احسن الکلام

فی

ترک القراءة خلف الإمام

شیخ الحدیث حضرت مولانا محمد سرفراز خان صاحب

ناشر

مکتبہ صفدریہ

نزد مدرسہ نصرۃ العلوم گھنٹہ گھر

گوجرانوالہ، پاکستان

وَاِذَا قُرِئَ الْقُرْاٰنُ فَاسْتَمِعُوْا لَهٗ وَاَنْصِتُوْا الآية

(قرآن کریم)

وَاِذَا قَرَأَ فَاَنْصِتُوْا (الحدیث)

احسن الکلام

فی

ترک القرأۃ خلف الامام

جلد اوّل

جس میں قرآن کریم، صحیح احادیث، آثار حضرات صحابہ کرامؓ و تابعینؒ و اتباعِ تابعینؒ اور دیگر جمہور فقہاءؒ اور محدثین عظامؒ سے یہ بات ثابت کی گئی ہے کہ امام کے پیچھے کسی نماز میں کسی بھی قسم کی قرأت عموماً اور سورۂ فاتحہ کی قرأت خصوصاً ممنوع ہے اور جہری نمازوں میں تو امام کے پیچھے قرأت کرنا قرآن کریم، حدیث صحیح اور اجماع کے خلاف ہے اور فی نفسہٖ منکر اور شاذ ہے اور جہری نمازوں میں حضرات ائمہ اربعہؒ کا اتفاق ہے۔ نیز عقلی اور قیاسی دلائل سے اس مسئلہ پر فیصلہ کن بحث کی گئی ہے اور فریقِ ثانی کو مسکت جوابات دیئے گئے ہیں اور اس طبع میں خیر الکلام اور الاعتصام" میں کیے گئے اعتراضات کے جوابات کو خصوصیت سے ملحوظ رکھا گیا ہے۔

تالیف

ابو الزاہد محمد سرفراز خان صفدر

لَا صَلٰوۃَ لِمَنْ لَّمْ یَقْرَأْ بِفَاتِحَةِ الْکِتَابِ فَصَاعِدًا (حدیث شریف)

جس شخص نے سورۂ فاتحہ اور اس کے ساتھ قرآن کریم کا کوئی اور بھی حصہ نہ پڑھا تو اس کی نماز نہ ہوگی (حدیث رسولؐ)

اَحْسَنُ الْکَلَام

فی

ترک القرأۃ خلف الامام

جلد دوم

"جس میں امام کے پیچھے سورۂ فاتحہ پڑھنے کو رکن اور ضروری ٹھہرانے والے فریق کے پیش کردہ نقلی اور عقلی دلائل پر روایۃً و درایۃً سیر حاصل کلام کیا گیا ہے۔ اور یہ امر واضح تر براہین سے ثابت کیا گیا ہے کہ حضرت عبادہؓ بن الصامت وغیرہ کی اس روایت کے علاوہ جس میں فصاعداً، اما تیسر، اور ما زاد کی زیادت یا اِلَّا وَرَاءَ الْاِمَامِ کی استثناء بھی مذکور ہے اور کوئی روایت صحیح نہیں ہے، خصوصاً وہ روایات جن میں خلف الامام کی قید اور اِلَّا بفاتحة الکتاب کی استثناء موجود ہے وہ تمام ضعیف کمزور اور معلول ہیں نیز حضرات صحابہ کرامؓ اور تابعینؒ وغیرہم کے آثار کا پس منظر بھی آشکارا کیا گیا ہے اور مؤلف خیر الکلام کے اعتراضات کا تانا بانا بھی پیش نظر رکھا گیا ہے۔"

تالیف

ابو الزاہد محمد سرفراز خان صفدر، گوجرانوالہ

طبع دہم ــــــــ جون ۲۰۰۶ء

نام کتاب ــــــ احسن الکلام فی ترک القرأۃ خلف الامام

مؤلف ــــــ شیخ الحدیث حضرت مولانا محمد سرفراز خان صفدر دام مجدہم

تعداد ــــــ ایک ہزار

مطبع ــــــ فائن بجس پرنٹرز لاہور

ناشر ــــــ مکتبہ صفدریہ نزد مدرسہ نصرۃ العلوم گھنٹہ گھر گوجرانوالہ

قیمت ــــــ دوسو پچیس روپے

ملنے کے پتے

- مکتبہ صفدریہ نزد گھنٹہ گھر گوجرانوالہ
- مکتبہ حلیمیہ جامعہ بنوریہ سائٹ کراچی
- مکتبہ رحمانیہ اردو بازار لاہور
- مکتبہ سید احمد شہید اردو بازار لاہور
- کتب خانہ رشیدیہ راجہ بازار راولپنڈی
- مکتبہ العارفی جامعہ اسلامیہ امدادیہ فیصل آباد
- مکتبہ رشیدیہ حسن مارکیٹ نیو روڈ مینگورہ
- مکتبہ نعمانیہ کبیر مارکیٹ لکی مروت
- مکتبہ امدادیہ ملتان
- مکتبہ حقانیہ ملتان
- مکتبہ مجیدیہ ملتان
- مکتبہ قاسمیہ اردو بازار لاہور
- اسلامی کتب خانہ اڈا کاکی ایبٹ آباد
- مکتبہ فریدیہ ای سیون اسلام آباد
- دار الکتاب عزیز مارکیٹ اردو بازار لاہور
- مدینہ کتاب گھر اردو بازار گوجرانوالہ
- مکتبہ قاسمیہ جمشید روڈ نزد جامع مسجد بنوری ٹاؤن کراچی
- مکتبہ فاروقیہ حنفیہ عقب فائر بریگیڈ اردو بازار گوجرانوالہ
- کتاب گھر شاہ جی مارکیٹ گکھڑ

فہرست مضامین

تصدیقات علماء کرام

تمّ بعون اللہ تعالیٰ

فہرست مضامین احسن الکلام (جلد دوم)

پیش لفظ

"احسن الکلام" کے حصہ اول میں جمہور اہل اسلام کے اس دعویٰ کو قرآن کریم، صحیح احادیث، آثار حضرات صحابہ کرامؓ و تابعینؒ اور دیگر فقہاءؒ اور محدثینؒ کے اقوال سے نیز بعض عقلی و ترجیحی اور قیاسی دلائل سے نہایت وضاحت کے ساتھ بیان کیا گیا ہے کہ مقتدیوں کو امام کے پیچھے کسی قسم کی قرأت کرنی جائز نہیں ہے اور متعدد صحیح احادیث اور آثار صحابہ کرامؓ سے ام القرآن اور فاتحۃ الکتاب کے خاص الفاظ بھی عرض کر دیے گئے ہیں اور یہ بھی واشگاف کیا گیا ہے کہ امام کے پیچھے قرأت کرنا صحیح نہیں ہے اور یہ کہ جہری نمازوں میں تو امام کے پیچھے قرأت کرنا شاذ، منکر اور خلاف اجماع ہے۔ اب اس حصہ میں فریق ثانی کی طرف سے پیش کردہ استدلالات اور دلائل کا معیار اور ان کا پس منظر عرض کرنا ہے اور انصاف و دیانت سے یہ بات بعید ہے کہ ہم اُنکے دلائل سے چشم پوشی کرتے ہوئے آگے نکل جائیں اور ان کو ہدیہ قارئین کرام نہ کریں، بلکہ اُن کی طرف سے بطور وکیل اور بہی خواہ کے جو حدیث (اگرچہ انھوں نے پیش نہیں کی لیکن) ان کی دلیل بن سکتی ہے اس کو بھی نقل کر دیا گیا ہے، اور اُن کے تمام پیش کردہ دلائل اور براہین کے صحیح محامل عرض کر دیے گئے ہیں اور حوالے بھی ساتھ ہی نقل کر دیے گئے ہیں تاکہ ایک طرف ان کو اصل عبارت اور مضمون کی طرف مراجعت کرنا دشوار نہ ہو اور دوسری طرف شاید "الانسان عبد الاحسان" پر نگاہ کرتے ہوئے وہ کچھ نرم بھی ہو جائیں اور ساری دنیا کو چیلنج نہ کرتے پھریں۔

مری ضد سے ہوا ہے مہرباں دوست

مرے احساں ہیں دشمن پر ہزاروں

چونکہ فریق ثانی کا دعویٰ بڑا سنگین ہے اس لیے اگر ہم سے کسی دلیل کی گرفت میں کوئی سختی ہوگئی تو معذور تصوّر کیجیے کیونکہ البادی اظلم مالم یتعد المظلوم کے پیش نظر ہم مظلوم ہیں اور ان لصاحب الحق مقالا ارشاد نبوی ہی تو ہے۔ اور یہ بھی مشہور ہے کہ عوض معاوضہ گلہ ندارد اور حتی الوسع اس پر خطر وادی سے دامن بچا کر نکلنے کی کوشش کی جائے گی۔ والعصمۃ بید اللہ تعالیٰ وحدہ

تصدیقاتِ علمائے کرام

فخر الاماثل قدوۃ الصلحا حکیم الاسلام الحاج الحافظ

حضرت مولانا قاری محمد طیب صاحب دامت برکاتہم

مہتمم دار العلوم، دیوبند۔

مخدوم و محترم زاد مجدکم

سلام مسنون نیاز مقرون۔ گکھڑ سے رخصت ہو کر بعافیت لاہور اور وہاں سے دیوبند پہنچا۔ احسن الکلام کا مطالعہ یاد اور شوقِ طبعی دامن گیر تھا۔ ماشاء اللہ تعالیٰ مسئلہ فاتحہ میں اسے ایک بحرِ ذخار پایا۔ اللہ تعالیٰ آپ کی اس سعی و محنت کو قبول فرمائے اور امت کی طرف سے آپ کو جزائے خیر عطا فرمائے۔

میں نے حسبِ وعدہ تقریظ لکھنے کا ارادہ کیا لکھنے بیٹھا تو غیر متوقع طریق پر تحریر طویل ہو گئی جو احسن الکلام سے متاثر ہونے کا نتیجہ تھا۔ تقریباً پانچ صفحے فل سکیپ کے ہو گئے۔ اور تقریظ کی صورت نہ رہی۔ اب دو صورتیں ہیں یا تو آپ اس میں سے وہ زائد حصہ حذف کر دیں جس میں غالی اہلِ حدیث کو ناصحانہ خطاب ہے اور اگر اسے غیر ضروری نہ سمجھیں تو دوسری صورت یہ ہے کہ اسے تقریظ کے بجائے کتاب کا مقدمہ بنا دیجیے جو میری طرف سے ہو جائے گا۔ مقدمہ کے لیے یہ تحریر موزوں رہے گی، جو بھی صورت مناسب ہو کر لی جائے۔

میں بحمد اللہ تعالیٰ بعافیت ہوں۔ اُس شب کی مہمان نوازی کا شکر گزار ہوں۔ والسلام

محمد طیّب

دیوبند

۳/۴/۷۵ھ

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

فَبَشِّرْ عِبَادِ الَّذِیْنَ یَسْتَمِعُوْنَ الْقَوْلَ فَیَتَّبِعُوْنَ اَحْسَنَہٗ (سورۃ الزمر)

محترم الفاضل مولانا محمد سرفراز خاں صاحب دام بالمجد والفواضل کی لطیف ترین تالیف احسن الکلام فی ترک قرأۃ الفاتحہ خلف الامام سے استفادہ کا شرف میسر ہوا۔ مطالعہ کے وقت ہر اگلی سطر پر آنکھوں میں نور دل میں سرور اور روح میں ثلج یقین بڑھتا جاتا تھا۔ اثبات مسئلہ کے سلسلہ میں مصنف نے سلاست بیان زورِ استدلال منصفانہ تنقید اور عادلانہ مدافعت سے مسئلہ کے تحقیقی اور الزامی دونوں پہلوؤں کو مضبوط اور مستحکم کرنے کا حق ادا کر دیا ہے۔ کتاب کا مثبت حصہ بہت زیادہ دل آویز ہے جس میں متین انداز کے ساتھ مضبوط دلائل اور مؤکد شواہد سے مسئلہ کے کسی پہلو کو تشنہ نہیں چھوڑا اور ساتھ ہی مسئلہ کے دفاعی پہلو سے بھی صرف نظر نہیں کیا۔ کیونکہ مثبت پہلو کے ساتھ جب تک اس کا منفی پہلو صاف نہ ہو مسئلہ من کل الوجوہ مستحکم نہیں ہوتا۔ مصنف نے جہاں مثبت پہلو سے ماننے والوں کے لیے سینہ کی ٹھنڈک کا سامان بہم پہنچایا ہے۔ وہیں منفی پہلو کے دفاع سے نہ ماننے والوں اور ان طعنہ زنوں کا منہ بند کر کے ان پر حجت بھی تمام کر دی ہے جنھیں فاتحہ اور ترک فاتحہ سے زیادہ صرف گروہی تعصب اور اس کا تفوق ہی زیادہ سے زیادہ پیش نظر ہے؛ لیکن ان کے مقابلے میں یہ تردید مسئلہ کے کسی اجتہادی پہلو کی تردید نہیں بلکہ ان کے تخیلات اور غیر معتدل رویہ کی تردید ہے ورنہ ایک فروعی اور ایک اجتہادی اور اوپر سے مختلف فیہ مسئلہ کے ایک پہلو کے اثبات و تحقیق پر اتنا زور دیا جانا ظاہر ہے کہ مسئلہ کی جانب مخالف اور اس کے ماننے والوں کی تردید یا مخالفت کے لیے نہیں ہے نہ ہونا چاہیے اور نہ ہو سکتا ہے۔ کیونکہ اس قسم کے فروعی مسائل نہ تو تبلیغی ہیں کہ انھیں دوسروں تک پہنچایا جانا اور ان کا منوایا جانا ضروری ہو اور نہ معاذ اللہ تکذیبی ہیں کہ مخالف رائے رکھنے والوں کو جھٹلایا جانا اور ان کی تکذیب کیا جانا

روا ہو بلکہ محض ترجیحی ہیں جن میں حق و باطل کا نہیں محض خطا و صواب کا اختلاف ہے وہ بھی علی الاطلاق نہیں بلکہ اپنا صواب بھی احتمال خطا کے ساتھ اور دوسروں کی خطا بھی احتمال صواب کے ساتھ مفید ہے اور پھر اس میں بھی دوسرے کی یہ محتمل خطا اس یقین کے ساتھ ہے کہ وہ اور اس کے ماننے والے اس پر مستحق اجر و ثواب اور مستوجب نجات و فلاح بھی ہیں۔ ظاہر ہے کہ ایسے ذو جہتین مسائل میں جن میں جانب مخالف باطل بھی نہ ہو وہ خطا قطعی بھی نہ ہو اوپر سے نجات و اجر کا استحقاق بھی یقینی ہو کسی فریق کو یہ حق کیسے مل سکتا ہے، کہ وہ مسئلہ کی مخالف سمت کے ساتھ طعنہ زنی اور تشنیع سے پیش آئے یا اسے باطل قرار دے کر ماننے والوں کو مبطل قرار دے۔ اور اس کے بالمقابل اپنی مسلمہ جانب کی دعوت و تبلیغ کرنے لگے۔ فریقین کو اگر حق پہنچتا ہے تو صرف یہ کہ وہ وجوہ دلائل سے اپنی مسلمہ جانب کو مسلک سنت ثابت کرتے ہوئے اس کی ترجیح واضح کر دیں جس کا منشا صرف یہ ہے کہ وہ اپنے کو تہمت بدعت سے بری ثابت کر کے دائرہ سنت میں محدود کیے ہوئے ہیں۔ اور یہ کہ مسئلہ کی جس سمت کو انہوں نے اختیار کیا ہے وہ ہوائے نفس سے نہیں بلکہ وجوہ شرعیہ سے ہے۔ اس ترجیحی سلسلہ میں فریق ثانی کا ابطال یا معاذ اللہ تعالیٰ اضلال کا کوئی سوال ہی نہیں ہوتا کہ اس کی طرف التفات کی کوئی وجہ ہو بلکہ میں تو یہ سمجھتا ہوں کہ ان فروعی اختلافات میں سرے سے فریق بندی ہی نہیں ہے کہ فریق اول اور فریق ثانی کی بحث شروع کر کے ہل من مبارز کی زور آزمائیاں دکھلائی جائیں۔ فاتحہ خلف الامام ہو یا آمین بالجہر و بالسر، رفع یدین ہو یا ترجیع اذان وغیرہ ان میں ہر مسئلہ کا مثبت اور منفی پہلو ایک ہی مسئلہ کے دو پہلو ہیں۔ مسئلے دو نہیں ہیں اور وہ پہلو بھی روایتی اور درایتی بحث سے سامنے آتے ہیں۔ شریعت نے بالاستقلال ابتدا ہی سے بیکدم دو متضاد پہلو عمل کے لیے سامنے نہیں رکھے۔ اب یہ دو پہلو خواہ زمانے کے تفاوت سے سامنے آئے کہ ابتدا میں ایک پہلو صاحب شریعت کے زیر عمل آیا اور آخر میں دوسرا جس سے ناسخ و منسوخ کی بحث پیدا ہوتی یا عزیمت و رخصت کے فرق سے سامنے آئے جس سے اولیٰ غیر اولیٰ کی بحث پیدا ہوئی یا تساوی کے ساتھ سامنے لائے گئے جس سے دونوں پہلوؤں میں

تخییر کی بحث پیدا ہوئی، بہر حال کسی بھی معیار سے سامنے آئے ہوں ایک ہی مسئلہ کے دو پہلو رہیں گے۔ جس میں ناسخ منسوخ اولیٰ غیر اولیٰ افضل غیر افضل عزیمت، رخصت تخییر و عدم تخییر کے معیار سے ترجیحات سامنے آتی رہیں گی اور وہ اپنے اپنے وقت اور ظرف اور کیف و کم کی ترجیحات کے ساتھ امت کے زیر عمل آتے رہیں گے جس سے پیغمبر صادق و مصدوق کا کوئی ارشاد اور ارشاد کا کوئی پہلو متروک العمل نہ رہے گا بلکہ ہر پہلو امت کے کسی نہ کسی طبقہ میں زیر عمل رہے گا اور اس طرح پوری امت نبی کے پورے ارشادات کی حامل اور عامل رہے گی۔ اندریں صورت ایک روایت دوسری روایت کی ایک حدیث دوسری حدیث کی اور ایک آیت دوسری آیت ہی کی خود ہی فریق نہیں ٹھہرتی چہ جائیکہ رجال حدیث یا حاملین آیت و روایت باہم ایک دوسرے کے فریق قرار پائیں اور آپس میں نبرد آزما ہوں۔ اور ہل من مبارز کہ کر پہلوانوں کی طرح اکھاڑوں میں اتریں اور زور آزمائی کے جوہر دکھلائیں گویا آیات و روایات اسلحہ ہیں۔ حاملین آیات و روایات جنگی سپاہی اور شریعت ان کا میدان مبارزہ و مقابلہ، ظاہر ہے کہ حسی طور پر سب سے پہلے اسلحہ ٹکراتے ہیں پھر سپاہی تو اس مبارزت طلبی کا مطلب یہ ہوا کہ خود آیات و روایات میں کوئی حقیقی تعارض اور تصادم ہے جس کی مجبوری سے حاملین آیات و روایات کو بھی باہم ٹکرانا پڑا۔ حالانکہ یہ صورت حال خود کتاب و سنت سے مدفوع ہے اگر عیاذاً باللہ تعالیٰ ان مختلف فیہ مسائل کی ذاتی خاصیت ہی یہ نبرد آزمائی اور مبارزت طلبی ہوتی تو حضرات صحابہؓ و تابعینؒ و آئمہ مجتہدینؒ اور علمائے راسخین کو تو اس لڑائی بھڑائی اور چیلنجوں سے ایک لمحہ کی بھی فرصت نہ ملتی۔ کیونکہ وہ تو ان مسائل میں مجتہد اور مدعی کی حیثیت رکھتے تھے اور مدعی کو اپنے دعوے پر بہ نسبت ناقل اور تابع کے زیادہ جمود اور استقلال ہوتا ہے جب ناقل اور تابع محض ہو کر ہمیں ان لڑائیوں سے فرصت نہیں تو مدعیوں کو تو ایک سیکنڈ کے لیے بھی ان ہل من مبارز کے چیلنجوں سے مہلت نہ ملنی چاہیے تھی۔ اور ان کی لڑائی ہم سے کہیں زیادہ شدید اور مدید ہونی چاہیے تھی۔ لیکن صورت واقعہ برعکس ہے کہ قرون اولیٰ میں ان علمی اور فروعی مسائل کی جانب و شقوق میں ترجیح و اختلاف کے باوجود ان حضرات کے قلوب میں ہل من مبارز اور چیلنجوں کا تصور تک نہیں ملتا چہ جائیکہ تصادم کا کوئی عمل دستیاب ہو اس لیے بلا جھجک کہا جا سکتا ہے کہ یہ ہماری مبارزت طلبیاں اور شرعی لائنوں میں زور آزمائیاں ان مسائل کی خاصیت نہیں بلکہ محض ہمارے نفوس کی شرارتیں ہیں جن میں جذبات نفس

نکالنے کا جب کہیں اور موقع نہیں ملتا تو ہم یہ کارِ خیر اس ترجیحی میدان میں انجام دے لیتے ہیں۔ بنیے کی مار ترازو کی ڈنڈی۔ اس لیے میں تو اس تصور پر ہوں کہ جب صورت تعارض کے باوجود ایک حدیث دوسری حدیث کا فریق نہیں تو ان مسائل کے سلسلے میں مرجحین کا کوئی طبقہ کوئی دوسرے طبقہ کا فریق کیسے قرار پا سکتا ہے؟ میرے خیال میں کوئی شافعی، مالکی، اہل حدیث ان مسائل کی ترجیحات کی حد تک نہ حنفی کا فریق ہے اور نہ حنفی ان میں سے کسی کا ان میں اگر ترجیحاتی بحثیں ہیں تو وہ علمی اور فطری طور پر ایک حق کو دوسرے حق پر راجح قرار دینے کی ہیں۔ نہ کہ حق کو باطل کے مقابلے پہ اختیار کرنے کی جن کا لڑائی یا چیلنجوں سے تعلق ہو۔ ہاں اگر ان مرجحین کے مقابلے میں کوئی طبقہ فریق کی حیثیت رکھتا ہے تو وہ طاعنوں تشنیع کنندوں اور ان افراد کا ہے جو کسی بھی اجتہادی شق کی تقبیح اور مذمت کے لیے مذہب و مشرب کے نام پر کھڑے ہوں۔ سو اس قسم کے طاعن اور تبرائی حضرات جس طرح تارکین فاتحہ خلف الامام کے فریق ہیں۔ اسی طرح قارئین فاتحہ خلف الامام کے بھی فریق ہیں۔ کیونکہ فاتحہ اور ترک فاتحہ تو حدیثی مسلک ہے لیکن طعن بر فاتحہ یا بر ترک فاتحہ (بایں طور کہ پڑھنے یا نہ پڑھنے والے کو مطعون کیا جائے) نہ حدیثی مسلک ہے نہ قرآنی نہ فقہی نہ کلامی۔ اس لیے اگر تارکین فاتحہ اور قارئین فاتحہ عامل بالحدیث ہونے کی وجہ سے اہل حق ہیں تو یہ طاعنین فاتحہ و ترک فاتحہ کسی سمت کے بھی ہوں۔ ان اہل حق کے فریق ہیں جن کا تقابل نہ فاتحہ سے ہے نہ ترکِ فاتحہ سے بلکہ حق اور اہلِ حق سے ہے۔ پس ایسے لوگ بلاشبہ تردید کے بھی مستحق ہیں اور تکذیب کے بھی درحالیکہ یہ تردید و تکذیب نہ کسی مسلک کی ہوگی نہ مسلک کی کسی اجتہادی شق کی بلکہ صرف ان افراد کی اور ان کے غیر معتدل کلام اور کلام کے اس رویّہ کی جس کا تعلق کسی حق سے نہیں بلکہ صرف ان کے جذبات نفس سے ہے۔

مصنف ممدوح نے اپنی اس متین کتاب میں اگر کہیں رد و قدح سے کام لیا ہے تو وہ درحقیقت اسی طبقہ کے مقابلے پر ہے جو مسائل کو مسائل کی نظر سے نہیں دیکھتا بلکہ جذبات نفس کی آنکھ سے دیکھتا ہے۔ بقول شخصے کہ وہ نہ آمین بالجہر پر لڑتا ہے۔ نہ آمین بالسر پر بلکہ صرف آمین بالشر پہ اس لیے وہ دونوں قسم کی آمین والوں کا فریق مقابل ہے۔ کیونکہ آمین کی پہلی دو قسمیں تو روایات میں ملتی ہیں لیکن تیسری سے قرآن و حدیث خالی ہیں۔ اس کا وجود اگر ہے تو صرف ان لوگوں کے نفس میں ہو سکتا ہے اور بس۔ پس مصنف کو یقیناً کسی اجتہادی مسئلہ کی شق کی بھی تردید کا حق نہیں لیکن بالیقین

ایسے طعنہ زن اور ان کی ایسی غلط روشوں اور مطاعن کی تردید بلکہ تکذیب کا حق ضرور پہنچتا ہے۔ جو مسئلہ کے بجائے اپنے نفس کی مصلحت کو آگے رکھتے ہوں اور دلائل سے گزر کر جذبات کو مسئلہ کی کافی دلیل خیال کر رہے ہوں اگر مصنف نے ایسے لوگوں کی تردید کا فرض احسن الکلام کے ساتھ ادا کیا تو بلاشبہ انھیں اس کا حق تھا اور انھوں نے حق ادا کر دیا۔

اگر طعنہ زن حضرات کو حدیث کے نام پر زور آزمائی کا ایسا ہی شوق دامن گیر ہے تو انھیں چاہیے کہ وہ پہلے منکرین حدیث سے نمٹیں اور نفس حدیث کے موقف کو تھامنے میں یہ زور آزمائی دکھلائیں۔ وہ ان سے کیا نمٹنا چاہتے ہیں جو خود ہی حدیث، فن حدیث، فقہ حدیث اور ائمہ حدیث کے متبع اور ایک فانی گرویدہ و معتقد کی حیثیت رکھتے ہیں جن کے یہاں حدیث رسول ہی نہیں رجال حدیث تک کی بے پناہ عظمت و بزرگی اور مخلصانہ پیروی کے جذبہ کو قائم رکھنا ایمان کا جزو اعظم ہے۔ نیز ان طعنہ زن حضرات کو اگر واقعی تبلیغ حق کا جذبہ بے چین کیے ہوئے ہے تو وہ منکروں کو اصول اسلام اور اصل دین کی تبلیغ فرمائیں جس کی تبلیغ ضروری ہے تو فروعی مسائل کب ہیں کہ ایک طبقہ دوسرے طبقہ کو اس کے مختار کی جانب سے ہٹا کر اپنی مختار جانب پر لانے کی کوشش کرے نیز اگر تردید ضروری ہے تو غیر اسلامی اصول کی ضروری ہے نہ کہ کسی اجتہادی شق کی سمت مخالف کی جس میں ہمہ وقت صواب کا احتمال قائم رہتا ہے اور اس پر چلنے والا ہر وقت اجر و نجات کا مستحق ہوتا ہے۔ پس تبلیغی سرگرمیاں اور بغض فی اللہ کے مجاہدانہ چیلنجوں کو اگر کام میں لانا ہے تو مخربین دین، محرفین کتاب و سنت اور مستھزئین اسلام کے مقابلہ میں لانا چاہیے نہ کہ فاتحہ وغیرہ جیسے فروعی اور اجتہادی مسائل کی ترجیحی شقوق وجوانب کے نام پر خود معتقدین دین وائمہ دین کے مقابلہ پر میں تو سمجھتا ہوں کہ جو حضرات ان فروعی مسائل کو محض ترجیحی اور عملی مسلک جان کر ان پر سچے دل سے عمل پیرا ہیں خواہ وہ اہل فقہ ہوں یا اہل حدیث۔ انھیں اس دوران میں کسی حنفی غیر حنفی اور اس کی تسلیم کردہ جانب کا تصور تک بھی نہ آتا ہوگا۔ چہ جائیکہ وہ اس کے خلاف غم و غصہ سے مغلوب ہو کر چیلنجوں کی عبارتوں سے اپنے ذہنوں کو مشوش کرتے ہوں اور ہل من مبارز کے دھیان میں غرق ہوں۔ استفسار مسئلہ کے وقت دیانتاً اپنے نزدیک جو پہلو راجح ہو اسے راجح بتلانا اور مرجوح کو مرجوح کہنا اور چیز ہے اور مرجوح کا ابطال اور افساد کرنا یا اس کے ماننے والے کی تضلیل و

تفسیق کرنا اور چیز ہے۔ پہلا کام اہلِ حق کا ہے اور دوسرا اہلِ حق کے مقابل فریق کا۔ بہر حال جیسا کہ ایک حنفی کو فاتحہ خلف الامام کے ماننے والے کو مبطل یا باطل پرست کہنے کی جرأت نہ ہونی چاہیے ایسے ہی کسی غیر حنفی کو ترکِ فاتحہ اور اس کے ماننے والوں کو باطل پرست یا مبطل یا ضال یا فاسق کہنے کی جرأت نہ ہونی چاہیے کہ یہ اسم فسوق بعد الایمان اور غیر محتاط تعبیر ہم نالائقوں ہی تک محدود نہیں رہتی دور تک جاتی ہے جس کی زد سے کوئی بڑے سے بڑا بھی نہیں بچا رہتا۔ کیونکہ عیاذاً باللہ اگر ترکِ فاتحہ خلف الامام کوئی ضلال یا گمراہی ہے تو یہ ضلالت بہت پرانی اور بہت سوں کی ہے۔ ؎

مرا بر بندگی عشق آں فضول عیب کند
کہ اعتراض بر اسرار علم غیب کند

ہاں اس حد تک ہم طعنہ زنوں کے ممنونِ کرم بھی ہیں کہ اگر وہ طعن و تشنیع کی راہ سے اس مسئلہ کو اپنے جذبات اور شکوک کی آماجگاہ نہ بناتے اور ایک فریق کی حیثیت سے سامنے نہ آتے تو مصنف محترم مولانا محمد سرفراز خاں صاحب کے ان دقیق علوم اور اسالیب بیان سے ہم مستفید بھی نہ ہو سکتے جو اس حیلہ سے انھوں نے اپنی کتاب احسن الکلام میں رقم فرمائے ہیں۔ واقعہ یہ ہے کہ اگر جہل علم سے نہ ٹکرائے تو علم کے مخفی گوشے واشگاف نہیں ہو سکتے اگر کذب۔ صدق سے ٹکر نہ کھائے تو صدق کی مخفی قوت نمایاں نہیں ہو سکتی اگر کفر اسلام سے نہ ٹکرائے تو اسلام کے مخفی گوشے دنیا کو اپنا نور نہ دکھلا سکتے بہر حال جب تک اضداد اپنے اصول سے نہ بھڑیں اصول کا وجود و ثبوت نمایاں نہیں ہو سکتا۔ اس لیے حق تعالیٰ نے اس عالم کو عالم اضداد بنایا ہے اور ہر اصول کے پیچھے اس کی ضد لگا دی ہے تاکہ وہ اس سے ٹکراتی رہے اور اس حیلہ سے اصول کی عظمت و قوت لپکتی رہے بایں معنی تکوینی طور پر طاعنوں اور منکروں کا وجود بھی مجموعۂ کائنات کے لیے ایک حسن ہے اور ضروری ہے وہ اگر دلوں میں وسوسے اور شبہات نہ ڈالیں تو اہلِ عرفان سے ان کے دفعیہ کی علمی تدبیریں بھی نمایاں نہ ہوں مثل مشہور ہے کہ "ادب سیکھا جاتا ہے بے ادبوں سے" یعنی وہ ذریعہ ادب دانی بن جاتے ہیں سو علم بھی بہت حد تک جہل سے ہی سیکھا جاتا ہے۔ یعنی جہل اور اس کے پیدا کردہ شکوک و شبہات

بھی بہت حد تک ذریعہ بن جاتے ہیں۔ اہلِ علم کی گرم جوشی آمادگی اور ان کے انقارِ علم کا جس سے مخلوقِ خدا علم سے بہرہ ور ہوتی ہے۔ بس اس حد تک اس طبقہ کا ہم سب ہی کو ممنون ہونا چاہیے کہ علم کے بہت سے مخفی گوشے ان کے سبب سے سامنے آگئے اور اس شر میں سے ایک خیر ہمارے لیے نکل آئی۔ شر اپنی ذات سے شر سہی مگر مجموعۂ عالم اور اہلِ معاملہ کے لیے نسبتاً وہی خیر ہے۔ مگر محض خدا تعالیٰ کے فضل سے نہ کہ شر کے خیر ہونے سے۔ اس لیے تکوینی طور پر تو ہم طعنہ زنوں کے ممنون ہوں گے کہ ان کی بدولت کتنے ہی علم کے مخفی گوشے ہمیں دستیاب ہوگئے مگر حقیقی طور پر ہم مصنف احسن الکلام کے ممنون ہیں کہ انھوں نے اس حیلہ سے مسئلہ فاتحہ کے تحقیقی اور دفاعی دونوں پہلوؤں کو بہت حد تک صاف کر دیا ہے جو موافق اور مخالف دونوں طبقوں کے لیے علمی حیثیت سے کارآمد ہوں گے۔ اگر خلاف رائے رکھنے والے حضرات کے لیے ان دلائل سے شفا ہوگئی تو ان کے خلاف میں شدت باقی نہ رہے گی خواہ وہ اپنے ہی مسلک پر عمل پیرا رہیں سو یہ کونسا کم نفع ہے اور اگر ان دلائل کے کسی مقدمہ کو کمزور پا کر انھوں نے جواب کے طور پر اسے واضح کیا تو ہم سب کے لیے ایک مزید علم کا اضافہ ہوگا اور یہ کونسا قلیل نفع ہے جو زدنی علما کا مصداق ہو، بہر صورت مولانا محمد سرفراز خاں صاحب اس تالیف لطیف کے لیے سرفراز ہوتے ہیں تو وہ ہمارے شکریہ کے مستحق ہیں اور احسن الکلام بحیثیت مجموعی حقیقتاً احسن الکلام ہے۔ حق تعالیٰ اس احسن الکلام کو حسنِ قبول سے سرفراز فرمائے اور اسے یتّبعون احسنہ کا مصداق بنائے۔ آمین

محمد طیب غفرلہ

مہتمم دارالعلوم دیوبند

یکم ربیع الثانی ۱۳۷۵ھ

سید المناظرین سند العلماء
حضرت مولانا سید مہدی حسن رحمہ اللہ تعالے
سابق مفتی اعظم دار العلوم، دیوبند

بسم اللہ الرحمن الرحیم

نحمدہ ونصلی علی رسولہ الکریم

وبعد - آج دنیا جس دور سے گذر رہی ہے خصوصاً مسلمانانِ عالم جن کٹھن مراحل سے گذر رہے ہیں۔ اس کا وقتی اور ہنگامی اقتضاء یہ تھا کہ وہ امت جس کا خدا ایک، رسول ایک، قرآن ایک۔ کعبہ ایک ہے سر جوڑ کر بیٹھتی اور ان امراض کا علاج تلاش کرتی جن امراض میں مسلمان مبتلا ہیں جن کی وجہ سے ان پر زندگی دوبھر اور وبال ہے۔ تحریکات گمراہ کن اور فتن مخرب دین کی ہوائیں چل رہی ہیں۔ نہیں، نہیں بلکہ دریا کی موجوں کی طرح پے بہ پے موجیں مار رہے ہیں جن کی لہروں کا اثر ساحلِ دریا سے باہر بھی کافی ہے: ؎

بحزم کوش کہ ایں رہ بسے پُر از خطر است ۔۔۔ باحتیاط قدم نہ کہ جائے شور و شر است

ہمیں کہ ابر بہار وچناں تصور کن ۔۔۔ کہ سیل می رسد وخانۂ تو بر گذر است

بجائے اس کے آج بھی تشتت و افتراق کی صورتیں پیدا کر کے شقاق و خلاف کے راستے کو ہموار کیا جاتا: ع ۔۔۔ وہ سمجھنے کس طرح بیٹھیں کہ جب بیٹھا نہیں جاتا

اس پر طرہ یہ کہ اس کو دینی خدمت تصور کیا جاتا ہے جو مسائل بر سہا برس سے ایسے چلے آتے ہیں جن پر ہر زبان میں خامہ فرسائی ہو چکی ہے اور قلموں کی روشنائی خشک ہو چکی ہے۔ انھیں اختلافی مسائل میں سے فاتحہ خلف الامام کا پرانا مسئلہ ہے کوئی نئی اور جدید تحقیق نہیں ہے جس کو دنیا کے سامنے پیش کیا جائے اور وہ اس سے مستفید ہو۔ لیکن جن حضرات کی طبیعت ثانیہ یہ ہو گئی ہو کہ اختلاف وسیع ہوتا رہے وہ کب گوارا کر سکتے ہیں کہ خاموش رہیں اور اپنی تحقیق کے مطابق عمل کرتے رہیں لیکن ایسا نہیں بلکہ دور حاضر کے ہمارے دینی بھائی اہل حدیث حد اعتدال سے باہر ہو کر اسی کے درپے ہو گئے کہ جو امام کے پیچھے - الحمد نہ پڑھے اس کی نماز باطل ہے اور جب نماز ہی نہیں ہوتی تو تارکین صلوٰۃ ہیں بلکہ قصداً اس جرم کے مرتکب ہیں جو بجائے خود باعث نجات ہونے کے

موجبِ خسرانِ اُخروی ہے۔ یہ اپنی جگہ پر کہاں تک صحیح ہے۔ اس کو انہیں کے قلوب زیادہ محسوس کرتے ہوں گے کہ امت محمدیہ کی ایک بہت بڑی جماعت کی نماز پر بُطلان کا حکم لگا کر کیا دین کی خدمت ہے، جن میں حضرات صحابہ کرامؓ، تابعینؒ و تبع تابعینؒ وغیرہم کی کافی تعداد داخل ہے۔ ایسی صورتِ حال پر اس کی ضرورت تھی کہ اس مسئلہ کے ہر پہلو پر از سرِ نو متانت و سنجیدگی، تہذیب و شائستگی کے ساتھ محدثانہ طریق سے روشنی ڈالی جائے جو پہلو اُجاگر نہیں ان کو اُجاگر کر دیا جاتے تاکہ انصاف پسند اور علم پرور حضرات کی بصیرت دقیقہ رس اس کو دیکھ کر اَحْسَنْتَ کہ اٹھے: ؎

لِلّٰہ الحمد ہر آں چیز کہ خاطر می خواست

آخر آمد ز پسِ پردۂ تقدیر پدید!

اس ضرورت کا احساس اخی محترم فاضل نوجوان مولانا محمد سرفراز خان صفدر سرحدی خطیب جامع مسجد گکھڑ منڈی نے کیا اور اس مسئلہ پر محققانہ و منصفانہ بحث کر کے کتابی صورت میں اس کو شایع کیا جو احسن الکلام فی ترک القرأۃ خلف الامام کے نام سے موسوم ہے جس کے دو حصے ہیں۔ میں نے جزو اوّل کا اوّل سے آخر تک لفظ بہ لفظ اور جزو ثانی کا مختلف مقامات سے مطالعہ کیا ہے۔ خوبیٔ اسلوب و انداز بیان، زبان کی صفائی کے ساتھ دلائل و براہین پر منصفانہ نظر ڈالی ہے۔ فاضل موصوف نے کسی پہلو کو تشنہ نہیں چھوڑا۔ معترضین کے شبہات کا جواب عالمانہ دیا ہے اور تحقیق کے ساتھ مجادلانہ طریق اختیار نہیں کیا کہ کتاب کی افادیت میں کمی واقع ہو۔ اپنے ہر دعویٰ کو براہین سے مدلّل کیا ہے کہ مخالفین حضرات کو بھی اگر ان کے یہاں علم و انصاف کی قدر و قیمت ہے تو تسلیم کر لینے اور سکوت اختیار کر لینے کے سوا چارۂ کار نہیں ہے اس محنت و عرق ریزی اور تحقیق و تنقید کی جملہ احناف کی طرف سے فاضل موصوف کو اللہ تعالیٰ جزائے خیر عطا فرمائے اور بے انصاف مخالفین کی ہدایت کا ذریعہ بنائے۔ ان کے علم و عمل میں برکت عطا فرمائے اور مخلوق کے طریق رشد و ہدایت کا رہبر بنائے۔ طلباء و عوام کے لیے اس کتاب کا مطالعہ ضروری ہے۔ علماء بھی اس کتاب کے مطالعہ سے دریغ نہ فرمائیں کہ براہین و دلائل اور آثار و اقوال ائمہ یکجائی طور پر اس کتاب میں ملیں گے۔ بعض مباحث ایسے بھی اس کتاب میں ملیں گے جو بڑی عرق ریزی اور کافی مطالعہ کتب

بمشکل حاصل ہو سکتے ہیں جن کو فاضل مؤلف نے بہت خوبی کے ساتھ اپنے اپنے موقع پر پیش کیا ہے اس لیے ہر اس شخص کو اس کتاب سے استفادہ کرنا چاہیے جو حنفیت سے وابستہ ہو تاکہ اپنے مذہب کی صداقت خصوصاً مسئلہ فاتحہ خلف الامام میں ہویدا اور نمایاں ہو جائے۔ طباعت و کتابت کی کہیں کہیں کوتاہیاں ہیں جو اشاعت آیندہ میں دور ہو جائیں گی انشاء اللہ تعالیٰ۔

احقر الزمن

السید مہدی حسن غفرلہ خادم دار الافتاء الواقعہ

بدار العلوم دیوبند۔ ۳/۷/۷۵ھ

شیخ العرب و العجم رأس الاتقیاء مجاہد ملت

حضرت مولانا سید حسین احمد مدنی رحمہ اللہ تعالیٰ

سابق شیخ الحدیث دار العلوم، دیوبند۔

حضرت مفتی سید مہدی حسن صاحب کی تحریر سے میں حرف بحرف موافقت کرتا ہوں اور دعا کرتا ہوں کہ اللہ تعالیٰ مولانا محمد سرفراز خاں صاحب موصوف کو جزائے خیر عطا فرمائے۔ آمین

ننگ اسلاف حسین احمد غفرلہ

مدرس دار العلوم، دیوبند

رئیس المحققین قامع البدعت محی السنۃ شیخ الحدیث

حضرت مولانا حبیب الرحمٰن صاحب اعظمی دامت برکاتہم (مئو اعظم گڈھ یوپی)

مئو

۱۲ ذیقعدہ ۱۳۷۴ھ

فاضل محترم! السلام علیکم و رحمۃ اللہ

آپ کا قیمتی ہدیہ (احسن الکلام) مجھے بروقت مل گیا تھا۔ اس عنایت کے لیے میں

آپ کا تہ دل سے شکر گذار ہوں - اپنی بے اطمینانی کی وجہ سے میں اب تک آپ کی کتاب پوری نہیں پڑھ سکا پھر بھی متعدد مقامات سے کئی کئی ورق پڑھے، آپ کی محنت وجانکاہی پر دل سے دعا نکلی - میں نے آپ کی کتاب کو اس لحاظ سے بہت زیادہ پسند کیا کہ آپ نے انھیں اصول کو سامنے رکھ کر جوابات دیے ہیں جن اصول کی بنا پر معترضین نے اعتراضات کیے ہیں - بالخصوص آپ نے تحقیق الکلام کی طرف جو خصوصی توجہ فرمائی اس کے لیے آپ خاص طور پر مستحق مبارکباد ہیں - اس لیے کہ ہماری جماعت کے تساہل وتغافل کی وجہ سے اس کو لاجواب سمجھا جا رہا تھا - حق تعالیٰ آپ کو جزائے خیر دے -

چونکہ یہ کتاب مقابلہ پر لکھی گئی ہے اور فریقِ مخالف صرف نکتہ چینی ہی کے خیال سے اس کو دیکھے گا، اس لیے مخالف کی نگاہ پڑنے سے پیشتر بعض ایسی باتیں جو میرے خیال میں صحیح نہیں معلوم ہوتیں - ان کی نشاندہی کرتا ہوں - آپ بھی غور فرمالیں - اگر آپ کو بھی مجھ سے اتفاق ہو تو فبہا ورنہ جانے دیجیے -

چونکہ میں نے مسلسل پوری کتاب نہیں پڑھی اس لیے کیف ما اتفق جہاں جہاں جو بات مجھے کھٹکی ہے اس کو میں نے نوٹ کر لیا ہے -

حبیب الرحمٰن الاعظمی

نوٹ: حضرت نے تین صفحات پر مشتمل تحریر میں متعدد اغلاط کی نشاندہی کی تھی جن کی اب بحمد اللہ تعالیٰ تصحیح کر لی گئی ہے - صفدر

حضرت مولانا مفتی فقیر اللہ صاحب رحمہ اللہ تعالیٰ

سابق مفتی اعظم جامعہ رشیدیہ منٹگمری تلمیذ و مرید حضرۃ شیخ الہندؒ

بخدمت جناب مولانا مولوی محمد سرفراز خاں صاحب بارک اللہ تعالیٰ فی عمرہ وعلمہ وعملہ!

السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ - امابعد گذارش کہ احسن الکلام، تبرید النواظر، گلدستۂ توحید، دل کا سرور میں نے پڑھوا کر سنی ہیں - ماشاء اللہ تعالیٰ آپ بہت وسیع النظر ہیں اور ذہین - حافظہ و فہم بہت پایا ہے، مگر معلوم نہیں یہ سب کتب جن کے حوالے آپ

نے دیے ہیں۔ کیا یہ سب آپ کے پاس موجود ہیں؟ جب میری بینائی تھی تو آثار السنن وجامع الآثار نیموی وایضاح الادلہ وہدایت المعتدی۔ والفرقان دیوبندی۔ وانوار نعمانیہ وسنت ضروریہ فیض پوری کا مطالعہ کیا تھا۔ مگر تحقیق الکلام کا جواب مصنف مرحوم کی زندگی میں کسی نے نہ لکھا۔ البتہ ابکار المنن کا جواب مولانا عبدالرشید ابن نیموی نے لکھا تھا۔ جس کا قلمی نسخہ انھوں نے مجھ کو بھی بھیجا تھا۔ جو جالندھر مولوی خیر محمد صاحب کے مکتبہ میں انقلاب کے وقت وہیں رہ گیا۔ ہمارے مدرسہ کی سب کتب اور مولوی خیر محمد صاحب کے مدرسہ کی کتب انقلاب میں سب ضائع ہوگئیں۔ معلوم ہوا کہ یک مجلسی طلقات ثلاثہ کی بابت آپ کتاب شائع کرنے کو ہیں؟ تیار ہونے پر پتہ کرنا۔ مولوی حبیب الرحمن اعظمی مدرس مدرسہ مئو بھنجن ناتھ ضلع اعظم گڈھ نے طلقات ثلاثہ کی بابت دو جلد میں کتاب لکھی ہے۔ جس میں علامہ ابن قیمؒ و غیر مقلدین کے جواب دیے ہیں۔ وہ کتاب بھی وطن میں ضائع ہوگئی۔ شاید آپ کی نظر سے گذری ہے یا نہیں۔ ابکار المنن کا جواب ابن نیموی طبع نہیں کراسکے۔ غریب ہونے کے سبب قلمی تین نسخے تیار کیے تھے۔ ایک نسخہ مجھ کو بھیجا اور ایک مبارکپوری صاحب کو اور ایک اپنے پاس رکھا۔ حضرت شیخ الہندؒ فرماتے تھے کہ امام بخاریؒ بڑے ذہین تھے۔ تھوڑا سا ذہن اور ہوتا تو امام ابو حنیفہؒ کے برابر ہوجاتے۔ امام نوویؒ کے متعلق فرماتے تھے کہ ان کا ذہن طویل وعریض تو بہت ہے مگر امام اعظم رح کے عمیق ذہن تک پہنچ نہیں سکتے۔ فقط آپ کے حوالہ جات بقید صفحات لکھنے سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ آپ پیر جھنڈا کے مکتبہ میں لکھ رہے ہیں یا مکتبہ مدرسہ دیوبند میں کیا یہ سب کتب آپ کے پاس ہیں۔ زیادہ کیا عرض کروں۔ والسلام فقط

خادم حبیب اللہ خلف حضرت مفتی رح
خادم طلبہ جامعہ رشیدیہ۔ ۵ شوال ۱۳۷۴ھ

فقیہہ وقت المحقق المدقق

حضرت مولانا مفتی محمد شفیع صاحب رحمہ اللہ تعالیٰ

مفتی اعظم پاکستان

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ وَکَفٰی وَسَلَامٌ عَلٰی عِبَادِہِ الَّذِیْنَ اصْطَفٰی۔

مولانا ابوالزاہد محمد سرفراز خاں صاحب صفدر کی محققانہ تازہ تصنیف "احسن الکلام فی ترک القرأۃ خلف الامام" دیکھنے کا موقع ملا جو اپنے موضوع میں بے نظیر کتاب ہے۔طرز بیان نہایت سلیس ہے اور اس مسئلہ میں غلو و تعدی کرنے والوں کا بہترین جواب ہے۔

مسئلہ قرأۃ فاتحہ خلف الامام ان مسائل میں سے ہے جن میں حضرات صحابہؓ و تابعینؒ کے زمانے سے اختلاف اور بحثیں چلی آتی ہیں۔سینکڑوں کی تعداد میں مستقل کتابیں اور رسالے اس موضوع پر لکھے گئے ہیں اور ایسے اجتہادی اختلافات میں تمام اہل حق کا مسلک یہی ہوتا ہے کہ ان کے جس پہلو کو وہ راجح سمجھتے ہیں اس کو اختیار کر لیتے ہیں اور دوسری جانب پر طعن و تشنیع اور زبان درازی جائز نہیں سمجھتے۔علمی بحث و تحیص کا مقام آتا ہے تو اس میں مناظرانہ بحثیں بھی ملتی ہیں مگر اس نظر سے نہیں کہ ان کا حریف باطل پرست یا گمراہ ہے۔اور اجتہادی اختلافات کا تمام اہل سنت والجماعت کے نزدیک یہی مقام ہے۔اور یہ بھی ظاہر ہے کہ آج کل کی فضا میں جہاں کفر و الحاد کے طوفان نئی نئی شکلوں سے اُٹھ رہے ہیں۔سرے سے حدیث ہی کو ناقابل عمل ٹھہرایا جا رہا ہے۔قرآن میں طرح طرح کی معنوی تحریفات کے لیے ادارے بنائے جا رہے ہیں، کسی خدا ترس ذی علم کے لیے اس کا کوئی موقع نہ تھا کہ ان پرانی بحثوں کو تازہ کر کے ایک نیا فتنہ قرآن و حدیث کے ماننے والوں اہل السنت میں پیدا کرتا۔لیکن افسوس کا مقام ہے کہ بعض ناعاقبت اندیش کم علم لوگ جو اپنے آپ کو فرقہ اہل حدیث سے منسوب کرتے ہیں اور درحقیقت انصاف پسند اہلحدیث بھی ان کے طرز عمل سے متنفر ہیں۔کفر و الحاد کے دنیا میں پھیلنے سے ان پر کوئی اثر نہیں ہوتا۔ان کی فکریں صرف اس میں مبذول رہتی ہیں کہ حنفی مسلمانوں کو گمراہ، بے نماز بلکہ کافر و مشرک قرار دیں۔اسی قسم کے بعض لوگوں نے حال میں کچھ رسائل شائع کر کے مسلمانوں

میں انتشار و اختلاف کا دروازہ کھولا تو ہمارے محترم مولانا ابو الزاہد محمد سرفراز خاں صاحب نے ضرورت محسوس فرما کر زمانہ حال کے طرز اور سلیس اُردو زبان میں اس موضوع پر دو جلدوں میں یہ ضخیم کتاب تصنیف فرما کر مسئلہ کے ہر پہلو کو خوب واضح فرما دیا۔ اس سے پہلے جتنی کتابیں اُردو زبان میں بھی اس مسئلہ کے متعلق نظر سے گذری ہیں اوّل تو ان میں پوری مباحث کے لیے جامع کم ہیں، پھر خالص قدیم علمی زبان میں ہیں آجکل عوام کیلئے ان سے استفادہ مشکل ہے اس کتاب میں فاضل مؤلف نے ماشاء اللہ تعالیٰ بڑی خوبی سے تمام جوانب کی رعایت رکھ کر اس کے حسن کو دوبالا کر دیا ہے۔ جزاہ اللہ تعالیٰ عنا و عن جمیع المسلمین خیر الجزاء و تقبل منہ مسعاہ۔

۲۵ شوال ۱۳۷۴ھ

بندہ محمد شفیع عفا اللہ عنہ

علامہ عصر امام المناظرین استاذ العلماء

حضرت مولانا خیر محمد صاحب رحمہ اللہ تعالیٰ

سابق مہتمم مدرسہ عربیہ خیر المدارس، ملتان، مغربی پاکستان

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

بعد حمد و صلوٰۃ۔ مسئلہ قراءۃ خلف الامام سلف و خلف میں ہمیشہ مختلف فیہا رہا ہے۔ مگر اس کا اختلاف اولیت و غیر اولیت تک محدود رہا۔ مثبتین حضرات نے تارکین قراءۃ پر بطلان صلوٰۃ کا جارحانہ حربہ کبھی استعمال نہیں فرمایا۔ البتہ ہمارے زمانے کے اکثر غیر معتدل اہل حدیث علماء جمہور سلف و خلف کے خلاف بڑی شدومد سے اپنی تحریر و تقریر میں اس دلآزار حربہ کو استعمال کرتے رہے ہیں اور کر رہے ہیں۔ بایں ضرورت جمہور کی طرف سے بھی اصلاحی طور پر تحقیقی و جوابی رسائل کی اشاعت کا سلسلہ بھی شروع ہوا جو معاندین کے لیے مسکت اور منصفین کے لیے قانع تھا۔ مگر بعض رسائل میں جزوی مباحث پر کلام تھا اور بعض میں قدر ضرورت پر اکتفا تھا۔ اس لیے ہنوز ضرورت تھی کہ اس مسئلہ میں ایسی جامع اور مسکت کتاب شائع ہو جو تمام مباحث پر حاوی ہو۔ سو بحمد اللہ تعالیٰ فاضل نوجوان حضرت مولانا محمد سرفراز خاں صاحب سرحدی خطیب جامع مسجد گکھڑ منڈی ضلع

گوجرانوالہ نے کتاب احسن الکلام فی ترک القراءۃ خلف الامام ہر دو جلد تصنیف فرما کر احسن طریق سے اس ضرورت کو پورا فرما دیا۔

امام شافعیؒ کے مذہب کی تحقیق انیق اور رواۃ احادیث کے تراجم و وفیات اور ہر ہر مبحث پر محققانہ و منصفانہ تفصیلی دلائل وبراہین اس کتاب کی خصوصیات ہیں مجھے سفر و علالت کے دوران میں صرف جلد اوّل کے مطالعہ کا حرفاً حرفاً موقع مل سکا۔ بفضلہ تعالیٰ اس مسئلہ کے متعلق فریقین کے بہت سے رسائل دیکھنے کا موقع مجھے بھی میسر آیا ہے اس لیے بلا تکلف عارض ہوں کہ میرے نزدیک یہ کتاب اس مسئلہ کے تمام مباحث پر حاوی اور جامع ہے۔ کوئی مبحث اس میں تشنہ نہیں چھوڑا گیا۔ فریقین کے لیے اس کا مطالعہ نافع ہوگا خصوصاً حنفی المذہب علماء وطلباء کو خود زیر مطالعہ رکھنا اور اس سے استفادہ کرنا ضروری ہے اور اس کی اشاعت میں سعی کرنا مذہبی فریضہ کے مرادف ہے۔ حق تعالیٰ اس کتاب کو مفید عام اور نافع تام بنادے۔ اور حضرت مؤلف علام دام فیضہٗ کو جزاء احسن عطا فرماتے ہوئے اس قسم کے دیگر مسائل پر محققانہ رسائل تصنیف فرمانے کی توفیق مزید شامل حال رکھے۔ آمین ثم آمین۔

احقر خیر محمد عفا اللہ عنہ

مہتمم مدرسہ عربیہ خیر المدارس، ملتان ۹ ذیقعدہ ۱۳۷۴ھ

شیخ کامل رئیس المجاہدین مفسر قرآن کریم

حضرت مولانا احمد علی صاحب رحمہ اللہ تعالیٰ

امیر انجمن خدام الدین شیرانوالہ دروازہ

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم۔ الحمد للہ وکفیٰ وسلام علیٰ عبادہ الذین اصطفیٰ۔ اما بعد! میں نے احسن الکلام فی ترک القراءۃ خلف الامام مصنفہ مولانا ابو الزاہد محمد سرفراز خاں صاحب دامت معالیہم کی دونوں جلدوں کو متعدد مقامات سے بغور پڑھا ہے، مولانا ممدوح نے جس محنت اور عرق ریزی سے اپنے مجوزہ موضوع کو دلائل و براہین سے مدلل فرمایا ہے۔ اگر اس عنوان

کے مخالفین انصاف اور تقویٰ سے کام لیں تو انہیں سوائے سکوت اور سر تسلیم کرنے کے اور کوئی چارۂ کار نہ ہو۔ بارگاہِ الٰہی میں دعا کرتا ہوں کہ اللہ تعالیٰ مولانا موصوف کی اس خدمت کو قبول فرمائے اور مخالفت کرنے والوں کی ہدایت ذریعہ بنائے۔ آمین یا اللہ العالمین۔

العارض احقر الانام احمد علی عفی عنہ لاہوری ۷ شوال ۱۳۷۴ھ

امیر الموحدین سید المناظرین الحافظ الحجۃ

حضرت مولانا قاضی شمس الدین صاحب دام فیضہم

سابق مدرس دار العلوم دیوبند و حال شیخ الحدیث گوجرانوالہ

نحمدہٗ ونصلّی علیٰ رسولہ الکریم۔ اما بعد عرض ہے کہ مجھے محترم دوست مولانا محمد سرفراز خان صاحب کی کتاب لاجواب احسن الکلام فی ترک القراۃ خلف الامام کے مطالعہ کرنے کا اتفاق ہوا جس کے بعد میں کتاب موصوف کی مندرجہ ذیل خوبیوں اور خصوصیات پر مطلع ہوا:

۱۔ استیعاب اطراف میں اپنی نظیر آپ ہی ہے۔ ۲۔ زورِ استدلال میں بے مثال ہے۔

۳۔ جامعیت مضامین میں بحر محیط ہے و معترضین کے اعتراضات کے جوابات میں دیوار فولاد ہے۔

۴۔ مصنف کے تبحرِ علمی کا زندہ ثبوت ہے۔

وبارک اللہ فی عمرہ وعلمہ وشانہ وصانہٗ عمّا شان وحفظہ من آفات الزمان وعصمہ من شر الحاسدین واصحاب العدوان۔

العبد ابو عبید اللہ شمس الدین عفی عنہ ۵ شوال ۱۳۷۴ھ

شیخ طریقت حافظ الحدیث العلامہ حضرت مولانا شیخ القرآن والحدیث محمد عبد اللہ صاحب

درخواستی دام مجدہم مہتمم مدرسہ عربیہ مخزن العلوم خانپور

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم۔ الحمد للہ وحدہٗ والصلوٰۃ والسلام علیٰ من لا نبیّ بعدہٗ وعلیٰ آلہ وصحبہ وجمیع من اقتفیٰ اثرہٗ۔ اما بعد، فقد رأیت رسالۃ احسن الکلام

من تالیف المولوی محمد سرفراز خان صفدر فرأیته موشحا بدلائل وخالیا عن الجدل فجزی الله تعالیٰ المؤلف احسن الجزاء وارجو من الله تعالیٰ ان ینتفع به العوام والخواص وان یترک اهل الجدل الجدل قال النبی صلی الله علیه وسلم ما ضل قوم بعد هدی کانوا علیه الا اوتوا الجدل الخ بکی شجرة الاسلام من علمائه فما اکثرتوا لما رآوا من بکائه. فاکثرهم مستحسن لخطائه مستقبح لصواب غیرهٖ. فایهم المرجو فینا لدینه وایهم الموثوق فینا برأیه هداة الذین ضلوا وقد بانت خسارتهم فباعوا الدین بالدنیا فما ربحت تجارتهم۔

حررہ افقر الی اللہ محمد عبد اللہ درخواستی

مہتمم مدرسۃ العربیہ مخزن العلوم خانپور

اُستاذ الاساتذہ محقق وقت الفقیہ حضرت مولانا شیخ الحدیث محمد عبد الرحمٰن صاحب رحمہ اللہ تعالیٰ

سابق صدر مدرس مظاہر العلوم سہارنپور

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم۔ الحمد للہ وکفی وسلام علی عبادہ الذین اصطفیٰ۔ اما بعد۔

احقر نے رسالہ احسن الکلام مؤلفہ مولانا محمد سرفراز خاں صاحب بعض بعض مقامات سے دیکھا۔ اس مختصر دیکھنے سے معلوم ہوا کہ مؤلف سلمہٗ نے استدلال اور تنقید میں تحقیق اور متانت سے کام لیا ہے۔ طعن و تشنیع سے (جو آج کل کے بعض حضرات نے اختیار کر رکھا ہے) اجتناب کیا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ ایسے مسائل مختلف فیہا میں طعن و تشنیع ایک امر قبیح کا ارتکاب ہے۔ اللہ تعالیٰ مسلمانوں کو اور خصوصاً حضرات علما کو اس سے محفوظ رکھے۔ اللہ تعالیٰ مؤلف سلمہٗ کی اس تالیف کو قبول اور مخلوق خدا کو اس سے مستفید و مستفیض فرمائے۔ اللھم وفقنا لما تحب وترضٰی من القول والعمل والھدی انک علی کل شیء قدیر۔

العبد الاحقر

عبد الرحمٰن غفرلہ

از بھیوڑی ملک مالا کیمبل پور ۶ شوال ۱۳۷۴ھ

شیخ المعقول والمنقول علّامۂ دہر فرید عصر حضرت مولانا شیخ القرآن والحدیث محمد سلطان محمود صاحب رحمہ اللہ تعالیٰ

اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ رَبِّ الْعٰلَمِیْنَ وَالصَّلٰوۃُ وَالسَّلَامُ عَلٰی رَسُوْلِہِ الْکَرِیْمِ وَعَلٰی اٰلِہٖ وَاَصْحَابِہٖ اَجْمَعِیْن

اما بعد۔ میں کتاب احسن الکلام کو بالاستیعاب تو نہیں دیکھ سکا لیکن اس کی دونوں جلدوں کے بعض بعض مقاموں کو نہایت غور و تدبّر کے ساتھ پڑھا ہے اور پڑھنے کے بعد جس نتیجہ پر پہنچا ہوں وہ درج ذیل ہے :

۱۔ مسئلہ فاتحہ خلف الامام میں مؤلف کتاب مولانا محمد سرفراز خاں صاحب کے دو فریضے تھے۔ پہلا فریضہ اپنے دعوے کو دلائل سے واضح کرنا۔ دوسرا فریضہ فریق مخالف کے دلائل کا جواب دینا۔ مؤلف صاحب نے ان دونوں فریضوں کے ادا کرنے میں کمال کر دیا ہے۔ اپنے دعوے کو دلائل عقلیہ و نقلیہ سے روز روشن کی طرح واضح کر دیا ہے۔ فریق مقابل کو ان کے دلائل کے جوابات عقلیہ و نقلیہ کا وہ نظارہ دکھایا ہے جو تا دم زیست ان کی نظروں سے غائب ہو ہی نہیں سکے گا۔

۲۔ طرز بیان نہایت ہی سلیس و عام فہم ہے صرف اُردو خواں بھی اس سے فائدہ اٹھا سکتے ہیں۔

۳۔ اس مسئلہ کے متعلق بہت سے رسائل لکھے گئے ہیں لیکن احسن الکلام جیسا مفصل و جامع دلائل عقلیہ و نقلیہ میری نظر سے کوئی دوسرا رسالہ نہیں گزرا۔

اب میں دعا کرتا ہوں کہ اللہ تعالیٰ مولانا کی اس خدمت کو شرفِ قبولیت عطا فرمائے۔ آمین۔ وآخر دعوانا ان الحمد للہ رب العٰلمین۔

خادم العلماء

سلطان محمود عفی عنہ

ناظم مدرسہ خادم علوم نبوّت (کھٹیالہ شیخاں) گجرات

سابق صدر مدرس مدرسہ عالیہ فتح پوری دہلی

نمونۂ سلف بقیّۃ الخلف حضرت مولانا محمد عبد الحق صاحب دامت فیوضہم

مہتمم مدرسہ حقانیہ اکوڑہ خٹک ضلع پشاور

حضرت العلامہ زید مجدکم۔ السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ۔ گرامی نامہ وصول پایا۔ حسب الحکم احسن الکلام کے بعض مقامات دیکھے گئے۔ افسوس کہ نہایت عدیم الفرصتی کی وجہ سے مکمل کتاب کا مطالعہ نہ ہو سکا۔ تاہم جستہ جستہ مقامات کو بغور دیکھا گیا۔ بزرگوارم ایسی جامع اور مسئلہ کے ہر پہلو پر حاوی کتاب پر تقریظی جملے لکھنا میرے خیال میں سورج کے سامنے چراغ دکھانا ہے لیکن محض تعمیل حکم کی غرض سے چند جملے تحریر کیے جا رہے ہیں۔

بسم اللہ الرحمن الرحیم۔

اَلْحَمْدُ لِمَنْ تَفَرَّدَ بِالْقِدَمِ۔ فَکُلُّ شَیْءٍ مَّا سِوَاہُ مَسْبُوْقٌ بِالْعَدَمِ وَالصَّلٰوۃُ وَالسَّلَامُ عَلٰی سَیِّدِ الْعَرَبِ وَالْعَجَمِ وَعَلٰی آلِہٖ وَاَصْحَابِہٖ مَصَابِیْحِ الظُّلَمِ

امابعد، تمام مشاغل میں افضل و بہترین مشغلہ خلوص نیت کے ساتھ علوم دینیہ اور مسائل شرعیہ کی تحقیق ہے جو افضل العبادات میں محسوب ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اسلاف نے اسی کو اپنی زندگی کا اہم نصب العین اور اپنی تمام سرگرمیوں کا محور قرار دیا تھا۔ اور قیمتی عمریں کو اسی مبارک مشغلہ میں فنا کیا ہے۔ بالخصوص ایسے مسائل شرعیہ میں علمی تحقیقات کو امت کے سامنے پیش کرنا جن میں امت کے نقطہائے نظر سلفاً و خلفاً مختلف رہے ہوں۔ علوم دینیہ کی بہترین خدمت اور امت کے ساتھ انتہائی درجہ کی خیر خواہی ہے جو ہر طرح قابل قدر اور لائق ستائش ہے کہ اسی میں امت کے مختلف الخیال حضرات کے خیالات کی ایک حد تک اصلاح اور طالب عمل کے لیے ایک واضح شاہراہ متعین ہو جانے کے قوی امکانات پائے جاتے ہیں۔ مسئلہ قرات خلف الامام بھی چونکہ ان معرکۃ الآراء مسائل میں سے ایک مسئلہ ہے۔ جس میں ہر زمانے کے اکابرین ملت نے اپنی تحقیقات پیش کی ہیں۔ اور اس پر طبع آزمائی فرمائی ہے۔ جزاہم اللہ تعالیٰ عنا خیر الجزاء لیکن زیادہ تر ہدف ملامت اس مسئلہ میں علماء احناف ہی کو بنایا جا چکا ہے اور بنایا جا رہا ہے کہ صحیح احادیث کے ہوتے ہوئے بھی علماء احناف قرأۃ خلف الامام پر عمل کرنے کے لیے تیار نہیں ہوتے ہیں۔ اور احادیث نبویہ سے کھلی ہوئی مخالفت کر رہے ہیں

حالانکہ مسئلہ کے تحقیقی اور استدلالی پہلو پر اگر انصاف سے نظر ڈالی جائے تو احناف اس مسئلہ میں نہ اپنی رائے میں منفرد ہیں۔ اور نہ شاہراہ اور جادۂ حق سے ان کے قدم ہٹتے ہیں۔ ضرورت تھی کہ اس اہم موضوع پر ایک ایسی علمی تحقیق پیش کی جائے جو نہ صرف توضیح مسئلہ کے لیے مفید ہو۔ بلکہ اظہار حق فی نفسہ الباب کے لیے برہان ساطع کی حیثیت بھی رکھتی ہو۔ خدا تعالیٰ جزاء خیر دے۔ مُصنّف احسن الکلام حضرت العلامہ مولانا ابوالزاہد محمد سرفراز خاں صفدر صاحب کو کہ انہوں نے اس ضرورت کو پورا فرمادیا۔ اور اپنی علمی تحقیقات کو اس مسئلہ کے بارے میں ایک ایسی کتاب کی شکل میں علماء اُمت کے سامنے پیش فرمایا جس کے متعلق یہ کہنا بے جا نہ ہوگا کہ پچھلی تمام ان کتابوں سے یہ کتاب مستغنی کردینے والی ہے، جو اس مسئلہ کے متعلق لکھی گئی ہیں۔ کتاب اپنے حُسنِ ترتیب اور مضامین کی شائستگی اور مکمل تشریح مسئلہ کے علاوہ اور بھی بہت سی خصوصیات کی حامل ہے جن کی وجہ سے کتاب اس قابل ہوگئی ہے کہ اہل انصاف عموماً احناف خصوصاً اس کو اپنے لیے بیش بہا تحفہ اور مبارک ہدیہ سمجھیں۔ سب سے زیادہ قابل ستائش اور لائق تحسین خصوصیت یہ ہے کہ ملّت کے بلند پایہ علماء کرام اور ائمہ عظام کے صحیح اقوال پیش کیے گئے ہیں۔ مدعٰی کے اثبات اور تحقیق انتساب کے لیے مستند نقول سے کام لیا گیا ہے۔ نیز مخالفین حضرات کے اعتراضات کے جوابات ایسے تسلی بخش طریقہ سے دیے گئے ہیں جو انصاف پسند حضرات کے لیے موجب تسکین ہیں۔ امید کہ اہل علم حضرات اس کتاب سے پورا پورا فائدہ اٹھائینگے دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ مصنف مدظلہ کی اس سعی و کاوش کو قبول فرمائیں اور اس کار خیر کے بدلہ میں ان کو اجر جزیل عطا فرمائیں۔ آمین یارب العٰلمین۔ وصلی اللہ تعالیٰ علیٰ خیر خلقہ محمد وّآلہٖ وصحبہٖ اجمعین۔

عبدالحق عفی عنہ دارالعلوم حقانیہ اکوڑہ خٹک ضلع پشاور (سرحد) ۱۱ر شوال ۱۳۷۴ھ

پیر کامل عالم بے مثل حامی سنت ماحیٔ بدعت حضرت مولانا مفتی محمد شفیع صاحب رحمہ اللہ تعالیٰ

سابق مہتمم مدرسہ عربیہ سراج العلوم سرگودہا

الحمد للہ وحدہٗ والصلوٰۃ والسلام علیٰ من لا نبی بعدہٗ۔ امابعد! مذہبی دنیا میں منقولات

اور تعامل کو دیکھا جاتا ہے۔ قرأۃ خلف الامام کے بارے میں قرن اوّل سے لے کر آج تک اہل اسلام کا عدم فرضیت پر جمہور کا تعامل رہا ہے۔ ائمہ مجتہدین میں سے امام شافعیؒ سرّی نمازوں میں (وجوب قرأۃ فاتحہ کے دعوے میں) منفرد ہیں۔ اسی واسطے محققین شوافع اس کے قائل نہیں۔ منقولات میں سے جہری (بلکہ جملہ) صلوات میں واذا قرئ القرآن فاستمعوا لہ وانصتوا نص قطعی ہے۔ اطلاق الفاظ سے قطع نظر خود شان نزول بھی آیت کا بتصریح ائمہ کرامؒ حصہ نماز ہے۔ سرّی نمازوں میں آثار مرفوعہ وموقوفہ کے بناء پر سے عدم قرأۃ مقتدی ثابت ہوتی ہے بلکہ بعض آثار میں وعیدیں بھی موجود ہیں۔ مجوزین حضرات کی جانب سے (صلوٰۃ الا بفاتحۃ الکتاب) پیش کی جاتی ہے جو حضرت جابرؓ اور امام احمدؒ اور سفیانؒ جیسے جلیل القدر حضرات منفرد کے حق میں فرما رہے ہیں۔ باقی جتنی حدیثیں قرأۃ خلف الامام کے متعلق بیان کی جاتی ہیں۔ ان میں بعض صحیح نہیں اور جو صحیح ہیں وہ دلالت علی المقصود پر صریح نہیں۔ بایں ہمہ احناف کی طرف سے جب کبھی اس مسئلہ پر کچھ لکھا گیا ان کی اس میں دفاعی حیثیت ہے۔ اقدام ہمیشہ مجوزین حضرات سے ہوتا رہا وہ بھی اس طعن کیساتھ کہ احناف کی نماز مردود اور باطل ہے وغیرہ وغیرہ۔ بقول مرتا کیا نہ کرتا۔ مجبوراً کچھ نہ کچھ لکھنا پڑا۔ حضرت محقق مولانا محمد سرفراز خاں صفدر زید علمہ نے اس بارے میں ایک مبسوط کتاب احسن الکلام لکھی ہے۔ اس میں بلا مبالغہ محقق مصنف نے بغیر تعصب کے سیر حاصل بحثیں فرمائی ہیں اور اس مسئلہ کے مالہ وما علیہ پر کلام مشبع فرمائی ہے۔ ع

آخر آمد بود فخر الاوّلین!

شاید اس کے بعد کسی راد اور مردود کو قلم اٹھانے کا موقع بھی نہ ملے۔ اللہ تعالیٰ مولانا کے صالحات باقیات میں اس تصنیف لطیف سے اضافہ فرمادے اور عامۃ المسلمین کو متمتع فرمادے آمین ثم آمین۔

احقر ابو سعید محمد شفیع عفی عنہ سرگودہا۔

اسوۂ صالحین شیخ المشائخ حضرت مولانا محمد نصیر الدین صاحب رحمۃ اللہ تعالیٰ غورغشتی

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم۔ الحمد للہ وکفیٰ وسلام علیٰ عبادہ الذین اصطفیٰ۔ میں نے کتاب احسن الکلام کی دونوں جلدوں کا مطالعہ کیا نہایت عمدہ اور مفید کتاب ہے اہل اسلام کو مناسب ہے کہ اس کا

مطالعہ کریں خصوصاً احناف کو (اور ان احناف کو تو علی الخصوص) اس کا مطالعہ ضروری ہے جو کہ اپنے مذہب کے معتبرات سے ناواقف ہیں۔ وصلی اللہ علی رسولہ وخیر خلقہ محمد وعلی آلہ واصحابہ وجمیع امتہ اجمعین۔

مسکین نصیر الدین غور غشتوی

اُستاذ العلماء رأس المحققین

حضرت مولانا محمد شمس الحق صاحب افغانی دامت برکاتہم

ترنگ زئی ضلع پشاور

سابق وزیر معارف شرعیہ ریاست ہائے متحدہ بلوچستان۔ شیخ التفسیر دار العلوم دیوبند و شیخ الحدیث جامعہ اسلامیہ ڈابھیل حالاً شیخ التفسیر جامعہ اسلامیہ بہاول پور

بسم اللہ الرحمن الرحیم نحمدہ ونصلی علی رسولہ الکریم اما بعد! احسن الکلام فی ترک القرأت خلف الامام تصنیف مولانا ابوالزاہد محمد سرفراز خاں صفدر کو میں نے بغور ملاحظہ کیا۔ اس مسئلہ پر قبل ازیں نفیاً و اثباتاً کافی رسائل و اجزاء لکھے گئے ہیں لیکن ان سب میں زیر تبصرہ کتاب کی شان نرالی ہے۔ مصنف علام کو حفاظت اصول و فروع دین و رد غلو غالین و تحریفات مبتدعین میں ایک ممتاز ملکہ حاصل ہے۔ بشکر اللہ تعالیٰ ساعیہ احسن الکلام کے دو حصے ہیں اور بنیادی اجزاء آٹھ ہیں۔ پہلے حصہ میں مذہب حنفی یعنی ممنوعیت فاتحہ خلف الامام کو کتاب اللہ و احادیث رسول اللہ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم و آثار صحابہ و تابعین و تبع تابعین اور دلائل عقلیہ قیاسیہ و اجتہادیہ سے ثابت کیا گیا ہے۔ یہ اس حصے کے بنیادی چار اجزاء ہیں۔ دوسرے حصہ میں مخالفین کی دعویٰ فرضیت فاتحہ کے دلائل قرآنیہ، حدیثیہ، اثریہ اور عقلیہ کا جواب دیا گیا ہے۔ یہ دوسرے حصے کے بنیادی چار اجزاء ہیں۔ گویا پہلے حصے میں مذہب حنفیہ کے مثبت پہلو کا بیان ہے اور دوسرے

حصے میں منفی پہلو کا۔

بہرحال یہ کتاب بلحاظ کثرت مواد، سلاست بیان و ضبط دلائل و ردِّ اشکالات مخالفین اور جامعیت جمیع ابحاث متعلقہ بالموضوع کے لحاظ سے اپنی شان میں بے نظیر ہے۔

میری دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ مصنّف علام کی اس خدمت کو قبول فرمائیں اور مسلمانوں کو اس کتاب سے نفع اٹھانے کی توفیق بخشے۔ آمین

۲۵ محرم ۱۳۸۶ھ شمس الحق افغانی عفا اللہ عنہ

۱۷ مئی ۱۹۶۶ء جامعہ اسلامیہ بہاولپور

محقق جلیل فاضل لبیب حضرت العلامہ مولانا محمد عبد الرشید صاحب نعمانی دامت فیوضہم

باسمہ سبحانہ وبحمدہ امابعد

بگرامی خدمت مخدوم و مکرم حضرت مولانا صفدر صاحب متع اللہ تعالیٰ المسلمین بفیوضہم و برکاتہم۔

السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ۔

بفضلہ تعالیٰ آپ کی گراں قدر تصنیف منیف احسن الکلام کا بالاستیعاب مطالعہ کیا گو مطالعہ سرسری تھا قیلولہ کے وقت تاہم مستفید ہوا۔ دل سے دعا نکلی۔ اللہ تعالیٰ آپ کی مساعی مشکور فرمائے۔ آپ نے بحث کا خوب احاطہ کیا۔ بڑی اچھی کتاب لکھی۔ تحقیق الکلام کے جواب کا قرض جو حنفیوں کے ذمے چلا آتا تھا مع شئے زائد ادا کر دیا۔ جزاک اللہ تعالیٰ عنا و عن سائر المسلمین خیرا۔ گو بعض جگہ بحث کا رنگ غیر مقلدوں (نام نہاد اہلحدیث) کی طرح متعنتانہ ہو گیا، مگر اس سلسلہ میں غالباً آپ کا عذر یہ ہو گا کہ خصم نے اس طرز پر مجبور کیا کہ قدیم زمانے سے خصم نے ظلم کا یہی طریق اپنا رکھا ہے۔ والبادی اظلم۔ والسلام

۲۹ شعبان ۱۳۷۵ھ خاکسار نعمانی از کراچی

نوٹ: حضرت العلام نے چند غلطیوں کی نشاندہی فرمائی جن کی اب اصلاح کر لی گئی ہے۔ (صفدر)

حضرت العلام فقیہ جلیل مولانا مفتی رشید احمد صاحب دامت برکاتہم
مہتمم اشرف المدارس ناظم آباد، کراچی

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ۔ احسن الکلام کی تحقیق عمیق اور جامعیت دیکھ کر بہت مسرت ہوئی۔ اللہ تعالیٰ اس محنت کو قبول فرمائیں۔ فقط والسلام

رشید احمد

از اشرف المدارس ناظم آباد، کراچی
۱۳ ر رمضان ۹۸ ۱۳ ھ

نوٹ: حضرت مفتی صاحب نے بھی چند اغلاط کی اصلاح کا مشورہ دیا۔ جن کی اس طبع میں اصلاح کر دی گئی ہے۔ (صفدر)

دیباچہ طبع سوم

مبسملاً و محمداً و مصلیاً

اما بعد راقم اثیم اللہ تعالیٰ کے بے حد و لاشمار انعامات و احسانات کا شکریہ کس زبان سے ادا کرے کہ اس نے محض اپنے فضل و کرم سے اس گنہگار کو جسمانی اور حسی اور معنوی انعامات سے نوازا اور دین کی خدمت اور تالیفِ کتب کا زرین موقع بھی مرحمت فرمایا اور بفضلہٖ تعالیٰ راقم اثیم کی ہر ہر کتاب اپنی اپنی جگہ مفید ثابت ہوئی۔ فللّٰہ تعالیٰ الحمد زیر نظر کتاب احسن الکلام کو اللہ تعالیٰ کی خصوصی مہربانی سے جو شہرت اور قبولیت حاصل ہوئی۔ وہ پاک و ہند کے جیّد اور نامی گرامی علماء کرام کی عمدہ آرا اور بلند پایہ تصدیقات سے بالکل عیاں ہے اور ان حضرات میں سے بعض وہ بزرگ ہستیاں ہیں کہ علمی اور تحقیقی طور پر وہ بین الاقوامی شہرت و حیثیت رکھتی ہیں اور ان کے علم پر عوام تو کیا بلکہ خواص اور مزید براں خواص الخواص کو بھی کلی اعتماد ہے۔ اس دیباچہ میں ہم نہایت ہی اختصار کے ساتھ چند ضروری باتیں عرض کرتے ہیں۔

۱۔ طبع دوم کے دیباچہ میں ہم نے یہ گذارش کی تھی کہ جو حضرات (ان کا نقطۂ نظر خواہ کچھ ہی ہو) ہماری کوتاہیوں پر ہمیں آگاہ کریں گے تو ہم ان کا شکریہ ادا کریں گے۔ الحمد للہ تعالیٰ کہ ہماری یہ آواز صدا بصحرا ثابت نہیں ہوئی۔ بلکہ خاصی مفید رہی ہے۔ چنانچہ فاضل جلیل محقق العصر حضرت العلامہ مولانا محمد عبد الرشید صاحب نعمانی دامت برکاتہم اور عالم نحریر نمونۂ سلف فقیہ دوراں

حضرت مولانا مفتی رشید احمد صاحب دامت فیوضہم کراچی نے بعض اغلاط کی نشاندہی کی جن کی اب تصحیح کردی گئی ہے اور ہم ان حضرات کے ممنون احسان ہیں۔ اسی طرح ہمارے کرم فرما معترض صاحب نے ترجمان الحدیث میں ایک راوی کی تعیین کے بارے میں غلطی بتائی ہے۔ ہم نے اس کی بھی اصلاح کردی ہے اور وہ بھی ہمارے شکریہ کے مستحق ہیں بایں ہمہ اب بھی یہ دعویٰ نہیں کیا جاسکتا کہ طبع ہٰذا اغلاط سے بالکل مبرّا ہے۔ بھلا انسان کا کام اور وہ بھی راقم اثیم جیسے بے بضاعت اور پُرتقصیر کا کام غلطی سے کیونکر محفوظ رہ سکتا ہے؟ سچ تو یہ ہے کہ ؎

تم تو پھولوں کے طلب گار نظر آتے ہو

میرے دامن میں تو کانٹوں کے سوا کچھ بھی نہیں

مگر اب بھی ہم شرح صدر کے ساتھ کہتے ہیں کہ معقول اغلاط کی نشاندہی پر ہم ہر وقت شکر گزاری کے لیے تیار ہیں۔

۳۔ احسن الکلام کے معرض وجود میں آنے کی وجہ سبب تالیف میں باحوالہ مفصل مذکور ہے کہ فریق ثانی امام کے پیچھے مقتدی کے لیے سورۂ فاتحہ کا پڑھنا فرض قرار دیتا ہے اور نہ پڑھنے والوں کی نماز کو ناقص کالعدم، بیکار اور باطل قرار دیتا ہے۔ اور حنفیوں کو بے نماز اور مفسدین صلوٰۃ کے خطاب سے نوازتا ہے اور حتی کہ احناف کی عورتوں سے بلا طلاق غیر مقلدوں کا نکاح جائز قرار دیتا ہے اور امام کے پیچھے سورۂ فاتحہ نہ پڑھنے والوں کو کافر اور مخلّد فی النّار تک ناروا فتووں سے رگیدتا ہے۔ اور ظاہر امر ہے کہ فرضیت قطعی دلیل کے بغیر تو ہرگز ثابت نہیں ہو سکتی اور اہل علم جانتے ہیں کہ قطعی دلیل نص قرآنی، خبر متواتر اور اجماع ہی ہے ان کے علاوہ اور کوئی دلیل قطعی نہیں مگر یقین جانیے کہ فریق مخالف اپنے اس باطل اور بے بنیاد دعوے پر ایک بھی حوالہ اور دلیل نہیں پیش کر سکا اور نہ تا قیامت پیش کر سکتا ہے اور جو غیر متعلق اور بے جان دلائل انھوں نے پیش کیے ہیں ان کا حال احسن الکلام سے بفضلہ تعالیٰ بخوبی واضح ہو چکا ہے اور کتاب کو پڑھنے والا ہر منصف مزاج اس کو سمجھ سکتا ہے۔

۴۔ ترجمان الحدیث میں عین اس دور میں جبکہ تحریک ختم نبوت اپنے عروج پر تھی مسلمان تو کیا حتّٰی کہ خود کو مسلمان کہلانے والے طبقے بھی مرزائیوں کو کافر قرار دینے کے سلسلے میں

قید و بند کی صعوبتیں برداشت کر رہے تھے اور ہمارے کرم فرما ترجمان الحدیث میں قسط وار احسن الکلام پر برسنے میں اور اس میں کیڑے نکالنے میں مصروف تھے اور تحریک ختم نبوت کے قائد اور روحِ رواں حضرت مولانا سید محمد یوسف صاحب بنوریؒ المتوفی ۱۳۹۷ھ کو ان کے استاذ محترم کی کتاب "نیل الفرقدین" ص ۷۰ کے ایک حوالہ کے پیش نظر بلاوجہ ان الفاظ سے خطاب کیا جا رہا تھا کہ کیا حضرت (مولانا سید محمد انور شاہ صاحب) کاشمیریؒ اور ان کے تلامذہ بالخصوص حضرت بنوری یہ تسلیم کرتے ہیں کہ اہل المدینہ کا مسلک ترکِ رفع الیدین تھا؟ بلفظہٖ (ترجمان الحدیث بابت ماہ نومبر ۱۹۷۴ء، ص ۳۷)۔ ہر سمجھدار آدمی بخوبی سمجھ سکتا ہے کہ ایک خالص اسلامی اور مذہبی تحریک کے قائد کو تحریک کے دور میں ان کے استاذ محترم کا حوالہ نکال کر کوسنا اور مطعون کرنا اور وہ بھی محض ایک فرعی مسئلہ میں کیا معنی رکھتا ہے؟ لیکن اس متعصبانہ کارروائی سے اُن کی شخصیت اور عظمت میں کیا فرق پڑا؟ آخر انھیں کی مبارک قیادت میں یہ مشکل ترین مسئلہ حل ہوا اور قانونی طور پر مرزائیوں کے ہر دو فرقے (قادیانی اور لاہوری) کافر قرار دیے گئے۔ ولنعم ماقیل ؎

جنھیں حقیر سمجھ کر بجھا دیا تم نے
وہی چراغ جلیں گے تو روشنی ہوگی

۴۔ جمہور اہلِ اسلام اور ان میں سے علی الخصوص احناف کثر اللہ تعالیٰ جماعتھم اس مسئلہ کو اختلافی مسئلہ سمجھتے ہیں اور صرف یہ فرماتے ہیں کہ امام کے پیچھے مقتدی کے لیے سورۂ فاتحہ سمیت کسی بھی قسم کی قرأت ممنوع اور مکروہ ہے۔ نہ تو وہ اس مسئلہ میں کسی کی تکفیر کرتے ہیں اور نہ کسی کی منکوحہ بیوی چھیننے کا فتویٰ دیتے ہیں اور نہ کسی کو اس مسئلہ کی وجہ سے فی النار والسقر تک پہنچاتے ہیں مگر فریق ثانی کو لفظ مکروہ بھی خاصا بد چبھتا ہے۔ چنانچہ ترجمان الحدیث ص ۱۸ بابت ماہ جولائی ۱۹۷۲ء میں مشہور مؤرخ اسلام اور حنفی عالم کا شکوہ ان الفاظ سے کیا گیا ہے کہ مولانا شبلی نعمانی سے سبھی اہل علم واقف ہیں کسی دور میں ان کا مشہور قول تھا کہ آدمی عیسائی ہو سکتا ہے، غیر مقلد نہیں ہو سکتا یہ بزرگ فاتحہ خلف الامام کو مکروہ خیال کرتے تھے ...... الخ بقول ناقل حضرت مولانا شبلی مرحوم کا مشہور قول آخر بلاوجہ تو ہرگز نہیں ہو سکتا۔ یقیناً اس کی تہ میں کچھ ہوگا اور انھوں نے ضرور کچھ محسوس کیا ہوگا۔ نیز اگر واقعی احناف کی نماز کالعدم، بے کار اور باطل ہے اور وہ بھی محض اس لیے کہ وہ امام کے پیچھے سورۂ

فاتحہ نہیں پڑھتے اوتو اس کے قائل ہیں۔ اور مبتدی طالب علم بھی یہ جانتے ہیں کہ جو حکم امام کے پیچھے سورہ فاتحہ نہ پڑھنے کا ہے وہی حکم نہ پڑھنے کا حکم دینے کا ہے اور ہر محقق حنفی یہی کچھ کہتا ہے تو غیر مقلدین حضرات اپنے شیخ الکل مولانا سید نذیر حسین صاحبؒ (المتوفی ۱۳۲۰ھ) کی زندگی بھر کی جمعہ کی نمازوں کے بارے میں کیا فتویٰ صادر فرماتے ہیں کہ آیا ان کی نمازیں ادا ہوئیں یا نہیں؟ کیونکہ لکھنے والوں نے ان کے حالات میں لکھا ہے کہ "بلکہ مدت العمر شاہی مسجد (دہلی) کے حنفی امام کے پیچھے نماز جمعہ ادا فرماتے رہے۔" (مقدمہ معیار الحق صڤ) اس سے یہ بات بالکل روشن اور عیاں ہو گئی کہ غیر مقلدین حضرات کے شیخ الکل نہ صرف یہ کہ حنفی امام کو مسلمان سمجھتے بلکہ ان کو اپنے سے بہتر قرار دے کر مدت العمر ان کی اقتدا میں جمعہ کی نماز ادا کرتے رہے۔ لہٰذا غیر مقلدین حضرات کو اس ناروا غلو اور بے بنیاد دعوے سے فوراً رجوع کر لینا چاہیے کہ امام کے پیچھے سورۂ فاتحہ کی قرأت نہ کرنے والے اور اسی طرح اس کو ضروری نہ قرار دینے والے مسلمان نہیں یا کم از کم بہتر مسلمان نہیں یا بے نماز اور مفسدین صلوٰۃ ہیں کیونکہ اس باطل نظریہ سے احناف کا تو کچھ نہیں بگڑتا۔ البتہ خود ان کے اکابر اس کی زد میں آتے ہیں اور اس باطل دعوے سے خود ان کے بزرگوں کا دامن علم و تقویٰ مطعون و مجروح ہوتا ہے۔ غور کرنا خود ان کا کام ہے: ؎

اگر کچھ کم ہے جو کچھ ہو چکا بیدار کرنے کو
تو کل افسانۂ عبرت کے عنوان اور بھی ہوں گے

۵۔ ترجمان الحدیث میں کئی قسطوں میں احسن الکلام پر اکثر وہی اعتراضات قدرے تشریح کے ساتھ بدمزہ سے بدمزہ کر کے پیش کیے گئے ہیں جن کے اصولی طور پر مدلل جوابات با حوالہ احسن الکلام میں مذکور ہیں۔ مثلاً یہ کہ حضرت قتادہؒ مدلس ہیں۔ حضرت ابو اسحٰقؒ مختلط اور مدلس ہیں۔ محدث ابو الزبیرؒ مدلس ہیں۔ حضرت امام ابو حنیفہؒ اور امام محمدؒ ضعیف ہیں۔ محمد بن اسحٰقؒ اور نافعؒ اور علاء بن عبد الرحمٰنؒ ثقہ ہیں وغیرہ وغیرہ۔ علاوہ ازیں یہ کہ فلاں راوی کے بارے میں احسن الکلام میں تضعیف یا توثیق کا فلاں جملہ نقل نہیں کیا گیا، اور فلاں عبارت کا معنیٰ غلط کیا ہے اور فلاں موقوف حدیث کو مرفوع بنا دیا ہے اور فلاں حوالے میں کتر بیونت کی ہے اور فلاں عبارت کا صحیح مطلب مؤلف احسن الکلام اپنی جہالت

کی وجہ سے نہیں سمجھ سکا اور فلاں جگہ دجل وتلبیس سے کام لیا ہے اور فلاں عبارت کو سیاق وسباق سے الگ کر کے مطلب لیا ہے اور فلاں مقام پر راوی کو ضعیف قرار دیا ہے لیکن اسی راوی کو متابعت اور شاہد میں پیش کر کے اس سے احتجاج کیا ہے اور ہمارے فلاں ثقہ راوی کو ضعیف کہہ دیا ہے اور فلاں راوی کو اپنے ہاتھ کے کرتب سے ثقہ کر دکھایا ہے وغیرہ وغیرہ۔ لیکن بحمد اللہ تعالیٰ اہلِ علم اور سمجھدار حضرات احسن الکلام کے مضبوط اور ٹھوس دلائل اور روشن حوالوں اور اس کی عمدہ ترتیب اور سلاست سے بخوبی واقف ہیں اور ان تمام رکیک شبہات کا رد اس میں مذکور ہے۔ ہمیں مزید کچھ کہنے اور لکھنے کی مطلقاً کوئی ضرورت نہیں ہے۔ دنیا جانتی ہے کہ محض کیڑے نکالنے اور اعتراضات کرنے سے کیا حاصل ہوتا ہے؟ پنڈت دیانند سرسوتی نے اپنی کتاب ستیارتھ پرکاش کے چودھویں باب میں بسم اللہ سے لے کر والناس تک قرآن کریم پر اعتراضات کیے ہیں۔ (معاذ اللہ تعالیٰ) لیکن اس سے کلام اللہ تعالیٰ کی صداقت وعظمت پر کیا زد پڑی یا پڑ سکتی ہے؟ منکرین حدیث مجموعی طور پر کتب حدیث پر پرستے رہتے ہیں مگر اس سے دینی کتب کے اس عظیم ذخیرہ میں کیا کمی اور نقص پیدا ہو سکتا ہے؟ خود غیر مقلد حضرات فقہ حنفی کی مشہور اور متداول کتابوں پر اعتراضات کرتے رہتے ہیں۔ ان کی کتاب حقیقۃ الفقہ اور نتائج التقلید وغیرہ میں اس کا واضح اور وافر ثبوت موجود ہے۔ اور فتاویٰ عالمگیری پر ان کی طرف سے جو اعتراضات کیے گئے ہیں وہ تو قریب کے حلقوں میں پان فروشوں اور انڈے فروشوں تک پہنچ چکے ہیں لیکن اس سے ان کو بجز اپنے دل ماؤف کی بھڑاس نکالنے کے اور کیا فائدہ؟ اللہ تعالیٰ کے فضل وکرم سے یہ تمام کتابیں بھی موجود ہیں اور ان میں مذکور ہزارہا مسائل بھی موجود ہیں جن سے اللہ تعالیٰ کی مخلوق برابر فائدہ اٹھا رہی ہے۔ اسی طرح اگر بعض مہربانوں کی طرف سے احسن الکلام پر بھی کچھ لایعنی سوالات ہو گئے ہیں یا ہوتے ہیں تو اس سے اس کے صحیح دعاوی اور قوی دلائل اور محکم براہین میں کیا فرق پڑتا ہے۔ اہل خرد جانتے ہیں کہ نری لفاظی سے کچھ حاصل نہیں ہوتا؎

الفاظ کے پیچوں میں الجھتے نہیں دانا
غوّاص کو مطلب ہے صدف سے کہ گہر سے

۶۔ ہماری دانست میں ترجمان الحدیث میں احسن الکلام پر کیے گئے جملہ اعتراضات میں

صرف دو باتیں علمی طور پر قابل توجہ ہیں۔ ممکن ہے بعض اہل علم کو ان سے مغالطہ پیدا ہو، اس لیے ضروری معلوم ہوتا ہے کہ ان کو یہاں نقل کر کے قدرے تفصیل سے ان کے جوابات عرض کر دیے جائیں تاکہ کسی کو غلط فہمی پیدا نہ ہو اور صحیح بات بھی سامنے آجائے۔

اوّل: ہم نے احسن الکلام میں اسرائیل عن ابی اسحاقؒ کی ایک سند سے استدلال کیا تھا۔ اس پر گرفت کرتے ہوئے ترجمان الحدیث ماہ جون ۱۹۷۴ء میں صفحہ ۷ تا ۲۸ ، اس مشہور محدث اور صحیحین کے مرکزی راوی امام ابو اسحٰقؒ کے اختلاط اور ان کی تدلیس پر خاصی لاحاصل بحث کی ہے جس کی چند اہم اور مرکزی باتیں یہ ہیں:

(۱) حافظ ابن حجرؒ لکھتے ہیں کہ بخاری میں ان سے بجز ان کے اصحاب قدماء کے اور کوئی روایت میں نے نہیں دیکھی۔ (ہدی الساری جلد ۲ ص ۱۹۹)

(۲) ابو اسحاقؒ مدلس تھے اور ان کا عنعنہ صحت حدیث کے منافی ہے اور آخر عمر میں اختلاط اور تغیر کے عارضہ میں مبتلا ہو گئے تھے۔ (ترجمان مذکور ص ۲۸)

(۳) زہیرؒ کی روایت عن ابی اسحاقؒ امام بخاریؒ اور محدث مبارکپوریؒ کے نزدیک صحیح ہے۔ کیونکہ امام ابو داؤدؒ زہیرؒ عن ابی اسحاقؒ کو اسرائیلؒ عن ابی اسحٰقؒ سے بدرجہا بہتر قرار دیتے ہیں اور بقول امام احمدؒ اسرائیلؒ نے ابو اسحاقؒ سے اختلاط کے بعد بھی سنا ہے (ص ۲۷) لہٰذا ان کو اُن پر کوئی مزیت حاصل نہیں ہے۔

الجواب: یہ جو کچھ کہا گیا ہے دفع الوقتی کے سوا کچھ نہیں ترتیب وار جوابات ملاحظہ کیجیے:

(۱) خود حافظ ابن حجر رحؒ ہی امام ابو زرعہ رح امام ابو حاتم رح اور امام احمد رح کے حوالہ سے نقل کرتے ہیں کہ زہیر رح نے ابو اسحاق رح سے آخر عمر میں ابو اسحاق رح کے مختلط ہونے کے بعد سماعت کی ہے۔ (ملاحظہ ہو تہذیب التہذیب ج ۳ ص ۳۵۲)

اور زہیر رح کی ابو اسحٰق رح سے بخاری ج ۱ ص ۲۷ و ج ۱ ص ۱۳۹ و ج ۱ ص ۲۲۷ وغیرہ میں روایتیں موجود ہیں اور حافظ ابن حجر رح زکریا بن ابی زائدہ رح کے بارے میں امام احمد رح اور محدث عجلی رح کے حوالہ سے نقل کرتے ہیں کہ انھوں نے ابو اسحاق رح سے آخر عمر میں سماعت کی ہے۔

(دیکھیے تہذیب التہذیب ج ۳ ص ۳۳۰)

اور زکریا رح بن ابی زائدہ رح کی ابو اسحاق رح سے روایت بخاری ج ۱ ص ۴۲۴ وغیرہ میں موجود ہے۔

اور خود معترض مذکور امام ابوداؤد رح کی تحقیق کے پیش نظر اسرائیل رح کی ابواسحاق رح سے روایت ان کے اختلاط کے بعد بھی تسلیم کرتے ہیں اور بخاری ج ا ص ۲۵۶ و ۵۰۵ و ۵۱۲ وغیرہ میں اسرائیل رح عن ابی اسحاق رح کی سند سے کئی روایات موجود ہیں پھر یہ کیسے تسلیم کیا جائے کہ بخاری میں ابواسحٰق رح کے ان قدیم شاگردوں کی روایات ہی مذکور ہیں جنھوں نے ان سے اختلاط سے قبل سماعت کی ہے۔ بس یہی کہا جائے گا کہ ابواسحٰق رح ایسے مختلط ہوئے ہی نہیں کہ ثقاہت سے گر جائیں اور اسرائیل رح کی روایت ابواسحاق رح سے اثبت اور ارجح ہے۔ ہاں بعض کے نزدیک اگر آخر عمر میں ان کے حافظہ میں کچھ تغیر ہوا ہے تو اس دور میں زہیر رح نے ان سے سماعت کی ہے۔

(۲) اگرچہ امام بخاری رح اور مبارکپوری صاحب رح کے نزدیک زہیر عن ابی اسحٰق رح کی روایت راجح ہے مگر امام ابوزرعہ رح، امام ابوحاتم رح، امام احمد رح اور امام ترمذی رح وغیرہم حضرات کی تحقیق کے لحاظ سے زہیر کی ابواسحاق رح سے روایت کمزور ہے اور ابوداؤد رح کے علاوہ باقی تقریباً تمام حضرات اسرائیل رح عن ابی اسحاق رح کو اصح اور ارجح قرار دیتے ہیں اور اس کے متعلق احسن الکلام میں واضح حوالے موجود ہیں وہیں ملاحظہ کرلیں۔ یہاں ان کے ذکر کی ضرورت نہیں ہے۔

(۳) اسرائیل رح کے بارے میں امام احمد رح کی یہ رائے کہ انھوں نے ابواسحاق رح سے آخر عمر میں سماعت کی منفرد رائے ہے اور باقی حضرات اسرائیل رح عن ابی اسحاق رح کو اثبت کہتے ہیں لہٰذا جمہور کے نزدیک اسرائیل عن ابی اسحٰق رح کی سند بلاشبہ صحیح اور راجح ہے۔

دوم - احسن الکلام میں ابوالزبیر رح عن جابر رض کی ایک سند سے احتجاج کیا گیا تھا اس پر کلام کرتے ہوئے ترجمان الحدیث ماہ فروری ۱۹۷۴ء ص ۷ تا ۲۹ و ماہ مارچ ۱۹۷۴ء ص ۳۸ تا ۴۸ میں مشہور محدث ابوالزبیر رح (محمد بن مسلم رح بن تدرس رح) کے عنعنہ پر طویل اور ناکام بحث کی ہے جس کے مرکزی نکات یہ ہیں:

(۱) ابوالزبیر مدلس تھے اور محدثین کرام رح کی خاصی جماعت نے ان کے مدلس ہونے کا ذکر کیا ہے اور بعض محدثین رح کے حوالے بھی انھوں نے ذکر کیے ہیں۔

(۲) ابوالزبیر رح کی لیث رح کے طریق اور سند سے عنعنہ والی روایت تو صحیح اور قابل قبول ہے مگر اس کے علاوہ ابوالزبیر رح کی کوئی روایت جو عنعنہ سے ہو قابل قبول نہیں ہے اس پر

بھی چند حوالے انھوں نے نقل کیے ہیں۔

(۴) ابوالزبیرؒ کی جن روایات میں تحدیث ہے وہ تو قابل قبول ہیں اور جن روایات میں ان کا عنعنہ ہے اور وہ لیث کے طریق سے بھی نہیں تو چونکہ دیگر حضرات صحابہ کرام رضؓ سے بھی وہ روایات مروی ہیں۔ بنا بریں اگر ابوالزبیرؒ کے سماع کی تصریح ان مخصوص الفاظ سے نہ بھی ملے تب بھی صحت حدیث پر کوئی حرف نہیں آتا۔ (محصلہ)

الجواب۔ معترض صاحب نے یہ جو کچھ بھی کہا ہے ان کو سود مند نہیں ہے۔

اوّل تو اس لیے کہ بلاشبہ ابوالزبیرؒ کا نام مدلسین کی فہرست میں موجود ہے۔ اس کا کسی کو انکار نہیں جتنے حوالے اس سلسلہ میں معترض صاحب نے نقل کیے ہیں اگر ہم چاہیں تو بحمداللہ تعالیٰ ان سے دوگنے حوالے مزید نقل کر سکتے ہیں لیکن ابوالزبیرؒ اُن مدلسین میں شامل ہیں جن کی تدلیس مضر نہیں اور احسن الکلام میں توجیہ النظر کے حوالہ سے اس کی بحث موجود ہے جس کی قدرے تفصیل یہ ہے کہ علامہ جزائریؒ نے حافظ ابن حزمؒ کے حوالہ سے مدلسین کی دو قسمیں بیان کی ہیں۔ پہلی قسم ان مدلسین کی ہے جو حافظ و عادل ہوں اور ان کے بارے میں وہ تفصیل کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ

وسواء قال اخبرنا فلان او قال عن فلان او قال فلان عن فلان کل ذلک واجب قبولہ مالم یتیقن انہ اورد حدیثاً بعینہ ایراد غیر مسند فان ایقنا ذلک ترکنا ذلک الحدیث وحدہ فقط و اخذنا سائر روایاتہ .... وھذا النوع منھم کان جلۃ اصحاب الحدیث وائمۃ المسلمین کالحسن البصری وابی اسحاق السبیعی وقتادہ بن دعامۃ وعمرو بن دینار وسلیمان الاعمش وابی

اور برابر ہے کہ وہ مدلس اخبرنا فلاں کہے یا عن فلاں کہے یا قال فلاں عن فلاں کہے ان سب صورتوں میں اس کی روایت واجب القبول ہے جب تک کہ یہ یقین نہ کر لیا جائے کہ اس نے کوئی حدیث غیر مسند پیش کی ہے اور جب ہمیں اس کا یقین ہو جائے کہ اس نے فلاں حدیث مسند بیان نہیں کی تو ہم صرف وہی روایت اس کی ترک کریں گے اور باقی اس کی تمام روایات لیں گے .... اور اس قسم میں بڑے بڑے محدثین اور ائمہ المسلمین شامل ہیں جیسے حسن بصریؒ ابواسحاق السبیعیؒ قتادہؒ بن دعامہ، عمرو بن دینارؒ، سلیمانؒ الاعمشؒ

الزبير وسفيان الثوري وسفيان بن عيينة اهـ (كتاب الاحكام في اصول الاحكام ج ۲ ص ۱۴۱ لابن حزمؒ وتوجيه النظر ص ۲۵۱ للجزائريؒ)

ابو الزبیرؒ سفیان ثوریؒ اور سفیان بن عیینہؒ .... الخ
(کتاب الاحکام فی اصول الاحکام جلد ۲ لابن حزمؒ و توجیہ النظر ص ۲۵۱ للجزائریؒ)

۱ اہل علم جانتے ہیں کہ بیشتر صحیح احادیث کے روات یہی حضرات ہیں اس عبارت سے یہ ضابطہ معلوم ہوا کہ ان مذکور حضرات کی جن میں ابو الزبیر رح بھی شامل ہیں معنعن احادیث مطلقاً قابل قبول ہیں اور ان کی صحت میں کوئی کلام نہیں اور امام بخاریؒ اور امام مسلمؒ وغیرہ چوٹی کے محدثین نے ان حضرات کی معنعن روایات سے استدلال کیا ہے چنانچہ حافظ ابن القیمؒ فرماتے ہیں کہ

وفي الصحيح قطعة من الاحتجاج بعنعنة المدلس كابي الزبير عن جابرؓ وسفيانؒ عن عمرو بن دينار ولنظائر كثيرة لذالك - (تهذيب سنن ابي داؤد، جلد ۷ ص ۹۸)

صحیح (یعنی بخاری و مسلم) میں مدلس کے عنعنہ والی روایتوں سے احتجاج کا ایک کافی حصہ موجود ہے جیسے ابو الزبیرؒ عن جابر رض اور سفیانؒ عن عمرو بن دینارؒ اور اس جیسی بکثرت نظیریں۔
(تہذیب سنن ابی داؤد، جلد ۷ ص ۹۸)

امام بخاریؒ نے ابو الزبیرؒ کی مقرون بعطاءؒ کی روایت سے استدلال کیا ہے۔ جلد ۱ ص ۲۹۱ اور جلد ۱ ص ۹۸ و جلد ۱ ص ۲۲۳ میں ابو الزبیرؒ عن جابر رض کو متابعات میں پیش کیا ہے اور اسی طرح جلد ۱ ص ۱۷۶ میں بھی لیکن کتابت کی غلطی سے ابو الزبیرؒ کی جگہ ابو زید لکھا گیا ہے۔
(دیکھیے مصری نسخہ بخاری مع شرح فتح الباری جلد ۳ ص ۱۳۴ و عمدۃ القاری جلد ۸ ص ۱۲)

بلکہ امام بخاری رح نے ابو الزبیر رح عن جابر رض کی سند سے احتجاج بھی کیا ہے۔ اہل علم بخوبی جانتے ہیں کہ امام بخاری رح فقہی مسائل بیان کرنے کے لیے باب ترجمہ اور عنوان قائم کرتے ہیں اور علماء کا مشہور مقولہ ہے فقہ البخاری فی الابواب والتراجم۔ پھر اس دعوے کے اثبات کے لیے کبھی تو وہ مسند اور مرفوع روایت پیش کرتے ہیں اور کبھی معلق روایت اور کوئی اثر نقل کرتے ہیں اور اس طریقے سے وہ اپنے دعوے کو مدلل اور مبرہن کرتے ہیں۔ امام بخاریؒ

نے جلد ۱ ص ۲۲۴ میں یہ عنوان قائم کیا ہے۔ باب الاهلال من البطحاء وغيرها للمكي ..... الخ یعنی مکہ مکرمہ میں رہنے والے کا بطحاء وغیرہا سے احرام باندھنے کا باب۔ (منی کے قریب ایک جگہ ہے جس میں بکثرت سنگریزے ہیں اس کو بطحاء، ابطح، محصب، حصبہ اور خیف بنی کنانہ بھی کہتے ہیں۔ اس وقت اس کے قریب کلیہ عبدالعزیز یعنی عبدالعزیز کالج ہے) اور امام بخاری رح نے اس دعوے کے اثبات کے لئے وقال ابو الزبير عن جابر رض أهللنا من البطحاء کے اثر سے احتجاج کیا ہے باب میں پیش کردہ اس دعوی کے اثبات کے لیے اور کوئی دلیل انھوں نے پیش نہیں کی انصاف شرط ہے کہ احتجاج اور استدلال اور کیا ہوتا ہے؟ اگر امام بخاری رح نے اس دعوے کے اثبات کے لیے کوئی اور مسند اور مرفوع حدیث پیش کی ہوتی اور ساتھ یہ اثر بھی پیش کیا ہوتا تو ہم سمجھتے کہ ابو الزبیر رح عن جابر رض کا اثر صرف متابعت میں پیش ہوا ہے مگر ایسا نہیں ہے اور حافظ ابن حجر رح فرماتے ہیں کہ

واحتج الجمهور بحديث ابي الزبير عن جابر رض وهو الذي علقه المصنف في هذا الباب .... الخ

جمہور نے ابو الزبیر رح عن جابر رض کی روایت سے احتجاج کیا ہے اور وہ یہی حدیث ہے جس کو امام بخاری رح نے اس باب میں معلق بیان کیا ہے۔

(فتح الباری جلد ۳ ص ۲۵۲)

الغرض جمہور محدثین کرام رح ابو الزبیر عن جابر رض کی سند سے احتجاج کرتے اور اس کو بالکل صحیح سمجھتے ہیں۔

دوم اس لیے کہ اگر صرف لیث رح عن ابی الزبیر رح کی سند سے ہی ابو الزبیر کی معنعن حدیثیں صحیح ہیں اور باقی نہیں تو پھر مسلم شریف کی ان تمام روایات کی صحت کا انکار کر دیا جائے، جو ابو الزبیر رح سے من غیر طریق لیث رح معنعن مروی ہیں۔ مثلاً جلد ۱ ص ۱۲۲ و ص ۱۴۴ و ص ۲۶۲ و ص ۴۷۶ و جلد ۲ ص ۳ و ص ۷ و ص ۱۱ و ۲۷ و ۳۲ و ۳۸ و ۹۵ و ۱۶۶ و ۱۹۷ و ۲۰۲ وغیرہ وغیرہ۔ پھر صحیح مسلم کو صحیح کہنے کی رٹ ترک کر دی جائے اور اگر یہ روایات صحیح ہیں اور یقیناً جمہور امت کے نزدیک صحیح ہیں تو ہماری پیش کردہ روایت عن ابی الزبیر رح عن جابر رض بھی یقیناً صحیح ہے۔

سوم اس لیے کہ امام مسلم رح نے صحیح مسلم میں ابو الزبیر رح عن جابر رض کی جن روایات سے

احتجاج کیا ہے کیا ان میں سے ہر ہر روایت کسی اور صحابی سے بھی امام مسلمؒ نے روایت کی ہے تاکہ ان کی معنعن روایات پر حرف نہ آئے ؟ اگر معترض صاحب صحیح مسلم میں سے انھیں مضامین کی روایات جو ابو الزبیرؒ عن جابرؓ کے طریق سے مروی ہیں دیگر حضرات صحابہ کرامؓ کی روایات سے باحوالہ بتادیں تو ہم علمی اور تحقیقی طور پر ان کے احسان مند ہوں گے۔ دو چار روایتوں میں ایسا کر دکھانا کوئی کمال نہ ہوگا۔ ہر ہر روایت اور مضمون میں یہ مطلوب ہے اور اگر وہ ایسا نہ کر سکے اور یقین جانیے کہ وہ ہرگز ایسا نہیں کر سکیں گے تو اس سے لازماً یہی سمجھا جاتے گا کہ مسلم شریف کی بے شما احادیثیں ان کے اس غلط نظریہ سے غیر صحیح قرار پائیں گی اور صحیحین کی صحت کے بارے میں ان حضرات کا دعویٰ محض زبانی جمع خرچ تصور ہوگا جیسا کہ مخفی نہیں۔

اس کے علاوہ اور بھی سطحی قسم کے اعتراضات اور بزعم خود جوابات ترجمان الحدیث میں موجود اور مذکور ہیں لیکن ہمارا دیانتاً یہ نظریہ ہے کہ ان سے کسی اہل علم اور صاحب بصیرت آدمی کو کوئی شبہ پیدا نہیں ہو سکتا۔ لہٰذا ہم ان کو نقل کر کے قارئین کرام کے اذہان کو بلاوجہ اور بے ضرورت پریشان نہیں کرنا چاہتے۔ وصلی اللّٰہ تعالیٰ علیٰ خیر خلقہ محمد وعلیٰ اٰلہٖ واصحابہٖ واتباعہٖ الیٰ یوم الدین وبارك وسلم۔

احقر النّاس

ابو الزاہد محمد سرفراز

۱۶ صفر ۱۴۰۰ھ
۵ جنوری ۱۹۸۰ء

دیباچہ طبع دوم

اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ وَکَفٰی وَسَلَامٌ عَلٰی عِبَادِہِ الَّذِیْنَ اصْطَفٰی

(۱) بعض غیر مقلدین حضرات نے یہ بے جان دعویٰ کیا تھا کہ جس شخص نے ہر رکعت میں امام کے پیچھے سورۂ فاتحہ نہ پڑھی تو اس کی نماز بے کار، باطل اور کالعدم ہے اور اس پر تمام دنیا کے احناف کو کھلا چیلنج بھی کیا تھا۔ راقم اثیم نے ان کے اس غلو کے رد میں ٹھوس دلائل کے ساتھ دو جلدوں میں بلسوط کتاب احسن الکلام لکھی جس کو نہ صرف یہ کہ عام تعلیم یافتہ حضرات ہی نے پسند کیا بلکہ ہند و پاک کے متبحر اور نامور علماء کرام نے اس کی بیحد تعریف کی اور اپنی زریں اور قیمتی آرا اور تصدیقات سے راقم کی عزت افزائی کی اور کتاب کی اغلاط کی طرف بھی توجہ دلائی جو بمقتضائے بشریت کچھ تو راقم سے اور کچھ کتابت کی وجہ سے اور بعض کاپیوں اور پروفوں کی کماحقہٗ تصحیح نہ ہو سکنے کی وجہ سے باقی رہ گئی تھیں جن حضرات نے نمایاں غلطیوں کی نشاندہی کی ان میں علی الخصوص شمس العلماء رئیس المحققین حضرت مولانا حبیب الرحمٰن صاحب اعظمی دامت برکاتہم اور حضرت مولانا ابو عبید اللہ غلام سرور صاحب دام مجدہم (چنن ضلع گجرات) خصوصیت سے قابل ذکر ہیں اور راقم تہ دل سے ان کا شکریہ ادا کرتا ہے۔

(۲) جہاں ان حضرات نے اس کتاب کے مضبوط دلائل اور براہین اور حسن ترتیب کی شاندار تحسین کی وہاں غیر مقلدین حضرات نے اس پر ضرورت سے زیادہ غم و غصہ کا اظہار فرمایا چنانچہ

ان کی جماعت کے چوٹی کے مدرس عالم اور سابق شیخ الحدیث جامعہ سلفیہ فیصل آباد نے ایک مستقل کتاب خیر الکلام تحریر فرمائی جس میں جوابات کا بیشتر حصہ محض سینہ زاد جوابات اور صدری نسخوں پر مشتمل ہے۔ اس کا یہ احتمال ہو سکتا ہے۔ یہ ممکن ہو سکتا ہے۔ اس کا مطلب یوں لینا چاہیے۔ اور اس کا مطلب یوں بھی لیا جا سکتا ہے وغیرہ وغیرہ۔ ظاہر بات ہے کہ احسن الکلام کے ٹھوس اور معنی خیز حوالوں کا جواب محض احتمالات اور سینہ زاد باتوں سے نہیں ہو سکتا یہاں ٹھوس حوالہ جات درکار تھے اور یہی ان کے بس کا روگ نہ تھا اور روایات کے بارے میں وہ ساری کتاب میں ایک ہی ضابطہ سے کام لیتے رہے ہیں وہ یہ کہ جرح مفسر کو بھی جرح مبہم گردان کر اور ایک دو حوالے راوی کی توثیق کے نقل کر کے یہ فیصلہ صادر فرماتے رہے ہیں کہ لہٰذا جو جرح مؤلف احسن الکلام نے کی ہے وہ مبہم ہے اور توثیق کے بعد اس کا کوئی اعتبار نہیں اور کہیں تعدد طرق کا سہارا لیکر حدیث کو حسن بنا ڈالا ہے۔ خیر ہم نے بقدر وسعت طبع ثانی میں اس کا خوب جائزہ لیا ہے۔

مؤلف خیر الکلام نے احسن الکلام کو لوگوں کی نظروں سے گرانے کیلئے اور اپنی جماعت کے جذباتی حضرات کے جذبات کو ابھارنے کیلئے آخر میں سترہ عدد مناقشات بھی درج فرمائے ہیں جن کا ذکر کتاب میں پہلے بھی وہ اپنے خیال میں مناسب مقامات پر کر چکے ہیں اور یہ چیز ان کے پیش نظر رہی ہے کہ احسن الکلام کی اغلاط ان کے حواریوں کے ذہن میں النقش فی الحجر ہو جائیں اور اس کتاب سے اور اس کے مصنف سے بدظنی پیدا ہو جائے۔ مثلاً ایک جگہ یہ تھا کہ حضرت امام عبداللہ بن المبارکؒ حضرت امام بخاریؒ کے استاذ الاستاذ تھے۔ الاستاذ کا لفظ کتابت سے چھوٹ گیا تو اس پر مناقشہ کھڑا کر لیا گیا کہ اس مؤلف کو یہ بھی معلوم نہیں کہ امام ابن مبارکؒ، امام بخاریؒ کے استاذ نہیں ہیں۔ اور ایک مقام پر فَقَرَأَ اِمَامَۃً کا جملہ غلطی سے رہ گیا تو اس پر بھی خوب مصالحہ لگا کر مناقشہ کی عمارت کھڑی کر دی گئی اور ایک جگہ قتادہؒ کا نام سند سے چھوٹ گیا تو اس کو کئی مقامات پر انھوں نے اُجاگر کیا اور یہ لکھا کہ چونکہ یہ تیسرے درجہ کے مدلس تھے۔ تب ان کو گرا دیا گیا ہے۔ حالانکہ راقم نے خود احسن الکلام میں باحوالہ یہ لکھا ہے کہ قتادہؒ کی تدلیس سرے سے مضر ہی نہیں تو پھر اس کو حذف کرنے کا راقم کو کیا فائدہ تھا؟ وعلیٰ ہذا القیاس۔ اکثر مناقشے اسی نہج کے ہیں اور جہاں بعض عبارتیں مجمل اور مختصر تھیں۔

اب ان کی تشریح کر دی گئی ہے اور جہاں اغلاط معقول نظر آئیں۔ ان کی اصلاح کر لی گئی ہے۔ ہم نے جب ان کی کتاب میں اسی نہج کے بلکہ ان سے سنگین تر منافقات کا تتبع کیا تو تقریباً ساٹھ سے زیادہ نظر آئے۔ اگر ضرورت پڑی اور ہم مجبور کر دیے گئے تو الگ ان کو شایع کر دیا جائے گا۔ انشاء اللہ تعالیٰ۔ ورنہ علمی اور تحقیقی میدان میں ہم اس طعنہ بازی کو پسند نہیں کرتے اور نہ اس کا اثر اچھا رہتا ہے۔ ان منافقات کو انھوں نے فہرست کتاب میں غلط بیانیاں، تحریفات اور مغالطات وغیرہ سے تعبیر کر کے اپنے دل کی خُوب بھڑاس نکالی ہے۔ سچ ہے کُلُّ اِنَاءٍ یَتَرَشَّحُ بِمَا فِیْہِ۔

(۳) غیر مقلدین حضرات نے جب تجربی یہ محسوس کر لیا کہ خیر الکلام تو احسن الکلام کا معقول جواب نہیں اور علماء تو کیا جذباتی مزاج جماعتی کارکن بھی اس سے مطمئن نہیں ہو سکتے تو ایک صاحب نے الاعتصام میں قسط وار احسن الکلام کی تردید شروع کر دی جس میں انھوں نے علمی اور تحقیقی سطح سے بہت ہی نیچے اتر کر محض تعصبِ مذہبی کا مظاہرہ کیا ہے اور اس میں بیشتر وہی باتیں دہرائی ہیں جو پہلے حضرات مسئلہ خلف الامام کے سلسلہ میں لکھ اور کہہ چکے ہیں۔ ہاں البتہ یہ سب کچھ انھوں نے صرف جذبات اور تعلّی کی صورت میں ادا کیا ہے ان کی قابلِ جواب باتوں کا ذکر ہم نے کتاب میں کر دیا ہے۔ باقی لایعنی باتوں کی طرف مطلقاً توجہ نہیں کی، البتہ انھوں نے الاعتصام اور مغالطات احسن الکلام میں جو باتیں خوب کھل کر چیلنج بازی کی شکل میں کہی ہیں وہ اصولاً و اختصاراً یہ ہیں:

(۱) مؤلف احسن الکلام نے حضرت شاہ ولی اللہ صاحبؒ کی عبارت سے دھوکا دیا ہے ...... الخ

اس کا جواب اور حضرت شاہ صاحبؒ کی پوری عبارت ہم نے طبع دوم میں ذکر کر دی ہے اور واضح کیا ہے کہ غلطی کس کی ہے؟

(۲) کہ مؤلف احسن الکلام نے محمد بن خازمؒ کی امام ابن حبانؒ سے یہ توثیق تو نقل کر دی ہے کہ وہ ثقہ اور متقن تھا مگر آخر کا یہ قول نقل نہیں کیا کہ وہ خبیث مرجئی تھا اور یہ بد دیانتی ہے۔ (محصلہ)

مگر یہ بیچارے اصول حدیث سے بالکل کورے ہیں۔ محمد بن خازمؒ بخاری اور مسلم کے مرکزی راوی ہیں اور اصول حدیث کے رو سے ثقہ راوی کا خارجی یا جہمی معتزلی یا مرجئی وغیرہ ہونا اس کی ثقاہت پر قطعاً اثر انداز نہیں ہوتا اور صحیحین میں ایسے راوی بکثرت موجود ہیں۔ تدریب الراوی اور ہدایت السائل میں ان کی کچھ نشاندہی کی گئی ہے اور خود مؤلف خیر الکلام ص ۲۹۰ میں لکھتے ہیں "کہ ارجاء وغیرہ بدعات کے اعتراضات سے ثقہ ہونے میں خلل پیدا نہیں ہوتا ...... الخ"

یہ قاعدہ ہمارے پیش نظر تھا اور اس لیے ہم نے یہ جملہ نقل نہیں کیا اور خود جناب قاضی مقبول احمد صاحب کا یہ عالم ہے (اور حیرت ہے کہ الاعتصام کے ذمہ داروں نے بھی اپنی ذمہ داری محسوس نہیں کی) کہ عبدالرحمٰنؒ بن محمد بن زیادؒ جو صحاح ستہ کے راوی ہیں ان سے متعلق لکھا ہے کہ انتہا درجہ کے ضعیف ہیں۔ (الاعتصام ۲۸ ستمبر ۱۹۶۲ء ص ۸ کالم ۳)

(۳) کہ مؤلف احسن الکلام نے راویوں کے بارے میں توثیق و تضعیف نقل کرنے میں خیانت اور بددیانتی سے کام لیا ہے۔ مثلاً فلاں ضعیف راوی کے بارے میں فلاں امام نے کہا ہے کہ وہ ثقہ ہے مگر اس قول کو وہ نقل نہیں کرتا اور فلاں ثقہ راوی کو فلاں امام نے ضعیف یا وہمی وغیرہ کہا ہے۔ اس کو بھی وہ پی گیا ہے۔ (محصلہ)

اور الاعتصام میں ان صاحب کا بیشتر مضمون اسی عبارت پر کھڑا ہے اور خوب جذباتی رنگ میں صفحہ صفحہ پر اس کو نمایاں کیا گیا ہے مگر صد افسوس ہے کہ احسن الکلام کی اس عبارت کا ذکر تک نہیں کیا۔ حالانکہ ان کا اخلاقی فریضہ تھا کہ وہ اس کا حوالہ دیتے۔ چنانچہ عبارت یوں ہے: "ہم نے بعض مقامات پر ثقہ راویوں سے متعلق ثقاہت اور عدالت کے اقوال تو نقل کر دیے ہیں، لیکن اگر بعض ائمہؒ کا کوئی جرحی کلمہ ملا ہے تو وہ نظر انداز کر دیا ہے۔ اسی طرح اگر کسی ضعیف اور کمزور راوی کے بارے میں کسی امام کا کوئی توثیق کا جملہ ملا ہے تو اس کو بھی در خور اعتنا نہیں سمجھا کیونکہ فن رجال سے ادنیٰ واقفیت رکھنے والے حضرات بھی بخوبی اس امر سے واقف ہیں کہ ایسا کوئی بھی ثقہ جس پر جرح کا کوئی کلمہ منقول نہ ہو یا ایسا ضعیف جس کو کسی ایک شخص نے بھی ثقہ نہ کہا ہو کبریت احمر کے مترادف ہے۔ حضرات

صحابہ کرام رض کا رتبہ کس سے مخفی ہے ؟ اور الصحابۃ کلھم عدول کے جملہ سے کون اہل علم ناواقف ہے ؟ مگر خوارج و روافض کا نظریہ بھی ان کے بارے میں پوشیدہ نہیں ہے۔ بایں ہمہ ، ہم نے توثیق و تضعیف میں جمہور ائمہ جرح و تعدیل اور اکثر ائمہ حدیث کا ساتھ اور دامن نہیں چھوڑا مشہور ہے کہ : ع زبان خلق کو نقارہ خدا سمجھو انتہی بلفظہٖ

(احسن الکلام جلد اول ، طبع اول ص)

یہ عبارت بار بار پڑھیے اور داد دیجیے قاضی مقبول احمد صاحب کے واویلا کی کہ مؤلف احسن الکلام نے روات کے بارے میں بددیانتی کی ہے فلاں راوی کے بارے میں فلاں کا قول ترک کر دیا ہے اور فلاں راوی کے بارے میں فلاں امام کا حوالہ چھوڑ دیا ہے اور الاعتصام میں قاضی صاحب کا زیادہ زور اسی پر صرف ہوا ہے۔ ان کو یہ توحق تھا کہ اس قاعدہ کو دلائل سے غلط ثابت کرتے لیکن اس واضح عبارت کو پیش نظر رکھتے ہوتے مؤلف احسن الکلام کو بددیانت ثابت کرنا خالص تعصب کا مظاہرہ یا اپنے ناخواندہ حواریوں کو خوش کرنے کا ایک مذموم ڈھنگ ہے۔ بحمد اللہ تعالیٰ مؤلف احسن الکلام کو کاملین سے خوشہ چینی کا موقع ملا ہے اور اصول و ضوابط کو سمجھنے کی اللہ تعالیٰ نے اس کو اہلیت مرحمت فرمائی ہے۔

(۴) عبداللہ بن نافع بن عمیار کے متعلق جو توثیق کے الفاظ مؤلف احسن الکلام نے نقل کیے ہیں اس میں دھوکہ اور بددیانتی سے کام لیا ہے۔ (محصلہ)

الجواب۔ اصل بات یہ ہے کہ تہذیب التہذیب جلد ۶ ص ۵۰ اور ۵۱ میں (نمبر ۹۷ اور ۹۸) دو راوی ہیں۔ ایک کا نام عبداللہ بن نافع بن عمیاؒ ہے اور دوسرے کا نام عبداللہ بن نافع بن ابی نافع الصائغ المخزومیؒ ہے۔ غلطی سے ثانی کا ترجمہ پہلے کے ترجمہ میں نقل ہوگیا ہے۔ اور اب طبع دوم میں اس کو بالکل کاٹ دیا گیا ہے۔ ایسے ہم نام راویوں کے بارے میں بڑے بڑے اکابر محدثینؒ سے غلطیاں چلی آرہی ہیں۔ نہ تو ان کو کسی نے دعوت مبارزت دی اور نہ بددیانت کہا ہے اوروں کی بات ہی چھوڑیے خود مؤلف خیر الکلام بعض مقامات میں اس غلطی کا شکار ہوئے ہیں۔ چنانچہ وہ خیر الکلام ص ۴۷، ۴۸ میں لکھتے ہیں : کہ دوسرا راوی اس میں علی بن احمد الحمامی مقری ہے۔ علامہ ذہبیؒ لکھتے ہیں ابن ابی الفوارسؒ کہتے

ہیں ضعیف جداً سخت ضعیف ہے۔"

(میزان جلد ۲، ص ۲۱۷، لسان المیزان جلد ۴، ص ۱۹۴)

لیکن یہ مؤلف خیر الکلام کی غلطی اور نرا وہم ہے۔ کیونکہ ابن ابی الفوارسؒ نے جس کی تضعیف کی ہے وہ علی بن احمد بن ابی القیس المقرئی الرفاعیؒ ہے جس کی وفات ۳۵۲ھ میں ہوتی ہے۔ دیکھیے: (لسان المیزان جلد ۴، ص ۱۹۴) اور ہماری پیش کردہ سند میں علی بن احمد بن عمر بن حفص ابوالحسن المقرئی المعروف بابن الحمامیؒ ہیں جن کی وفات ۴۱۷ھ میں ہوئی ہے۔

(ملاحظہ ہو۔ بغدادی جلد ۱۱، ص ۳۳۰)

الغرض ہم نام راویوں کے بارے میں ایسے اوہام کا پیش آجانا کوئی مستبعد بات نہیں ہے اور نہ کسی دیانت دار عالم نے آج تک ایسے امور میں کسی کو چیلنج کیا ہے۔

(۵) بایں ہمہ ہم نے الاعتصام میں پیش کیے گئے اعتراضات میں سے جو قابل جواب تھے ان کی قدرے وضاحت کر دی ہے اور ہم ان غیر مقلدین حضرات کے ممنون ہیں کہ انھوں نے احسن الکلام پر ناقدانہ نگاہ ڈالی گو ان کا نظریہ ان کا مذہبی تعصب ہے" تاہم وہ شکریہ کے مستحق ہیں۔

(۶) مؤلف خیر الکلام سے ہم بجا توقع رکھ سکتے تھے کہ وہ اپنی جماعت کے مدرس عالم اور شیخ الحدیث ہیں کہ وہ اپنی جماعت کے ان غالی لوگوں کو ناصحانہ طور پر ترک غلو کا کوئی مفید مشورہ دے دیتے اور چند سطریں اس پر بھی تحریر فرما دیتے کہ جو لوگ ترک قرأۃ خلف الامام کی صورت میں لوگوں کی نمازوں کو باطل، بے کار اور کالعدم کہتے ہیں وہ اعتدال کی راہ اختیار کریں۔ اختلافی مسائل میں یہ طریقہ پسندیدہ نہیں ہے لیکن یقین جانیے کہ انھوں نے صحیح طور پر آج کل کی عدالتی وکالت کا حق ادا کر دیا ہے کہ ہر طرح سے اپنے مؤکل کو خواہ وہ جھوٹا ہی کیوں نہ ہو سچا ثابت کیا جائے یہ الگ بات ہے کہ عدالت اس کی رائے سے متفق نہ ہو اور اس کو مجرم گردان کر قرار واقعی سزا دے۔ اپنی جماعت کے تمام عیبوں پر پردہ ڈال کر اس کو برحق قرار دینے پر بلا وجہ ایڑی چوٹی کا زور لگانا کوئی مستحسن امر نہیں ہے۔ ان سے تو خیر الکلام کے صاحب مقدمہ ہی قدرے اچھے رہے کہ انھوں نے صد۳ میں کچھ اشارہ

کیا ہے اگرچہ اپنی جماعت کے چیلنج کو مدافعت کہ کر حق پوشی کی گئی ہے۔ وہ لکھتے ہیں کہ "مجھے اعتراف ہے کہ اس سلسلے میں ہمارے بھائیوں کے حملوں کی مدافعت میں رد کے طور پر جماعت اہل حدیث کے ایک قلیل طبقے کا ایسا رویہ ضرور رہا کیا جو غیر معتدل ہونے کے علاوہ مسلک اہل حدیث کے شایان شان نہ تھا۔ لیکن میں سمجھتا ہوں کہ غلو کے مقابلہ میں غلو ایک نفسیاتی حقیقت ہے۔" اھ

اگر تو کسی حنفی نے تمام روئے زمین کے غیر مقلدین حضرات کو ایسا کوئی چیلنج کیا ہے کہ جو شخص امام کے پیچھے سورۃ فاتحہ پڑھتا ہے۔ اس کی نماز باطل ہے، بیکار ہے، کالعدم ہے۔ تو وہ بلاشک اس کو مدافعت سے تعبیر کر سکتے ہیں اور اگر ایسا نہیں کیا تو یہ خالص جماعتی بلی بھگت ہی ہے کہ سیدھی سادھی بات میں تاویل کا پیوند لگا کر اس کو حق ثابت کیا جائے۔ نَعُوْذُ بِاللّٰهِ مِنْ شُرُوْرِ اَنْفُسِنَا۔

(۷) اگرچہ اپنی دانست کے مطابق ہم نے اب کتاب کو اغلاط سے پاک کر دیا ہے۔ تاہم ان حضرات کا (خواہ ان کا نقطۂ نظر کچھ ہی ہو) شکریہ ادا کریں گے جو ہمیں ہماری کوتاہیوں سے آگاہ کریں گے۔ اور ہمیں معقول اغلاط کی درستی میں کوئی تامل نہ ہوگا۔ انشاء اللہ العزیز۔ وَصَلَّی اللّٰهُ تَعَالٰی عَلٰی خَیْرِ خَلْقِهٖ مُحَمَّدٍ وَّعَلٰی اٰلِهٖ وَاَصْحَابِهٖ اَجْمَعِیْنَ ط

ابوالزاہد
۲۶ شوال ۱۳۸۴ھ
۲۸ فروری ۱۹۶۵ء

دیباچہ طبع اوّل

کتاب احسن الکلام جلد اوّل و دوم کی تالیف و ترتیب میں گو بڑی محنت اور کوشش سے کام لیا گیا تھا مگر اس کا وہم و گمان بھی نہ تھا کہ اس کو صفِ اول کے محقق اور جید علماءِ کرام بھی بے حد پسند فرمائیں گے جیسا کہ تصدیقات اور تقاریظ سے بھی ظاہر ہے۔ یہ محض اللہ تعالیٰ کا فضل و کرم ہے کہ اُس نے اس حقیر سے یہ خدمت لی ہے۔ ورنہ من آنم کہ من دانم۔

میں اپنی اس کتاب کا حضرت الاستاد المحقق، المدقق، الفقیہ، المحدث شیخ المعقول، والمنقول مولانا عبدالقدیر صاحب کیمبل پوری دامت برکاتہم (حال اوکاڑہ) کے نام گرامی سے انتساب کرتا ہوں کیونکہ اس حقیر کا دینی کتب کے ساتھ تھوڑا بہت تعلق حضرت موصوف کی خالص توجہ اور نوازش کا رہین منت ہے اور اکثر بڑی اور دقیق کتابیں راقم نے حضرت سے ہی پڑھی ہیں۔ دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ حضرت کو تادیر سلامت رکھے اور دین کی خدمت کا مزید موقع دے۔ ع "ویرحم اللّٰہ عبداً قال اٰمینا۔"

احقر

ابو الزاہد

۱۸ر ذوالقعدہ ۱۳۷۴ھ

۹ر جولائی ۱۹۵۵ء

سخن ہائے گفتنی

بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ ط

اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ رَبِّ الْعٰلَمِیْنَ۔ وَالصَّلٰوۃُ وَالسَّلَامُ عَلٰی خَاتَمِ النَّبِیِّیْنَ

وَعَلٰی اٰلِہٖ وَاَصْحَابِہٖ اَجْمَعِیْنَ ط

عالمِ انسانی میں ہر چیز کا وجود اسباب و علل اور محرکات و دواعی کے وجود پر موقوف ہے۔ جب تک علتِ وجود اپنے تمام لوازم کے ساتھ معرضِ وجود میں نہ آجائے کسی چیز کا عالم وجود میں آنا ممکن نہیں یہ ایک عقلی اور فطری قاعدہ ہے۔ اور انسانی افعال و اغراض کا ناگزیر محور جس کے گرد انسان کے سب افعال چکر لگاتے اور گھومتے رہتے ہیں۔

سببِ تالیف

علمی اور عملی، فنی اور تحقیقی لحاظ سے قرأۃ الفاتحہ خلف الامام کا مسئلہ اپنے مثبت اور منفی پہلو کے اعتبار سے قرنِ اوّل سے تاہنوز بحث و تمحیص اور تطبیق و ترجیح کا محتاج رہا ہے۔ حضرات ائمہ دین و محققین علماء نے مختلف زمانوں اور متعدد زبانوں میں اس مسئلہ پر خامہ فرسائی کی ہے۔ محرم اور مبیح پہلو اور راجح و مرجوح گوشہ کی تلاش اور جستجو میں انھوں نے انتہائی کوشش اور کاوش کی ہے۔ اور سینکڑوں کتابیں اور رسالے اس پر لکھے گئے ہیں۔ مگر اس خاص شکل و صورت

اور ترتیب کے ساتھ نہایت سہل اور آسان طریقہ پر اس کتاب کو پیش کرنے کا بڑا سبب فریقِ ثانی کی حد سے زیادہ تجاوز اور گرم گفتاری ہے۔ اس کا یہ دعویٰ ہے۔ کہ جو شخص امام کے پیچھے سورۂ فاتحہ نہیں پڑھتا۔ اس کی نماز بالکل نہیں ہوتی۔ اور بعض نے تو یہاں تک غلو سے کام لیا کہ جملہ احناف کو[1] بے نماز اور مفسدین صلوٰۃ کے خطاب سے نوازا ہے۔ اور بعض نے قسم اور حلف[2] اٹھا کر کہا کہ حنفیوں کی نماز نہیں ہوتی۔ اور ہم نے ان میں سے بعض کو سلسلۂ تقریر و درس حدیث اور نجی مجلسوں میں منطقِ یونان سے بھی استعانت کرتے دیکھا ہے اور یوں صغریٰ و کبریٰ جوڑ کر نتیجہ[3] نکالتے ہوئے سنا ہے کہ جو شخص امام کے پیچھے سورۂ فاتحہ نہیں پڑھتا۔ قرأت سورۂ فاتحہ نہیں کرتا۔ اس کی نماز نہیں ہوتی اور من ترك الصّلوٰة متعمّدًا فقد كفر کہ جس شخص نے دیدہ و دانستہ نماز ترک کی وہ کافر ہو گیا۔ اور نتیجہ یہ نکلا کہ امام کے پیچھے سورۂ فاتحہ ترک کرنے والا کافر ہے۔ (گو بعض بڑے محتاط اور منصف مزاج حضرات کے نزدیک عملی طور پر ہی وہ کافر ہو گیا۔ مگر ہے ضرور) اور ہمارے زمانے کے ایک صاحب نے جو اپنی جماعت

---

[1] حضرة مولانا رشید احمد صاحب گنگوہیؒ (المتوفی ۱۳۲۳ھ) تحریر فرماتے ہیں کہ اس زمانے میں بعض مدعیانِ عمل بالحدیث نے یہ غوغا مچایا کہ حنفیہ مفسدین صلوٰۃ اور بے نماز ہیں۔" (ہدایت المعتدی ص ۲)

[2] حضرت مولانا سید مرتضیٰ حسن صاحبؒ (المتوفی ۱۳۷۱ھ) لکھتے ہیں: "کہ بالخصوص قسم کھا کر کہے کہ حنفیوں کی نماز نہیں ہوتی۔ ان کی بیبیوں سے غیر مقلدین کو بلا طلاق نکاح جائز ہے"۔۔۔الخ (تنقیح التنقید ص ۳۵)

[3] ایک غیر مقلد مگر منصف مزاج عالم ایسے ہی ایک غالی اور بے باک مفتی کا حوالہ دیتے ہوئے یوں رقم طراز ہیں: "اول تحریر ایک ہمارے ہی علماء اہلِ حدیث کی پرچہ تنظیم میں طبع ہوئی تھی جس میں مولانا موصوف نے مدرک رکوع کے اعتداد والوں کو مخلّد فی النّار تک کا حکم صادر فرما دیا تھا نتیجہ اس طرح نکالا تھا کہ مدرک رکوع سے فاتحہ مفقود ہوتی ہے۔ لہٰذا اس کی نماز نہیں۔ جس کی نماز نہیں وہ بے نماز ہے اور بے نماز کافر ہے اور وہ مخلّد فی النّار ہے"۔ (بلفظہٖ اتمام الرکوع فی ادراک الرکوع ص ۱ طبع کردہ منیجر رسالہ صحیفہ اہلحدیث صدر دہلی) مؤلف خیر الکلام نے بزعم خود چند دلائل پیش کیے ہیں پھر لکھتے ہیں: "لہٰذا فاتحہ ہر نمازی پر خواہ امام ہو یا منفرد یا مقتدی فرض ہوگی"۔ (ص ۱۲ ۵) ۔ مگر یہ نہیں بتایا کہ اس فرض کے منکر اور تارک پر فتویٰ کیا صادر ہوگا؟ آیا وہ مسلمان رہے گا یا نامسلم؟ (العیاذ باللہ) کیونکہ اصول کے لحاظ سے فرض کا منکر مسلمان نہیں رہنا چاہیے۔ دیکھیے کیا فتویٰ صادر ہوتا ہے؟

کے روحِ رواں اور چوٹی کے مناظر و مبلغ سمجھے جاتے ہیں۔ پنجاب کے ایک مشہور قصبہ میں دورانِ تقریر یہ ارشاد فرمایا کہ جو شخص امام کے پیچھے سورۃ فاتحہ نہیں پڑھتا اس کی نماز ہرگز نہیں ہوتی۔ آؤ ہمارے ساتھ اس مسئلہ پر مباہلہ کر لو۔"

آپ اس کتاب میں پوری تفصیل سے پڑھیں گے کہ امام کے پیچھے سورۃ فاتحہ ترک کرنے کے قائل کون کون ہیں؟ نہ معلوم مباہلہ کس کس سے ہوگا؟ اور تاسف بالائے تاسف یہ کہ مباہلہ بھی فَنَجْعَلْ لَعْنَةَ اللهِ عَلَى الْكَاذِبِيْنَ ط کے الفاظ کے ساتھ اور لطف یہ ہے کہ وہ صاحب نہ بیوی رکھتے ہیں اور نہ بچے۔ گویا آیت مباہلہ میں نَدْعُ اَبْنَاءَنَا وَ اَبْنَاءَكُمْ وَنِسَاءَنَا وَ نِسَاءَكُمْ کا ان کے نزدیک کوئی مفہوم ہی نہیں —— اور اب کراچی سے ایک کتابچہ کو شائع ہوا ہے جس کا نام ہے "فصل الخطاب فی قرأۃ فاتحۃ الکتاب" جو کتب خانہ اہلحدیث، ۱۱۹۔ نیو کلاتھ مارکیٹ، کراچی (پاکستان) کی طرف سے شائع ہوا ہے، جس میں انھوں نے انتہائی فراخ دلی کے ساتھ تمام روئے زمین کے احناف کو انعامی چیلنج کیا ہے۔ اور روئے زمین کی چیدہ چیدہ ہستیوں کو نام بہ نام للکارا ہے۔ اصل الفاظ میں ان کا اعلان یہ ہے:

انعامی چیلنج: تمام دنیا کے حنفی حضرات کو کھلا اور انعامی چیلنج دیا جاتا ہے۔ جیسا کہ ہم اہلِ حدیث امام کے پیچھے سورۃ فاتحہ کے پڑھنے کا خاص لفظ حدیث مرفوع صریح صحیح حسن سے (بحوالہ کتب صحاح ستہ وما وافق بہا) دکھاتے ہیں۔ ایسا ہی وہ امام کے پیچھے سورۃ فاتحہ کے نہ پڑھنے کا خاص لفظ حدیث مرفوع صریح صحیح حسن سے (بحوالہ کتب صحاح ستہ وما وافق بہا) میدانِ مناظرہ میں دکھادیں تو ہم ان کو اس حق محنت، داد ہمت، تمغۂ صداقت کے صلہ میں فاتحہ کے ہر حرف کے بدلے میں مبلغ ایک سو روپے دینے کو تیار ہیں۔ (انشاء اللہ تعالیٰ)

کیا ہے روئے زمین پر کوئی زندہ دل حنفی جو میدانِ مناظرہ میں آئے اور امام کے پیچھے خاص لفظ فاتحہ کے نہ پڑھنے کا دکھا کر مبلغ پانچ سو روپیہ انعام حاصل کرے (دیدہ باید) اس انعامی چیلنج کو شائع کیے ہوئے آج تیرہ سال سے زائد کا عرصہ ہو چکا ہے اور تقریباً یہ چیلنج بارہ ہزار کی تعداد میں طبع کرا کر علماء اور جہلاء کے ہاتھوں میں پہنچا چکے ہیں۔ دیوبند، ڈابھیل، ہندوستان پاکستان کے احناف کے بڑے بڑے مدارس میں بھی پہنچ چکا ہے۔ احناف کے مقتدر علماء

مفتی کفایت اللہ صاحبؒ (المتوفی ۱۳ ربیع الثانی ۱۳۷۲ھ مطابق یکم جنوری ۱۹۵۳ء) مولانا حسین احمد صاحب مدنیؒ (المتوفی ۱۲ جمادی الاولی ۱۳۷۷ھ) اور مولانا شبیر احمد عثمانی رح (المتوفی ۲۱ صفر ۱۳۶۹ھ مطابق ۱۳ دسمبر ۱۹۴۹ء) کی خدمت میں پیش ہو چکا ہے۔ لیکن اس وقت تک کسی حنفی کو یہ جرأت نہ ہوئی اور نہ ہی آئندہ ہوگی۔ انشاء اللہ تعالیٰ۔ کہ وہ دنیا کی کسی کتاب سے ایک حدیث ہی بموجب شرائط مندرجہ درہ چیلنج پیش کر کے انعام حاصل کرنے کے علاوہ مذہب حنفی پر احسان کرتا۔ لیکن کرتا کہاں سے۔ جب کہ اس طرح کی ایک حدیث کسی دنیا کی اسلامی کتب میں موجود نہ ہو اور یقیناً نہ ہو۔ (انتہی بلفظہ فصل الخطاب ص ۳ ج ۲)

اس شاہی اور رفراخدلانہ انعامی چیلنج کے بعد اسی کتابچہ کے آخری صفحہ پر یہ اعلان ان الفاظ سے دہرایا گیا ہے۔

تمام دنیا کے علماء احناف کو کھلا چیلنج

ہم تمام علماء احناف ہند، سندھ، پنجاب، بنگال، خراسان، عربستان، چین، جاپان، افریقہ، امریکہ، آسٹریلیا، یورپ، مصر، عراق وغیرہ کو بذریعہ چیلنج و اشتہار ہذا کے دعوت دیتے ہیں کہ ان مسائل مندرجہ ذیل کو کسی آیت یا حدیث صحیح مرفوع متصل سے اور وہ حدیث جس مسئلہ کے ثبوت میں پیش کریں۔ نص صریح ہو صحاح وما وافق بہا سے ثابت فرماویں تو ہم ان کو اس حق محنت، داد ہمت، تمغہ صداقت کے صلہ میں ہر آیت اور حدیث کے بدلہ میں پچیس روپے انعام دیں گے۔ انشاء اللہ العزیز۔

(۱) آں حضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا مقتدیوں کو سورۃ فاتحہ کے پڑھنے سے منع کرنا۔

(پھر نو عدد مسائل اور لکھ کر اور تلك عشرة كاملة تحریر فرما کر بحث کو اس اعلان پر ختم کیا ہے)

هَلْ مِنْ مُبَارِزٍ يُبَارِزُنِي۔ یعنی کیا ہے روئے زمین پر کوئی زندہ دل اور خوش نصیب حنفی بھائی جو میدان میں کود ے اور ہم سے سینکڑوں روپے کا انعام حاصل کرے۔ (دیدہ باید)

(انتہی بلفظہ فصل الخطاب ص ۸)

اور اب فصل الخطاب ص ۱ کے جدید ایڈیشن میں یہ دعویٰ کیا گیا ہے کہ جو شخص امام کے پیچھے ہر رکعت میں سورۃ فاتحہ نہ پڑھے اس کی نماز ناقص ہے، کالعدم ہے، بیکار ہے اور باطل ہے۔ (بلفظہ)

ان تمام اقتباسات کو پیش نظر رکھ کر پڑھے لکھے آدمی کو ضرور یہ شبہ پیدا ہو جاتا ہے کہ شاید امام کے پیچھے سورۂ فاتحہ نہ پڑھنے والے کافر اور گمراہ ہیں اور نماز پڑھتے ہوئے بھی وہ بے نماز اور اقل درجہ یہ ہے کہ وہ بلا دلیل ہیں حتیٰ کہ ان کے ساتھ لعنۃ اللہ علی الکاذبین کے الفاظ سے مُباہلہ کرنا بھی کارِ ثواب اور جائز ہے اور عوام پر اشتہاری رُعب ڈالنے کے لیے انعامی چیلنج بھی دیا جا سکتا ہے۔ چنانچہ راقم الحروف کو بھی خالی الذہن ہو کر محض اپنی قلبی تسکین اور سنتِ رسول صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کی پیروی کرنے کی خاطر سینکڑوں کتابوں کے ہزاروں اوراق الٹنے پڑے ہیں اور صدہا رسائل اور کتابچوں کی ورق گردانی کرنا پڑی ہے تاکہ دلائل کی صحت اور سقم کا موازنہ کر کے نجاتِ اخروی کی فکر کی جائے۔ لیکن میں نے فریقِ ثانی کے جملہ دعووں کو بالکل بے حقیقت یا مبالغہ آمیز اور انتہائی غلو پر مبنی پایا ہے۔ گو مسئلہ زیرِ بحث میں ائمہ دین کا اختلاف رہا ہے مگر جو بے اصل دعاوی فریقِ ثانی کے اہلِ علم حضرات نے کیے ہیں وہ بالکل بے اصل ہیں اور ان حضرات کی ان کارستانیوں پر مطلع ہونے کے بعد قرینِ انصاف تو یہ تھا کہ ہم بھی اپنی لن ترانیوں پر آجاتے اور ان کی سرابی حقیقت کو الم نشرح کرتے ہوئے کہہ دیتے ؎

محتسب خم شکست و من سر او

اَلسِّنَّ بِالسِّنِّ وَالْجُرُوْحَ قِصَاص

لیکن قرآنِ کریم کی تعلیم اور حدیثِ نبوی کے صریح ارشادات اور جن اکابر سے ہمیں لگاؤ اور تعلق ہے ان سے ربط و نسبت ہمیں ہرگز اس کی اجازت نہیں دیتی کہ ہم اس قسم کی لچر پوچ اور فتنہ انگیز باتیں کہتے پھریں۔ ہمیں تو اصلیت اور حقیقت کو بے نقاب اور آشکارا کرنا ہے اور بس۔ اور اس کتاب کی تالیف و ترتیب سے جو ناراضگی فریقِ ثانی کو پیدا ہو گی اس کے متعلق صرف اتنا کہنا ہی کافی ہے کہ ؏:

"اے بادِ صبا ایں ہمہ آوردۂ تست"

یہ بات تو پوری تفصیل کے ساتھ اپنے موقع پر بیان ہو گی کہ امام کے پیچھے سورۂ فاتحہ ترک کرنے والے صرف ہم احناف ہی نہیں، بلکہ جمہور صحابہ کرام رضی و تابعین رح و اتباعِ تابعین رح ہیں اور اکثر سلف و خلف کی معیت سے ہمارا دامنِ تحقیق وابستہ ہے۔ اور جمہور اپنے اس محقق نظریہ پر نص

قرآنی اور بے شمار حدیثیں پیش کرتے ہیں۔ اور ایسے اختلافی مسائل میں (خصوصاً جن میں بعض صحابہ کرام رضؓ اور ائمہ دینؒ کا اختلاف ہو) ہمارا یہ منصفانہ عندیہ ہے کہ جو بات ظاہر قرآن کریم و حدیث اور جمہور کے عمل کے مطابق ہوتی ہے۔ ہم نہ صرف یہ کہ اس کے سامنے سر تسلیم خم کر دیتے ہیں بلکہ اس کو اپنا دینی سرمایہ اور باعثِ صد افتخار سمجھتے ہیں اور جن مسائل میں طرفین کے پاس قرآن و حدیث کے دلائل ہوں۔ ہم اس پہلو کو جو قرآن و سنت کے قریب تر ہوتا ہے۔ اختیار کرتے ہیں۔ اور اپنے مسلک کی تائید میں تطبیق اور ترجیح کے ٹھوس دلائل پیش کرتے ہیں اور فریق ثانی کے حق میں غلط موشگافی اور غیر محتاط لفظ زبان سے نکالنا ہرگز جائز نہیں سمجھتے اور تمام مسائل اختلافیہ اور اجتہادیہ میں ہمارا یہی نظریہ ہے جس کی مزید تحقیق آپ کو راقم الحروف کی کتاب الکلام المفید فی اثبات التقلید میں ملے گی۔ مع ہٰذا معصوم ہونے کا دعویٰ بھی نہیں ہے۔ کیونکہ والعصمة بید الله تعالیٰ وحدہٗ۔

ہم حیران ہیں کہ مسئلہ زیر بحث میں تکفیر اور تفضیل کس کی ہو گی؟ اور تجہیل و تحمیق کس کی؟ بے سند اور بے دلیل ہونے کا الزام کس پر عائد ہوگا؟ اور لعنة الله علی الکاذبین کے الفاظ سے مباہلہ کس سے ہوگا؟ کیونکہ مسئلہ کے اختلافی ہونے میں فریق ثانی کا بھی اتفاق ہے۔ چنانچہ حضرت امام بیہقی رح (المتوفی ۴۵۸ھ) نے اس مسئلہ پر ایک مستقل کتاب[۱] (کتاب القرآۃ) لکھی ہے۔ اس میں تحریر کرتے ہیں کہ حضرات صحابہ کرام رضؓ کے عہد سے اس وقت تک باقاعدہ اس مسئلہ میں اختلاف چلا آتا ہے۔

(کتاب القرآۃ ص ۱۴۶)

اور مولانا مبارک پوری صاحبؒ المتوفی ۱۳۵۳ھ جن کی کتاب تحقیق الکلام پر فریق ثانی کے مسئلہ زیر بحث پر مناظرہ کا دارومدار ہے امام خطابیؒ[۲] رح المتوفی ۳۸۸ھ کے حوالہ سے نقل کرتے ہیں:

۱؎ ولفظہ: فی مسئلة معروفة مشهورة بما فيها من الاختلاف منذ عصر الصحابة رضؓ الی یومنا هذا۔ یعنی یہ مسئلہ معروف و مشہور ہے۔ اس میں اختلاف حضرات صحابہ کرام رضؓ کے زمانہ سے تا ہنوز چلا آتا ہے۔ (کتاب القرآۃ ص ۱۴۶)

۲؎ یہ بحث امام خطابی رحؒ نے "معالم السنن" میں کی ہے۔ چنانچہ وہ فرماتے ہیں کہ علماء نے اس مسئلہ میں اختلاف کیا ہے صحابہ کرام رضؓ کی ایک جماعت سے روایت کی گئی ہے کہ انہوں نے امام کے پیچھے قرأۃ کرنے کو واجب کہا ہے اور دوسرے صحابہ کرام رضؓ سے مروی ہے کہ وہ امام کے پیچھے قرأت نہیں کیا کرتے تھے اور فقہا کے تین قول ہیں:

(باقی ص پر)

کہ اس مسئلہ میں صحابہ کرامؓ کا اختلاف تھا۔ ایک گروہ وجوب قرأۃ خلف الامام کا قائل تھا تو دوسرا منکر۔ اس لیے فقہاؒ اور ائمہؒ کا بھی اس میں اختلاف ہے۔ ایک گروہ مطلقاً وجوب کا قائل ہے اور دوسرا مطلقاً ممانعت کا۔ تیسرا گروہ سری نمازوں میں قائل ہے اور جہری نمازوں میں قائل نہیں ہے۔

(تحفۃ الاحوذی جلد ا ص ۲۵۷)

اندریں حالات انصاف کا تقاضا تو یہ تھا کہ فریق ثانی جس پہلو کو حق اور صحیح سمجھتا۔ شدت کے ساتھ اس پر عمل پیرا ہوتا۔ لیکن تکفیر اور تفسیق وغیرہ اور تعدی وتجاوز کے الفاظ سے گریز کرتا نہ تو مباہلہ کا چیلنج دیتا اور نہ حلفیہ طور پر دوسرے فریق کو بے نماز اور مفسدین صلوٰۃ کا خطاب دیتا اور ایسے اختلافی مسئلہ میں سنجیدگی اور متانت سے کام لیتے ہوئے تعصب، عناد، غلو اور زبان درازی سے اجتناب کرتا، مگر کاش کہ اس نے ایسا نہ کیا۔

ہمارا اندازہ چونکہ عامۃ المسلمین کو مسئلہ زیر بحث سے شناسا کرنا ہے۔ اس لیے ہم نے عوام کی رعایت کرتے ہوئے نہایت سہل اور حتی الوسع سلیس زبان استعمال کی ہے۔ اسی وجہ سے اکثر عربی عبارات پیش نہیں کی گئیں بلکہ ان کے حوالہ درج کر دینے پر اکتفا کی گئی ہے۔ ہاں البتہ جہاں کسی خاص مصلحت سے اصل عربی عبارت پیش کرنا ضروری معلوم ہوا ہے تو وہاں اصل عبارت نقل کر کے اس کا ترجمہ بھی ساتھ ہی لکھ دیا ہے تاکہ خواص اور عوام دونوں برابر استفادہ کر سکیں۔

ہم نے بعض مقامات پر حتی الوسع متانت اور سنجیدگی کو مدنظر رکھتے ہوئے بعض علمی چوٹیں بھی کی ہیں جن سے ان اکابر کے طرز استدلال کی خامی اور اس کا نقص واضح کرنا مقصود ہے اور جن سے بڑے بڑے اکابر کے خیالات اور نفسی میلانات کی پردہ دری ضرور ہو گی لیکن پردہ دری کے بغیر درون پردہ کا نظارہ کس نے کیا ہے؟ ورنہ حاشا وکلا ہمارے اس علمی اور تحقیقی طنز سے نہ سلف صالحین سے بدظنی ہے اور نہ تمسخر اور نہ زمانہ حال کے حضرات کی دل آزاری۔ واللہ علیٰ ما نقول شہید۔

(بقیہ صفحہ) امام مکحولؒ، اوزاعیؒ، شافعیؒ اور ابو ثورؒ فرماتے ہیں کہ امام کے پیچھے جہری اور سری سب نمازوں میں قرأۃ کرنا ضروری ہے اور امام زہریؒ، مالکؒ، عبداللہ بن المبارکؒ، احمد بن حنبلؒ اور اسحاق بن راہویہؒ فرماتے ہیں کہ مقتدی سری نمازوں میں امام کے پیچھے قرأۃ کرے لیکن جہری نمازوں میں قرأۃ نہ کرے۔" اور امام سفیان ثوریؒ اور اصحاب الرأی یہ فرماتے ہیں کہ امام کے پیچھے کوئی شخص قرأۃ نہ کرے۔ امام جہر سے قرأۃ کر رہا ہو یا آہستہ۔" اھ

(معالم السنن جلد ۲ ص ۲۰۵ طبع مصر)

ہم نے اپنے استدلال میں جملہ پیش کردہ احادیث اور آثار کی اسانید نقل کر کے ہر روایت اور اثر کے جملہ راویوں کی کتب اسماء الرجال سے توثیق نقل کر دی ہے تاکہ پڑھنے والوں کو ہر قسم کی سہولت رہے اور دشواری پیش نہ آئے۔ البتہ متابعات اور شواہد میں نیز ضمنی اور استطرادی ابحاث میں رواۃ کی توثیق کا التزام نہیں کیا گیا اور فریق ثانی کی طرف سے جملہ نقل کردہ روایات و آثار میں جو ضعیف و کمزور اور مجروح و متکلم فیہ راوی ہیں۔ ان پر کتب رجال سے جرحی کلام نقل کر دیا ہے تاکہ بلند و بالا دعاوی کرنے والوں کو اپنے دلائل کا معیار بھی معلوم ہو جائے اور جن حضرات صحابہ کرام رضی اللہ عنہم و تابعینؒ اور ائمہ دینؒ کی مسئلہ زیر بحث میں معیت جمہور کو حاصل ہے۔ ان کی ثقاہت اور بعض صفات عالیہ کا تذکرہ بھی کر دیا گیا ہے تاکہ عوام کو بھی یہ بات بخوبی معلوم ہو جائے کہ ان اکابر کا اسلام اور مسلمانوں میں کیا رتبہ ہے؟

ہم نے بعض مقامات پر ائمہ جرح و تعدیل اور جمہور محدثین کرامؒ کے مسلمہ اور طے شدہ اصول و ضوابط کے عین مطابق ثقہ راویوں سے متعلق ثقاہت اور عدالت کے اقوال تو نقل کر دیئے ہیں لیکن اگر بعض ائمہ کا کوئی جرحی کلمہ ملا ہے تو وہ نظر انداز کر دیا ہے۔ اسی طرح اگر کسی ضعیف اور کمزور راوی کے بارے میں کسی امام کا کوئی توثیق کا جملہ ملا ہے تو اس کو بھی درخور اعتنا نہیں سمجھا۔ کیونکہ فن رجال سے ادنیٰ واقفیت رکھنے والے حضرات بھی بخوبی اس امر سے واقف ہیں کہ کوئی بھی ایسا ثقہ جس پر جرح کا کوئی کلمہ منقول نہ ہو یا ایسا ضعیف جس کو کسی ایک نے بھی ثقہ نہ کہا ہو کبریت احمر کے مترادف ہے۔ حضرات صحابہ کرامؓ کا رتبہ کس سے مخفی ہے؟ اور الصحابة کلهم عدول کے جملہ سے کون اہل علم ناواقف ہے؟ مگر خوارج اور روافض کا نظریہ بھی ان کے بارے میں پوشیدہ نہیں ہے، بایں ہمہ ہم نے توثیق و تضعیف میں جمہور ائمہ جرح و تعدیل اور اکثر ائمہ حدیث کا ساتھ اور دامن نہیں چھوڑا مشہور ہے کہ

زبانِ خلق کو نقارۂ خدا سمجھو

تا حدِ ممکن اسانید کو پورا پورا نقل کیا گیا ہے اور ترجمہ میں اخبرنا، اخبرنی، حدثنا، حدثنی، قال فلان عن فلان، روی فلان اور رواہ عن فلان وغیرہ اصطلاحات کی پوری رعایت رکھی گئی ہے تاکہ ایک طرف نقل سند کے سلسلہ میں کسی قسم کی خیانت واقع نہ ہو۔ اور دوسری طرف سندات کو دیکھ کر صحیح و ضعیف، متصل اور منقطع وغیرہ کا فرق سمجھنے کی اہلیت رکھنے

داؤں کا بھی پورا پورا لحاظ رکھا گیا ہے۔ اکثر مقامات پر جتنی کتابیں دستیاب ہو سکی ہیں۔ ان کے حوالے درج کر دیئے گئے ہیں۔ بعض متن میں اور بعض حاشیہ میں (تاکہ اصل عبارت کی ترتیب اور تسلسل میں گنجلک اور اضطراب پیدا نہ ہو) اور یہ حوالے اس لیے درج کیے گئے ہیں تاکہ جو کتاب بھی آسانی کے ساتھ کسی صاحب کو میسر اور دستیاب ہو سکے۔ اس کی طرف مراجعت کر کے اصل عبارت یا اس کا ترجمہ بنظر انصاف دیکھ لیا جائے اور اکثر تاریخی واقعات اور ضمنی ابحاث کو حاشیہ پر درج کر دیا گیا ہے تاکہ پڑھنے والے حضرات اصل مضمون کو مرتب اور مربوط طور پر یکبارگی پڑھ لیں۔ اور مزید تفصیل اور تشریح کے لیے حاشیہ دیکھ لیں۔ بنا بریں توضیحِ بیان، دفعِ شبہ، رفعِ ابہام، توثیقِ رجال، جرحِ رواۃ اور دیگر نہایت ضروری امور کے لیے بہت سے تشریحی حواشی بڑھا دیئے گئے ہیں تاکہ خواص کے علاوہ عوام کے لیے بھی یہ کتاب چراغِ راہ کا کام دے۔

حضرات سلف صالحین کی عبارات کے پہلو بہ پہلو ہم نے فریقِ ثانی کی عبارات اور تحریرات سے بھی استفادہ کیا ہے اور ان کی عبارتیں اپنی تائید میں نقل کی ہیں۔ مگر ان کی عبارات سے احتجاج کرنے میں سینہ زوری سے کام نہیں لیا گیا بلکہ ان سے جو منطوق اور مفہوم کے لحاظ سے ہماری سمجھ میں آیا ہے وہ لکھ دیا ہے۔ ہاں اگر کسی موقع پر مناظرانہ رنگ میں ان کی عبارت کی تشریح میں طنز اور ظرافت کے طور پر کچھ لکھا گیا ہے تو اس کا انکار نہیں، لیکن بحمداللہ تعالیٰ انصاف کا دامن حتی الوسع ہاتھ سے نہیں چھوڑا۔ والعصمۃ بید اللہ تعالیٰ وحدہٗ۔

ع : یہ اپنی حد نظر ہے کسی کی دید کہاں

جہاں تک انسانی اور امکانی کوشش کا تعلق ہے۔ حوالہ جات کی تصحیح کا پورا التزام کیا گیا ہے۔ معہذا اگر جلد اور صفحہ کا نمبر اور ہندسہ کسی وجہ سے بدل جائے تو غوغا آرائی کے بجائے اس کی تصحیح کر لی جائے۔ دل میں پورا احترام موجود ہے اور ارادہ بھی تھا کہ محدثین کرامؒ، فقہائے عظامؒ اور اربابِ جرح و تعدیل کے ناموں کے پہلے امام علامہ حافظ اور شیخ و حضرت وغیرہ کے توصیفی الفاظ لکھے جائیں، مگر ان کے ناموں کے بار بار آنے سے ہر جگہ ایسا لکھنا ایک دشوار امر ہے۔ لہٰذا اس فعل کو گستاخی پر حمل نہ کیا جائے، بلکہ ایک مجبوری امر سمجھا جائے اور جہاں ہم نے راویوں

کے ناموں میں تصحیف اور غلطی کو درست کیا ہے اور اس پر تاریخی اور ٹھوس واقعات اور شہادتیں نقل کی ہیں۔ ان کو بنظرِ انصاف دیکھا جائے اور جلد بازی سے ہرگز کام نہ لیا جائے۔ اور اگر کسی مقام پر طرزِ استدلال میں کوئی خامی یا کمزوری نظر آئے تو قصور اور لغزش کو مجھ سے منسوب کریں نہ کہ جمہور سلف و خلف سے۔ کیونکہ ؎

میرے ساقی نے عطا کی ہے مئے بے دُرد و صاف
رنگ جو کچھ دیکھتے ہو میرے پیمانے کا ہے

اس کے علاوہ کہیں کہیں میرے اپنے استنباطات اور اجتہادات بھی ہوں گے۔ ان میں غلطی کا واقع ہونا بہت اغلب ہے۔ اور ان کو یوں سمجھنا چاہیے کہ ع :

"چراغِ راہ ہیں منزل نہیں ہیں"

مسئلہ زیرِ بحث کی اہمیت کے پیشِ نظر اس کے کسی گوشہ کے متعلق بھی کچھ عرض کرنا میرے لیے اپنی تہی مائیگی اور بے بضاعتی کے باعث چھوٹا منہ بڑی بات کا مصداق ہے۔ چاہیے تو یہ تھا کہ اس مسئلہ پر ایسے حضرات خامہ فرسائی کرتے جو خود بھی کچھ ہوتے۔ یہاں اپنا حال یہ ہے کہ اس پر کچھ لکھنا ہی اس بڑے اہم اور مُبارک کام کی توہین ہے لیکن جب میں نے اس مسئلہ کے جمع و ترتیب اور تحقیق و تحمیص کے لیے قدم اٹھایا تو صورتِ حال کا یہ نقشہ دیکھ کر مجھے ایسا محسوس ہونے لگا کہ کوئی اور طاقت ہے جو بے اختیار یہ کام لے رہی ہے ؎

مری طلب بھی اسی کے کرم کا صدقہ ہے
قدم یہ اٹھتے نہیں ہیں اٹھائے جاتے ہیں

ضروری التماس: حتی الوسع میں نے اس مسئلہ کے ہر پہلو کو مکمل اور واضح کرنے میں انتہائی کوشش کی ہے لیکن باوجود اس کے یہ دعویٰ ہرگز نہیں کیا جا سکتا کہ یہ کتاب اس مسئلہ کی تحقیق کے لیے آخری کتاب ہے۔ یا باوجود اتنی محنت اور کاوش اٹھانے کے یہ کتاب غلطیوں سے بالکل مبّرا ہے کیونکہ اوّل تو انسان کا کوئی کام لغزش اور خطا سے یوں بھی خالی نہیں ہوتا۔ اس لیے کہ خطا اور نسیان انسان کا خمیر ہے۔ اور پھر کام بھی اس بندۂ عاجز کا جو سراپا تقصیر و خطا ہو۔ اس کی نسبت بالکل صحت کا دعویٰ کس طرح ہو سکتا ہے؟ لہٰذا التماس ہے کہ

مجھ کو ہدفِ ملامت بنانے کے بجائے منصفانہ تنقید کے اصول پر میری راہنمائی کی جائے۔ اللہ تعالیٰ نے چاہا تو غلطیات کی تلافی کرنے اور حق کے تسلیم کرنے میں مجھے کوئی تامل نہ ہوگا۔ انشاء اللہ تعالیٰ۔
الغرض کتاب کی معنوی صورت ہو یا صوری، بہر حال نگاہ مقصود پر رکھیے اور میری کوتاہیوں پر مجھے مطلع کیجیے، حقیقت تو یہ ہے کہ ؎

نغمہ کجا و من کجا ساز سخن بہانہ ایست
سوئے قطار می کشم ناقۂ بے زمام را

دعا کیجیے کہ اللہ تعالیٰ قلب میں اپنی محبت، ارادہ میں قوت، جسم میں صحت اور عمر میں درازی عطا فرمائے اور کتاب و سنت کی پیروی اور حضرات سلف صالحین کی اتباع اور اطاعت کا صحیح جذبہ مرحمت فرمائے اور ہر نیک عمل میں اخلاص و احسان کی توفیق دے۔ اگر یہ مقصد حاصل ہو جائے تو کتاب کا ہر عیب حسن ہے اور اگر یہ نہ ہو تو تمام خوبیاں بے معنی ہیں اور اس فقیرِ بے زاد اور ماہیِ بے آب اور تہی دستِ علم و عمل کی خدائے برتر و بزرگ سے نہایت اخلاص سے یہ دعا ہے کہ جب تک دنیا میں زندہ رکھنا ہے تو اپنی رضا اور خوشنودی کی توفیق دے۔ اور جب دنیا سے اٹھانا منظور ہو تو خاتمہ بالخیر ہو۔ ؎

خدا سے مانگ جو کچھ مانگنا ہو اے اکبر
یہی وہ در ہے کہ ذلت نہیں سوال کے بعد

وَمَا تَوْفِيْقِيْ إِلَّا بِاللهِ عَلَيْهِ تَوَكَّلْتُ وَإِلَيْهِ أُنِيْبُ ط

ابو الزاہد محمد سرفراز خاں صفدر
خطیب جامع گکھڑ ضلع گوجرانوالہ

۲۰ر رجب ۱۳۷۴ھ
۱۵ر مارچ ۱۹۵۵ء

مقدمہ

اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ رَبِّ الْعٰلَمِیْنَ وَالصَّلٰوۃُ وَالسَّلَامُ عَلٰی خَاتَمِ الْاَنْبِیَاءِ وَالْمُرْسَلِیْنَ وَعَلٰی اٰلِہٖ وَاَصْحَابِہِ الْمُھْدِیِّیْنَ وَعَلٰی جَمِیْعِ اُمَّتِہٖ وَالْاَئِمَّۃِ الْمُقَرَّبِیْنَ الَّذِیْنَ بَلَّغُوْا کَلَامَ رَبِّ الْعٰلَمِیْنَ وَاَحَادِیْثَ رَحْمَۃٍ لِّلْعٰلَمِیْنَ اِلَی النَّاسِ کَافَّۃً لِیَدْخُلُوْا بِھَا جَنَّاتِ الْخُلْدِ وَالْبَسَاتِیْنَ

ضروری معلوم ہوتا ہے کہ اصول موضوعہ کے طور پر محل نزاع کو اور اس کے اہم اجزائے بحث کو متعین کر لیا جائے۔ تاکہ مسئلہ زیر بحث کی تہ تک پہنچنے میں دقّت پیش نہ آئے۔ سو ہماری تحقیق یہ ہے کہ مقتدی کو امام کے پیچھے نہ جہری نمازوں میں سورۃ فاتحہ پڑھنے کی گنجائش ہے۔ اور نہ سرّی نمازوں میں۔ مقتدی کا وظیفہ تمام نمازوں میں یہ ہے کہ پوری دلجمعی اور نہایت خاموشی کے ساتھ امام کی قرأۃ کی طرف توجہ کرے، سنے یا نہ سنے، ہمارے اس دعوٰی پر نص قرآنی موجود ہے جس کا معنٰی اجماع اور اتفاق سے یہ ثابت ہو چکا ہے کہ مقتدی کو امام کے پیچھے قرأۃ سے منع کیا گیا ہے۔ اور صحیح و صریح اور مرفوع قولی اور فعلی حدیثیں بھی اس پر موجود ہیں اور حضرات خلفائے راشدین رضؓ اور ان کے علاوہ جمہور صحابہ کرام رضؓ و تابعین رحؒ و اتباع تابعین رحؒ اور محدثین رحؒ و فقہاء رحؒ کی اکثریت بھی ہمارے ساتھ ہے۔ خصوصاً جہری نمازوں میں۔ ان میں ہر ایک امر کی پوری تفصیل اپنے موقع پر آئے گی۔ انشاء اللہ العزیز۔

حضرات صحابہ کرام رضہ

وہ حضرات صحابہ کرام رضہ جو امام کے پیچھے تمام نمازوں میں قرأۃ کے قائل نہ تھے :

حضرات خلفائے راشدین رضہ ، حضرت عبد اللہ بن عمر رضہ ، حضرت جابر بن عبد اللہ رضہ ، حضرت زید بن ثابت رضہ ، حضرت عبد اللہ بن مسعود رضہ ، حضرت ابوالدرداء رضہ اور حضرت عبد اللہ بن عباس رضہ وغیرہ ۔

اور وہ حضرات جو جہری نمازوں میں امام کے پیچھے قرأۃ کے قائل نہ تھے ۔ ان میں :

حضرت عائشہ رضہ اور حضرت ابوہریرہ رضہ وغیرہ خاص طور پر قابلِ ذکر ہیں ۔ غرضکہ امام کے ساتھ سورۃ فاتحہ کا پڑھنا حضرات صحابہ کرام رضہ میں شایع نہ تھا ۔

حضرت شاہ ولی اللہ صاحب رح لکھتے ہیں کہ

زیرا کہ خواندن فاتحہ با امام در صحابہ رضہ شایع نبود ۔ (مصفّٰی جلد ۱ ص ۱۳۱ طبع رحیمیہ دہلی)	چنانچہ امام کے ساتھ سورۃ فاتحہ کا پڑھنا حضرات صحابہ کرام رضہ میں شایع نہ تھا ۔

حضرات تابعین رح

جو تمام نمازوں میں امام کے پیچھے قرأۃ کے قائل نہ تھے ۔ ان میں سے حضرت سوید رح بن غفلہ رضہ ، سعید بن جبیر رح ، سعید بن المسیب رح ، محمد بن سیرین رح ، اسود بن یزید رح ، علقمہ بن قیس رح اور حضرت ابراہیم نخعی رح وغیرہ زیادہ مشہور ہیں ۔

اور جو اکابر جہری نمازوں میں قائل نہ تھے ۔ ان میں حضرت عروۃ بن زبیر رضہ ، قاسم رح بن محمد رضہ ، امام زہری رح ، نافع رح بن جبیر رضہ ، حسن بصری رح ، مجاہد بن جبیر رح ، محمد بن کعب القرظی رح ، ابوالعالیہ ریاحی رح اور امام شعبی رح وغیرہ کے نام قابل ذکر ہیں ۔

حضرات اتباعِ تابعین رح

جو حضرات مطلقاً امام کے پیچھے قرأۃ کے قائل نہ تھے ۔ ان میں حضرت سفیان بن عیینہ رح ، سفیان ثوری رح اور امام اوزاعی رح وغیرہ مشہور و معروف ہیں ۔ وعلیٰ ہٰذا القیاس ۔ امام لیث بن سعد رح اور عبد اللہ بن وہب رح مشہور ائمہ میں شمار ہوتے ہیں ۔ اور قرأت خلف الامام کے قائل نہیں ہیں ۔ اور امام بخاری رح کے استاد الاستاد حضرت عبد اللہ بن مبارک رح

جہری نمازوں میں قرأۃ خلف الامام کے قائل نہ تھے۔ ان کے علاوہ بے شمار اتباع تابعین ہیں، جن کا احصار اور احاطہ اگر محال نہیں تو آسانی کے ساتھ ممکن بھی نہیں ہے۔ ان تمام اکابر کے اقوال و مسالک پورے حوالہ جات کے ساتھ اور ایک ایک سند مع توثیقِ رواۃ اور دفع شبہات و تصحیح کے ساتھ اپنے موقع پر پوری بسط کے ساتھ بیان ہوں گے۔ انشاء اللہ العزیز۔

حضرات ائمہ اربعہ رح

چونکہ ائمہ اربعہؒ کے پیروکار ہر دور میں اکثریت کے ساتھ رہے ہیں اور آج بھی اکثریت مقلدین حضرات ائمہ اربعہ رح کی ہے۔ اس لیے زیادہ مناسب معلوم ہوتا ہے۔ کہ ہم ان حضرات کا مسلک بھی عرض کر دیں۔ اور ان کے بعد ان جلیل القدر ہستیوں کا نظریہ بھی تحریر کر دیں جن کے بارے میں فریق ثانی کو خاص طور پر غلط فہمی ہوئی ہے اور ان ائمہ کرام رح میں سے علی الخصوص حضرت امام ابو حنیفہ رح کا ذکر پہلے مناسب ہے، جو علم، عمر، تقویٰ و ورع اور شرفِ تابعیت کے حاصل کرنے میں دوسرے جملہ ائمہؒ سے خاص درجہ اور فضیلت کے مالک تھے۔

حضرت امام ابو حنیفہ رحؒ (المتوفی ۱۵۰ھ)

امام کے پیچھے سورۂ فاتحہ پڑھنے کے مطلقاً قائل نہ تھے۔ نہ جہری نمازوں میں اور نہ سری میں۔ چنانچہ مولانا عبد الرحمٰن صاحب مبارکپوری رح تحریر فرماتے ہیں کہ امام محمد رح موطا میں لکھتے ہیں:

"کہ امام کے پیچھے قرأۃ نہ کرنی چاہیے خواہ امام جہر سے قرأۃ کرتا ہو یا آہستہ، اسی پر عام آثار دلالت کرتے ہیں اور امام ابو حنیفہ رح کا مسلک اور مذہب بھی یہی ہے۔"[1]

---

[1] تحفۃ الاحوذی جلد ۱ ص: ۲۵۸ - یہ عبارت موطا امام محمدؒ ص ۹۴ - جامع المسانید جلد ۱ ص ۳۳۶ - فتح القدیر جلد ۱ ص ۲۴۱ اور روح المعانی جلد ۹ ص ۱۳۵ وغیرہ میں بھی نقل کی گئی ہے۔

[2] امام موصوف سے متعلق کبھی نہ جاننے والوں اور متعصب لوگوں نے کیا کیا الزام نہیں لگائے؟ کسی نے ان کو ضعیف کہا اور کسی نے یتیم فی الحدیث کے خطاب سے نوازا۔ لیکن حقیقت بالکل اس کے برعکس ہے۔ علامہ ذہبیؒ (المتوفی ۷۴۸ھ) ان کے بارے میں لکھتے ہیں: کہ ھو الامام الاعظمؒ،

(باقی اگلے صفحہ پر)

(بقیہ حاشیہ پچھلا صفحہ) فقیہ العراق، امام متورع، عالم، عامل، متقی اور کبیر الشان تھے۔ (تذکرۃ الحفاظ جلد ۱ ص ۱۵۸)۔ حافظ ابن عبد البرؒ (المتوفی ۴۶۳ھ) فرماتے ہیں کہ امام وکیع رح نے ان سے بہت سی حدیثیں سُنی ہیں۔ (کتاب الانتقاء ص ۱۳۶) اور لکھتے ہیں کہ جن لوگوں نے امام موصوف سے روایتیں کیں اور ان کی توثیق و تعریف کی۔ وہ ان سے بہت زیادہ ہیں جنھوں نے (بلاوجہ) ان میں کلام کیا ہے۔ (مختصر کتاب العلم ص ۱۹۳) امام ابن معین رح (المتوفی ۲۳۳ھ) فرماتے ہیں کہ امام موصوف ثقہ تھے۔ وہ صرف اسی حدیث کو بیان کرتے تھے جو ان کو اچھی طرح یاد ہوتی تھی۔ امام عبداللہ بن المبارک رح فرماتے ہیں کہ ہم نے فقہ میں امام ابوحنیفہ رح جیسا کوئی اور نہیں دیکھا۔ امام الجرح والتعدیل یحییٰ بن سعید القطانؒ (المتوفی ۱۹۸ھ) فرماتے ہیں ہم خدائے قدوس کی تکذیب نہیں کرتے، ہم نے امام موصوف سے بہتر رائے اور بات کسی کی نہیں سُنی۔ (تہذیب التہذیب جلد ۱۰ ص ۴۴۹)۔ امام شافعی رح فرماتے ہیں کہ تمام لوگ فقہ میں امام ابوحنیفہ رح کے عیال اور خوشہ چیں ہیں۔ (بغدادی جلد ۱۳ ص ۳۴۶ و تہذیب جلد ۱۰ ص ۴۴۹)۔ علامہ تاج الدین سبکی رح (المتوفی ۷۷۱ھ) لکھتے ہیں کہ امام ابوحنیفہ کی فقہ بڑی مشکل اور دقیق ہے (طبقات کبریٰ جلد ۲ ص ۱۷۴)۔ شاید اسی وجہ سے نااہل اور سطحی قسم کے لوگ ان کی فقہ سے نفرت کرتے ہیں۔ علامہ خطیب بغدادیؒ المتوفی ۴۶۳ھ) باوجود امام موصوف پر انتہائی جرح نقل کرنے کے ان کی ذاتی خوبیوں اور علمی قابلیتوں کا انکار نہیں کر سکے اور صاف لکھتے ہیں کہ علم عقائد اور کلام میں لوگ ابوحنیفہؒ کے عیال اور خوشہ چیں ہیں۔ (بغدادی جلد ۱۳ ص ۱۶۱)۔
مشہور محدث اسرائیل (المتوفی ۱۶۲ھ) کا بیان ہے کہ امام ابوحنیفہ رح کیا ہی خوب مرد تھے جنھوں نے ہر ایسی حدیث کو اچھی طرح سے یاد کیا جس سے کوئی فقہی مسئلہ مستنبط ہو سکتا ہے۔ اور وہ بڑی احتیاط کرنے والے اور فقہی مسائل پر عبور کرنے والے تھے (بغدادی جلد ۱۳ ص ۳۳۹) امام ابن معینؒ فرماتے تھے کہ علماء تو صرف چار ہیں۔ سفیان ثوریؒ، ابوحنیفہ رح، مالکؒ اور اوزاعیؒ (البدایہ والنہایہ، جلد ۱۰ ص ۱۱۶) حافظ ابن کثیرؒ (المتوفی ۷۷۴ھ)۔ امام موصوف کی ان الفاظ سے تعریف کرتے ہیں۔ الامام، فقیہ العراق، احد ائمۃ الاسلام والسادۃ الاعلام، احد ارکان العلماء، احد الائمۃ الاربعۃ اصحاب المذاہب المتبوعۃ، امام عبداللہ بن داؤد الخریبیؒ (المتوفی ۲۱۳ھ) کا ارشاد ہے کہ مسلمانوں کے لیے مناسب ہے کہ امام ابوحنیفہ رح کے لیے نمازوں میں دعا کیا کریں کیونکہ انھوں نے فقہ اور سنت کو محفوظ رکھا جو لوگوں تک پہنچی۔ امام سفیان ثوریؒ اور عبداللہ بن المبارک فرماتے ہیں کہ اپنے زمانہ میں

فائدہ ۵: اس عبارت سے امام محمدؒ (المتوفی ۱۸۹ھ) کا مسلک بھی واضح ہو جاتا ہے کہ وہ

(بقیہ حاشیہ) سب روئے زمین پر بسنے والوں سے بڑھ کر فقہ جاننے والے امام ابو حنیفہؒ تھے۔ امام مکی بن ابراہیم رحؒ فرماتے ہیں کہ امام ابو حنیفہ رحؒ اعلم اہل الارض تھے۔ (البدایہ والنہایہ جلد ۱۰ صـ ۱۰۷) علامہ ابن خلدونؒ (المتوفی ۸۰۸ھ) لکھتے ہیں کہ امام موصوف علم حدیث کے بڑے مجتہدین میں سے تھے (مقدمہ صـ ۴۴۵) اور لکھتے ہیں کہ فقہ میں ان کا مقام اتنا بلند تھا کہ کوئی دوسرا ان کی نظیر نہیں ہو سکتا۔ اور ان کے تمام ہم عصر علماء نے ان کی اس فضیلت کا اقرار کیا ہے۔ خاص طور پر امام مالکؒ اور امام شافعیؒ نے۔ (مقدمہ صـ ۴۴۸) علامہ محمد طاہر رحؒ (المتوفی ۹۸۶ھ) لکھتے ہیں کہ اگر اللہ تعالیٰ کے نزدیک امام موصوف کی مقبولیت کا کوئی خاص راز اور بھید نہ ہوتا۔ تو امت محمدیہ (علیٰ صاحبہا الف الف تحیۃ) کا ایک نصف حصہ کبھی ان کی تقلید پر مجتمع نہ ہوتا (تکملہ مجمع البحار جلد ۳ ص ۵۴۷) مولانا مبارکپوری صاحبؒ لکھتے ہیں کہ امام ابن معین رحؒ، امام شعبہؒ اور سفیان ثوری رحؒ سب ان کی توثیق کرتے ہیں۔ (تحقیق الکلام صـ ۱۴۲) نیز تحریر فرماتے ہیں کہ حدیث (کی قیود اور شرائط) کے بارے میں جتنی تشدید پابندی اور احتیاط امام ابو حنیفہ رحؒ نے کی ہے اور کسی نے اس کا ثبوت نہیں دیا۔ (تحفۃ الاحوذی جلد ۲ صـ ۱۶۵) ہم نے اپنی کتاب مقام ابی حنیفہ رحؒ میں امام صاحبؒ کے امام حدیث و فقہ ہونے پر باحوالہ سیر حاصل بحث کی ہے اور عناد و تعصب کی وجہ سے جن لوگوں نے ان پر اعتراضات کیے ہیں ان کے ٹھوس جوابات بھی ہم نے اسی کتاب میں عرض کر دیے ہیں۔

نواب صدیق حسن خاں صاحبؒ (المتوفی ۱۳۰۷ھ) رقم طراز ہیں:

امام اعظم ابو حنیفہ رحؒ کوفی وی چنانکہ در علم دین منصب امامت دارد۔ ہم چناں در زہد و عبادت امام سالکان است۔ (تقصار جیود الاحرار من تذکار جنود الابرار صـ ۹۳)۔

حضرات اگر امام موصوف میں کوئی خوبی نہ ہوتی۔ تو امت کی اکثریت کے علاوہ امام یحییٰ بن سعید القطانؒ، امام وکیعؒ بن الجراح رحؒ، امام ابن معین یحییٰ بن زکریاؒ وغیرہ ایسے امام حدیث کبھی ان کی تقلید نہ کرتے۔ (دیکھیے طائفہ منصورہ) شاید نواب صاحبؒ نے بھی امام اعظم کا خطاب متعصب لوگوں کے توحش کو کم کرنے کے لیے اختیار فرمایا ہے اور علامہ ذہبیؒ بھی ان کی تعریف الامام الاعظم سے شروع کرتے ہیں۔ ع "وَالْفَضْلُ مَا شَهِدَتْ بِهِ الْأَعْدَاءُ"

سلہ بعض قاصر اور غیر بالغ نظروں نے امام محمدؒ کی شخصیت کو بھی پہچانا نہیں۔ امام محمدؒ فرماتے ہیں کہ میرے

(باقی اگلے صفحہ پر)

بھی کسی نماز میں امام کے پیچھے سورۃ فاتحہ پڑھنے کے قائل نہ تھے۔ اور یہی مضمون ان کی کتاب الآثار ص۱۲ میں بھی منقول ہے جن لوگوں نے امام محمدؒ کا یہ مسلک نقل کیا ہے کہ وہ سری نماز میں مقتدی کے لیے امام کے پیچھے سورۃ فاتحہ پڑھنے کو مستحسن سمجھتے تھے۔ وہ غلطی پر ہیں۔ چنانچہ حافظ ابن ہمام رح (المتوفی ۸۶۱ھ) تحریر فرماتے ہیں کہ جو لوگ امام محمد رح کا یہ مذہب نقل کرتے ہیں کہ وہ امام کے پیچھے مقتدی کے لیے سورۃ فاتحہ کو جائز اور مستحسن سمجھتے ہیں وہ لوگ غلط فہمی[1] کا شکار ہیں۔

(بقیہ حاشیہ پچھلا صفحہ) والد نے تیس ہزار درہم چھوڑے تھے، پندرہ ہزار میں نے نحو، شعر اور ادب کی تعلیم پر صرف کیے اور پندرہ ہزار حدیث اور فقہ کی تعلیم پر (بغدادی جلد ۲ ص ۱۷۳) امام شافعی رح فرماتے ہیں کہ میں نے امام محمدؒ سے ایک اونٹ کے بوجھ کے برابر علم حاصل کیا ہے۔ اور اگر وہ نہ ہوتے تو مجھ پر علم کی اتنی راہیں نہ کھلتیں جتنی اب کھلی ہیں۔ اور میں نے امام محمدؒ سے بڑا کوئی شخص کتاب اللہ کا عالم نہیں دیکھا۔ (شذرات الذہب جلد ۱ ص ۳۲۲) امام ابو عبیدؒ کا بیان ہے کہ میں نے امام محمدؒ سے بڑا کوئی کتاب اللہ کا عالم نہیں دیکھا (بغدادی جلد ۲ ص ۱۷۵)، امام شافعی فرماتے ہیں کہ میں نے کوئی شخص ایسا نہیں دیکھا جس سے کوئی مشکل مسئلہ پوچھا جائے اور اس کے تیوروں پر بل نہ پڑے ہوں۔ البتہ ہاں محمدؒ اس سے مستثنیٰ ہیں۔ (ابن خلکان جلد ۱ ص ۴۵۳) امام شافعیؒ سے پوچھا گیا کہ آپ نے امام مالکؒ اور امام محمدؒ...... دونوں کی رفاقت کی ہے۔ ان دونوں میں بڑا فقیہ کون ہے؟ فرمایا امام محمدؒ باعتبار نفس کے امام مالکؒ سے بڑے فقیہ ہیں۔ (شذرات الذہب جلد ۱ ص ۳۲۲) اس سے ملتے جلتے الفاظ یحییٰ بن صالح رح سے بھی منقول ہیں (بغدادی جلد ۲ ص ۱۷۵) امام دارقطنیؒ (المتوفی ۳۸۵ھ) باوجود متعصب ہونے کے امام محمدؒ کو ثقات اور حفاظ حدیث میں شمار کرتے ہیں۔ چنانچہ ایک مقام پر لکھتے ہیں کہ یہ حدیث بیس عدد ثقات اور حفاظ حدیث نے بیان کی ہے جن میں امام محمدؒ بن الحسن الشیبانی، یحییٰ بن سعید القطانؒ، عبداللہ بن المبارکؒ، عبدالرحمٰن بن مہدیؒ، اور ابن وہبؒ وغیرہ شامل ہیں (بحوالہ نصب الرایہ جلد ۱ ص ۴۰۹) امام دارقطنیؒ ان کو ثقات اور حفاظ میں پہلے نمبر پر بیان کرتے ہیں۔ ۔۔۔

میری انتہائے نگارش یہی ہے
تیرے نام سے ابتدا کر رہا ہوں

امام شافعیؒ فرماتے ہیں کہ میں نے امام محمدؒ سے زیادہ عقلمند کوئی نہیں دیکھا (البدایہ والنہایہ جلد ۱۰ ص ۲۰۲) امام ابن عبد البرؒ فرماتے ہیں کہ امام محمد بن الحسنؒ فقیہ اور عالم تھے۔ انھوں نے امام مالکؒ سے بہت حدیثیں لکھی ہیں اور اسی طرح ثوریؒ وغیرہ سے بھی۔ (الانتقاء ص ۱۷۴)

[1] صاحب درمختار نے لکھا ہے کہ امام محمدؒ کی طرف یہ نسبت کہ وہ امام کے پیچھے (باقی اگلے صفحہ پر)

ان کا قول حضرت امام ابو حنیفہ رحمہ اور امام ابو یوسف رحمہ کی طرح ممانعت کا ہے۔ (بحوالہ فتح الملہم جلد ۲ صفحہ ۷۷)

امام ابو یوسفؒ (المتوفی ۱۸۳ھ) کا مسلک بھی اس سے واشگاف اور آشکارا ہو گیا ہے کہ وہ بھی جملہ نمازوں میں امام کے پیچھے سورۃ فاتحہ کے قائل نہ تھے۔

(بقیہ حاشیہ پچھلا صفحہ) قرأۃ کو جائز قرار دیتے ہیں۔ ضعیف ہے اور علامہ شامی رحمہ لکھتے ہیں کہ امام محمد رحمہ نے کتاب الآثار میں تصریح کی ہے کہ ہم جہری اور سری .... کسی نماز میں امام کے پیچھے قرأۃ کے قائل نہیں ہیں۔

ودعوی الاحتیاط ممنوعۃ بل الاحتیاط ترک القرأۃ لانہ العمل باقوی الدلیلین اھ۔ (رد المختار جلد ۱ ص ۳۶۶)

اور یہ دعوے کہ امام کے پیچھے قرأۃ کرنے میں احتیاط ہے تو یہ دعوی ممنوع ہے بلکہ احتیاط ترک قرأۃ میں ہے کیونکہ یہاں دو دلیلوں میں سے قوی تر دلیل پر عمل ہو رہا ہے۔

ك امام ابو یوسفؒ کے بارے میں فریق ثانی بعض محدثین کا ترکوہ کا جملہ لیے پھرتا ہے۔ حالانکہ بات یہ نہیں ہے۔ امام نسائی رحمہ لکھتے ہیں کہ وہ ثقہ تھے۔ (ضعفاء صغیر ص ۵۷)۔ امام بیہقی رحمہ لکھتے ہیں: وہ ثقہ تھے (سنن الکبری جلد ۱ ص ۳۴۷) حافظ عبد القادر القرشی الحنفی رحمہ (المتوفی ۷۷۵ھ) فرماتے ہیں کہ امام محمدؒ اور امام ابن معینؒ اور امام علی بن المدینی رحمہ فرماتے ہیں کہ وہ ثقہ ہیں۔ (الجواہر المضیۃ جلد ۲ ص ۲۲۱) علامہ خطیبؒ لکھتے ہیں کہ امام ابن معین رحمہ اور امام احمد بن حنبلؒ اور علی بن مدینیؒ سب کا اس بات پر اتفاق ہے کہ امام ابو یوسفؒ ثقہ تھے۔ (بغدادی جلد ۱۴ ص ۲۴۳) علامہ ذہبیؒ ان کو الامام العلامہ اور فقیہ العراقین لکھتے ہیں (تذکرہ جلد ۱ ص ۲۶۹) امام مزنی رحمہ کا بیان ہے کہ فقہاء اور اصحاب الرائے میں وہ سب سے زیادہ حدیث کی اتباع کرنے والے تھے (البدایہ والنہایہ جلد ۱۰ ص ۱۸۰) امام ابن قتیبہؒ (المتوفی ۲۷۶ھ)۔ ان کو صاحب سنت اور حافظ لکھتے ہیں۔ (معارف ابن قتیبہؒ ص ۱۶۱) امام ابن معینؒ ان کو صاحب حدیث اور صاحب سنت کہتے ہیں (تذکرہ جلد ۱ ص ۲۷۰) اور ان سے یہ بھی منقول ہے کہ اصحاب رائے میں وہ سب سے زیادہ حدیثیں روایت کرنے والے اور اثبت فی الحدیث تھے۔ (ایضاً) علامہ ابن خلکانؒ (المتوفی ۶۸۱ھ) لکھتے ہیں کہ امام ابو یوسفؒ حافظ اور کثیر الحدیث تھے (ابن خلکان جلد ۲ ص ۳۰۳) علامہ عبد القادرؒ (المتوفی ۶۹۶ھ) لکھتے ہیں کہ مشرق سے مغرب تک قضاۃ کی تقرری ان کے سپرد تھی (الجواہر المضیۃ جلد ۲ ص ۲۲) امام ابن جریرؒ ابن جوزیؒ اور ابن حبانؒ ان کو عالم حافظ اور فقیہ کہتے ہیں (مقدمہ زیلعی ص ۴۱) اور امام یحییٰ بن معینؒ سے امام ابو یوسفؒ کے

حضرت امام مالکؒ (المتوفی ۱۷۹ھ) بھی امام کے پیچھے جہری نمازوں میں مقتدی کے لیے سورۃ فاتحہ پڑھنے کے حق میں[۱] نہ تھے۔ اور سرّی نمازوں میں گو امام کے پیچھے سورۃ فاتحہ پڑھنے کی مقتدی کو اجازت دیتے ہیں۔ لیکن مع ہذا وجوب کے قائل نہ تھے۔ چنانچہ مولانا مبارک پوری صاحبؒ لکھتے ہیں کہ امام مالکؒ[۲] سرّی نمازوں میں وجوب قرآۃ خلف الامام کے قائل نہ تھے۔

(تحفۃ الاحوذی جلد ۱ ص ۲۵۷)

(بقیہ حاشیہ) بارے میں پوچھا گیا تو انہوں نے فرمایا ثقہ صدوق (مناقب کردری جلد ۲ صفحہ ۲۲۰ و مناقب موفق ۱۹۷)

امام احمد بن حنبلؒ فرماتے ہیں کہ مجھے جب طلبِ حدیث کا شوق حاصل ہوا تو سب سے پہلے میں قاضی ابو یوسفؒ کی خدمت میں حاضر ہوا (بغدادی جلد ۱۴ صفحہ ۲۵۵) امام ابن حبانؒ فرماتے ہیں کہ وہ شیخ اور متقن تھے۔ (لسان المیزان جلد ۶ صفحہ ۳۰۱) علامہ ذہبیؒ فرماتے ہیں کہ وہ حسن الحدیث ہیں (تلخیص المستدرک جلد ۱ صفحہ ۳۷۲) امام ابن عبدالبرؒ امام طبریؒ کے حوالہ سے نقل کرتے ہیں کہ امام ابو یوسفؒ فقیہ عالم اور حافظ تھے پچاس اور ساٹھ تک حدیثیں وہ ایک مجلس میں یاد کر لیا کرتے تھے اور وہ کثیر الحدیث تھے۔

(الانتقاء ص ۱۷۲)

[۱] امام مالکؒ کا یہ مذہب و مسلک ان کی مشہور کتاب موطا صفحہ ۲۹ اور تفسیر کبیر جلد ۴ صفحہ ۵۰۱ و معالم التنزیل جلد ۳ ص ۶۲۴ و روح المعانی جلد ۹ صفحہ ۱۳۵ و فتح الملہم جلد ۲ صفحہ ۲۷ اور تحفۃ الاحوذی جلد ۱ صفحہ ۲۵۵ وغیرہ میں منقول ہے۔

[۲] علامہ ذہبیؒ لکھتے ہیں کہ وہ الامام، الحافظ، فقیہ الامت، شیخ الاسلام اور امام دار ہجرت تھے۔ (تذکرہ جلد ۱ صفحہ ۱۹۳) امام شافعیؒ فرماتے ہیں۔ اگر امام مالکؒ اور ابن عیینہؒ نہ ہوتے تو حجاز کا علم ختم ہو جاتا امام ابن وہبؒ فرماتے ہیں اگر امام مالکؒ اور امام لیثؒ نہ ہوتے تو ہم گمراہ ہو جاتے۔ (تذکرہ: ۱ ص ۱۹۴)

امام احمد بن الخلیلؒ فرماتے ہیں۔ میں نے امام اسحاقؒ بن ابراہیم کو کہتے سنا۔ وہ فرماتے ہیں کہ اگر امام مالکؒ، امام ثوریؒ اور امام اوزاعیؒ کسی مسئلہ پر متفق ہو جائیں تو وہی مسئلہ حق اور سنت ہو گا۔ اگرچہ اس میں نص موجود نہ بھی ہو۔ (تذکرہ جلد ۱ صفحہ ۱۹۵) راقم السطور کہتا ہے کہ امام ثوریؒ اور اوزاعیؒ سب نمازوں میں اور امام مالکؒ جہری نمازوں میں ہمارے ساتھ ہیں اور سرّی نمازوں میں بھی وجوب کے قائل نہیں ہیں۔ لہٰذا اس مسئلہ میں یہی مسئلہ حق اور سنت ہے اور نص قرآنی اور احادیث صحیحہ کے صریح حوالے اس پر مستزاد ہیں جو سونے پہ سہاگہ ہے۔

حضرت امام شافعیؒ[1] (المتوفی ۲۰۴ھ) امام موصوف کا مسئلہ زیر بحث میں صحیح مسلک کیا تھا؟ اس کے سمجھنے اور نقل کرنے میں بڑے بڑے ائمہ فن نے پیچ در پیچ غلطیوں کا ارتکاب کیا ہے اور اس کو ایک معمہ اور عقدہ لاینحل بنا دیا ہے۔ کسی نے یہ کہ دیا کہ امام موصوف سب نمازوں میں قراۃ الفاتحہ خلف الامام کے وجوب[2] کے قائل تھے۔ اور کسی نے کہہ دیا کہ ان کا قدیم قول یہ ہے کہ جہری

(بقیہ حاشیہ) امام عبد الرحمن بن مہدیؒ، امام مالکؒ پر کسی کو ترجیح نہ دیتے تھے۔ (تہذیب التہذیب جلد ۱۰ صـ ۸)

علامہ ابن سعدؒ فرماتے ہیں کہ امام مالکؒ ثقہ، مامون، ثبت، متورع، فقیہ، عالم اور حجت تھے۔

(تہذیب التہذیب جلد ۱۰ صـ ۸)

حافظ ابن کثیرؒ لکھتے ہیں کہ وہ احد الائمۃ الاربعۃ، اصحاب المذاہب المتبعۃ تھے۔ (البدایہ والنہایہ جلد ۱۰ صـ ۱۷۴) امام ابن عبد البرؒ نے کتاب الانتقاء میں کم وبیش ۴۶ صفحات میں ان کے فضائل بیان کیے ہیں۔

نواب صدیق حسن خاں صاحبؒ فرماتے ہیں۔ امام دار ہجرت و امامے از ائمہ مذاہب (اتحاف صـ ۹۴)

[1] علامہ ذہبی ان کی ان الفاظ سے تعریف کرتے ہیں۔ الامام العلم۔ حبر الامۃ اور ناصر السنۃ (تذکرہ جلد ۱ صـ ۳۲۹) امام اسحاق بن راہویہؒ فرماتے ہیں۔ مجھ سے امام احمدؒ نے فرمایا۔ آؤ تمہیں ایسا شخص بتاؤں جس کا نظیر اور مثیل تم نے نہیں دیکھا ہوگا۔ پھر مجھے امام موصوف کے پاس لے گئے۔ (بغدادی جلد ۲ صـ ۶۹) امام ابو ثورؒ فرماتے ہیں میں نے ان کا نظیر نہیں دیکھا۔ اور مجھے یقین ہے کہ خود انھوں نے بھی اپنا نظیر نہیں دیکھا ہوگا۔ (تذکرہ جلد ۱ صـ ۳۲۹)۔ امام ابن عبد الحکم کہتے ہیں کہ امام شافعیؒ ہر بات میں حجت ہیں (تہذیب التہذیب جلد ۹ صـ ۳۱)

امام نسائیؒ فرماتے ہیں کہ امام شافعیؒ احد العلماء، ثقہ اور مامون تھے۔ (تہذیب التہذیب جلد ۹ صـ ۳۱) حافظ ابن کثیرؒ نے ان کی ایسے شاندار الفاظ اور عبارات سے تعریف کی اور عقیدت کے پھول برسائے ہیں جن کے واقعی امام موصوف اہل اور مستحق ہیں۔ (دیکھیے البدایہ والنہایہ جلد ۱۰ صـ ۲۵۱) علامہ ابن عبد البرؒ نے ابن عبد الحکمؒ کے حوالہ سے لکھا ہے کہ وہ صاحب سنت و اثر، اہل فضل و فصاحت اور مضبوط عقل کے مالک تھے۔

(الانتقاء صـ ۷۳)

نواب صدیق حسن خاں صاحبؒ لکھتے ہیں۔ امام شافعیؒ ہم افضل وقت و ہم اعلم عہد و ہم حجۃ الائمہ و ہم مقدم الامۃ۔ (اتحاف صـ ۹۳)

[2] یہ قول علامہ بدر الدین عینیؒ نے عمدۃ القاری جلد ۳ صـ ۶۴ میں اور اسی طرح دوسرے ائمہ نے بھی نقل کیا ہے۔

نمازوں میں امام کے پیچھے قرأت نہ کی جائے۔ اور قولِ جدید یہ ہے کہ جہری ہوں یا سری، تمام نمازوں میں قرأۃ واجب[1] ہے۔ اور کسی نے یہ کہہ دیا کہ امام موصوف کے دو قول ہیں۔ ایک جہری نمازوں میں ممانعت کا اور دوسرا اجازت[2] کا۔ لیکن حقیقت ان تمام باتوں کے بالکل برعکس ہے۔

امام موفق الدین[3] ابن قدامہ الحنبلیؒ (المتوفی ۶۲۰ھ) تحریر فرماتے ہیں:

وجملة ذلك ان القرأة غير واجبة على المأموم فيما جهر به الامام ولا فيما اسر به نص عليه احمدؒ في رواية الجماعة وبذلك قال الزهريؒ والثوريؒ وابن عيينهؒ ومالكؒ وابو حنيفةؒ واسحقؒ

اور اس کا خلاصہ یہ ہے کہ مقتدی پر قرأت واجب نہیں نہ جہری نمازوں میں اور نہ سری میں امام احمدؒ بن حنبلؒ نے صراحت کے ساتھ یہ بیان کیا ہے جیسا کہ علماء کی ایک جماعت نے ان سے نقل کیا ہے اور امام زہریؒ، ثوریؒ، سفیان بن عیینہؒ، مالکؒ، ابو حنیفہؒ اور

---

[1] یہ قول امام بیہقیؒ نے (سنن الکبریٰ جلد ۲ ص ۱۵۴) میں اور دوسرے اکابر نے بھی نقل کیا ہے جن میں حافظ ابن کثیرؒ بھی ہیں۔ (تفسیر جلد ۴ ص ۲۸۳)

[2] یہ قول امام مزنیؒ (المتوفی ۲۶۴ھ) نے مختصر مزنی جلد ۱ ص ۹۰ میں امام بیہقیؒ نے (کتاب القرأۃ ص ۱۰) میں اور شیخ الاسلام ابن تیمیہؒ نے (تنوع العبادات ص ۸۳) میں نقل کیا ہے۔

[3] آپ حضرت امام احمد بن حنبلؒ کے مسلک پر تھے اور سیدنا شیخ عبدالقادر جیلانیؒ کے تلامذہ میں تھے۔ حدیث، فقہ، تفسیر اور طبقاتِ رواۃ کے متبحر اور بے مثل عالم تھے۔ آپ کا سلسلہ نسب یوں ہے۔ عبداللہ بن احمد بن محمد بن قدامہ الدمشقی جو الفقیہ، الزاہد، الامام، شیخ الاسلام اور احد الاعلام تھے۔ علامہ ابن نجارؒ کا بیان ہے کہ وہ امام الحنابلہ، ثقہ، حجت، نبیل، غزیر الفضل، کامل العقل اور شدید التثبت تھے۔ امام ابو شامہؒ لکھتے ہیں کہ وہ شیخ الحنابلہ، امام من ائمۃ المسلمین، علم من اعلام الدین فی العلم والعمل تھے۔ محدث ضیاءؒ لکھتے ہیں کہ وہ علوم قرآن وحدیث، فقہ وعلم خلاف کے امام اور یکتائے روزگار تھے۔ شیخ الاسلام ابن تیمیہؒ لکھتے ہیں کہ امام اوزاعیؒ کے بعد ملک شام میں ان سے بڑا کوئی امام داخل نہیں ہوا۔ علامہ ذہبیؒ نے ان کے اوصاف حمیدہ پر دو مستقل جلدیں لکھی ہیں۔ (ترجمۃ الشیخ فی بدء المغنی ص ۲، ۳، ۴) علامہ عزالدین بن عبدالسلامؒ (المتوفی ۶۶۰ھ) فرماتے ہیں۔ میں نے اسلام میں دو کتابوں کی مثال نہیں دیکھی۔ ایک محلّٰی (علامہ ابن حزمؒ (المتوفی ۴۵۶ھ)

وقال الشافعیؒ وداؤدؒ لعموم قوله علیه السلام لا صلوٰة لمن لا یقرأ بفاتحة الکتاب غیرانه خص فی حال الجهر بالامر بالانصات ففیما عداه یبقی علی العموم۔ (انتهی بلفظه) (مغنی ابن قدامه جلد ۱ ص ۶۰۶)

اسحاقؒ اسی کے قائل ہیں۔ امام شافعیؒ اور داؤدؒ فرماتے ہیں کہ آں حضرت صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کی حدیث کہ جس شخص نے سورۃ فاتحہ نہ پڑھی اس کی نماز نہ ہوگی۔ عام ہے مگر جہری نمازیں اس حدیث سے مستثنیٰ ہیں کیونکہ ان میں خاموش رہنے کا حکم دیا گیا ہے اور جہری نمازوں کے علاوہ یہ حدیث اپنے عموم پر باقی رہے گی۔

اس عبارت سے یہ امر بالکل عیاں ہو جاتا ہے کہ امام شافعیؒ کے نزدیک جہری نمازوں میں امام کے پیچھے سورۃ فاتحہ کا پڑھنا درست نہیں ہے۔ کیونکہ یہ نص قرآنی اور حدیث صحیح اَنْصِتُوْا کے خلاف ہے۔

فائدہ۔ اس عبارت سے جس طرح امام شافعیؒ کا مسلک واضح طور پر معلوم ہو جاتا ہے اسی طرح امام داؤد ظاہری کا مسلک بھی نمایاں ہو جاتا ہے کہ وہ بھی جہری نمازوں میں امام کے پیچھے سورۃ فاتحہ کی قراءۃ کو جائز نہیں سمجھتے تھے۔ کیونکہ جہری نمازوں میں امام کے پیچھے فاتحۃ الکتاب کا پڑھنا انصات مامور بہ کے منافی ہے۔ ممکن ہے کسی صاحب کو یہ شبہ پیدا ہو کہ ہو سکتا ہے امام ابن قدامہؒ ہی کو امام شافعیؒ کے مسلک کے سمجھنے اور نقل کرنے میں غلطی واقع ہوئی ہو۔ اس لیے زیادہ مناسب معلوم ہوتا ہے کہ ہم خود امام شافعی کی تحریروں سے اس مسئلہ کو حل

(بقیہ حاشیہ پچھلا صفحہ) اور دوسری مغنی ابن قدامہ (تذکرۃ الحفاظ جلد ۴ ص ۳۲۵ و لسان المیزان جلد ۴ ص ۲۰) حافظ تقی الدین علی بن عبد الکافیؒ (المتوفی ۷۵۶ھ) لکھتے ہیں کہ مغنی ابن قدامہ فقہ حنبلی کی بلند پایہ اور معتمد کتاب ہے (شفاء السقام ص ۱۴۹) اور حافظ ابن القیمؒ فرماتے ہیں کہ وہ شیخ الاسلام تھے۔ جہمیہ اور معطلہ کے بغیر باقی تمام فرقے ان کی مقبولیت، تعظیم اور امامت پر متفق ہیں (اجتماع الجیوش الاسلامیۃ ص ۶۹ طبع امرتسر)

لہ امام داؤدؒ بن علیؒ (المتوفی ۲۷۰ھ) علامہ خطیبؒ لکھتے ہیں کہ وہ اصحاب ظاہر کے امام، متورع، عابد اور زاہد تھے (بغدادی جلد ۸ ص ۳۶۹)

علامہ ذہبی رحمہ اللہ تعالیٰ ان کی ان الفاظ سے تعریف کرتے ہیں۔ الحافظ، الفقیہ، المجتہد اور فقیہ اہل الظاہر۔ (تذکرۃ الحفاظ جلد ۲ ص ۱۳۶)

کردیں۔ امام موصوف تحریر فرماتے ہیں:

فالعمد فی ترک القرأۃ بام القرآن والخطأ سواء فی ان لا تجزئ رکعۃ الا بہا او بشیٔ معہا الا ما یذکر من المأموم ان شاء اللہ تعالیٰ۔

(کتاب الام جلد ۱ ص ۹۹)

سورۃ فاتحہ کا دیدہ دانستہ ترک کرنا اور بھول کر ترک کرنا دونوں کا حکم ایک ہے کہ کوئی رکعت سورۃ فاتحہ اور اس کے ساتھ کچھ اور بھی پڑھنے کے بغیر جائز نہیں ہو سکتی۔ ہاں مگر مقتدی کا حکم آگے ذکر کیا جائے گا۔ ان شاء اللہ العزیز۔

امام موصوف کی اس عبارت کو بار بار پڑھئے اور ملاحظہ کیجئے کہ مقتدی کے لیے سورۃ فاتحہ کے پڑھنے کو کیوں مستثنیٰ قرار دیتے ہیں؟ اگر مقتدی کے لیے بھی سورۃ فاتحہ کا پڑھنا ویسا ہی ضروری ہے جیسا کہ امام اور منفرد کے لیے تو ان کی اس تفریق کا کیا مطلب ہے؟ پھر آگے تحریر فرماتے ہیں:

فواجب علی من صلی منفردا او اماما ان یقرأ بام القرآن فی کل رکعۃ لا یجزئہ غیرہا واحب ان یقرأ معہا شیئا آیۃ او اکثر وساذکر المأموم ان شاء اللہ تعالیٰ۔

(کتاب الام جلد ۱ ص ۹۳)

سو منفرد اور امام پر واجب ہے کہ وہ ہر رکعت میں سورۃ فاتحہ پڑھیں اس کے علاوہ کوئی اور سورۃ کفایت نہیں کر سکتی اور میں اس کو بھی زیادہ پسند کرتا ہوں کہ سورۃ فاتحہ کے علاوہ کچھ اور بھی پڑھیں ایک آیت ہو یا اس سے زیادہ۔ اور رہا مقتدی کا حکم آگے بیان کروں گا۔ ان شاء اللہ تعالیٰ۔

اس عبارت میں بھی امام موصوف، امام اور منفرد کی تصریح کرتے ہوئے ان کا یہ فریضہ اور وظیفہ بتلاتے ہیں کہ ان کو نماز کی ہر رکعت میں سورۃ فاتحہ پڑھنی ضروری ہے۔ مگر یہ بھی تصریح کرتے ہیں کہ مقتدی کا وظیفہ اور ڈیوٹی کچھ اور ہی ہے۔ جس پر ہر نماز اور ہر رکعت میں سورۃ فاتحہ کا پڑھنا ضروری نہیں ہے۔ اور فرماتے ہیں کہ میں ان شاء اللہ العزیز خود اس کا حکم بیان کروں گا۔ وہ کونسا حکم ہے جس کا دو مرتبہ وعدہ کیا ہے؟ تحریر فرماتے ہیں۔

ونحن نقول کل صلوٰۃ صلیت خلف الامام والامام یقرأ قرأۃ لا

اور ہم کہتے ہیں کہ ہر وہ نماز جو امام کے پیچھے پڑھی جائے اور امام ایسی قرأۃ کرتا ہو جو سنی نہ جاتی ہو

یسمع فیھا قرأ فیھا۔ تو مقتدی ایسی نماز میں قرأۃ کرلے۔

(کتاب الام جلد ۷ ص ۱۵۳)

امام شافعیؒ کی یہ عبارت اس بات کو واشگاف کرتی ہے کہ مقتدی کو جہری نمازوں میں امام کے پیچھے سورۂ فاتحہ پڑھنا درست نہیں ہے اور نہ واجب ہے۔ بلکہ مقتدی صرف ان نمازوں میں امام کے پیچھے سورۂ فاتحہ پڑھ سکتا ہے جن میں امام کی قرأۃ نہ سنی جا سکتی ہو اور وہ سرّی نماز ہے۔ اسی لیے انھوں نے قرأۃ لا یسمع ارشاد فرما کر جہری اور سرّی نمازوں میں مقتدی کا وظیفہ متعین کر دیا ہے۔ اس کے بعد بھی اگر کوئی شخص اس کا دعویٰ کرے کہ حضرت امام شافعیؒ تمام نمازوں میں مقتدی کے لیے سورۂ فاتحہ کے وجوب کے قائل ہیں تو وہ نہ صرف یہ کہ خوش فہمی اور غلطی کا شکار ہے بلکہ اس کو تعدیل مزاج کی کوشش بھی کرنی چاہیے۔

فائدہ: راقم الحروف کہتا ہے کہ حضرت امام شافعیؒ کے مسلک کی تعیین میں جو غلط فہمی پیدا ہوئی ہے اور قول قدیم وجدید کا جو جھگڑا چل نکلا ہے۔ اس کی اصل وجہ ہی کچھ اور ہے۔ وہ یہ کہ امام الحرمین[۱]ؒ (المتوفی ۴۷۸ھ) وغیرہ نے غلطی سے کتاب الام کو امام شافعیؒ کی کتب قدیمہ میں شامل سمجھ لیا ہے۔ اور دوسرے ائمہ نے بھی اس امام عالی مقام کی جلالتِ شان کی وجہ سے اس بات پر بھروسہ اور اعتماد کر لیا ہے۔ حالانکہ یہ ان کی غلطی ہے اور یہ سارا جھگڑا ہی اس مفروض پر مبنی ہے۔ ہم اختصار کو پیش نظر رکھتے ہوئے ان کی اس تاریخی غلطی پر دو تاریخی شہادتیں نقل کرتے ہیں۔ حافظ ابن کثیرؒ لکھتے ہیں:

ثم انتقل منھا الی مصر فاقام بھا الی ان مات فی ھذہ السنۃ (سنہ ۲۰۴ھ) وصنف کتاب الام وھو من کتبہ الجدیدۃ لانھا من روایۃ الربیع بن سلیمانؒ وھو مصری

پھر حضرت امام شافعیؒ بغداد سے مصر کی طرف روانہ ہوئے اور وہیں اقامت پذیر ہوئے حتی کہ سنہ ۲۰۴ھ میں اسی جگہ ان کی وفات ہوئی اور مصر میں ہی انھوں نے کتاب الام تصنیف کی ہے اور وہ ان کی جدید کتابوں میں ہے۔

---

[۱] ان کا نام عبد الملک، ابو المعالی کنیت، اور الجوینی (ان کے والد ابو محمد عبد اللہ الجوینیؒ کی طرف) نسبت ہے۔ یہ امام غزالیؒ (المتوفی ۵۰۵ھ) کے استاد تھے۔ حدیث، فقہ اور اصول اور دیگر علوم اور فنون میں اپنا نظیر نہیں رکھتے تھے۔ اپنے زمانہ میں علماء شوافع کے سربراہ تھے۔ حرم مکہ اور حرم مدینہ میں عرصہ دراز تک علوم اسلامیہ کی تعلیم دیتے رہے۔ اس لیے امام الحرمین کے لقب سے مشہور ہوئے۔ (الجواہر المضیہ جلد ۲ ص ۴۳۶-۴۳۷ و فوائد البہیہ ص ۲۴۶ طبع مصر)

وقد زعم امام الحرمين وغيره انها من القديم وهذا بعيد وعجيب من مثله ۔

(البداية والنهاية جلد ۱۰ ص ۲۵۲)

کیونکہ اس کے راوی ربیع بن سلیمانؒ (المتوفی ۲۷۰ھ) ہیں جو مصری تھے اور امام الحرمینؒ وغیرہ نے یہ خیال کیا ہے کہ کتاب الام کتب قدیمہ میں ہے ۔لیکن یہ امام الحرمینؒ ایسے امام سے بڑی ہی بعید اور نرالی بات ہے ۔

حافظ موصوف کی یہ عبارت بڑی واضح اور صاف ہے کہ امام الحرمینؒ وغیرہ کا یہ دعویٰ کرنا کہ یہ کتاب یعنی کتاب الام، امام شافعیؒ کی قدیم کتابوں میں شامل ہے نہ صرف تاریخی لحاظ سے باطل اور مردود ہے بلکہ اس کے مانع صواب سے بڑے دور اور بڑی عجیب بات کے مرتکب ہوگئے ہیں۔ حافظ ابن کثیرؒ نے اپنی تفسیر میں بنا بر اس مفروض کے اجازت کا قول امام شافعیؒ کا قول جدید قرار دیا ہے لیکن چونکہ البدایہ والنہایہ تفسیر کے بعد کی تصنیف ہے جیساکہ خود انھوں نے البدایہ میں اس کی تصریح کی ہے ۔ اس لیے ان کی اس جدید تاریخی تحقیق کے بعد تفسیر کا حوالہ قابل التفات نہیں ہے ۔

دوسری شہادت امام جلال الدین سیوطی رحمہ اللہ تعالیٰ (المتوفی ۹۱۱ھ) کی ہے ۔وہ لکھتے ہیں :

ثم خرج الی مصر وصنف بها کتبه الجدیدة کالام الخ (حسن المحاضرہ جلد ۱ ص ۱۲۲)

پھر حضرت امام شافعیؒ مصر کی طرف روانہ ہوئے ۔ اور وہاں کتب جدیدہ تصنیف کیں جن میں کتاب الام بھی ہے

ان تاریخی شہادتوں سے ثابت ہوگیا کہ کتاب الام حضرت امام شافعی رحؒ کی کتب جدیدہ میں ہے ۔ اور امام کے پیچھے مقتدی کا سورۂ فاتحہ کو جہری نمازوں میں ترک کرنا ان کا قول جدید ہے نہ کہ قول قدیم ۔

مصنف خیر الکلام نے ان ٹھوس حوالجات سے اپنے جواب کے سلسلہ میں جو مخلص تلاش کیا وہ یہ ہے :

(۱) کہ امام شافعیؒ مصر میں پانچ سال رہے ۔ہوسکتا ہے کہ آپ نے مصر جاکر پہلے یہی فتویٰ دیا ہو مگر بعد میں اس سے رجوع کیا ہو جیساکہ ہم نے انور شاہ صاحبؒ کی عبارت میں نقل کیا ہے کہ امام شافعی رحؒ نے وفات سے دو سال قبل مقتدی کو جہری نماز میں قرأۃ کے روکنے سے رجوع کیا ہے بس محض اس عبارت کا مصری کتاب میں ہونا آخری قول ہونے کی کیسے دلیل بن سکتا ہے بلکہ اس جگہ تصریح کی ضرورت ہے ۔ اھ (خیر الکلام ص ۲۴)

(۲) مختصر مزنی امام شافعیؒ کے ان مسائل کا مجموعہ ہے جو مصر میں بیان فرمائے اور اختیار کیے ہیں ۔

(ضحی الاسلام جلد ۲ صـ۹۱) بلکہ مزنی رح امام شافعی رح کے مصری شاگردوں سے ہے۔ (ضحی الاسلام جلد ۲ صـ۲۲۲)
(خیر الکلام صـ۲)

(۳) امام بیہقی رح فرماتے ہیں کہ امام شافعی رح کا صحیح قول یہی ہے کہ قرأت واجب ہے امام جہر کرے یا نہ کرے۔ (خیر الکلام صـ۲۱)

(۴) امام ترمذی رح نے لکھا ہے کہ اگر فاتحہ نہ پڑھی جائے تو نماز کسی کام کی نہیں رہتی اکیلا ہو یا امام کے پیچھے ہو امام شافعی رح اور امام اسحاق رح اور ان کے علاوہ اور علماء کا یہی مسلک ہے۔ (خیر الکلام صـ۲۲)

(۵) امام ابن عبد البر رح فرماتے ہیں کہ فاتحہ خلف الامام کے واجب ہونے کے مندرجہ ذیل ائمہ قائل ہیں امام اوزاعی رح، امام لیث رح بن سعد رح امام شافعی رح جب مصر میں گئے اور یہی ان کے اکثر شاگردوں کا مذہب ہے۔ ان سے امام مزنی رح اور امام بویطی رح ہیں امام ابو ثور رح کا بھی یہی مذہب ہے۔
(تمہید ابن عبد البر رح تحقیق) خیر الکلام صـ۲۳)

(۶) کتاب الام کی پہلی اور دوسری عبارت میں تصریح نہیں کہ مقتدی پر جہری نمازوں میں فاتحہ واجب نہیں منفرد اور امام کے متعلق دو احتمال ہیں ایک یہ کہ ان پر صرف فاتحہ واجب ہو۔ دوسرا یہ کہ ان پر فاتحہ اور مازاد دونوں واجب ہوں مگر مقتدی کے بارے میں دو احتمال نہیں صرف ایک ہی احتمال ہے۔ (محصلہ خیر الکلام ۲۴، ۲۵)

(۷) کتاب الام کی تیسری عبارت میں فاتحہ کا ذکر نہیں مطلق قرأۃ کا ذکر ہے۔ (محصلہ خیر الکلام صـ۲۷)

(۸) البدایہ والنہایہ تفسیر سے پہلے کی کتاب ہے۔ کیونکہ تفسیر میں دو جگہ اس کا حوالہ دیا ہے۔
(محصلہ خیر الکلام صـ۲۶، ۲۷)

(۹) حافظ ابن کثیر رح لکھتے ہیں کہ امام شافعی رح کا دوسرا قول یہ ہے کہ مقتدی جہری نماز میں بھی پڑھے اسی طرح امام لیث رح، امام اوزاعی رح، امام ابن عون رح امام مکحول رح اور امام ابو ثور رح سے بھی مروی ہے۔
(جلد ۱ صـ۱۶) (خیر الکلام صـ۲۷)

(۱۰) معالم التنزیل میں ہے کہ ایک جماعت کے نزدیک قرأۃ واجب ہے خواہ امام قرأۃ بلند آواز سے پڑھ رہا ہو یا آہستہ یہ قول حضرت عمر رض، حضرت عثمان رض، حضرت علی رض، حضرت ابن عباس رض اور معاذ رض سے مروی ہے۔ امام اوزاعی رح اور امام شافعی رح کا بھی یہی قول ہے۔ (خیر الکلام صـ۲۷، ۲۸)

(۱۱) علامہ ابن قدامہ رح ایک جگہ یہ نقل فرماتے ہیں کہ امام کے لیے فاتحہ کے بعد سکتہ کرنا مستحب ہے تاکہ اس

میں آرام کرے اور مقتدی فاتحہ پڑھ لے تاکہ مقتدی کی طرف سے امام کے ساتھ ساتھ پڑھنے سے منازعت واقع نہ ہو۔ امام اوزاعی رح، امام شافعی رح، امام اسحٰق کا یہی مذہب ہے۔ (تحسین الکلام ص۲۸)

الجواب: ہم بفضلہ تعالیٰ خیر الکلام کے ترتیب وار جوابات عرض کرتے ہیں غور فرمائیں۔

(۱) ٹھوس تاریخی حوالوں اور شہادتوں کو رد کرنے کے لیے صرف ہو سکتا ہے ۔۔۔۔ الخ

کوئی جواب نہیں۔ مصنف خیر الکلام پر اخلاقی طور پر لازم تھا کہ وہ صراحت کے ساتھ دو تاریخی اور ٹھوس حوالوں کے ساتھ یہ نقل فرماتے کہ فلاں کتاب حضرت امام شافعیؒ نے کتاب الام کے بعد لکھی ہے اور اس میں یہ لکھا ہے کہ مقتدی پر سورۂ فاتحہ یا قرآۃ کا پڑھنا واجب ہے اور عبارت یہ ہے۔ جب وہ ایسا نہیں کر سکے تو یقین کامل رکھیں کہ کتاب الام کی صریح عبارتوں کا جواب تاہنوز کوئی نہیں ہوا۔ رہا حضرت مولانا محمد انور شاہ صاحبؒ کا حوالہ تو وہ مؤلف خیر الکلام کو چنداں مفید نہیں ہے کیونکہ اس میں صرف اس قدر ہے کہ امام شافعیؒ نے وفات سے دو سال پہلے مقتدی کے لیے جہری نمازوں میں ترکِ قرآۃ سے رجوع کیا ہے۔ اس سے وجوب کیسے ثابت ہوا؟ چنانچہ خود مؤلف خیر الکلام حضرت شاہ صاحبؒ کے حوالہ سے نقل کرتے ہیں کہ پھر مجھے علم نہیں کہ امام شافعی رحمۃ جہری میں وجوب پسند کیا جیسے کہ شافعیہؒ کا مسلک ہے یا صرف استحباب کو۔ (فیض الباری جلد ۲ ص۲۷۱) اور فصل الخطاب میں فرماتے ہیں کہ میرے خیال میں امام شافعیؒ بھی جہری نمازوں میں صرف پڑھنے کو پسند کرتے ہیں فرض نہیں سمجھتے۔ (خیر الکلام ص۲۰) باقی رہا فیض الباری جلد ا ص۳۵۳) کا حوالہ جس میں لکھا ہے کہ امام شافعیؒ وفات سے دو سال پہلے مقتدی پر قرآۃ کے وجوب کے قائل ہو گئے تھے۔ (محصلہ) تو ظن غالب یہ ہے کہ یہ مترجم صاحب کی غلطی ہے جنھوں نے حضرت شاہ صاحبؒ کی املائی تقریر کو اپنی صوابدید کے مطابق عربی کا جامہ پہنایا ہے ورنہ یہ کیونکر صحیح ہو سکتا ہے کہ جلد اوّل میں وجوب کا حکم بیان فرمائیں اور جلد ثانی میں فرمائیں کہ مجھے کوئی علم نہیں کہ آیا وہ وجوب کے قائل تھے یا استحباب کے؟ اور فصل الخطاب میں یہ فیصلہ صادر فرمائیں کہ امام شافعیؒ جہری نمازوں میں صرف پڑھنے کو پسند کرتے تھے فرض نہیں سمجھتے تھے۔ غور فرمائیے کہ تحقیقی طور پر اس سے زیادہ اور کیا کہا جا سکتا ہے؟ اور خود مولانا سید انور شاہ صاحبؒ لکھتے ہیں:

ونقل ابن تیمیہ الاجماع عنہ یدل علی ان وجوب القرأۃ فی الجھریۃ خلاف الاجماع اولم یذھب الیہ احد من اھل الاسلام۔ اھ

کہ حافظ ابن تیمیہؒ نے امام احمد بن حنبلؒ سے اجماع نقل کیا ہے جو اس بات پر دلالت کرتا ہے کہ جہری نمازوں میں وجوب قرأۃ خلاف اجماع ہے یا اہلِ اسلام میں سے اس کا ایک شخص بھی قائل نہیں ہے۔

(فیض الباری جلد ۲ ص ۲۷۲)

پھر کیونکر سمجھ لیا جائے کہ ان کے نزدیک امام شافعیؒ جہری نمازوں میں وجوب قرأۃ کے قائل ہیں اور اگر یہ تسلیم بھی کر لیا جائے کہ واقعی امام شافعیؒ وفات سے دو سال پہلے مقتدی کے لیے وجوب قرأۃ کے قائل ہو گئے تھے تب بھی ایک بات نہایت ہی قابل توجہ ہے وہ یہ کہ تقریباً پچاس سال تک جو نمازیں حضرت امام شافعیؒ نے پڑھی ہیں جن میں وہ جہری نمازوں میں قرأۃ خلف الامام کے قائل نہ تھے کیا ان کی وہ نمازیں درست اور صحیح ہیں یا نہیں؟ اور کیا صرف دوسرے حضرات کی نمازیں ہی جن میں قرأۃ فاتحہ نہ کی گئی ہو باطل کالعدم اور بیکار ہیں یا حضرت امام شافعیؒ کی ان نمازوں کا بھی یہی حشر ہے؟ اگر کسی اور کی تحقیق بھی دیانتاً یہی ہو جو وفات سے دو سال قبل تک حضرت امام شافعیؒ کی تھی تو فرمائیے کہ اس کی نماز کیوں کالعدم، بیکار اور باطل ہو گی؟ یا یہ چورن اور امرت دھارا صرف حنفیوں کے لیے ریزرو اور وقف ہے۔ کیا خوب؟ :

ابھی کیا ہے ابھی تو ابتدا ہے دیکھتے جاؤ
ہمارے حال پر یاروں کے احسان اور بھی ہونگے

(۲) چونکہ باقرار صاحب خیر الکلام حضرت امام شافعیؒ مصر میں پانچ سال رہے تھے اس لیے اگر مختصر مزنی ان کے مصری مسائل کا مجموعہ بھی ہو اور مزنیؒ ان کے مصری شاگرد بھی ہوں تب بھی اس سے یہ کیونکر ثابت ہوا کہ یہ مجموعہ کتاب الام سے بھی بعد کا ہے؟ ہو سکتا ہے کہ یہ پہلے کا ہو اور کتاب الام ان کی صحیح طور سے کتب جدیدہ میں ہو اور امام مزنیؒ نے باوجود مصری ہونے کے مختصر مزنی کی تدوین کتاب الام سے پہلے کی ہو۔ یہ جواب صحیح ہونے کے علاوہ مصنف خیر الکلام کی اپنی پسند کا بھی ہے۔ علاوہ ازیں ایک اور بات بھی قابل غور ہے۔ وہ یہ کہ اگرچہ امام مزنیؒ اور امام بویطیؒ اصحاب شافعیؒ اور بڑے پائے کے محدث اور فقیہ تھے۔

لیکن ربیع بن سلیمان المرادی رح (المتوفی ۲۷۰ھ) کو ان دونوں پر ترجیح ہے۔ چنانچہ امام خلیلی رح فرماتے ہیں کہ

ثقة متفق علیه والمزنی مع جلالته استعان علی ما فاته عن الشافعی بکتاب الربیع وقال مسلمة من کبار اصحاب الشافعی رح۔ (اھ)

(تہذیب التہذیب جلد ۳، ص ۲۴۶)

ربیع بن سلیمان ثقہ اور متفق علیہ ہیں اور امام مزنی رحمہ باوجود جلالت شان کے جو مسائل امام شافعی رح کے ان سے چھوٹ گئے تھے ان میں ربیع کی کتاب سے استعانت کی ہے اور مسلمہ فرماتے ہیں کہ ربیع امام شافعی رح کے بڑے اصحاب میں شمار ہوتے ہیں۔

اس سے معلوم ہوا کہ امام مزنی کو حضرت امام شافعی رح کے تمام مسائل معلوم نہ تھے بلکہ ان سے کچھ چھوٹ بھی گئے تھے اور امام شافعی رح کے مسائل میں وہ ربیع بن سلیمان رح کے خوشہ چیں تھے۔ پھر کیوں نہ ہو کہ حضرت امام شافعی رح کے مسائل میں امام ربیع بن سلیمان رح پر اعتماد کیا جاتے جن پر خود امام مزنی رح نے اعتماد کیا ہے۔ اور مولیٰ احمد بن مصطفیٰ المعروف بطاش کبریٰ زادہ رح (المتوفی ۹۶۲ھ) لکھتے ہیں کہ

الربیع بن سلیمان — الثقة الثبت فیما یرویه حتی رجحوا روایته عند تعارض المزنی مع علو قدر المزنی علماً ودیناً وجلالة۔ اھ

(مفتاح السعادة ومصباح السیادة جلد ۲ ص ۱۶۲ طبع حیدرآباد دکن)

ربیع بن سلیمان رح — جو کچھ بھی روایت کرتے ہیں اس میں وہ ثقہ اور ثبت ہیں حتی کہ محدثین رح نے ان کی روایت کو مزنی کی روایت پر جب کہ دونوں کی روایت کا تعارض ہو ترجیح دی ہے۔ حالانکہ امام مزنی علم اور دین اور جلالت میں بلند مرتبہ تھے۔

اس سے بھی ثابت ہوا کہ جب امام ربیع اور امام مزنی رح کی روایت میں تعارض ہو تو محدثین کرام کے نزدیک امام ربیع بن سلیمان رح کی روایت کو ترجیح ہوتی ہے۔ اور امام ابوالحسین رح فرماتے ہیں کہ

البویطی کان یقول الربیع اثبت فی

امام بویطی فرماتے تھے کہ امام شافعی رح سے روایت

الشافعی رح منی اھ (تہذیب التہذیب   کرنے میں ربیعؒ مجھ سے بھی زیادہ اثبت ہیں۔

جلد ۳ ص ۲۳۶)

قطع نظر کتاب الام اور مختصر مزنی اور مختصر بویطی کے تقدم و تاخر کے خود امام بویطیؒ اور محدثینؒ

کے فیصلے کی رو سے امام ربیع بن سلیمانؒ کی روایت کو تاریخی اور صریح حوالوں کے پیش نظر

ترجیح ہے۔ اس لیے اگر بالفرض تسلیم بھی کر لیا جائے کہ کتاب الام پہلے کی ہے اور مختصر مزنیؒ

اور مختصر بویطیؒ بعد کی ہیں تب بھی ترجیح امام ربیعؒ بن سلیمان ہی کی   روایت کو ہو گی جو کتاب الامؒ

کے اور امام شافعیؒ کے مسائل کے راوی ہیں اور یہی وجہ ہے کہ بقول حافظ ابن تیمیہؒ حذاق

اصحاب الشافعیؒ مثلاً امام رازیؒ اور ابن عبد السلامؒ وغیرہ نے اسی پر عمل کیا ہے کہ جہری نمازوں

میں قرأۃ خلف الامام درست نہیں۔ (عبارت آگے آ رہی ہے)

(۳ و ۴ و ۵) کا جواب یہ ہے کہ یہ سب حوالے اس امر پر مبنی ہیں کہ مختصر مزنیؒ اور مختصر بویطیؒ

(جو امام یوسف بن یحییٰ البویطی (المتوفی ۲۳۱ھ) کی تالیف ہے) کے حوالوں کو غلطی سے ربیع بن

سلیمانؒ کی روایت پر ترجیح دی گئی ہے اور اسی غلطی کے نتیجہ میں حضرت امام شافعیؒ کو وجوب

قرأۃ خلف الامام کا قائل گردانا گیا ہے اور مصنف خیر الکلام نے تحقیق الکلام کے حوالہ سے

بحوالہ تمہید ابن عبد البرؒ امام شافعیؒ سے وجوب کا جو قول نقل کیا ہے اس میں خصوصیت سے

یہ درج ہے کہ امام شافعی رح کے اکثر شاگردوں کا یہی مذہب ہے جن میں امام مزنی رح اور

بویطیؒ بھی ہیں۔ بس یہیں سے اس غلطی کی بنیاد قائم ہوتی ہے کہ امام مزنیؒ اور امام بویطیؒ

کے آئینہ میں حضرت امام شافعیؒ کا مذہب اور مسلک متعین کرنے کی شدید غلطی کی گئی ہے۔

اور اسی پیچ در پیچ غلطیاں مرتب ہوتی ہیں؛ ؏

سخن شناس نۂ دلبرا خطا ایں جا است

(۶) حضرت امام شافعیؒ تو صاف طور پر یہ ارشاد فرماتے ہیں کہ سورۃ فاتحہ کا جان بوجھ

کر ترک کرنا یا خطاءً ترک کرنا دونوں اس حکم میں برابر ہیں کہ کوئی رکعت سورہ فاتحہ یا سورہ فاتحہ

اور کچھ دیگر حصۂ قرآن کے بغیر جائز نہیں۔ ہاں مگر مقتدی کا حکم الگ ہے جو آگے بیان ہو گا اور

دوسری عبارت میں تصریح کرتے ہیں کہ امام و منفرد دونوں پر ہر رکعت میں سورۃ فاتحہ

واجب ہے اس کے بغیر کوئی اور سورت جائز نہیں اور اس سے زیادہ ایک آیت یا اکثر پڑھیں تو مجھے پسند ہے۔ ہاں مگر مقتدی کا حکم کچھ اور ہے اور میں خود اس کو بیان کروں گا۔ ان شاء اللہ تعالیٰ۔ ان عبارتوں میں تو وہ صراحت کے ساتھ فرماتے ہیں کہ سورۃ فاتحہ امام اور منفرد دونوں پر واجب ہے۔ اور اس سے مازاد واجب نہیں بلکہ بہتر ہے جب سورۃ فاتحہ اور مازاد کا الگ الگ حکم بیان فرما رہے ہیں کہ ایک واجب ہے اور دوسرا مستحب (وَاُحِبُّ) تو پھر یہ احتمال حضرت امام شافعیؒ کی عبارت میں کہاں سے پیدا ہوا۔ دوسرا یہ کہ ان پر فاتحہ اور مازاد دونوں واجب ہوں۔ اھ۔ (خیر الکلام: ص ۲۵) اسی کو کہتے ہیں توجیہ القول بما لا یرضٰی بہ قائلہ۔ اور پھر مصنف خیر الکلام کا اخلاقی فرض تھا کہ وہ کتاب الام سے حضرت امام شافعیؒ کا وہ حوالہ جس کا دو دفعہ انھوں نے وعدہ فرمایا ہے نکال کر بقید حروف بتاتے کہ یہ لو امام شافعیؒ کی معہود عبارت یہ ہے جس میں ہماری خانہ ساز توجیہ کی تصدیق ہو رہی ہے۔ مصنف خیر الکلام کو معلوم ہونا چاہیے کہ خواہ مخواہ کچھ لکھ دینے سے جواب نہیں ہو جایا کرتا۔ حضرت امام شافعیؒ کی یہ دونوں عبارتیں سورۃ فاتحہ اور ہر رکعت اور امام و منفرد کے واضح الفاظ کے ساتھ بالکل صریح ہیں اور مقتدی اور ماموم کی استثناء اور وعدہ بھی۔ ان میں صاف طور پر موجود ہے جس کا ایک ایک حرف پکار پکار کر کہہ رہا ہے کہ صاحب خیر الکلام کی تاویل بالکل سینہ زوری پر محمول ہے اور قطعاً باطل اور مردود ہے۔ علمی دنیا میں اس کی کوئی وقعت نہیں ہے۔

(۷) بلاشک کتاب الام کی تیسری عبارت میں مطلق قرأۃ کا ذکر ہے لیکن حضرت امام شافعیؒ نے جن پہلی دو عبارتوں میں وعدہ فرمایا ہے۔ ان میں اُمّ القرآن کی تصریح موجود ہے اور ونحن نقول سے اسی وعدہ کو انھوں نے پورا کیا ہے۔ مصنف خیر الکلام اور ان کی جماعت کا اخلاقی فرض ہے کہ اگر یہ عبارت ان کے دو مرتبہ وعدہ کے ایفاء کے لیے نہیں تو بتلائیں کہ کتاب الام میں وہ کونسی عبارت ہے جس کے ساتھ حضرت امام شافعیؒ نے اپنا وعدہ پورا فرمایا ہے؟ (دیدہ باید)

(۸) البدایہ والنہایہ اور تفسیر ابن کثیرؒ کی ان عبارات سے قدر مشترک یہ ثابت ہوتا ہے کہ نہ تو کلیتہً البدایہ تفسیر ابن کثیر سے مقدم ہے اور نہ مکمل طور پر تفسیر اس سے پہلے کی ہے۔ کچھ

اجزا اِس کے پہلے لکھے گئے اور کچھ حصص اُس کے پہلے تصنیف ہوئے اور مناسب مواقع پر ایک کے حوالے دوسری کتاب میں ذکر کر دیے گئے لیکن بایں ہمہ اس سے کتاب الام کے صریح حوالوں اور امام ربیع بن سلیمانؒ کی راجح روایت پر کوئی زد نہیں پڑتی۔ جیسا کہ پہلے عرض کر دیا گیا ہے کہ کتاب الام ٹھوس تاریخی شہادتوں کی بنا پر امام موصوفؒ کی کتب جدیدہ میں سے ہے اور امام ربیعؒ کی روایت کو ترجیح ہوتی ہے۔

(۹، ۱۰) کا جواب یہ ہے کہ یہ ساری تحقیق اس بات پر مبنی ہے کہ امام مزنیؒ اور امام بویطیؒ کی روایت کو ترجیح دی گئی ہے اور ہم با حوالہ عرض کر چکے ہیں کہ اصل غلطی کا سبب ہی یہ غلط نظریہ ہے۔ سچ ہے کہ ؎

خشت اوّل چوں نہد معمار کج
تا ثریّا میرود دیوار کج

(۱۱) کا جواب یہ ہے کہ اس عبارت سے معلوم ہوا کہ حضرت امام شافعیؒ جہری نمازوں میں مقتدی کے لیے قرأۃ کے قائل نہ تھے بلکہ امام کے سورۂ فاتحہ ختم کر چکنے کے بعد سکتہ میں سورۂ فاتحہ کے قائل تھے کیونکہ بحالت جہر امام مقتدی کی قرأۃ خلافِ اجماع اور شاذ ہے۔ یہ عبارت تو مؤلف خیر الکلام کے مدعٰی کے مطابق نہیں۔ وہ تو جہر میں بھی قرأۃ فرض قرار دیتے ہیں۔ اور حافظ ابن کثیر رحمۃ اللہ علیہ لکھتے ہیں کہ وقال فی الجدید یقرأ الفاتحۃ فقط فی سکتات الامام۔[۱]

امام شافعیؒ کا قول جدید یہ ہے کہ مقتدی سورۂ فاتحہ پڑھے لیکن سکتات امام میں۔

(تفسیر جلد ۲، ص ۲۸۰)

اس سے معلوم ہوا کہ بحالت جہر امام شافعیؒ بھی مقتدی کے لیے قرأۃ کے قائل نہ تھے اور ہم نے اسی کتاب میں با حوالہ مبسوط بحث کر دی ہے کہ سکتات امام کا (جن میں مقتدی قرأۃ کر سکیں) شریعت سے کوئی ثبوت نہیں جس کا کوئی معقول جواب مؤلف مذکور نے نہیں دیا۔ الغرض امام شافعی رح کی کتاب الام کی احسن الکلام میں پیش کردہ عبارات اپنے مدلول پر بالکل نص صریح ہیں اور تاویلات باردہ کو بالکل قریب نہیں آنے دیتیں۔ یوں تعصب وعناد اور انکار وجحود کا دنیا میں کوئی علاج نہیں ہے جب تک نگاہ تعصب نہ بدلے گی نظریات میں کوئی تبدیلی ممکن نہیں ہو سکتی: ؎

نہ تم بدلے نہ دل بدلا نہ دل کی آرزو بدلی !
میں کیسے اعتبارِ انقلابِ آسماں کر لوں !

امام احمدؒ[1] بن حنبلؒ : (المتوفی ۲۴۱ھ) کا مسلک یہ ہے کہ وہ بھی جہری نمازوں میں امام کے پیچھے سورۂ فاتحہ کی قرأۃ کے قائل[2] نہ تھے۔ بلکہ جہری نمازوں میں امام کے پیچھے قرأۃ کرنے کو شاذ اور خلاف اجماع فرماتے تھے[3]۔ اور سری نمازوں میں وجوب کے قائل نہ تھے۔ چنانچہ مولانا مبارکپوری صاحبؒ لکھتے ہیں کہ امام مالکؒ اور امام احمدؒ تمام نمازوں میں مقتدی کے لیے امام کے پیچھے سورۂ فاتحہ کی قرأۃ کو واجب نہیں سمجھتے تھے۔ (تحفۃ الاحوذی، جلد ۱ ص ۲۵۷)

---

[1] علامہ ذہبیؒ ان کی ان الفاظ سے تعریف کرتے ہیں "شیخ الاسلام سید المسلمین، الحافظ اور الحجۃ" (تذکرہ جلد ۲، ص ۱۷) محدث ابراہیم حربیؒ کہا کرتے تھے کہ ان میں اللہ تعالیٰ نے اولین اور آخرین کے علوم جمع کر دیے ہیں" (ایضاً) امام شافعیؒ فرمایا کرتے تھے "میں نے بغداد میں امام احمدؒ سے بڑا فقیہ و عالم اور افضل کوئی نہیں دیکھا۔" (بغدادی جلد ۴ ص ۴۱۹، تذکرہ جلد ۲ ص ۱۸، البدایہ والنہایہ جلد ۱ ص ۳۳۵) اور نیز فرماتے ہیں کہ "جب میں بغداد سے نکلا تو میں نے امام احمدؒ سے بڑا فقیہ، زاہد اور متورع اور عالم کوئی وہاں نہیں چھوڑا" (تہذیب التہذیب ص ۷۳) علامہ خطیب ان کی تعریف یوں کرتے ہیں "امام المحدثین، الناصر للدین، المناضل (یعنی مدافعت کرنیوالے) عن السنۃ اور الصابر فی المحنۃ" (بغدادی جلد ۴ ص ۴۱۲) نواب صدیق حسن خاں صاحبؒ لکھتے ہیں: "امام احمدؒ امام سنت و مقتدائے ملت است" (تقصار ص ۹۴)

[2] امام احمدؒ کا یہ مسلک مغنی ابن قدامہ جلد ۱ ص ۶۰۶، تنوع العبادات ص ۸۶، روح المعانی جلد ۹ ص ۱۳۵۔ اور تحفۃ الاحوذی جلد ۱ ص ۲۵۷ وغیرہ میں مذکور ہے۔

[3] شیخ الاسلام ابن تیمیہؒ نے اپنے فتاویٰ جلد ۲ ص ۱۴۹ و تنوع العبادات ص ۸۷ میں اس کی تصریح ہے۔ چنانچہ وہ تحریر فرماتے ہیں:

بخلاف وجوبها فی حال الجهر فانه شاذ حتی نقل احمد الاجماع علی خلافه۔ (فتاویٰ: ۲ ص ۱۴۹)

یعنی سورۂ فاتحہ کا جہری نمازوں میں امام کے پیچھے بطور وجوب پڑھنا شاذ ہے۔ حتیٰ کہ امام احمدؒ نے اس کے خلاف اجماع اور اتفاق نقل کیا ہے۔

(نوٹ اگلے صفحہ پر دیکھیے)

ائمہ اربعہؒ کے مسالک کی تشریح کے بعد ضرورت تو باقی نہیں رہتی کہ ہم دوسرے ائمہ یا محدثین اور فقہائے کے حوالے پیش کریں۔ بھلا حضرات ائمہ اربعہؒ کے اقوال کی موجودگی میں اور کس کے قول کی ضرورت ہو سکتی ہے۔ کیونکہ ان میں اکثریت ان ائمہ کی ہے جو حضرات ائمہ اربعہؒ میں سے کسی نہ کسی امام کے مقلد اور ان کی علمی تحقیق کے خوشہ چیں تھے۔ مگر چونکہ فریق ثانی کی طرف سے بعض ائمہ کے مسالک نقل کرنے میں غلطی ہوتی ہے۔ اس لیے ہم بعض ائمہ کے اقوال عرض کرتے ہیں۔

ان میں وہ ائمہ کرام بھی شامل ہیں جو خود مستقل طور پر امام تھے اور انھوں نے کسی کی تقلید نہیں کی، بلکہ عرصہ دراز تک ان کی تقلید ہوتی رہی ہے۔

امام ابراہیم النخعیؒ : (المتوفی ۹۶ھ) کسی نماز میں امام کے پیچھے قرأۃ سورۃ فاتحہ کے قائل نہ تھے۔ (مغنی ابن قدامہ: ۱ ص ۶۰۶، الجوہر النقی جلد ۲ ص ۱۶۹، شرح مقنع جلد ۲ ص ۱۱) ان کی پوری عبارات

مع تشریح کے باب سوم میں ذکر کی جائے گی۔ انشاء اللہ العزیز۔

(نوٹ پچھلا صفحہ) مصنف خیر الکلام (دیکھو ص ۳۱) کا یہ کہنا کہ اس کا مطلب یہ بھی ہو سکتا ہے کہ امام کے ساتھ نہ پڑھے بلکہ سکتات میں پڑھے (محصلہ) قطعاً باطل اور مردود ہے کیونکہ شیخ الاسلام ابن تیمیہؒ سکتات کے قائل نہیں ہیں جیسا کہ ان کے حوالہ سے آگے اپنے مقام پر بحث آئیگی۔ انشاء اللہ تعالیٰ۔ پھر ان کی مرضی کے خلاف ان کی عبارت کا مطلب لینا کہاں کا انصاف ہے؟ اور شیخ منصور علی ناصفؒ لکھتے ہیں:

فلا فاتحۃ علی المأموم وعلیہ الجمہور و مالک وابوحنیفۃ واحمد (غایۃ المأمول جلد ۱ ص ۱۸۲، شرح التاج الجامع للاصول)	مقتدی پر سورۃ فاتحہ کا پڑھنا لازم نہیں ہے یہی جمہور اہل اسلام اور ابو حنیفہؒ اور امام احمدؒ کا مسلک اور مذہب ہے۔

لہ امام نوویؒ (المتوفی ۶۷۷ھ) لکھتے ہیں کہ ان کی توثیق۔ جلالت شان اور فقہی کمال پر سب کا اتفاق ہے۔ امام شعبیؒ نے انکی وفات کے وقت کہا کہ ابراہیمؒ نے اپنے بعد اپنے سے بڑا عالم اور فقیہ کوئی نہیں چھوڑا۔ لوگوں نے کہا کہ کیا حسن بصریؒ اور ابن سیرینؒ بھی نہیں؟ تو شعبیؒ نے کہا کہ نہ صرف حسن بصریؒ اور ابن سیرینؒ بلکہ اہل بصرہ، کوفہ، حجاز اور شام میں کوئی بھی نہیں۔ (تہذیب الاسماء واللغات جلد ۱ ص ۱۰۴) علم حدیث میں ان کے اس قدر وسیع معلومات تھے کہ مشہور محدث اعمش رحؒ کا بیان ہے کہ میں نے جب کبھی ابراہیم رحؒ کے (بقیہ اگلے صفحہ پر)

امام زہریؒ[1]: (المتوفی ۱۲۴ھ) جہری نمازوں میں امام کے پیچھے قراۃ سورۃ فاتحہ کے قائل نہ تھے۔ (کتاب القراۃ ص ۷۵، مغنی ابن قدامہ جلد ۱ ص ۶۰۹، شرح مقنع جلد ۲ ص ۱۱)

(بقیہ پچھلا صفحہ) سامنے کوئی حدیث پیش کی تو انھوں نے اس میں میرے معلومات اور بڑھائے۔ بڑے بڑے فقہاء فقہی مسائل میں ان کی طرف رجوع کرتے تھے۔ سعیدؒ بن جبیرؒ کے پاس جب کوئی فتویٰ پوچھنے کے لیے آتا تو اس سے کہتے، ابراہیمؒ کی موجودگی میں مجھ سے پوچھتے ہو؟

ابو وائلؒ کے پاس جب کوئی مستفتی آتا تو اس کو ابراہیمؒ کے پاس بھیج دیتے۔ اور اس سے کہہ دیتے جب وہ جواب دیں مجھے بتانا۔ (طبقات ابن سعد جلد ۶ ص ۱۸۹) وہ اتنے محتاط تھے کہ اکثر یہ فرمایا کرتے تھے۔ ایک زمانہ وہ تھا جب لوگ قرآن کی تفسیر کرتے ہوتے ڈرتے تھے اور اب یہ زمانہ ہے کہ جس کا دل چاہتا ہے مفسر بن بیٹھتا ہے۔ مجھے زیادہ پسند ہے کہ علم کے متعلق ایک کلمہ بھی منہ سے نہ نکالوں جس زمانہ میں میں فقیہ ہوا وہ بہت ہی انحطاط کا زمانہ ہے۔ (طبقات الکبریٰ شعرانی جلد ۱ ص ۳۶) علامہ ذہبیؒ لکھتے ہیں کہ وہ فقیہ العراق اور صاحبِ اخلاص بلند پایہ علماء میں تھے اور احادیث کے پرکھنے میں وہ صراف اور نقاد تھے۔ اور گمنامی کی زندگی کو بہت پسند کرتے تھے۔ (تذکرہ جلد ۱ ص ۶۹)

[1] امام زہریؒ، امام ابن مدینیؒ کا بیان ہے کہ حجاز میں ثقات کا سارا علم زہریؒ اور عمرو بن دینارؒ کے درمیان تقسیم تھا۔ (تذکرہ جلد ۱ ص ۹۹) عمرؒ بن عبدالعزیزؒ فرمایا کرتے تھے کہ اب زہریؒ سے زیادہ سنت ماضیہ کا جاننے والا کوئی نہیں رہا (ایضاً) عمرو بن دینارؒ جو خود بھی بہت بڑے محدث تھے فرماتے تھے کہ میں نے زہریؒ سے زیادہ حدیث میں کسی کو انقص نہیں دیکھا۔ (تہذیب التہذیب جلد ۹ ص ۴۴۸) فقہ میں وہ بہت بلند مقام رکھتے تھے۔ مدینہ کے ساتوں مشہور فقہاء کا علم ان کے سینہ میں محفوظ تھا۔ (ابن خلکان جلد ۱ ص ۴۵۱) اسی فقہی کمال کی وجہ سے وہ مدینے کی مجلس افتاء کے مسند نشین تھے۔ ان کے فتاویٰ کی تعداد اتنی زیادہ تھی کہ محمدؒ بن نوحؒ نے فقہی ترتیب سے ان کو تین ضخیم جلدوں میں جمع کیا تھا۔ (اعلام الموقعین جلد ۱ ص ۲۶) امام بیہقیؒ لکھتے ہیں کہ امام زہریؒ کے زمانہ میں ان سے بڑھ کر بڑا حافظ حدیث، عالم اور احادیث کی جمع و ترتیب کرنے والا اور کوئی نہ تھا (کتاب القراۃ ص ۷۵) حافظ ابن کثیرؒ ان کو احد الاعلام من ائمۃ الاسلام اور تابعی جلیل و اعلم الناس لکھتے ہیں۔ (البدایہ و النہایہ جلد ۹ ص ۳۴۲) امام شافعیؒ فرماتے ہیں کہ زہریؒ ہمارے نزدیک حدیث تفسیر اور رجال کی توثیق کرنے کے امام ہیں۔ (الرسالہ للامام الشافعیؒ ص ۶۴۳) اور حافظ ابن تیمیہؒ فرماتے ہیں کہ امام زہریؒ (بقیہ اگلے صفحہ پہ)

اور اسی طرح امام سفیانؒ ثوریؒ رحمۃ اللہ علیہ (المتوفی ۱۶۱ھ)۔

امام لیثؒ بن سعدؒ (المتوفی ۱۷۵ھ) امام عبداللہؒ بن المبارکؒ (المتوفی ۱۸۱ھ)

(بقیہ پچھلا صفحہ) اپنے وقت میں سنت اور حدیث کے بہت بڑے امام تھے۔ (فتاویٰ جلد ۲ ص ۱۴۵)

۱؎ سفیان ثوریؒ: علامہ ذہبیؒ ان کو الامام، شیخ الاسلام، سید الحفاظ اور الفقیہ لکھتے ہیں (تذکرہ جلد ۱ صفحہ ۱۹۰) امام شعبہؒ وابن معینؒ اور ایک بہت بڑی جماعت یہ کہتی ہے کہ سفیانؒ فن حدیث میں امیر المؤمنین تھے۔ ابن مبارکؒ فرماتے ہیں کہ میں نے گیارہ سو شیوخ سے احادیث کی سماعت کی ہے جن میں سفیان ثوریؒ سے افضل کوئی بھی نہ تھا۔ ان کی تعریف و توصیف کے لیے یہ الفاظ کیا کم ہیں؟ شعبہؒ فرماتے ہیں۔ سفیانؒ مجھ سے بڑے حافظ ہیں۔ ورقاؒ فرماتے ہیں: سفیانؒ نے اپنا نظیر خود بھی نہیں دیکھا ہوگا۔ امام احمدؒ فرماتے تھے میرے نزدیک سفیانؒ سے بڑھ کر کوئی نہیں۔ امام اوزاعیؒ فرماتے ہیں کہ اس سرزمین پر کوئی ایسا نہیں رہا جس پر تمام امت متفق ہو۔ ہاں مگر وہ صرف سفیان ثوری ہی ہیں (تذکرہ جلد ۱ ص ۱۹۱)

امام قطانؒ فرماتے ہیں کہ سفیان ثوریؒ، امام مالکؒ سے سب چیزوں میں بڑھ کر ہیں (تذکرہ جلد ۱ ص ۱۹۱) علامہ خطیب لکھتے ہیں کہ وہ ائمہ مسلمین کے بہت بڑے امام اور اعلام دین کے بہت بڑے علم تھے۔ سب کا ان کی امامت پر اتفاق ہے۔ (بغدادی جلد ۹ ص ۱۵۲، تہذیب التہذیب جلد ۴ ص ۱۱۴) حافظ ابن کثیرؒ لکھتے ہیں کہ وہ احد ائمۃ الاسلام اور عابد متقی اور بے شمار تابعینؒ سے روایتیں کرنے والے تھے۔ (البدایۃ والنہایہ جلد ۱۰ ص ۱۳۴)

نواب صدیق حسن خاں صاحبؒ لکھتے ہیں کہ امام سفیانؒ ثوری از اصحاب مذاہب متبوعہ بود و محدث جلیل و عارف نبیل علم را باسلوک یکجی داشت۔ (تقصار ص ۲۷)

۲؎ امام لیثؒ بن سعدؒ علامہ ابن سعدؒ کا بیان ہے کہ وہ ثقہ اور کثیر الحدیث تھے۔ امام احمدؒ ان کو کثیر العلم اور صحیح الحدیث کہتے تھے۔ ابن مدینیؒ ان کو ثقہ اور ثبت کہتے تھے۔ (تہذیب التہذیب جلد ۸ ص ۴۶۱) ابن وہبؒ کا بیان ہے کہ اس ذات کی قسم جس کے سوا کوئی معبود نہیں۔ ہم نے لیثؒ سے بڑا کوئی فقیہ نہیں دیکھا۔ (ابن خلکان جلد ۱ ص ۴۳۸)

امام نوویؒ کا بیان ہے کہ لیثؒ کی مہارت فقہ پر علما کا اجماع ہے۔ اس کمال تفقہ کے باعث اپنے زمانہ میں مصر کے سب سے بڑے مفتی بھی تھے۔ (تہذیب الاسماء جلد ۱ ص ۷۴) علامہ ذہبیؒ کا بیان ہے کہ وہ الامام، الحافظ اور دیار مصر کے علماء کے شیخ اور رئیس تھے۔ (تذکرہ جلد ۱ ص ۲۰۷) یحییٰ بن بکیرؒ کا بیان ہے کہ لیثؒ سے زیادہ کامل اور فقیہ البدن (باقی اگلے صفحہ پر نمبر ۲ بھی)

امام اوزاعیؒ رحمۃ اللہ علیہ (المتوفی ۱۵۷ھ)

(بقیہ اور نمبر ۱۲ پچھلے صفحہ) میں نے کوئی نہیں دیکھا۔ سعید بن ایوبؒ کہتے ہیں اگر امام مالکؒ اور لیثؒ کسی موقع پر مجتمع ہوتے تو مالک کو ان کے سامنے لب کشائی کی ہمت نہ ہوتی۔ (بغدادی جلد ۱۳ ص ۶) امام شافعیؒ کا بیان ہے کہ لیثؒ امام مالکؒ سے زیادہ احادیث اور آثار کا اتباع کرتے تھے۔ (تذکرہ جلد ۱ ص ۲۰۷) حافظ ابن کثیرؒ ان کو امام فی الفقہ والحدیث والعربیۃ سے یاد کرتے ہیں۔ (البدایہ والنہایہ جلد ۱۰ ص ۱۶۶) امام احمد فرماتے ہیں کہ لیث کثیر العلم اور صحیح الحدیث تھے۔ اور نیز فرمایا کہ اہل مصر میں ان سے زیادہ اصح الحدیث اور کوئی نہ تھا (بغدادی جلد ۱۳ ص ۱۲)

۱۳ امام عبداللہ بن المبارکؒ علامہ ذہبیؒ ان کو الامام العلامۃ الحافظ، شیخ الاسلام، فخر المجاہدین اور قدوۃ الزاہدین لکھتے ہیں (تذکرہ جلد ۱ ص ۲۵۳) امام ابن حبانؒ کا بیان ہے کہ ان میں اہل علم کے اتنے خصائل جمع ہوگئے تھے کہ ان کے زمانہ میں تمام روئے زمین پر کسی میں مجتمع نہ ہوئے تھے۔ (تہذیب التہذیب جلد ۵ ص ۳۸۶) امام نوویؒ لکھتے ہیں کہ ان کی امامت اور جلالت پر سب کا اتفاق ہے۔ وہ تمام چیزوں میں امام تھے ان کے ذکر سے رحمت نازل ہوتی ہے اور ان کی محبت کی وجہ سے بخشش کی توقع کی جاتی ہے۔ علامہ ابن سعدؒ ان کو متقن، حجت اور کثیر الحدیث کہتے ہیں۔ (تہذیب الاسماء جلد ۱ ص ۲۸۵) حافظ ابن کثیرؒ لکھتے ہیں کہ وہ حفظ، فقہ، عربیت، زہد، شجاعت اور شعر کے مسلم امام تھے۔ (البدایہ والنہایہ جلد ۱۰ ص ۱۷۷) علامہ خطیبؒ فرماتے ہیں کہ وہ علم میں حق پرستوں کے گروہ میں تھے۔ اور حفظ و زہد کے ساتھ متصف تھے۔ (بغدادی جلد ۱۰ ص ۱۵۲) مولانا مبارکپوری صاحب لکھتے ہیں کہ وہ اپنے زمانہ کے سب سے بڑے عالم تھے۔ (تحفۃ الاحوذی جلد ۱ ص ۲۲۰)

۱۴ امام اوزاعیؒ: علامہ ذہبیؒ لکھتے ہیں کہ وہ شیخ الاسلام اور حافظ تھے۔ اور وہ اس قابل تھے کہ ان کو وقت کا خلیفہ بنایا جاتا۔ امام ابو اسحاق فزاریؒ کا بیان ہے کہ اگر تمام امت کا خلیفہ منتخب کرنے کا اختیار مجھے دیا جائے تو میں امام اوزاعیؒ کا انتخاب کروں گا۔ اہل شام اور اندلس میں ایک عرصہ تک ان کی تقلید ہوتی رہی۔ (تذکرہ جلد ۱ ص ۱۶۸) امام ابو زرعہؒ فرماتے ہیں کہ امام اوزاعیؒ سے فقہ اور دین کی بہت سی روایتیں منقول ہیں۔ اسی علمی قابلیت کی وجہ سے وہ اہل شام کے مفتی اعظم تھے۔ امام ابن مہدیؒ کا بیان ہے۔ حدیث کے مرکزی امام صرف چار ہیں۔ امام اوزاعیؒ (۲) امام مالکؒ (۳) امام ثوریؒ (۴) امام حماد بن زیدؒ۔ نیز ان کا بیان ہے کہ اہل شام میں ان سے بڑا کوئی سنت کا عالم نہ تھا۔ تہذیب التہذیب جلد ۶ ص ۲۳۹) حافظ ابن کثیرؒ ان کو الامام الجلیل علامۃ الوقت اور فقیہ اہل الشام لکھتے ہیں۔ امام عبیداللہ بن عبدالکریمؒ فرماتے ہیں: (بقیہ اگلے صفحہ پر)

امام اسحاق بن راہویہ رحمۃ اللہ علیہ (المتوفی ۲۳۸ھ) اور امام سفیان بن عیینہ رح (المتوفی ۱۹۸ھ) وغیرہ جہری نمازوں میں مطلقاً اور سری میں وجوب کے قائل نہ تھے۔ مناسب معلوم ہوتا ہے کہ ہم اختصاراً اپنے اس دعوے کی دلیل بھی عرض کر دیں۔ چنانچہ امام موفق الدین ابن قدامہ تحریر فرماتے ہیں:

(بقیہ پچھلا صفحہ) میں نے امام اوزاعیؒ سے بڑا عقلمند، پرہیزگار، عالم، فصیح، باوقار، حلیم اور خاموش طبع کوئی اور نہیں دیکھا۔ (البدایہ والنہایہ جلد ۱۰ ص ۱۱۵) حافظ ابن القیمؒ لکھتے ہیں کہ وہ امام الشام فی وقتہ اور احد ائمۃ الدنیا تھے۔ (اجتماع الجیوش الاسلامیہ ص ۸۰)

لہ امام اسحاق بن راھویہ: علامہ ذہبیؒ لکھتے ہیں کہ وہ حافظ کبیر عالم نیشاپور بلکہ جملہ اہل مشرق کے شیخ تھے۔ محدث ابو زرعہ کا بیان ہے کہ ان سے بڑا کوئی حافظ دیکھنے میں نہیں آیا۔ ابو حاتمؒ کا بیان ہے کہ ان کے اتقان اور اصابت رائے پر آفرین ہے۔ اللہ تعالیٰ نے ان کو بہت بڑا حافظہ عطا فرمایا تھا۔ (تذکرہ جلد ۲ صفحہ ۱۹)

امام ابن خزیمہؒ کا بیان ہے کہ اگر وہ تابعین کے زمانہ میں ہوتے تو وہ یقیناً ان کے علم اور فقہ کا اقرار کرتے۔ امام احمدؒ ان کو امام من ائمۃ المسلمین کہتے ہیں۔ (بغدادی جلد ۶ ص ۳۵۰) ابن حبان کا بیان ہے کہ وہ اپنے زمانے میں فقہ، علم اور حفظ میں یکتا تھے۔ (تہذیب التہذیب جلد ۱ ص ۲۱۷) سعید بن ذویبؒ کا بیان ہے کہ وہ عدیم النظیر تھے۔ (بغدادی جلد ۶ ص ۳۵۰)

لہ امام سفیان بن عیینہؒ: امام شافعیؒ فرماتے تھے کہ اگر امام مالکؒ اور سفیان بن عیینہؒ نہ ہوتے تو حجاز کا علم ختم ہو جاتا۔ (تہذیب التہذیب جلد ۴ ص ۱۱۹) امام نوویؒ لکھتے ہیں کہ ان کی امامت، جلالت شان اور عظمت پر سب کا اتفاق ہے۔ امام احمد بن حنبلؒ فرماتے ہیں کہ میں نے ابن عیینہؒ سے بڑا کوئی عالم سنن نہیں دیکھا۔ (تہذیب الاسماء جلد ۱ ص ۲۲۴) ابن حماد حنبلیؒ انہیں شیخ الحجاز اور احد الاعلام لکھتے ہیں: ابن ناصر الدین کہتے ہیں: سفیان بن عیینہؒ امام عالی مقام اور محترم محدث تھے۔ (شذرات الذہب جلد ۱ ص ۳۵۴)۔ ابن وہب کہتے تھے۔ میں نے سفیان بن عیینہؒ سے بڑھ کر کوئی شخص قرآن مجید کا عالم نہیں دیکھا۔ (بغدادی جلد ۹ ص ۱۸۲)

علامہ ذہبیؒ ان کو العلامہ، الحافظ اور شیخ الاسلام لکھتے ہیں اور فرماتے ہیں کہ وہ امام، حافظ، حجت، وسیع العلم اور بلند قدر تھے۔ امام شافعیؒ فرماتے ہیں کہ میں نے سفیان بن عیینہؒ سے بڑھ کر کسی کو نہیں دیکھا کہ فتویٰ دینے میں احتیاط کرتا ہو اور حدیث کی تفسیر میں بھی ان سے بہتر کوئی نہیں دیکھا۔ (تذکرۃ الحفاظ جلد ۱ ص ۲۴۲)

وجملة ذلك ان القرأة غير واجبة على العموم فيما جهر به الامام ولا فيما اسر به نص عليه احمد فى رواية الجماعة و بذلك قال الزهرىؒ والثورىؒ وابن عيينةؒ ومالكؒ وابو حنيفةؒ واسحاقؒ بن راهويهؒ۔ (مغنى جلد ۱ ص ۶۰۵)

خلاصۂ کلام یہ ہے کہ سورۂ فاتحہ کا امام کے پیچھے پڑھنا نہ جہری نمازوں میں واجب ہے، نہ سری میں، ایک بڑی جماعت نے امام احمدؒ سے اس کی تصریح نقل کی ہے اور یہی امام زہریؒ، سفیان ثوریؒ، سفیانؒ بن عیینہ، مالکؒ، ابو حنیفہؒ اور اسحاقؒ بن راہویہؒ کا مسلک اور مذہب ہے۔

امام شمس الدینؒ ابن قدامہ الحنبلیؒ:

(المتوفی ۶۸۲ھ) جن کا نام عبد الرحمٰنؒ بن ابی عمر محمدؒ بن احمدؒ بن محمدؒ بن قدامہؒ ہے۔ علامہ ذہبیؒ فرماتے ہیں کہ وہ الامام اور شیخ الاسلام تھے (تذکرہ جلد ۴ ص ۲۷۳) فرماتے ہیں کہ

ولا تجب القرأة على المأموم هذا قول اكثر اهل العلم وممن كان لا يرى القرأة خلف الامام علىؓ وابن عباسؓ وابن مسعودؓ وابو سعيدؓ وزيدؓ بن ثابتؓ وعقبةؓ بن عامر وجابرؓ وابن عمرؓ وحذيفةؓ بن اليمانؓ وبه يقول الثورىؒ و ابن عيينةؒ واصحاب الرأى ومالكؒ والزهرىؒ والاسودؒ وابراهيمؒ وسعيدؒ بن جبيرؒ قال ابن سيرينؒ لا اعلم من السنة القرأة خلف الامام اه (شرح مقنع جلد ۲ ص ۱۱ طبع مصر)

اور مقتدی پر قرأۃ واجب نہیں ہے اور یہی اکثر اہل علم کا قول ہے اور جو حضرات قرأۃ خلف الامام کے قائل نہ تھے ان میں خصوصیت سے حضرت علیؓ، حضرت ابن عباسؓ، حضرت ابن مسعودؓ، ابو سعیدؓ، زیدؓ بن ثابت، عقبہؓ بن عامر، جابرؓ، ابن عمرؓ، حذیفہؓ بن الیمانؓ قابل ذکر ہیں اور یہی قول امام سفیان ثوریؒ سفیانؒ بن عیینہؒ فقہاء حنفیہؒ امام مالکؒ، زہریؒ، اسودؒ ابراہیمؒ وسعیدؒ بن جبیرؒ کا ہے اور محمدؒ بن سیرینؒ فرماتے ہیں کہ میں نہیں جانتا کہ قرأۃ خلف الامام سنت ہو۔

یہ حوالہ بھی اس بات کی واضح اور روشن دلیل ہے کہ اکثر اہلِ علم کے نزدیک مقتدی پر قرأت واجب نہیں ہے اور حضرات صحابہ کرامؓ اور تابعینؒ و اتباع تابعینؒ میں مذکورین حضرات قرأۃ خلف الامام کے قائل نہ تھے اور امام محمدؒ بن سیرینؒ قرأۃ خلف الامام کو خلاف سنت قرار دیتے ہیں اور ہم پہلے مغنی کے حوالہ سے عرض کر چکے ہیں کہ امام احمدؒ امام زہریؒ، امام سفیانؒ بن عیینہؒ

امام مالکؒ، امام ابوحنیفہؒ اور امام اسحاق بن راہویہؒ سب حضرات کے نزدیک مقتدی پر جہری اور سری کسی نماز میں قرآۃ واجب نہیں ہے۔ اور قاضی شوکانی نے تصریح کی ہے کہ امام اسحاق بن راہویہؒ امام احمد بن حنبلؒ، امام مالکؒ وغیرہ جہری نمازوں میں امام کے پیچھے قرآۃ کے قائل نہ تھے۔
(نیل الاوطار جلد ۲ ص ۲۲۳)

مولانا مبارک پوری صاحبؒ لکھتے ہیں:

وقال الزهری ومالك وابن المبارك واحمد واسحاق يقرأ فيما اسر فيه الامام ولا يقرأ فيما جهر به۔
(تحفۃ الاحوذی جلد ۱ ص ۲۵۰)

امام زہریؒ، امام مالکؒ، ابن المبارکؒ، احمدؒ اور اسحاقؒ فرماتے ہیں کہ جن نمازوں میں امام آہستہ قرآت کرتا ہو، ان میں مقتدی قرآۃ کر سکتا ہے اور جہری نمازوں میں مقتدی کے لیے اس کی گنجائش نہیں ہے۔"

امام ابن قدامہؒ کے حوالہ سے ابھی نقل کیا جا چکا ہے اور مبارک پوری صاحبؒ کے حوالہ سے عنقریب آئے گا کہ یہ ائمہ باوجودیکہ سری نمازوں میں قرآۃ خلف الامام کے قائل تھے۔ لیکن وجوب کے قائل نہ تھے۔

شیخ عبدالقادر جیلانیؒ[1]: (متوفی ۵۶۱ھ) بھی مقتدی کے لیے قرآت کو درست نہیں سمجھتے تھے۔ چنانچہ لکھتے ہیں:

ان كان مأموما ينصت الى قراءة الامام ويفهمها۔
(غنیۃ الطالبین، طبع مصر، ص ۶۷۴)

اگر نماز پڑھنے والا مقتدی ہے تو اس کو امام کی قرآت کے لیے خاموش رہنا چاہیے اور اس کی قرآۃ کو سمجھنے کی کوشش کرنی چاہیے۔

اگر ظاہری الفاظ پر نگاہ ڈالی جائے تو ان سے یہی متبادر ہو سکتا ہے کہ موصوف مقتدی کا تمام نمازوں میں یہ وظیفہ بتا رہے ہیں کہ وہ نہایت توجہ اور دلجمعی کے ساتھ امام کی قرآۃ کو سنے اور خود خاموش رہے اور اگر اس امر پر بھی دھیان رکھا جائے کہ صاحب موصوف امام احمد بن حنبلؒ کے مقلد تھے[2]۔ تو اس عبارت

---

[1] علامہ ذہبیؒ ان کو الشیخ اور القدوۃ لکھتے ہیں۔ (تذکرہ جلد ۴ ص ۱۷۲) علامہ سیوطیؒ ان کو الشیخ لکھتے ہیں۔ (تاریخ الخلفاء ص ۳۰۵) اور حافظ ابن القیمؒ ان کو الشیخ الامام العارف اور قدوۃ العارفین لکھتے ہیں (اجتماع الجیوش الاسلامیہ ص ۱۰۱) نواب صاحبؒ ان کو امام الصوفیہ لکھتے ہیں۔ (الجنۃ فی الاسوۃ الحسنۃ بالسنۃ ص ۳۷)
[2] اگلے صفحہ پر دیکھیے

سے جہری نمازوں میں ممانعت ثابت ہوگی۔ اور چونکہ امام احمدؒ سری نمازوں میں وجوب قرأۃ کے قائل نہیں تھے۔ اس لیے صاحب موصوف کا مسلک بھی یہی ہوگا۔

شیخ الاسلام ابن تیمیہؒ[1] (المتوفی ۷۲۸ھ) مسئلہ خلف الامام پر بحث کرتے ہوئے تحریر فرماتے ہیں کہ "امام کے جہر کرنے کا مقصد ہی یہ ہے کہ وہ پڑھے اور مقتدی سنیں۔ یہی وجہ ہے کہ امام جہری نمازوں میں جب وَلَا الضَّآلِّيْنَ پڑھتا ہے تو مقتدی بھی آمین کہتے ہیں اور سری نمازوں میں چونکہ مقتدی سنتے نہیں۔ اس لیے وہ آمین بھی نہیں کہتے۔ اگر امام بھی قرأت کر رہا ہو اور مقتدی بھی پڑھتے ہوں تو اس کا مطلب یہ ہوگا کہ امام کو یہ حکم دیا جا رہا ہے کہ تم ایسے لوگوں کو سناؤ جو اس کے لیے آمادہ نہیں اور ایسی قوم کو خطبہ اور وعظ کہو جو توجہ نہیں کرتی۔ اور یہ ایسی کھلی حماقت ہے جس سے شریعت مطہرہ کا دامن بالکل پاک ہے۔ ایک حدیث میں آتا ہے کہ جو شخص خطبۂ امام کے وقت باتیں کر رہا ہو تو اس کی مثال ایسی ہے جیسے گدھے پر کتابوں کا بوجھ لادا گیا ہو۔ ایسا ہی وہ شخص ہے جو جہری نمازوں میں امام کے پیچھے قرأت کرتا ہو۔"

(فتاویٰ شیخ الاسلام ابن تیمیہؒ، جلد ۲ ص ۱۴۷)

یعنی نہ گدھا کتابوں سے منتفع ہو سکتا ہے اور نہ مقتدی قرأت امام سے۔ غور کیجیے کہ کتنی نازک تشبیہ ہے کہ امام کے پیچھے قرأت کرنے والوں کو گدھے سے مثال دی گئی ہے۔

(نمبر ۳ پچھلے صفحہ کا) نواب صاحبؒ فرماتے ہیں کہ شیخ عبدالقادر جیلانیؒ کہ در طبقات صوفیہ سرخیل طوائف اولیاء است انجام کار در مذہب احمد بن حنبلؒ انتقال برحمت الٰہی فرمود او را نیز در مجتہدین شمردہ اند جم غفیر از حنفیہ قدیماً و حدیثاً مریداں ایں خانوادہ و آخذ طریق او ست۔"

(ہدایۃ السائل ص ۲۸۲)

[1] علامہ ذہبیؒ ان کی تعریف ان الفاظ سے کرتے ہیں "شیخ الاسلام، العلامہ، الحافظ، الناقد، المفسر، المجتہد، عالی قدر، رئیس الزہاد، یگانۂ دوراں، بحر العلوم، الذکی، الشجاع، السخی اور لکھتے ہیں کہ مخالف اور موافق سب ان کی تعریف میں رطب اللسان ہیں۔"

(تذکرہ جلد ۴ صفحہ ۲۷۸)

نواب صدیق حسن خاں صاحبؒ لکھتے ہیں "کہ وہ شیخ الاسلام، امام الائمہ اور مجتہد مطلق تھے۔ علامہ ابن حزمؒ کے بعد شیخ الاسلام ابن تیمیہؒ کے ہم پایہ کوئی امام پیدا نہیں ہوا۔"

(تقصار ص ۷۶)

مولانا محمد ابراہیم میر سیالکوٹیؒ لکھتے ہیں "شیخ الاسلام ابن تیمیہؒ علماء اسلام میں بلحاظ جامعیت علوم و فنون خصوصیت سے ممتاز ہیں۔" (تفسیر واضح البیان ص ۳۸)

قارئین کرام! اگر جہری نمازوں میں امام کے پیچھے قرأۃ کرنے کی کچھ بھی اجازت ہوتی یا شیخ الاسلام ابن تیمیہؒ کے خزانۂ معلومات میں ممانعت پر کوئی وزنی دلیل اور امت کی اکثریت کی معیت نہ ہوتی تو یقیناً وہ کبھی ایسی نازک تشبیہ نہ نقل کرتے اور یہی شیخ الاسلامؒ ایک دوسرے مقام پر یوں ارشاد فرماتے ہیں:

والامر باستماع قرأۃ الامام والانصات لہ مذکور فی القرآن وفی السنۃ الصحیحۃ وھو اجماع الامۃ فیما زاد علی الفاتحۃ وھو قول جماھیر السلف من الصحابۃؓ فی الفاتحۃ وغیرھا وھو احد قولی الشافعیؒ واختارہ طائفۃ من حذاق اصحابہ کالرازیؒ وابی محمد بن عبد السلامؒ فان القرأۃ مع جھر الامام منکر مخالف القرآن و السنۃ وما کان علیہ عامۃ الصحابۃؓ۔
(تنوع العبادات ص۸۵)

امام کی قرأۃ سننے اور اس کے لیے چپ رہنے کا حکم قرآن کریم اور صحیح حدیث میں مذکور ہے اور اس پر تمام امت کا اجماع ہے کہ مقتدی پر سورۃ فاتحہ کے بعد اور کوئی قرأت نہیں ہے اور یہی جمہور اور اکثر حضرات صحابہ کرامؓ کا مسلک ہے کہ مقتدی پر نہ سورۃ فاتحہ کی قرأت ضروری ہے اور نہ کوئی اور سورۃ۔ امام شافعیؒ کا بھی ایک قول یہی ہے اور ان کے پیروکاروں کے گروہ میں جو بڑے ماہر تھے۔ مثلاً امام رازیؒ اور امام ابن عبد السلامؒ ان کا بھی یہی قول ہے اور اسی کو انھوں نے پسند کیا ہے۔ کیونکہ جہر امام کے وقت مقتدی کا پڑھنا قرآن کریم اور سنت کے خلاف بھی ہے۔ اور فی نفسہٖ بُرا بھی ہے اور اکثر حضرات صحابہ کرامؓ کے تعامل کے بھی سراسر خلاف ہے۔

حضرت امام شافعیؒ وغیرہ کا مسلک پوری تفصیل کے ساتھ پہلے نقل کیا جا چکا ہے اعادہ کی ضرورت نہیں ہے۔ اور شیخ الاسلام کی عبارت بھی بڑی صاف اور واضح ہے۔ مزید تشریح کی محتاج نہیں ہے اور ہم شیخ الاسلامؒ کے حوالہ سے پہلے نقل کر آئے ہیں کہ امام احمدؒ سے وہ نقل کرتے ہیں کہ جہری نمازوں میں مقتدی کا امام کے پیچھے قرأۃ کرنا شاذ بھی ہے اور خلاف اجماع بھی۔ اور لکھتے ہیں کہ امام احمدؒ کے نزدیک نہ جہری نمازوں میں مقتدی پر قرأت واجب ہے اور نہ سری نمازوں میں۔ (تنوع العبادات ص۸۶)

شیخ الاسلام ابن تیمیہؒ سری نمازوں میں امام کے پیچھے قرأۃ کرنے کے قائل تھے جیسا کہ

انھوں نے اپنے فتاوٰی (جلد ۲ ص ۱۴۹) میں اس کی تصریح کی ہے، لیکن چونکہ وہ حنبلی تھے اِس لیے قرین قیاس یہ ہے کہ ان کا مسلک بھی امام احمد بن حنبلؒ کی طرح صرف استحباب کا ہونا چاہیے، نہ کہ وجوب کا۔ اور امام ابن قدامہ کی عبارت سری نمازوں میں عدم وجوب کی پہلے نقل کی جا چکی ہے۔ مؤلف خیر الکلام ص۳۱ و ۳۲ پر لکھتے ہیں کہ ان کے ہاں سکتاتِ امام میں پڑھنے سے بھی فرض ادا ہو جاتا ہے (محصلہ) لیکن اپنے مقام پر تفصیل کے ساتھ آئے گا کہ شیخ الاسلامؒ سکتات کے قائل نہیں ہیں اس لیے یہ توجیہ مردود ہے۔ رہا شیخ الاسلامؒ کا حنبلی ہونا ؟ تو اس پر سینکڑوں حوالے نقل کیے جا سکتے ہیں مگر ہم صرف نواب صدیق حسن خاں صاحبؒ کے ایک حوالے پر اکتفا کرتے ہیں کہ شیخ الاسلام کو شیخ الحنابلہ لکھتے ہیں۔
(الجنۃ فی الاسوۃ الحسنۃ بالسنۃ ص۲۸)

حافظ ابن القیمؒ[1]: (المتوفی ۷۵۱ھ) مسئلہ خلف الامام کی تحقیق میں ارشاد فرماتے ہیں:
کہ آں حضرت صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے مقتدی پر سے سجدہ سہو ساقط کر دیا ہے۔ بایں طور کہ امام کے پیچھے مقتدی کے بھولنے سے مقتدی پر سہو لازم نہ ہوگا۔ یعنی جب امام کی نماز صحیح ہو گئی تو مقتدی کی نماز بھی صحیح ہو گی۔ اسی طرح آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے مقتدی پر سورۃ فاتحہ کا پڑھنا بھی ساقط کر دیا ہے، کیونکہ امام کا پڑھنا مقتدی کا پڑھنا ہے۔ آگے لکھتے ہیں:

فقرأۃ الامام وسترتہ قرأۃ لمن خلفہ وسترۃ لہ۔ (کتاب الروح لابن القیمؒ ص۱۶۶)

یعنی امام کی قرأۃ مقتدیوں کی قرأۃ ہے اور امام کا سترہ مقتدیوں کا سترہ ہے (نہ ان کو الگ قرأۃ کی ضرورت ہے اور نہ سترہ کی)۔

---

[1] امام سیوطیؒ لکھتے ہیں کہ انھوں نے تصنیف کتب، مناظرہ اور مسائل کے استنباط میں بڑی جدت کی اور محنت اٹھائی ہے۔ حتی کہ علم حدیث، تفسیر اور فقہ میں وہ کبار ائمہ میں شمار ہوتے ہیں۔ (بغیۃ الوعاۃ ص۲۵)
ملا علی قاریؒ حنفی المتوفی ۱۰۱۴ھ لکھتے ہیں کہ حافظ ابن تیمیہؒ اور حافظ ابن القیمؒ اکابر اہل السنۃ والجماعت میں سے تھے۔ اور اس امت کے اولیاء میں ان دونوں کا شمار ہوتا ہے۔ (جمع الوسائل شرح شمائل طبع مصر، جلد ا ص۲۰۸)
نواب صدیق حسن خاں صاحبؒ لکھتے ہیں کہ وہ المتکلم الحافظ اور الامام تھے۔ (دلیل الطالب ص۹۰۳)
اور دوسرے مقام پر یوں پھول برساتے ہیں۔ علامہ کبیر مجتہد مطلق تمام علوم وفنون میں اپنے معاصرین پر تفوق رکھنے والے اور مذاہب کے جاننے میں تمام آفاق میں مشہور اور علوم کے سمندر تھے۔ (تقصار ص۸۱)

یہ مضمون بھی نہایت روشن ہے اور غیر مبہم - مزید تفصیل کی ضرورت نہیں -

امام شاہ ولی اللہ الدہلویؒ[1]: (المتوفی ۱۱۷۶ھ) ان کو بھی بعض حضرات نے (جن میں مولانا عبدالرحمٰن صاحب مبارک پوریؒ بھی شامل ہیں - دیکھیے (تحقیق الکلام جلد ۱ ص۵ وغیرہ) مجوزین قرأۃ خلف الامام میں شامل کر لیا ہے - حالانکہ معاملہ یوں نہیں ہے - چنانچہ حضرت شاہ صاحب تحریر فرماتے ہیں:

فان جهر الامام لم يقرأ الا عند الاسكات وان خافت فله الخيرة -	اگر امام جہر سے قرأت کرتا ہو تو مقتدی کو اس کے پیچھے قرأۃ نہیں کرنی چاہیے، ہاں مگر سکتاتِ امام میں اور سری نمازوں میں مقتدی کو اختیار ہے چاہے پڑھے چاہے نہ پڑھے -
(حجۃ اللہ البالغۃ جلد ۲ ص۹ طبع مصر)	

اور دوسرے مقام پر لکھتے ہیں: وَاِذَا قُرِئَ الْقُرْاٰنُ فَاسْتَمِعُوْا لَهٗ وَاَنْصِتُوْا دلالت تمی دارد مگر در جہر - (انفاس العارفین ص۸) یہ بحث تو اپنے مقام پر آئے گی کہ سکتاتِ امام کا کیا کہاں اور کتنا ثبوت ہے؟ اور یہ بھی کہ آیت مذکورہ سری نمازوں کو بھی شامل ہے نہ کہ فقط جہری نمازوں کو - لیکن یہ بات بالکل عیاں ہو جاتی ہے - کہ شاہ صاحبؒ قرأۃ خلف الامام کے جہری نمازوں میں مطلقاً اور سری نمازوں میں وجوب کے قائل نہ تھے -

قاضی مقبول احمد صاحب نے مغالطات احسن الکلام ص۳۲ اور الاعتصام ۳۱ ر اگست ۱۹۶۲ء، ص۵ کالم ۲ میں خاصا واویلا کیا ہے - جس کا خلاصہ یہ ہے کہ مصنف احسن الکلام نے حضرت شاہ ولی صاحبؒ کی عبارت کے نقل کرنے میں خیانت کی ہے - اور حضرت شاہ صاحب کی غلط ترجمانی کی بخلاف اس کے مولانا عبدالرحمٰن صاحبؒ مبارکپوری نے صحیح ترجمانی کی ہے چنانچہ وہ لکھتے ہیں کہ شاہ صاحب کی یہ عبارت ہضم کر لی گئی ہے اور اگر پڑھے تو سورہ فاتحہ کو اس طرح پڑھے کہ امام کو خلجان پیش نہ آئے - اور میرے نزدیک یہ بہتر قول ہے - (حجۃ اللہ البالغۃ ج ۲ ص۹ بمغالطات احسن الکلام ص۳۲)

---

[1] نواب صاحبؒ لکھتے ہیں: کہ وہ المحدث اور المشہور تھے - (اکسیر ص۹۰) نیز لکھتے ہیں کہ وہ الشیخ الاجل اور المحدث تھے - (الحطۃ ص۷۳) مولانا میر سیالکوٹی رح لکھتے ہیں کہ حضرت شاہ ولی اللہ صاحبؒ کے بعد اس وقت تک ہندوستان میں تو ایسا شخص نہیں ہوا - کہ اسے امام کہہ سکیں اور دوسرے ممالک کا حال خدا جانے -

(اخبار اہل حدیث ۱۵ر نومبر ۱۹۲۹ء)

اور الاعتصام میں لکھتے ہیں کہ مناسب معلوم ہوتا ہے کہ اس موقع پر مولانا عبدالرحمٰن صاحبؒ مبارکپوری کی یہ عبارت بھی نقل کر دی جائے تاکہ قارئین اچھی طرح اندازہ فرما سکیں کہ شاہ ولی اللہ الدہلوی علیہ الرحمۃ کا مسلک بیان کرنے میں کس نے غلطی کی ہے۔ مولانا مبارک پوری نے یا مولانا سرفراز نے؟

مولانا عبدالرحمٰن مبارک پوری علیہ الرحمۃ فرماتے ہیں: شاہ ولی اللہ الدہلویؒ نے بھی باوجود حنفی المذہب ہونے کے امام کے پیچھے الحمد پڑھنے کو اولیٰ الاقوال بتایا ہے۔ (تحقیق الکلام جلد۱ ص۵) آپ دونوں عبارتیں ملاحظہ فرمائیں اور بتائیں کہ کیا مولانا عبدالرحمٰن مبارک پوریؒ نے شاہ ولی اللہ علیہ الرحمۃ کی غلط ترجمانی کی ہے یا مولوی سرفراز نے؟

الجواب: قاضی صاحب غصہ جانے دیجیے احسن الکلام کے ٹھوس دلائل اور محکم براہین نے آپ کے اور آپ کی جماعت کے دماغ کو ضرور ماؤف کر دیا ہے اور دل کی بھڑاس نکالنے کے اور اپنے متعصب حواریوں کو یہ باور کرانے کے لیے کہ مغالطاتِ احسن الکلام ہماری طرف سے مکمل جواب ہے یا الاعتصام میں بے سوچے سمجھے چند مضامین درج کر کے احسن الکلام کا جواب تصور کر لینا علمی دنیا میں کوئی وقعت نہیں رکھتا۔ ہاں اپنے چند باقی حواریوں کو جماعت میں منسلک رکھنے کے لیے قدرے سنبھالا ہو سکتا ہے۔ مگر تابکے؟ لوگ دلائل دیکھا کرتے ہیں۔ ہم حضرت شاہ ولی اللہ صاحبؒ کی مکمل عبارت نقل کرتے ہیں اور قارئین کرام سے التماس کرتے ہیں کہ وہ انصاف سے فرمائیں کہ حضرت شاہ صاحب کی عبارت میں خیانت کس نے کی ہے؟ آیا مولانا مبارک پوری صاحبؒ اور ان کے وکیل قاضی مقبول احمد صاحب نے یا سرفراز نے؟ حضرت شاہ صاحب کی عبارت مع ترجمہ یہ ہے:

وان كان مأموما وجب عليه الانصات	اور اگر وہ مقتدی ہو تو اس پر خاموش رہنا اور سننے
والاستماع فان جهر الامام لم يقرأ الا	کے لیے توجہ کرنا واجب ہے۔ پس اگر امام جہر سے پڑھے تو
عند الاسكاتة وان خافت فله الخيرة فان	مقتدی قرأۃ نہ کرے مگر سکتہ میں اور اگر امام آہستہ پڑھے
قرأ فليقرأ الفاتحة قرأة لا يشوش على الامام	تو مقتدی کو اختیار ہے پس اگر مقتدی پڑھے تو فاتحہ پڑھے
وهذا اولى الاقوال عندي وبه يجمع بين	اس طرح کہ امام کو خلل میں نہ ڈالے اور یہ میرے نزدیک سب سے
احاديث الباب والسر فيه ما نص عليه من	بہتر قول ہے اور یونہی اس باب کی حدیثیں باہم جمع کی جاتی
ان القرأة مع الامام تشوش عليه وتفوت	ہیں اور راز اس میں یہ ہے کہ شارع نے صراحت کے ساتھ

التدبر وتخالف تعظیم القرآن ولم یعزم
علیهم ان یقرؤا استنان العامة متی
ارادوا ان یصححوا الحروف باجمعهم
کانت لهم لجة مشوشة فسجل فی
النهی عن التشویش ولم یعزم علیهم مایؤدی
الی المنهی وابقی خیرة لمن استطاع و
ذلك غایة الرحمة بالامة انتهی۔
(حجۃ اللہ البالغۃ جلد ۲ ص۹ طبع مصر)

بتایا ہے کہ امام کے ساتھ قرأۃ کرنا اس کو خلل میں ڈالتا ہے
اور تدبر کو فوت کر دیتا ہے اور تعظیم قرآن کے مخالف ہے۔
اور تاکیداً ان کو نہیں فرمایا کہ وہ ضرور آہستہ پڑھیں کیونکہ
عام لوگ جب مل کر تصحیحِ حروف کا ارادہ کریں گے تو ان کی
آواز بلند ہوگی جو باعث تشویش ہوگی سو اس تشویش کی
نہی میں تو تاکید کی ہے مگر آہستہ پڑھنے کی تاکید نہیں کی
جو اس ممنوع چیز تک ان کو پہنچائے اور اختیار دیا گیا ہے کہ جو
پڑھ سکتا ہے پڑھے اور یہ امت کے ساتھ انتہائی رحمت ہے۔

یہ تمام خط کشیدہ عبارت قاضی مقبول احمد صاحب شیر مادر سمجھ کر پی گئے ہیں جس سے سرّی نمازوں میں قرأۃ کرنے اور نہ کرنے کے اختیار کا راز کھلتا ہے۔ اور فان قرأ فلیقرأ الخ کا (جو ولمن خافت فلہ الخیرۃ کی تفریع ہے) معنی اور اگر پڑھے الخ کر کے اپنی لیاقت کا ثبوت دیا ہے اور غصہ ہم پر آرہا ہے کہ غلط ترجمانی ہم نے کی ہے۔ یہ ہے فریق ثانی کے علماء کا علم اور لیاقت سبحان اللہ تعالیٰ قاضی صاحب! حضرت شاہ صاحبؒ حرف فا کے ساتھ (جو تفریع اور ترتیب کے لیے ہوتا ہے) یہ فرماتے ہیں کہ اگر مقتدی نے سرّی نمازوں میں پڑھنے کی شق کو اختیار کیا تو اس طرح فاتحہ پڑھے کہ امام کے لیے باعث تشویش نہ ہو حرف واؤ کے ساتھ بیان نہیں کر رہے جس کا معنی اور اگر پڑھے الخ اور والسرّ فیہ سے آہستہ پڑھنے کا اور الخیرۃ کا راز بیان فرمایا ہے۔ حضرت شاہ صاحبؒ نے تمام سرّی اور جہری نمازوں میں سورۃ فاتحہ کے پڑھنے کو اولی الاقوال نہیں فرمایا جیسا کہ مبارکپوری صاحبؒ نے دھوکہ کھایا ہے اور قاضی صاحب موصوف دھوکہ دہی پر کمربستہ ہیں کسی عربی کے ماہر ثالث سے فیصلہ کرالیں کہ اس کا مطلب سرفراز ٹھیک بیان کر رہا ہے؟ یا مبارکپوری صاحبؒ جو فرماتے ہیں وہ درست ہے؟

جو بات حق ہو وہ مجھ سے چھپی نہیں رہتی
خدا نے مجھ کو دیا ہے دلِ خبیر و بصیر!

قارئین کرام! آپ کو اس ماسبق بحث سے یہ اندازہ بخوبی ہو گیا ہو گا کہ حضرات صحابہ کرامؓ اور تابعینؒ و تبع تابعینؒ اور ائمہ اربعہؒ اور ان کے علاوہ امت کی اکثریت کے نزدیک

جہری نمازوں میں امام کے پیچھے سُورۂ فاتحہ کی قرأۃ کو جائز نہیں سمجھا جاتا تھا۔ بلکہ وہ جہری نمازوں میں امام کے پیچھے مقتدی کا سُورۂ فاتحہ پڑھنا شاذ، مخالف قرآن وسنت اور مخالفِ اجماع سمجھتے تھے اور سرّی نمازوں میں بھی اُمّت کی اکثریت وجوب قرأۃ کی قائل نہ تھی۔ اس بحث کے پیشِ نظر فریقِ ثانی کے یہ باطل اور بے بنیاد دعاوی کہ امام کے پیچھے سُورۂ فاتحہ نہ پڑھنے والے بے نماز مفسدینِ صلوٰۃ اور تارکِ سُنّت ہیں اور ان کے ساتھ مُباہلہ تک کرنا بھی صحیح ہے۔ ملاحظہ کیجئے کہ کہاں تک صحیح ہیں؟ اور ان کے ان غلو آمیز اور شر انگیز گستاخانہ کلمات سے کون امام بچ سکتا ہے؟ ہم نے محض نمونہ کے طور پر بعض حضرات ائمہ رحمہم اللہ کی عبارات مقدمہ میں درج کی ہیں۔ ان کے علاوہ باب اوّل میں آیت کی تفسیر میں حضرات تابعینؒ واتباع تابعینؒ کے جو آثار بیان ہوں گے۔ نیز باب سوم میں آثار حضرات صحابہؓ وتابعینؒ کے تحت جو آثار ذکر کیے جائیں گے۔ وہ ان کے علاوہ ہیں اور اگر آپ کی نزاکت طبع وقلتِ فرصت کا خیال دل کی گہرائیوں میں دب دب کر نہ اُبھرتا تو ہم ان کو بھی مقدمہ میں جگہ دیتے۔ کیونکہ ؎

رہ روان را خستگی راہ نیست
عشق ہم راہ ہست وہم خود منزل است

اب ہم مقدمہ میں انہی اقتباسات پر اکتفا کرتے ہوئے صرف حضرت امام احمد بن حنبلؒ کی ایک جامع ومانع عبارت نقل کرتے ہیں۔ بغور پڑھیے۔ امام ابن قدامہؒ فرماتے ہیں:

قال احمدؒ[1] ما سمعنا احدًا من اهل الاسلام يقول ان الامام اذا جهر بالقرأة لا يجزئ صلوٰة من خلفه اذا لم يقرأ وقال هذا النبى صلى الله عليه وسلم واصحابه والتابعون وهذا مالكؒ فى اهل الحجاز وهذا الثوريؒ

امام احمد بن حنبلؒ نے فرمایا کہ ہم نے اہلِ اسلام میں کسی سے نہیں سنا۔ جو یہ کہتا ہو کہ جب امام جہر سے قرأۃ کرتا ہو اور مقتدی اس کے پیچھے قرأۃ نہ کرے تو مقتدی کی نماز باطل اور فاسد ہو جاتی ہے اور فرمایا یہ آں حضرت صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم ہیں۔ اور یہ آپ کے صحابہؓ اور تابعینؒ ہیں اور یہ امام مالکؒ ہیں اہل حجاز میں اور یہ امام ثوریؒ ہیں

---

[1] اور نواب صدیق حسن خاں صاحبؒ دارقطنی کے حوالے سے ایک روایت رجالہ کلھم ثقات کے الفاظ سے نقل کر کے آگے لکھتے ہیں کہ حدیث دلیل است بر عدم قرأۃ چیزی در پس امام در حالت جہر امام ولہٰذا احمدؒ گفتہ ما سمعنا احدًا يقول ان الامام اذا جهر بالقرأة لا تجزئ صلوٰة من لم يقرأ۔ اھ (ہدایۃ السائل ص ۱۹۳)

فی اهل العراق وهذا الاوزاعی فی اهل الشام وهذا اللیث فی اهل مصر ما قالوا لرجل صلی وقرأ امامه ولم یقرأ هو صلوته باطلة۔ (مغنی ابن قدامہ ج ۱ ص ۶۰۶ بعینہا یہ عبارت شرح مقنع جلد ۲ ص ۱۳ میں بھی ہے)

اہلِ عراق میں اور یہ امام اوزاعیؒ ہیں اہلِ شام میں اور یہ امام لیثؒ بن سعدؒ ہیں اہلِ مصر میں ان میں سے کسی نے یہ نہیں کہا کہ جب کوئی شخص نماز پڑھے اور اس کا امام قراۃ کرے اور مقتدی خود قراۃ نہ کرے تو اس کی نماز باطل اور فاسد ہو جاتی ہے۔

درماندگی:

مصنف خیر الکلام نے حضرت امام احمدؒ بن حنبلؒ کی اس واضح اور صریح عبارت کا جو جواب دیا ہے اس کو پڑھ کر ان کی علمی حالت پر بے ساختہ ترس آتا ہے وہ فرماتے ہیں کہ

(۱) اس کا مطلب بھی یہی لینا چاہیئے کہ امام کے ساتھ ساتھ پڑھنا کسی کے نزدیک ضروری نہیں بلکہ قراۃ کا فریضہ (جن کے ہاں قراۃ فرض ہے) سکتات میں ادا ہو سکتا ہے۔ الخ (خیر الکلام ص ۳۲)

(۲) یا امام احمد بن حنبلؒ کی عبارت کا یہ مطلب ہے کہ چونکہ یہ مسئلہ اختلافی ہے اس لیے کسی کی تحقیق میں فاتحہ فرض نہ ہو تو وہ جہری نمازوں میں نہ پڑھے تو اس کی نماز ہو جاتی ہے باقی رہا یہ سوال کہ امام صاحبؒ نے جہر کی قید کیوں لگائی ہے اس اختلافی مسئلہ میں تو جہر اور سر برابر ہے اس کی وجہ یہ ہے کہ سری نمازوں میں منع کی چونکہ کوئی دلیل نہیں اس واسطے بعض علماء نے اس کو اختلافی مسئلہ قرار نہیں دیا بلکہ اتفاقی سمجھ کر یہ فتویٰ لگایا کہ سری نمازوں میں جو شخص نہ پڑھے اس کی نماز باطل ہے۔ الخ (ص ۳۲ خیر الکلام)

(۳) بعض حنفیہ (احسن الکلام ص ۲۴) نے علامہ کی عبارت سے قرأ امامہ امام پڑھ رہا ہو گا جملہ حذف کر دیا ہے پھر امام احمد بن حنبلؒ سے یہاں اوزاعیؒ اور لیثؒ کا نام بھی نقل کر دیا ہے حالانکہ امام ابن عبد البرؒ نے ان دونوں سے فاتحہ کی فرضیت نقل کی ہے معلوم ہوتا ہے کہ امام احمد بن حنبلؒ کو ان کے اس قول کا علم نہیں۔ الخ (ص ۳۳ و ۳۴)

الجواب: یہ ہے فریقِ ثانی کے رئیس المحدثین قدوۃ السالکین اور استاذ الاساتذہ کا جواب جس میں ایک رتی جان بھی نہیں ہے۔ ترتیب وار سُنیئے:

۱۔ حضرت امام احمد بن حنبلؒ سکتات کا مسئلہ نہیں بیان فرما رہے بلکہ تصریح کرتے ہیں کہ جہری

نمازوں میں امام کے پیچھے مطلق قرآۃ نہ کرنے والے کی نماز تمام اہل اسلام کے نزدیک جائز ہے اور اس کا ایک شخص بھی منکر اور مخالف نہیں ہے۔ اگر امام احمد بن حنبلؒ کے علم میں یہ ہوتا کہ امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ (یا کوئی اور) اس کا مخالف ہے تو باوجود قرب زمانے کے بلکہ امام شافعیؒ کا شاگرد ہونے کے (دیکھیے تہذیب التہذیب جلد ۱ ص ۲۷) کبھی یہ دعویٰ نہ کرتے کہ اہل اسلام میں اس کا کوئی قائل نہیں۔ چودھویں صدی کے مجتہدین کا تو انہیں کوئی علم نہ تھا تاکہ ان کے لیے کوئی گنجائش چھوڑ دیتے حضرت امام احمدؒ بن حنبلؒ کا یہ ارشاد امام شافعیؒ کے مسلک کی وضاحت کے لیے ایک مستقل دلیل ہے اور اپنے مفہوم میں بالکل واضح ہے کہ امام کے پیچھے قرأت ترک کرنیوالے کی نماز بالکل صحیح ہے۔

عـ۲ - امام احمد بن حنبلؒ تو جہری نمازوں میں تمام اہل اسلام کا اتفاق نقل فرماتے ہیں۔ پھر ان کی عبارت کا مطلب چونکہ یہ مسئلہ اختلافی ہے الخ کس طرح صحیح ہوا۔ رہا سرّی نمازوں کے بارے میں مصنّف خیر الکلام کا یہ فرمانا کہ چونکہ دلیل نہیں ..... الخ (محصلہ) ممکن ہے اس چونکہ سے ان کے حواری تو شاید مطمئن ہو جائیں مگر علمی دنیا کبھی اس چونکہ سے مطمئن نہیں ہو سکتی۔ کیونکہ سرّی نمازوں میں بھی عدم قرأت کی دلیل ایک نہیں کئی ٹھوس دلائل ہیں اور صرف ایک برہان نہیں بلکہ متعدد براہین موجود ہیں۔ اور یہ مسئلہ بھی خاصا اختلافی ہے اور جو حضرات پڑھنے کے قائل ہیں۔ مثلاً: امام مالکؒ اور امام احمد بن حنبلؒ وغیرہ تو وہ بھی سرّی نمازوں میں وجوب کے قائل نہیں ہیں سوائے گنے چنے چند حضرات کے کوئی امام سرّی نمازوں میں قرآۃ نہ کرنے والے کی نماز کے بطلان کا ہرگز قائل نہیں اور یہی جمہور کا مسلک ہے۔

عـ۳ قدوۃ السالکین کا تعصب ملاحظہ ہو کہ یہ حسن ظنی ان کے قلب مبارک میں پیدا ہی نہیں ہوئی کہ یہ لفظ چھوٹ گیا ہے بلکہ فرماتے ہیں حذف کر دیا ہے اور خیر الکلام صـ۵۵۶ مناقشہ ۹ میں لکھا ہے کہ اس عبارت میں سے جملہ وقرأ اماما اور اس کا امام پڑھتا ہو چھوڑ دیا ہے تاکہ جہری و سرّی سب نمازوں کو یہ فتویٰ شامل ہو۔ انتہیٰ بلفظہٖ۔ فریق ثانی کے رئیس المحدثین کو معلوم ہونا چاہیے کہ احسن الکلام جلد ۱ صـ۲۴۲ پر جہاں یہ عبارت نقل کی گئی ہے اس کے ترجمہ میں یہ لفظ موجود ہیں کہ جب امام جہر سے قرآۃ کرتا ہو الخ اس کی موجودگی میں یہ احتمال کہاں سے اور کیونکر پیدا ہوا کہ سرّی نمازیں بھی اس میں شامل ہوں جب کہ راقم کے نزدیک سرّی کو یہ شامل ہی نہیں تو سب کو شامل

ہونے کا کیا معنیٰ؟ آپ کو معلوم ہونا چاہیے کہ چار سو صفحات کی کتاب میں کسی ایک آدھ جملہ کا
چھوٹ جانا یا کتابت میں غلطی کا واقع ہونا غیر اغلب نہیں ہوتا۔ آپ کے فہمِ مبارک سے
اِنَّ بَعْضَ الظَّنِّ اِثْمٌ کیوں نکل گیا؟ باقی امام عبد البرؒ سے بدرجہا زیادہ امام احمدؒ بن حنبلؒ امام
اوزاعیؒ اور امام لیثؒ کے مسلک کو جانتے ہیں۔ مجتہد مطلق بھی ہیں اور قرب زمانہ بھی ہے
اور یہ حوالہ علامہ ابنِ قدامہؒ کے علاوہ اور دیگر ثقہ اور ثبت حضرات محدثین عظامؒ نے بھی
نقل فرمایا ہے۔ اس لیے اس سلسلہ میں امام احمدؒ بن حنبلؒ کا علم بالکل صحیح ہے اور مؤلف
خیر الکلام کی بات پرکاہ کی حیثیت بھی نہیں رکھتی۔

اقرار کے ساتھ انکار کی دم:

مصنف خیر الکلام نے جب بخوبی یہ محسوس کر لیا کہ حضرت امام احمدؒ بن حنبلؒ کی اس
ٹھوس اور واضح عبارت کے جواب میں میری لکھی ہوئی سینہ زاد باتیں ناکام ہیں تو آخر میں
اقرار بھی کیا ہے۔ چنانچہ وہ لکھتے ہیں کہ پس زیادہ سے زیادہ یہ کہا جا سکتا ہے کہ امام احمدؒ بن حنبلؒ
کے قول کا مطلب وہی ہے جو ناقل (سرفراز) نے سمجھا ہے تو اس کا یہ مطلب ہوگا کہ امام احمدؒ بن حنبلؒ
نے آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے قول کی تاویل کی ہے اور صحابہ کرامؓ کے اقوال ان کو بسند صحیح نہیں
پہنچے۔ مگر امام بخاریؒ اور دیگر محدثین کو وہ اقوال بسند صحیح پہنچ گئے اس لیے انھوں نے آں حضرت صلی
اللہ علیہ وسلم کے قول لا صلوٰۃ لمن لم یقرأ بفاتحۃ الکتاب جو فاتحہ نہ پڑھے اس کی نماز نہیں ہے۔
اس کی تاویل نہیں کی جیسا کہ امام احمدؒ بن حنبلؒ نے تاویل کی ہے۔ الیٰ ان قال بہر صورت اس اختلافی
مسئلہ میں ایک امام کی رائے ہے جو دوسرے ائمہ حدیث خصوصاً امام بخاریؒ (جو بقول حافظ ابن حجرؒ امام
احمدؒ سے فقہ اور حدیث میں بیسیوں گنا سے زیادہ ہیں۔ مقدمہ فتح الباری ص ۴۸۷) کی رائے کے خلاف
ہے پس کسی صورت میں یہ قابل التفات نہیں۔ (خیر الکلام ص ۳۴ و ۳۵)

الجواب: حضرت امام احمدؒ بن حنبلؒ اس مقام پر اہلِ اسلام کا متفقہ فیصلہ اور ائمہ مذکورین
کا اجماع نقل کر رہے ہیں کہ امام کے پیچھے قرأت نہ کرنے والے کی نماز فاسد اور باطل ہونے کا کوئی
قائل نہیں۔ حدیث کی تاویل اور عدم تاویل کا ذکر وہ یہاں نہیں فرما رہے وہ تو اہل اسلام کا متفقہ فیصلہ
نقل فرما رہے ہیں اور حضرات صحابہ کرامؓ کے اقوال اگر امام احمدؒ بن حنبلؒ کو بسند صحیح نہیں پہنچے تو

اور کس کو پہنچے ہیں؟ اور جو اقوال حضرت امام بخاریؒ کو بقول مصنف خیر الکلام بسند صحیح پہنچے ہیں ان کا حال بھی اپنے مقام پر احسن الکلام جلد دوم میں واضح کر دیا گیا ہے جن کو مؤلف مذکور نے تنکوں کا سہارا دے کر تھامنے کی بے جا سعی کی ہے مگر سنبھلے پھر بھی نہیں۔ رہا یہ کہ امام بخاریؒ امام احمدؒ بن حنبلؒ سے بلیں گنا فقہ و حدیث میں زیادہ ہیں۔ صرف عقیدت کی نقل سے کچھ نہیں بنتا۔ اس کا قائل اور اس کا درجہ معلوم ہونا چاہیے اور اس کی علمی شہرت اور اکثر امت کا اعتماد با حوالہ درکار ہے۔ محض نقل کی حیثیت کیا ہے؟ اور اگر وہ کوئی معتبر امام ہے تو یہ صرف ان کی غلو فی العقیدت کا اظہار ہے۔ حضرت امام بخاریؒ کا جو مقام حدیث و فقہ میں ہے اس کا کون منکر ہے یا ہو سکتا ہے؟ لیکن حدیث و فقہ میں جو مقام حضرت امام احمدؒ بن حنبلؒ کا ہے وہ حضرت امام بخاریؒ کا نہیں ہے اس لیے کہ حضرت امام احمدؒ بن حنبلؒ بالاتفاق ائمہ مجتہدین میں شمار ہوتے ہیں اور حضرت امام بخاریؒ کے متعلق مختلف آرا ہیں کوئی ان کو مجتہد مطلق کہتا ہے اور کوئی مجتہد فی المذہب کہتا ہے۔ اور امام سبکیؒ اور حضرت شاہ ولی اللہ صاحبؒ ان کو شافعیؒ بتاتے ہیں ہم نے بقدر ضرورت طائفہ منصورہ میں اس پر با حوالہ بحث کی ہے اور امام بخاریؒ بقول حافظ ابن حجر عسقلانیؒ فقہی مسائل میں امام شافعیؒ اور امام ابو عبیدہؒ کے خوشہ چین اور ان کی کتب سے استمداد کرتے ہیں۔ اس لیے دونوں میں زمین و آسمان کا فرق ہے۔ ہمارے لیے دونوں دل کا نور اور آنکھوں کا سرور ہیں مگر فرق مراتب ضرور ہے لہٰذا حضرت امام احمدؒ بن حنبلؒ کے اس واضح اور روشن حوالہ کو ہرگز نظر انداز نہیں کیا جا سکتا اور نہ علمی دنیا میں اس کو باور کرنے کے لیے کوئی تیار ہے اور یہ حضرت امام حضرت احمدؒ بن حنبلؒ ہی کی رائے نہیں بلکہ جمہور حضرات صحابہ کرامؓ تابعینؒ اتباع تابعینؒ اور ائمہ دینؒ کی رائے ہے اور اتنی بڑی وزنی رائے ہے جس نے فریق ثانی کے اس غلو اور بے جا تعصب کا بھیجا نکال دیا ہے کہ قراءۃ خلف الامام نہ کرنے والوں کی نماز بے کار، باطل اور کالعدم ہے۔ اس لیے امام احمدؒ بن حنبلؒ کی اس مسئلہ میں لاعلمی کا دعویٰ (جیسا کہ مؤلف خیر الکلام نے کیا ہے) بالکل بے بنیاد اور سراسر مردود ہے۔ عجب نہیں کہ مؤلف مذکور یہ کہہ دیں: ع

مگر میں نے تو اپنا فائدہ انکار میں دیکھا

آں حضرت صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم اور حضرات صحابہ کرامؓ و تابعین عظامؒ اور بعض دیگر ائمہؒ (جن سے آپ ماسبق حواشی میں اچھی طرح روشناس ہو چکے ہیں) کا یہ فیصلہ دیکھ لیجئے۔

اور فریقِ ثانی کے مفسدین صلوٰۃ اور بے نماز ہونے کے خالص متعصبانہ فتوے اور مباہلہ کے اعلان اور فراخ دلی سے انعامی چیلنج ملاحظہ کر لیجیے اور پھر فرمائیے کہ تکفیر کس کی ہو گی؟ اور بے نماز کون ہو گا؟ مفسدِ صلوٰۃ کون ہو گا؟ اور مباہلہ کس سے ہو گا؟ تارکِ سنت کون ہو گا اور انعامی چیلنج کا مستحق کون ہو گا؟ افسوس ہے کہ فریقِ ثانی نے تعصب اور کم فہمی کی وجہ سے ایسا ایٹم بم ایجاد کر لیا کہ اس کی زد سے نہ بڑے بڑے ائمہ بچ سکتے ہیں اور نہ حضرات تابعینؒ بلکہ حضرات صحابہ کرامؓ اور حتیٰ کہ آں حضرت صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کی ذاتِ گرامی بھی ان کے لایعنی فتووں سے محفوظ نہیں رہ سکتی۔ (العیاذ باللہ تعالیٰ ثم العیاذ باللہ تعالیٰ) دیکھئے اس ناروا فتوے کی زد سے کون بچ سکتا ہے؟ ؎

متاعِ دین و دانش لٹ گئی اللہ والوں کی
یہ کس کافر ادا کا غمزۂ خوں ریز ہے ساقی!

باوجود اس کے کہ حق جمہور کے ساتھ ہے اور سو فیصدی ان کی رائے درست اور صحیح ہے۔ مگر وہ فریقِ ثانی کی طرح اس مسئلہ میں (بلکہ دیگر تمام اختلافی مسائل میں) نہ تو مجوزین قرأۃ خلف الامام کی تکفیر کرتے ہیں اور نہ قسم اٹھا کر ان کو بے نماز اور مفسدین صلوٰۃ کہتے ہیں اور نہ ان کو مباہلہ کا چیلنج دیتے ہیں۔ بلکہ جن اکابر (مثلاً امام بخاریؒ و امام بیہقیؒ وغیرہ) نے اپنی انتہائی وسعت اور کوشش صرف کر کے جمہور کی رائے کے ساتھ اختلاف رائے کیا ہے۔ نہ صرف یہ کہ ان کو معذور تصور کرتے ہیں بلکہ ماجور بھی سمجھتے ہیں اور ائمہ دین اور دیگر حضرات سلف صالحینؒ کی نسبت بدظنی اور سوءِ اعتقاد کو کسی طرح بھی روا نہیں سمجھتے: ؎

وفاؤں کے ہزاروں دے چکے ہیں امتحاں اب تک
مگر وہ ہیں کہ اس پر بھی ہیں ہم سے بدگماں اب تک

اگر بہ نظرِ انصاف دیکھا جائے تو فریقِ ثانی کے بے بنیاد اور بے پا در ہوا دعووں اور فتووں کا جواب تو اس مقدمہ ہی سے پورا ہو جاتا ہے اور مزید کوئی چیز پیش کرنے کی ضرورت باقی نہیں رہتی۔ مگر چونکہ ہم تہیہ کر چکے ہیں کہ مسئلہ زیرِ بحث کو پوری طرح بے نقاب کرنا ہے۔ اس لیے ہم مقدمہ کے بعد اصل بحث اور اس کے دلائل عرض کرتے ہیں ــــــ لیکن باب اوّل شروع کرنے سے قبل یہ ضروری معلوم ہوتا ہے کہ ہم امام ترمذیؒ[1] (المتوفی ۲۷۹ھ) اور علامہ بدرالدین عینیؒ[2] رح

---

[1] و [2] کا مکمل حاشیہ اگلے صفحہ پر دیکھیے۔

(المتوفی ۸۵۵ھ) کی بعض عبارتوں کو یہیں حل کرتے جائیں، جن سے بہت ممکن ہے کہ بعض اہلِ علم کو مغالطہ لگ جائے اور طالب علموں کا غلط فہمی میں مبتلا ہو جانا تو بہت اغلب ہے، رہے وہ حضرات جو غلط فہمی اور مغالطہ کو متاعِ عزیز سمجھ کر سینہ سے لگائے پھرتے ہیں۔ ان کے لیے ہمارے پاس کوئی علاج اور دوا موجود نہیں ہے۔ اللہ تعالیٰ بھی صرف اسی کو ہدایت دیتا ہے جو دل میں اس کی تڑپ اور جذبہ پیدا کرے۔ اور عملاً اس کی طرف پیش قدمی کرے ورنہ اس دربارِ عالی سے بھی محرومی کے بغیر کچھ حاصل نہیں ہو سکتا۔ ؎

یہ بزمِ مے ہے یاں کوتاہ دستی میں ہے محرومی
جو بڑھ کر خود اٹھا لے ہاتھ میں مینا اسی کا ہے

امام ترمذیؒ تحریر فرماتے ہیں: اکثر اہلِ علم جن میں حضرات صحابہ کرامؓ اور تابعینؒ شامل ہیں اور خاص طور پر امام مالکؒ، عبداللہ بن مبارکؒ، شافعیؒ، احمدؒ اور اسحٰقؒ کا یہ مسلک ہے کہ امام کے پیچھے مقتدی کو قرأۃ کرنی چاہیے (ترمذی جلد۱ صفحہ۴۱) ہم پہلے امام مالکؒ، امام شافعیؒ، امام احمدؒ اور امام عبداللہ بن مبارکؒ امام اسحٰقؒ اور

(پچھلے صفحے کے حاشیے) ؎ امام ترمذیؒ، علامہ ذہبیؒ ان کو الامام اور الحافظ لکھتے ہیں۔ صحاح ستہ میں جو مشہور کتاب "الجامع" ہے۔ وہ انہی کی تصنیف ہے۔ اس کے علاوہ کتاب "العلل" بھی انھوں نے لکھی ہے۔ حافظہ میں وہ ضرب المثل تھے۔ (تذکرہ ۲ صفحہ ۱۸۷) مگر افسوس یہ امام عالی مقام بھی جرح سے محفوظ نہ رہ سکے۔ چنانچہ علامہ ابن حزمؒ ایک مقام پر لکھتے ہیں کہ ترمذی صاحب الجامع مجہول ہیں (میزان الاعتدال جلد۳ صفحہ۱۱۷) اگر امام ترمذیؒ مجہول ہیں تو دنیا میں معروف کون ہوگا؟

؎ علامہ بدرالدین عینیؒ، مولانا عبدالحی صاحب لکھنویؒ (المتوفی ۱۳۰۴ھ) لکھتے ہیں کہ وہ امام، عالم، علامہ عالم بالعربیۃ والتصریف اور حافظ لغت تھے۔ نیز لکھتے ہیں کہ اگر ان میں مذہبی تعصب نہ ہوتا تو کیا خوب ہوتا (فوائد البہیہ صفحہ۲۰۸) بعض غیر مقلد حضرات علامہ عینیؒ کے تعصب پر مولانا لکھنویؒ کی یہ عبارت لیے لیے پھرتے ہیں۔ لیکن یہ تو فرمائیں کہ ذہنی تعصب سے کون امام بچ سکا ہے۔ علامہ ذہبیؒ جن کے بعد آج تک کوئی ناقد رجال پیدا نہیں ہوا۔ اور حافظ الدنیا ابن حجرؒ بھی ان کے ناقد رواۃ ہونے پر نہ صرف اعتماد کرتے ہیں بلکہ ان کے خوشہ چین بھی ہیں۔ (شرح نخبۃ الفکر صفحہ۱۱۰) مع ہذا شیخ الاسلام تاج الدین سبکیؒ لکھتے ہیں کہ ذہبیؒ بڑے متعصب ہیں وہ ہمارے استاد ہیں اور ہم پر ان کا حق ہے۔ مگر اللہ تعالیٰ کا حق ان پر مقدم ہے ہم جو کہتے ہیں وہ یہ ہے کہ کسی حنفی یا شافعی کے حق میں ذہبی

بن راہویہ کا مسلک پوری وضاحت سے نقل کر آتے ہیں کہ جہری نمازوں میں ان میں کوئی بھی قرأۃ خلف الامام کا قائل نہ تھا اور سری نمازوں میں امام مالکؒ ، امام احمدؒ اور عبداللہؒ بن مبارکؒ وغیرہ وجوب قرأۃ کے قائل نہ تھے۔ اور خود امام ترمذیؒ نے امام عبداللہؒ بن مبارکؒ سے یہ نقل کیا ہے کہ وہ فرماتے ہیں: بعض لوگوں نے تشدد سے کام لیا ہے لیکن میرے نزدیک جس شخص نے امام کے پیچھے قرأۃ نہ کی اس کی نماز صحیح ہے۔ (ترمذی جلد ۱ ص ۴۲)

اندریں حالات اگر کسی کو امام ترمذیؒ کی اس عبارت سے کوئی شک اور شبہ پیدا ہو۔ تو ہرگز صحیح نہیں۔ المعصوم من عصمہ اللہ تعالیٰ۔ لیجیے ہم آپ کو ترمذیؒ کی اسی عبارت کی شرح مولانا مبارکپوری صاحبؒ کے حوالہ سے سناتے ہیں۔ وہ لکھتے ہیں:

فیہ اجمال ومقصودہ ان ھؤلاء الائمۃ کلھم یرون القرأۃ خلف الامام اما فی جمیع الصلوٰت او فی الصلوٰۃ السریۃ فقط واما علی سبیل الوجوب او علی سبیل الاستحباب والاستحسان۔

کہ امام ترمذیؒ کا یہ قول مجمل ہے۔ ان کی مراد یہ ہے کہ یہ ائمہ مذکورین امام کے پیچھے قرأۃ کے قائل تھے۔ بعض سب نمازوں میں اور بعض صرف سری نمازوں میں۔ بعض وجوب کے قائل تھے اور بعض صرف استحباب اور استحسان کے۔

(تحفۃ الاحوذی جلد ۱ ص ۲۵۴)

اور تصریح کرتے ہیں کہ امام مالکؒ اور امام احمدؒ تمام نمازوں میں امام کے پیچھے قرأۃ کے وجوب کے قائل نہ تھے۔ (ایضاً ص ۲۵۷) اور لکھتے ہیں کہ امام عبداللہؒ بن مبارکؒ بھی امام کے پیچھے وجوب قرأۃ کے قائل نہ تھے۔ (ایضاً ج ۱ ص ۲۵۷)

رہا یہ کہ تمام نمازوں میں قرأۃ خلف الامام کا قائل کون تھا؟ اور پھر خاص طور پر وجوب کا جہاں تک راقم الحروف کے محدود مطالعہ کا تعلق ہے۔ ان ائمہ میں سے جن کا تذکرہ امام ترمذیؒ نے کیا ہے۔ ایک بھی ایسا نہیں جو تمام نمازوں میں قرأۃ خلف الامام کا قائل ہو اور خاص طور پر وجوب کا۔ اگر مولانا مبارکپوری صاحبؒ کو امام شافعیؒ کے مسلک میں غلط فہمی ہوئی ہو۔ تو ہم پوری وضاحت اور

(پچھلے صفحہ کا بقیہ حاشیہ) کا قول مسموع نہیں ہو سکتا۔ کیونکہ وہ شافعیوں اور حنفیوں کے حق میں اکثر تعصب سے کام لیتے ہیں۔ (طبقات الکبریٰ جلد ۴ ص ۱۹۱) والحصمۃ بید اللہ تعالیٰ وحدہ۔

اور صراحت کے ساتھ امام شافعیؒ کا مسلک عرض کر چکے ہیں۔ علامہ عینیؒ لکھتے ہیں کہ

واستدل بھذا الحدیث عبد اللّٰہ بن المبارکؒ والاوزاعیؒ ومالکؒ والشافعیؒ واحمدؒ واسحٰقؒ وابو ثورؒ وداؤدؒ علی وجوب قراءۃ الفاتحۃ خلف الامام فی جمیع الصلوات انتہی بلفظہٖ۔ (عمدۃ القاری ج۳ ص۶۴)

یعنی حضرت عبادۃؓ کی (لا صلوٰۃ لمن لم یقرء بام القرآن) کی روایت سے امام ابن مبارکؒ، امام اوزاعیؒ، امام مالکؒ، امام احمدؒ، امام اسحاقؒ، امام ابو ثورؒ[1] اور امام داؤد ظاہریؒ نے یہ استدلال کیا ہے کہ تمام نمازوں میں قرأت فاتحہ خلف الامام واجب ہے۔

اس عبارت سے غلط فہمی پیدا نہ ہونی چاہیے:

اوّلاً اس لیے کہ ہم ان حضرات ائمہ کرامؒ کی عبارتیں پوری تشریح کے ساتھ اور خود فریق ثانی کے محدث جلیل اور وکیل اعظم مولانا مبارکپوری صاحبؒ کے اقرار کے ساتھ نقل کر آئے ہیں کہ یہ ائمہ تمام نمازوں میں وجوب قرأۃ خلف الامام کے قائل نہ تھے۔ امام ابو ثورؒ کے علاوہ باقی ائمہ کرامؒ کی عبارتیں پہلے نقل کی جا چکی ہیں اور ان کا مسئلہ زیر بحث کے متعلق محقق مسلک بھی عرض کیا جا چکا ہے۔ امام ابو ثورؒ کا صحیح مسلک علی التعیین معلوم نہیں ہو سکا۔ لیکن شیخ الاسلام ابن تیمیہؒ کی پیش کردہ سابق عبارتوں سے بظاہر یہ سمجھا جا سکتا ہے کہ جہری نمازوں میں وہ بھی امام کے پیچھے قرأۃ کو شاذ اور خلاف اجماع ہی سمجھتے ہوں گے اور اسی صفحہ کے حاشیہ سے انکا مسلک یہ معلوم ہوتا ہے کہ اس مسئلہ میں ان کی رائے اور تحقیق وہی تھی جو حضرت امام شافعیؒ کی تھی۔ واللّٰہ اعلم بالصواب۔

وثانیاً علامہ عینیؒ کی اسی عبارت پر گرفت کرتے ہوئے مولانا مبارکپوریؒ صاحب لکھتے ہیں:

---

[1] امام ابو ثورؒ (المتوفی ۲۴۰ھ) علامہ ذہبی لکھتے ہیں: کہ وہ الامام، المجتہد اور الحافظ تھے۔ امام نسائیؒ ان کو ثقہ اور مامون اور احد الفقہاء کہتے ہیں۔ امام ابن حبانؒ کہتے ہیں کہ وہ فقہ، علم، ورع، فضیلت، تصنیف کتب اور تشریح سنت میں دنیا کے اماموں میں ایک تھے۔ (تذکرہ جلد ۲ ص ۸۷) علامہ خطیب لکھتے ہیں کہ وہ احد الثقات المامونین ومن الائمۃ الاعلام فی الدین تھے۔ (بغدادی جلد ۶ ص ۶۵) حافظ ابن حجر لکھتے ہیں کہ وہ پہلے اپنی رائے اور فقہ پر کاربند تھے۔ جب حضرت امام شافعی رحمۃ اللّٰہ علیہ بغداد تشریف لے گئے تو امام موصوف نے اپنے مسلک سے رجوع کر لیا اور امام شافعیؒ کے پاس آتے جاتے رہتے۔ (تہذیب جلد ۱ ص ۱۱۹) اس سے بظاہر یہ متبادر ہوتا ہے کہ امام شافعیؒ کا مسلک اختیار کر لیا تھا۔ واللّٰہ تعالیٰ اعلم۔

قلت هذا وهم من العيني فان عبد الله بن المبارك لم يكن من القائلين بوجوب القرأة خلف الامام كما عرفت وكذالك الامام مالك والامام احمد لم يكونوا قائلين بوجوب قرأة الفاتحة خلف الامام في جميع الصلوٰت۔ انتہی (تحفۃ الاحوذی جلد ا ص ۲۵۷)

میں کہتا ہوں کہ یہ امام بدرالدین عینیؒ کا وہم ہے کیونکہ عبد اللہ بن مبارک امام کے پیچھے وجوب قرأۃ کے قائلین میں نہ تھے جیسا کہ تمہیں معلوم ہو چکا ہے اور اسی طرح حضرت امام مالکؒ اور امام احمد بھی تمام نمازوں میں سورۃ فاتحہ کے امام کے پیچھے پڑھنے کے وجوب کے قائل نہ تھے۔

مولانا مبارکپوری صاحبؒ کا یہ ارشاد فرمانا بالکل صحیح ہے۔ یہ یقیناً علامہ عینیؒ کا وہم اور ان کے سہو قلم کا نتیجہ ہے۔ ورنہ دلائل اور براہین کے رو سے ان ائمہ کا جن کا ذکر علامہ موصوف نے کیا ہے مسلک بادلائل نہایت شرح وبسط کے ساتھ اپنے موقع پر بیان ہوگا اور اجمالی طور پر بقدر کفایت مقدمہ میں ذکر ہو چکا ہے۔

ہمیں اچھی طرح اس امر کا احساس ہے کہ سلسلۂ کلام دراز سے دراز تر ہوتا جا رہا ہے اور شاید کہ آپ منفسہ کی طوالت سے ہی گھبرا جائیں۔ حالانکہ ہم نے ابھی بہت کچھ عرض کرنا ہے۔ اس لیے ہم مقدمہ کو انہی اقتباسات پر ختم کرتے ہیں اور فریق ثانی کی خدمت میں نہایت اخلاص سے عرض کرتے ہیں کہ وہ کوئی ایسا غیر محتاط لفظ زبان سے نہ نکالے جس کی زد میں اکثر امت اور جمہور سلف صالحینؒ آجائیں کیونکہ ہم لوگوں تک حدیث کے پہنچانے کا واحد ذریعہ یہی لوگ ہیں اور ان پر برسنے والا گویا بالواسطہ حدیث پر برس رہا ہے۔ اور ان کی گستاخی کرنے والا کبھی حدیث رسول کا خیر خواہ نہیں ہو سکتا: ؎

تا دامن آکے چاکِ گریباں نے دم لیا

ہے دامن اور جیب میں رشتہ قریب کا

نوٹ: قرآن کریم کی ضروری تشریح حضرت شیخ الاسلام مولانا شبیر احمد عثمانی صاحبؒ کے فوائد سے ماخوذ ہے اور طبقات ابن سعد، شذرات الذہب، تہذیب الاسماء اور ابن خلکان وغیرہ میرے پیش نظر نہیں ہیں۔ ان کتابوں کے حوالے تابعین اور غلامان اسلام سے ماخوذ ہیں۔ باقی جملہ کتابوں سے میں نے براہ راست استفادہ کیا ہے۔ الا ماشاءاللہ تعالیٰ اور حوالہ جات میں صحت کی ہر ممکن کوشش مدنظر رکھی گئی ہے۔

ابوالزاہد

باب اوّل

اصل دین آمد کلام اللہ معظم داشتن
پس حدیث مصطفیٰ بر جاں مسلّم داشتن

اہلِ اسلام سے یہ بات ہرگز مخفی نہیں کہ جو رتبہ، درجہ اور قطعیت اللہ تعالیٰ کے کلام اور اس کی کتاب کو حاصل ہے۔ وہ یقیناً دنیا میں کسی اور کلام اور کتاب کو حاصل نہیں ہے۔ یہی وجہ ہے کہ دلائل اور براہین کے موقع پر مسلمانوں کے ہاں سب سے پہلا نمبر صرف قرآنِ کریم کو حاصل ہے۔ اس لیے کہ قرآنِ کریم کا ایک ایک حرف اور ایک ایک جملہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے نازل ہوا ہے۔ اس میں کسی انسان کی دماغی محنت اور کاوش کو کوئی دخل نہیں ہے۔ بخلاف احادیث کے کیونکہ پہلے ہر حدیث کو نقل بالتواتر کا درجہ حاصل نہیں ہے جیسا کہ قرآنِ کریم کو حاصل ہے اور پھر احادیث میں نقل بالمعنیٰ[1] کا بھی کافی دخل ہے جیسا کہ فنِ حدیث سے تعلق رکھنے والوں پر یہ بات مخفی نہیں ہے۔ لہٰذا یہ امر یقینی ہے کہ جس گروہ کے ہاتھ میں اللہ تعالیٰ کی کتاب سے ثبوت ہوگا۔ اس کا مسلک حق اور صحیح ہوگا اور اس میں کوئی شک و شبہ نہیں ہو سکتا۔ الحمد للہ تعالیٰ کہ امام کے پیچھے قراۃ

[1] بلکہ امام سیوطیؒ وغیرہ نے تو یہاں تک دعوےٰ کیا ہے فان اکثر الاحادیث مروی بالمعنیٰ۔ (الاقتراح ص ۱۶)
یعنی اکثر احادیث جناب رسول خدا صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم سے بقید الفاظ مروی نہیں ہیں۔ بلکہ راویوں نے احادیث کے معانی کو اپنے الفاظ سے تعبیر کیا ہے۔

ترک کرنے پر جمہور کے پاس اللہ تعالیٰ کی کتاب سے قطعی اور محکم دلیل موجود ہے۔

قرآنِ کریم کے آداب:

اس سے قبل کہ ہم قرآنِ کریم کی وہ آیت اور اس کی تفسیر اور تشریح نقل کریں جس سے ہم استدلال کرتے ہیں یہ ضروری سمجھتے ہیں کہ قرآنِ کریم کے عمومی آداب پر غور اور فکر کر لیں کہ جس وقت اور جس مقام پر قرآنِ کریم کی قرآۃ اور تعلیم وتدریس اور تلاوت ہوتی ہو وہاں سامعین کو کیا کرنا چاہیے؟ اور اس موقع پر اللہ تعالیٰ نے ان کو کیا ادب سکھلایا ہے؟ اگر اسی ایک پہلو پر سرسری غور کیا جائے تو بہت ممکن ہے کہ کافی حد تک بحث اسی سے حل اور طے ہو جائے۔ ہم قرآنِ کریم کی چند آیات اور احادیث اور علماء کرام کی بعض عبارتیں اور نقول عرض کرتے ہیں جن سے سامعین کے آداب پر خوب روشنی پڑتی ہے۔ اور قرآنِ کریم کے آداب کا قابلِ تعظیم پہلو بخوبی سمجھ میں آسکتا ہے۔ ملاحظہ کریں۔

(۱) شروع شروع میں جس وقت حضرت جبرائیل علیہ السلام اللہ تعالیٰ کی طرف سے قرآنِ کریم لاتے۔ ان کے پڑھنے کے ساتھ ساتھ آں حضرت صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم بھی دل میں پڑھتے جاتے تھے تاکہ جلد اسے یاد کر لیں اور سیکھ لیں۔ مبادا حضرت جبرائیلؑ چلے جائیں اور وحی پوری طرح محفوظ نہ ہو سکے۔ ظاہر بات ہے کہ اس صورت میں پوری طرح سننے اور سمجھنے میں دقت ہوتی تھی۔ ارشاد ہوا کہ آپ ہمہ تن متوجہ ہو کر سنیں۔ جس وقت حضرت جبرائیلؑ پڑھیں۔ آپ اس وقت خاموش ہو کر توجہ کریں اور سنیں اور زبان مبارک کو حرکت نہ دیں۔ قرآنِ کریم کا حرف بحرف جمع کرنا اور آپ کی ذات سے پڑھوانا ہمارے ذمے ہے۔ آیات ملاحظہ کریں:

لَا تُحَرِّكْ بِهٖ لِسَانَكَ لِتَعْجَلَ بِهٖ ۝ اِنَّ عَلَيْنَا جَمْعَهٗ وَقُرْاٰنَهٗ ۝ فَاِذَا قَرَاْنٰهُ فَاتَّبِعْ قُرْاٰنَهٗ ۝ ثُمَّ اِنَّ عَلَيْنَا بَيَانَهٗ ۝ (پ ۲۹ - قیمۃ ۱)	نہ حرکت دیجیے قرآن کے پڑھنے میں اپنی زبان کو تاکہ آپ جلدی اس کو سیکھ لیں۔ اس کا جمع کرنا اور اس کا (آپ کی زبان سے) پڑھنا ہمارے ذمہ ہے اور جب ہم (بزبان فرشتہ) پڑھیں تو آپ ان کے پڑھنے کی اتباع کریں۔ پھر ہمارا ذمہ ہے اس کو کھول کر بتلانا

ان آیات سے معلوم ہوا کہ قرآنِ کریم کی تعلیم وتدریس اور تلاوت کے وقت سامعین کو خاموش رہ کر پوری

دلچسپی اور توجہ کے ساتھ قاری اور تالی کی قرآۃ سننی چاہیے۔ کیونکہ قرآن کریم کے آداب اور اتباع اور اس کی تعظیم و تکریم کا یہی واضح پہلو ہے۔

مصنف خیر الکلام نے اپنی عادت کے مطابق کہ چپ نہ رہ سکوں یہ فرمایا ہے کہ اس آیت کا قرآن کریم کی تعظیم و احترام سے کوئی تعلق نہیں ورنہ لازم آئے گا کہ آپ کو اس سے پہلے قرآنی آداب کا علم نہ تھا۔ اور یہ بات سراسر غلط ہے اور نیز لازم آئے گا کہ استاد جب تک سبق ختم نہ کرے شاگرد کا پڑھنا بے ادبی ہو تو پھر پڑھنے پڑھانے کا سلسلہ ہی چھوڑ دیا جاتے بلکہ اس کا مطلب جیسا کہ بخاری میں حضرت ابن عباس رضی سے مروی ہے یہ ہے کہ قرآن کے اترنے سے آپ کو سخت تکلیف برداشت کرنی پڑتی تھی۔

(بخاری جلد ۱ ص۳) (محصلہ خیر الکلام ص ۳۶۲، ۳۶۳)

الجواب:

یہ جو کچھ کہا ہے محض دفع الوقتی ہے۔ حافظ ابن کثیر رحمہ اللہ تعالیٰ علیہ تحریر فرماتے ہیں کہ

ھذا تعلیم من اللہ عزّوجلّ لرسولہ صلی اللہ علیہ وسلم فی کیفیۃ تلقیہ الوحی من الملک فانہ کان یبادر الی اخذہ ویسابق الملک فی قرأتہ فامرہ اللہ عزّوجل اذا جاءہ الملک بالوحی ان یستمع لہ وتکفل اللہ ان یجمعہ فی صدرہ ..... الخ	اس میں آں حضرت صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کو اللہ تعالیٰ کی طرف سے تعلیم دی گئی ہے کہ فرشتہ سے وحی کس کیفیت سے حاصل کرنی ہے کیونکہ آپ وحی کے لینے میں جلدی کرتے اور فرشتہ سے اس کی قرآۃ میں سابقت کرتے تھے۔ اللہ تعالیٰ نے آپ کو حکم دیا کہ جب فرشتہ وحی لائے تو آپ توجہ فرمائیں اور قرآن پاک کو آپ کے سینہ میں محفوظ کر دینے کا ذمہ اللہ تعالیٰ نے خود اٹھالیا ہے۔

(تفسیر جلد ۴ ص ۴۴۹)

اس سے معلوم ہوا کہ آپ اس آیت کے نزول سے پہلے اس طرح پڑھنے کو خلاف ادب نہ سمجھتے تھے لیکن آپ پر واضح کر دیا گیا ہے کہ آپ کا کام استماع ہے ساتھ ساتھ پڑھنا نہیں ہے باقی حضرت ابن عباس رضی کی روایت ہمارے مطلب کے خلاف نہیں ہے کیونکہ آپ اسی خیال سے پڑھتے تھے کہ مبادا بھول نہ جاؤں سو آپ پر منکشف کر دیا گیا کہ آپ بھولیں گے بھی نہیں اور اس طرح قرآن کریم کا ادب بھی ملحوظ رہے گا۔ یوں معلوم ہوتا ہے کہ مصنف خیر الکلام

الف با تا پڑھنے والے ابجد خوانوں کو ذہن مبارک میں جگہ دیے ہوتے ہیں جبھی تو فرماتے ہیں کہ پڑھنا پڑھانا ختم ہو جائے گا۔ بات اُن کی ہو رہی ہے جو سن کر تدبر اور قرآن کریم کے مضمون پر غور و خوض کر سکیں اور ان کے لیے یہی مناسب ہے کہ وہ پہلے سُن لیں پھر لب کشائی کریں۔ بچوں کی بات نہیں ہو رہی۔

(۲) ایک دوسرے مقام پر اللہ تعالیٰ نے آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو ان الفاظ سے خطاب فرمایا ہے:

وَلَا تَعْجَلْ بِالْقُرْآنِ مِنْ قَبْلِ أَنْ يُقْضَىٰ إِلَيْكَ وَحْيُهُ وَقُلْ رَبِّ زِدْنِي عِلْمًا (پ ۱۶ طٰہٰ رکوع ۷)	اور آپ جلدی نہ کریں قرآن کے لینے میں جب تک پورا نہ ہو جایا کرے اس کا اترنا۔ اور کہیے اے میرے رب زیادہ کر علم میرا اور سمجھ۔

یہ آیت بھی اس امر کو صراحت کے ساتھ بیان کرتی ہے کہ تلاوت اور قرأت قرآن کریم کے وقت سامعین کو پورے تدبر اور انہماک کے ساتھ قرآن سننا چاہیے اور خود ساتھ ساتھ پڑھنے کی کوشش اور کاوش نہیں کرنی چاہیے۔

(۳) بعثتِ محمدی سے پہلے جنوں کو کچھ آسمانی خبریں معلوم ہو جاتی تھیں۔ جب آں حضرت صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم پر وحی آنا شروع ہوئی تو وہ سلسلہ بند ہو گیا اور بہت کثرت سے شہب کی مار پڑنے لگی۔ جنوں کو خیال ہوا کہ ضرور کوئی نیا واقعہ رونما ہوا ہے جس کی وجہ سے آسمانی خبروں پر بہت زیادہ سخت پہرے بٹھلائے گئے ہیں۔ اسی کی تلاش و جستجو کے لیے جنوں کے مختلف گروہ مشرق و مغرب میں پھیل پڑے۔ ان میں سے ایک جماعت بطن نخلہ (مکہ مکرمہ کے پاس ایک مقام کا نام ہے) کی طرف سے گذری۔ وہاں اتفاق سے اس وقت آں حضرت صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم اپنے چند اصحاب کے ساتھ نماز فجر ادا کر رہے تھے۔ اللہ تعالیٰ نے جنوں کی اس ٹکڑی کا رُخ قرآن کریم سننے کے لیے ادھر پھیر دیا۔ قرآن کریم کی آواز ان کو بہت عجیب اور مؤثر و دلکش معلوم ہوئی اور اس کی عظمت اور ہیبت دلوں پر چھا گئی۔ آپس میں کہنے لگے کہ چپ رہو اور خاموشی کے ساتھ یہ کلام پاک سنو۔ آخر قرآن کریم نے ان کے دلوں میں گھر کر لیا۔ وہ سمجھ گئے کہ یہی نئی چیز ہے جس نے جنوں کو آسمانی خبروں سے روکا ہے۔ بہر حال جب آں حضرت صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم قرآن کریم پڑھ کر فارغ ہوتے تو یہ لوگ

اپنے دلوں میں ایمان وایقان کا موجزن سمندر لے کر واپس ہوئے اور اپنی قوم کو نصیحت کی جس کی پوری تفصیل سورۂ جن میں کی گئی ہے اور آں حضرت صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کو بھی اسی سورت کے ذریعہ سے ان کا پورا قصہ اور واقعہ بتلایا گیا ہے۔ ارشاد ہوتا ہے:

وَاِذْ صَرَفْنَآ اِلَيْكَ نَفَرًا مِّنَ الْجِنِّ يَسْتَمِعُوْنَ الْقُرْاٰنَ ۚ فَلَمَّا حَضَرُوْهُ قَالُوْٓا اَنْصِتُوْا ۚ فَلَمَّا قُضِيَ وَلَّوْا اِلٰى قَوْمِهِمْ مُّنْذِرِيْنَ ۔

(پارہ ۲۶، احقاف ۴)

اور جب متوجہ کر دیا۔ ہم نے جنوں کا ایک گروہ آپ کی طرف وہ سننے لگے قرآن، پھر جب وہ وہاں پہنچے، بولے چپ اور خاموش رہو۔ پھر جب قرآن ختم ہوا تو اپنی قوم کی طرف چلے گئے تاکہ ان کو خدا تعالیٰ کی مخالفت اور عذاب سے ڈرائیں

اللہ تعالیٰ نے اس مضمون میں جنوں کے اس گروہ کی تعریف بیان کی ہے کہ انھوں نے نہ صرف یہ کہ پوری توجہ کے ساتھ خاموش رہ کر قرآن کریم کی قرأۃ سنی بلکہ اس کارِ خیر پر دوسروں کو بھی آمادہ کیا اور مردِ مومن کی بھی یہی عادت اور خصلت ہونی چاہیے کہ قرأۃ قرآن کے وقت خود چپ رہے اور دوسروں کو بھی اس کی تلقین کرے۔ مؤلف خیر الکلام کہتے ہیں کہ یہ خاموشی ادب و احترام کے لیے نہ تھی، تحقیق حال کے لیے تھی کیونکہ دوسری جگہ ثابت ہے کہ جب آپ نے سورۂ رحمٰن پڑھی تو جنات جواب دیتے تھے۔ (محصلہ ص ۳۶۴)

الجواب:

جنوں کا خاموش رہنا خالص ادب اور احترام کے لیے تھا اگرچہ وہ اس وقت تک مسلمان نہ تھے مگر بات سمجھنے کی اور خدائی کلام کی تعظیم کی اہلیت ان میں تھی۔ علاوہ ازیں قرآن کریم کے مضامین پر مطلع ہونا اور اس سے آگاہی حاصل کرنا آپ کو کیوں ناگوار ہے؟ آپ بھی استماع و انصات سے کام لیں۔ رہا سورۂ رحمٰن میں جنوں کا جواب تو یقین رکھیے کہ وہ ساتھ ساتھ سورۂ رحمٰن ہرگز نہ پڑھتے تھے۔ جب آپ فَبِاَيِّ اٰلَآءِ رَبِّكُمَا الآیۃ کی قرأۃ مکمل کر چکتے تو اس کے بعد جنات تائید میں اللہ تعالیٰ کی نعمتوں کا اقرار کرتے تھے جیسا کہ مقتدی جہری نمازوں میں آمین کہہ کر تائید کرتے ہیں کیونکہ ساتھ ساتھ پڑھنا تو خلاف اجماع اور شاذ ہے۔ کما مر۔ اور سکتات کا صحیح احادیث میں کہیں وجود نہیں ہے۔

(۴۴) اللہ تعالیٰ کافروں اور مشرکوں کے ایک بڑے منصوبے کا تذکرہ یوں کرتا ہے اور اس کے بعد ان کو سزا کا مستوجب قرار دیتا ہے:

وَقَالَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا لَا تَسْمَعُوْا لِهٰذَا الْقُرْاٰنِ وَالْغَوْا فِيْهِ لَعَلَّكُمْ تَغْلِبُوْنَ۔ (پارہ ۲۴، حم السجدہ ۴)

اور کافروں اور منکروں نے کہا۔ اس قرآن کے سننے کے لیے کان مت دھرو اور قرأۃ قرآن کے وقت شور و غل مچا دو تاکہ تم غالب ہو جاؤ۔

اگرچہ مشرکین کا قرآن کریم کو نہ سننا اور قرآت کے وقت شور و غل مچانا، معاندانہ اور مخالفانہ طور پر تھا اور حضرات مجوزین قرأۃ خلف الامام کو قرآن کریم سے یقیناً عداوت اور عناد نہیں ہوتا اور نہ اُن کا پڑھنا من کل الوجوہ ان کافروں کے شور و غل کے برابر ہے۔ اور گو وہ انہ روتے دیانت پڑھتے ہیں لیکن دیکھنا صرف یہ پہلو ہے کہ قرآن کریم کی قرأۃ اور تلاوت کے وقت خود پڑھنا کیا باعثِ مخالجت و منازعت اور تشویش و رہا تھا پائی کا سبب ہے یا نہیں ؟ اگر ایسا ہے اور یقیناً ہے تو ایسے موقع پر خود قرآن کریم کا پڑھنا آداب قرآن کریم کے خلاف اور موجب تشتتِ افکار ہوگا، لہٰذا حق اور صواب یہی ہے کہ تلاوت قرآن کریم کے وقت خاموش رہ کر اس کا ادب و احترام ملحوظ رکھنا چاہیے۔ مؤلف خیر الکلام کا یہ کہنا کہ جن باتوں کی شریعت نے اجازت دی ہے وہ کیونکر بے ادبی ہیں۔ (محصلہ ص۲۶۳) تو اس کا جواب یہ ہے کہ جہری نمازوں میں امام کے ساتھ ساتھ قرأت کرنے کا کسی شرعی دلیل سے ثبوت نہیں ہے اور یہ خلاف اجماع ہے۔

قرآن کریم کی اس آیت کی تفسیر میں حافظ ابن کثیرؒ لکھتے ہیں:

هٰذا حال هٰؤلاء الجهلة من الكفار ومن سلك مسلكهم عند سماع القراٰن وقد امر الله عباده المؤمنين بخلاف ذٰلك فقال واذا قرى القراٰن فاستمعوا له وانصتوا لعلكم ترحمون۔ (تفسیر ابن کثیر جلد ۴ ص ۸۹ مع المعالم)

ان جاہل کافروں اور ان کے نقش قدم پر چلنے والوں کا یہ حال ہے کہ وہ قرآن کی قرأۃ کے وقت خاموشی اور سکوت اختیار نہیں کرتے اور شور و غل مچاتے ہیں اور مومنوں کو اللہ تعالیٰ نے اس کے خلاف حکم دیا ہے کہ جب قرآن مجید پڑھا جائے تو تم اس کی طرف توجہ کرو اور خاموش رہو تاکہ تم پر رحمت نازل کی جائے۔

حافظ صاحبؒ کی عبارت سے یہ بات بالکل عیاں ہو جاتی ہے کہ قرأۃ قرآن کے وقت مومنوں کا کام

دلچسپی کے ساتھ اس کو سنتا ہے اور جاہل کافر اور ان کے پیروکار اس ضابطہ کو ملحوظ نہیں رکھتے بلکہ اس کی خلاف ورزی کرتے ہیں۔

(۵) حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ ایک مرتبہ آں حضرت صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے ان سے فرمایا:

"اے ابن مسعودؓ! مجھے قرآن کریم پڑھ کر سناؤ۔ ابن مسعودؓ فرماتے ہیں: "میں نے کہا حضرت! کیا میں آپؐ کو قرآن پڑھ کر سناؤں؟ حالانکہ آپؐ پر قرآن کریم نازل ہوا ہے تو آپ نے ارشاد فرمایا کہ انی اشتھی ان اسمعہ من غیری ـــــ میرا دل چاہتا ہے کہ کسی دوسرے سے قرآن سنوں۔" (مسلم جلد۱ ص ۲۷۰)

یہ روایت بخاری جلد۲ ص ۷۵۹ اور ترمذی جلد۲ ص ۱۲۷ وغیرہ میں بھی موجود ہے۔

چنانچہ حضرت ابن مسعودؓ نے سورۃ نساء کا کافی حصہ پڑھ کر سنایا اور آں حضرت صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے پورے ذوق و شوق سے سنا۔ امام نوویؒ اس حدیث کی شرح میں اس سے جو احکام اور فوائد اخذ ہو سکتے ہیں۔ ان کی تفصیل کرتے ہوتے تحریر کرتے ہیں:

منھا استحباب استماع القرأۃ و الاصغاء لھا والبکاء عندھا وتدبرھا واستحباب طلب القرأۃ من غیرہ لیستمع لہ وھو ابلغ فی الفھم والتدبر من قرأتہ بنفسہ۔ (نووی شرح مسلم ج۱ ص ۲۷۰)

ان فوائد میں سے ایک یہ ہے کہ قرآن کریم کا بغور سننا اور توجہ کرنا اور رونا اور تدبر کرنا پسندیدہ بات ہے اور یہ بھی مستحب ہے کہ دوسرے سے قرآن کریم سنے اور دوسرے سے سننا خود پڑھنے سے فہم و تدبر میں زیادہ ممد و معاون ہے۔

یعنی اگرچہ قرآن کریم کا پڑھنا کارِ ثواب ہے لیکن جس طرح دوسرے سے سننے میں فہم و تدبر اور غور و فکر کا موقع ملتا ہے۔ وہ یقیناً خود پڑھنے سے حاصل نہیں ہو سکتا۔ اس لیے خود پڑھنے کے بجائے بعض اوقات دوسرے سے سننا افضل اور اعلیٰ ہے۔

مؤلف خیر الکلام کہتے ہیں کہ یہ نماز میں نہ تھا اور آپ نے کمال توجہ سے سنا آخر میں آپ نے رونا شروع کیا اور فرمایا بس اتنا ہی کافی ہے معلوم ہوا کہ مناسب کلمہ کہنا بے ادبی نہیں ورنہ تکبیر تحریمہ کا پڑھنا خلاف ادب ہوگا۔ (المحصلہ ص ۳۶۵)

الجواب:

ہم نے کب کہا ہے کہ وہ نماز میں تھے۔ بتلانا تو صرف قرآن کریم کی تعظیم کا پہلو ہے۔ دیکھیے کہ حضور صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے باقرار شما کس غور سے آخر تک سنا اور رونا شروع کر دیا۔ یہی اس کے تدبر اور استماع کا لازمی نتیجہ تھا اور آپ نے حَسْبُكَ کہ بس اتنا ہی کافی ہے آخر میں فرمایا ہے۔ درمیان میں اور ساتھ ساتھ نہیں فرمایا۔ باقی تکبیر تحریمہ فرض ہے۔ اس کو واجب لغیرہ کے لیے (یعنی خاموشی جو قرأۃ قرآن کے استماع کے لیے ہے) نہیں چھوڑا جاسکتا اور ساتھ ساتھ پڑھنا تو منکر اور شاذ ہے۔ كما مرّ۔

قرآن کریم کے مَنْ جَآءَ بِالْحَسَنَةِ فَلَهٗ عَشْرُ اَمْثَالِهَا ——— کہ جس نے ایک نیکی کی اس کو دس گنا ثواب ملے گا) قاعدہ سے عموماً اور اس صحیح حدیث سے خصوصاً کہ جو شخص قرآن کریم کا ایک حرف پڑھے گا۔ اس کو دس نیکیاں عطا ہوں گی (ترمذی جلد ۲ ص ۱۱۵) یہ امر ثابت ہوتا ہے کہ خود پڑھنے والا دس نیکیوں کا مستحق ہے لیکن بعض روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ دوسرے سے قرآن سننے والے کو بیس نیکیاں ملتی ہیں۔ چنانچہ حضرت ابوہریرہؓ جناب رسول خدا صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم سے روایت کرتے ہیں،

من استمع الی اٰية من كتاب الله	جو آدمی قرآن کریم کی ایک آیت سنتا ہے اس
كتب له حسنة مضاعفة (الحديث)	کے لیے دوہرا اجر لکھا جاتا ہے۔

(رواہ احمد فی مسندہ۔ ابن کثیر جلد ۲ ص ۲۸۱)

چونکہ مقتدی پر انصات واجب ہے اس لیے اس حدیث کی رُو سے اس کو دہرا اجر ملیگا اور غیر حافظ جب حافظ کی قرأۃ سننے کے لیے توجہ کرے تو اس حدیث کے رُو سے وہ بھی دہرے اجر کا مستحق ہے۔ خدا تعالیٰ کے ہاں کیا کمی ہے؟

مؤلف خیر الکلام کا طنزاً یہ کہنا کہ غیر حافظوں کے لیے یہ نسخہ اکسیر ہے ....الخ (ص ۳۸۰) محض تسکین قلب کا سامان ہے اور بس۔ ملاحظہ کیجیے کس طرح صرف اپنی فاسد رائے سے حدیث کو رد کیا جا رہا ہے۔ (معاذ اللہ تعالیٰ) صرف بطور تائید ایک روایت اور ملاحظہ کریں: آں حضرت صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے فرمایا کہ

ان اللہ یحب الصمت عند ثلاث عند تلاوۃ القرآن وعند الزحف وعند الجنازۃ۔

(اخرجہ ابن کثیر جلد ۲ ص ۳۱۶)

تین مقامات پر اللہ تعالیٰ خاموشی کو پسند کرتا ہے۔ ان میں سے ایک قرآن کریم کی قرآۃ کا، دوسرا لڑائی کا اور تیسرا جنازہ کا وقت ہے۔

احسن الکلام طبع اول میں وعندہ تلاوۃ القرآن (الحدیث) کردیا گیا تھا جس پر مؤلف خیر الکلام نے اعتراض کیا کہ مؤلف احسن الکلام نے چالاکی کرکے وعند الزحف .... الخ کو حذف کردیا گیا ہے کیونکہ لڑائی کے وقت ذکر اللہ قرآن سے ثابت ہے جس سے معلوم ہوتا ہے کہ انصات اور ذکر جمع ہو سکتے ہیں چونکہ یہ ہماری تائید میں ہے۔ لہٰذا احسن الکلام والا اس کو کھا گیا ہے۔ (محصلہ ص ۲۷۹)

الجواب:

وعند الزحف کا جملہ ہمارے ہرگز خلاف نہیں ہے کیونکہ لڑائی کے موقع پر مختلف اوقات ہوتے ہیں کبھی ذکر کا حکم ہے اور کبھی انصات کا اور کبھی ذکر قلبی اور استعانت وغیرہ کا۔ چنانچہ حافظ ابن کثیرؒ حضرت عبداللہ بن عمرؓ سے مرفوع روایت نقل کرتے ہیں جس میں یہ بھی ہے کہ پس جب تم کافروں سے ملو تو ثابت قدم رہو اور اللہ کو یاد کرو اور جب وہ شور و غل کریں تو تم خاموش رہو۔

(تفسیر جلد ۲ ص ۳۱۶)

اور ایک دوسری حدیث میں یذکرنی کا معنی یوں کرتے ہیں: ای لا یشغلہ ذلک الحال عن ذکری ودعائی واستعانتی (ایضاً) یعنی لڑائی میں وہ اللہ تعالیٰ کی یاد اور اس سے مانگنے اور استعانت سے بے پروا نہ ہو تو اس میں ذکر اور انصات دونوں جمع نہیں ہوتے بلکہ دونوں اپنے اپنے موقع پر ہیں اور حیرت ہے کہ ان کو الحدیث کی اصطلاح بھی معلوم نہیں جبھی تو کہتے ہیں کہ حذف کردیا ہے جس کا مطلب ہے کہ آخر تک حدیث پڑھو اور اس کو ملحوظ رکھو۔

اور شیخ الاسلام ابن تیمیہؒ لکھتے ہیں کہ

دل الکتاب والسنۃ والاجماع علی ان الاستماع افضل من القرأۃ۔

(فتاوے جلد ۲ ص ۱۴۳)

کتاب و سنت اور اجماع امت سے یہ امر ثابت ہوچکا ہے کہ قرآن کریم کی قرأت کو سننا خود پڑھنے سے زیادہ اعلیٰ اور افضل ہے۔

الحاصل قرآن کریم و حدیث اور اقوال ائمہؒ سے یہ بات بالکل واضح ہوچکی ہے کہ قرآن کریم کی

تلاوت اور قرآت کے وقت سامعین کو ہمہ تن گوش ہو کر اس کی طرف توجہ اور تدبر کرنا چاہیے۔ اور صرف یہی پہلو قرآن کریم کی توقیر و تعظیم پر علی وجہ الاتم دلالت کرتا ہے۔

یہاں تک جو کچھ عرض کیا گیا ہے۔ وہ قرآن کریم کے عمومی آداب پر مشتمل ہے۔ اور اس سے عام قاعدہ اور ضابطہ بخوبی سمجھا جا سکتا ہے۔ اب ہم تخصیص کے ساتھ امام کے پیچھے قرآت کی ممانعت پر قرآن کریم کی آیت پیش کرتے ہیں۔ پھر اس کی تفسیر و تشریح اور شان نزول حضرات صحابہ کرامؓ و تابعینؒ اور معتبر مفسرینؒ سے نقل کریں گے۔ اور فریق ثانی کی طرف اس پر جو اعتراضات کیے گئے ہیں۔ ان کو نقل کر کے ان کی حقیقت کو بقدر وسعت الم نشرح کریں گے۔ انشاء اللہ العزیز۔

قرآۃ خلف الامام اور قرآن کریم:

اللہ تعالیٰ ارشاد فرماتا ہے:

وَاِذَا قُرِئَ الْقُرْاٰنُ فَاسْتَمِعُوْا لَهٗ وَاَنْصِتُوْا لَعَلَّكُمْ تُرْحَمُوْنَ۔

اور جب قرآن کریم پڑھا جائے تو اس کی طرف کان لگائے رہو اور چپ رہو۔ تاکہ تم پر رحم ہو۔

(پارہ ۹، اعراف ۲۴)

جمہور اہلِ اسلام کا بیان ہے کہ اس آیت میں اللہ تعالیٰ نے مسئلہ خلف الامام پر روشنی ڈالی ہے کہ جب امام قرآن کریم کی قرآۃ کر رہا ہو تو اس وقت مقتدیوں کا وظیفہ صرف یہ ہے کہ نہایت توجہ کے ساتھ اس کی طرف کان لگائے رہیں اور خود خاموش رہیں۔ امام کا وظیفہ قرآت کرنا اور مقتدیوں کا وظیفہ خاموشی کے ساتھ توجہ کرنا ہے اور ان کو استماع اور انصات کے علاوہ قرآت کی مطلقاً گنجائش نہیں ہے۔ اس میں شک نہیں کہ الحمد سے لے کر والناس تک سب قرآن ہے۔ لیکن قرآن کریم صحیح احادیث، حضرات صحابہ کرامؓ اور تابعینؒ کے اقوال کی روشنی میں دیکھنا یہ ہے کہ قرآن کا خاص اطلاق کس سورت پر ہوا ہے؟ اور قرآن کا اوّلین اور بالذات مصداق کونسا حصہ ہے؟ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

وَلَقَدْ اٰتَيْنٰكَ سَبْعًا مِّنَ الْمَثَانِيْ وَالْقُرْاٰنَ الْعَظِيْمَ (پ۱۴، الحجرات ۶)

اور البتہ وہی ہیں ہم نے آپ کو سات آیتیں جو بار بار پڑھی جاتی ہیں اور دیا قرآن بڑے درجہ کا۔

حضرت ابوہریرہ رضؓ سے مروی ہے کہ آں حضرت صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا:

ام القرآن هی السبع المثانی والقرآن العظیم۔ کہ ان سات آیتوں اور قرآن عظیم کا مصداق سورۂ فاتحہ ہے۔

(بخاری جلد۲ ص ۶۸۳ اور اسی کے قریب الفاظ دارمی ص ۴۴۶ طبع دمشق میں ہیں)

اس کے علاوہ حضرت ابو سعید بن المعلیٰ رضؓ اور حضرت ابی ابن کعب رضؓ وغیرہ سے بخاری و موطا امام مالکؒ وغیرہ میں مرفوعاً صحیح احادیث سے ثابت ہے کہ قرآن عظیم کا پہلے نمبر پر مصداق ام الکتاب ام القرآن اور سورۂ فاتحہ ہے۔ اور یہی حضرت عمرؓ، علیؓ، ابن مسعودؓ، ابن عباسؓ، ابراہیم نخعیؒ، عبداللہ بن عبیدؒ بن عمیرؒ ابن ابی ملیکہ شہرؒ بن حوشبؒ، حسن بصریؒ، مجاہدؒ اور قتادہؒ وغیرہ اکابر سے مروی ہے اور اسی کو امام ابن جریرؒ اور حافظ ابن کثیرؒ ترجیح دیتے ہیں اور لکھتے ہیں:

فهذا نص فی ان الفاتحة هی السبع المثانی والقرآن العظیم۔ کہ یہ روایات اور اقوال مفسرین اس بات پر نص ہیں کہ سبع مثانی اور قرآن عظیم کا اولین مصداق سورۂ فاتحہ ہے۔

(تفسیر ابن کثیر، جلد۲ ص ۵۵۷)

شیخ الاسلام ابن تیمیہؒ لکھتے ہیں کہ سورۂ فاتحہ قرآن کریم کی سب سورتوں سے افضل ہے اور یہی وجہ ہے کہ اس کا پڑھنا ہر نماز میں لازم قرار دیا گیا ہے۔ اور حقیقت یہ ہے (جو احادیث سے ثابت ہے) کہ تورات انجیل اور زبور بلکہ قرآن کریم میں اس جیسی مزیت اور فضیلت والی اور کوئی سورت نازل نہیں کی گئی اور یہ بالکل ممتنع ہے کہ استماع اور انصات کا حکم سورۂ فاتحہ کو شامل نہ ہو۔ حالانکہ استماع اور انصات کی آیت اس کو کئی طور سے شامل ہے کہ یہ آیت مطلق ہے اور سورۂ فاتحہ اس کا ایک حصہ ہے اور یہ کہ آیت عام ہے اور یہ اس کا فرد ہے (اور یہ کہ آیت مجمل ہے اور حدیث اس کی تفسیر ہے کہ اس سے مراد سورۂ فاتحہ ہے۔ (صفدر) علاوہ بریں اس کی قرأۃ اکثر اور مشہور ہے اور یہ تمام سورتوں سے افضل ہے۔ پھر آگے لکھتے ہیں:

فان قوله واذا قرئ القرآن یتناولها ولا یتناول غیرها اظهر لفظا ومعنا۔ یعنی واذا قرئ القرآن کی آیت جس طرح اپنی لفظی اور معنوی حیثیت سے سورۂ فاتحہ کو شامل ہے اس طرح وہ قرآن کی کسی دوسری سورت کو شامل نہیں ہے۔

(فتاوی جلد۲ ص ۱۴۳)

اس تحقیق سے یہ امر بالکل واشگاف اور ہویدا ہو جاتا ہے کہ واذا قرئ القرآن

کا صحیح، اصلی اور بالذات مصداق صرف سورۂ فاتحہ ہے۔ لہٰذا یہ حکم سُورۂ فاتحہ پر خصوصاً اور دیگر سُورتوں پر عموماً حاوی ہے۔ اور اس لحاظ سے مقتدیوں کو امام کے پیچھے سُورۂ فاتحہ کا ترک کرنا اصل ہوگا۔ اور باقی سُورتوں کو ترک کرنا اس کی فروع، امام نسائیؒ نے (جلد ۱ ص ۱۰۶ میں) جناب رسولِ خدا صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کی صحیح حدیث (جس کی پوری تفصیل اپنے مقام پر آئے گی انشاء اللہ العزیز) اذا قرأ فانصتوا (کہ جب امام قرأۃ کرے تو تم مقتدی خاموش رہو) قرآن کریم کی اس آیت کی تفسیر اور تاویل میں نقل کرکے یہ بات پایۂ تکمیل کو پہنچادی ہے کہ گویا آں حضرت صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم بھی قرآن کی اس آیت کو نماز اور نمازیوں کے حق میں ہی سمجھتے تھے۔ اب آپ حضرات صحابہ کرام رضی، تابعینؒ اور معتمد مفسرین کرامؒ سے اس آیت کی تفسیر سن لیجیے کہ وہ کیا ارشاد فرماتے ہیں۔

اس سے قبل کہ ہم اس آیت کی تفسیر حضرات صحابہ کرامؓ سے نقل کریں۔ یہ بیان کرنا ضروری سمجھتے ہیں کہ حضرات صحابہؓ کی تفسیر کا رتبہ، درجہ اور حیثیت کیا ہے۔ امام حاکم رحؒ لکھتے ہیں: کہ امام بخاریؒ اور امام مسلمؒ کے نزدیک صحابی کی تفسیر مسند اور مرفوع حدیث کے حکم میں ہوتی ہے۔ (مستدرک ج ۱ ص ۱۲۳) اور یہی امام حاکم رحؒ کی اپنی تحقیق ہے۔ (معرفت علوم الحدیث ص ۲۰) حافظ ابن کثیر رحؒ لکھتے ہیں کہ اکثر علماء کے نزدیک صحابی کی تفسیر مرفوع حدیث کے حکم میں ہے۔ (البدایہ والنہایہ جلد ۹ ص ۲۳۳) حافظ ابن القیم رحؒ لکھتے ہیں: وتفسیر الصحابی حجۃ۔ (زاد المعاد جلد ۵ ص ۵۲) علامہ سیوطیؒ لکھتے ہیں وتفسیر الصحابی مرفوع۔ (تدریب الراوی ص ۶۵) علامہ جزائریؒ لکھتے ہیں جس صحابی نے نزولِ وحی کا زمانہ پایا ہو۔ اس کا کسی آیت سے متعلق یہ کہنا کہ یہ فلاں اور فلاں حکم میں نازل ہوتی۔ یہ مرفوع حدیث کے حکم میں ہے۔ (توجیہ النظر ص ۱۶۵)

نواب صدیق حسن خاں صاحب لکھتے ہیں:

وکذا حکموا اقوالھم فی التفسیر فانھا اصوب من اقوال من بعدھم وقد ذھب بعض اھل العلم الی ان تفسیرھم فی حکم المرفوع۔	یعنی حضرات صحابہ کرامؓ کی تفسیر بعد کے آنے والے مفسرین سے بہت زیادہ صحیح اور صواب ہے حتیٰ کہ بعض (بلکہ اکثر) علماء کی تحقیق یہ ہے کہ حضرات صحابہؓ کی تفسیر مرفوع حدیث کے حکم میں ہے۔

(الجنۃ فی الاسوۃ الحسنۃ بالسنۃ ص ۹)

حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ تعالیٰ عنہ (المتوفی ۳۲ھ)

سے قرآن کریم کی اس آیت کی تفسیر یوں منقول ہے:

لہ یہ بات شک و شبہ سے بالاتر ہے کہ آفتاب نبوت سے اکتساب نور کرنے کے بعد تمام حضرات صحابہ کرام رضی اللہ تعالیٰ عنہم نجوم ہدایت تھے۔ مگر بعض کو ایسے جزوی فضائل حاصل تھے کہ دوسرا کوئی ان میں ان کا ہم پایہ نہیں ہو سکتا تھا۔ ان میں ایک شخصیت حضرت عبداللہ ابن مسعود رضؓ کی ہے۔ آنحضرت صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے معلمین قرآن میں سب سے پہلا نمبر ان کا بیان کیا ہے (بخاری جلد ۱ ص ۵۳۱ و مسلم جلد ۲ ص ۲۹۳) اور فرمایا ہے جس چیز کو تمہارے لیے ابن مسعود رضؓ پسند کرتے ہیں میں اس پر راضی ہوں۔ (مستدرک جلد ۳ ص ۳۱۹ صحیح) نیز فرمایا اگر بغیر مشورہ کے تمہارے لیے میں خلیفہ کا انتخاب کروں تو وہ صرف ابن مسعودؓ ہی ہوں گے اور جس چیز کو ابن مسعودؓ تمہارے لیے پسند نہ کرے میں بھی اس کو تمہارے لیے پسند نہیں کروں گا۔ (الاستیعاب جلد ۱ ص ۳۵۹) اور فرمایا ابن مسعود کے عہد اور تحقیق کو مضبوطی سے قائم رکھو۔ (ایضاً) حضرت عقبہ بن عمروؓ فرماتے تھے جناب رسول اللہ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کے بعد میں نے ما انزل اللہ (یعنی جو کچھ خدا تعالیٰ نے نازل کیا ہے) کا ابن مسعود رضؓ سے بڑا عالم کوئی نہیں دیکھا۔ حضرت ابو موسیٰ رضؓ نے فرمایا کیوں نہ ہو۔ وہ ہر وقت حضور کے پاس رہتے تھے اور حضورؐ ان سے کسی وقت حجاب نہیں کرتے تھے۔ (مسلم ۲ ص ۲۹۳) مشہور تابعی شقیق رحؒ کا بیان ہے کہ میں ابن مسعودؓ پر کسی صحابی کو ترجیح نہیں دیتا۔ (مستدرک جلد ۳ ص ۳۱۹) یہی وجہ ہے کہ ابن مسعود رضؓ علی رؤس الاشہاد فرمایا کرتے تھے۔ اس خدا کی قسم جس کے بغیر کوئی دوسرا الٰہ نہیں۔ قرآن کریم کی کوئی سورت اور کوئی آیت ایسی نہیں جس کا شان نزول مجھے معلوم نہ ہو کہ کس موقع اور کس حالت میں نازل ہوئی ہے اور میں کتاب اللہ کا اپنے سے بڑا عالم کسی کو نہیں پاتا۔ (بخاری جلد ۲ ص ۷۴۸، و مسلم ۲ ص ۲۹۳) اور فرمایا تمام صحابہؓ کو اچھی طرح معلوم ہے کہ میں ان سب سے کتاب اللہ کا بڑا عالم ہوں۔ (ایضاً) امام نوویؒ لکھتے ہیں کہ حضرت ابن مسعود رضؓ حضرات خلفائے راشدینؓ سے بھی کتاب اللہ کے بڑے عالم ہیں۔ (شرح مسلم جلد ۲ ص ۲۹۳) اور اہل علم میں ان پر وہ حضرات کسی کو فضیلت نہ دیتے تھے۔ (مفتاح السعادۃ جلد ۱ ص ۳۵۳) حضرت عمر رضؓ نے ان کو علم کا انبار کہا۔ اور اہل کوفہ کی طرف تعلیم قرآن کے لیے ارسال کیا۔ (بغدادی جلد ۱ ص ۱۴۷) بعض حضرات نے مسئلہ رفع یدین کے پیش نظر حضرت عبداللہ بن مسعود رضؓ پر متعدد مسائل میں نسیان کا الزام عائد کیا ہے۔ لیکن نسیان تو انسان کی فطرت اور خمیر میں ودیعت کیا گیا ہے۔ جو اولاد آدم کو باپ سے بطور ورثہ ملا ہے۔ اگر نسیان (بقیہ حاشیہ اگلے صفحہ پر)

(پچھلے صفحہ کا بقیہ حاشیہ)

سے محض نسیان ہی مراد ہے تو دوسروں کا ذکر بعد میں ہوگا۔ کیا آں حضرت صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے یہ ارشاد نہیں فرمایا: انما انا بشر انسٰی کما تنسون اور اگر نسیان سے مراد بعض مسائل اور احادیث سے لاعلمی ہے تو یہ قصور صرف حضرت ابن مسعود رضہ کا نہیں بلکہ دوسرے بھی اس بات میں ان کے شریک ہیں۔ کیا حضرت ابوبکر رضہ کو وراثت جدہ کی بابت اور حضرت عمر رضہ کو حکم طاعون سے متعلق بلکہ رفع یدین کے مرکزی راوی حضرت ابن عمر رضہ کو مسح علی الخفین کے مسئلہ سے ناواقفی اور لاعلمی نہ تھی؟ اور کیا یہ اکابر عموماً اور حضرت ابن عمر رضہ خصوصاً اس لیے قابل اعتماد نہ رہے۔ کہ انھوں نے مسح علی الخفین (دیکھیے موطا ص ۱۷) جیسے مسئلہ سے جس کا ثبوت متواتر احادیث اور تعامل امت سے ثابت ہے۔ لاعلمی ظاہر کی بلکہ انکار کیا۔ چنانچہ حافظ ابن حجر رح فرماتے ہیں کہ ان ابن عمر رضہ انکر المسح علی الخفین مع قدیم صحبتہ وکثرۃ روایتہ اھ (فتح الباری جلد ۱ ص ۲۴۵ طبع مصر) کہ بے شک حضرت عبداللہ بن عمر رضہ نے مسح علی الخفین کا انکار کیا حالانکہ وہ پرانے صحابی اور کثیر الراویہ تھے۔ باقی باتوں کا ذکر تو روایات اور احادیث سے متعلق ہے اور یہ تفصیل کا مقام نہیں۔ لیکن حضرت ابن مسعود رضہ پر جو یہ الزام لگایا گیا ہے کہ وہ معوذتین کو قرآن کریم کی سورتیں نہیں سمجھتے تھے۔ یہ خالص افترا اور بہتان ہے۔ علامہ ابن حزم رح لکھتے ہیں کہ

كل ما روي عن ابن مسعود رضہ من ان المعوذتين وام القرآن لم يكونا في مصحفه فكذب موضوع لا يصح۔

(محلی ابن حزم جلد ۱ ص ۱۳)

جتنی روایتیں بھی ابن مسعود رضہ سے اس مضمون کی نقل کی گئی ہیں کہ معوذتین اور ام القرآن ان کے مصحف میں نہ تھیں تو وہ خالص جھوٹی اور جعلی ہیں جو کسی طرح صحیح نہیں ہیں۔

امام نووی رح اور علامہ سیوطی رح لکھتے ہیں:

وما نقل عن ابن مسعود رضہ باطل ليس بصحيح۔

(شرح المہذب جلد ۔ ص ۔ والاتقان ج ۱ ص ۷۹)

معوذتین کے قرآن میں نہ ہونے کی جتنی روایتیں ابن مسعود رضہ کی طرف منسوب ہیں وہ سب باطل اور غیر صحیح ہیں۔

امام سبکی رح فرماتے ہیں کہ دلیل قاطع اس پر قائم ہے کہ یہ حضرت ابن مسعود رضہ پر جھوٹ باندھا گیا ہے اور وہ اس سے بالکل بری ہیں۔ (طبقات جلد ۲ ص ۲۰۷)

پہلی روایت: امام ابن جریرؒ[1] فرماتے ہیں۔ ہم سے ابو کریبؒ[2] نے بیان کیا۔ وہ فرماتے ہیں ہم سے محاربیؒ[3] نے بیان کیا۔ وہ داؤدؒ[4] بن ابی ہند سے روایت کرتے ہیں۔ اور وہ لیثیرؒ[5] بن جابر سے روایت کرتے ہیں۔ انھوں نے فرمایا:

---

[1] ان کا ترجمہ عنقریب آرہا ہے۔

[2] ابو کریب کا نام محمدؒ بن العلاءؒ ہے۔ علامہ ذہبیؒ ان کو الحافظ، الثقہ اور محدث کوفہ لکھتے ہیں (تذکرہ جلد ۲ صفحہ ۷۴) امام نسائیؒ ان کو ثقہ کہتے ہیں۔ ابن حبانؒ ان کو ثقات میں لکھتے ہیں۔ ابو عمرو الخفافؒ کا بیان ہے کہ میں نے اسحاقؒ بن ابراہیمؒ کے بعد ان سے بڑا کوئی حافظ نہیں دیکھا۔ محدث مسلمہؒ ان کو ثقہ کہتے ہیں۔ (تہذیب التہذیب ۹ صفحہ ۳۸۶)

[3] محاربی کا نام یحییٰ بن یعلیٰ ہے۔ امام ابو حاتمؒ ان کو ثقہ کہتے ہیں اور ابن حبانؒ ان کو ثقات میں لکھتے ہیں۔ (ایضاً جلد ۱۱ صفحہ ۳۰۳) اور کسی کی جرح ان پر منقول نہیں ہے۔ قاضی مقبول احمد صاحب نے اس روایت پر یہ اعتراض کیا ہے کہ محاربی دو ہیں۔ ایک یعلیٰ بن یعلیٰ جن کی توثیق مولانا سرفراز صاحب نے فرمائی ہے اور دوسرے عبدالرحمٰن بن محمد بن زیاد جو انتہا درجہ کے ضعیف ہیں اور قوی احتمال ہے کہ مولانا نے ضعیف محاربی کی توثیق کر کے اپنا مطلب نکال لیا ہو۔ (محصلہ الاعتصام ۲۸ ستمبر سنہ ۱۹۶۲ء صفحہ ۶ کالم ۲)

الجواب: راقم نے یعلیٰ بن یعلیٰؒ کی توثیق نہیں نقل کی بلکہ یحییٰ بن یعلیٰ المحاربیؒ کی توثیق نقل کی ہے اور اس سند میں یہی محاربی ہیں۔ ہم محض قاضی صاحب کی تسلی کے لیے عبدالرحمٰن بن محمد بن زیاد المحاربی کے متعلق بھی یہ عرض کیے دیتے ہیں کہ وہ انتہائی درجہ کے ضعیف نہیں بلکہ اعلیٰ درجہ کے ثقہ ہیں۔

اوّلاً۔ اس لیے کہ یہ بخاری، مسلم، ابو داؤد، نسائی، ترمذی اور ابن ماجہ کے مرکزی راوی ہیں کیا فریق ثانی کے نزدیک صحاح ستہ کے مرکزی راوی بھی انتہا درجہ کے ضعیف ہوتے ہیں؟ یہ ہے غیر مقلدین حضرات کا علم و دیانت۔ سبحان اللہ تعالیٰ۔ اگرچہ ان کے بارے میں بعض نے مضطرب کثیر الغلط اور یہم وغیرہ کے الفاظ لکھے ہیں لیکن امام ابن معینؒ، نسائیؒ اور ابو حاتمؒ ان کو ثقہ کہتے ہیں۔ امام وکیعؒ فرماتے ہیں کہ طویل احادیث کے وہ بڑے حافظ تھے۔ ابن حبانؒ ان کو ثقات میں لکھتے ہیں۔ ابن سعدؒ ان کو ثقہ کہتے ہیں۔ ابن شاہینؒ ان کو ثقات میں لکھتے ہیں۔ عثمان بن ابی شیبہؒ ان کو صدوق کہتے ہیں۔ محدث بزارؒ اور دارقطنیؒ ان کو ثقہ کہتے ہیں۔ عجلیؒ ان کو لا بأس بہ کہتے ہیں اور ساجیؒ ان کو صدوق کہتے ہیں۔ (ملتقطاً تہذیب التہذیب جلد ۶ صفحہ ۲۶۶)۔

(باقی حاشیہ اگلے صفحہ پر)

صلی ابن مسعود فسمع اناسا یقرؤن مع الامام فلما انصرف قال اما آن لکم ان تفقھوا اما آن لکم ان تعقلوا واذا قرئ القرآن فاستمعوا له وانصتوا کما امرکم اللّٰہ تعالیٰ۔

(تفسیر ابن جریر جلد ۹ ص ۱۰۳)

کہ حضرت عبداللہ ابن مسعودؓ نے نماز پڑھی اور چند آدمیوں کو امام کے ساتھ قرآۃ کرتے سنا۔ جب آپ نماز سے فارغ ہوگئے تو فرمایا کیا وہ وقت ابھی نہیں آیا کہ تم سمجھ اور عقل سے کام لو اور جب قرآن کریم کی قرآۃ ہوتی ہو تو تم اس کی طرف توجہ کرو اور خاموش رہو جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے تمہیں حکم دیا ہے۔

یہ روایت وضاحت سے یہ بات ثابت کرتی ہے کہ پڑھنے والے امام کے پیچھے قرآۃ کر رہے تھے اور حضرت ابن مسعودؓ نے ان کو فہم و عقل سے کام نہ لینے پر تنبیہ کرتے ہوئے قرآۃ سے منع کیا اور یہ بات بھی عیاں کر دی کہ اس آیت میں اللہ تعالیٰ نے ان لوگوں کو استماع اور انصات کا حکم دیا ہے۔ جو امام کے ساتھ اس کی اقتداء میں نماز ادا کر رہے ہوں اور یہ وہی ابن مسعودؓ ہیں جو کتاب اللہ کے عالم ہونے میں تمام حضرات صحابہؓ

(پچھلے صفحہ کا بقیہ حاشیہ) قاضی صاحب مؤلف احسن الکلام سے بے شک اختلاف رکھیے، مگر صحاح ستہ کے ثقہ راوی کو تو انتہا درجہ کا ضعیف نہ قرار دیجیے۔

۴ داؤد بن ابی ہندؒ کو امام احمدؒ، سفیان ثوریؒ، ابن معینؒ، ابو حاتمؒ اور نسائیؒ ثقہ کہتے ہیں۔ یعقوب بن ابی شیبہؒ ان کو ثقہ اور ثبت کہتے ہیں۔ ابن حبانؒ ان کو متقنین میں شمار کرتے ہیں۔ ابن خراشؒ ان کو ثقہ اور ابن سعدؒ ثقہ اور کثیر الحدیث کہتے ہیں۔ (ایضاً جلد ۳ ص ۲۰۴) ذہبیؒ ان کو الامام اور الثبت لکھتے ہیں۔ (تذکرہ جلد ۱ ص ۱۳۷)۔

۵ یسیر بن جابرؒ، ابن حبان ان کو ثقات میں لکھتے ہیں۔ ابن سعدؒ ان کو ثقہ کہتے ہیں۔ امام عجلیؒ ان کو من ثقات اصحاب عبداللہ بن مسعودؓ کہتے ہیں۔ عوام بن حوشبؒ ان کو صحابی بتلاتے ہیں اور کہتے ہیں کہ سنہ ۱ھ میں ان کی ولادت ہوئی تھی۔ (تہذیب التہذیب جلد ۱۱ ص ۳۷۹) حافظ ابو عمرؒ بن عبدالبرؒ بھی ان کو صحابی بتلاتے ہیں۔

(الاستیعاب جلد ۲ ص ۶۱۷)

نوٹ: تفسیر ابن جریر اور ابن کثیر کے بعض نسخوں میں کاتب کی غلطی سے بشیر بن جابر لکھا گیا ہے جو قطعاً غلط ہے۔ مسند احمد جلد ۱ ص ۳۸۳ اور مسند طیالسی ص ۵۱ اور صحیح مسلم جلد ۲ ص ۳۹۲ میں ایک دوسری حدیث کی سند میں یسیر بن جابرؒ ہی آیا ہے جو صحیح ہے مزید تشریح کے لیے نووی جلد ۱ ص ۳۹۲۔ اور تجرید اسماء الصحابہؓ للذہبیؒ جلد ۲ ص ۱۵۳ وغیرہ کی طرف مراجعت کیجیے۔

کرامؓ حتیٰ کہ حضرات خلفائے راشدینؓ سے بھی بڑھے ہوئے تھے اور جن کو ہر سورت اور ہر آیت کا شان نزول بخوبی معلوم تھا۔ مؤلف خیر الکلام نے یہ جواب دیا ہے کہ حضرت ابن مسعودؓ شانِ نزول نہیں بیان کر رہے بلکہ استدلال کر رہے ہیں اور استدلال بھی ان کی بے جا حرکت پر تھا کیونکہ وہ امام کے ساتھ ساتھ جہر کے ساتھ پڑھتے تھے جیسا کہ لفظ استماع سے معلوم ہوتا ہے ...... الخ (محصلہ صد ۲۵۱)۔

الجواب:

حضرت ابن مسعودؓ تو کما امر کم اللہ سے اس کا شانِ نزول بیان فرما رہے ہیں اور اگر استدلال بھی مان لیا جائے تو ما و شما کا استدلال تو نہیں بلکہ حضرت ابن مسعودؓ صحابی کا استدلال ہے جو پہلے درجہ کے مفسر ہیں۔ اور مقتدیوں کی بیجا حرکت امام کے ساتھ قرآۃ تھی نہ کہ جہر۔ جیسا کہ یقرؤن کے الفاظ اس پر دال ہیں اور حضرت ابن مسعودؓ کے ارشاد میں لفظ انصات اس کی واضح دلیل ہے اور حضرت ابن مسعودؓ نے قرآۃ کی اس بیجا حرکت سے انہیں منع فرمایا ہے اور مطلق قرآۃ پر جہر کا اطلاق محض مجازی طور پر ہوتا ہے جس کے لیے قرینہ صارفہ درکار ہے اور وہ یہاں مفقود ہے۔

دوسری روایت۔ امام بیہقیؒ[1] فرماتے ہیں۔ ہم سے ابو الحسن، محمدؒ بن الحسینؒ[2] بن داؤد علویؒ نے بیان کیا۔ وہ فرماتے ہیں ہم سے ابو الحسن علیؒ[3] بن محمدؒ بن حمشاذ العدلؒ نے بیان کیا۔ وہ فرماتے ہیں۔ مجھ سے محمدؒ[4] بن حسینؒ انماطی بغدادیؒ نے بیان کیا۔ وہ فرماتے ہیں ہم سے یحییٰ بن ابوبؒ[5] نے بیان کیا۔ وہ فرماتے ہیں ہم سے عبد الوہابؒ[6] ثقفی رحمۃ اللہ علیہ نے بیان کیا۔ وہ کہتے ہیں ہم سے

---

[1] امام ابو بکر احمدؒ بن الحسین البیہقیؒ علامہ ذہبیؒ ان کو الامام، الحافظ، العلامہ اور شیخ خراسان لکھتے ہیں (تذکرہ ۳ صد ۳۰۹)

[2] جلیل القدر عالم اور بڑے پایہ کے صوفی تھے۔ (بغدادی جلد ۱۲ صد ۲۲۸) علامہ ذہبیؒ ان کو امام بیہقیؒ کے مشائخ اور زمرۂ محدثین میں بیان کرتے ہیں۔ (تذکرہ ۳ صد ۲۰۹)۔

[3] علامہ ذہبیؒ ان کو الحافظ الکبیر لکھتے ہیں۔ (تذکرہ ۳ صد ۶۹)

[4] ثقہ تھے (بغدادی جلد ۲ صد ۲۲۸)

[5] علی بن مدینیؒ اور ابو حاتمؒ ان کو صدوق کہتے ہیں۔ ابن حبانؒ اور حسین بن فہمؒ ان کو ثقہ کہتے ہیں۔ ابن قانعؒ ان کو ثقہ اور مامون کہتے ہیں۔ (تہذیب التہذیب جلد ۱۱ صد ۱۸۸)

[6] الحافظ الامام اور ثقہ تھے۔ (تذکرہ ۱ صد ۲۹۵) آخر عمر میں ان کے دماغ میں کچھ فتور آ گیا تھا۔ (تقریب صد ۲۱۹)

(باقی اگلے صفحہ پر)

ایوبؒ[۱] نے بیان کیا۔ وہ منصورؒ[۲] سے روایت کرتے ہیں۔ وہ ابو وائلؒ[۳] سے روایت کرتے ہیں:

قال عبد اللہ رضؓ فی القرأۃ خلف الامام انصت للقرآن کما امرت فان فی القرأۃ لشغلا وسیکفیک ذلک الامام۔ (کتاب القرأۃ ص۷۳)

کہ حضرت عبداللہ بن مسعودؓ نے فرمایا کہ امام کے پیچھے خاموشی اختیار کرو۔ جیسا کہ تمھیں حکم دیا گیا ہے۔ کیونکہ خود پڑھنے کی وجہ سے امام کی قرأۃ سننے سے آدمی رہ جاتا ہے اور امام کا پڑھنا ہی تمھیں کافی ہے۔ (الگ قرأۃ کی ضرورت باقی نہیں رہتی۔)

حضرت ابن مسعودؓ کی یہ روایت صحیح ہے جیسا کہ آپ دیکھ چکے ہیں اور خطاب ان لوگوں کو تھا جو امام کے پیچھے اس کی اقتدا کر رہے تھے۔ جیسا کہ الفاظ سے ظاہر ہے اور یہ سرّی وجہری تمام نمازوں کو شامل۔ اور فاتحہ وغیر فاتحہ سب کو حاوی ہے اس میں قرأت کو ما زاد علی الفاتحہ پر حمل کرنا جیسا کہ قاضی مقبول احمد صاحب وغیرہ نے کیا ہے سراسر باطل ہے اور اس روایت میں گو امرتُ ہے لیکن پہلی روایت میں تصریح ہے کہ یہ حکم اللہ تعالیٰ نے دیا ہے اور امر بھی واذا قرئ القرآن۔ الآیۃ سے واضح ہے۔ حضرت ابن مسعودؓ سے اسی مضمون کی روایتیں مختلف اسانید سے اور بھی مروی ہیں مگر ہمارا مقصد استیعاب نہیں ہے۔

حضرت عبداللہ بن عباسؓ[۴] رضی اللہ تعالیٰ عنہما (المتوفی ۶۸ھ) سے اس آیت کی تفسیر میں متعدد روایات مروی ہیں۔ مگر ہم یہاں صرف دو روایتیں نقل کرتے ہیں۔

(بقیہ پچھلا صفحہ) لیکن اس فتور کے زمانہ میں انھوں نے کوئی روایت بیان نہیں کی۔ (میزان الاعتدال جلد ۱ ص۱۹۱)

[۱] ثقہ، ثبت اور حجت تھے۔ (تقریب ص۴۶)

[۲] الامام الحافظ اور الحجۃ تھے۔ (تذکرہ جلد ۱ ص۱۳۴) ابو حاتمؒ کہتے ہیں کہ وہ بڑے متقن تھے تدلیس نہیں کرتے تھے۔ عجلیؒ ان کو ثقہ، ثبت اور حجت کہتے ہیں۔ (تہذیب التہذیب ۱۰ ص۳۱۵)

[۳] ابو وائلؒ ان کا نام شقیق بن سلمہؒ ہے۔ ابن معینؒ کہتے ہیں وہ ایسے ثقہ تھے کہ ان کے مثل سے متعلق سوال نہیں ہو سکتا۔ امام وکیعؒ کہتے ہیں کہ وہ ثقہ تھے۔ ابن سعدؒ ان کو ثقہ اور کثیر الحدیث کہتے ہیں۔ ابن حبان ان کو ثقات میں لکھتے ہیں۔ ان کی یہ خوبی تھی کہ تدلیس نہیں کرتے تھے۔ (ایضاً ۴ ص۳۶۲)

[۴] تمام حضرات صحابہ کرامؓ میں فن تفسیر میں حضرت ابن مسعودؓ کے بعد نمبر حضرت عباسؓ کا آتا ہے۔ اور کیوں نہ

(بقیہ اگلے صفحہ پر)

پہلی روایت: امام بیہقیؒ فرماتے ہیں ہم سے ابوزکریا بن ابی اسحاق مزکیؒ نے بیان کیا وہ فرماتے ہیں ہم سے ابوالحسن احمد بن محمد بن عبدوسؒ نے بیان کیا، وہ فرماتے ہیں ہم سے عثمان بن سعیدؒ نے بیان کیا وہ فرماتے ہیں ہم سے عبداللہ بن صالحؒ نے بیان کیا ہے

(بقیہ حاشیہ پچھلا صفحہ) جناب رسول خدا صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے ان کے حق میں یہ دعا فرمائی تھی کہ اے اللہ! اس کو دین کی سمجھ اور قرآن کریم کی تفسیر اور تاویل کی مہارت عطا فرما۔ (مسند احمد جلد ۱ ص ۳۲۸ قال الهيثمی رح رجاله رجال الصحيح مجمع الزوائد جلد ۹ ص ۲۷۶ وصححہ ابن کثیرؒ البدایہ والنہایہ جلد ۸ ص ۲۹۵) حضرت ابن عمرؓ فرماتے ہیں کہ وہ اعلم الناس بما انزل علی محمد صلی اللہ علیہ وسلم تھے۔ (ایضاً البدایہ جلد ۸ ص ۳۰) — علامہ ذہبیؒ لکھتے ہیں کہ وہ دین کے امام علم کا سمندر اور بہت بڑے عالم تھے۔ (تذکرہ ۱ ص ۳۷) یہی وجہ تھی کہ حضرت عمرؓ ایسے محقق اور صاحب بصیرت بھی قرآن کریم کی تفسیر میں ان کی طرف مراجعت کرتے تھے۔ (بخاری ۲ ص ۷۴۳)۔

[1] علامہ ذہبیؒ انکو مسند نیشاپور لکھتے ہیں (تذکرہ جلد ۳ ص ۲۳۵) علامہ خطیبؒ لکھتے ہیں کہ وہ ادیب مورخ کثیر العلوم تھے اور علاقہ نیشاپور میں علم حدیث کا درس دیتے تھے (بغدادی جلد ۴ ص ۲۳۹) [2] علامہ سبکیؒ نے طبقات جلد ۲ ص ۹۸ میں ان کا تذکرہ کیا ہے اور علامہ ذہبیؒ ان کو مسند نیشاپور لکھتے ہیں (تذکرہ جلد ۳ ص ۱۰۶) [3] علامہ ذہبیؒ ان کو الامام اور الحجۃ لکھتے ہیں (تذکرہ جلد ۲ ص ۱۷۱)

[4] امام ابن معینؒ انکو ثقہ اور ابو حاتمؒ صدوق کہتے ہیں۔ ابن حبانؒ ان کو مستقیم الحدیث کہتے ہیں (تذکرہ جلد ۱ ص ۳۵۶) عبدالملک بن شعیبؒ ان کو ثقہ اور مامون کہتے ہیں۔ ابوزرعہؒ انکو حسن الحدیث، اور ابن عدیؒ مستقیم الحدیث کہتے ہیں مسلمہ بن قاسمؒ (دیا۔ س) یہ کہتے ہوئے ان کی توثیق کرتے ہیں (تہذیب التہذیب جلد ۵ ص ۲۵۹) امام ابن معینؒ نے ان کو ثبت فی کتاب کہا ہے (تہذیب جلد ۵ ص ۲۶۰) یعقوب بن سفیانؒ انکو الرجل الصالح کہتے ہیں (تہذیب جلد ۵ ص ۲۵۹) ابو ہارون الخربیؒ فرماتے ہیں کہ میں نے ابو صالحؒ سے اثبت اور کوئی نہیں دیکھا اور ابن القطانؒ فرماتے ہیں کہ وہ صدوق ہیں۔ ان پر ایسا کوئی الزام ثابت نہیں ہوسکا جسکی وجہ سے انکی حدیث ساقط الاعتبار ہو۔ ہاں وہ مختلف فیہ ہیں (فحدیثہ حسن) انکی حدیث حسن ہے۔ (ایضاً ص ۲۶۱) حافظ ابن حجرؒ نے اس کی نشان دہی کی ہے کہ یہ صحیح بخاری کے راوی ہیں (ایضاً) اور صحیح بخاری جلد ۲ ص ۱۰۶۴ میں انکی روایت موجود ہے اور جن حضرات محدثین کرامؒ نے ان میں کلام کیا ہے تو اسکی اصل وجہ ان کا ایک شریر پڑوسی تھا جس کا نام خالد بن نجیح تھا، ابو صالح عبداللہؒ بن صالحؒ کا کوئی قصور نہیں ہے۔ تہذیب التہذیب (جلد ۵ ص ۲۵۹) وغیرہ میں اس کی تصریح موجود ہے اور امام بخاریؒ نے ادب المفرد اور جزء القراۃ وغیرہ میں ان سے باقاعدہ احتجاج کیا ہے فریق ثانی کی ستم ظریفی دیکھئے کہ وہ محض تعصب کی وجہ سے ایسے مسلم راویوں کو بھی مجروح اور ضعیف گردانتے کے درپے ہے۔ امام حاکمؒ انکی سند سے ایک حدیث کو صحیح الاسناد اور ذہبیؒ صحیح کہتے ہیں (مستدرک ۲ ص ۱۹۹) اور انکی سند سے ایک روایت کو علامہ ذہبیؒ سندہ قوی کہتے ہیں (تذکرہ جلد ۱ ص ۳۵۶) اور حافظ ابن کثیرؒ انکی سند سے ایک حدیث کو اسناد جید سے تعبیر کرتے ہیں۔ (البدایہ والنہایہ جلد ص ... وتفسیر جلد ۳ ص ۴۲۸) قاضی مقبول احمد صاحب لکھتے ہیں کہ ابن عدیؒ نے ان کو مستقیم الحدیث کہا

وہ کہتے ہیں مجھ سے معاویہ بن صالحؒ[1] نے بیان کیا۔ وہ علیؒ بن ابی طلحہؒ[2] سے روایت کرتے ہیں کہ

عن ابن عباسؓ فی قولہ تعالٰی واذا قرئ القراٰن فاستمعوا لہ وانصتوا لعلکم ترحمون یعنی فی الصلوٰۃ المفروضۃ

حضرت ابن عباسؓ نے فرمایا کہ اذا قرئ القراٰن الآیۃ فرضی نماز کے بارے میں نازل ہوتی ہے۔ (کتاب القراۃ ص۴۳)

حضرت ابن عباسؓ کی اس روایت کا مفہوم بالکل واضح ہے کہ اس آیت میں استماع اور انصات کا جو حکم آیا ہے وہ شان نزول کے لحاظ سے صرف فرضی نماز کو شامل ہے اور یہی اس کا شان نزول ہے۔ گو غیر فرضی نمازوں (مثلاً نماز عید و تراویح وغیرہ) اور خطبہ کو بھی عموم الفاظ کے لحاظ سے شامل ہے۔

تنبیہ: علیؒ ابن ابی طلحہ ہاشمیؒ کی براہ راست حضرت عبداللہ بن عباسؓ سے سماعت نہیں ہوئی۔ بلکہ وہ حضرت مجاہدؒ بن جبرؒ اور سعیدؒ بن جبیرؒ کی وساطت سے حضرت ابن عباسؓ سے روایت کرتے ہیں اور یہ دونوں ثقہ ہیں (جیسا کہ اپنے موقع پر ذکر ہوگا) اس لیے یہ روایت بلاشک و شبہ

(پچھلے صفحہ کا باقی) ہے مگر ساتھ ہی کہا ہے کہ سند اور متن میں غلطی کر جاتا ہے۔ عمداً جھوٹ نہیں کہتا۔ (تہذیب جلد ۵ ص۲۵۷) اس لیے عبداللہؒ بن صالحؒ پر شدید جرح موجود ہے۔ اھ محصلہ الاعتصام ۲۱ ستمبر ۱۹۶۲ء ص۱ کالم ۲ مگر جمہور محدثین کی تعدیل کے مقابلہ میں صرف ابن عدیؒ کا یہ بیان ادنیٰ جرح بھی نہیں چہ جائیکہ شدید جرح ہو۔

[1] علامہ خطیبؒ ان کو ثقات میں بیان کرتے ہیں (بغدادی جلد ۱۱ ص۴۲۰) امام احمدؒ ان کو ثقہ اور ابن عدیؒ ان کو صدوق کہتے ہیں۔ ابو زرعہؒ ان کو ثقہ کہتے ہیں۔ (تہذیب التہذیب جلد ۱۰ ص۲۰۹) علامہ ذہبیؒ ان کو الامام الفقیہ اور قاضی اندلس لکھتے ہیں (تذکرہ جلد ۱ ص۱۶۶) حاکمؒ ان کی سند سے ایک روایت کو صحیح سے (مستدرک ۱ ص۱۰۹) اور ذہبیؒ حسن الاسناد، اور صالح الاسناد سے تعبیر کرتے ہیں۔ (تذکرہ جلد ۱ ص۳۵۲ و ص۳۵۳) بلکہ ذہبیؒ بھی ان کی ایک سند کو صحیح کہتے ہیں (تلخیص المستدرک جلد ۴ ص۸۱) اور سیوطیؒ ان کی سند سے ایک روایت کو اسنادہ صحیح سے تعبیر کرتے ہیں (تاریخ الخلفاء ص۱۰) اور مستدرک جلد ۳ ص۲۲ میں ایک روایت کی سند یوں ہے۔ عبداللہ بن صالح عن معاویۃ بن صالح عن علی بن ابی طلحۃ عن ابن عباسؓ ..... الخ امام حاکمؒ اور ذہبیؒ دونوں فرماتے ہیں صحیح۔

[2] امام نسائیؒ ان کی لیس بہ بأس سے توثیق کرتے ہیں (میزان جلد ۲ ص۲۲۸) ابو داؤدؒ ان کو مستقیم الحدیث کہتے

(بقیہ اگلے صفحہ پر)

صحیح اور معتبر ہے۔ (دیکھیے مزید تحقیق کے لیے میزان الاعتدال ۲ صـ۲۲۸ فتح الباری ۸ صـ۳۱۲ ، تہذیب التہذیب ۷ صـ۳۳۹ ، اور تفسیر اتقان ج ا صـ۱۸۸)

علیؒ بن ابی طلحہؒ کے اس تفسیری صحیفہ کو صحیح اور معتبر سمجھتے ہوئے امام ابوجعفر نحاسؒ نے اپنی کتاب الناسخ والمنسوخ میں استفادہ کیا ہے (اتقان جلد ا صـ۱۸۸) اور اسی صحیفہ سے امام بخاریؒ نے صحیح میں اور امام ابن جریرؒ و ابن ابی حاتمؒ اور امام ابن المنذرؒ وغیرہ نے تفاسیر میں خوشہ چینی کی ہے۔ (فتح الباری جلد ۸ صـ۳۳۸)

نواب صدیق حسن خاں صاحبؒ لکھتے ہیں: اما روایت از ابن عباس بطریق مختلفہ آمدہ اجود آنہا طریق معاویہؒ بن صالحؒ از علیؒ بن ابی طلحہؒ از ابن عباسؓ است، بخاری در صحیح خود اعتماد برہمیں طریق کردہ لیس میں۔ اکسیر فی اصول التفسیر صـ۱۱)

مصنف خیر الکلام نے اس سے جو مخلص تلاش کیا وہ یہ ہے کہ علیؒ بن ابی طلحہ کی ابن عباسؓ سے باقرار مصنف احسن الکلام سماعت نہیں۔ لہٰذا یہ منقطع ہے اور مجاہدؒ اور سعیدؒ بن جبیرؒ کا واسطہ تفسیری صحیفہ میں ہے جب تک یہ ثابت نہ کیا جائے کہ یہ اسی صحیفہ کی روایت ہے۔ تو اتصال ثابت نہیں ہو سکتا۔ پھر امام احمدؒ بن حنبلؒ نے فرمایا ہے کہ لہ اشیاء منکرات۔ (میزان جلد ۲ صـ۲۲۸) اس کے لیے کچھ منکر چیزیں بھی ہیں اور متن کے لحاظ سے اس میں کوئی ذکر نہیں کہ مقتدی کو آیا جہر سے روکا گیا ہے یا کلام کرنے یا شور ڈالنے سے اور یہ بھی احتمال ہے کہ آیت فرضی نماز جمعہ اور عید سب کو شامل ہو۔ اس صورت میں نماز کو دوسرے مقامات پر ترجیح نہ ہوگی۔

(محصلہ خیر الکلام صـ۳۴۷ و صـ۳۴۸)

الجواب:

ہم نے باحوالہ ثابت کیا ہے کہ علیؒ بن ابی طلحہؒ صحیح مسلم کا راوی اور ثقہ ہے اور اس نے مجاہدؒ اور سعیدؒ بن جبیرؒ کے واسطے سے حضرت ابن عباسؓ سے تفسیر حاصل کی ہے اور اسی کو امام حاکمؒ اور ناقدِ فنِ رجال علامہ ذہبیؒ وغیرہ صحیح کہتے ہیں جیسا کہ باحوالہ گذر چکا ہے اور ہم نے باحوالہ نواب

(بقیہ پچھلا صفحہ) ابن حبانؒ ان کو ثقات میں لکھتے ہیں۔ محدث عجلیؒ ان کو ثقہ کہتے ہیں۔ (تہذیب التہذیب جلد ۷ صـ۳۳۹) اور صحیح مسلم جلد ا صـ۲۶۵ میں ان کی روایت موجود ہے۔

صاحبؒ سے یہ ذکر کیا ہے کہ ابن عباسؓ کی روایت کے طرق تو متعدد ہیں مگر اجود ترین طریقہ معاویہؒ بن صالحؒ از علیؒ بن ابی طلحہؒ از ابن عباسؓ ہے اور اسی طریق پر امام بخاریؒ نے اعتماد کیا ہے صحیفہ کی قید مؤلف خیر الکلام کی محض سینہ زاد ہے۔ جس کی پرکاہ بھی کوئی حیثیت نہیں ہے۔ یہ روایت اصولِ حدیث کے رُو سے بالکل صحیح اور متصل ہے۔ رہا امام احمدؒ کا یہ فرمانا کہ لہ اشیاء منکرات تو بجا ہے لیکن اس کی وجہ ان کا روایت میں ضعف نہیں بلکہ اس لیے کہ

ولكن له رأى سوء كان يرى السيف
(تهذيب التهذيب جلد ۷ ص ۳۴۰)

ان کی رائے اچھی نہ تھی کیونکہ وہ خلیفہ کے مقابلہ خروج کو جائز سمجھتے تھے۔

اور حافظ ابن حجرؒ فرماتے ہیں کہ

ونقل البخارى من تفسيره رواية معاوية بن صالح عنه عن ابن عباسؓ شيئًا كثيرًا فى التراجم وغيرها ولكنه لا يسميه يقول قال ابن عباسؓ او يذكر عن ابن عباسؓ وقد وقفت على السبب الذى قال فيه ابو داؤد يرى السيف اھ
(تهذيب التهذيب جلد ۷ ص ۳۴۰)

امام بخاریؒ نے اپنی تفسیر میں معاویہؒ بن صالحؒ عن علیؒ بن ابی طلحہؒ عن ابن عباسؓ کے طریق سے اپنے ابواب کے تراجم وغیرہا میں بہت زیادہ روایتیں نقل کی ہیں لیکن وہ ان کا نام نہیں لیتے بلکہ کہہ دیتے ہیں کہ ابن عباسؓ نے فرمایا یا ابن عباس سے نقل کیا گیا ہے اور میں اس کی وجہ پر مطلع ہو چکا ہوں وہ یہ ہے کہ امام ابوداؤدؒ فرماتے ہیں کہ وہ بادشاہ کے خلاف تلوار کے استعمال کی اجازت دیتے تھے۔

ان کے ایسے خیالات اشیاء منکرات کی مد میں ہیں اور ایسے راوی جو شیعہ، مرجی اور قدری وغیرہ ہیں صحیحین میں ان کی بے شمار روایتیں موجود ہیں۔ یہ ان کی ضعف کی وجہ نہیں ہے اہل علم سے یہ امر مخفی نہیں ہے اگر ضرورت پڑی تو ہم انشاء اللہ تعالیٰ اس کی تفصیل عرض کریں گے اور اس ارشاد سے مقتدی کو قرأۃ سے منع کیا گیا ہے۔ کیونکہ وَاِذَا قُرِئَ ... الآیۃ اس کا واضح قرینہ ہے۔ باقی جہر اور شور و غل وغیرہ حضرات صحابہ کرامؓ سے جماعتی رنگ میں حضورؐ کے پیچھے نہ ہوتا تھا۔ افراد کا معاملہ الگ ہے اور نماز میں قرأت سے منع کرنا اس آیت کا اولین مصداق ہے کیونکہ جمعہ اور عید وغیرہ کا حکم ہجرت کے بعد نازل ہوا ہے اور آیت مکّی ہے۔ ہاں ضمنی طور پر وہ بھی اس میں داخل ہیں کیونکہ بقول مؤلف خیر الکلام شانِ نزول کے حکم میں اس قسم کی وسعت ہوتی ہے۔

دوسری روایت: امام بیہقیؒ فرماتے ہیں۔ ہم سے ابوالحسن علیؓ بن محمدؒ بن عبداللہؒ بن بشرانؒ نے بغداد میں بیان کیا۔ وہ کہتے ہیں۔ ہم سے ابوجعفر محمدؒ بن عمرو الرزازؒ نے بیان کیا۔ وہ فرماتے ہیں ہم سے سعدانؒ بن نصرؒ نے بیان کیا وہ فرماتے ہیں ہم سے مسکینؒ بن بکیر الحرانیؒ نے بیان کیا۔ وہ ثابتؒ بن عجلانؒ سے روایت کرتے ہیں۔ وہ سعیدؒ بن جبیرؒ سے اور وہ عبداللہؓ بن عباسؓ سے انھوں نے فرمایا:

المؤمن فی سعة من الاستماع الیه الا فی صلوٰة مفروضة او المکتوبة او یوم جمعة او یوم فطر او یوم اضحٰی یعنی واذا قرئ القرآن..... الآیة

کہ آیت واذا قرئ القرآن کے پیش نظر مومن پر کوئی پابندی نہیں ہے۔ اس کو گنجائش ہے کہ سنے یا نہ سنے مگر مفروضہ نماز، جمعہ، عید الفطر، عید الاضحیٰ کے موقع پر اس کے لیے کوئی گنجائش نہیں ہے۔

(کتاب القرأة ص۱۳۰)

(ان حالات میں اس کو بہر حال خاموش رہنا اور استماع و انصات کرنا ضروری ہے)

۱؎ امام خطیبؒ ان کو ثقہ، صدوق، ثبت، حسن الاخلاق اور تام المروۃ لکھتے ہیں۔ (بغدادی جلد ۱۲ ص۹۹)

۲؎ علامہ بغدادیؒ ان کو ثقہ اور ثبت لکھتے ہیں۔ (بغدادی جلد ۳ ص۱۳۲)

۳؎ امام ابوحاتمؒ ان کو صدوق اور دارقطنیؒ ان کو ثقہ اور مامون کہتے ہیں۔ (بغدادی جلد ۹ ص۲۰۵)

۴؎ امام احمدؒ اور ابن معینؒ ان کی لا بأس کہتے ہوئے توثیق کرتے ہیں۔ ابن حبانؒ اور ابن شاہینؒ ان کو ثقات میں لکھتے ہیں۔ ابن عمارؒ ان کو ثقہ لکھتے ہیں۔ ابو حاتمؒ ان کو صالح الحدیث اور لا بأس بہ کہتے ہیں اور فرماتے ہیں کہ وہ حدیث کے حافظ تھے۔ قاضی مقبول احمد صاحب نے یہ اعتراض کیا ہے کہ تقریب میں اس کو خطا کار کہا ہے اور امام احمدؒ اور ابو احمدؒ نے اس کو بہت وہمی اور کثیر الخطا کہا ہے۔ (محصلہ الاعتصام ۲۸ ستمبر ۱۹۶۲ء ص۸ کالم ۱) لہٰذا اس حدیث پر کسی طرح اعتبار نہیں کیا جا سکتا۔ (ایضاً)

الجواب۔ ان کا وہم اور خطا وغیرہ جو کچھ ہے مطلق نہیں ہے بلکہ صرف سعیدؒ بن عبدالعزیزؒ کی روایت میں ہے۔ چنانچہ خود ابو احمدؒ نے تصریح کی ہے ومن این کان مسکین یضبط عن سعید اھ۔ (تہذیب جلد ۱۰ ص۱۲۱) کہ مسکینؒ کو سعیدؒ کی روایت میں ضبط کہاں سے نصیب ہوا؟ اور اس سند میں روایت ثابتؒ بن عجلانؒ سے ہے نہ کہ سعیدؒ سے۔

۵؎ امام احمدؒ اور ابن معینؒ ان کو ثقہ کہتے ہیں۔ دحیمؒ اور نسائیؒ لیس بہ بأس سے ان کی توثیق کرتے ہیں۔ ابو حاتمؒ ان کو صالح الحدیث کہتے ہیں، ابن حبانؒ ثقات میں لکھتے ہیں (تہذیب التہذیب جلد ۲ ص۱۰) ۶؎ ان کا ذکر عنقریب آئے گا۔ انشاء اللہ تعالیٰ۔

حضرت ابن عباسؓ کی سابق روایت سے معلوم ہو چکا ہے کہ آیت مذکورہ کا شانِ نزول فرضی نماز ہے۔ اور اس روایت میں وہ عموم الفاظ کے پیش نظر جمعہ اور عیدین کی نماز اور خطبہ وغیرہ کا حکم بھی استماع و انصات بیان کرتے ہیں اور اس کی پوری تحقیق اپنے مقام پر آئے گی کہ نصوص میں عموم الفاظ کا اعتبار ہوتا ہے۔ نہ کہ خصوص اسباب کا۔ اور یہ کہ کوئی آیت شانِ نزول پر مقید نہیں ہوتی۔ اسی طرح کے مضمون کی روایت حضرت ابوہریرہؓ اور حضرت عبداللہؓ بن مغفل وغیرہ سے بھی مروی ہے کہ اس آیت کا حکم امام کے پیچھے اقتداء کرنے والوں کو ہے۔ مگر حضرت ابن مسعودؓ اور حضرت ابن عباسؓ کی تفسیر کے بعد کچھ کہنے کی مطلقاً حاجت باقی نہیں رہتی کیونکہ قرآن کریم کی تفسیر کے متعلق ان کا مقام تمام حضرات صحابہ کرامؓ سے علی الاطلاق بہت اونچا اور بلند ہے اور سند کے لحاظ سے بھی یہ روایتیں سو فی صدی صحیح ہیں جیسا کہ آپ پوری تفصیل سے پڑھ چکے ہیں۔ مصنفؒ خیر الکلام سے نہ تو جواب بن سکا ہے اور نہ خاموشی گوارا فرما سکے ہیں کیونکہ "ملاّ آں باشد کہ چپ نشود"۔ وہ لکھتے ہیں کہ بعض حنفیہ نے آیت کے شانِ نزول میں صحابہ کرامؓ سے صرف دو قول نقل کیے ہیں۔ ایک عبداللہؓ بن مسعود کا قول ہے۔ دوسرا عبداللہؓ بن عباسؓ کا ہے حالانکہ ابن عباسؓ سے بسند صحیح اور ابن مسعودؓ سے پانچ اسانید کے ساتھ اگرچہ بعض اسانید میں انفرادی طور پر کچھ کلام ہے مگر مجموعی طور پر معلوم ہوتا ہے کہ وہ قرأت خلف الامام کے قائل تھے پس ان دو صحابہؓ سے صرف اس قدر مروی ہونے سے کہ یہ آیت نماز کے بارے میں ہے یہ ثابت نہیں ہوتا کہ یہ آیت نمازی کو قرأت سے روکنے کے لیے ہے۔ (محصلہ خیر الکلام ص۳۴۳، ص۳۴۴)

الجواب:

روایت تو صرف ایک صحابی کی بھی کافی ہوتی ہے جب کہ سند صحیح ہو آپ کو دو صحابہؓ کی روایت سے کیوں تسلی نہیں ہوتی؟ اور یہ روایتیں صحیح اسانید کے ساتھ ہیں اور یہیں حضرت ابن مسعودؓ اور ابن عباسؓ سے جو فن تفسیر میں پہلا درجہ رکھتے ہیں اگر ان کی روایتیں معتبر نہیں تو نہ معلوم آپ کے نزدیک کس کی مروی روایتیں معتبر ہوں گی؟ یقین رکھیے کہ یہ کوئی جواب نہیں ہے ممکن ہے کہ آپ کے حواری اسی قدر سے مطمئن ہو جائیں مگر ایک رتی جان بھی اس میں نہیں ہے باقی حضرت ابن مسعودؓ سے ایک روایت بھی قرأت خلف الامام کے جواز کی ثابت نہیں تفصیل اپنے مقام پر مذکور ہے اور

حضرت ابن عباسؓ کی روایتیں متعارض ہیں۔ صحیح روایت ترکِ قرأۃ کی ہے جیسا کہ ابھی مذکور ہوا اور اپنے مقام پر آگے بھی آئے گا۔ انشاء اللہ تعالیٰ۔

اس کے بعد ہم بعض تابعینؒ کی چند روایات اس آیت کی تفسیر میں نقل کرتے ہیں۔ حافظ ابن کثیرؒ لکھتے ہیں۔ قرآن کریم کی تفسیر میں قرآن، حدیث اور صحابہؓ کے بعد تابعین کی تفسیر قابلِ حجت ہے اور یہی اکثر ائمہؒ سے منقول ہے۔ خصوصاً مجاہدؒ بن جبرؒ کی تفسیر کیونکہ وہ فن تفسیر کے امام تھے۔ سفیان ثوریؒ فرمایا کرتے تھے۔ جب مجاہدؒ کی تفسیر تمہارے پاس پہنچ جائے تو پھر کسی کی حاجت باقی نہیں رہتی۔ اور ان کے بعد سعیدؒ بن جبیرؒ، عکرمہؒ، عطاءؒ بن ابی رباحؒ حسن بصریؒ، مسروقؒ، سعیدؒ بن المسیبؒ، ابوالعالیہؒ ربیعؒ بن انسؓ، قتادہؒ اور ضحاکؒ بن مزاحمؒ وغیرہ کا درجہ ہے۔ (تفسیر ابن کثیرؒ جلد ۱ صفحہ ۱۲ ۵)

نواب صدیق حسن خاں صاحبؒ لکھتے ہیں: وھکذا تفسیر التابعی حجۃ (الجنہ صفحہ ۹۲) صحابی کی طرح تابعی کی تفسیر بھی حجت ہے۔

حضرت مجاہدؒ[1] بن جبرؒ: (المتوفی سنہ ۱۰۲ھ) سے

پہلی روایت: امام بیہقیؒ فرماتے ہیں کہ ہم سے حافظ ابو عبد اللہؒ[2] نے بیان کیا وہ فرماتے ہیں کہ

---

[1] علامہ ابن سعدؒ لکھتے ہیں کہ وہ فقیہہ، عالم، ثقہ اور کثیر الحدیث تھے۔ (طبقات ابن سعد ۵ صفحہ ۴۶۶) امام ذہبیؒ لکھتے ہیں کہ وہ علم کا ظرف تھے۔ (تذکرہ جلد ۱ صفحہ ۸۶) امام نوویؒ لکھتے ہیں کہ ان کی امامت اور جلالت پر سب کا اتفاق ہے۔ خصیفؒ کا بیان ہے کہ مجاہدؒ تفسیر کے سب سے بڑے عالم ہیں (تذکرہ جلد ۱ صفحہ ۸۶) حبر الامت حضرت ابن عمرؓ ان کے حفظ کے اتنے معترف تھے کہ فرماتے تھے کہ کاش نافعؒ کا حفظ تمہاری ہی طرح ہوتا (شذرات الذہب جلد ۱ صفحہ ۱۲۵) حافظ ابن کثیرؒ لکھتے ہیں کہ وہ احد الائمۃ التابعین والمفسرین تھے اور حضرت ابن عباسؓ کے ارشد تلامذہ میں تھے اور اپنے زمانہ میں تفسیر کے سب سے بڑے عالم تھے (البدایۃ والنہایۃ جلد ۹ صفحہ ۲۲۴) اور ان کے فقہی کمال کے لیے یہ سند کافی ہے۔ کہ مخزنِ علوم مکہ کی جماعت افتاء کے ایک معزز رکن تھے۔ (اعلام الموقعین جلد ۱ صفحہ ۳۶) نواب صاحبؒ لکھتے ہیں: ابن تیمیہؒ گفتہ اعلم الناس بالتفسیر اہل مکہ لانہم اصحاب عبد اللہ بن عباسؓ کمجاہدؒ۔ آگے لکھتے ہیں۔ ابن تیمیہؒ فرماتے ہیں یہی وجہ ہے کہ امام شافعیؒ اور امام بخاریؒ اور دیگر اہلِ علم نے ان کی تفسیر پر کلی اعتماد کیا ہے (اکسیر صفحہ ۱۱)

[2] یہ وہی امام ہیں جن کو الحاکم کہتے ہیں اور جن کی کتاب مستدرک شائع ہو چکی ہے۔ (باقی اگلے صفحہ پر دیکھیے)

ہم سے حافظ ابو علی حسین بن علیؒ نے بیان کیا۔ وہ فرماتے ہیں کہ ہم سے ابو یعلیٰ موصلیؒ نے بیان کیا۔ وہ فرماتے ہیں کہ ہم سے محمد بن ابو بکر مقدمیؒ نے بیان کیا۔ وہ فرماتے ہیں کہ ہم سے یحییٰ بن سعیدؒ نے بیان کیا۔ وہ سفیانؒ سے روایت کرتے ہیں اور وہ فرماتے ہیں کہ ہم سے ابو ہاشم اسمٰعیل بن کثیر مکیؒ نے بیان کیا۔ وہ مجاہد بن جبیرؒ سے روایت کرتے ہیں کہ اذا قرئ القرآن فاستمعوا له قال فی الصلوٰۃ۔ (کتاب القرأۃ ص ۷۳) واذا قرئ القرآن .... الآیۃ

دوسری روایت:

امام بیہقیؒ سے لے کر محمد بن ابو بکر مقدمیؒ تک وہی سند ہے جو پہلے بیان ہو چکی ہے۔ وہ فرماتے ہیں ہم سے اشعثؒ بن عبد اللہؒ نے بیان کیا۔ وہ فرماتے ہیں ہم سے

(بقیہ حاشیہ پچھلا صفحہ) علامہ ذہبیؒ لکھتے ہیں کہ وہ الحافظ الکبیر اور امام المحدثین تھے۔ (تذکرہ جلد ۳ ص ۲۲۷)

۱؎ خطیبؒ لکھتے ہیں کہ وہ حفظ اتقان، ورع، مذاکرۂ ائمہ اور کثرت تصنیف میں گوئے سبقت لے گئے تھے (البغدادی جلد ۸ ص ۷۱) ذہبیؒ ان کو الامام، الحافظ اور محدث اسلام لکھتے ہیں۔ (تذکرہ جلد ۳ ص ۱۱۰)۔

۲؎ ذہبیؒ ان کو الحافظ، الثقہ اور محدث جزیرہ لکھتے ہیں۔ (تذکرہ جلد ۲ ص ۲۴۷)

۳؎ امام یحییٰ بن سعید القطانؒ اور ابو زرعہؒ ان کو ثقہ کہتے ہیں۔ ابو حاتمؒ ان کو صالح الحدیث اور ابن قانعؒ ان کو ثقہ کہتے ہیں۔ (تہذیب التہذیب جلد ۹ ص ۷۹)

۴؎ امام الجرح والتعدیل ذہبیؒ ان کو الامام العلم اور سید الحفاظ لکھتے ہیں۔ نسائیؒ فرماتے ہیں کہ مالکؒ، شعبہ اور یحییٰ بن سعیدؒ حدیث رسول کے امین تھے۔ (تذکرہ جلد ۱ ص ۲۷۴) علامہ ابن سعدؒ لکھتے ہیں کہ وہ ثقہ، ثبت، حجت، بلند مرتبہ اور مامون تھے۔ خلیلیؒ کہتے ہیں وہ بلا کسی اختلاف کے مسلم امام تھے (تہذیب ۱۱ ص ۲۱۹)

۵؎ امام سفیان ثوریؒ کا ترجمہ مقدمہ میں نقل کیا جا چکا ہے۔

۶؎ امام احمدؒ، نسائیؒ، یعقوب بن شیبہؒ، یعقوب بن سفیانؒ اور عجلیؒ سب ان کو ثقہ کہتے ہیں۔ ابن سعدؒ ان کو ثقہ اور کثیر الحدیث کہتے ہیں۔ ابو حاتمؒ ان کو صاحب الحدیث کہتے ہیں اور ابن حبانؒ ان کو ثقات میں لکھتے ہیں۔ (تہذیب التہذیب جلد ۱ ص ۳۲۶)

۷؎ امام ابن معینؒ اور ابو داؤدؒ ان کو ثقہ کہتے ہیں۔ امام نسائیؒ لا باس بہ سے ان کی توثیق کرتے ہیں۔ ابن حبانؒ ان کو ثقات میں لکھتے ہیں۔ (تہذیب التہذیب جلد ۱ ص ۳۵۶)

شعبہؒ نے بیان کیا وہ حمیدؒ اعرج سے روایت کرتے ہیں اور وہ حضرت مجاہدؒ سے واذا قرئ القراٰن فاستمعوا قال فی الصلوٰۃ (کتاب القرأۃ ص۴۳) انھوں نے فرمایا کہ واذا قرئ القراٰن کا شان نزول نماز ہے۔

تیسری روایت:

امام بیہقیؒ فرماتے ہیں۔ ہم سے حافظ ابو عبداللہؒ نے بیان کیا۔ وہ فرماتے ہیں ہم سے قاضی عبدالرحمٰنؒ بن حسنؒ نے بیان کیا۔ وہ کہتے ہیں ہم سے آدمؒ بن ابی ایاسؒ نے بیان کیا۔ وہ کہتے ہیں۔ ہم سے ورقاءؒ نے بیان کیا۔ وہ ابن ابی نجیحؒ سے روایت کرتے ہیں اور وہ حضرت مجاہدؒ سے

قال کان رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم یقرأ فی الصلوٰۃ فسمع قرأۃ فتی من الانصار فنزل واذا قرئ القراٰن (الاٰیۃ)
(کتاب القرأۃ ص۴۷)

وہ فرماتے ہیں کہ آں حضرت صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نماز میں قرآت کر رہے تھے۔ آپ کے ساتھ ایک انصاری بھی پڑھتا رہا۔ اس پر اذا قرئ القرآن الاٰیۃ نازل ہوئی۔

۱؎ ذہبیؒ ان کو الحجۃ، الحافظ اور شیخ الاسلام لکھتے ہیں (تذکرہ جلد ا ص۱۸۱) سفیان ثوریؒ ان کو امیر المؤمنین فی الحدیث کہتے تھے۔ (کتاب العلل امام ترمذی جلد ۲ ص۲۳۸)

۲؎ امام ابن معینؒ، ابو زرعہؒ، ابو داؤدؒ، ابن خراشؒ، عجلیؒ اور بخاریؒ سب ان کو ثقہ کہتے ہیں۔ نسائیؒ لا بأس بہ کہتے ہیں۔ ابن سعدؒ ثقہ اور کثیر الحدیث کہتے ہیں۔ (تہذیب التہذیب جلد ۳ ص۴۷)

۳؎ امام حاکمؒ نے اس سند سے (مستدرک جلد ۲ ص۴۵، ۴۶، ۲۵۹، ۲۶۰، ۵۲۱، ۳۵۳، ۲۷۶۔ وجلد ۳ ص۳۱۴، وجلد ۴ ص۶۶ وغیرہ میں، چند حدیثیں نقل کی ہیں اور ہر مقام پر امام حاکمؒ اور ذہبیؒ ان کو صحیح کہتے ہیں اور ایک مقام پر حاکمؒ اور ذہبیؒ دونوں علیٰ شرط الشیخین تصحیح کرتے ہیں۔

۴؎ ورقاءؒ، امام احمدؒ، ابن معینؒ اور وکیعؒ ان کو ثقہ کہتے ہیں۔ ابو حاتمؒ ان کو صالح الحدیث کہتے ہیں۔ ابن حبانؒ اور ابن شاہینؒ ان کو ثقات میں لکھتے ہیں ابن معینؒ فرماتے ہیں کہ ورقاءؒ کی تفسیر شیبانؒ اور سعیدؒ سے زیادہ معتبر ہے کیونکہ ورقاء ابن ابی نجیحؒ سے اور وہ مجاہدؒ سے تفسیر روایت کرتے ہیں اور وہ فن تفسیر کے امام تھے۔ (تہذیب التہذیب جلد ۱۱ ص۱۱۴)

(نمبر ۵ اگلے صفحہ پر دیکھئے)

اس روایت سے معلوم ہوا کہ امام کے پیچھے قرآۃ کرنا حضرات صحابہ کرام رضی اللہ تعالیٰ عنہم میں معمول نہ تھا۔ ورنہ صرف ایک ہی انصاری کے پڑھنے کا کیا مطلب ہے اور جب حکم نازل ہوا تو نہ پڑھنے والوں کو کچھ نہ کہا۔ بلکہ منع کیا تو پڑھنے والے ہی کو منع کیا اور آیت کا شان نزول بھی حضرت مجاہدؒ نے وضاحت سے بیان فرما دیا ہے اور اسی مضمون کی ایک روایت امام زہریؒ سے بھی منقول ہے۔ (کتاب القرآت ص۲۷)

حضرت امام بیہقیؒ اور مبارک پوری صاحبؒ وغیرہ نے اس اثر کو منقطع کہہ کر گلو خلاصی کرنے کی ناکام کوشش کی ہے جو بے سود ہے۔ اولاً اس لیے امام ابن مدینیؒ فرماتے ہیں: کہ مجاہدؒ کا مرسل عطاءؒ کے مرسل سے مجھے کہیں زیادہ پسند ہے۔ (تہذیب التہذیب جلد۱۰ ص۲۰۲)

امام یحییٰؒ بن سعید القطانؒ کہتے ہیں: مجاہدؒ کا مرسل مجھے طاؤسؒ کے مرسل سے زیادہ پسند ہے۔ (تدریب الراوی ص۷۰ و کتاب العلل ترمذی ص۳۲۹) جب ائمہ جرح و تعدیل ان کے مرسل پر کامل اعتماد کرتے ہیں۔ تو نقار خانہ میں طوطی کی کون سنتا ہے؟

وثانیاً[1] علماء احناف کے نزدیک اور جمہور اہلِ اسلام اور دوسری صدی سے قبل تمام محدثین کرامؒ کے نزدیک تنہا مرسل قابل حجت ہوتا ہے جیسا کہ اپنے مقام پر آئے گا۔ اور جب دوسری روایات سے (گو مرسل ہی کیوں نہ ہوں) وہ معتضد اور قوی ہو جائے تو فریق ثانی کے نزدیک بھی وہ حجت ہے۔ اور مبارک پوری صاحبؒ کو اس کا اقرار ہے (دیکھیے تحقیق الکلام جلد۱ ص۹۱) اور اگر حضرت ابن مسعودؓ و ابن عباسؓ وغیرہ کی صحیح روایات سے بھی[1] انقطاع کا یہ بہانہ رفع

(پچھلے صفحہ کا حاشیہ ۵) ابن ابی نجیحؒ، امام احمدؒ، ابوزرعہؒ، ابن معینؒ اور نسائیؒ ان کو ثقہ کہتے ہیں۔ ابن سعدؒ ان کو ثقہ اور کثیر الحدیث کہتے ہیں۔ ابن حبانؒ ان کو ثقات میں لکھتے ہیں۔ امام سفیانؒ اور ابو حاتمؒ ان کی تفسیر کی بڑی قدر کرتے تھے (تہذیب التہذیب جلد۱۰ ص۴۴)

[1] جو پہلے شانِ نزول کے سلسلہ میں پیش کی گئی ہیں جن کا استدلالی رنگ نہیں جیسا کہ مؤلف خیر الکلام نے ص۳۵ میں) ناکام بہانہ کیا ہے۔ حضرت مجاہدؒ اور ان دونوں حضرات صحابہؓ کے اثر میں شان نزول ہونے کے بارے میں کوئی فرق نہیں ہے اور جمہور حضرات صحابہؓ ان کے ساتھ ہیں جیسا کہ ان کا مرسل حجت ہے اسی طرح ان کی تفسیر بھی حجت ہے اور کسی صحیح روایت سے ان کا قرأۃ خلف الامام کرنا ثابت نہیں ہے۔ جزء القرآۃ ص۹ کا حوالہ بالکل بے سند ہے۔ اس لیے اس کو اس صحیح اور مسند روایات کا جواب تصور کرنا بے سود ہے۔

نہ ہو۔ تو کسی دوسرے جہان اور دوسری جون کی انتظار کیجیے۔

وثالثاً امام شافعیؒ، بخاریؒ، ابن تیمیہؒ وغیرہ کلی طور پر مجاہدؒ کی تفسیر پر اعتماد کرتے ہیں اور نواب صاحبؒ کا حوالہ پہلے نقل کیا جا چکا ہے۔ لہٰذا ان کا یہ عذر یارد اور رکیک تاویل قابل سماعت نہیں ہے حضرت مجاہدؒ کی اور بھی متعدد روایات باسانید صحیحہ مروی ہیں مگر ہم صرف ان پر ہی اکتفا کرتے ہیں: وفیہا کفایۃ لمن لہ ہدایۃ۔

حضرت سعید[1]ؒ بن المسیبؒ (المتوفی ۹۴ھ)

امام بیہقیؒ فرماتے ہیں ہم سے حافظ ابو عبد اللہؒ نے بیان کیا وہ کہتے ہیں ہم سے ابو یعلی موصلیؒ نے بیان کیا وہ کہتے ہیں ہم سے محمدؒ بن ابو بکر مقدمیؒ نے بیان کیا۔ وہ کہتے ہیں ہم سے عبد الرحمن[2]ؒ بن مہدیؒ

---

[1] امام نوویؒ لکھتے ہیں۔ ان کی امامت اور جلالت پر سب کا اتفاق ہے۔ ابن حبانؒ لکھتے ہیں کہ وہ اپنے زمانہ میں اہل مدینہ کے سردار تھے۔ (تہذیب الاسماء جلد ۱ ص ۲۲۰)۔ حافظ ذہبیؒ ان کو الامام شیخ الاسلام اور اجلہ تابعینؒ میں لکھتے ہیں۔ (تذکرہ جلد ۱ ص ۴۹) ابن عمادؒ لکھتے ہیں کہ ان کی ذات میں حدیث، فقہ، زہد و ورع اور عبادات اور جملہ علمی و عملی کمالات جمع تھے۔ (شذرات الذہب جلد ۱ ص ۱۰۲) حافظ ابن کثیرؒ لکھتے ہیں کہ علی الاطلاق وہ سید التابعین تھے اور حضرت ابن عمرؓ ان کو احد المتقین کہتے تھے۔ (البدایہ والنہایہ جلد ۹ ص ۹۹)

امام یحییٰؒ بن سعیدؒ فرمایا کرتے تھے۔ ہم قرآن کی تفسیر میں رائے کو دخل نہیں دیتے صرف وہی کہہ سکتے ہیں۔ جس کا ہمیں علم ہے۔ (تفسیر ابن کثیر جلد ۱ ص ۵) امام احمدؒ فرماتے ہیں کہ ان کے تمام مراسیل صحیح ہیں۔ (تذکرہ جلد ۱ ص ۵۱) امام حاکمؒ لکھتے ہیں کہ تمام مراسیل میں صحیح تر مراسیل ان کے ہیں۔ (معرفت علوم الحدیث ص ۲۵) امام بیہقیؒ ان کے مراسیل کو اصح المراسیل کہتے ہیں۔ (سنن الکبریٰ جلد ۱ ص ۴۲۱) علامہ جزائریؒ لکھتے ہیں کہ مراسیل میں سے صحیح ترین مرسل سعیدؒ بن المسیبؒ کا ہے (توجیہ النظر ص ۱۶۶) امام ابن معینؒ فرماتے ہیں کہ ان کے مراسیل صحیح ترین ہیں۔ (مقدمہ فتح الملہم ص ۳۶) امام شافعیؒ باوجودیکہ وہ دیگر تابعینؒ کے مراسیل میں کلام کرتے ہیں مگر حضرات صحابہ کرامؓ کے مراسیل کی طرح وہ سعیدؒ بن المسیبؒ کے مرسل کو حجت اور صحیح مانتے ہیں۔ (مقدمہ فتح الملہم ص ۳۷)

[2] ذہبیؒ ان کو الحافظ الکبیر الامام العلم اور الشہیر لکھتے ہیں۔ (تذکرہ جلد ۱ ص ۳۰۱) علیؒ بن المدینیؒ کا بیان ہے کہ ان سے بڑا کوئی عالم نہ تھا۔ اگر میں رکن حطیم اور مقام ابراہیم کے درمیان کھڑا ہو کر قسم کھاؤں تب بھی یہی کہوں گا کہ میں نے ان جیسا یا ان سے بڑا کوئی عالم نہیں دیکھا۔ (شذرات ص ۳۵۵ و تہذیب الاسماء جلد ۱ ص ۳۰۵) علامہ سمعانیؒ لکھتے ہیں کہ پختہ کار حافظ صاحب تقویٰ اور جامع حدیث تھے۔ (کتاب الانساب ص ۴۹۶)

نے بیان کیا۔ وہ حمادؒ بن سلمہؒ سے روایت کرتے ہیں اور وہ قتادہؒ سے اور وہ سعیدؒ بن المسیبؒ سے وہ فرماتے ہیں واذا قرئ القرآن فاستمعوا له وانصتوا قال فی الصلوٰۃ (کتاب القرأۃ ص۷۵) کہ آیت واذا قرئ القرآن الآیۃ کا شانِ نزول نماز ہے۔

حضرت حسن بصریؒ (المتوفی سنہ ۱۱۰ھ)

امام بیہقیؒ فرماتے ہیں ہم سے حافظ ابو عبد اللہؒ نے بیان کیا وہ کہتے ہیں ہم سے حافظ ابو علیؒ نے بیان کیا وہ بیان کرتے ہیں ہم سے ابو یعلی موصلیؒ نے بیان کیا وہ کہتے ہیں ہم سے محمدؒ بن ابوبکر مقدمیؒ نے بیان

۱؎ علامہ ذہبیؒ ان کو الامام، الحافظ، المحدث اور شیخ الاسلام لکھتے ہیں۔ (تذکرہ جلد ۱ ص۱۸۹) آخر میں ان کے حافظہ میں معمولی فتور آ گیا تھا۔ (تقریب ص۱۰۱) لیکن اس سے ان کی حدیث اور روایت پر مطلقاً اثر نہیں پڑتا۔ اس کی مزید تحقیق اپنے مقام پر آئے گی، امام احمدؒ فرماتے ہیں جب کسی شخص کو دیکھو کہ وہ حمادؒ بن سلمہؒ کے حق میں کچھ کہتا ہے تو اس کو منافق سمجھنا (فاتہمه علی الاسلام) تذکرہ جلد ۱ ص۱۹۰) یہی الفاظ امام ابن معینؒ سے بھی منقول ہیں۔ (تہذیب التہذیب جلد ۳ ص۱۲) نواب صاحب لکھتے ہیں: گو کہ حمادؒ بن سلمہؒ امام است تفردش مادام کہ در مرویش مانع از اصول نبود مضر نیست۔ (بدور الاہلہ ص۳۳)

۲؎ حضرت قتادہؒ کا ترجمہ جلد ۱ ص۲۲۵ میں مذکور ہے وہاں ملاحظہ کریں۔

۳؎ علامہ ابن سعدؒ لکھتے ہیں کہ وہ جامع کمالات عالم بلند مرتبت رفیع المنزلت، فقیہ مامون عابد زاہد وسیع العلم فصیح و بلیغ، حسین اور جمیل تھے۔ (طبقات جلد ۷ ص۱۱۵) علامہ ذہبیؒ لکھتے ہیں کہ وہ علم کا سمندر، فقیہ النفس، کبیر الشان عدیم النظیر اور بلیغ التذکیر تھے۔ (تذکرہ جلد ۱ ص۶۲) امام نوویؒ لکھتے ہیں کہ ان کی جلالتِ شان پر سب کا اتفاق ہے۔ (تہذیب الاسماء جلد ۱ ص۱۶۱) ابوبکر الہذلیؒ کا بیان ہے کہ جب تک وہ ایک سورت کی تفسیر اور شان نزول وغیرہ سے پوری طرح واقفیت حاصل نہ کر لیتے تھے۔ اس وقت تک آگے نہ پڑھتے تھے۔ (شذرات جلد ۱ ص۱۳۶) فقہ کے بہت بڑے امام تھے اور بصرہ کے مفتی اعظم تھے۔ قتادہؒ کا بیان ہے کہ حسن بصریؒ حلال و حرام کے سب سے بڑے عالم تھے۔ (طبقات ابن سعد جلد ۷ ص۱۱۸ قسم اول) حافظ ابن کثیرؒ لکھتے ہیں کہ وہ الامام الفقیہ المشہور احد التابعین الکبار، الاجلاء اور علم و عمل اور اخلاص میں یکتا تھے (البدایہ والنہایہ جلد ۹ ص۲۶۸) نواب صدیق حسن خاں صاحبؒ لکھتے ہیں۔ حسن بصریؒ و محمدؒ بن کعب القرظیؒ و ابو العالیہ الریاحیؒ وغیرہ ایں ہمہ قدماء مفسرین اند وغالب اقوال ایشاں متلقی از صحابہؓ بودہ است۔ (اکسیر ص۱۲)

گیا۔ وہ کہتے ہیں ہم سے یوسفؒ[۱] بن یعقوبؒ نے بیان کیا وہ شعبہؒ سے روایت کرتے ہیں۔ وہ منصورؒ سے روایت کرتے ہیں اور وہ حضرت حسن بصریؒ سے۔ انھوں نے فرمایا: واذا قرئ القرآن فاستمعوا لہ وانصتوا فی الصلوٰۃ۔ (کتاب القراۃ صـ۲۵) کہ واذا قرئ القرآن کا شانِ نزول نماز ہے۔

حضرت ابو العالیہ[۲] الریاحیؒ (نام رفیعؒ بن مہرانؒ تھا۔ المتوفی سـ۹۳ـھ)

امام بیہقیؒ فرماتے ہیں ہم سے حافظ ابو عبد اللہؒ نے بیان کیا ہے۔ وہ کہتے ہیں ہم سے حافظ ابو علیؒ نے بیان کیا۔ وہ کہتے ہیں ہم سے ابو یعلیٰ (موصلیؒ) نے بیان کیا۔ وہ کہتے ہیں ہم سے محمدؒ بن ابوبکر مقدمیؒ نے بیان کیا۔ وہ کہتے ہیں ہم سے عبد الوہابؒ[۳] نے بیان کیا۔ وہ مہاجرؒ[۴] سے روایت کرتے ہیں اور وہ حضرت ابو العالیہ الریاحیؒ سے، انھوں نے فرمایا:

---

[۱] امام ابن معینؒ، ابو داؤدؒ، یعقوب بن شیبہؒ اور خلیلیؒ سب ان کو ثقہ کہتے ہیں۔ ابو حاتمؒ ان کو شیخ کہتے ہیں اور ابن حبانؒ ان کو ثقات میں لکھتے ہیں۔ (تہذیب التہذیب جلد ۱۱ صـ۴۲۳) باقی جملہ رواۃ کی توثیق پہلے نقل کی جا چکی ہے۔

[۲] امام نوویؒ لکھتے ہیں کہ وہ کبار تابعینؒ میں تھے۔ ابو القاسم طبریؒ کا بیان ہے کہ ان کی توثیق پر سب کا اتفاق ہے۔ (تہذیب الاسماء جلد ۱ صـ۲۵۱) ابو بکرؒ بن ابی داؤدؒ کا بیان ہے کہ حضرات صحابہؓ کے بعد ابو العالیہؒ سے بڑھ کر عالم قرآن کوئی نہ تھا۔ (تذکرہ جلد ۱ صـ۵۸) ابن حمادؒ ان کو مفسر قرآن لکھتے ہیں (شذرات جلد ۱ صـ۱۰۲) علامہ ابن سعدؒ ان کو کثیر الحدیث لکھتے ہیں (طبقات جلد ۷ صـ۸۵) خود امام بیہقیؒ اُن کی قہقہہ فی الصلوٰۃ کی حدیث کے علاوہ باقی تمام احادیث کو صحیح اور مستقیم تسلیم کرتے ہیں۔ (سنن الکبریٰ جلد ۱ صـ۱۴۷) امام عجلیؒ فرماتے ہیں کہ وہ ثقہ اور کبار تابعینؒ میں تھے۔ امام ابن عدیؒ فرماتے ہیں کہ حدیث ضحک فی الصلوٰۃ کے علاوہ ابو العالیہؒ کی باقی تمام احادیث مستقیم اور صالح ہیں۔ (تہذیب التہذیب جلد ۳ صـ۲۸۵) مولیٰ طاش کبریٰ زادہ لکھتے ہیں کہ وہ کبار تابعینؒ میں تھے، آں حضرت صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کی وفات کے صرف دو سال بعد مسلمان ہوئے تھے اور حضرت ابوبکرؓ کے پاس گئے تھے اور حضرت عمرؓ کے پیچھے نماز پڑھی ہے اور قرآن کریم حضرت ابی بن کعبؓ، حضرت زیدؓ بن ثابت اور حضرت ابن عباسؓ سے پڑھا تھا اور صحیح روایت سے ثابت ہے کہ تین مرتبہ انھوں نے قرآن کریم حضرت عمرؓ پر پیش کیا تھا۔ (مفتاح السعادۃ جلد ۱ صـ۳۹۴) اور اسی کے قریب تہذیب التہذیب جلد ۳ صـ۲۸۴ میں ہے۔

(نمبر ۳ اور نمبر ۴ اگلے صفحہ پر دیکھیے)

کان النبی صلی اللہ علیہ وسلم اذا صلی قرأ فقرأ اصحابہ فنزلت فاستمعوا لہ الآیۃ فسکت القوم و قرأ النبی صلی اللہ علیہ وسلم۔ (کتاب القرأۃ ص۳۲)	کہ آں حضرت صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم جب نماز پڑھتے تو ساتھ ساتھ آپ کے حضرات صحابہؓ بھی قرأت کرتے تھے۔ جب واذا قری القرآن (الآیۃ) نازل ہوئی تو حضرات صحابہ کرامؓ نے خاموشی اختیار کرلی اور جناب رسول خدا صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم قرأۃ کیا کرتے تھے۔

امام بیہقیؒ علامہ حازمیؒ (المتوفی ۵۸۴ھ) اور مبارک پوری صاحبؒ وغیرہ نے اس روایت کے منقطع ہونے کا ناکام بہانہ کیا ہے اور یہی کچھ مؤلف خیر الکلام نے ص۵۵۳ میں کہا ہے لیکن یہ صحیح نہیں ہے۔ اولاً: اس لیے کہ مرسل حجت ہے اور مرسل معتضد بلا اختلاف حجت ہے جیسا کہ بیان ہو چکا ہے۔

وثانیاً: اگر اس کو ابو العالیہؒ کی تفسیر بھی تسلیم کرلیا جائے تب بھی کوئی حرج نہیں جس کی تائید کئی محقق مفسرین کرامؒ سے آگے آرہی ہے۔ خود مؤلف خیر الکلام ص۴۱ میں ایک جگہ لکھتے ہیں کہ مگر معترض کو معلوم ہونا چاہیے کہ کسی آیت کی تفسیر اگر کسی تابعی سے ثابت ہو اور ایک بڑے مفسر نے بھی اس کی تصدیق کی ہو اور کسی صحابی اور تابعی سے اس کی تردید وارد نہ ہوتی ہو تو اس کی صحت میں کیا کلام ہو سکتا ہے؟ اور اسی صفحہ کے آخر میں لکھتے ہیں کہ ایک تفسیر کے مقابلہ میں محض اٹکل پچو بات بنانا درست نہیں۔ لہٰذا ان کو اپنے تجویز کردہ نسخہ پر عمل کرنا چاہیے کہ ہینگ لگے نہ پھٹکڑی۔

حضرت امام زہریؒ:

امام بیہقیؒ فرماتے ہیں ہم سے حافظ ابو عبد اللہؒ نے بیان کیا۔ وہ کہتے ہیں ہم سے

---

۳ ان کا ترجمہ حضرت ابن مسعود رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی روایت کی ذیل میں نقل کر دیا گیا ہے۔

۵ مہاجر بن مخلد کو امام ابن معینؒ صالح کہتے ہیں۔ محدث ساجیؒ ان کو صدوق کہتے ہیں۔ اور نیز کہتے ہیں کہ وہ معروف و مشہور تھے۔ ابن حبانؒ ان کو ثقات میں لکھتے ہیں۔ (تہذیب التہذیب جلد ۱۰ ص۳۲۳) باقی رواۃ کا حال اور توثیق آپ پہلے پڑھ چکے ہیں۔

۱ امام زہریؒ اور امام عبد اللہ بن مبارکؒ کا ترجمہ مقدمہ میں عرض کیا جا چکا ہے اور بقیہ رواۃ کا عنقریب گزر چکا ہے۔ (باقی اگلے صفحہ پر دیکھیے)

حافظ ابو علیؒ نے بیان کیا۔ وہ کہتے ہیں ہم سے حسنؒ بن سفیانؒ نے بیان کیا وہ کہتے ہیں ہم سے حبانؒ بن موسیٰؒ نے بیان کیا۔ وہ کہتے ہیں ہم سے عبداللہؒ بن مبارکؒ نے بیان کیا۔ وہ کہتے ہیں ہم سے یونسؒ نے بیان کیا وہ امام زہریؒ سے روایت کرتے ہیں۔ انھوں نے فرمایا کہ

قال لا یقرأ من وراء الامام فیما یجھر بہ الامام یکفیھم قراءۃ الامام وان لم یسمعھم صوتہ ولکنھم یقرأون فیما لا یجھر بہ سراً فی انفسھم ولا یصلح لاحد خلفہ ان یقرأ معہ فیما جھر بہ سراً ولا علانیۃ قال اللہ واذا قرئ القرآن فاستمعوا لہ وانصتوا لعلکم ترحمون

امام کے پیچھے جہری نمازوں میں مقتدیوں کو قرآت کرنے کی مطلقاً گنجائش نہیں ہے۔ امام کا پڑھنا ہی مقتدیوں کو کافی ہے۔ چاہے وہ مقتدیوں کو کچھ بھی نہ سناتا ہو ان کو نہ تو جہر سے پڑھنا جائز ہے اور نہ آہستہ۔ ہاں سری نمازوں میں وہ اپنے دل میں قرآت کر سکتے ہیں اور جہری نمازوں میں اس لیے منع ہے کہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے کہ جب قرآن پڑھا جاتا ہو تو تم خاموش ہو کر اس کی طرف توجہ کرو تاکہ تم پر رحم کیا جائے۔

(کتاب القراءۃ ص۵)

سری اور جہری نمازوں کا بیان اپنی جگہ پر ہو گا۔ لیکن بہر حال امام زہریؒ بھی آیت مذکورہ کا شان نزول مسئلہ قرأۃ خلف الامام بتاتے ہیں۔ سکتات میں پڑھنے کا کسی صحیح حدیث سے ثبوت نہیں اور یہ استدلالی رنگ نہیں بلکہ شانِ نزول ذکر ہو رہا ہے۔ مرسل زہریؒ اگرچہ تنہا حجت نہیں ہوتا مگر اس سے دیگر مراسیل کی تائید مطلوب ہے اور دوسرے مراسیل کے ساتھ مل کر یہ مرسل مسئلہ زیر بحث پر صراحت سے روشنی ڈالتا ہے۔

(پچھلے صفحہ کا باقی) صرف تین راوی باقی ہیں۔ ان کی توثیق سن لیجئے ـــ حسنؒ بن سفیانؒ علامہ ذہبیؒ ان کو الحافظ، الامام اور شیخ خراسان لکھتے ہیں۔ امام حاکمؒ کا بیان ہے کہ وہ خراسان کے محدث اور اپنے تمام معاصرین پر تثبت، کثرت روایت نحو، فقہ، ادب اور دیگر علوم میں فائق تھے۔ (تذکرہ ۲ ص۲۴۵) ـــ حبانؒ بن موسیٰؒ، ابراہیمؒ بن الجنیدؒ ان کی آدباس بہ سے توثیق کرتے ہیں۔ ابن حبانؒ ثقات میں لکھتے ہیں۔ (تہذیب التہذیب جلد ۲ ص۱۷۵) حافظ ابن حجرؒ لکھتے ہیں کہ وہ ثقہ تھے۔ (تقریب ص۷۰) یونسؒ بن یزیدؒ علامہ ذہبیؒ ان کو الحافظ اور الثبت لکھتے ہیں۔ اور احمدؒ بن صالحؒ کا بیان ہے کہ ہم امام زہریؒ کے تلامذہ میں یونسؒ کو ترجیح نہیں دیتے۔ امام احمدؒ فرماتے تھے کہ وہ ثقہ ہیں۔

(تذکرہ جلد ۱ ص ۱۵۳)

عبید[1] بن عمیرؒ (المتوفی سنہ ۷۴ھ) اور عطاء[2]ؒ بن ابی رباحؒ (المتوفی سنہ ۱۱۴ھ):

امام ابن جریرؒ فرماتے ہیں ہم سے حمید[3]ؒ بن مسعدہؒ نے بیان کیا۔ وہ فرماتے ہیں ہم سے بشر[4]ؒ بن المفضلؒ نے بیان کیا وہ کہتے ہیں ہم سے جریری[5]ؒ نے بیان کیا۔ وہ طلحہ[6]ؒ بن عبیدؒ بن کریزؒ سے روایت کرتے ہیں۔ وہ کہتے ہیں میں نے عبیدؒ بن عمیرؒ اور عطاءؒ بن ابی رباحؒ کو آپس میں باتیں کرتے دیکھا۔ حالانکہ ایک واعظ وعظ کہہ رہا تھا۔ میں نے کہا۔ آپ ذکر کیوں نہیں سنتے اور کیوں وعید کے مستوجب ہو رہے ہیں؟ لیکن ان دونوں نے میری طرف نگاہ اٹھائی اور پھر گفتگو میں مشغول ہو گئے۔ میں نے پھر کہا۔ انھوں نے پھر میری طرف دیکھا اور باتوں میں مشغول ہو گئے میں نے سہ بارہ ان سے کہا۔ مگر ان دونوں نے کہا:

انما ذلك فی الصلوٰۃ یعنی واذا قرئ القرآن فاستمعوا له وانصتوا (الآیۃ) (تفسیر ابن جریر جلد ۹ و مثلہ ابن کثیر ج ۲ ص ۲۸۱)	یعنی جو آیت واذا قرئ القرآن فاستمعوا له وانصتوا تمہارے پیش نظر ہے۔ اس کا شان نزول نماز ہے نہ کہ وعظ و عام تلاوت۔

اس سے معلوم ہوا کہ امام کے پیچھے باتیں کرنا اور قرآت کرنا ممنوع ہے کیونکہ یہ استماع و انصات کے خلاف ہے اور اس آیت کریمہ کا شانِ نزول ہی نماز ہے۔ خارج از نماز باتوں کو یہ شامل نہیں ہے۔

---

[1] علامہ ذہبیؒ لکھتے ہیں کہ وہ عالم، واعظ اور کبیر القدر تھے (تذکرہ جلد ۱ ص ۴۵) امام ابن معینؒ اور ابو زرعہؒ کہتے ہیں کہ وہ ثقہ تھے۔ ابن حبانؒ ثقات میں لکھتے ہیں۔ عجلیؒ ان کو ثقہ من کبار التابعینؒ کہتے ہیں۔ حضرت ابن عمرؓ ان کی مجلس وعظ میں حاضر ہوتے اور ان کی تعریف کیا کرتے تھے۔ (تہذیب التہذیب جلد ۷ ص ۷۱)

[2] ذہبیؒ ان کو مفتی اہل مکہ اور محدث، القدوہ اور العلم لکھتے ہیں۔ (تذکرہ جلد ۱ ص ۹۲) ابن حبانؒ ان کو علم فقہ ورع اور فضیلت میں تابعینؒ کے سردار لکھتے ہیں۔ حافظ ابن حجرؒ ان کو ثبت، حجۃ، امام اور کبیر الشان لکھتے ہیں۔ (تہذیب التہذیب جلد ۷ ص ۲۰۳) حافظ ابن کثیرؒ لکھتے ہیں کہ وہ کبار اور ثقات و بلند پایہ تابعینؒ میں تھے۔ دو سو صحابہؓ سے ان کی ملاقات ہوئی ہے۔ نیز ابن سعدؒ سے نقل کرتے ہیں کہ وہ ثقہ، فقیہ، عالم اور کثیر الحدیث تھے۔ (البدایہ والنہایہ جلد ۹ ص ۳۰۶)

[3] ابو حاتمؒ ان کو صدوق اور نسائیؒ ثقہ کہتے ہیں اور ابن حبانؒ ثقات میں لکھتے ہیں۔ (تہذیب التہذیب جلد ۳ ص ۳۹)

[4] امام ذہبیؒ ان کو الامام، الثقہ، الحافظ اور العابد کہتے ہیں امام احمدؒ فرماتے ہیں کہ بصرہ میں تثبت ان پر ختم تھا۔ (تذکرہ جلد ۱ ص ۲۸۳)

(باقی نمبر ۵ و ۶ اگلے صفحہ پر دیکھئے)

حضرت محمد[1] بن کعب القرظیؒ (المتوفی ۱۸۸ھ):

امام بیہقیؒ فرماتے ہیں ہم سے ابو النصر[2] عمرؒ بن عبد العزیز بن عمرؒ بن قتادہؒ نے بیان کیا۔ وہ کہتے ہیں ہم سے ابو منصور[3] عباس بن فضل نضرویؒ نے بیان کیا۔ وہ فرماتے ہیں ہم سے احمد[4] بن نجدہؒ نے بیان کیا۔ وہ کہتے ہیں ہم سے سعید[5] بن منصورؒ نے بیان کیا۔ وہ کہتے ہیں کہ ہم سے ابو معشر[6]ؒ نے بیان کیا۔ وہ محمدؒ بن کعب (القرظیؒ) سے روایت کرتے ہیں۔ انھوں نے فرمایا کہ حضرات صحابہ کرامؓ آں حضرت صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کے پیچھے قرأت کرتے تھے۔ جب آپ قرأت کرتے تھے تو وہ بھی ساتھ قرأت

(نمبر ۵ و ۶ پچھلے صفحہ کے حاشیے) [8] علامہ ذہبیؒ ان کو الحافظ الحجۃ لکھتے ہیں۔ (تذکرہ جلد ۱ صـ۱۳۶)

[9] امام احمدؒ اور نسائیؒ ان کو ثقہ کہتے ہیں اور ابن حبانؒ ان کو ثقات میں لکھتے ہیں (تہذیب التہذیب جلد ۵ صـ۲۲)

[10] ابن حبانؒ کہتے ہیں کہ وہ علم و فقہ میں مدینہ کے فاضل ترین علمائے میں تھے (تہذیب التہذیب جلد ۹ صـ۴۲۱) امام نوویؒ لکھتے ہیں۔ وہ بڑے اور ائمہ تابعین میں تھے (تہذیب الاسماء جلد اقسم اوّل صـ۹۰) حافظ عجلیؒ ان کو ثقہ، رجل صالح اور عالم قرآن کہتے ہیں۔ ابن سعدؒ ان کو ثقہ، عالم اور کثیر الحدیث کہتے ہیں۔ عونؒ بن عبد اللہؒ کا بیان ہے کہ میں نے تفسیر قرآن کا ان سے بڑا عالم نہیں دیکھا۔ (البدایۃ والنہایۃ جلد ۹ صـ۲۳۰ و تہذیب التہذیب، جلد ۹ صـ۴۲۱)۔ علامہ ذہبیؒ ان کو مفسر قرآن لکھتے ہیں۔ (دول الاسلام جلد ۱ صـ۵۶) حافظ ابن کثیرؒ ان کو عالم تفسیر قرآن، صالح اور عابد لکھتے ہیں۔ (البدایہ والنہایہ جلد ۹ صـ۲۵۷) جناب رسول خدا صلی اللہ تعالیٰ علیہ وآلہ وسلم نے ایک پیش گوئی فرمائی تھی کہ بنو قریظہ میں ایک شخص پیدا ہوگا جو فن تفسیر میں اپنا نظیر نہ رکھتا ہوگا۔ ائمہ کا خیال ہے کہ یہ محمدؒ بن کعب قرظیؒ کے حق میں تھی۔ (البدایہ جلد ۹ صـ۲۳۰)۔ مولانا مبارک پوری صاحبؒ لکھتے ہیں: مدینہ طیبہ میں محمدؒ بن کعبؒ کے بعد زیدؒ بن اسلمؒ جیسا مفسر قرآن کوئی اور نہ تھا۔ (تحفۃ الاحوذی جلد ۱ صـ۲۱۷)

[11] امام بیہقیؒ کے شیخ ہیں۔ ان کی سند سے ایک حدیث کی امام بیہقیؒ تصحیح کرتے ہیں (دیکھیے سنن الکبریٰ جلد ۱ صـ۱۶۹)

[12] ثقہ اور مشہور تھے (تقریب صـ۱۹۱) [13] امام دارقطنیؒ ان کی توثیق کرتے ہیں اور ان پر کسی کی جرح منقول نہیں ہے (تہذیب التہذیب جلد ۱ صـ۵۸) [14] ابو حاتم ان کو ثقہ من المثبتین الاثبات کہتے ہیں۔ ابن نمیرؒ اور ابن خراشؒ ان کو ثقہ کہتے ہیں۔ ابن قانعؒ ان کو ثقہ اور ثبت کہتے ہیں۔ خلیلیؒ کہتے ہیں ان کے ثقہ ہونے پر سب کا اتفاق ہے (تہذیب التہذیب جلد ۴ صـ۹۰-۸۹) [15] ابو معشرؒ کو بعض محدثینؒ روایت حدیث

(بقیہ اگلے صفحہ پر دیکھیے)

کرتے جاتے۔ اس پر سورۂ اعراف کی یہ آیت نازل ہوئی:

واذا قرئ القرآن فاستمعوا له وانصتوا (الآیۃ) (کتاب القراۃ ص٧٤)

کہ جب قرآن کریم کی قرأت کی جاتی ہو تو تم توجہ کرو اور خاموش رہو۔

حدیث مرسل:

مرسل حدیث سے احتجاج اور عدم احتجاج کی بحث اسی کتاب میں آگے اپنے مقام پر آ رہی ہے (ان شاء اللہ تعالیٰ) یہاں بقدر ضرورت تھوڑی سی بحث مناسب معلوم ہوتی ہے تاکہ بات ذرا واضح ہو جائے اور یہ حوالے آگے ذکر نہ کیے جائیں گے تاکہ تکرار لازم نہ آئے۔ امام سیوطیؒ علامہ قاسمؒ بن قطلوبغاؒ محدث جزائریؒ اور مولانا عثمانیؒ نقل کرتے ہیں:

کمزور سمجھتے تھے۔ مگر امام احمدؒ ان کو صالح محلہ الصدق کہتے تھے۔ ابن معینؒ کہتے ہیں۔ ان سے حدیثیں لکھی جا سکتی ہیں۔ ابو زرعہؒ ان کو صدوق فی الحدیث کہتے ہیں۔ ابن عدیؒ کہتے ہیں ان سے بڑے بڑے ثقات نے روایات کی ہیں۔ (میزان الاعتدال جلد۳ ص۲۲۹ و تہذیب التہذیب جلد۱۰ ص۴۲۰) امام نعیمؒ ان کو کیس اور حافظ کہتے ہیں (تہذیب ص۴۲۰) علامہ ذہبیؒ ان کو علم کا ظرف لکھتے ہیں اور فرماتے ہیں کہ امام نسائیؒ نے ان سے احتجاج کیا ہے (تذکرہ جلد۱ ص۲۱۶) حافظ ابن حجرؒ ان کو ابوداؤد، نسائی، ترمذی اور ابن ماجہ کا راوی بتاتے ہیں (تہذیب جلد۱۰ ص۴۱۹) ان کے متعلق یہ اختلاف صرف روایت حدیث کے بارے میں ہے فن تفسیر میں وہ بلا اختلاف اور بلا مدافعت مسلم امام تھے۔ چنانچہ امام احمدؒ بن حنبل، محمدؒ بن عثمان بن ابی شیبہؒ، امام علیؒ بن المدینیؒ اور عمروؒ بن علی الفلاسؒ وغیرہ ائمہ کہتے ہیں کہ ابو معشرؒ کی وہ روایات جو تفسیر کے سلسلہ میں ہیں اور خاص طور پر وہ جو محمدؒ بن قیسؒ اور محمدؒ بن کعبؒ سے نقل کرتے ہیں۔ وہ بلا چون و چرا صحیح، معتبر اور قابل حجت ہیں۔ (تہذیب التہذیب جلد۱۰ ص۴۲۰ و ص۴۲۱ ملخصہ) مبارکپوری صاحبؒ نے ان کی جو تضعیف نقل کی ہے وہ ان کے لیے چنداں مفید نہیں۔ کیونکہ محدثین جب ان کو کمزور کہتے ہیں تو صرف روایت حدیث کے بارے میں اور ہم نے جو روایت نقل کی ہے وہ تفسیر کے بارے میں ہے اور خاص طور پر محمدؒ بن کعب قرظیؒ سے ہے اور ان کی روایت کو اس باب میں بلا قیل و قال محدثین تسلیم کرتے ہیں۔ مؤلف خیر الکلام نے اپنی عادت کے مطابق محدثین کی جرح تو نقل کر دی ہے۔ (ملاحظہ ہو ص ۲۵۹) مگر تفسیر کے بارے میں ان کی روایت کے قابل اعتبار ہونے کا کوئی معقول جواب نہیں دے سکے اور لکھتے ہیں کہ جس حدیث کو محدثینؒ کی شرائط کے مطابق محمدؒ بن کعبؒ سے بیان کریں آن سے چند

وقال ابن جرير اجمع التابعون باسرهم على قبول المرسل ولم يأت عنهم انكاره ولا عن احد من الائمة بعدهم الى رأس المأتين قال ابن عبد البرؒ كانه يعني الشافعيؒ اول من رده اھ (رسالہ ابی داؤد صنا۔ منیۃ الالمعی صث۔ توجیہ النظر ص۲۴۵ ومقدمہ فتح الملہم ص۳۲)

امام ابن جریرؒ نے فرمایا کہ تابعینؒ سب کے سب اس امر پر متفق تھے کہ مرسل قابل احتجاج ہے تابعین سے لے کر دوسری صدی کے آخر تک ائمہ میں سے کسی نے مرسل کے قبول کرنے کا انکار نہیں کیا۔ امام ابن عبدالبرؒ فرماتے ہیں کہ گویا امام شافعیؒ ہی پہلے وہ بزرگ ہیں جنھوں نے مرسل کے ساتھ احتجاج کا انکار کیا ہے۔

اس سے صاف طور پر یہ بات واضح ہو گئی کہ دوسری صدی کے آخر تک تابعینؒ اور ائمہ دینؒ میں سے کوئی بھی مرسل حدیث سے احتجاج کا منکر نہ تھا۔ تعجب ہے کہ فریق ثانی کے نزدیک یہ اجماع تو حجت نہیں لیکن دوسری صدی کے بعد کا نظریہ قابل قبول ہے اور مؤلف خیر الکلام لکھتے ہیں کہ اور امت کی اکثریت کا لحاظ قرن اول میں لیا جائے گا...... الخ ص۱۵۳)

الحمد للہ تعالیٰ کہ قرن اول والے مرسل کو بلا قیل وقال تسلیم کرتے تھے۔ اور اس پر ان کا اجماع ہے۔

نواب صدیق حسن خاں صاحبؒ اور علامہ جزائریؒ لکھتے ہیں:

حدیثیں صالح پائی گئی ہیں.... الخ مگر ان کو معلوم ہونا چاہیے کہ محدثین کرام تو بھی ان کی محمد بن کعبؒ سے روایتوں کو صالح کہتے ہیں اور یہ بھی انھیں میں سے ہے اور بالکل صالح ہے اور امام کے پیچھے قرأت ترک کرنے کے سلسلے میں ہے قرأت ہو یا کلام ہو جہر ہو یا آہستہ اور اس کا شان نزول ہی یہ بتاتے ہیں۔ قاضی مقبول احمد صاحب کو بلا وجہ غصہ آ گیا ہے کہ اس کو امام بخاریؒ منکر الحدیث کہتے ہیں اور مصنف احسن الکلام خود لکھتا ہے کہ جس کو امام بخاریؒ منکر الحدیث کہیں اس سے روایت نہیں لی جا سکتی۔ (محصلہ الاعتصام، ۲۸ ستمبر ۱۹۶۲ء) لیکن محدثینؒ نے ان کی تفسیر کی روایت کو اور اسی طرح تاریخی روایت کو حجت مانا ہے۔ تفسیر کے بارے میں تو حوالہ گزر چکا ہے تاریخ کے متعلق سنیے۔ امام خلیلیؒ فرماتے ہیں:

وتاريخه احتج به الائمة وضعفوه في الحديث اھ (تہذیب التہذیب جلد ۱۰ ص۴۲)

اور ان سے تاریخ میں ائمہ نے احتجاج کیا ہے اور حدیث میں اس کو اس کو ضعیف سمجھا ہے جیسا کہ محمد بن اسحاقؒ کہ حدیث احکام میں ضعیف ہے مگر مغازی کا امام ہے۔ اس کے احادیث احکام میں ضعیف ہونے سے اس کے تاریخ میں معتبر ہونے پر کیا زد پڑتی ہے؟ فکذا ھذا۔

واما المراسيل فقد كان يحتج بها العلماء فيما مضى مثل سفيان الثوری و مالك والاوزاعی حتی جاء الشافعی فتکلم فيه اھ

مراسیل کے ساتھ گذشتہ زمانہ میں علماء احتجاج کیا کرتے تھے۔ مثلاً امام سفیان ثوریؒ، امام مالکؒ اور امام اوزاعیؒ جب امام شافعیؒ آئے تو انھوں نے مرسل کی حجیت میں کلام کیا۔

(الحطة فی ذکر الصحاح الستة ص۲۴۵ وتوجیه النظر)

امام ابوداؤدؒ فرماتے ہیں کہ

فاذا لم یکن مسند ضد المرسل ولم یوجد مسند فالمرسل یحتج به ولیس هو مثل المتصل فی القوة۔

جب مرسل کے خلاف کوئی مسند حدیث موجود نہ ہو اور مسند اس باب میں نہ پائی جائے تو مرسل حجت ہوگی مگر متصل کی طرح قوی نہ ہوگی۔

(رسالہ ابوداؤد، ص۵)

شیخ الاسلام ابن تیمیہؒ مراسیل سے احتجاج اور عدم احتجاج کے بارے میں بحث کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ

واما المراسیل قد تنازع الناس فی قبولها وردها واصح الاقوال ان منها المقبول والمردود ومنها الموقوف فمن علم من حاله انه لا یرسل الا عن ثقة قبل مرسله ومن عرف انه یرسل عن الثقة وغیر الثقة کان ارساله روایة عن من لا یعرف حاله فهذا موقوف وما کان من المراسیل مخالفاً لما رواه الثقات کان مردوداً واذا کان المرسل من وجهین کل من الراویین اخذ العلم عن شیوخ اخر فهذا یدل علی صدقه

بہرحال مراسیل کے قبول اور رد کرنے میں لوگوں نے اختلاف کیا ہے اور صحیح تر قول یہ ہے کہ مراسیل میں مقبول و مردود اور موقوف سبھی اقسام ہیں سو جس کے حال سے یہ معلوم ہوا کہ وہ ثقہ ہی سے ارسال کرتا ہے تو اس کا مرسل قبول کیا جائے گا اور جو ثقہ اور غیر ثقہ سب سے ارسال کرتا ہے اور جس سے اس نے حدیث مرسل روایت کی ہے۔ اس کا علم نہیں تو ایسی مرسل حدیث موقوف ہوگی اور جو مراسیل ثقات کی روایت کے خلاف ہوں تو وہ مردود ہوں گے اور جب مرسل دو طریقوں سے مروی ہو ایک مرسل الگ شیوخ سے اور دوسرا الگ سے

فان مثل ذلك لا يتصور في العادة تماثل الخطأ فيه وتعمد الكذب اھ (منہاج السنۃ جلد ۲ ص ۱۱۷)

تو یہ اس کے صدق پر دلالت کرتا ہے کیونکہ عادتاً اس میں خطا اور جان بوجھ کر جھوٹ بولنے کا تصور نہیں کیا جا سکتا۔

امام نوویؒ پہلے ان حضرات کا ذکر کرتے ہیں جو مرسل کو قابل استدلال نہیں گردانتے۔ آگے ارشاد فرماتے ہیں کہ

ومذهب مالك وابي حنيفة واحمد واكثر الفقهاء انه يحتج به ومذهب الشافعي انه اذا انضم الى المرسل ما يعضده احتج به وذلك بان يروى مسنداً او مرسلاً من جهة اخرى او يعمل به بعض الصحابة او اكثر العلماء اھ (مقدمہ نووی برشرح مسلم ص ۱۷)

امام مالکؒ، امام ابوحنیفہؒ، امام احمدؒ اور اکثر فقہاء کا مذہب یہ ہے کہ مرسل قابل احتجاج ہے اور امام شافعیؒ کا مذہب یہ ہے کہ اگر مرسل کے ساتھ کوئی تقویت کی چیز مل جائے تو وہ حجت ہوگا مثلاً یہ کہ وہ مسنداً بھی مروی ہو یا دوسرے طریق سے وہ مرسل روایت کیا گیا ہو یا بعض حضرات صحابہ کرامؓ یا اکثر علماء نے اس پر عمل کیا ہو

حضرت امام شافعیؒ نے یہ بحث اپنی کتاب الرسالۃ فی اصول الفقہ ص ۶۲ طبع بولاق میں کی ہے اس سے معلوم ہوا کہ مرسل معتضد کے حجت ہونے کے امام موصوفؒ بھی قائل ہیں اور اس کی ان کے نزدیک چند شرطیں ہیں جن کا اختصار کے ساتھ امام نوویؒ نے تذکرہ فرمایا ہے ایک شرط یہ ہے کہ

وزاد في الاعتضاد ان يوافق قول صحابي او يفتي اكثر العلماء بمقتضاه ... الخ (تدریب الراوی ص ۶۲)

امام شافعیؒ نے اعتضاد کے لیے یہ شرط زائد بیان کی ہے کہ وہ کسی صحابی کے قول کے موافق ہو یا اکثر علماء نے اس کے مقتضیٰ پر فتویٰ دیا ہو۔

امام ابن الجوزیؒ اپنی کتاب التحقیق میں اور محدث خطیب بغدادیؒ اپنی تالیف الجامع فی اداب الراوی والسامع میں امام احمدؒ بن حنبلؒ سے نقل کرتے ہیں۔

ربما كان المرسل اقوى من المسند۔ (شرح نقایہ جلد ۱ ص ۳۲ طبع ہند)

بسا اوقات حدیث مرسل مسند سے قوی تر ہوتی ہے۔

اور عہد حاضر کے محقق علامہ زاہد الکوثریؒ (المتوفی ۱۳۷۱ھ) لکھتے ہیں کہ

والاحتجاج بالمرسل کان سنة متوارثة جرت علیه الامة فی القرون الفاضلة حتی قال ابن جریر رد المرسل مطلقاً بدعة حدثت فی رأس المأتین اھ کما ذکره الباجیؒ فی اصوله وابن عبد البرؒ فی التمهید وابن رجبؒ فی شرح علل الترمذی اھ

مرسل کے ساتھ احتجاج کرنا ایک ایسا متوارث طریق تھا جس پر قرون فاضلہ میں امت عمل پیرا رہی ہے امام ابن جریرؒ نے تو یہاں تک کہا ہے کہ مطلقاً مرسل کو رد کر دینا بدعت ہے جو دوسری صدی کے آخر میں ایجاد ہوئی جیسا کہ علامہ باجیؒ نے اپنے اصول میں اور ابن عبد البرؒ نے تمہید میں اور ابن رجبؒ نے شرح علل ترمذی میں ذکر کیا ہے۔

(تانیب الخطیب ص۱۵۲ طبع مصر)

تقلید شخصی تو بقول فریق ثانی چوتھی صدی کے بعد کی بدعت ہے مگر مطلقاً مرسل کو رد کرنا دوسری صدی کے بعد کی بدعت نکلی ان تمام اقتباسات سے یہ بات بالکل مبرہن ہو چکی ہے کہ مرسل حدیث کے حجت ہونے نہ ہونے کا جھگڑا تو دوسری صدی کے بعد سے تاہنوز چلا آرہا ہے مگر دوسری صدی تک ساری امت مرسل کو حجت سمجھتی تھی۔ لہٰذا محض مرسل مرسل کہہ کر ہستی گلو خلاصی چاہنا جیسا کہ فریق ثانی کر رہا ہے آسان نہیں ہے حق بات یہ ہے کہ مرسل جبکہ اس کی سند صحیح ہو اور کسی مرفوع متصل روایت کے خلاف بھی نہ ہو تو وہ بالکل حجت ہے۔

بعض حضرات تابعینؒ اور تبع تابعینؒ کے مراسیل:

علمی اور تحقیقی طور پر بعض حضرات تابعینؒ اور اتباع تابعینؒ ایسے بھی ہیں جن کے مراسیل کو امت مسلمہ نے بخوشی قبول کیا ہے حتی کہ خود حضرت امام شافعیؒ نے بھی ان کو تسلیم کیا ہے اور وہی اس کے رد کرنے میں پیش پیش ہیں۔ چنانچہ امام شافعیؒ کا مشہور قول یہ بتایا گیا ہے کہ وہ حضرت سعیدؒ بن المسیبؒ کے مرسل کو حجت مانتے ہیں۔ (تدریب الراوی ص ۱۲۰)

اور امام ابن معینؒ فرماتے ہیں کہ سعید بن المسیبؒ کے مراسیل اصح ترین ہیں۔

(تدریب ص ۱۲۳)

امام احمدؒ بن حنبلؒ فرماتے ہیں کہ سعیدؒ المسیبؒ کے مراسیل صحیح تر ہیں اور ابراہیم نخعیؒ کے مراسیل لا بأس بہا ہیں۔ (ایضاً ص ۱۲۳ و ص ۱۲۴)

اور امام ابن معینؒ نے فرمایا کہ مراسیل ابراہیم نخعیؒ مجھے شعبیؒ کے مراسیل سے زیادہ محبوب ہیں۔ (ایضاً صہ ۱۲۴) اور امام المحدثین علیؒ بن المدینیؒ فرماتے ہیں کہ حسن بصریؒ کے مراسیل جن کو ان سے ثقہ راوی نقل کریں بالکل صحیح ہوتے ہیں۔ (ایضاً) اور علیؒ بن المدینیؒ فرماتے ہیں کہ مجھے مجاہدؒ کے مراسیل، عطاؒ کے مراسیل سے کئی درجہ زیادہ پسند ہیں (ایضاً صہ ۱۲۳) اس میں کوئی شک نہیں کہ بعض مراسیل ایک دوسرے کی نسبت سے صحیح تر ہوتے ہیں مگر بعض ایسے بھی ہیں جو فی نفسہٖ صحیح بلکہ اصح ہیں۔ لہٰذا مؤلف خیر الکلام کا یہ بہانہ کہ ترجیح سے اعتضاد سمجھ لیا حالانکہ ضعیف پر ضعیف کو بھی ترجیح ہوتی ہے۔ الی ان قال یاد رکھنا چاہیے کہ مرسل کو مرسل سے اس وقت قوت ہوتی ہے جب دونوں کبار تابعینؒ سے ہوں..... الخ (صہ ۳۵۳) محض اپنے قلب کی تسکین کا سامان ہے اور ناخواندہ حواریوں کو طفل تسلی دینا ہے اور بس کیونکہ ان مراسیل میں مطلقاً بعض مراسیل فی نفسہا صحیح ہیں اور اعتضاد کے لیے کبار تابعینؒ کی کوئی قید نہیں ہے۔ یہ محض مؤلف مذکور کی اختراع ہے کیونکہ حضرات ائمہ ثلاثہؒ اور دوسری صدی تک کی ساری امت تو ویسے ہی مرسل کو حجت مانتی ہے اور امام شافعیؒ مرسل معتضد کو (جو بعض حضرات صحابہ کرامؓ یا اکثر علماء کے عمل کے موافق ہو) حجت سمجھتے ہیں اور امام کے پیچھے قرأت کا ترک کرنا خصوصاً جہری نمازوں میں نہ صرف یہ کہ بعض حضرات صحابہ کرامؓ کے عمل سے مؤید ہے بلکہ جمہور صحابہ کرامؓ کا یہی معمول تھا اور بقول حافظ ابن تیمیہؒ جہری نمازوں میں ترک قرأت پر اجماع امت ہے لہٰذا ہر حیثیت سے یہ مراسیل حجت ہیں لا شك فیہا۔

فائدہ۔ اگرچہ بعض محدثینؒ نے مرسل اور منقطع میں اصطلاحی طور پر کچھ فرق کیا ہے لیکن علامہ جزائریؒ لکھتے ہیں:

وقد اطلق المرسل علی المنقطع من ائمۃ الحدیث ابو زرعۃ وابو حاتم والدارقطنی۔ اھ (توجیہ صہ ۲۴۳)	حدیث منقطع پر مرسل کا اطلاق ان ائمہ حدیث نے کیا ہے امام ابو زرعہؒ، امام ابو حاتمؒ اور امام دارقطنیؒ

مؤلف خیر الکلام نے حضرت مجاہدؒ کے اثر کے بارے میں امام بیہقیؒ کی کتاب القرأۃ صہ ۷۲ کے حوالہ سے جو یہ لکھا ہے کہ یہ منقطع ہے اور منقطع ضعیف کی قسم ہوتی ہے (محصلہ صہ ۳۵۲) محض طفل تسلی ہے کیونکہ مرسل فی نفسہٖ صحیح قول کی بنا پر حجت ہے اور حکم منقطع و مرسل ایک

وغیر الامام (کتاب القرأۃ ص۹۸ جزء القرأۃ ص۱۳) امام کے پیچھے ہو یا اکیلا۔

جواب:۔ اس کی سند میں زیادؒ بن ابی زیاد جصاصؒ ہے امام ابن معینؒ اور ابن مدینیؒ اس کو لیس بشیئ کہتے ہیں نسائیؒ اور دارقطنیؒ اس کو متروک کہتے ہیں ابو زرعہؒ اس کو واہی کہتے ہیں علامہ ذہبیؒ فرماتے ہیں کہ اس کے ضعیف ہونے پر سب کا اجماع اور اتفاق ہے (میزان جلد ا ص۳۵۶ و تہذیب جلد ۳ ص۳۶۸) مؤلف خیر الکلام نے بھی علامہ ذہبیؒ کا حوالہ نقل کیا ہے (ص۴۲) یہ روایت بھی نہایت کمزور اور ضعیف ہے اور ان کی ایک روایت یوں ہے لا تجوز صلٰوۃ الا بفاتحۃ الکتاب وآیتین فصاعدًا (کتاب القرأۃ ص۱۶) کہ نماز سورۂ فاتحہ اور دو آیتوں اور اس سے کچھ زیادہ کے بغیر صحیح نہیں ہوتی۔ لیکن اس میں ایک تو خلف الامام کا کوئی ذکر نہیں ہے اور دوسرے اس میں وآیتین فصاعدًا کی زیادت موجود ہے۔

لطیفہ:۔ حضرت عمرانؓ بن حصینؓ سے مرفوعًا ایک روایت مروی ہے کہ ظہر کی نماز میں ایک شخص نے آنحضرت صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کے پیچھے قرأت کی نماز سے فارغ ہونے کے بعد آپ نے فرمایا کس نے میرے ساتھ منازعت اور ہاتھا پائی کی ہے؟ غرضیکہ آپ نے امام کے پیچھے قرأۃ کرنے سے منع کر دیا (دارقطنی جلد ا ص۱۲۴) اس روایت پر فریق ثانی کی طرف سے جن میں امام دارقطنیؒ بھی ہیں یہ اعتراض ہوا ہے کہ سند میں حجاجؒ بن ارطاۃؒ ہے اور وہ ضعیف ہے ہم نے حجاجؒ بن ارطاۃؒ سے کوئی روایت نہیں لی۔ لیکن فریق ثانی کی ستم ظریفی ملاحظہ کیجئے کہ حجاجؒ بن ارطاۃؒ، ابو داؤدؒ، ترمذیؒ، نسائیؒ اور مسلمؒ وغیرہ کے رواۃ میں ہیں (ازالۃ ستر ص۱۴۱) علامہ ذہبیؒ ان کو احد الاعلام اور علم کا ظرف لکھتے ہیں (تذکرہ جلد ا ص۱۷۵) ابو زرعہؒ اور ثوریؒ ان کی توثیق کرتے ہیں (تہذیب جلد ۲ ص۱۹۶) امام نوویؒ لکھتے ہیں کان بارعًا فی الحفظ والعلم کہ حفظ اور علم میں وہ بلند پایہ رکھتے تھے۔ (تہذیب الاسماء جلد ا ص۱۵۳) امام ترمذیؒ ان کی ایک حدیث کو حسن کہتے ہوئے تحسین کرتے ہیں (جلد ا ص۱۴۱) بلکہ ایک حدیث کو حسن صحیح کہتے ہیں (جلد ا ص۱۱۳) افسوس ہے کہ ان کی روایت تو فریق ثانی کے نزدیک حجت نہیں ہے لیکن زیادؒ کی روایت حجت ہے جو لیس بشیئ ہے اور اس کی تضعیف پر اجماع ہے ان کی ایک روایت یوں ہے کہ ظہر کی نماز میں ایک شخص نے سبح اسم ربک الاعلیٰ کی سورت آپ کے پیچھے پڑھی تھی (مسلم جلد ا ص۱۷۲، نسائی جلد ا ص۱۰۶، ابو داؤد جلد ا ص۱۲۷) چونکہ لغت

توضیحی ہے اس لیے قراٗکو جہر کے معنی میں نہیں لیا جاسکتا اور پڑھنے والا بھی صرف ایک شخص تھا اور لطف کی بات یہ ہے کہ اس نے قراۃ ظہر کی نماز میں کی تھی جو سرّی ہے مگر آنحضرت صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے اس کو بھی گوارہ نہیں کیا اور پوری تحقیق گذر چکی ہے کہ اعتبار عموم الفاظ کا ہوتا ہے خصوص سبب کا کوئی اعتبار نہیں ہوتا اور منازعت و مخالجت میں قرأت سورۃ فاتحہ اور دوسری تمام سورتیں یکساں ہیں کیونکہ علت ایک ہے اور مدار علی الفاتحۃ کو منازعت کے لیے متعین کر دینا اور سورۂ فاتحہ کو اس سے خارج تصور کرنا دعویٰ بلا دلیل ہے جو بہر حال مردود ہے۔

حضرت ہشامؓ بن عامرؓ کا اثر: حمیدؒ بن ہلالؒ سے مروی ہے وہ کہتے ہیں۔

ان هشامؓ بن عامرؓ قرأ فقيل له اتقرأ خلف الامام قال انا لنفعل ذلك	کہ ہشامؓ بن عامرؓ نے قرأت کی اُن سے پوچھا گیا کہ آپ امام کے پیچھے قرأت کرتے ہیں؟ فرمایا ہاں ہم
(السنن الکبریٰ جلد ۲ صفحہ ۱۷۰)	یوں ہی کرتے ہیں۔

جواب: یہ اثر بھی قابل التفات نہیں ہے اوّلاً اس لیے کہ اس کی سند میں البحر بن بہاریؒ ہے اور عرض کیا جا چکا ہے کہ وہ کذاب تھا ثانیاً اس بات میں اختلاف ہے کہ حمیدؒ بن ہلالؒ کی ہشامؓ بن عامرؓ سے ملاقات ثابت ہے یا نہیں؟ امام ابوحاتمؒ کہتے ہیں ملاقات ثابت نہیں ہے اور ان کی روایت مرسل ہے (دیکھئے تہذیب التہذیب جلد ۳ صفحہ ۵۲ و جلد ۱۱ صفحہ ۴۱) وثالثاً اس اثر میں سورۃ فاتحہ کا ذکر نہیں بلکہ مطلق قرأت کا ذکر ہے فریق ثانی کا دعویٰ صرف سورۃ فاتحہ کی قرأت کا ہے نہ کہ مطلق قرأت کا۔

حضرت معاذؓ بن جبل کا اثر: ایک سائل نے حضرت معاذؓ سے قراۃ خلف الامام کے متعلق سوال کیا۔

قال اذا قرأ فاقرأ بفاتحة الكتاب وقل هو الله احد واذا لم تسمع فاقرأ في نفسك ولا تؤذ من عن يمينك ولا من عن شمالك (السنن الکبریٰ جلد ۲ صفحہ ۱۶۹)	انہوں نے فرمایا کہ جب امام قرأت کرے تو تم بھی سورۃ فاتحہ اور قل ھو اللہ احد پڑھا کرو اور جب اس کی قراۃ نہ سنو تو دل میں پڑھا کرو دائیں اور بائیں پہلو والوں کو اذیت نہ دیا کرو۔

جواب: یہ اثر بھی قابل استدلال نہیں ہو سکتا اوّلاً اس لئے کہ اس کی سند میں احمدؒ بن محمودؒ

واقع ہے حافظ ابن حجرؒ ایک سند کے متعلق جس میں احمد بن محمودؒ واقع ہے لکھتے ہیں کہ سند باطل ہے اور اس سند کے راوی ضعیف ہیں دارقطنیؒ کہتے ہیں کہ مجہول ہیں (لسان المیزان جلد ۶ ص ۳۱۴) وثانیاً اس کی سند میں ابو شیبہ مہریؒ ہے علامہ ذہبیؒ اور حافظ ابن حجرؒ بلج مہریؒ کے ترجمہ میں لکھتے ہیں لا یدری من ذا ولا من شیخہ بلج مہریؒ اور اس کا استاد ابو شیبہ مہریؒ پتہ نہیں یہ دونوں کون تھے؟ امام بخاریؒ فرماتے ہیں اس کی سند مجہول ہے (میزان جلد ۱ ص ۱۶۴ ولسان جلد ۲ ص ۱۲) وثالثاً اس سند میں علیؒ بن یونسؒ واقع ہے اگر یہ علی بن یونس لخمیؒ ہے تب بھی کمزور ہے (میزان جلد ۲ ص ۲۴۱ ولسان ص ۲۶۸) اور اگر علیؒ بن یونس مدینیؒ ہے تب بھی ضعیف ہے (ایضاً وایضاً ص ۲۶۹) اگر کوئی اور ہے تو اس کی توثیق درکار ہے ورابعاً اس اثر سے بظاہر یہ معلوم ہوتا ہے کہ حضرت معاذؓ نے صرف سرّی نمازوں میں اجازت دی ہے وخامساً اس میں سورۃ فاتحہ کے علاوہ قل ھو اللہ احد کی قرأت کا بھی ذکر ہے اور فریق ثانی اس کا قائل نہیں ہے۔

حضرت عبد اللہؓ بن عمرؓ کا اثر :- حضرت سالمؒ سے مروی ہے وہ فرماتے ہیں ان ابن عمرؓ کان ینصت للامام فیما جھر فیہ ولا یقرأ معہ (کتاب القرأۃ ص ۱۰۱ وتحقیق الکلام جلد ۲ ص ۱۶۱) کہ حضرت ابن عمرؓ جہری نمازوں میں امام کے پیچھے خاموش رہا کرتے تھے اور قرأت نہیں کرتے تھے، فریق ثانی کا کہنا ہے کہ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ سرّی نمازوں میں وہ امام کے پیچھے قرأۃ کیا کرتے تھے۔

جواب :- یہ اثر بھی فریق ثانی کو مفید نہیں اولاً اس لیے کہ اس کی سند میں ابن جریجؒ ہیں، امام دارقطنیؒ علامہ ذہبیؒ اور مبارکپوری صاحبؒ وغیرہ لکھتے ہیں کہ وہ مدلس تھے (تہذیب جلد ۶ ص ۴۰۵، میزان جلد ۲ ص ۱۵۱، ابکار ص ۲۳۷) اور یہاں وہ عنعنہ سے روایت کرتے ہیں اور عنعنہ مدلس کا مقبول نہیں وثانیاً اس میں زہریؒ ہیں اور مبارکپوری صاحبؒ ان کی مدلس روایت کو بھی صحیح تسلیم نہیں کرتے اور یہاں بھی وہ عنعنہ سے روایت کرتے ہیں وثالثاً یہ اثر عبارۃ النص کے طور پر ہماری دلیل ہے کہ حضرت ابن عمرؓ جہری نمازوں میں قرأت کے قائل نہ تھے رہا سرّی نمازوں میں اس سے قرأت کا اثبات کرنا تو مفہوم مخالف پر مبنی ہے اور ہمارے نزدیک مفہوم مخالف حجت نہیں ہے (تعلیق الممجد ص ۹۳ واعلاء السنن جلد ۴ ص ۷۷) ورابعاً اگر مفہوم مخالف کو بعض فقہاءؒ

کے قول کے مطابق صحیح بھی تسلیم کر لیا جائے تب بھی اس سے اتنا ہی ثابت ہوگا کہ حضرت ابن عمرؓ سری نمازوں میں امام کے پیچھے قرأت کرتے تھے اور فریق ثانی کا دعویٰ اس سے خاص ہے کیونکہ ان کا دعویٰ صرف سورۃ فاتحہ پڑھنے کا ہے وضاحتاً موطا امام مالکؒ وغیرہ کے حوالہ سے بسند صحیح ان کا یہ اثر نقل کیا جا چکا ہے کہ وہ امام کے پیچھے کسی نماز میں کسی قسم کی قرأت کے قائل نہ تھے اور ان کا یہ مسلک ایک مسلّم حقیقت ہے اور ان سے ایک روایت یوں ہے انه كان ينهى عن القرأة خلف الامام (الجوهر النقي جلد ۲ ص ۱۶۳) کہ حضرت ابن عمرؓ امام کے پیچھے قرأت کرنے سے منع کیا کرتے تھے۔ مولانا سید نذیر حسین صاحب دہلویؒ (المتوفی ۱۳۲۰ھ) جو فریق ثانی کے مقتدر اور پیشوا ہیں تحریر فرماتے ہیں کہ مقتدی کو سورۃ فاتحہ پڑھنے کی علماء احناف کے نزدیک اجازت نہیں ہے اور ان کا استدلال ان صحابہ کرامؓ کی روایات سے ہے اور یہ قرأت خلف الامام کے قائل نہ تھے۔ حضرت جابرؓ بن عبد اللہؓ، حضرت ابن عباسؓ، حضرت عبد اللہؓ بن عمرؓ، حضرت ابو ہریرہؓ، حضرت ابو سعیدؓ الخدریؓ، حضرت انسؓ بن مالک، حضرت عمرؓ بن الخطاب، حضرت زیدؓ بن ثابت، حضرت ابن مسعودؓ اور حضرت علیؓ وغیرہم (منع قرأت خلف الامام۔ بحوالہ ایضاح الادلۃ ص ۵۷) اور صحیح اسانید کے ساتھ جلد اول میں ان اکابر کے آثار نقل کئے جا چکے ہیں کہ یہ جملہ حضرات امام کے پیچھے قرأت کے قائل نہ تھے اور یہی بات مولانا نذیر حسین صاحبؒ فرماتے ہیں حضرت عبد اللہؓ بن عمرؓ کا ایک اثر کتاب القرأۃ ص ۱۲۹ و ص ۱۴۷ میں ہے لیکن اس میں مکحولؒ مدلس ہیں اور عنعنہ سے روایت کرتے ہیں علاوہ ازیں امام بیہقیؒ فرماتے ہیں کہ یہ عبد اللہ بن عمرؓ نہیں بلکہ عبد اللہؓ بن عمروؓ بن العاص ہیں (ص ۱۲۹) اور مستزاد براں اس میں خلف الامام کا جملہ بھی مذکور نہیں ہے لہٰذا یہ روایت منفرد کے حق میں ہے۔ حضرت عبد اللہؓ بن عمرؓ سے ابو العالیہؒ نے مکہ مکرمہ میں دریافت کیا کہ کیا میں نماز میں قرأت کیا کروں؟ فرمایا میں بیت اللہ کے رب سے حیا کرتا ہوں کہ نماز میں قرأت نہ کروں ولو بام الکتاب اگرچہ ام القرآن ہی ہو (جزء القرأۃ ص ۱۲) لیکن اس میں بھی خلف الامام کا کوئی ذکر نہیں ہے۔ علاوہ بریں کتاب القرأۃ ص ۶۵ میں اسی اثر کے آخر میں فاتحۃ الکتاب کے بعد ما تیسر کی زیادت بھی موجود ہے اور یہ زیادت اس بات کو متعین کر دیتی ہے کہ حضرت ابن عمرؓ کا یہ اثر مقتدی کے حق میں نہیں ہے کیونکہ فریق ثانی کے نزدیک

بھی اس کو ما زاد علی الفاتحہ پڑھنے کی گنجائش نہیں ہے اور کتاب القراۃ صفحہ ۶۳ میں ان کی اسی روایت میں بام الکتاب کے بعد فزادتہا فصاعداً کی زیادت بھی مروی ہے حضرت ابن عمرؓ سے ایک اثر ان الفاظ سے مروی ہے۔

سئل ابن عمرؓ عن القراۃ خلف الامام فقال ماکانوا یرون باساً ان یقرأ بفاتحۃ الکتاب فی نفسہ (جزء القراۃ ص۱۲)

ان سے سوال کیا گیا کہ کیا امام کے پیچھے قراۃ کی جا سکتی ہے؟ فرمایا لوگ اس میں کوئی حرج نہیں سمجھتے تھے کہ اپنے دل میں سورۃ فاتحہ پڑھ لیں۔

لیکن اس کی سند میں ایک تو ابو جعفر رازیؒ ہے جس کا نام عیسیٰ بن ماہان ہے جس کا ترجمہ نقل کیا جا چکا ہے کہ وہ ضعیف ہے اور دوسرا راوی اس سند کا یحییٰ البکاءؒ ہے امام احمدؒ، ابوداؤدؒ، ابوزرعہؒ اور ابن عدیؒ اس کو ضعیف کہتے ہیں، دارقطنیؒ اس کو ضعیف اور علی بن الجنیدؒ اس کو مختلط کہتے ہیں، ازدیؒ کہتے ہیں کہ یہ متروک ہے ابن حبانؒ کہتے ہیں کہ اس سے احتجاج صحیح نہیں ہے (تہذیب التہذیب جلد ۱۱ ص۲۷۹) امام نسائیؒ اس کو متروک الحدیث کہتے ہیں (ضعفاء صغیر ص۵۵) حافظ ابن حجرؒ اس کو ضعیف الحدیث لکھتے ہیں (تقریب ص۳۹۵) مؤلف خیر الکلام لکھتے ہیں کہ عیسیٰ بن ماہان متکلم فیہ ہے مگر حافظ ابن حجرؒ لکھتے ہیں کہ صدوق ہے اس کا حافظہ اچھا نہیں تقریب ص۳۲۴ اور یحییٰ البکاءؒ کو ابن سعدؒ لکھتے ہیں کہ ثقہ ہے انشاء اللہ جب راوی مختلف فیہ ہو تو اس کی حدیث حسن ہوتی ہے (محصلہ ص۳۲۴) الجواب: ہاں بس ایسے ہی راویوں کی ایسی ہی حسن قسم کی حدیثوں پہ آپ کے مذہب کی بنیاد ہے اور مسلمانوں کی اکثریت کی نمازوں کو باطل اور کالعدم ٹھہرانے والوں کی وکالت فرما رہے ہیں۔ سبحان اللہ تعالیٰ اور آگے لکھتے ہیں کہ تطبیق کی یہی صورت ہے کہ نفی سے مراد جہری نماز میں فاتحہ سے ما زاد کی نفی مراد لی جائے اور فاتحہ کو اس نفی سے مستثنیٰ قرار دیا جائے انتہیٰ ص۳۲۵ الجواب: نہ معلوم یہ حضرات کس روایت کی کس سے تطبیق دے رہے ہیں؟ صحیح اور ضعیف کی تطبیق کا کیا معنیٰ؟ الحاصل حضرت ابن عمرؓ ہوں یا کوئی اور صحابی ہو ان میں کسی سے بسند صحیح یہ ثابت نہیں کہ امام کے پیچھے مقتدیوں کو سورۃ فاتحہ پڑھنی ضروری اور واجب ہے۔

حضرت عبادہؓ بن الصامت کا اثر:-

حضرت محمودؓ بن ربیع فرماتے ہیں کہ:-

سمعت عبادۃؓ بن الصامت یقرأ خلف الامام فقلت له تقرأ خلف الامام فقال عبادۃؓ لا صلوٰۃ الا بقراۃ (سنن الکبریٰ جلد ۲ ص ۱۶۸)

میں نے حضرت عبادہؓ کو امام کے پیچھے قرأت کرتے سنا میں نے دریافت کیا کہ آپ امام کے پیچھے قرأت کرتے ہیں؟ حضرت عبادہؓ نے فرمایا قرأت کے بغیر نماز نہیں ہو سکتی۔

امام بیہقیؒ نے اپنی سند کے ساتھ ان کی ایک اور روایت بھی نقل کی ہے جس میں امام کے پیچھے آہستہ قرأت کرنے کی اجازت ہے اور پھر لکھا ہے۔

وهذهب عبادۃؓ فی ذلک مشہور (ص ۲/۱۶۸)

حضرت عبادہؓ کا مذہب اس میں مشہور و معروف ہے۔

جواب: سند کے لحاظ سے گو کلام کرنے کی کافی گنجائش ہے مگر ہم سند کے لحاظ سے اس پر کوئی کلام نہیں کرتے حضرت عبادہؓ بن الصامت نے صحیح سمجھا یا غلط بہر حال یہ بالکل صحیح بات ہے کہ حضرت عبادہؓ امام کے پیچھے سورۃ فاتحہ پڑھنے کے قائل تھے اور ان کی یہی تحقیق اور یہی مسلک و مذہب تھا مگر فہم صحابی اور موقوف صحابی حجت نہیں ہے خصوصاً قرآن کریم، صحیح احادیث اور جمہور حضرات صحابہ کرامؓ کے آثار کے مقابلہ میں لیکن یہ روایت خود اس بات کو واضح کر رہی ہے کہ حضرات صحابہ کرامؓ اور تابعینؒ میں امام کے پیچھے قرأت کرنے کو پسندیدگی کی نگاہ سے نہیں دیکھا جاتا اور یہ مسئلہ ان میں رائج بھی نہ تھا ورنہ محمودؓ بن ربیع جو خود صغار صحابہؓ میں سے تھے حضرت عبادہؓ بن الصامت کی امام کے پیچھے قرأت سے کبھی تعجب نہ کرتے اور نہ یہ پوچھنے کی نوبت ہی آتی کہ حضرت آپ امام کے پیچھے کیوں قرأت کرتے ہیں؟ یقینی امر ہے کہ حضرت عبادہؓ بن الصامت نے نماز میں تکبیر، قیام، رکوع، سجود، تشہد، اور سلام وغیرہ جملہ امور ادا کیے ہوں گے مگر ان میں سے کسی چیز کے بارے میں پوچھنے کی ضرورت محسوس نہ کی گئی کہ حضرت آپ نے رکوع کیوں کیا ہے؟ سجدہ کیوں کیا ہے؟ وغیرہ وغیرہ اگر سوال کیا ہے تو اس چیز کے بارے میں کہ آپ امام کے پیچھے قرأت کیوں کرتے ہیں؟ یہ بھی مت بھولیے کہ حضرت عبادہؓ بن الصامت نے محمودؓ بن ربیع کو یہ نہیں فرمایا کہ برخوردار تمہاری تمام سابق نمازیں بے کار کالعدم اور باطل ہیں کیونکہ تم نے قرأت نہیں کی اور تمام نمازیں واجب الاعادہ ہیں اور نہ سہی تو یہی نماز جو تم نے ابھی ابھی میرے ساتھ بغیر قرأت کے ادا کی ہے وہی دوبارہ پڑھ لو اور لطف کی بات یہ ہے کہ حضرت محمودؓ بن ربیع حضرت عبادہؓ کے داماد تھے (تہذیب التہذیب جلد ۱۰ ص ۶۲) انہوں نے ان کو یہ بھی نہ فرمایا کہ تم امام کے پیچھے ترک قرأت کے مرتکب

ہوئے ہو اور تارکِ قرأت کی نماز باطل اور کالعدم ہے اور من ترک الصلوٰۃ متعمدا فقد کفر لہذا میری سنت جگہ جگہ کو میرے گھر پہنچا دو اور خود مزے اڑاتے پھرو۔ حضرت عبادہؓ وہی جلیل القدر صحابی ہیں جو فرماتے ہیں کہ ہم نے جناب رسولِ خدا صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کے ہاتھ مبارک پر اس شرط سے بیعت کی ہے کہ ان لا نخاف فی اللہ لومۃ لائم (مستدرک وقال صحیح جلد ۳ ص ۳۵۶) اللہ تعالیٰ کے معاملہ میں کسی ملامت کرنے والے کی ملامت سے ہرگز نہ گھبرائیں گے اور ایک معمولی قسم کے مسئلہ میں حضرت امیر معاویہؓ سے اُلجھ کر ملک شام ترک کر دیا تھا اور یہ فرمایا کہ ہمارا اجتماع ناممکن ہے لیکن حضرت عمرؓ کی زبردست مداخلت سے اپنے ارادہ سے باز آئے (دیکھئے مستدرک جلد ۳ ص ۳۵۵، مسند دارمی ص ۹۳ اور ابن ماجہ ص ۳ وغیرہ) مگر جب قرأت خلف الامام کے مسئلہ کی باری آتی ہے تو اپنے پڑھنے کی وجہ تو بتلاتے ہیں لیکن اس اہم مسئلہ کے اظہار پہ کما حقہ وہ جوش و خروش ظاہر نہیں کرتے جو اس کے رکن اور ضروری ہونے پہ کرنا چاہیئے تھا۔ اگر حضرت عبادہؓ کے نزدیک قرأت خلف الامام واجب فرض اور رکن ہوتی تو اس کے اظہار میں پوری قوت اور طاقت صرف کرتے اور اس میں کسی قسم کی کوئی کوتاہی نہ کرتے اس بحث کو پیشِ نظر رکھنے سے یہ بات بخوبی سمجھ آسکتی ہے کہ حضرت محمودؓ بن ربیع مطلقاً امام کے پیچھے قرأتِ فاتحہ کے قائل نہ تھے اور حضرت عبادہؓ گو قائل تو تھے لیکن محض استحباب کے طور پر اور اگر کسی کو حکم بھی کیا ہے تو صرف استحبابی امر سمجھ کر۔ اگر اس کو رکن اور فرض سمجھتے تو کتمان حق سے بچتے ہوئے حضرت ابن مسعودؓ کی طرح (جنہوں نے قرآن کریم کی دو سورتوں کے تقدم و تأخر فی النزول کے بارے میں اعلان کیا تھا) یہ اعلان فرماتے من شاء باھلتہ جس کا جی چاہے میں اس کے ساتھ مباہلہ کرنے کے لیے تیار ہوں جب حضرت عبادہؓ نے ایسا نہیں کیا تو قطعی بات ہے کہ وہ امام کے پیچھے بلاشک سورۂ فاتحہ پڑھتے تو تھے (اور جہری نمازوں میں پڑھتے بھی صرف تنہا اور اکیلے تھے دوسرے حضرات صحابہؓ کا ان سے اتفاق نہ تھا) مگر صرف مستحب سمجھ کر ہم نے جو یہ کہا ہے کہ دوسرے صحابہ کرامؓ حضرت عبادہؓ بن الصامت سے جہری نمازوں میں قرأۃ خلف الامام کے مسئلہ میں اتفاق نہیں رکھتے تھے سینہ زوری نہیں بلکہ حقیقت ہے۔ چنانچہ امام بیہقیؒ لکھتے ہیں کہ

وانما تعجب من تعجب من قرأۃ عبادۃؓ بن الصامت خلف الامام فیما یجھر فیہ بالقرأۃ لذھاب

جو لوگ امام کے پیچھے جہری نمازوں میں قرأت کے قائل نہ تھے انہوں نے حضرت عبادہؓ کی جہری نمازوں میں قرأت

من ذهب الى قول القرأة خلف الامام فيما يجهر الامام فيه بالقرأة حين قال النبي صلى الله عليه وسلم مالى انازع القرآن ولم يسمع استثناء النبي صلى الله عليه وسلم قرأة فاتحة الكتاب سرًا وقوله صلى الله عليه وسلم فانه لا صلوٰة لمن لم يقرأ بها وسمعه عبادةؓ بن الصامت واتقنه واداه واظهره فوجب الرجوع اليه في ذلك (انتهى بلفظه كتاب القرأة ص ۲۷)

پر تعجب کا اظہار کیا اور اس کی وجہ یہ ہوئی کہ آنحضرت صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے جب یہ فرمایا کہ میرے ساتھ قرآن میں منازعت کیوں کی جا رہی ہے؟ اور اس کے بعد آپ نے آہستہ سورۂ فاتحہ پڑھنے کا حکم دیا اور اسی طرح آپ نے یہ فرمایا کہ جس آدمی نے نماز میں سورۂ فاتحہ نہ پڑھی تو اس کی نماز نہ ہوگی تو یہ استثناء صرف حضرت عبادہؓ بن الصامت نے سُنی اور دیگر حضرات صحابہؓ نہ سُن سکے اور اس کو حضرت عبادہؓ نے خوب محفوظ رکھا اس کو ادا کیا اور ظاہر کیا سو انکی بات کی طرف رجوع کرنا ضروری ٹھہرا۔

صحابی اور تارک نماز؟ یہ دو متضاد باتیں ہیں اور واقعہ صبح کی نماز کا ہے جس میں سینکڑوں حضرات صحابہؓ شریک ہوں گے اور آنحضرت صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے مالی انازع الخ سے تنبیہ فرما کر سب حضرات صحابہ کرامؓ کی توجہ اپنی طرف مبذول کرائی تھی اور یہ حکم بھی پیش نظر تھا۔ یَا اَیُّھَا الرَّسُوْلُ بَلِّغْ مَا اُنْزِلَ اِلَیْکَ مِنْ رَّبِّکَ اور فَاصْدَعْ بِمَا تُؤْمَرُ (یعنی اے رسول صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم اللہ تعالیٰ کے حکموں کو کھول کر بیان کریں جن میں کوئی اشتباہ باقی نہ رہے) مگر باایں ہمہ جناب رسول خدا صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم یہ حکم آہستہ (سراً) بیان کرتے ہیں اور حضرت عبادہؓ کے بغیر اس حکم کو کوئی دوسرا سنتا ہی نہیں؟ پھر حضرت عبادہؓ پر لوگ متعجب کیوں نہ ہوں کہ حضرات صحابہ کرامؓ جو آنحضرت صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کے ایک ایک حکم اور ارشاد کو عزیز از جان سمجھتے تھے اور ہمہ تن گوش ہو کر سنتے تھے کوئی بات نہیں سمجھ آتی تو پھر استدعا کرتے تھے اور کوئی ضروری امر ہوتا تو آپ تین تین مرتبہ ایک ایک جملہ کو دہراتے تھے لیکن جب امام کے پیچھے قرأت سورۂ فاتحہ کے حکم کے بیان کرنے کا نمبر آتا ہے تو آپ آہستہ بیان کرتے ہیں؟ تین مرتبہ بیان کرنے کی ضرورت ہی نہیں سمجھتے؟ اور یہ حکم صرف حضرت عبادہؓ سُنتے ہیں کسی دوسرے کے پلے کچھ نہیں پڑتا؟ اور دیگر حضرات صحابہ کرامؓ آپ سے دریافت کرنے کی ضرورت بھی نہیں سمجھتے کہ حضرت آپؐ نے کیا ارشاد فرمایا ہے؟ اگر امام کے پیچھے سورۂ فاتحہ کے پڑھنے کا مسئلہ ضروری فرض، واجب اور رکن ہوتا تو یقیناً آنحضرت صلی اللہ تعالیٰ علیہ و

سلم ایک بار نہ فرماتے بلکہ کئی بار فرماتے سراً نہ فرماتے بلکہ جہراً فرماتے صرف حضرت عبادہؓ کو نہ سناتے بلکہ تمام حضرات صحابہؓ کو سناتے اور اگر حضرت عبادہؓ بھی اس حکم کو ضروری سمجھتے تو یقیناً بغیر خوف لومۃ لائم کے اس کی خوب نشر و اشاعت کرتے اور حضرات صحابہ کرامؓ کو اس بات کا قائل کر لیتے کہ وہ بھی جہری نمازوں میں امام کے پیچھے قرأت کرتے۔ یہ حکم تو ضروری نہ تھا اس لیے اس کی پرزور اشاعت کی ضرورت ہی انہوں نے نہ سمجھی بخلاف اس کے ترک قرأت کا حکم ضروری تھا اس لیے کہ جب آنحضرت صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کے پیچھے صرف ایک شخص نے قرأت کی تو آپ نے فرمایا میرے پیچھے کس نے قرأت کی ہے؟ کیوں میرے ساتھ منازعت اور مخالجت ہوتی رہی ہے؟ حتیٰ کہ آپ نے ببانگ دہل یہ ارشاد فرمایا مالی انازع القرآن نتیجہ یہ ہوا کہ یہ ارشاد سب نے سنا اور یہ ارشاد سن کر تمام حضرات صحابہؓ کرام نے جہری نمازوں میں امام کے پیچھے قرأت ترک کر دی جیسا کہ مفصل پہلے گذر چکا ہے۔ باقی اگر حضرت عبادہؓ سے بسند صحیح یا کسی اور صحابی سے بلا قیل و قال خلف الامام کی قید سے کوئی روایت صحیح ہوتی تو یقیناً اس کی طرف رجوع کیا جاتا مگر روایات کا حال آپ ملاحظہ کر ہی چکے ہیں اور بقول شیخ الاسلام ابن تیمیہؒ حضرت عبادہؓ کے موقوف قول سے ہی غلطی در غلطی پیدا ہوئی ہے الغرض حضرات صحابہ کرامؓ کے یہ آثار پہلے تو سنداً ہی صحیح نہیں ہیں اور اگر کچھ صحیح بھی ہیں تو ان میں صرف سری نمازوں کا ذکر ہے اور کسی میں مطلق قرأت کا ذکر ہے اور اکثر میں ما زاد، ما تیسر اور فصاعداً وغیرہ کی زیادت بھی موجود ہے لہٰذا یہ آثار فریق ثانی کو ہرگز مفید نہیں ہو سکتے۔

آثار حضرات تابعینؒ وغیرہم

فریق ثانی نے اپنے اس دعویٰ پر کہ امام کے پیچھے ہر رکعت میں سورۂ فاتحہ پڑھنا ضروری ہے ورنہ نماز ناقص، بیکار، کالعدم اور باطل ہو گی حضرات تابعینؒ و اتباع تابعینؒ وغیرہم کے آثار اور اقوال سے بھی استدلال کیا ہے حالانکہ ان کے نزدیک در موقوفات صحابہؓ حجت نیست اگرچہ بصحت رسد پھر آثار حضرات تابعینؒ وغیرہم سے استدلال کیونکر صحیح ہو سکتا ہے جبکہ وہ سنداً اور روایۃً بھی صحت کے معیار پر پورے نہیں اترتے اور معنوی اور درایتی پہلو کے پیش نظر بھی وہ ان کو چنداں مفید نہیں ہو سکتے مگر مشہور ہے ڈوبتے کو تنکے کا سہارا، حضرات تابعینؒ وغیرہم کے وہ آثار جو بحث سکتات

وغیرہ اور دیگر مواقع پر نقل کیے جا چکے ہیں اور جن پر کلام بھی کیا جا چکا ہے ان کے اعادہ کی ضرورت نہیں ہے اس موقع پر صرف وہ آثار پیش ہوں گے جو پہلے نقل نہیں ہوئے۔

حضرت مکحول کا اثر:۔ ان سے روایت ہے انہوں نے فرمایا کہ مغرب عشاء اور صبح کی نماز میں ہر رکعت میں آہستہ سورۃ فاتحہ پڑھی جائے اور جہری نمازوں میں جب امام سورۃ فاتحہ پڑھنے کے بعد سکوت اختیار کرے تو اس وقت آہستہ سورۃ فاتحہ پڑھی جائے اور اگر امام خاموش نہ ہو تو اس کے ساتھ یا اس کے بعد یا اس سے پہلے ہر حالت میں سورۃ فاتحہ پڑھو اور کسی حالت میں نہ چھوڑو (بیہقی جلد ۲ ص ۱۷۱)

جواب:۔ یہ اثر بھی قابل التفات نہیں ہے اولاً اس لیے کہ اگر بالفرض یہ اثر صحیح بھی ہو تب بھی نص قرآنی، صحیح احادیث اور جمہور حضرات صحابہ کرامؓ کے صحیح آثار کے مقابلہ میں اس کو سنتا کون ہے؟ وثانیاً قرأت سورۃ فاتحہ کے لیے سکتہ کی کوئی گنجائش نہیں ہے جیسا کہ بحث سکتات امام میں اس کی سیر حاصل تحقیق پیش ہو چکی ہے اور جہرا امام کے ساتھ ساتھ پڑھتے جانا منازعت اور مخالجت کا موجب ہے جو کتاب وسنت اور اجماع امت سے مردود ہے۔

حضرت عروہ بن زبیرؓ کا اثر:۔ ان سے مروی ہے انہوں نے ارشاد فرمایا کہ

لا تتم صلوٰۃ لاحد من الناس لا یقرأ فیھا بفاتحۃ الکتاب فصاعدا مکتوبۃ ولا سبحۃ (کتاب القراۃ ص ۳۷)

کسی شخص کی کوئی نماز خواہ وہ فرضی ہو یا نفلی اس وقت تک مکمل نہیں ہو سکتی جب تک اس میں سورۃ فاتحہ اور اس سے کچھ زیادہ کی قرأت نہ کی جائے۔

جواب:۔ یہ اثر بھی قابل استدلال نہیں ہے اولاً اس لیے کہ اس کی سند میں محمد بن العباسؒ ہے کتب اسماء الرجال سے اس کی تعیین نہیں ہو سکی کہ یہ کون اور کیسا ہے؟ وثانیاً اس میں احمدؒ بن سویدؒ ہے جس کا کتب رجال میں کوئی نام ونشان ہی نہیں ملتا، مؤلف خیر الکلام لکھتے ہیں کہ مگر عدم علم سے یہ لازم نہیں آتا کہ وہ مجہول ہو اھ ص ۲۳۹ الجواب:۔ یہ ٹھیک ہے مگر مؤلف مذکور کا یہ علمی اور اخلاقی فریضہ تھا کہ وہ اس راوی کی نشاندہی کرتے اور کتب رجال سے اس کی توثیق نقل کرتے وثالثاً اس کی سند میں حماد بن سلمہؒ ہے ان کے اس اثر کا مقابلہ اس اثر سے نہیں ہو سکتا جو جلد اول میں بسند صحیح نقل کیا جا چکا ہے مبارکپوری صاحب لکھتے ہیں۔ سو یہ معارضہ بھی صحیح نہیں

علیٰ وجوب الاستماع والانصات لقرأة الامام ۔۔۔۔ الخ (احکام القرآن ج ۳ ص ۴۹)	استماع وانصات کے وجوب پر واضح دلیل ہوتی ہے

علامہ سید محمود آلوسیؒ (مفتی بغداد المتوفی ۱۲۷۰ھ)

اس آیت کی تفسیر کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ

لانها تقتضی وجوب الاستماع عنه قرأة القرآن فی الصلوٰة وغیرها و قد قام الدلیل فی غیرها علیٰ جواز الاستماع وترکه فبقی فیها علیٰ حاله فی الانصات للجهر وکذا فی الاخفاء لعلمنا بانه یقرأ ویؤید ذلك اخبار جمة (روح المعانی جلد ۹ ص ۱۳۳)	آیت کا مقتضیٰ یہ ہے کہ نماز میں یا خارج از نماز جب بھی قرآن کریم کی قرأت ہوتی ہو تو خاموش رہنا چاہیے ۔ لیکن خارج از نماز سماع وعدم سماع دونوں کے جواز پر دلیل قائم ہو چکی ہے ۔ لہٰذا جہری نمازوں میں انصات بہرحال ضروری ہے اور اسی طرح سری نمازوں میں بھی کیونکہ ہمیں معلوم ہے کہ امام قرأت کرتا ہے اور متعدد حدیثیں بھی اس کی تائید کرتی ہیں ۔

اس کے بعد علامہ موصوفؒ نے متعدد صحیح حدیثیں، عقلی وترجیحی دلائل پیش کر کے بڑے وزنی دلائل سے اپنا دعوٰی ثابت کیا ہے ۔

قارئین کرام! آپ حقیقت کی تہ کو پہنچ چکے ہوں گے ۔ ابھی بہت سے مفسرین کرامؒ مثلاً علامہ خازنؒ[2] (المتوفی ۷۴۱ھ) اور شیخ احمد جونپوریؒ[3] (المتوفی ۱۱۳۰ھ) وغیرہ وغیرہ کی عبارتیں باقی ہیں، مگر ہمارا مقصد صرف منصف مزاج لوگوں کے لیے معتبر مفسرین کے

---

[1] مولانا میر صاحبؒ لکھتے ہیں کہ متاخرین حنفیہ میں بڑے پائے کے مفسر ہیں۔ ۳ تفسیر واضح البیان ص ۴۲

[2] مشہور تفسیر ہے اور ۷۲۵ھ میں مصنف اس کی تالیف سے فارغ ہوتے تھے ۔ (اکسیر ص ۱۶۱) آیت مذکورہ کی تفسیر انھوں نے جلد ۲ ص ۲۷۲ میں کی ہے ۔

[3] یہ اورنگ زیب عالم گیر رحمۃ اللہ علیہ (المتوفی ۱۱۱۸ھ) کے استاد تھے ۔ (اکسیر ص ۳۴) اور تفسیر احمدی ص ۲۸۰ میں انھوں نے آیت مذکورہ کی سیر حاصل تفسیر کی ہے ۔

چند اقوال بطور نمونہ عرض کرنے تھے اگر استقصار کیا جائے تو تقریباً محال ہے اور ہمارا موضوع بھی یہ نہیں۔ اس لیے اب ہم بعض ضروری عبارتیں نقل کرکے اس بحث کو ختم کرتے ہیں۔

امام بیہقی رح جن کی کتاب القرآۃ پر مسئلہ زیر بحث میں فریق ثانی کا مدار ہے۔ رقم طراز ہیں کہ

انا لا ننکر نزول هٰذه الاٰیة فی الصلوٰة او فی الصّلوٰة والخطبة کما ذهب الیه من ذکرنا قوله من سلف هذه الامة غیر انهم او بعض من روی عنهم اختصروا الحدیث فقالوا فی الصلوٰة مطلقًا۔

(کتاب القرآۃ ص۸)

ہم اس بات کا انکار نہیں کرتے کہ یہ آیت نماز کے بارے میں یا نماز اور خطبہ دونوں کے بارے میں نازل ہوئی ہے جیسا کہ سلفِ امت کے اقوال ہم نے نقل کیے ہیں لیکن ہمارا اعتراض یہ ہے کہ انھوں نے یا ان میں سے بعض نے حدیث کو مختصر کر دیا ہے اور اس آیت کا شان نزول مطلقاً نماز کو قرار دیا ہے۔ (اور خطبہ وغیرہ کا ذکر تک نہیں کرتے۔)

امام بیہقیؒ کو اس کا اقرار ہے کہ آیت مذکورہ کا شان نزول صرف نماز یا نماز اور خطبہ دونوں ہیں اور جمہور امت کا بھی یہی قول ہے مگر ان کا اعتراض یہ ہے کہ آیت کو فقط نماز پر کیوں قصر کر دیا ہے؟ اس میں خطبہ وغیرہ کا ذکر بھی آنا چاہیے جیسا کہ احادیث میں آتا ہے لیکن امام موصوفؒ کا یہ اعتراض محض دفع الوقتی اور تسکین قلب کا سامان ہے۔

اوّلاً اس لیے کہ جمعہ اور عید کی فرضیت مدینہ طیبہ میں ہوئی ہے اور آیت مذکورہ مکی ہے جیسا کہ علامہ بغویؒ کے حوالہ سے عرض کیا جا چکا ہے۔ پھر اس کا شان نزول خطبہ کیسے ہوا؟

وثانیاً جس حدیث (بلکہ احادیث) کے اختصار کا الزام امام موصوفؒ نے عائد کیا ہے۔ ان میں ایک بھی صحیح نہیں ہے جیسا کہ اپنے مقام پر عرض ہوگا۔ پھر ان سے استدلال و احتجاج کیسا؟

وثالثاً آیت کا حکم خطبہ کو عموم الفاظ کے لحاظ سے شامل ہے نہ کہ شان نزول کے لحاظ سے۔ جیسا کہ آپ پوری وضاحت سے یہ پڑھ چکے ہیں۔ مگر یہ کس قدر حقیقت فراموشی ہے کہ جس نماز کے بارے میں یہ آیت نازل ہوتی ہے۔ اس میں استماع و انصات تو ضروری نہ ہوا اور خطبہ (وغیرہ بالتبع امور) کو اس کا شان نزول بنا کر اصل حقیقت سے گریز اور پہلو تہی کی جائے؟

قاضی شوکانیؒ (محمدؒ بن علیؒ المتوفی ۱۲۵۵ھ)[1]

اس مسئلہ پر تبصرہ کرتے ہوئے تحریر فرماتے ہیں کہ

ان عمومات القرآن والسنۃ قد دلت علیٰ وجوب الانصات والاستماع والمتوجہ حال قرأۃ الامام للقرآن غیر منصت ولا مستمع..... الخ

(نیل الاوطار جلد ۲ ص ۲۲۶ ونقل النواب فی ھدایۃ السائل ص ۱۹۱)

(امام جب قرأت قرآن کر رہا ہو تو مقتدی کو اس وقت اِنِّیْ وَجَّھْتُ وَجْھِیَ لِلَّذِیْ ... الآیۃ کی دعاء استفتاح نہیں پڑھنی چاہیئے) کیونکہ قرآن کریم اور سنت کے عمومات اور اکثر دلیلیں اس پر دلالت کرتی ہیں۔ کہ امام جب قرأت کر رہا ہو تو اس وقت مقتدی پر انصات اور استماع واجب ہے۔ حالانکہ اس حالت میں امام کے ساتھ پڑھنے والا استماع اور انصات پر عامل نہیں ہے۔

قاضی صاحبؒ بھی جمہور اہل اسلام کی طرح جہرِ امام کے وقت مقتدی کی قرأت کو قرآن کریم کی نظیر تو جہ مانع سکھے قرآن و سنت عمومی دلائل کے خلاف سمجھتے ہیں اور تصریح کرتے ہیں کہ اس کے خلاف کرنے والا عمومات قرآن اور سنت کا مخالف ہے۔ قاضی صاحبؒ نے سکتات امام میں مقتدی کے لیے قرأت فاتحہ کو احوط کہا ہے، لیکن قرأت مقتدی کے لیے سکتات کا شریعت میں کوئی وجود ہی نہیں ہے جس کی پوری تشریح اپنے مقام پر عرض ہو گی۔ انشاء اللہ العزیز۔

مؤلف خیر الکلام کا مناقشہ نمبر ۳ میں یہ کہنا کہ اس میں فاتحہ کا ذکر نہیں اور قاضی شوکانیؒ ہر حالت میں فاتحہ خلف الامام کے قائل ہیں اور استماع و انصات آہستہ پڑھنے کے منافی نہیں (محصلہ خیر الکلام ص ۵۴۷، ۵۴۸) تو یہ محض لفاظی ہے۔ ہم نے کب فاتحہ کا ذکر کیا ہے۔ ہم نے تو یہ حوالہ صرف اس لیے پیش کیا ہے کہ جہرِ امام کے وقت مقتدی کا پڑھنا استماع و انصات کے بالکل منافی ہے اور یہی کچھ قاضی صاحب فرماتے ہیں۔ حتیٰ کہ باقرار مؤلف خیر الکلام قاضی صاحبؒ مقتدی کے لیے فاتحہ کی قرأت کو سکتات میں احوط کہتے ہیں۔ (ملاحظہ ہو خیر الکلام ص ۵۴۸) کہ قاضی صاحبؒ نے فرمایا کہ

---

[1] قاضی صاحبؒ موصوف اپنے وقت کے متبحر اور وسیع المطالعہ محقق عالم تھے۔ نواب صدیق صاحبؒ لکھتے ہیں کہ وہ القاضی، العلامۃ، الامام، الانور، الزکی، المنور اور عزّ الاسلام تھے اور لکھتے ہیں کہ وہ کمال عالم انسانی پر حاوی تھے۔ (اکسیر ص ۹)

اگر ممکن ہو تو فاتحہ کو امام کے سکتات میں پڑھنے میں زیادہ احتیاط ہے۔ (نیل جلد ۲ ص۲۳۷) اور فرماتے ہیں کہ قرآن و سنت کے عمومی دلائل مقتدی پر استماع و انصات کو واجب قرار دیتے ہیں۔

حافظ ابو عمرؒ بن عبد البرؒ (یوسف بن عبد اللہ المتوفی ۴۶۳ھ):

لکھتے ہیں کہ حضرت امام مالکؒ (وغیرہ) جہری نمازوں میں مقتدی کے لیے امام کے پیچھے قرأت کو صحیح نہیں سمجھتے تھے۔

وحجته قوله تعالى واذا قرئ القرآن فاستمعوا له وانصتوا لعلكم ترحمون ولا خلاف انه نزل في هذا المعنى دون غيره ومعلوم انه في صلاة الجهر لان السر لا يسمع فدل على انه اراد الجهر خاصة۔
(بحوالہ اوجز المسالک جلد ۱ ص ۲۴۸)

اور ان کی دلیل اللہ تعالیٰ کا یہ فرمان ہے کہ جب قرآن کریم کی قرأت ہو رہی ہو تو تم اس کی طرف توجہ کرو اور خاموش رہو تاکہ تم پر رحم ہو اور اس میں کسی کا اختلاف نہیں ہے کہ اس آیت کا شان نزول صرف یہی ہے نہ کہ کوئی اور۔ اور یہ ظاہر ہے کہ استماع تو صرف جہری نمازوں میں ہو سکتا ہے۔ لہٰذا اس آیت سے فقط جہری نمازیں مراد ہوں گی نہ کہ سری۔

ان شاء اللہ العزیز یہ بات تو اپنے مقام پر آئے گی کہ آیت میں صرف استماع کا لفظ ہی نہیں جو بقول ان کے محض جہری نمازوں کو شامل ہے (اور نیز استماع اور سماع میں بھی فرق ہے۔) بلکہ اس میں انصات کا لفظ بھی ہے جو سری نمازوں کو بھی شامل ہے لیکن حافظ المغرب قرآن کریم کی مذکورہ آیت کا شان نزول نماز اور خلف الامام کا مسئلہ بتلاتے ہیں اور لطف کی بات یہ ہے کہ پوری ذمہ داری اور وضاحت سے تحریر فرماتے ہیں کہ آیت مذکورہ کا شان نزول صرف نماز اور خلف الامام کا مسئلہ ہے اور اس میں کسی کا کوئی اختلاف

؎ علامہ ذہبیؒ ان کو الامام، شیخ الاسلام اور حافظ المغرب لکھتے ہیں۔ (تذکرہ جلد ۳ ص ۳۰۶) علامہ ابو الولید باجیؒ ان کو احفظ اہل المغرب کہتے ہیں (ایضاً ص ۳۰۷) امام حمیدیؒ کہتے ہیں کہ وہ فقیہ، حافظ کثیر التصنیف قرأت اور علم خلاف کے عالم اور علوم حدیث اور اسماء الرجال کے مسلم امام تھے (ایضاً ص ۳۰۷) غرضیکہ وہ حفظ اتقان میں اپنا نظیر نہیں رکھتے تھے۔ علامہ ابن حزمؒ کہتے تھے کہ میں نے فقہ الحدیث پر ابن عبد البرؒ کی کتاب التمہید کی مانند کوئی کتاب نہیں دیکھی چہ جائیکہ اس سے بہتر اور اعلیٰ اور کتاب الاستذکار اسی کا ملخص ہے (تذکرہ جلد ۳ ص ۳۰۷) حافظ ابن القیمؒ ان کو الامام الحافظ اور اپنے زمانہ میں امام اہل السنت لکھتے ہیں۔ (اجتماع الجیوش الاسلامیہ ص ۴۶)

نہیں ہے۔ انصاف شرط ہے کہ اس اجماع و اتفاق کے بعد اور کون سی تفسیر معتبر اور قابل اعتماد ہو سکتی ہے؟ جو حضرات صحابہ کرامؓ سے لے کر قاضی شوکانی صاحبؒ تک ہر دور، ہر طبقہ اور ہر مسلک کے فقہاءؒ و محدثینؒ، مؤرخینؒ اور مفسرینؒ کے ہاں طے شدہ حقیقت ہے۔

شیخ الاسلام ابن تیمیہؒ (جن کے نام اور محاسن سے مقدمہ میں آپ اچھی طرح متعارف ہو چکے ہیں۔) اس مسئلہ پر بحث کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

فالنزاع من الطرفين لكن الذين ينهون عن القرأة خلف الامام جمهور السلف والخلف ومعهم الكتاب والسنة الصحيحة والذين اوجبوها على المأموم فحديثهم ضعفه الائمة۔

(تنوع العبادات ص۸۶)

مسئلہ زیر بحث میں نزاع تو طرفین سے ہے لیکن جو لوگ امام کے پیچھے قرأت سے منع کرتے ہیں۔ وہ جمہور سلف وخلفؒ ہیں اور ان کے ہاتھ میں کتاب اللہ اور سنت صحیحہ ہے اور جو لوگ امام کے پیچھے مقتدی کے لیے قرأۃ کو واجب قرار دیتے ہیں۔ ان کی حدیث کو ائمہؒ حدیث نے ضعیف قرار دیا ہے۔

مطلب ظاہر ہے کہ منکرین قرأت خلف الامام صرف چند نفوس نہیں، بلکہ جمہور سلف وخلفؒ ہیں اور یہ نظریہ جمہور نے اجتہاد اور قیاس ہی سے قائم نہیں کر لیا۔ بلکہ کتاب اللہ اور سنت صحیحہ سے لیا ہے اور جو لوگ امام کے پیچھے قرأت تجویز کرتے ہیں۔ ان کا ہاتھ کتاب اللہ سے یکسر خالی ہے اور محض حدیث پر ان کے استدلال کی بنیاد قائم ہے اور حدیث بھی وہ ہے جس کی تضعیف ائمہ حدیث سے منقول ہے۔ (پوری تفصیل اپنے مقام پر آئے گی انشاء اللہ العزیز۔)

اور دوسرے مقام پر لکھتے ہیں کہ

وقول الجمهور هو الصحيح فان الله سبحانه وتعالى قال واذا قرئ القرآن فاستمعوا له وانصتوا لعلكم ترحمون قال احمد اجمع الناس على انها نزلت فى الصلوٰة۔

(فتاوی جلد ۲ ص۴۱۲)

جمہور کا مسلک اور قول ہی صحیح ہے کیونکہ اللہ تعالیٰ کا حکم ہے کہ جب قرآن کریم پڑھا جائے تو تم اس کی طرف توجہ کرو اور خاموش رہو تاکہ تم پر رحم ہو۔ امام احمدؒ بن حنبلؒ فرماتے ہیں کہ سب لوگوں کا اس پر اتفاق اور اجماع ہے کہ اس آیت کا شان نزول نماز ہے۔

شیخ الاسلامؒ کی اس عبارت نے اس امر کی مزید تشریح کر دی ہے کہ آیت مذکورہ کا شانِ نزول ہی نماز ہے اور اس پر تمام اہلِ اسلام اور ائمہ دینؒ کا یعنی حضرات صحابہ کرامؓ و تابعینؒ و اتباع تابعینؒ اور جمہور سلف و خلفؒ کا اجماع و اتفاق ہے۔ یہی شیخ الاسلامؒ ایک دوسرے مقام پر یوں ارشاد فرماتے ہیں کہ

وذکر احمدؒ بن حنبلؒ الاجماع علی انها نزلت فی الصلوٰة وذکر الاجماع علی انها لا تجب القرأة علی المأموم حال الجهر (فتاوٰی جلد ۲ ص ۱۴۳)	امام احمدؒ بن حنبلؒ نے اس پر اجماع نقل کیا ہے کہ یہ آیت نماز کے بارے میں نازل ہوئی ہے۔ نیز اس پر بھی اتفاق نقل کیا ہے کہ جب امام جہر سے قرأۃ کرتا ہو تو مقتدی پر قرأت واجب نہیں ہے۔

اور نواب صاحبؒ اس آیت کے بارے میں لکھتے ہیں کہ

وایں آیت دلالت نمی کند مگر بر منع قرأت در حال جہر امام بقرأت لقولہ فاستمعوا واستماع نمی باشد مگر از برائے قرأت مجہورہ بہانہ برائے قرأت مخافتت ... اھ (دلیل الطالب ص ۲۵۰)

قارئین کرام! آپ جناب رسولِ خدا صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کے بعد حضرت عبداللہؓ بن مسعود سے لے کر قاضی شوکانیؒ اور نواب صاحبؒ تک کی عبارات ملاحظہ فرما چکے ہیں کہ اس مذکورہ آیت کا شانِ نزول صرف نماز ہے۔ خطبہ (وغیرہ) عموم الفاظ کے لحاظ سے بالتبع اور ضمنی طور پر اس حکم میں شامل ہے۔ اور حافظ ابن عبدالبرؒ اور شیخ الاسلامؒ سے یہ بھی سن چکے ہیں کہ اس بات پر تمام اہلِ اسلام کا اجماع اور اتفاق ہے کہ اس کا شانِ نزول فقط نماز ہے۔ اور اس میں کسی کا کوئی اختلاف نہیں ہے۔ اور اجماع کے نقل کرنے والے بھی امام اہل السنت اور مقتدائے ملت حضرت امام احمدؒ بن حنبلؒ ہیں اور آپ یہ بھی سن چکے ہیں کہ جہری نمازوں میں امام کے پیچھے مقتدی کے لیے قرأت کرنا اجماع اور اتفاق کے سراسر خلاف ہے۔ اس تمام بحث کو پیشِ نظر رکھتے ہوئے فریق ثانی کے بے بنیاد دعاوی کو (جن کا ذکر سخن ہائے گفتنی میں ہو چکا ہے) دیکھیے کہ حق کس کے ساتھ ہے؟ کتاب اللہ اور سنت صحیحہ کس کے ہاتھ میں ہے اور جمہور سلف و خلفؒ کی معیت کس کو نصیب ہے؟

نواب صاحبؒ لکھتے ہیں کہ

کوئی دعویٰ اس وقت تک صحیح نہیں ہو سکتا۔ جب تک کتاب اللہ و سنت رسول اللہ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم اور بیّنۂ عادلہ سے اس پر ثبوت نہ پیش کیا جائے۔ دلیل الطالب ص۳۹

الحمدللہ تعالیٰ کہ قرآن کریم اور سنت رسول اللہ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کے بعد جمہور سلف و خلفؒ کی معیت بھی ہمیں حاصل ہے جو بفحوائے حدیث کبھی گمراہی پر مجتمع نہیں ہو سکتی اور نہ ہوگی۔

مناسب معلوم ہوتا ہے کہ ہم اس آیت کے سلسلہ میں فریق ثانی کی طرف سے قدیماً و حدیثاً جو جو اعتراضات اور معارضات وارد کیے گئے ہیں ان پر بھی طائرانہ نگاہ ڈال لیں کہ ان کی حقیقت کیا ہے ان کو ایک خاص ترتیب سے ہم نقل کرتے ہیں اور ہر ایک کا جواب ساتھ ساتھ عرض کرتے جائیں گے۔ انشاء اللہ العزیز۔

پہلا اعتراض:

مولانا مبارک پوری صاحبؒ لکھتے ہیں کہ علامہ زیلعیؒ نے "نصب الرایہ ج۲ ص۱۴" میں امام بیہقیؒ کے حوالہ سے امام احمد بن حنبلؒ کا جو یہ قول نقل کیا ہے کہ آیت واذا قرئ القرآن کا شان نزول اجماع اور اتفاق سے نماز ہے تو مجھے اس سے اتفاق نہیں ہے۔ کیونکہ میں نے امام بیہقیؒ کی معرفت السنن و الآثار اور کتاب القرأۃ کا مطالعہ کیا ہے لیکن ان میں مجھے یہ قول نہیں مل سکا۔

(تحقیق الکلام جلد ۲ ص۹۵، تحفۃ الاحوذی جلد ۱ ص۲۵۹ و ابکار المنن ص)

جواب:

مبارک پوری صاحبؒ کا یہ اعتراض چند وجوہ سے باطل ہے۔

اوّلاً۔ اس لیے کہ علامہ جمال الدین زیلعیؒ[1] (المتوفی ۷۶۲ھ) نقل میں بڑے محتاط اور ثقہ ہیں اور پھر انھوں نے امام بیہقیؒ کی کسی خاص کتاب کا نام بھی نہیں لیا۔ اور امام بیہقیؒ کثیر التصانیف تھے۔ لہٰذا مبارکپوریؒ صاحب کا ان کی صرف دو یا تین کتابیں دیکھ کر یہ نظریہ قائم کرنا کیوں کر صحیح ہو سکتا ہے؟

---

[1] جو الشیخ الامام، الحافظ اور الحجۃ تھے۔ مولانا عبدالحی صاحبؒ لکھتے ہیں کہ وہ من اعلام العلماء اور فقہ حدیث اور اسماء الرجال کے مسلم امام تھے۔ فوائد البہیہ ص۲۲۳

وثانیاً — نواب صاحبؒ نے تو جمہور کے ساتھ اس امر پر اتفاق کیا ہی تھا کہ عدم علم او علم بعدم نیست۔ (بدور الاہلہ صہ ۲۷۹) مگر مبارک پوری صاحبؒ کو بھی اس کا اقرار ہے کہ عدم نقل عدم وقوع کو مستلزم نہیں (تحقیق الکلام ۲ ص ۱۳۱) اگر مبارکپوری صاحبؒ کو اس کا علم نہیں ہو سکا تو اس کا یہ مطلب تھوڑا ہی ہے کہ یہ جملہ اور قول ہی کتابوں سے نکل کر بھاگ گیا ہے؟

وثالثاً — تنہا علامہ زیلعیؒ ہی اس قول کے ناقل نہیں بلکہ علامہ موفق الدین ابن قدامہؒ (مغنی جلد ۱ صہ ۶۰۵ میں) اور علامہ شمس الدین[2] بن قدامہؒ (شرح مقنع للکبیر جلد ۲ صہ ۱۱ میں) اور حافظ ابن ہمام[3] (فتح القدیر جلد ۱ ص ۲۴۱ میں)، اور ملا علی القاریؒ[4] (شرح نقایہ جلد ۱ ص ۸۳ میں اور شیخ الاسلام ابن تیمیہؒ (اپنے فتاوے میں جیسا کہ گزر چکا ہے) وغیرہ سب اس کو نقل کرتے ہیں۔ مبارک پوری صاحبؒ کو ان کتابوں کی طرف مراجعت کرنی چاہیے تھی تاکہ علامہ زیلعیؒ کے قول کی صداقت معلوم ہو جاتی۔

ورابعاً — لیجیے ہم مبارکپوری صاحبؒ کے ہم مسلک اور ہم مشرب عالم سے یہ متوا دیتے ہیں، مولانا عبد الصمد صاحب پشاوریؒ غیر مقلد نقل کرتے ہیں کہ

والاصح کونها فی الصلوٰۃ لما روی البیہقیؒ عن الامام احمدؒ قال اجمعوا علی انها فی الصلوٰۃ۔ (اعلام الاعلام فی قرأۃ خلف الامام ص۱۹)

صحیح ترین بات یہ ہے کہ آیت واذا قرئ القرآن کا شان نزول ہی نماز ہے جیسا کہ امام بیہقیؒ نے امام احمدؒ سے نقل کیا ہے کہ اس آیت کے نماز کے بارے میں نازل ہونے پر اجماع و اتفاق ہے۔

---

[1] بعض ائمہ نے حدیث قلتین کی تصحیح کی نسبت امام طحاویؒ کی طرف کی تھی۔ مولانا شوق نیمویؒ نے لکھا کہ مجھے شرح معانی الآثار میں تصحیح نہیں مل سکی۔ اس پر مبارک پوری صاحبؒ یوں گرفت کرتے ہیں کہ تصحیح کی نسبت کرنے والوں نے امام طحاوی کی کسی خاص کتاب کا نام نہیں لیا۔ لہٰذا نیموی صاحبؒ کو ان کی دوسری کتابیں دیکھنی چاہیے تھیں۔ (نہ معلوم یہ مفید مشورہ یہاں کیوں بھول گئے ہیں — مگر کیا کیا جائے: ع "تمہیں عادت ہے بھول جانے کی"۔

[2] المتوفی ۶۸۲ھ جو الامام الفقیہ الزاہد الخطیب اور قاضی القضاۃ تھے۔ (مقدمہ مغنی ص ۱۲)

[3] المتوفی ۸۶۱ھ اپنے وقت کے امام محدث اور فقیہ تھے اور ان کا شمار اہل ترجیح میں ہے۔ (فوائد البہیہ ص ۱۸۰)

[4] المتوفی ۱۰۱۴ھ علم و تحقیق کے یگانہ اور محدث و فقیہ تھے۔ (تعلیقات ص ۸)

نوٹ: یہ کتاب نواب صاحبؒ کی مشہور کتاب "لقطۃ العجلان" کے ساتھ منضم ہے۔ اور دونوں یکجا طبع ہوئی ہیں۔ اس سے بڑھ کر ہم مبارک پوری صاحبؒ کو اور کیا ثبوت دے سکتے ہیں؟

دوسرا اعتراض

مبارک پوری صاحبؒ لکھتے ہیں کہ اس آیت کا خطاب مومنوں کو نہیں بلکہ کافروں کو ہے۔ جو تبلیغ کے وقت شور و غل مچایا کرتے تھے اور یہ کہتے تھے کہ قرآن نہ سنو جیسا کہ امام رازیؒ نے اپنی تفسیر (الکبیر جلد ۴ ص ۵۰۲) میں لکھا ہے اور دلیل یہ پیش کی ہے کہ اگر واقعی خطاب مومنوں کو ہوتا تو لَعَلَّکُمْ کے لفظ کی کیا ضرورت تھی؟ کیونکہ یہ لفظ ترجی کے لیے آتا ہے اور مومن بہر حال رحمت خداوندی کا مورد اور مستحق ہیں۔ (تحقیق الکلام جلد ۲ ص و تحفۃ الاحوذی جلد ۱ ص ۲۵۹) اور مولانا میر صاحبؒ لکھتے ہیں اور نہ اس کا خطاب مومنوں سے ہے جس نے اس کا خطاب مومنوں سے سمجھا اس نے سلسلۂ عبارت اور سیاق مضمون پر غور نہیں کیا۔ (تفسیر واضح البیان ص ۵۰۲) اور یہی مضمون کم و بیش مولانا عبد الصمد صاحب پشاوریؒ لکھتے ہیں۔ (اعلام الاعلام ص ۱۹۰) اور یہی عذر لنگ مؤلف خیر الکلام نے کیا ہے۔ (ملاحظہ ہو ص ۳۴۳)

جواب

یہ اعتراض بھی بالکل بے جان اور بے بنیاد ہے۔ اس لیے کہ آپ جناب رسول خدا صلی اللہ تعالیٰ علیہ وآلہ وسلم کے بعد حضرت ابن مسعودؓ سے لے کر قاضی شوکانیؒ تک اکثر حضرات مفسرین کا بلکہ تمام امت کا اجماع و اتفاق سن چکے ہیں کہ اس آیت کا خطاب نہ صرف مومنوں سے ہے بلکہ اس کا شان نزول ہی نماز ہے۔ اس اجماع کے مقابلہ میں ایسے لغو اور پادر ہوا نظریہ اور رائے کو کون سنتا ہے؟ ہم سہولت کے لیے اس اعتراض کا یوں تجزیہ کر سکتے ہیں یہ تجزیہ اس لیے ضروری ہے کہ بات سمجھ آسکے، کہ ان حضرات کے اعتراض کے یا بزعم خود استدلال کے تین مرکزی نقطے ہیں۔ ہم ان کو الگ الگ بیان کر کے ان کا جائزہ لیتے ہیں۔ دعویٰ یہ ہے کہ یہ آیت کافروں کے حق میں نازل ہوئی ہے۔ مومن اس کے مخاطب

نہیں ہیں۔ دلائل یہ ہیں :

(۱) امام رازیؒ نے یوں کہا ہے۔

۲۔ لَعَلَّکُمْ کا لفظ اس کی تائید کرتا ہے۔

۳۔ سیاق وسباق کا تقاضا یہی ہے۔

پہلی جزو کا جواب

یہ ٹھیک ہے کہ حضرت امام رازیؒ (المتوفی ۶۰۶ھ) منطق وفلسفہ اور عقلیات وغیرہ کے مسلّم امام تھے۔ لیکن فنِ روایت اور نقلیات میں ان کا پایہ نہایت کمزور تھا۔ حافظ ابنِ حجرؒ لکھتے ہیں امام رازیؒ عقلیات کے مسلّم امام ہیں، لیکن احادیث وآثار میں ان کا پایہ کمزور ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ان کی تفسیر میں رطب ویابس سبھی کچھ موجود ہے۔ (لسان المیزان جلد۴ ص۴۲۶) امام سیوطیؒ نقل کرتے ہیں کہ تفسیر کبیر میں سبھی کچھ ہے مگر اس میں تفسیر نہیں۔ (درمنثور جلد۳ ص۱۵۵ و اتقان جلد۲ ص ۱۸۹)۔ نواب صدیق حسن خاں صاحب لکھتے ہیں کہ مؤلف وے از علم حدیث بے خبر است ودر علوم کلام وفنون رسمیہ امام اہل زماں بعضے از اہل معرفت بعلوم کتاب وسنت گفتہ اند۔ فیہ کل شیء الا التفسیر۔ (اکسیر ص۱۰۲)

اور دوسرے مقام پر لکھتے ہیں کہ رازیؒ از علم حدیث خبر ندارد (اکسیر ص۱۱۳) فریقِ ثانی ہی ازراہِ انصاف فرمائے کہ قرآن کریم کی مذکورہ آیت کی تفسیر جو حضرات صحابہ کرام رضؓ و تابعینؒ اور جمہور سلف وخلفؒ سے صحیح اسانید سے نقل کی جا چکی ہے (بلکہ اسی پر اُمت کا اجماع ہے اور کسی کا اس میں اختلاف نہیں ہے) وہ قابلِ حجت ہے یا امام رازیؒ کی تفسیر؟ ؎

من نہ گویم کہ ایں بکن آں کُن !

مصلحت بین وکار آساں کُن !

دوسری جزو کا جواب

امام رازیؒ کا لفظ لَعَلَّ سے یہ استدلال کرنا کئی وجوہ سے غلط ہے :

اوّلاً : لفظ لَعَلَّ اگرچہ ترجی کے معنیٰ میں ہے۔ لیکن حضرات مفسرین کرامؒ اور ائمہ نحوؒ اس

امر کی تصریح کرتے ہیں کہ یہ لفظ اللہ تعالیٰ کی طرف سے وجوب کے معنی میں بھی مستعمل ہوتا ہے، علامہ خازنؒ لکھتے ہیں، لَعَلَّ و عسٰی من اللہ واجب (جلد ۲ ص ۲۲۳) اور صاحب مدارک علامہ عبداللہؒ بن احمد النسفیؒ (المتوفی ۷۰۱ھ) لکھتے ہیں کہ

ولعل للترجي والاطماع ولکنه من کریم فیجري مجری وعده المحتوم وفائه وبه قال سیبویهؒ۔

لَعَلَّ کا لفظ ترجی اور طمع دلانے کے لیے آتا ہے۔ لیکن ذاتِ باری سے یہ حتمی اور ضروری وعدہ کے طور پر آتا ہے اور سیبویہؒ اسی کا قائل ہے۔

(مدارک جلد ۱ ص ۲۵)

علامہ جار اللہؒ لکھتے ہیں کہ بادشاہوں کی عادت ہے کہ جب کسی چیز کا وعدہ کرتے ہیں تو اپنی شانِ استغنا کو ملحوظ رکھ کر لَعَلَّ و عسٰی استعمال کرتے ہیں۔ (کشاف جلد ۱ ص ۹۲)

اور مولانا تھانویؒ (المتوفی ۱۳۶۲ھ) لکھتے ہیں: شاہی محاورہ میں لَعَلَّ کے معنی عجب نہیں کے آتے ہیں۔ (بیان القرآن جلد ۱ ص ۱) لہٰذا اگر اللہ تعالیٰ نے اپنی شانِ بے نیازی کے مطابق لعلکم کے لفظ کے ساتھ مومنوں سے خطاب کیا ہے تو اس میں خرابی کیا ہے؟

ثانیاً۔ قرآن کریم میں متعدد مقامات پر مومنوں کے لیے لعلّ کا لفظ استعمال کیا گیا ہے۔ نہ معلوم وہاں یہ منطق کیسے چلے گی؟ ایک مقام پر ارشاد ہوتا ہے کہ اے لوگو! جو ایمان لائے ہو تم پر روزے فرض کیے گئے ہیں جیسے تم سے پہلے لوگوں پر فرض کیے گئے تھے لعلکم تتقون۔ (پ۲۔ بقرۃ) تاکہ تم پرہیزگار بن جاؤ۔

اور ایک مقام پر ارشاد ہوتا ہے کہ رجوع کرو اللہ تعالیٰ کی طرف اے مومنو سب کے سب لَعَلَّکُمْ تُفْلِحُوْنَ۔ (پ۱۸۔ نور ۴) تاکہ تم کامیاب ہو جاؤ۔ اور اس آیت میں خطاب بھی تمام مومنوں کو ہے جب مومن ہیں تو ان کی کامیابی یقینی ہے۔ کیونکہ اللہ تعالیٰ فرما چکا ہے کہ قد افلح المومنون۔ (پ۱۸ المومنون رکوع ۱) تحقیق مومن فلاح پا چکے ہیں۔ اگر لعلکم کے خطاب سے مومن مراد نہیں ہو سکتے تو قرآن کریم کی ان آیات کا کیا مطلب ہو گا؟

اور ایک مقام پر یہ فرمایا ہے کہ اے لوگو! جو ایمان لائے ہو جب جمعہ کے دن نماز کے لیے اذان کہی جائے تو تم جلدی پہنچو۔ آگے ارشاد ہوتا ہے لعلکم تفلحون (پ جمعہ ۲۸) تاکہ تم کامیاب ہو جاؤ۔

وثالثاً۔ اگر یہ تسلیم کر بھی لیا جائے تو کیا قرآن کریم اور صحیح احادیث میں اس کا کوئی ثبوت نہیں کہ بعض مومن اپنی ناشائستہ حرکات کی بنا پر خدا تعالیٰ کی رحمت کے مستحق نہیں رہتے؟ کیا قاتل، چور، شرابی، زانی، راشی اور سود خور وغیرہ کے لیے لعنت اور غضب وغیرہ کے الفاظ قرآن کریم اور حدیث میں وارد نہیں ہوتے؟ اور کیا وہ خدا تعالیٰ کی رحمت کے حقدار اور محتاج نہیں؟ یا ان کے لیے یہ سب کچھ کرنے کے بعد بھی رحمت کے دروازے کھلے اور رحمت واجب ہے؟ اور کیا رحمت کا مستحق صرف کافر ہی ہو سکتا ہے؟

ورابعاً۔ تمام علمائے اسلام کا یہ متفقہ فیصلہ ہے کہ قرآن کریم تمام اقوام عالم کے لیے ایک دستور العمل اور ضابطہ حیات ہے اور قرآن کے کسی حکم اور آیت کو اس کے شان نزول اور خاص سبب پر منحصر کر دینا بالکل بے کار اور بے حقیقت ہے۔ اگرچہ اکثر احکام کے نزول کا کوئی نہ کوئی سبب اپنی جگہ ضرور ہو گا۔ حضرت امام شافعیؒ لکھتے ہیں کہ آیات کے اسباب و شان نزول کچھ ہی ہوں۔ مگر احکام کی دارو مدار الفاظ پر ہے۔ (کتاب الام جلد ۵ ص ۱۴۱)

حافظ ابن تیمیہؒ لکھتے ہیں کہ قرآن کریم کے عمومی احکام کو اسباب نزول پر مقید کر دینا باطل ہے۔ (الصارم المسلول ص ۵۰) حافظ ابن کثیرؒ لکھتے ہیں کہ جمہور علماء اصول و فروع کے نزدیک اعتبار عموم لفظ کا ہے نہ کہ خصوص سبب کا۔ (تفسیر ابن کثیر جلد ۲ ص ۹) حافظ ابن القیمؒ لکھتے ہیں کہ جن اسباب کی وجہ سے عبادات کی مشروعیت ہوتی ہے۔ ان کا دوام شرط نہیں ہے، جیسا کہ طواف میں رمل اور صفا و مروہ پر سعی کا سبب مشرکین کا اعتراض تھا، لیکن باوجود ان مشرکوں کے ختم ہونے کے اس کا حکم قیامت تک باقی رہے گا۔ (بدائع الفوائد جلد ۳ ص ۱۶۱)

حافظ ابن حجرؒ لکھتے ہیں کہ اعتبار عموم لفظ کا ہوتا ہے نہ کہ خصوص مورد کا (فتح الباری جلد ۸ ص ۱۴۱) امام سیوطیؒ لکھتے ہیں کہ اعتبار تعمیم الفاظ کا ہو گا نہ کہ خصوص سبب کا (اتقان جلد ۱ ص ۴۷) قاضی شوکانیؒ لکھتے ہیں کہ عام کو سبب پر بند کر دینا مرجوح اور کمزور مذہب ہے۔ (نیل الاوطار جلد ۲ ص ۱۲۹)

نواب صدیق حسن خان صاحب لکھتے ہیں کہ خصوص سبب کا کوئی اعتبار نہیں ہوتا بلکہ اعتبار عموم لفظ کا ہو گا۔ (دلیل الطالب ص ۴۱۲) اور دوسرے مقام پر لکھتے ہیں: وعبرت

بعموم لفظ است نہ بخصوص سبب، چنانکہ در اصول متقرر است (بدور الاہلہ ص۲۰۹)

مولانا عبدالصمد پشاوریؒ لکھتے ہیں کہ والحق ان المقرر اعتبار عموم المبنی و لوخص سببہ (اعلام الاعلام ص ۱۹۰) اور اس قاعدہ کو مبارک پوری صاحبؒ بھی صاف لفظوں میں تسلیم کرتے ہیں (دیکھئے تحقیق الکلام جلد ۲ ص ۱۶۳) مؤلف خیر الکلام نے پہلے تو لاجواب ہو کر اِدھر اُدھر کی بے کار باتیں کی ہیں پھر اقرار پر بھی مجبور ہو گئے ہیں۔

چنانچہ لکھتے ہیں کہ یہ آیت نماز کو بھی شامل ہے خواہ اس طرح شامل ہو کہ اس آیت میں مقتدیوں کو خطاب ہو یا سب مسلمانوں کو جس میں مقتدی بھی داخل ہیں یا اس طرح شامل ہو کہ خطاب تو کفار کو ہو مگر نمازی اور سب مسلمان عموم علت کی بنا پر داخل ہوں۔ (اھ ص ۳۴۸)

اگر بالفرض آیت مذکورہ کا شانِ نزول صحیح روایات اور آثار سے نماز نہ بھی ثابت ہوتا۔ بلکہ یہ آیت کافروں کے حق میں ہی نازل ہوتی۔ تب بھی اس کو کافروں پر منحصر سمجھنا اور مسلمانوں اور مومنوں کو اس سے خارج کر دینا باطل ہے۔ حالانکہ اس کا شانِ نزول ہی (مومن اور نماز ہے۔ مگر افسوس ہے کہ فریقِ ثانی یہ کہتا ہے کہ اس آیت کا جو اوّلین سبب اور مصداق تھا۔ اس کو یہ آیت شامل نہیں ہے۔ یہ تو صرف کافروں کو شامل ہے۔ حیرت اور تعجب ہے اس غلط نظریہ پر۔

وخامسًا۔ اگر فریقِ ثانی کی یہی منطق صحیح تسلیم کر لی جائے تو نہ معلوم ان کا قرآنِ کریم کے ان عمومی احکام کے بارے میں کیا ارشاد ہو گا جو بظاہر ایک کافر اور مشرک قوم کے بارے میں نازل ہوئے تھے۔ مثلاً ایک مقام پر اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے کہ اے نبیؐ آپ اِن کافروں سے کہہ دیجیے کہ آؤ میں تمھیں وہ چیزیں پڑھ کر سناؤں، جو تمھارے رب نے تم پر حرام کی ہیں۔ اللہ تعالیٰ کے ساتھ کسی کو شریک نہ ٹھہراؤ۔ قتلِ اولاد کا ارتکاب نہ کرو۔ فواحشات کے قریب نہ جاؤ۔ خُون ناحق نہ کرو۔ یتیم کا مال نہ کھاؤ وغیرہ وغیرہ۔ (پارہ ۸، سُورۂ انعام) کیا یہ کہنا سچا اور صحیح ہو گا کہ یہ احکام تو کافروں اور مشرکوں کے حق میں نازل ہوئے ہیں۔ لہٰذا مومن کے لیے شرک کرنا، قتل کرنا اور یتیم کا مال ہڑپ کر لینا بالکل جائز ہے؟ فریقِ ثانی نے یہ عجیب قاعدہ نکالا ہے۔ ہو سکتا ہے وہ فرما دیں کہ ہم تو گروہ بندی کا

شکار ہو کر قاعدہ سے بے نیاز ہیں ؎

کس طرح فریاد کرتے ہیں بتادو قاعدہ   اے اسیرانِ قفص میں نوگرفتاروں میں ہوں

تیسری جزو کا جواب

ہو سکتا ہے کہ نمیر صاحبؒ کا سیاق و سباق کے بارے میں قاعدہ ہی کوئی نرالا اور ماوراء الادراک ہو اور ہم اس کو نہ سمجھ سکیں۔ لیکن بحمد اللہ تعالیٰ اس آیت کا سیاق اور سیاق ہم بیان کر سکتے ہیں اور نمیر صاحب کو فکر و غور کی دعوت دیتے ہیں اور مخلصانہ اپیل کرتے ہیں کہ وہ ارشاد فرمائیں کہ غور کس نے نہیں کیا ؟

اہلِ ایمان کے تین درجے ہو سکتے ہیں۔ اعلیٰ ، متوسط اور ادنیٰ۔ جو لوگ توحید و معرفت کے تمام زینوں کو طے کرکے اس مقام پر فائز ہو جاتے ہیں کہ کارخانہ زمین و آسماں کی علوی اور سفلی چیزیں مشاہدہ کے طور پر ان کے سامنے آجاتی ہیں اور وہ عین الیقین تک پہنچ جاتے ہیں تو ایسے لوگ اصحاب بصیرت کہلاتے ہیں اور جو لوگ نظر و استدلال سے کسی حقیقت تک پہنچنے کی اہلیت رکھتے ہیں اور وہ علم الیقین کے درجہ تک پہنچ کر خود ان کا قدم ہدایت سے ایک انچ نہیں ہٹتا اور لوگوں کی ہدایت کا ذریعہ بنتے ہیں تو وہ ہادی اور مہدی کہلاتے ہیں اور جن کو نہ پہلا درجہ حاصل ہوتا ہے اور نہ دوسرا ، صرف یہی جانتے ہیں کہ حق تعالیٰ کے احکام کے سامنے سرِ تسلیم خم کرنا ہے وہ گروہ عامۃ المومنین کا ہے ، جن کو حق الیقین کا مرتبہ حاصل ہوتا ہے اور وہ اپنی استعداد اور قابلیت کے مطابق رحمت کے امیدوار ہوتے رہتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ ارشاد فرماتا ہے کہ

هٰذَا بَصَآئِرُ مِنْ رَّبِّكُمْ وَهُدًى وَّرَحْمَةٌ لِّقَوْمٍ يُّؤْمِنُوْنَ۔ وَاِذَا قُرِئَ الْقُرْاٰنُ فَاسْتَمِعُوْا لَهٗ وَاَنْصِتُوْا لَعَلَّكُمْ تُرْحَمُوْنَ۔ (پ ۹ ، اعراف ۲۴)

یہ سمجھ کی باتیں ہیں تمہارے رب کی طرف سے اور ہدایت و رحمت ہے اُن لوگوں کے لیے جو مومن ہیں اور جس وقت قرآن کریم پڑھا جائے تو اس کی طرف کان لگاتے رہو اور چپ رہو تاکہ تم پر رحم ہو۔

اللہ تعالیٰ نے مومنوں کے تین طبقوں کی خوبیوں کو علی الترتیب هٰذا بصائر من ربکم و ھدی و رحمۃ کے ارشاد سے بیان فرما کر لقوم یؤمنون کہہ کر سب کو مومن کا خطاب

اور لقب عطا فرمایا ہے اور آگے قرآن کریم کی طرف توجہ کرنے اور خاموش رہنے کا حکم دیا ہے۔ اس سے زیادہ صحیح اور مضبوط ربط اور کیا ہو سکتا ہے کہ پہلی آیت لقوم یومنون۔ پر ختم ہوتی ہے اور دوسری واذا قریٔ القراٰن الآیۃ سے شروع ہوتی ہے۔ پہلی آیت میں مومنوں کے تین طبقوں کی خوبیوں کا ذکر ہوتا ہے اور دوسری آیت میں بصیرت، ہدایت اور رحمت کے سرچشمے قرآنِ کریم کا ذکر ہوتا ہے۔ پہلی آیت میں اللہ کی رحمت کا ذکر ہے اور دوسری میں لعلکم ترحمون سے مستحقین رحمت کا تذکرہ ہے۔ اس سے بڑھ کر اس مضمون کا اپنے سیاق و سباق سے اور کیا تعلق ہو سکتا ہے؟ اور تمام اہل اسلام اور جملہ معتبر مفسرین کرامؒ اس کا یہی سلسلہ اور تعلق سمجھے ہیں۔ خوفِ طوالت سے صرف دو شہادتیں ہی نقل کی جاتی ہیں۔ ملاحظہ کیجیے:

علامہ خازنؒ لکھتے ہیں کہ

واذا قریٔ علیکم ایھا المؤمنون القراٰن فاستمعوا لہٗ یعنی اصغوا الیہ باسماعکم لتفھموا معانیہ وتتدبروا مواعظہ وانصتوا یعنی عند قراٗتہٖ۔ (تفسیر خازن جلد ۲ ص۲۷۵)	اے مومنو! جب تم پر قرآن کریم پڑھا جائے تو تم اس کی طرف توجہ کرو یعنی بگوش ہوش اس کی طرف مائل ہو جاؤ تاکہ تم اس کے معانی سمجھو اور اس کی نصائح سے تدبر اور غور کر کے فائدہ حاصل کرو اور اس کی قرأت کے وقت خاموش رہو۔

اور حافظ ابن کثیرؒ لکھتے ہیں کہ کافر لوگ قرأتِ قرآن کے وقت شور و غل مچایا کرتے تھے۔

وقد امر اللہ عبادہ المؤمنون خلاف ذٰلک فقال واذا قریٔ القراٰن فاستمعوا لہ وانصتوا لعلکم ترحمون (تفسیر ابن کثیر جلد ۲ ص۸۹)	لیکن اللہ تعالیٰ نے اپنے مومن بندوں کو اس کے خلاف حکم دیا ہے کہ جب قرآنِ کریم پڑھا جاتا ہو تو تم اس کو سنو اور خاموش رہو تاکہ تم پر رحم ہو۔

اور اس کے بعد اللہ تعالیٰ نے تمام مومنوں کے سردار سید الانبیاء و امام المرسلین و خاتم النبیین حضرت محمد صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کو خطاب کیا ہے کہ آپ اپنے رب کو دل میں عاجزی اور زاری کرتے ہوئے صبح و شام یاد کرتے رہیں گو خطاب آپ کو ہے لیکن گفتہ آید در حدیثِ دیگراں کے قاعدہ کے مطابق حکم سب کو دیا گیا ہے۔

بہرحال اس آیت سے قبل بھی مومنوں کا ذکر ہے اور بعد بھی اکمل ترین مومن سے خطاب

ہے۔میر صاحب کو اس سے بہتر سیاق و سباق کہاں سے ملیگا مگر ہاں یہ بات الگ ہے کہ مسلم کا کوئی جواب نہیں ہے۔ بفضلہٖ تعالیٰ ہم نے تو حق وفا ادا کر دیا ہے شاید آپ فرماویں ؎

پلک کر کہہ رہا ہے جانے کیا کیا تیرے گوشے میں
عجب انداز ہے اس کا یہ کوئی دل جلا ہوگا۔

تیسرا اعتراض:

مبارک پوری صاحبؒ (وغیرہ) لکھتے ہیں کہ اس آیت کا شانِ نزول خطبہ ہے جیسا کہ امام بیہقیؒ نے (کتاب القراۃ ص ۵۷ میں) لکھا ہے۔ لہٰذا اس آیت سے قرأت خلف الامام کے عدم جواز پر استدلال صحیح نہیں ہے۔ (ابکار المنن ص۱۴۵)

جواب

یہ اعتراض بھی بے حقیقت اور بے کار ہے؛ اوّلاً: اس لیئے کہ دلائل اور براہین سے یہ ثابت کیا جا چکا ہے کہ اس آیت کا شانِ نزول ہی نماز ہے۔ خطبہ وغیرہ اس کے عمومی اور ضمنی حکم میں شامل ہے۔

وثانیاً ۔ خطبہ سے اگر جمعہ کا خطبہ مراد ہو تو امام بغویؒ کے حوالہ سے پہلے عرض کیا جا چکا ہے کہ جمعہ کی فرضیت مدینہ میں ہوتی ہے اور آیت مکّی ہے۔ اور امام ابن حجرؒ لکھتے ہیں کہ جمعہ کی فرضیت ؁ میں ہوئی ہے حالانکہ آیت مذکورہ بالاتفاق مکّی ہے اور مولانا عبد الصمدؒ لکھتے ہیں کہ جو لوگ اس آیت کا شانِ نزول خطبہ بتلاتے ہیں وہ سخت غلطی پر ہیں کیونکہ یہ آیت مکّی ہے اور خطبہ کا حکم مدینہ میں ہوا ہے۔ (اعلام الاعلام ص۱۸۹) اور اگر خطبہ سے مراد عید کا خطبہ ہے تو وہ بھی صحیح نہیں کیونکہ عید کی نماز کا حکم بھی مدینہ طیبہ میں ہوا تھا۔ (طبری ص ۱۲۸۱)

وثالثاً ۔ اگر بالفرض یہ تسلیم بھی کر لیا جائے کہ اس آیت کا شانِ نزول جمعہ یا عید کا خطبہ ہے۔ تو اس سے نماز کو بالیقین خارج کرنا کیونکر صحیح ہو سکتا ہے؟ جب کہ امت کا ایک معتد بہ طبقہ اس کا قائل ہے کہ اسبابِ نزول میں تعدد بھی جائز ہے جیسا کہ شیخ عبد الرحمٰن بن حسنؒ نے اس کی تصریح کی ہے۔ (فتح المجید شرح کتاب التوحید ص۵۷)

اور صحیح[1] احادیث سے اس کی تائید بھی ہوتی ہے۔ لہٰذا اگر اس کا شانِ نزول خطبہ بھی ہو اور نماز بھی ہو تو اس میں کیا قباحت ہے؟ اور یہ پہلے لکھا جا چکا ہے کہ اعتبار عموم الفاظ کا ہو گا نہ کہ خصوص سبب کا۔ الحاصل یہ اعتراض نقلاً و عقلاً ہر لحاظ سے مردود ہے اور ایک بھی صحیح روایت اس کی تائید نہیں کرتی کہ آیت مذکورہ کا شانِ نزول خطبہ ہے۔ روایات پر بحث اپنے مقام پر آئے گی۔ رہی یہ بات کہ یہ نظریہ امام بیہقیؒ ایسے مشہور امام کا ہے تو یہ کوئی وزنی دلیل نہیں ہے۔ چنانچہ مبارکپوری صاحبؒ ایک مقام پر تحریر کرتے ہیں کہ امام بیہقیؒ اگرچہ ایک مشہور محدث ہیں۔ مگر ان کا کوئی قول بلا دلیل معتبر نہیں ہو سکتا۔ (بلفظہٖ تحقیق الکلام جلد ۲، ص ۳۲)

---

[1] مثلاً بخاری جلد ۲ ص ۶۸۶ و مسلم جلد ۱ ص ۱۸۳ و ابو عوانہ جلد ۲ ص ۱۲۳ و نسائی جلد ۱ ص ۱۱۶ اور مسند احمد جلد ۱ ص ۲۱۵ وغیرہ میں آیت ولا تجهر بصلاتك ولا تخافت بها... الآية کا شانِ نزول نماز بیان کیا گیا ہے۔ اور بخاری جلد ۲ ص ۶۸۶ و مسلم جلد ۱ ص ۱۸۳ اور ابو عوانہ جلد ۲ ص ۱۲۳ میں اسی آیت کا شانِ نزول دعا بتلائی گئی ہے اور محققین کی تصریح ہے کہ یہ تعدد اسباب نزول کا واضح ثبوت ہے۔

فائدہ: یہ تو آپ پہلے پڑھ چکے ہیں کہ آیت مذکورہ کا صحیح اور حقیقی شانِ نزول نماز اور صرف نماز ہے۔ اور جن حضرات نے یہ کہا ہے کہ اس آیت کا شانِ نزول خطبہ ہے تو وہ صرف اس مفہوم کے اعتبار سے کہ اس آیت کا مضمون عموم الفاظ کے لحاظ سے خطبہ کو بھی شامل ہے۔ گویا یہ بھی اس کا شانِ نزول ہے۔ چنانچہ امام سیوطیؒ (تفسیر اتقان جلد ۱ ص ۳۱ میں) اور شاہ ولی اللہ صاحبؒ (الفوز الکبیر ص ۲۲ میں) اور نواب صدیق حسن خاں صاحبؒ لکھتے ہیں: "و قسمے آنست کہ معنی آیت خود تام است بغیر احتیاج دانستن حادثہ کہ سبب نزول شدہ است و حکم عموم لفظ راست نہ خصوص سبب را قدمائے مفسرین بقصد احاطۂ آثار مناسبہ بآں آیت یا بقصد بیان ماصدق آں عموم آں قصہ را ذکر کردہ اند۔ ایں قسم را ذکر کردن ضرور نیست۔ و صحابہؓ و تابعینؒ بسیار بود کہ نزلت فی کذا و کذا می گفتند و غرض ایشاں تصویر ماصدق آں آیت بود و ذکر بعض حوادث کہ آیت آں را بہ عموم خود شامل شدہ است خواہ ایں قصہ متقدم باشد یا متاخر و خواہ اسرائیلی باشد......... یا جاہلی یا اسلامی تمام قیود آیت را در گرفتہ باشد یا بعض آں را و ازیں جا دانستہ شد کہ اجتہاد را دریں قسم دخلی ہست و قصص متعددہ را آں جا گنجائش ہست پس ہر کہ ایں نکتہ مستحضر دارد حل مختلفات سبب نزول بادنیٰ عنایت میتواں نمود۔ (اکسیر ص ۱۹) بہر حال شانِ نزول اس موقع میں گو نماز ہے لیکن خطبہ بھی ماصدق آں آیت کا مصداق ہے۔

چوتھا اعتراض

مبارکپوری صاحبؒ لکھتے ہیں کہ آیت واذا قرئ القرآن .... الآیۃ قرآن کریم کی دوسری آیت فاقرؤا ماتیسر من القرآن .... الآیۃ سے منسوخ ہے۔ لہٰذا اس سے مسئلہ خلف الامام کیسے ثابت ہوگا اور اس دعویٰ کے دلائل یہ ہیں:

۱۔ امام ابونصر مروزیؒ (المتوفی ۲۹۴ھ) لکھتے ہیں کہ آیت فاقرؤا .... الآیۃ مدینہ میں نازل ہوئی ہے کیونکہ اس آیت میں جہاد اور قتال کا حکم ہے اور جہاد کی فرضیت مدینہ میں ہوئی ہے۔ (قیام اللیل[1])

۲۔ امام سیوطیؒ نقل کرتے ہیں کہ باقی تمام سورۂ مزمل مکہ مکرمہ میں نازل ہوئی ہے۔ مگر فاقرؤا ما تیسر .... الآیۃ (تفسیر اتقان جلد ۱ ص ۱۳)

۳۔ حافظ ابن حجرؒ لکھتے ہیں کہ زکوٰۃ مدینہ طیبہ میں فرض ہوئی ہے اس کی دلیل یہ ہے کہ روزے بالاتفاق مدینہ فرض ہوئے ہیں اور حضرت قیسؓ بن سعد فرماتے ہیں کہ زکوٰۃ کی فرضیت سے قبل ہمیں صدقہ فطر ادا کرنے کا حکم تھا۔ جب زکوٰۃ فرض ہوئی تو نہ ہمیں فطرانہ ادا کرنے کا تاکیدی حکم دیا گیا اور نہ اس سے منع کیا گیا۔ (فتح الباری جلد ۴ ص ۱۱) اور اس آیت فاقرؤا ماتیسر .... الآیۃ میں زکوٰۃ کا حکم بھی ہے۔ اور زکوٰۃ صدقہ فطر کے بعد فرض ہوئی اور صدقہ فطر صوم رمضان کا تتمہ ہے۔ اس سے معلوم ہوا کہ آیت فاقرؤا ماتیسر .... الآیۃ مدنی ہے۔ لہٰذا یہ ناسخ اور آیت واذا قرئ القرآن .... الآیۃ منسوخ ٹھہری اور منسوخ آیت سے استدلال اور احتجاج باطل ہے۔

(او کما قال تحقیق الکلام ۲ ص ۳۶)

جواب: یہ دعویٰ بھی قطعاً باطل اور بے بنیاد ہے۔ ترتیب وار ہر ایک شق کا جواب ملاحظہ فرمائیں۔

پہلی شق کا جواب: حافظ ابن حجرؒ لکھتے ہیں کہ امام ابونصرؒ کا یہ دعوے غلط ہے۔ اس لیے کہ تمام اہل اسلام اس پر متفق ہیں کہ سورۂ مزمل کی آخری آیت بھی مکی ہے۔ امام ابونصرؒ کو قتال اور جہاد کے حکم سے جو شبہ ہوا ہے۔ وہ مردود ہے۔ کیونکہ اس میں ارشاد یوں ہوتا ہے۔

---

[1] ان کی یہ روایت نسائی جلد ۱ ص ۲۶۹، ابن ماجہ ص ۱۳۲، طیالسی ص ۱۶۸ اور مستدرک جلد ۱ ص ۴۱۰ وغیرہ میں مروی ہے۔

عَلِمَ اَنْ سَیَکُوْنُ مِنْکُمْ مَّرْضٰی وَاٰخَرُوْنَ یَضْرِبُوْنَ فِی الْاَرْضِ ... الاٰیۃ

اللہ تعالیٰ کو علم ہے کہ عنقریب تم میں بعض آدمی بیمار ہوں گے اور بعض دیگر اللہ تعالیٰ کے راستہ میں نکلیں گے۔

اور بیماری وسفر میں پابندی کے ساتھ تہجد کی نماز ادا نہیں ہو سکے گی۔ اس کی تاکید اللہ تعالیٰ نے ساقط کر دی ہے اور اس آیت میں سَیَکُوْنَ (حرف سین جو استقبال کے لیے آتا ہے) سے خوشخبری سنا کر وجود[1] مشقت سے پہلے ہی تہجد کی نماز کی فرضیت ساقط کر دی گئی ہے۔ اس سے یہ کیونکر ثابت ہوا کہ جہاد اور قتال کا حکم اس وقت نازل ہو چکا تھا؟ بہر حال آیت مکہ مکرمہ میں نازل ہوئی ہے اور اس میں زمانہ مستقبل میں جہاد اور قتال کے حکم کی خوشخبری سنائی گئی ہے اگر امام ابونصرؒ سیکون میں حرف سین پر ہی نگاہ ڈال لیتے جو استقبال کے لیے آتا ہے تو ایسی فاحش غلطی کا ارتکاب نہ کرتے اور نہ اس آیت کو مدنی کہنے پر مجبور ہوتے۔ (فتح الباری جلد ۱ ص ۳۹۲)

دوسری شق کا جواب: امام سیوطیؒ نے یہ قول نقل کیا ہے لیکن پورے زور کے ساتھ اس کی تردید بھی کی ہے اور لکھتے ہیں کہ جو لوگ یہ کہتے ہیں کہ سورۃ مزمل کی آخری آیت مدینہ میں نازل ہوئی ہے تو وہ غلط فہمی کا شکار ہیں۔ کیونکہ حضرت عائشہ[2] رضی اللہ عنہا سے روایت ہے کہ سورۃ مزمل کا آخری حصہ پہلے حصہ کے نزول کے پورے ایک سال بعد نازل ہوا ہے۔ (تفسیر اتقان جلد ۱ ص ۳۸) اور سورۃ مزمل قرآن کریم کی ابتدائی سورتوں میں سے ایک ہے چنانچہ مبارک پوری صاحب لکھتے سب سے پہلے سورۃ قلم نازل ہوئی اور اس کے بعد سورۃ مزمل۔ (تحقیق الکلام جلد ۲ ص ۲۸)

---

[1] اگر کسی کو یہ شبہ ہو کہ وجود مشقت سے قبل تنسیخ صحیح نہیں یا اس میں تردد ہو تو اس کو معراج کی وہ طویل حدیث پڑھنی چاہیے جس میں پچاس نمازوں کی فرضیت کے بعد وجود مشقت سے قبل ہی باقی سب نمازیں معاف کر کے صرف پانچ ہی باقی رکھی گئیں ہیں۔

[2] ان کی یہ روایت مسلم جلد ۱ ص ۲۵۶، نسائی جلد ۱ ص ۱۸۲، ابوعوانہ جلد ۲ ص ۳۲۲ اور مستدرک جلد ۱ ص ۵۰۴ وغیرہ میں صحیح سند کے ساتھ مروی ہے اور اسی مضمون کی روایت حضرت ابن عباسؓ سے بھی مروی ہے۔ مستدرک جلد ۲ ص ۵۰۵ و سنن الکبریٰ جلد ۲ ص ۵۰۰۔ الغرض یہ صحیح روایتیں ابن عرسؒ کی اس روایت سے جس میں یونسؒ بن حبیبؒ وغیرہ راوی موجود ہیں جن کا اتا پتا کتب رجال سے نہیں ملتا۔ بدرجہا زیادہ قابل اعتماد ہیں۔

جب صحیح روایت سے یہ ثابت ہو گیا کہ سورۃ مزمل من و عن سب کی ہے تو اس کو مدنی کہنا کیونکر صحیح ہو سکتا ہے؟

تیسری شق کا جواب: یہ دعویٰ کرنا کہ زکوٰۃ کی فرضیت مدینہ میں ہوئی صحیح نہیں ہے حقیقت یہ ہے کہ نفس زکوٰۃ کا حکم مکہ مکرمہ میں نازل ہو چکا تھا۔ کیونکہ سورۃ مومنون، سورۃ حم سجدہ اور سورۃ لقمان وغیرہ تمام مکی سورتوں میں زکوٰۃ کا حکم موجود ہے پھر یہ کس طرح صحیح ہو سکتا ہے کہ زکوٰۃ مکہ میں فرض نہیں ہوئی تھی۔ باقی یؤتون الزکوٰۃ کو تزکیۂ نفس پر حمل کرنا تاویل بعید اور توجیہ رکیک کے علاوہ کچھ نہیں ہے اور حضرت جعفر طیارؓ نے دربار نجاشیؓ میں جو تقریر کی تھی اس میں زکوٰۃ کا ذکر موجود ہے حالانکہ مہاجرین حبشہ ۵ نبوت میں ہجرت کر گئے تھے۔ (طبری ص ۱۱۸، زاد المعاد جلد ۲ ص ۶۱)

امام الائمہ ابن خزیمہؒ المتوفی ۳۱۱ھ کہتے ہیں کہ زکوٰۃ مکہ مکرمہ میں فرض ہو چکی تھی۔ (فتح الباری ج ۳ ص ۲۱۱)

امام رازیؒ لکھتے ہیں کہ زکوٰۃ مکہ میں فرض ہو چکی تھی۔ (تفسیر کبیر جلد ۴ ص ۲۳۵) سید آلوسیؒ لکھتے ہیں کہ اکثر علما کی تحقیق یہ ہے کہ زکوٰۃ مکہ میں فرض ہو چکی تھی۔ (روح المعانی جلد ۱۹ ص ۱۴۱) حافظ ابن کثیرؒ لکھتے ہیں کہ سورۂ مزمل کی آخری آیت ان لوگوں کی تائید کرتی ہے جو یہ کہتے ہیں کہ نفس زکوٰۃ تو مکہ میں فرض ہو چکی تھی لیکن اس کے نصاب اور مقدار کی تعیین مدینہ طیبہ میں ہوئی ہے۔

(تفسیر ابن کثیر جلد ۴ ص ۴۳۹)

حضرت ابن عمرؓ کے بیان سے معلوم ہوتا ہے کہ زکوٰۃ کی مقدار اور تعیین نصاب سے پہلے اپنی ضرورت سے زائد سب مال صرف کر دینے کا حکم تھا۔ (فتح الباری جلد ۳ ص ۲۱۶) اس تحقیق کو پیش نظر رکھنے کے بعد حضرت قیسؓ بن سعد کی روایت کا مطلب یہ ہوگا کہ زکوٰۃ کے نصاب اور مقدار کی تعیین سے قبل صدقۂ فطر کی اس لیے تاکید کی جاتی تھی تاکہ فقراء اور مساکین کی امداد اور اعانت

لہ یہ روایت ابوداؤد جلد ۱ ص ۱۹۲ میں مختصراً اور مسند احمد جلد ۵ ص ۲۹۱ اور مستدرک جلد ۲ ص ۳۱۰ وغیرہ میں مفصلاً موجود ہے۔ قال الحاکمؒ والذہبیؒ علی شرطہما۔

لہ یہ بات بھی نہ بھولیے کہ صحابہ کرامؓ کی مکی زندگی اور مدینہ طیبہ کا ابتدائی دور غربت اور افلاس کا دور تھا اس میں زکوٰۃ کے نصاب اور مقدار کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ لہٰذا صدقہ فطر کے تاکیدی حکم سے اس کی تلافی کر دی گئی تھی۔

بخوبی ہوسکے اور جب ۸ھ سے لگ بھگ زکوٰۃ کا نصاب اور مقدار مقرر ہوئی تو صدقہ فطر کا وہ تاکیدی اور فرضی حکم باقی نہ رہا۔ گو روزہ و صدقہ فطر کا حکم اور زکوٰۃ کا نصاب اور مقدار کی تعیین مدینہ طیبہ میں ہوئی اور صدقہ فطر بعض ائمہؒ کی تحقیق میں اب بھی واجب ہے مگر فرض نہیں۔

اس بحث کو ملحوظ نظر رکھتے ہوئے مبارک پوری صاحبؒ کی ستم ظریفی دیکھیے کہ وہ کس بے باکی سے یہ لکھتے ہیں کہ اندرونی اور بیرونی شہادتوں سے معلوم ہوتا ہے کہ فاقرؤا ما تیسّر... الآیۃ مدنی ہے۔ (تحقیق الکلام جلد ۲ ص ۱۳۶) فوا اسفا آپ دلائل واضحہ کے ساتھ یہ معلوم کر چکے ہیں کہ اندرونی اور بیرونی عقلی اور نقلی شہادتوں سے فاقرؤا ما تیسّر.... الآیۃ کا مکی ہونا ثابت ہو چکا ہے۔

پانچواں اعتراض

مبارک پوری صاحبؒ لکھتے ہیں کہ اگر یہ بات تسلیم بھی کر لی جائے کہ فاقرؤا ما تیسّر... الآیۃ سے واذا قرئ القرآن... الآیۃ منسوخ نہیں۔ لیکن اس میں نسخ کا احتمال تو موجود ہے۔ جب اس میں یہ احتمال موجود ہے تو اس سے استدلال کیسے؟ (تحقیق الکلام جلد ۲ ص ۱۳۶)

جواب: یہ اعتراض بھی مردود ہے۔

اولاً۔ اس لیے کہ نسخ کا مسئلہ بڑا اہم ہے۔ وہ محض بے بنیاد احتمالات سے ثابت نہیں ہو سکتا بلکہ اس کے اثبات کے لیے قطعی، محکم اور اٹل دلائل کی ضرورت ہے اور صرف ظن اور تخمین سے قرآن کریم کی کوئی آیت منسوخ نہیں ہو سکتی۔

وثانیاً۔ یہ احتمال صرف مبارکپوری صاحبؒ کے خیال مبارک میں ہی آیا ہے یا امام احمدؒ بن حنبلؒ، حافظ ابن عبد البرؒ اور شیخ الاسلام ابن تیمیہؒ وغیرہ بلکہ جمہور سلف و خلفؒ کو بھی یہ نکتہ یاد آیا ہے؟ اگر یہ احتمال کسی دلیل و برہان پر مبنی ہوتا تو جمہور اہل اسلام کا اس آیت سے استدلال کیسے صحیح ہوتا ہے اور باوجود ان حضرات کے علم کی گہرائی کے اس احتمال کی طرف ان کا ذہن کیوں نہ گیا؟

وثالثاً۔ خود مبارکپوری صاحبؒ لکھتے ہیں کہ آیت فاقرؤا ما تیسّر سے قرأت کی فرضیت ثابت نہیں ہو سکتی۔ (تحفۃ الاحوذی جلد ا ص ۲۰۷) تو اس آیت سے ہر ہر مقتدی کی قرأت کے وجوب پر استدلال کیونکر درست ہوا؟ اور آیت واذا قرئ القرآن ... الآیۃ اس سے منسوخ کیسے ٹھہری؟ کیونکہ اس میں استماع اور انصات کا حکم سب مقتدیوں پر بہر حال واجب اور

لازم ہے اور فاقرؤا سے فرضیت ہی ثابت نہیں ہے۔

ورابعًا۔ مبارک پوری صاحب لکھتے ہیں کہ سورۃ مزمل پہلے نازل ہوئی ہے۔ (جس میں فاقرؤا ما تیسّر کی آیت ہے) اور سورۃ اعراف بعد کو نازل ہوئی ہے (جس میں واذا قرئ القراٰن ... الآیۃ ہے۔ (تحقیق الکلام جلد ۲ ص ۲۹) اور پہلے ثابت کیا جاچکا ہے کہ مزمّل کا آخری حصّہ بھی مکّی ہے اور اوّل و آخر میں صرف ایک سال کا وقفہ ہے۔ پھر محض خیال سے متاخر سورت کو متقدم سے منسوخ کرنے کا کیا مطلب ؟

وخامسًا۔ نواب صاحب شورہ اعراف کے متعلق لکھتے ہیں کہ دروے یک آیت یا دو آیت منسوخ است باقی ہمہ محکم۔ اوّل۔ خذ العفو و أمر بالعرف۔ دوم۔ واعرض عن الجٰھلین (افادۃ الشیوخ ص ۶۵) تو محکم آیات کے منسوخ ہونے کا کیا معنٰی ؟

چھٹا اعتراض: مولانا میر صاحب سیالکوٹی رح لکھتے ہیں کہ ان دونوں آیتوں میں احناف کے نزدیک تعارض ہے۔ جیسا کہ ملّا جیونؒ اور صاحب تلویحؒ نے لکھا ہے۔ لہٰذا اس تعارض کے ہوتے ہوئے استدلال صحیح نہیں ہو سکتا۔ (تفسیر واضح البیان ص ۲۳۸) مبارک پوری صاحبؒ نے بھی اس کا تذکرہ کیا ہے۔ (تحقیق الکلام جلد ۲ ص ۲۸، ابکار المنن ص ۱۴۸ و تحفۃ الاحوذی جلد ۱ ص ۲۵۸)

جواب :

بلاشک ملّا جیونؒ حنفی تھے لیکن مدار صرف دلائل پر ہے شخصیتوں پر نہیں ہے اور تلویح کے کے مصنف علامہ سعدالدین تفتازانیؒ (المتوفی ۷۹۱ ھ) حسب تصریح علامہ حسن چلپیؒ (المتوفی ۸۸۶ ھ) وعلامہ سیوطی رح (المتوفی ۹۱۱ ھ) وعلامہ محمود الکفوی رح (المتوفی ۹۹۰ ھ) وعلامہ کاتب چلپی رح (المتوفی ۱۰۶۷ ھ صاحب کشف الظنون) شافعی المسلک تھے۔ احناف میں ان کا شمار غلط ہے لیکن دیکھنا یہ ہے کہ تعارض کے لیے شرائط کیا ہیں ؟ حافظ ابن حجر رح (شرح نخبۃ الفکر ص ۴۷ میں) بیان کرتے ہیں کہ تعارض کی شرطیں یہ ہیں:

۱۔ دونوں حکموں کا محل ایک ہو۔

۲۔ تقدم اور تاخر معلوم نہ ہو سکے۔

۳- ایک کو دوسرے پر ترجیح نہ دی جاسکے۔

۴- دونوں میں تطبیق نہ ہو سکے۔ مگر ان دونوں آیتوں میں تعارض کی ایک شرط بھی موجود نہیں ہے۔

دونوں کا محل جُدا جُدا ہے: ہم عرض کر چکے ہیں کہ حضرت ابن عباسؓ وغیرہ تصریح کرتے ہیں کہ آیت واذا قرئ القرآن کا شانِ نزول فرضی نماز ہے اور آیت فاقرؤا ما تیسّر کا محل نماز تہجد ہے جیسا کہ ابوداؤد جلد ا ص ۱۹۲ اور عون المعبود جلد ا ص ۵۰۳ وغیرہ میں اس کی تصریح ہے اور امام بیہقی رحہ لکھتے ہیں: وھذا معروف مشھور فیما بین اھل العلم۔ (کتاب القرأۃ ص ۱۵۲) اور یہ امر اہل علم میں مشہور و معروف ہے اور حافظ ابن قیم رحہ لکھتے ہیں کہ یہ آیت صلاۃ تہجد کے بارے میں نازل ہوئی ہے۔ (اعلام الموقعین جلد ۲ ص ۳۷۸) خطیب شربینیؒ جو بڑے پایہ کے مفسّر تھے لکھتے ہیں کہ اس آیت کا شان نزول تہجد کی نماز ہے۔ (السراج المنیر جلد ۴ ص ۲۴۸) علّامہ ابوالسعودؒ لکھتے ہیں کہ یہ صلاۃ تہجد کے بارے میں ہے۔ (تفسیر ابوالسعود برکبیر جلد ۸ ص ۲۸۵) مبارک پوری صاحبؒ بھی صاحبِ رُوح المعانی سے یہ مضمون نقل کرتے ہیں (تحفۃ الاحوذی جلد ا ص ۲۰۷)۔ قاضی شوکانی لکھتے ہیں کہ نزلت فی قیام اللیل فلیست مما نحن فیہ (نیل جلد ۲ ص ۲۱۸) یعنی یہ آیت نماز تہجد کے بارے میں نازل ہوئی ہے اور ہمارے اس مسئلہ سے (کہ سورۃ فاتحہ رکن ہے یا جہاں سے بھی پڑھ لیا جائے صحیح ہے) اس کا کوئی تعلق نہیں ہے اور لطف کی بات یہ ہے کہ خود مولانا میر صاحبؒ لکھتے ہیں کہ سورہ مزّمّل کا یہ رکوع نماز تہجد میں تخفیف کے لیے اترا ہے۔ (تفسیر واضح البیان ص ۴۴۳) جب ایک آیت کا محل فرضی نماز ہے اور دوسری کا تہجد کی نماز ہے تو پھر تعارض کیسے ؟ کیونکہ تعارض کے لیے وحدت محل شرط ہے جو یہاں مفقود ہے۔

دونوں کا تقدّم اور تاخّر: پہلے پوری تحقیق گذر چکی ہے کہ ان کے تقدم اور تاخّر کا علم ہے اور تواور خود مبارک پوری صاحبؒ کو بھی اقرار ہے کہ سورۃ مزّمّل پہلے اور سورۃ اعراف بعد کو نازل ہوئی ہے۔ سو تعارض کی یہ شرط بھی نہ پائی گئی۔

وجہ ترجیح:

اگر بالفرض دونوں کا محل بھی ایک ہوتا اور تقدم و تأخر بھی معلوم نہ ہوتا تب بھی واذا قرئ القرآن ... الآیۃ کے حکم کو ترجیح ہوتی۔ کیونکہ صحیح روایات اور آثار اور جمہور سلف و خلف کی اکثریت سے یہ بات ثابت ہو چکی ہے کہ اس آیت میں مقتدی کو قرأت خلف الامام سے منع کیا گیا ہے ترجیح کے لیے یہ دلیل کیا کم وزنی ہے؟

جمع وتطبیق: علاوہ بریں ان دونوں آیتوں میں جمع وتطبیق بھی چنداں دشوار اور مشکل نہیں ہے کیونکہ واذا قرئ ... الآیۃ مقتدی کے حق میں ہے جو باجماعت فرض نماز پڑھتا ہو اور فاقرؤا ما تیسّر تہجد کی نماز کے بارے میں ہے جو انفرادی طور پر پڑھی جاتی ہے اور یہ بھی ممکن ہے کہ پہلی آیت صرف سورۃ فاتحہ کو شامل ہو کیونکہ قرآن العظیم کا اطلاق اسی پر ہوا ہے اور فاقرؤا ما تیسّر سے ما زاد علی الفاتحہ مراد ہو۔ چنانچہ امام بیہقیؒ لکھتے ہیں: کہ حضرت ابن عباس رضؓ سے بسند صحیح یہ روایت مروی ہے کہ فاقرؤا ما تیسّر سے ما زاد علی الفاتحہ مراد ہے۔ (کتاب القرأۃ ص ۶، ص ۱۵۳، ۱۵۴) اور امام دارقطنیؒ حضرت ابن عباسؓ سے باسناد حسن اسی مضمون کی روایت نقل کرتے ہیں اور پھر فرماتے ہیں کہ اس میں ان لوگوں کے لیے حجت ہے جو یہ کہتے ہیں کہ فاقرؤا ما تیسّر ما زاد علی الفاتحہ پر محمول ہے۔ (دارقطنی جلد ۱ ص ۱۲۹) اور میر صاحبؒ لکھتے ہیں کہ الغرض آیت فاقرؤا ما تیسّر میں اگر قرأت سے مراد قرأت القرآن فی الصلوٰۃ مراد لی جائے تو اس سے مراد فاتحہ کے بعد کی قرأت ہے۔ (واضح البیان ص ۴۴۵)

اور چونکہ فریق ثانی کے نزدیک بھی ما زاد علی الفاتحہ کی قرأۃ مقتدی کے لیے ممنوع ہے۔ لہٰذا اس سے مراد صرف منفرد ہوگا اور یہ بھی ممکن ہے کہ فاقرؤا ما تیسّر کا حکم امام کے لیے ہو۔ اور واذا قرئ القرآن صرف مقتدی کے لیے۔ اندریں حالات جب جمع وتطبیق کی صحیح صورتیں بھی سامنے موجود ہیں تو تعارض کا دعوٰے بالکل باطل ہو گیا۔

ساتواں اعتراض:

مولانا مبارک پوری صاحب لکھتے ہیں کہ آیت واذا قرئ القرآن .... الآیۃ پہلا

جواب خود حنفی دیوبندیؒ کے قلم سے کہ جو شخص اس آیت سے خلف الامام کے منسوخ ہونے پر استدلال کرتا ہے اسے یہ ثابت کرنا ہوگا کہ یہ آیت افتراض صلوٰتِ خمسہ کے بعد نازل ہوتی ہے۔ (تحقیق الکلام جلد ۲ ص ۲۵)

جواب

کیا قرأت خلف الامام کی ممانعت اور افتراض صلوٰت خمسہ میں کوئی علت اور معلول کا تلازم یا عرفی اور عادی تعلق ہے؟ کیا قرآنِ کریم کی تعظیم کے پیش نظر قرأت خلف الامام کی ممانعت صرف اسی صورت میں ہو سکتی ہے کہ پانچ نمازیں ہی فرض ہوں۔ پانچ سے کم نمازوں میں یہ ممکن نہیں ہے؟ پہلے عرض ہو چکا ہے کہ دار و مدار دلائل پر ہوتا ہے نہ کہ شخصیتوں پر۔ شخصیتیں قابل صد احترام ہیں مگر صحت و سقم کا مبنیٰ دلائل ہیں۔

آٹھواں اعتراض

مبارک پوری صاحبؒ لکھتے ہیں کہ آیت واذا قرئ القرآن مکی ہے اور امام کے پیچھے قرأت کرنے کا حکم مدینہ طیبہ میں ہوا ہے۔ لہٰذا متقدم حکم سے متاخر حکم کے خلاف استدلال درست نہیں ہو سکتا۔ اور مدینہ میں قرأت خلف الامام کے جواز پر یہ دلیلیں موجود ہیں:

۱۔ حضرت ابوہریرہ رضؓ کا قول ہے کہ جو شخص امام کے پیچھے سورۂ فاتحہ نہ پڑھے، اس کی نماز نہیں ہوتی (موطا امام مالک ص ۲۹)

۲۔ حضرت ابوہریرہؓ روایت کرتے ہیں کہ ایک مرتبہ آں حضرت صلی اللہ تعالیٰ علیہ وآلہ وسلم نے حضرات صحابہ کرام رضؓ کو نماز پڑھائی اور جب فارغ ہوئے تو فرمایا۔ میرے پیچھے کس نے قرأت کی ہے؟ اس حدیث کے آخر میں فرمایا: امام کے پیچھے سورۂ فاتحہ کے بغیر اور کچھ بھی نہ پڑھا کرو۔ (کتاب القرأت ص ۵۱)

اور حافظ ابن حجرؒ لکھتے ہیں کہ اس پر اتفاق و اجماع ہے کہ حضرت ابوہریرہ رضؓ ۷ھ میں مسلمان ہوئے تھے۔ (تلخیص الجبیر ص ۱۱۴)

لہ یہ مضمون انھوں نے اپنی مشہور کتاب الفرقان ص ۸۹ میں لکھا ہے اور اس کے مولف مولانا ناظر حسن صاحبؒ دیوبندی تلمیذ مولانا احمد علی صاحب سہارنپوری رحمۃ اللہ علیہما ہیں۔

۲- حضرت عبادہ رضؓ بن الصامت مدنیؓ ہیں اور انھوں نے قرأت خلف الامام کا ذکر کیا ہے۔
(تحقیق الکلام جلد ۲ ص ۲۸)

میر صاحب سیالکوٹی رحہ لکھتے ہیں کہ یہ بات ثابت شدہ ہے کہ احادیث مثبتہ قرأۃ خلف الامام آیت واذا قرئ القرآن کے بعد فرمائی گئی تھیں۔ کیونکہ عبادہ رضؓ مدنی ہیں اور حضرت ابوہریرہ رضؓ ۷ھ میں مسلمان ہوئے تھے۔ (تفسیر واضح البیان ص ۲۲۵)

جواب ۔ یہ اعتراض بھی محض بے کار ہے: اوّلاً۔ اس لیے کہ قرآن کریم کی کسی آیت اور حکم کو منسوخ ٹھہرانے کے لیے کسی محکم قطعی اور اٹل حکم کی ضرورت ہے۔ حضرت عبادہ رضؓ اور

لہ مبارک پوری صاحب نے بزعم خود بڑی دور اندیشی کا ثبوت دیا ہے اور لکھتے ہیں: اوّلاً۔ کہ اگرچہ حضرت عبادہ رضؓ بن الصامت بیعت عقبہ اولی (جو ۱۲ نبوت میں ہوئی تھی) اور بیعت عقبہ ثانیہ میں (جو ۱۳ نبوت میں ہوئی تھی)، حاضر ہوئے تھے۔ لیکن ان کی حاضری سے (یعنی آں حضرت صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کی خدمت میں سلام لانے کیلئے حاضری سے) سورۂ اعراف پہلے نازل ہو چکی تھی کیونکہ مجمع البحار جلد ۲ ص ۵۱۳ میں لکھا ہے کہ ۱۰ نبوت میں پہلے سورۂ جن نازل ہوئی اور پھر سورۂ اعراف الخ۔

وثانیاً۔ یہ کہ عقبہ اولیٰ سے قبل نماز باجماعت مشروع ہی نہ تھی۔ اس لیے بہرحال حضرت عبادہ رضؓ کی حدیث کا یہ حکم آیت کے بعد ہی ہوگا۔ (تحقیق الکلام جلد ۲ ص ۲۸ محصلہ) مگر یہ تمام مقدمات مخدوش ہیں۔ اوّلاً۔ اس لیے حضرت عبادہ رضؓ کی خلف الامام کی قید کے ساتھ کوئی مرفوع روایت صحیح نہیں ہے۔ لہٰذا وہ مکی ہوں یا مدنی فرق کیا ہو گا؟

وثانیاً۔ حافظ ابن کثیر رحہ لکھتے ہیں کہ بیعت عقبہ اُولیٰ رجب ۱۲ نبوت میں اور بیعت عقبہ ثانیہ ۱۳ نبوت میں ہوئی تھی۔ (البدایہ والنہایہ جلد ۳ ص ۱۵۹)

وثالثاً۔ امام نووی لکھتے ہیں کہ جماعت کے ساتھ نماز ابتدائے نبوت سے مشروع تھی۔ (شرح مسلم جلد ۱ ص ۱۸۳) حافظ ابن حجر رحہ لکھتے ہیں کہ نماز باجماعت ابتدائے اسلام سے مشروع تھا۔ (فتح الباری جلد ۲ ص ۶۰) مسلم جلد ۲ ص ۲۹۶ اور مستدرک جلد ۳ ص ۵۹۲ میں روایت ہے کہ حضرت ابوذر غفاری رضؓ مسلمان ہو کر جب اپنی قوم کے پاس گئے تو حضرت ایماء رضؓ بن رحضہ ان کو جماعت سے نماز پڑھایا کرتے تھے۔ حالانکہ حضرت ابوذر غفاری رضؓ سے قبل مردوں میں حضرت ابوبکر رضؓ اور حضرت بلال رضؓ (باقی اگلے صفحہ پر)

حضرت ابوہریرہ رضؓ کی اخبار احاد سے قرآن کریم کی آیت کیسے منسوخ ہو سکتی ہے۔[1]

وثانیاً۔ حضرت عبادہ رضؓ کی خلف الامام کی قید کے ساتھ کوئی روایت صحیح نہیں ہے۔ جیسا کہ اپنے مقام پر بیان ہوگا۔ پھر ایسی بے حقیقت، ضعیف کمزور اور معلول روایتوں نص قطعی کیونکر منسوخ ہوگئی؟ اور حضرت ابوہریرہ رضؓ سے موطا امام مالک ص ۲۹ میں کوئی روایت ایسی نہیں جس کا مفہوم یہ ہو کہ اگر مقتدی فاتحہ نہ پڑھے تو اس کی نماز باطل ہے رہی اُن کی مرفوع روایت خداج والی تو وہ موجود ہے اور ان کا قول اقرأ بها فی نفسك یا فارسی بھی موجود ہے مگر اس کا مطلب بطلان صلوٰۃ نہیں ہے جس کی بحث جلد ثانی میں آرہی ہے انشاء اللہ تعالیٰ۔

وثالثاً۔ حافظ ابن حجرؒ لکھتے ہیں کہ کسی متاخر الاسلام صحابی کی روایت سے متقدم الاسلام صحابی کی روایت کو بلا دلیل محض تقدم و تاخر کی وجہ سے منسوخ نہیں قرار دیا جاسکتا۔ (شرح نخبۃ الفکر ص ۴۷) نہ معلوم متاخر الاسلام صحابی کی روایت سے نص قرآنی کیسے منسوخ ٹھہرائی جاسکتی ہے؟

ورابعاً۔ کیا صرف حضرت عبادہ رضؓ اور حضرت ابوہریرہ رضؓ ہی مدنی تھے یا حضرت ابوموسٰی الاشعری رضؓ، حضرت جابرؓ بن عبداللہؓ، حضرت ابوالدرداء رضؓ، حضرت انسؓ بن مالکؓ، حضرت زیدؓ بن ثابت، حضرت عبداللہؓ بن بُحینہ رضؓ اور حضرت ابوبکرہ رضؓ وغیرہ بلکہ خود حضرت ابوہریرہؓ بھی جن سے قرأت خلف الامام کی ممانعت کی روایتیں مروی ہیں مدنی تھے؟

(بقیہ پچھلا صفحہ) اور بیبیوں میں صرف حضرت خدیجہ رضؓ مسلمان ہوئی تھیں۔ (تذکرہ جلد ا ص ۱۷ واکمال ص ۵۹۴)

مگر اس ابتدائی دور میں بھی جماعت ہوتی تھی۔

[1] نواب صاحبؒ لکھتے ہیں کہ ناسخ مثل منسوخ باشد در قوت بلکہ اقوی ازاں چہ در صورت ضعف مزیل قوی نہ تواند شد و ایں حکم عقل است و اجماع برآں دلالت کردہ چہ صحابہ رضؓ نص قرآں را بخبر واحد منسوخ نہ کردہ اند۔ (افادۃ الشیوخ بمقدار الناسخ والمنسوخ ص ۵)

حضرت مولانا عبدالحی صاحب لکھنوی رحمۃ اللہ علیہ علماء حنفیہ کا ضابطہ یہ بیان کرتے ہیں۔ ان تخصیص العام القطعی بخبر الاحاد غیر جائز..... الخ (غیث الغمام ص ۲۲۵) کہ عام قطعی کی تخصیص خبر واحد سے جائز نہیں ہے۔

وخامسًا۔ حضرت ابوہریرہ رضؓ کے موقوف اور غیر صریح قول سے نص قرآنی کس طرح منسوخ ہو سکتی ہے۔ جبکہ قاعدہ یہ ہے کہ مرفوع حدیث کے مقابلے میں امت میں سے کسی کا قول قابل قبول نہیں ہو سکتا چنانچہ امام شافعی رحؒ فرماتے ہیں کہ جناب رسول اللہ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کے مقابلے میں ماو شما کے قول کی کیا وقعت ہے؟ (البدایہ والنہایہ جلد ۱۰ ص ۲۵۳)

امام ابن خزیمہؒ کا بیان ہے کہ حدیث کے مقابلہ میں کسی کی بات حجت نہیں ہو سکتی۔ یحییٰ بن آدمؒ فرماتے تھے کہ مرفوع حدیث صحیح کے مقابلہ میں کسی کا قول معتبر نہیں ہے۔ (معرفت علوم الحدیث ص ۸۴)

امام بخاری رحؒ لکھتے ہیں کہ آں حضرت صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم سے جب حدیث ثابت ہو جائے تو پھر کسی امتی کا قول قابل اعتماد نہیں ہے (جزء القراۃ ص ۱۱) امام بیہقی رحؒ لکھتے ہیں کہ حضورؐ کی حدیث کے مقابلہ میں کسی امتی کا قول قابل اعتبار نہیں ہے۔ (سنن الکبریٰ جلد ۲ ص ۱۷۳)

محدث ابن حزمؒ لکھتے ہیں کہ آں حضرت صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کے قول کی موجودگی میں کسی کی بات قابل قبول نہیں ہے (محلی جلد ۱۰ ص ۱۷۰) شیخ الاسلام ابن تیمیہؒ لکھتے ہیں کہ جب آں حضرت صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم سے کوئی بات ثابت ہو جائے تو پھر کسی کی بات حجت نہیں ہے۔ (رفع الملام عن ائمۃ الاعلام ص ۶۴) نواب صاحبؒ لکھتے ہیں: زیرا کہ حجت در روایت صحابی است نہ در رائے وفعل وے (بدور الاہلہ ص ۵۷) اور دوسرے مقام پر لکھتے ہیں کہ علامہ شوکانی رحؒ در مؤلفات خود ہزار بار می نویسد کہ در موقوفاتِ صحابہ حجت نیست (دلیل الطالب ص ۱۱)

عجیب بات ہے کہ ایک طرف تو فریق ثانی کے نزدیک موقوفات صحابہؓ حجت نہیں ہیں اور دوسری طرف ان سے وافاقریٔ القرآن کی آیتِ قرآنی منسوخ قرار دی جاتی ہے۔ فوااسفاع: "میں وہ جواں ہوں شیشے سے پتھر کو توڑ دوں۔"

وسادسًا۔ حضرت ابوہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی جو روایت امام بیہقیؒ کے حوالہ سے نقل کی گئی ہے وہ کمزور اور ضعیف ہے، کیونکہ اس کی سند میں ایک راوی واہر بن نوح ہے۔ امام دارقطنیؒ کہتے ہیں کہ وہ قوی نہیں۔ ابن حبان رحؒ کہتے ہیں۔ اس کی روایتوں میں خطا ہوتی ہے۔ ابن قطانؒ کہتے ہیں کہ وہ مجہول ہے۔ (لسان المیزان جلد ۲ ص ۴۱۳)

دوسرا راوی اس سند میں ربیع بن بدر ہے۔ امام بخاریؒ لکھتے ہیں کہ امام ابن قتیبہؒ اسکو ضعیف

کہتے تھے (ضعفاء صغیر صہ ۱۲) امام نسائی رح اس کو متروک کہتے ہیں۔ (ضعفاء صغیر نسائی صہ ۴۷) حافظ ابن حجر لکھتے ہیں کہ وہ متروک تھا۔ (تقریب صہ ۱۲۱) امام ابن معین رح، ابوداؤد رح اور ابن عدیؒ وغیرہ اس کو ضعیف کہتے ہیں۔ (میزان الاعتدال جلد ا ص ۳۳۳) امام بیہقیؒ لکھتے ہیں کہ وہ ضعیف ہے۔ (کتاب القرآۃ ص ۱۳۸) یعقوبؒ بن سفیانؒ اور ابن خراشؒ اسے متروک کہتے ہیں۔ جوزقانی رح اس کو واھی الحدیث اور ابوحاتمؒ اس کو ذاھب الحدیث اور ضعیف الحدیث کہتے ہیں۔ عجلیؒ محمدؒ بن عثمانؒ اور عثمانؒ ابن ابی شیبہ رح سب اس کی تضعیف کرتے ہیں۔ امام حاکم رح کا بیان ہے کہ ضعیف اور کمزور لوگوں سے موضوع اور جعلی روایتیں بیان کرتا تھا۔ ابن حبانؒ، دارقطنی رح اور ازدیؒ سب اسے متروک کہتے ہیں۔ (تہذیب التہذیب جلد ۳ ص ۲۳۹)

حضرات! آپ مبارک پوری صاحبؒ کی کرامت ملاحظہ کیجئے کہ اس روایت سے وہ واذا قریٔ القرآن ..... الآیۃ کو منسوخ قرار دینے پر اُدھار کھاتے بیٹھے ہیں۔ تعجب اور حیرت ہے ایسے علم پر۔

وسَابعًا۔ کیا جمہور کی طرف سے یہ نہیں کہا جا سکتا ہے کہ ممکن ہے حضرت عبادہ رض وغیرہ نے بیعت عقبہ اولیٰ یا ثانیہ کے موقع پر قرأت خلف الامام کا حکم سنا ہو اور حضرت ابوہریرہ رض کی صحیح اور مرفوع حدیث واذا قرأ فانصتوا اور مالی انازع القرآن الحدیث سے وہ حکم منسوخ ہو گیا ہو۔ کیونکہ حضرت ابوہریرہ رض متاخر الاسلام ہیں اور ۷ھ کو مسلمان ہوتے تھے۔ حدیث، حدیث کے مقابل میں آگئی اور نص قرآنی محفوظ رہ گئی۔

وثَامنًا۔ اگر محض احتمال کا نام ہی استدلال ہے تو کیوں نہیں ہو سکتا کہ حضرت عبادہ رض نے بیعت عقبہ اولیٰ یا ثانیہ میں یہ حکم سنا ہو اور آیت واذا قریٔ القرآن مدینہ میں نازل ہوئی ہو۔ چنانچہ حافظ ابن کثیر رح تفسیر جلد ۲ ص ۲۵۴ میں اور نواب صدیق حسن خاں صاحبؒ اپنی تفسیر فتح البیان جلد ۳ ص ۱۳ میں لکھتے ہیں کہ سورہ اعراف مدنی ہے۔ کیونکہ اس سورت میں حضرت موسیٰ علیہ السلام اور ان کی امت، یہود کا واقعہ پوری تفصیل کے ساتھ بیان ہوا ہے اور ظاہر ہے کہ یہود کا مرکز مدینہ طیبہ تھا نہ کہ مکہ مکرمہ، لہٰذا ثابت ہوا کہ یہ ساری سورت ہی مدنی ہے ——— ع

ہے یہ گنبد کی صدا جیسی کہو ویسی سنو

نواں اعتراض

امام بیہقی رحمہ لکھتے ہیں کہ آیت واذا قرئ القرآن کا شانِ نزول یہ ہے کہ حضرات صحابہ کرام رضہ اقتداء کی حالت میں بلند آواز سے نماز میں تکلم کیا کرتے تھے۔ اس پر یہ آیت نازل ہوئی ہے اور اس کا ثبوت یہ ہے:

۱۔ محمد بن دینار کہتے ہیں۔ ہم سے ابراہیم ہجری نے بیان کیا۔ وہ ابو عیاض سے اور وہ حضرت ابوہریرہ رضہ سے روایت کرتے ہیں۔ انھوں نے فرمایا کہ حضرات صحابہ کرام رضہ نماز میں تکلم کیا کرتے تھے حتیٰ کہ واذا قرئ القرآن .... الآیۃ نازل ہوئی۔

۲۔ موئل بن اسمٰعیل حضرت ابوہریرہ رضہ سے یہی مضمون نقل کرتے ہیں۔

۳۔ عبداللہ بن عامر حضرت ابوہریرہ رضہ کی روایت بیان کرتے ہیں کہ صحابہ رضہ بلند آواز سے نماز میں گفتگو اور تکلم کیا کرتے تھے۔ یہاں تک کہ یہ آیت نازل ہوئی۔

۴۔ عاصم بن عمر، حضرت ابن عباس رضہ سے روایت کرتے ہیں کہ حضرات صحابہ کرام رضہ نماز میں تکلم کیا کرتے تھے جس پر یہ آیت نازل ہوئی۔ اس سے معلوم ہوا کہ امام کے پیچھے ممانعت قرأت سے نہیں بلکہ تکلم اور رفع اصوات سے ہے اور تکلم فی الصلوٰۃ و رفع اصوات اور چیز ہے اور قرأت فی الصلوٰۃ الگ امر ہے۔ (کتاب القرأۃ صـ۷۷)

جواب۔ امام موصوف رحمہ کا یہ بیان باطل ہے۔

اوّلاً۔ اس لیے کہ صحیح اسانید سے پہلے یہ امر ثابت کیا جا چکا ہے کہ اس آیت کا شانِ نزول قرأت خلف الامام کا منفی پہلو ہے۔ عام تکلم اور رفع اصوات اس کا شانِ نزول نہیں ہے۔

وثانیاً۔ امام موصوف رحمہ نے جتنی روایتوں سے احتجاج کیا ہے۔ وہ سب ضعیف کمزور اور معلول ہیں۔ پہلی روایت میں ایک راوی محمد بن دینار ہے۔ امام ابن معینؒ، دار قطنیؒ اور نسائی رحمہ کہتے ہیں کہ وہ ضعیف ہے۔ عقیلی رحمہ کا بیان ہے کہ اس کی حدیث میں وہم ہوتا ہے۔ ابوداؤدؒ فرماتے ہیں کہ ان کا حافظہ آخر میں متغیر ہو چکا تھا۔ (تہذیب التہذیب جلد ۹ ص ۱۵۵)

دوسرا راوی اس کڑی کا ابراہیم ہجری ہے۔ امام ابن معینؒ، نسائیؒ، ابوزرعہؒ، ترمذیؒ، احمدؒ، سعدؒ، حربیؒ اور ابوحاتمؒ سب اس کو ضعیف کہتے ہیں۔ امام بخاریؒ اور ابوحاتمؒ اس کو منکر

الحدیث کہتے ہیں۔ ابن عدیؒ کا بیان ہے کہ وہ قابل احتجاج نہیں۔ علیؒ بن الحسینؒ بن الجنیدؒ کہتے ہیں کہ وہ متروک ہے۔ (میزان جلد ۱ص ۱۳۱، تہذیب التہذیب جلد ۱ص ۱۶۵)

دوسری روایت میں مؤمل بن اسمٰعیل ہے۔ امام بخاریؒ[لہ] فرماتے ہیں کہ وہ منکر الحدیث ہے۔ ابو حاتم رح اس کو کثیر الخطاء کہتے ہیں۔ ابن حبانؒ کا بیان ہے کہ ان کی روایات میں کثرت سے خطا ہوتی ہے۔ یعقوبؒ بن سفیانؒ فرماتے ہیں کہ اہلِ علم کو ان کی روایات سے اجتناب کرنا چاہیے کیونکہ وہ منکر روایتیں بیان کرتے ہیں۔ ساجیؒ اس کو کثیر الخطاء کہتے ہیں۔ دار قطنیؒ اور ابن سعدؒ اس کو کثیر الخطاء اور کثیر الغلط کہتے ہیں۔ ابن قانعؒ اس کو یخطئی سے تعبیر کرتے ہیں۔ محمدؒ بن نصرؒ مروزی اس کو سیئ الحفظ اور کثیر الخطاء کہتے ہیں۔ امام ابو زرعہؒ کہتے ہیں کہ وہ کثیر الخطاء ہے۔ (میزان الاعتدال جلد ۳ص ۲۲۱ تہذیب التہذیب جلد ۱۰ص ۳۸۰)

تیسری سند میں عبداللہ بن عامر ہے۔ امام احمدؒ، ابو زرعہؒ، ابو حاتمؒ، نسائیؒ، ابو داؤدؒ، دار قطنیؒ محدث سعدیؒ سب اس کو ضعیف کہتے ہیں۔ امام ابن معینؒ ان کو لیس بشیء اور ابو احمد الحاکم رح لیس بالقوی کہتے ہیں۔ ابن مدینیؒ اس کی ڈبل تضعیف کرتے ہیں (ضعیف ضعیف) ابو حاتمؒ اس کو متروک کہتے ہیں۔ امام بخاریؒ فرماتے ہیں کہ محدثین ان کے حافظہ کی شکایت کرتے ہیں۔ (میزان جلد ۲ص ۱۵۰ و لسان جلد ۳ص ۳۰۲، تہذیب جلد ۵ص ۲۷۵)

چوتھی روایت میں عاصم بن عمر ہے۔ امام احمدؒ، ابن معینؒ اور جوزقانی اس کو ضعیف کہتے ہیں۔

لہ علامہ ذہبی رحمۃ اللہ علیہ کا بیان ہے کہ جس راوی سے متعلق امام بخاریؒ منکر الحدیث کہتے ہیں۔ اس سے حدیث روایت کرنا جائز نہیں۔ (میزان جلد ۱ص ۵) اور اسی طرح طبقات سبکیؒ جلد ۲ص ۹ اور تدریب الراوی ص ۲۳۵ میں ہے کہ امام بخاریؒ جس کو منکر الحدیث فرمائیں لاتحل الروایۃ عنہ۔ ایسے راوی سے روایت بیان کرنا جائز اور حلال نہیں ہے۔

لطیفہ: فریق ثانی صحیح ابن خزیمہؒ کے حوالہ سے فوق الصدر کی جو روایت پیش کیا کرتا ہے اس کی سند میں بھی یہی مؤمل بن اسمٰعیل واقع ہے (دیکھئے اعلام الموقعین جلد ۲ص ۹ اور بدائع الفوائد جلد ۳ص ۹۱) کیا بعید ہے کہ اصل روایت تحت السرہ ہو اور مؤمل بن اسماعیل کی کثرت خطاء کا نشانہ بن کر روایت فوق الصدر ہوگئی ہو ۔

نہ تم صدمے ہمیں دیتے نہ ہم فریادیوں کرتے ،
نہ کھلتے راز سربستہ نہ یہ رسوائیاں ہوتیں

امام بخاریؒ اس کو منکر الحدیث اور ترمذیؒ متروک کہتے ہیں۔ (میزان جلد ۲ ص ۴، تہذیب التہذیب جلد ۵ ص ۱۵۱) یہ ہیں وہ روایات اور آثار جن پر امام بیہقی رحؒ اپنے استدلال کی بنیاد رکھتے ہیں۔ فالی اللہ المشتکیٰ۔

وثالثًا۔ امام بیہقی رحؒ کی یہ غلطی ہے کہ وہ تکلّم فی الصلوٰۃ سے صرف عام انسانی تکلّم اور گفتگو مراد لیتے ہیں۔ حالانکہ تکلّم کا مفہوم عام ہے جس میں قرأتِ قرآن، تسبیح، تہلیل، تحمید، تکبیر، نماز، خطبہ اور جملہ ادعیہؒ آجاتی ہیں۔ لہٰذا نہی عن التکلم فی الصلوٰۃ میں سورہ فاتحہ کی نہی بھی آجائے گی۔ کیونکہ عام کی نفی سے خاص کی نفی عین عقلی اور منطقی قاعدہ ہے۔ تکلّم کا مادہ کلام اور کلمہ ہے۔ اور قرآن کریم میں متعدد مقامات اور مختلف مواضع میں کلام اللہ، کلماتُ ربّی اور کلمات ربك وغیرہ کا قرآن کریم اور اس کی آیتوں پر اطلاق ہوا ہے۔ آں حضرت صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم فرماتے ہیں کہ جمعہ کے وقت امام کے منبر پر تشریف لانے سے قبل جتنی نماز کوئی پڑھنا چاہے پڑھ لے۔ ثم ینصت اذا تکلم الامام (بخاری جلد ۱ ص ۱۲۱) پھر جب امام آجائے اور تکلم کرے تو اس وقت وہ نمازی خاموش ہو جاتے۔ اس حدیث میں جمعہ کے خطبہ پر تکلم الامام کا اطلاق ہوا ہے خطبہ کیا ہے؟ آں حضرت صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: وانما الخطبۃ ھی قرأۃ القرآن (الحدیث مسند طیالسی ص ۲۵۹) خطبہ تو قرآن کریم کی تلاوت اور اس کی قرأت ہے۔ حضرت ام ہشام رضؓ فرماتی ہیں کہ میں نے سورۃ ق والقرآن المجید جناب رسول خدا صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم سے سُن کر یاد کی ہے۔ آپ اسے ہر جمعہ کے خطبہ میں پڑھا کرتے تھے۔ (مشکوٰۃ جلد ۱ ص ۱۲۳ و مسلم جلد ۱ ص ۲۸۶) آخری تشہد میں درود شریف کے بعد کوئی متعین دعا شریعت نے نہیں بتائی۔ لیکن ادعیہ ماثورہ میں ربّنا اٰمنّا.... الآیۃ رب اجعلنی مقیم الصلوٰۃ.... الآیۃ۔ ربّنا لا تزغ قلوبنا.... الآیہ ربّنا ظلمنا انفسنا...... الآیہ وغیرہ وغیرہ بھی ادعیہ ثابت ہیں اور آپ نے ارشاد فرمایا ہے کہ آخری تشہد سے فارغ ہونے کے بعد ثم لیتخیر بعد من الکلام ما شاء (بخاری ۲ ص ۹۲۱) جو کلام بھی دل چاہے نمازی انتخاب کر لے۔ ایک شخص نے رکوع کی حالت میں الحمد للہ حمدًا کثیرًا طیبًا مبارکًا فیہ پڑھا تھا اور آپ نے فرمایا: من المتکلم (بخاری جلد ۱ ص ۱۱۰ و مسند احمد جلد ۳ ص ۱۰۴) متکلّم کون تھا؟ ایک شخص نے یہ دعا کی تھی: اَللّٰھُمَّ ارْحَمْنِیْ وَ مُحَمَّدًا وَلَا تَرْحَمْ

مَعْنًا آخَرَا۔ امام نسائیؒ اس پر ایک باب قائم کرتے ہیں۔ باب الکلام فی الصلوٰۃ (جلد ا ص ۱۱۰) امام بخاری رحہ ایک باب بایں عنوان قائم کرتے ہیں:

اذا قال واللہ لا اتکلم الیوم فصلے او قرأ او سبّح او کبر او حمد او هلل فھو علی نیتہ۔ (بخاری ۲ ص ۹۸۹)	اگر کسی شخص نے قسم اٹھائی کہ میں کلام نہیں کروں گا تو اگر اس نے نماز پڑھی یا قرآن کی تلاوت کی یا سبحان اللہ یا اللہ اکبر یا الحمد للہ یا لا الٰہ الا اللہ پڑھا تو یہ اس کی نیت پر موقوف ہے۔

یعنی اگر وہ تکلم سے قرأتِ قرآن وغیرہ مراد لے اور اس کی نیت کرے تو تکلم کا اطلاق اس پر صحیح ہے اور وہ حانث ہو جائے گا۔ قاضی شوکانی رحہ لکھتے ہیں:

فلا یجوز من الکلام الا ما خصّہ دلیل کصلوٰۃ التحیّۃ۔ (نیل الاوطار جلد ۳ ص ۱۵۲)	جب امام خطبہ پڑھ رہا ہو تو اس وقت کلام صحیح نہیں ہے۔ مگر جس کو شرعی دلیل نے خاص کر دیا ہو جیسے صلوٰۃ تحیہ۔

اس عبارت سے معلوم ہوا کہ قاضی صاحب موصوفؒ صلوٰۃ تحیہ پر کلام کا اطلاق صحیح تسلیم کرتے ہیں۔ جب یہ امر پایۂ ثبوت کو پہنچ گیا کہ نہی عن التکلم قرأتِ قرآن وغیرہ پر مشتمل ہے تو امام بیہقی رحہ کا یہ استدلال کہ نہی تو تکلم سے ہے۔ تلاوت اور قرأت قرآن سے نہیں بالکل بے بنیاد ہے اور جیسے جہر کے ساتھ پڑھنے سے منازعت اور مخالجت ہوتی ہے۔ اسی طرح آہستہ پڑھنے سے بھی ہوتی ہے۔ جس کی تحقیق آگے آئے گی۔ انشاء اللہ تعالیٰ۔

ورابعًا۔ امام بیہقی رحہ نہی عن التکلم فی الصلوٰۃ ان ضعیف اور کمزور روایتوں سے ثابت کرتے ہیں۔ حالانکہ صحیح روایت سے ثابت ہے کہ عام تکلم فی الصلوٰۃ[1] کی ممانعت

---

[1] محدثینؒ و مورخینؒ کا اس بات میں شدید اختلاف ہے کہ نہی عن التکلم فی الصلوٰۃ مکہ مکرمہ میں نازل ہوئی یا مدینہ طیبہ میں؟ حافظ ابن قیمؒ (زاد المعاد جلد ۲ ص ۶۱ میں) حافظ ابن کثیر رحہ (البدایہ والنہایہ جلد ۲ ص ۹۲ میں) اور قاضی ابو الطیب الطبریؒ (المتوفی ۴۵۰ھ دیکھئے بذل المجہود جلد ۲ ص ۹۵) اس کے مدعی ہیں۔ کہ یہ ممانعت مکہ مکرمہ میں نازل ہو چکی تھی۔ اور حسب ذیل باقی اگلے صفحہ پر دیکھیے۔

آیت قومُوا لِلّٰہِ قانتین سے ہوئی ہے جیسا کہ بخاری جلد ۱ ص ۱۶۰ و مسلم جلد ۱ ص ۲۰۴ میں حضرت زیدؓ بن ارقم سے مروی ہے اور اس کی پوری تحقیق پہلے گزر چکی ہے کہ آیت و اذا قرئ القرآن کا شانِ نزول ہی خاص قرأت خلف الامام کا مسئلہ ہے۔

دسواں اعتراض

حضرت امام بخاری رح فرماتے ہیں کہ آیت فاذا قرئ القرآن ... الآیہ میں استماع اور انصات کا حکم ہے اور استماع کا تحقق صرف ان نمازوں میں ہوسکتا ہے جن میں قرأت سنی جاسکتی ہو اور سرّی نمازوں میں چونکہ قرأت سُنی نہیں جاسکتی۔ اس لیے ان میں مقتدی کو امام کے پیچھے قرأت کرنی جائز ہوگی۔ لہٰذا آیت اپنے عموم پر باقی نہ رہی اور منکرین قرأت خلف الامام کا علی الاطلاق استدلال اس آیت سے صحیح نہ ہوا (او کما قال جزء القرآۃ ص ۹ اور یہی سوال امام بیہقی رح نے کتاب القرآۃ ص ۷۶ میں اور نواب صاحبؒ نے دلیل الطالب ص ۲۸۰ میں اور مُبارک پوری صاحبؒ نے تحقیق الکلام جلد ۲ ص ۱۰۵ اور ابکار المنن ص ۱۲۸ میں کیا ہے)

جواب۔ ان اکابر کے سوال یا استدلال کے مرکزی نقطے اصولی طور پر صرف دو ہیں۔ ان کا تجزیہ یوں کیا جاسکتا ہے:

۱۔ استماع کا معنی سننا ہے۔

۲۔ سرّی نمازوں میں آہستہ آہستہ امام کے پیچھے قرأت کرنا استماع اور انصات کے منافی نہیں ہے علی الترتیب دونوں شقوں کا جواب ملاحظہ کریں:

استماع کا معنیٰ۔ استماع کا معنیٰ سننا نہیں بلکہ کان دھرنا اور توجہ کرنا ہے، قرآۃ سُنی جاسکتی ہو یا نہ۔

(بقیہ پچھلا صفحہ) میں حضرت ابن مسعودؓ کی وہ صحیح روایت پیش کرتے ہیں جو صحاح ستہ میں موجود ہے کہ حبشہ سے لوٹنے کے بعد انھوں نے بحالتِ نماز آں حضرت صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کو سلام کہا۔ مگر جواب نہ ملا۔ کیونکہ نہی عن التکلم فی الصلوٰۃ نازل ہوچکی تھی۔ مگر حافظ ابن حجر رح لکھتے ہیں کہ یہ آیت چونکہ بالاتفاق مدنی ہے اس سے معلوم ہوا کہ عام تکلم فی الصلوٰۃ کی نہی مدینہ ہی میں نازل ہوئی ہے (فتح الباری جلد ۳ صفحہ ۵۹) اور یہی بات زیادہ قرین قیاس ہے۔ کیونکہ بعض مہاجرین حبشہ مکہ مکرمہ بھی واپس آئے اور بعض مدینہ منورہ میں اور حضرت ابن مسعودؓ کا یہ رجوع مدینہ طیبہ میں ہوا تھا۔

۱- آں حضرت صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کی عادت یہ تھی کہ جب بسلسلۂ جہاد کسی قصبہ یا شہر پر حملہ کرنا چاہتے تھے تو

وکان یستمع الاذان فان سمع ..... پہلے توجہ کرتے - اگر اذان کی آواز سن لیتے تو حملہ سے

.... اذانا امسك والا اغار باز رہتے - ورنہ ہلہ بول دیتے تھے۔

(مسلم ج۱ ص۱۶۶، ابو عوانہ جلد۱ ص۳۳۵، دارمی ص۳۲۳، طیالسی ص۲۶۱)

قطبی پڑھنے والا طالب علم بھی بخوبی اس امر سے واقف ہوگا کہ تقسیم الشئ الیٰ نفسہ والیٰ غیرہ محال ہے - اگر استماع اور سماع کا ایک ہی معنی ہو تو اس حدیث کا مطلب یہ ہوگا کہ آپ اذان سنتے تھے۔ سو اگر آپ سُن لیتے تو حملہ نہ کرتے ورنہ حملہ کر دیتے تھے۔ جب پہلے اذان سُن لی ہوتی تھی تو پھر اگر اذان سُن لیتے کا کیا مطلب؟ استماع کا معنٰی کان دھرنا اور توجہ کرنا ہے۔ مطلب واضح ہے کہ آپ پہلے کان دھرتے اور توجہ کرتے - توجہ کے بعد اگر اذان سُن لیتے تو فبہا ورنہ حملہ کر دیتے تھے - مؤلف خیر الکلام کا یہ کہنا کہ استماع سے مراد ارادہ استماع ہے..... اھ ص ۲۸۱ - ایک بے کار بہانہ ہے - اس لیے کہ مجازی معنی کے لیے قرینہ درکار ہے اور اس جگہ قرینہ مفقود ہے - فان سمع ... الخ کے واضح الفاظ اس کا ابا کرتے ہیں کیونکہ حرف فا سے سماع کا ترتب امر باطنی یعنی ارادہ پر چسپاں نہیں ہوتا بخلاف کان دھرنے کے جو ظاہری امر ہے۔

۲- صراح ص۳۱۳ میں لکھا ہے - استماع گوش داشتن - کان دھرنا اور توجہ کرنا۔

۳- لغت کے امام ثعلبؒ سے روایت ہے واذا قرئ القرآن .... الآیہ کا یہ مطلب نقل کیا گیا ہے کہ قال ثعلبؒ معناہ اذا قرء الامام فاستمعوا الی قرآنہ ولا تتکلموا (تاج العروس ج۱ ص۵۹۱)
ثعلبؒ لکھتے ہیں کہ استماع کا معنٰی یہ ہے کہ جب امام قراۃ کرے تو اس کی قراءت کی طرف توجہ کرو اور بولو مت۔

۴- اور امام راغبؒ فرماتے ہیں کہ والاستماع الاصغاء ___ استماع کا مطلب کان دھرنا اور توجہ کرنا ہے۔ (مفردات ص ۲۴۲)

۵- اور مختار الصحاح میں ہے: واستمع لہ ای اصغی ___ کہ استمع لہ کا یہ معنٰی ہے کہ اس نے توجہ کی اور کان دھرے۔

۶- منجد اور قاموس میں ہے: استمع لہ والیہ اصغی ___ استمع لہ اور الیہ کا ایک ہی مطلب

ہے کہ اس نے توجہ کی اور کان دھرے۔ (منجد صفحہ ۳۶۲، قاموس جلد ۳ صفحہ ۳۱)

۷۔ امام نوویؒ لکھتے ہیں:

الاستماع الاصغاء۔ (شرح مسلم جلد ۱ صفحہ ۱۸۲) کہ استماع کا معنیٰ توجہ کرنا اور کان دھرنا ہے۔

۸۔ امام رازیؒ لکھتے ہیں:

لان السماع غیر والاستماع غیر۔ سماع اور چیز ہے اور استماع اور ہے۔

(تفسیر کبیر جلد ۴ صفحہ ۵۰۲)

۹۔ قاضی شوکانی صاحبؒ قرأت خلف الامام کی حدیث پر بحث کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ

یدل علی النهی عن القرأة عند مجرد الجهر من الامام ولیس فیه ولا فی غیره ما یشعر باعتبار السماع۔ (نیل الاوطار جلد ۲ صفحہ ۲۱۱) یہ حدیث اس پر دلالت کرتی ہے کہ جب امام جہر سے قرأت کر رہا ہو تو مقتدی کو اس حالت میں قرأت کرنا منع ہے۔ یہ حدیث اور کوئی دیگر حدیث اس پر دلالت نہیں کرتی کہ مقتدی کو قرأت سے اس لیے منع کیا گیا ہے کہ وہ قرأت سن رہا ہے۔

اس عبارت میں قاضی صاحبؒ واشگاف الفاظ میں اس بات کو تسلیم کرتے ہیں کہ ترک قرأۃ خلف الامام کی علت سماع نہیں ہے۔ موصوف جہرِ امام کو اس کی علت ٹھہراتے ہیں اور جمہور اہلِ اسلام بڑے وسیع الظرف ہیں۔ وہ صرف قرأتِ امام کو ترکِ القرأت خلف الامام کی علت سمجھتے ہیں۔

۱۰۔ نواب صاحبؒ لکھتے ہیں:

ومعتبر استماع است نہ سماع پس ہر کہ بانتہاء وقوف واقف شد ونمی شنود یا اصم است یا صوتِ خطیب خفی است وے ہمچو سامع است۔ (بدور الاہلہ ص ۷۳)

ان تمام پیش کردہ اقتباسات سے یہ بات روشن ہو جاتی ہے کہ استماع اور سماع دو الگ الگ چیزیں ہیں اور استماع کا معنیٰ کان دھرنا اور توجہ کرنا ہے۔ اس میں سننے کا معنیٰ ملحوظ نہیں ہے۔ لہٰذا اس آیت کو صرف جہری نمازوں کے ساتھ مخصوص کر دینا

باطل ہے بلکہ یہ آیت سرّی اور جہری ہر قسم کی نمازوں کو شامل ہے اور سماعِ قرأت، ترکِ قرأت کی علت نہیں۔ جیسا کہ قاضی شوکانی صاحبؒ کو بھی مسلّم ہے۔

انصات کا معنیٰ

انصات کا معنیٰ ہے خاموش بودن (صراح ص۶۹) قاموس جلد ۱ ص۱۹۲ میں ہے۔ انصت، سکت یعنی انصات کا معنیٰ خاموش ہونا ہے اور یہی معنی مغرب ۲ ص۲۱۷ اور منجد ص۸۸۳ وغیرہ کتب لغت میں آئے ہیں۔ امام نوویؒ لکھتے ہیں: الانصات السکوت کہ انصات کا معنیٰ سکوت کرنا اور خاموش رہنا ہے۔ (شرح مسلم جلد ۱ ص۲۸۳) امام بیہقیؒ لکھتے ہیں: اذ لا فرق بین السکوت والانصات عند العرب (کتاب القرأت ص۸۴) اہلِ عرب کے نزدیک سکوت اور انصات میں کوئی فرق نہیں ہے۔

اور مختار الصحاح میں ہے کہ الانصات السکوت والاستماع انصتہ وانصت لہ (ص ۵۸) ۔ انصات کا معنیٰ خاموش رہنا اور کان دھرنا ہے لام کے ساتھ ہو یا بدون لام دونوں کا ایک ہی معنیٰ ہے۔

اور منجد میں ہے کہ انصت وانتصت لہ سکت مستمعا لحدیثہ (ص۸۸۳) انصت اور انتصت لہٗ کا معنیٰ یہ ہے کہ اس کی بات کے لیے توجہ کرتے ہوئے خاموش ہو گیا۔

اور تاج العروس میں ہے کہ

وانصتہ وانصت لہ اذا سکت لہٗ مثل نصحہ ونصح لہ وانصتہٗ و انصت لہ مثل نصحتہٗ و نصحت لہٗ والانصات ھو السکوت والاستماع للحدیث یقال انصتہٗ وانصت لہ۔ (جلد ۱ ص ۵۹۱)

انصتہٗ اور انصت لہٗ کا معنیٰ ایک ہی ہے کہ اس کے لیے خاموش ہو گیا جیسے نصحہٗ اور نصح لہٗ کا ایک ہی مطلب ہے اور انصات کا معنیٰ سکوت اور بات کی طرف توجہ کرنا ہے۔ کہا جاتا ہے انصتہٗ وانصت لہٗ۔

امام ابوبکر الرازی رحؒ لکھتے ہیں کہ

قد بینا دلالۃ الآیۃ علی وجوب الانصات

ہم نے بیان کیا ہے کہ یہ آیت وجوب انصات

عند قرأۃ الامام فی حال جهر الامام
والاخفاء وقال اهل اللغۃ الانصات
الامساك عن الکلام والسکوت لاستماع
القرأۃ ولایکون القاری منصتا ولا ساکتا
بحال وذلك لان السکوت ضد الکلام وهو
تسکین الآلۃ عن التحریك بالکلام ۔
۔ اھ (احکام القرآن جلد ۳ ص ۴۹)

پر دلالت کرتی ہے جب کہ امام قرأت کر رہا
ہو جہر سے قرأت کرے یا آہستہ اور اہل لغت
کہتے ہیں کہ انصات کا معنی کلام سے ترک
جانا اور قرأت کی توجہ کے لیے خاموش رہنا
ہے اور پڑھنے والا کسی صورت میں منصت
اور ساکت نہیں ہو سکتا کیونکہ سکوت کلام کی
ضد ہے اور سکوت کا یہ معنی ہے کہ زبان کو
کلام کے لیے حرکت نہ دی جائے۔

سکوت کا معنی!

امام اللغت والادب ابو عبداللہ الحسینؒ بن احمد المعروف بابن خالویہؒ (المتوفی ۳۷۰ھ) لکھتے ہیں: نزف الرجل اذا انقطعت حجتہ عند المناظرۃ وسکت وامسکت مثلہ ۔

(اعراب ثلاثین سورۃ من القرآن ص ۲۷)

یعنی مناظرہ کرتے وقت جب کوئی آدمی بالکل لاجواب ہو کر خاموشی اختیار کر لیتا ہے تو اس پر نزف کا لفظ اطلاق ہوتا ہے۔ اسی طرح جب کوئی اپنے کلام کو منقطع کر دیتا ہے۔ اسی طرح جب کوئی اپنے کلام کو منقطع کر دیتا ہے تو اس پر سکت اور اسکت بولا جاتا ہے۔

منجد صفحہ ۳۵۱ اور قاموس جلد ۱ صفحہ ۹۲ میں لکھا ہے: اسکت انقطع کلامہ فلم یتکلم کہ سکوت کا معنی یہ ہے کلام بالکل ترک کر دیا اور کوئی بات نہ کی۔ مجمع البحار جلد ۲ ص ۱۲۵ میں اس کی تصریح یوں کی ہے۔ جری الوادی ثلاثا ثم سکت ای انقطع یعنی تین دن تک سیلاب چلتا رہا پھر بالکل رک گیا۔

امام راغب اصفہانیؒ (المتوفی ۵۰۲ھ) لکھتے ہیں: السکوت مختص بترك الکلام۔ (مفردات ص ۲۲۵) سکوت ترک کلام کے ساتھ مختص ہے۔

امام رازیؒ تحریر فرماتے ہیں:

لان السکوت عدمی معناہ انہ

سکوت عدمی ہے اس کا معنی یہ ہے کہ اس

لم یقل شیئاً ولم ینقل امراً ولم یتصرف فی قولٍ ولا فعل ولا شک ان هٰذا المعنی عدمی محض۔

(مناظرات امام رازیؒ ص ۳۵)

نے کچھ بھی نہیں کہا نہ کوئی بات نقل کی ہے اور نہ کسی قول اور فعل میں تصرف کیا ہے اور اس کے عدمی محض ہونے میں کیا شک اور شبہ ہو سکتا ہے؟

ان منقولہ حوالوں سے یہ بات قطعیت کے ساتھ ثابت ہو جاتی ہے کہ بغیر مکمل خاموشی کے انصات اور سکوت اور اسکات کا مفہوم کسی طرح بھی محقق نہیں ہو سکتا اور جو لوگ جہری یا سرّی نمازوں میں امام کے پیچھے مقتدی کے لیے قرآت تجویز کرتے ہیں۔ وہ کسی طرح انصات پر عامل نہیں تصور کیے جا سکتے اور یہ بھی وضاحت کے ساتھ عرض کیا جا چکا ہے کہ استماع کا معنی کان دھرنا اور توجہ کرنا ہے، سننا اس کے مفہوم میں شامل نہیں ہے۔ اس لیے سرّی اور جہری کا سوال اٹھانا محض بے جا اور دور از کار بحث ہے۔

آہستہ پڑھنا بھی انصات اور استماع کے سراسر منافی ہے:

جو حضرات بحالتِ اقتداء امام کے پیچھے آہستہ قرآت تجویز کرتے ہیں اور اس کو انصات اور استماع کے منافی نہیں سمجھتے وہ غلطی پر ہیں۔ صحیح حدیث میں آتا ہے کہ جب حضرت جبرائیل علیہ السلام وحی لے کر آتے اور آنحضرت صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کو قرآن کریم پڑھاتے تو آپ بھی آہستہ آہستہ ساتھ پڑھتے جاتے کہ مبادا حضرت جبرائیل علیہ السلام کے تشریف لے جانے کے بعد میں بھول نہ جاؤں اور یہ کان یحرک شفتیہ آپ آہستہ آہستہ ہونٹ مبارک ہلاتے جاتے تھے۔ مگر اللہ تعالیٰ کو یہ بھی پسند نہ آیا کہ آپ قرآتِ قرآن کے وقت اپنے ہونٹوں کو حرکت دیں اور یہ حکم نازل ہوا۔ لاتحرک بہ لسانک کہ آپ اپنی زبان تک کو حرکت نہ دیں۔

فاستمع لہ وانصت۔ (بخاری جلد ۱ ص ۳، مسلم جلد ۱ ص ۱۸۳، طیالسی ص ۳۴۲)

سو آپ کان دھریں اور پوری طرح توجہ کریں اور مکمل خاموشی اختیار کریں۔

اس سے معلوم ہوا کہ آہستہ پڑھنا، زبان کو حرکت دینا اور ہونٹ ہلانا استماع اور انصات کے بالکل منافی ہے۔ اسی لیے تو آپ کو تحریک لسان اور تحریک شفتین سے بھی منع کیا گیا۔

حالانکہ آپ آہستہ ہی پڑھتے تھے۔ بعض علماء نے واذکر ربك فی نفسك ...... الایۃ سے آہستہ قرآت کرلے کے جواز پر استدلال کیا ہے۔ حافظ ابن کثیر علیہ الرحمہ ان کی تردید کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ

وھذا بعید مناف للانصات المأمور به۔ (تفسیر ابن کثیر مع المعالم ج۳ ص۲۲۲ وبغیرہ جلد ۲ ص ۲۸۱)

یہ معنی حق اور انصاف سے بعید اور انصات مامور بہ کے قطعاً اور سراسر منافی اور مخالف ہے۔

حضرات! آفتابِ نیم روز کی طرح یہ بات ثابت ہو چکی ہے کہ مقتدی کے لیے سری اور جہری کسی بھی نماز میں قرآت کرنا استماع، انصات اور سکوت کے منافی ہے۔

گیارھواں اعتراض: حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت ہے کہ انھوں نے آں حضرت صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم سے دریافت کیا کہ آپ تکبیر تحریمہ اور قرآت کے درمیان جو اسکات اور خاموشی اختیار کرتے ہیں۔ اس وقت آپ کیا پڑھا کرتے ہیں؟ آپ نے ارشاد فرمایا کہ میں یہ دعا پڑھا کرتا ہوں۔ اللھم باعد بینی و بین خطایای۔ (الحدیث۔ بخاری جلد ۱ ص۱۰۳)

امام بیہقی رح اس روایت سے یہ استدلال کرتے ہیں کہ معلوم ہوا کہ آہستہ آہستہ پڑھنے پر اسکات کا اطلاق صحیح ہے۔ لہٰذا جو شخص امام کے پیچھے آہستہ قرآت کرتا ہے تو وہ آیت استماع وانصات کی مخالفت نہیں کر رہا۔ (کتاب القرآت ص ۵۷) یہی بات مبارک پوری صاحب رح وغیرہ نے بھی نقل کی ہے۔ (دیکھیے تحقیق الکلام جلد ۲ ص ۵۱)

جواب۔ یہ اعتراض یا استدلال بھی مخدوش ہے۔

اوّلاً۔ اس لیے کہ ہمارا استدلال نص قرآنی سے ہے جس میں لفظ استماع اور انصات آیا ہے۔ اسکات اور سکوت کا لفظ صراحت کے ساتھ اس آیت میں مذکور نہیں ہے۔ استماع اور اسکات وسکوت کے درمیان فرق نمایاں ہے۔ امام بیہقی رح نے جو یہ فرمایا ہے کہ ان میں فرق نہیں ہے صحیح نہیں ہے۔ اور اسی سے قاضی مقبول احمد صاحب کو مغالطہ ہوا ہے (دیکھیے الاعتصام) اس میں اہلِ علم کے لیے اشکال کی کوئی وجہ نہیں اور انصات اور سکوت میں جو فرق ہے وہ مبارکپوری صاحب رح کو بھی مسلّم ہے۔ چنانچہ وہ لکھتے ہیں کہ انصات اور سکوت کا معنی ایک نہیں ہیں بلکہ انصات کا معنی سکوت مع الاستماع ہیں۔ (تحقیق الکلام جلد ۲ ص ۵۱ و

تحفۃ الاحوذی جلد۱ صفحہ ۲۵۸) لہٰذا حدیث انصتوا سے استماع اور انصات کی تفسیر کرنا اور اس پر استدلال کی بنیاد رکھنا باطل ہے۔

وثانیاً۔ حافظ ابن حجرؒ حضرت زیدؓ بن ارقم کی امرنا بالسکوت کی روایت کا مطلب یہ بیان کرتے ہیں کہ اس حدیث کا یہ مطلب نہیں کہ ہمیں نماز میں مطلقاً سکوت کا حکم دیا گیا کہ نہ تو تم ثناء و آمین پڑھو اور نہ تسبیح، تحمید، تشہد اور درود وغیرہ پڑھو۔ بلکہ مراد یہ ہے کہ حکم سابق سے سکوت کا حکم دیا گیا کہ سلام و کلام وغیرہ سے سکوت اختیار کرو تو اس روایت میں سکوت عن الکلام المتقدم مراد ہے۔ (فتح الباری جلد۳ ص ۶۰ محصلہ) گویا جس چیز سے سکوت کا حکم دیا گیا ہے۔ اس سے حقیقتاً سکوت ہی مراد ہے۔ اس بیان کو پیش نظر رکھتے ہوئے حضرت مولانا سید محمد انور شاہ صاحبؒ (المتوفی ۱۳۵۲ھ) حدیث انصتوا کا مطلب یہ بیان کرتے ہیں کہ اس میں اسکات عن التکبیر مراد ہے یعنی تکبیر تحریمہ سے اسکات اور سکوت کرنا (فصل الخطاب ص) خلاصہ یہ ہوا کہ اسکات کا معنی آہستہ پڑھنا نہیں جیسا کہ امام بیہقیؒ وغیرہ کو دھوکا ہوا ہے بلکہ اسکات کے حقیقی معنی ہی مراد ہیں۔ وہ یہ کہ جس چیز سے خاموش رہنے کا حکم تھا اس کو حقیقتاً ترک کر دینا اور اس سے خاموش ہونا ہے۔ علاوہ ازیں اگر اس سے صرف نظر بھی کر لیا جائے تو یہ ایک مجازی معنی ہے اور آیت زیر بحث میں جمہور سلف و خلفؒ نص صحیح احادیث اور لغت کی روشنی میں حقیقی معنی مراد لیتے ہیں۔ لہٰذا مجازی معنی کو حقیقی معنی کے ترک کی دلیل قرار نہیں دیا جا سکتا۔ چنانچہ امام ابوبکر الرازیؒ اسی حدیث کا جواب دیتے ہوئے لکھتے ہیں: انما سمیناہ ساکتا مجازا لان من لم یسمعہ یظنہ ساکتا اھ (احکام القرآن جلد۳ ص ۴۹) یعنی اس کو ہم نے مجازی طور پر ساکت کہا ہے کیونکہ جو شخص اس کی قرآت کو نہیں سن رہا وہ اس کو ساکت ہی خیال کرتا ہے۔ مجازی معنی خود قرینہ کا محتاج ہوتا ہے اور فریق ثانی اس سے حقیقت کو ترک کرنے پر تلا ہوا ہے۔

بارھواں اعتراض۔ مبارکپوری صاحبؒ لکھتے ہیں کہ صاحب مجمع البحار نے (جلد میں) حدیث قرأ رسول اللہ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم فیما امر وسکت فیما امر کے یہ معنی بیان کیے ہیں کہ قرأ کے معنی جہر کے ہیں اور سکت کے معنی اَسَرَّ کے ہیں یعنی آں حضرت صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے جہر سے بھی قرآت کی اور آہستہ بھی۔ اس سے معلوم ہوا کہ قرأ کے معنی جَہَرَ بھی آتے ہیں۔ اس

معنی کو پیش نظر رکھتے ہوئے آیت واذا قرئ القرآن کا مطلب یہ ہوگا کہ جب قرآن جہر سے پڑھا جائے تو تم خاموش رہو۔ لہٰذا یہ آیت صرف جہری نمازوں کو شامل ہوگی۔ نہ کہ سری نمازوں کو۔ (تحقیق الکلام جلد ۲ صفحہ ۱۵ محصلہ)

جواب ۔ مبارک پوری صاحب کا یہ بیان بھی قابل التفات نہیں ہے۔

اولاً ۔ اس لیے کہ آیت کا شان نزول صحیح روایات سے ترکِ قرأت ثابت ہو چکا ہے۔ اس میں قیاس کی ضرورت ہی نہیں ہے

وثانیاً ۔ اہل عرب کے نزدیک قرأ اور جہر میں نمایاں فرق ہے اور حقیقت کو بلا کسی قوی اور صارف قرینہ کے ترک کرنا کئی وجوہ سے باطل ہے۔

وثالثاً ۔ اگر اس حدیث کا معنی ہی بیان کرنا مقصود ہے تو اس کی صحیح صورتیں بھی عرض کی جاتی ہیں۔ کیوں نہیں ہو سکتا کہ اس کا مطلب یہ ہو کہ آں حضرت صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم امامت کی حالت میں قرأت کرتے تھے۔ (قرأ رسول اللہ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم فیما اُمِرَ) اور اقتداء[1] کی حالت میں آپ نے سکوت اور خاموشی اختیار کی (وسکت فیما اُمِرَ) اور یہ بھی ممکن ہے کہ مطلب یہ لیا جائے کہ آپ نے پہلی دو رکعتوں میں سورۃ فاتحہ کے بعد قرأت کی اور کوئی نہ کوئی سورت یا قرآن کا کچھ حصہ پڑھا (قرأ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم فیما اُمِرَ) اور پچھلی دو رکعتوں میں سورۃ فاتحہ کے بعد اور کوئی سورت نہ پڑھی۔ اور حقیقتاً سکوت اختیار کیا (وسکت فیما اُمِرَ) اور صحیح بخاری جلد ۱ ص ۱۰۷ وغیرہ میں اس کی تصریح موجود ہے کہ پچھلی دو رکعتوں میں

---

[1] بیت اللہ کے پاس دو مرتبہ آپ نے حضرت جبرائیل علیہ السلام کی اقتداء میں نماز پڑھی ہے۔ (ابوداؤد جلد ۱ ص ۵۷، ترمذی جلد ۱ ص ۲۱) سفر تبوک سے واپسی پر آپ نے حضرت عبد الرحمٰن رضی اللہ عنہ بن عوف کی اقتداء کی ہے۔ (مسلم جلد ۱ ص ۱۳۴، ابوداؤد جلد ۱ ص ۲۰) اہل قبا کے درمیان مصالحت کرانے کے بعد واپسی پر آپ نے عصر کی نماز میں حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کی اقتداء کی ہے۔ (بخاری جلد ۲ ص ۱۰۶۶) اور نزل جبرائیل فامنی۔ الحدیث بخاری جلد ۱ ص ۴۵۶ و مسلم جلد ۱ ص ۲۲۱ اور مؤطا امام مالک ص ۲ وغیرہ میں موجود ہے۔ جس سے حضرت جبرائیل کی اقتداء میں آپ کا نماز پڑھنا ثابت ہے اور آخری نماز میں آپ نے حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کی اقتداء کی جس کی تفصیل آگے آئے گی۔ آپ کی نفس اقتداء کے ثبوت کے لیے یہ دلائل کافی ہیں۔

آپ صرف سورۂ فاتحہ پڑھا کرتے تھے۔ جب سکت کے اور قرأ کے معنی کے لیے صحیح احادیث سے اور احتمالات کا بھی ثبوت مل سکتا ہے جن سے حقیقی معنی درست ہو سکتے ہیں تو پھر مجاز مراد لینے کی کون سی مجبوری ہے، جس کے لیے ایسی رکیک اور بارد تاویل اختیار کی جائے؟ اور ہمارا بیان کردہ مطلب ہی سابق اور آئندہ دلائل کا ساتھ دیتا ہے، جس کو صحیح ہونے کے ساتھ جمہور کی تائید کا شرف بھی حاصل ہے۔

ورابعاً۔ کیا مبارک پوری صاحبؒ فَلَمَّا سَكَتَ عَنْ مُّوْسَى الْغَضَبُ اور اُمِرْنَا بِالسُّكُوْتِ اور سُئِلَ النَّبِیُّ صلی اللہ علیہ وسلم عن الروح فسکت (بخاری جلد ۱ ص ۲۴) وغیرہ کا یہ معنی کریں گے۔ کہ موسیٰ علیہ السلام کا غصہ آہستہ آہستہ بولتا رہا۔ ہمیں نماز میں آہستہ آہستہ سلام وکلام کرنے کی اجازت دے دی گئی۔ سائلین کے سوال کے بعد آپ آہستہ بولتے رہے؟ اور کیا یہ فَاصْدَعْ بِمَا تُؤْمَرُ کے خلاف نہ ہوگا؟ اور دل میں آہستہ آہستہ بولنے سے سائلین کو کیا فائدہ تھا؟ لہٰذا اس استدلال میں بھی کوئی جان نہیں ہے۔

تیرھواں اعتراض۔

حافظ ابن ہمامؒ نے آیت واذا قرئ القرآن کا یہ مطلب بیان کیا ہے کہ فاستمعوا میں اللہ تعالیٰ نے جہری نمازوں میں قرأت سے مقتدیوں کو منع کیا ہے اور انصتوا میں سری نمازوں میں ان کو قرأت سے روکا ہے۔ مبارکپوری صاحب ان پر گرفت کرتے لکھتے ہیں کہ ابن ہمامؒ کے کلام میں تین فساد ہیں:

۱۔ ابن ہمامؒ انصات کا معنی سکوت سمجھے ہیں۔ حالانکہ انصات کا معنی مطلق سکوت کے نہیں ہیں بلکہ سکوت مع الاستماع کے ہیں۔

۲۔ ابن ہمامؒ کی تفسیر بالرائے ہے۔ (جس کا حرام ہونا مبرہن ہے)

۳۔ سری نمازوں میں سماع قرأت کے بغیر تدبر کیسے متصور ہو سکتا ہے؟ (تحقیق الکلام ج۲ ص۳۶)

جواب ۔ مبارک پوری صاحبؒ کی تینوں شقیں مردود ہیں:

پہلی اس لیے کہ مبارک پوری صاحبؒ خود غلطی کا شکار ہیں۔ وہ سماع اور استماع کو ایک سمجھتے ہیں۔ حالانکہ سماع اور استماع میں زمین آسمان کا فرق ہے اور متعدد حوالوں سے پہلے یہ امر ثابت

کیا جاچکا ہے۔ اگر واقعی استماع کا معنی سننا ہوتا تو حافظ ابن ہمامؒ پر اعتراض کی گنجائش تھی۔ اور دوسری شق اس لیے مخدوش ہے کہ حافظ ابن ہمامؒ کی تفسیر بعینہٖ قرآن کریم، صحیح احادیث لغت اور جمہور مفسرین کی تفسیر ہے۔ لہٰذا اس کو تفسیر بالرائے سے تعبیر کرنا ان دلائل سے غفلت اور بے خبری پر مبنی ہے۔ اور بلا تحقیق یہ الزام لگانا کھلی جسارت ہے۔ اور تیسری شق اس لیے باطل ہے کہ اگر مبارکپوری صاحبؒ اس دھوکہ میں مبتلا ہیں کہ استماع کا مطلب سماع ہے (اور کبھی تو وہ سماع قرأت کی آڑ لیتے ہیں) تو اس کی پوری تفصیل پہلے عرض کی جا چکی ہے کہ سماع اور استماع میں فرق ہے۔ اور اگر وہ اس غلط فہمی کا شکار ہیں کہ انصات کا سماع کے بغیر تحقق نہیں ہو سکتا تو یہ بھی باطل ہے۔ کیونکہ انصات کے مفہوم میں من وجہ استماع اور توجہ تو شامل ہے لیکن اس میں سماع ہرگز شامل نہیں ہے۔ ایک حدیث بایں الفاظ آتی ہے۔

وان نأی وجلس حیث لا یسمع فانصت ولم یلغ کان لہ کفل من الاجر۔ (الحدیث) (ابوداؤد جلد ا ص ۱۵۱)	اگر کوئی شخص جمعہ کے خطبہ کے وقت امام سے دور بیٹھ گیا جہاں سے امام کی آواز وہ نہیں سن سکتا اور خاموش رہا تو اس کو ایک درجہ ثواب حاصل ہوگا۔

اس حدیث سے معلوم ہوا کہ انصات کے لیے سماع شرط نہیں ہے۔ انصات وہاں بھی ہو سکتا ہے بلکہ ہوتا ہے جہاں خطبہ وغیرہ کچھ بھی نہ سنا جا سکتا ہو۔ اگر انصات کے تحقق کے لیے سماع شرط ہوتا تو بغیر سماع کے انصات نہ پایا جا سکتا۔ اور یہ بھی مت بھولیے کہ انصات میں گو فی الجملہ استماع ملحوظ ہے لیکن من کل الوجوہ استماع بھی اس میں ضروری نہیں ہے۔ انصات کا معنی خاموش ہونا ہے اور یہ معنی بغیر استماع اور توجہ کے بھی متحقق ہو سکتا ہے اور استماع کے ساتھ بھی متحقق ہو سکتا ہے۔ حافظ ابن حجرؒ لکھتے ہیں:

فالانصات ھو السکوت وھو یحصل ممن یسمع وممن لا یستمع کان یکون مفکرا فی امر آخر۔ (فتح الباری جلد ۲ ص ۲۰ بحوالہ فتح الملہم)	انصات کا معنی سکوت کرنا اور خاموش رہنا ہے اور انصات ایسے شخص سے بھی ہو سکتا ہے جو استماع اور توجہ کرے اور انصات اس شخص سے بھی ہو سکتا ہے جو استماع اور توجہ نہیں کرتا، بلکہ کسی اور امر کی فکر میں ڈوب کر خاموش ہے۔

بہر حال مبارکپوری صاحبؒ کی پیش کردہ تینوں شقیں باطل ہیں اور اس کے مصداق ہیں کہ ...... ع: میں الزام ان کو دیتا تھا قصور اپنا نکل آیا

مؤلف خیر الکلام نے (اور انھیں کی پیروی میں قاضی مقبول احمد صاحب نے ملاحظہ ہو الاعتصام ۵ر اکتوبر ۱۹۶۲ء) اس سلسلہ میں جو مخلص تلاش کیا ہے وہ بھی بڑا ہی عجیب ہے۔ انھوں نے ص ۳۷۰ سے ص ۳۹۹ تک کئی صفحات اس پر سیاہ کر ڈالے ہیں مگر بعض باتوں کو شاید وہ خود بھی نہ سمجھے ہوں کہ میں کیا کہہ رہا ہوں صرف کچھ کہنے اور لکھنے کا نام جواب نہیں ہوتا۔ ذیل کے امور کو ملحوظ رکھیں۔

۱۔ ہم نے کتب لغت سے باحوالہ یہ ثابت کیا ہے کہ انصات کے معنی بالکل خاموشی اور استماع کے معنی کان دھرنا اور توجہ کرنا ہے، مؤلف مذکور کا یہ فریضہ تھا کہ وہ باحوالۂ کتبِ لغت یہ ثابت کرتے کہ انصات مطلق خاموشی نہیں بلکہ اس میں کلام کرنا درست ہے اور استماع کا معنیٰ کان دھرنا اور توجہ کرنا نہیں بلکہ اس کا معنیٰ سننا اور آہستہ آہستہ بولنا ہے لیکن جب وہ اس سے بالکل لاجواب رہے تو یہ کہکر جان چھڑالی ہے کہ پھر ہم کو اس بحث میں پڑنے کی ضرورت نہیں ہے کہ سکوت اور انصات لغت کے لحاظ سے آہستہ پڑھنے کے ساتھ جمع ہو سکتے ہیں یا نہیں ؟ بلکہ ہمارے لیے اس قدر کافی ہے کہ ہم ثابت کردیں کہ قرآن مجید کی آیت زیر بحث میں جو استماع اور انصات آیا اس سے بالکل خاموشی مراد نہیں ... اھ (ص ۳۷۱) مگر یقین جانیے کہ اس سے بالکل خاموشی مراد ہے۔ حضرات ائمہ لغتؒ اور جمہور مفسرینؒ کی روشن عبارتیں اس کا بیّن ثبوت ہے۔ جن کے حوالے گذر چکے ہیں چونکہ لغت سے ہی ایک ایسا فن ہے جو بلا کسی فریق کے لحاظ کے صحیح بات بتاتا ہے۔ اس لیے مؤلف خیر الکلام لغت سے اپنی تائید پیش کرنے سے بالکل قاصر رہے ہیں۔

۲۔ جن روایات سے انھوں نے استدلال کیا ہے کہ سکوت قرأۃ کے ساتھ جمع ہو سکتا ہے ان میں ایک روایت بخاری کی اور ایک مستدرک وغیرہ کی ہے کہ اسکاتك ما بين التكبير والقرأة ما تقول ... الخ ويسكت بعد القرأة هنية يسأل الله من فضله۔ تو ہم نے احسن الکلام میں اس کی تصریح کر دی ہے کہ نصِ قرآنی میں انصات و استماع

کالفظ ہے اور مبارکپوری صاحبؒ انصات اور سکوت میں فرق ہے اس لیے یہ جملہ حوالے ہمارے خلاف نہیں ہیں کیونکہ ہمارا استدلال تو انصات و استماع کے لفظ سے ہے اور اور انصات وسکوت میں فرق ہے۔

۳- فتح الباری جلد ۱ ص ۴۰۳ کے حوالہ سے ابن جریجؒ سے جو روایت نقل کی گئی ہے کہ لوگ مؤذن کی اذان کے لیے خاموش رہتے تھے بایں ہمہ وہ اذان کے کلمات دہراتے تے جس سے مؤلف خیر الکلام نے یہ ثابت کرنے کی سعی کی ہے کہ انصات میں تکلم درست ہے۔ (محصلہ خیر الکلام ص ۲۷۲) تو یہ اثر بالکل ضعیف ہے کیونکہ اس میں حُدِّثْتُ ہے اور یہ معلوم نہیں کہ بیان کرنے والا کون ہے؟ اور ہے بھی موقوف اس میں مرفوع روایات کے مقابلہ میں کیا حجت ہے؟ علاوہ ازیں اذان پر قیاس باطل ہے کیونکہ اذان میں ہر کلمہ کے بعد وقفہ ہوتا ہے جس میں اجابتِ مؤذن ہو سکتی ہے۔ بخلاف امام کے پیچھے قرأت کے کہ سکتات کا تو صحیح احادیث سے ثبوت نہیں اور مقتدی کو پڑھنا منع ہے۔

۴- مجمع الزوائد جلد ۲ ص ۱۴۳ سے جو روایت نقل کی ہے کہ من صام رمضان فی انصات وسکون .... الخ اس کی سند درکار ہے کہ آیا صحیح بھی ہے یا نہیں؟ ضعیف قسم کی روایتوں سے قرآن و احادیث صحاح اور اجماع امت اور لغت کو کس طرح رد کیا جا سکتا ہے؟ علامہ ہیثمیؒ فرماتے ہیں کہ اس کی سند میں الولید بن الولید ہے۔ امام ابوحاتمؒ اس کی توثیق کرتے ہیں۔۔ وضعفه جماعة اور دیگر حضرات محدثین کرامؒ اس کو ضعیف قرار دیتے ہیں۔ (مجمع الزوائد جلد ۳ ص ۱۴۳) علاوہ ازیں اس سے جھوٹ، گالی گلوچ اور غیبت وغیرہ سے صحیح معنی میں انصات مراد ہے جیسا کہ مقتدی کے لیے انصات عن القراءة مراد ہے۔ کیونکہ باقی باتوں کا تو نماز میں احتمال ہے ہی نہیں اور جن حضرات سے اس کے علاوہ کچھ اور منقول ہے تو وہ لاعلمی پر مبنی ہے۔

۵- جو آیات مؤلف خیر الکلام نے ص ۲۷۶ پر پیش کی ہیں کہ قرآن کریم کی تلاوت کے وقت کچھ کلمات کہہ سکتے ہیں تو انھوں نے یقولون اور قالوا کے الفاظ پر غور نہیں کیا کیونکہ یہ زبان کے ساتھ پڑھنے پر نص نہیں ہیں دل میں کہنے پر بھی قال اور یقول کا اطلاق صحیح ہے۔

حضرت یوسف علیہ السلام نے ایک خاص موقع پر اپنے بھائیوں سے کہا: قَالَ اَنْتُمْ شَرٌّ مَّكَانًا ...... الآیۃ۔ حافظ ابن کثیرؒ اس کا مطلب یہ بیان کرتے ہیں کہ قال ھٰذا فی نفسہ (ابن کثیر جلد ۲ صفحہ ۴۸۶) یہ قول انھوں نے دل میں کہا تھا، مؤلف مذکور کو معلوم ہونا چاہیے کہ نزاع قرأ اور یقرأ کے الفاظ میں ہے قال اور یقول میں نہیں ہے اور نہ ان کی پیش کردہ آیات سے انصات اور استماع کے وقت قرأت ثابت ہوتی ہے۔

۷۔ مؤلف خیر الکلام نے جو قرائن پیش کیے ہیں کہ انصات وسکوت وغیرہ کے ساتھ قرأت ہو سکتی ہے تو اگر ان کو صحیح بھی تسلیم کر لیا جائے تب بھی مجاز ہے اور انصات واستماع کا جو معنی ہم نے کیا ہے وہ حقیقت ہے جو صحیح احادیث کے علاوہ اجماعِ اُمّت اور لغت سے قوی طور پر مؤید ہے اس لیے اس کو ترک کرنا کسی طرح صحیح نہیں ہے اور نہ اس کو کوئی سننے کے لیے تیار ہے چنانچہ خود مؤلف خیر الکلام لکھتے ہیں کہ کیونکہ ہم کو اس امر کی ضرورت ہے کہ معلوم کریں کہ آیت میں استماع اور انصات کا کیا درجہ ہے خواہ وہ اطلاق حقیقی ہو یا مجازی۔ جب یہ ثابت ہو جائے تو مدعٰی حاصل ہو جاتا ہے باقی بحث زائد ہے (ص ۲۷۱) آپ پر کیا مصیبت وارد ہوتی ہے کہ آپ اطلاقِ مجازی کے پیچھے کمربستہ ہو کر نصوص صحیحہ کی خلاف ورزی کر رہے ہیں جو کچھ ائمہ لغت اور جمہور امت نے کہا ہے اسے تسلیم کر لیں۔ اور یہ بات بھی قابلِ غور ہے کہ جن حضرات سے انصات و استماع اور سکوت وغیرہ کے حوالے مؤلف خیر الکلام نے نقل کیے ہیں چونکہ وہ اس مسئلہ میں فریق کی حیثیت رکھتے ہیں جن کی تفسیر میں ان کا اپنا ذہن بھی کارفرما ہے اور ان کی تفسیر خود محل نزاع ہے اس لیے صحیح احادیث اور کتب لُغت ہی سے ان کے معانی حل ہو سکتے ہیں۔ مؤلف خیر الکلام ص ۲۸۹ میں لکھتے ہیں کہ پس ضروری ہے کہ جو آیت میں بالکل خاموشی کا معنی لیتا ہے وہ دو باتیں ثابت کرے۔ ایک یہ کہ انصات لُغت میں بالکل خاموشی کے معنی میں آتا ہے۔ دوم یہ کہ اس کے خلاف جو قرائن پیش کیے جاتے ہیں وہ صحیح نہیں ہیں ..... اھ

بحمد اللہ تعالٰی ہم کتب لُغت سے ثابت کر چکے ہیں کہ انصات کے معنی لغت میں بالکل خاموشی کے آتے ہیں اور جو قرائن اس کے خلاف پیش کیے گئے ہیں وہ سب مجازی ہیں۔ اس لیے حقیقت کو ترک کرنا کسی طرح صحیح نہیں ہے اور نہ شاذ اور خلافِ اجماع قول کو لے کر جمہور کا مسلک رد

کیا جا سکتا ہے۔

۷۔ مؤلف خیر الکلام نے ص ۳۰۷ میں جو یہ لکھا ہے کہ اگر انصت بدون لام کے ذکر ہو تو سکوت کے معنی میں ہے اور جب اس کے ساتھ لام ہو تو اس میں استماع بھی ہے۔ اور قاموس جلد ۱ ص ۱۵۹ کا حوالہ انصتہٗ وله سکت له واستمع لحدیث نقل کیا ہے اور لکھا ہے کہ چونکہ اس کا عطف فاستمعوا له پر ہے لہٰذا یہاں بھی لام ہے یا مقدر مانی جائیگی۔ (محصلہ) تو یہ محض لفظوں کا کرتب ہے محض لفظوں کی شعبدہ بازی سے کیا بنتا ہے۔ قاموس میں انصتہٗ وله، لام کے ساتھ ساتھ ہو یا بدون لام کے دونوں کے معنی سکت کیا ہے اور قرآن کریم میں انصات اور استماع دو الگ الگ حکم ہیں۔ ایک کی لام دوسرے کو دے کر کام نکالنا اور اس طرح کی خانہ پری سے کچھ نہیں بنتا۔

۸۔ ہم نے قاموس کا حوالہ دیا ہے۔ اس پر مؤلف خیر الکلام ص ۲۹۳ میں لکھتے ہیں کہ قاموس میں اس سے آگے لکھا ہے کہ وَرَجُلٌ سِكِّتٌ قَلِيلُ الْكَلَامِ فاذا تکلم احسن (قاموس جلد ۱ ص ۹۳) یہ آدمی سکت ہے یعنی کم باتیں کرتا ہے جب کلام کرتا ہے تو اچھا کلام کرتا ہے .... الخ مگر اس حوالہ سے مؤلف کو کیا فائدہ؟ رجل سکت کا معنیٰ تو یہ ہے کہ خاموش طبع کم گو ہے مگر جب کلام کرتا ہے تو اچھا کلام کرتا ہے۔ اس میں یہ کہاں ہے کہ وہ خاموشی اور انصات کے وقت کلام کرتا ہے جو مؤلف مذکور کا مدعیٰ ہے۔ انصات اور خاموشی اپنے وقت پر ہے اور کلام اپنے وقت پر ہے۔ دونوں کا وقت ایک نہیں ہے۔ اللہ تعالیٰ مؤلف مذکور کو سمجھ عطا فرمائے ان کو ثابت تو یہ کرنا ہے کہ انصات کے وقت کلام ہو رہا ہے۔ اور اس حوالہ میں اس کا ذکر کوئی نہیں۔ خاموشی اپنے وقت پر ہے اور کلام اپنے وقت پر ہے۔ اور اس بات کو ایک عام آدمی بھی بخوبی سمجھتا اور سمجھ سکتا ہے۔ مگر ع : اک دل ہے جو ہر لحظہ الجھتا ہے خرد سے

چودھواں اعتراض

حضرت امام بخاری رح[۱]، امام ترمذی رح[۲]، امام بیہقی رح[۳]، مولانا شمس الحق رح[۴]، مولانا ابو عبد الرحمٰن

---

[۱] جزء القرأة ص ۹ و ۵۸
[۲] ترمذی جلد ۱ ص ۴۲
[۳] کتاب القرأة ص ۱۷ و ۲۹
[۴] التعلیق المغنی جلد ۱ ص ۱۲۵

محمد عبد اللہ[۱]، مولانا عبد الصمد[۲] اور مبارک پوری صاحب[۳] وغیرہ فرماتے ہیں کہ ہم یہ تسلیم کر لیتے ہیں کہ آیتِ استماع اور انصات کا مطلب یہی ہے کہ مقتدی کو بحالتِ قرأتِ امام توجہ کرتے ہوئے خاموشی اختیار کرنی چاہیئے اور جب امام قرأت کر رہا ہو تو اس وقت مقتدی کو کچھ بھی نہیں پڑھنا چاہیے اور مکمل خاموشی اختیار کرنی چاہیے لیکن مقتدی کو سکتاتِ امام میں قرأت کرنی چاہیے اور سکتات میں قرأت کرنا آیت مذکورہ کے منافی نہیں ہے اور سکتات کا ثبوت یہ ہے۔

۱۔ حضرت ابن عمرؓ فرماتے ہیں کہ امام جس وقت سکتہ کرے تو اس وقت مقتدی کو قرأت کرنی چاہیے کیونکہ جس شخص نے قرأت نہ کی۔ اس کی نماز میں خلل اور نقصان واقع ہوگا۔ (کنز العمال جلد ۴ ص ۹۶)

۲۔ حضرت ابوہریرہ رضؓ فرماتے ہیں کہ آں حضرت صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ جو شخص امام کے ساتھ فرض نماز میں شریک ہو۔ اس کو امام کے سکتات میں سورۃ فاتحہ پڑھنی چاہیے۔ (کتاب القرأۃ ص ۵۴، مستدرک جلد ۱ ص ۲۳۸)

۳۔ عمرو بن شعیب عن ابیہ عن جدہٖ سے روایت ہے کہ جب آں حضرت صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم انصات اور سکتہ کرتے تھے تو اس وقت حضرات صحابہ کرام رضی اللہ تعالیٰ عنہم آپ کے پیچھے قرأت کر لیا کرتے تھے۔ (کتاب القرأۃ ص ۶۹، ۸۶)

۴۔ ہشامؒ بن عروہؒ اپنے باپ سے روایت کرتے ہیں۔ انھوں نے فرمایا کہ اے فرزند جب امام سکتہ کرے تو تم اس وقت قرأت کر لیا کرو۔ اور جب امام قرأت کرے تو اس وقت تم خاموش ہو جاؤ۔ کیونکہ فرض نماز ہو یا نفل۔ اگر اس میں سورۃ فاتحہ نہ پڑھی جائے تو نماز ادا نہیں ہوتی۔ (جزء القرأۃ ص ۵۸، کتاب القرأۃ ص ۸۷)

۵۔ حضرت ابوسلمہؒ یا حضرت ابوہریرہ رضؓ سے روایت ہے کہ امام کے لیے دو سکتے ہوتے ہیں۔ ان کو سورۃ فاتحہ کی قرأت کے لیے غنیمت سمجھو۔ (جزء القرأۃ ص ۵۸ و کتاب القرأۃ ص ۷۰)

---

[۱] عقیدہ محمدیہ جلد ۲ ص ۱۸۳ [۳] تحقیق الکلام جلد ۲ ص ۱۵۱ و ابکار المنن ص ۱۴۸

[۲] اعلام الاعلام ص ۱۹۰ (ہم نے ان تمام حضرات کے دلائل کا قدر مشترک نقل کیا ہے۔)

۶- حضرت سعیدؒ بن جبیرؒ کا بیان ہے کہ سلف کا طریقہ یہ تھا کہ جب ان کو کوئی نماز پڑھاتا اور امامت کا فریضہ بجالاتا تو نماز میں ضرور سکتہ کیا کرتا تھا تاکہ مقتدی سورۃ فاتحہ پڑھ لیں۔

(جزء القرآۃ ص ۵۷)

ان روایات سے معلوم ہوا کہ سکتات امام کا وجود اور ثبوت بھی ہے۔ لہٰذا اس صورت میں قرآنِ کریم اور حدیث دونوں پر عمل ہو جائے گا۔

جواب - ان حضرات کا یہ استدلال نہایت ضعیف اور کمزور ہے۔ کیونکہ یہ اکثر و بیشتر روایات حضرات صحابہؓ و تابعینؒ پر موقوف ہیں اور پہلے نقل کیا جا چکا ہے کہ فریقِ ثانی کے نزدیک "در موقوفات صحابہؓ حجت نیست"۔ جب حضرات صحابہ کرامؓ کا یہ حال رہا تو تابعینؒ اور اتباعِ تابعینؒ وغیرہمؒ کی کیا پوزیشن باقی رہ جاتی ہے۔ اور یہ جتنے آثار و روایات نقل کی گئی ہیں۔ ان میں ایک بھی صحیح نہیں ہے۔ ترتیب وار جوابات ملاحظہ کریں:

اثر ابن عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہما - اولاً - یہ اثر موقوف ہونے کے ساتھ حضرت ابن عمرؓ سے نہیں۔ بلکہ حضرت عبداللہؓ بن عمروؓ بن العاص سے مروی ہے۔ ابن عمرؓ کا نام لینا راوی یوں ہیں سے کسی کی غفلت اور غلطی کا نتیجہ ہے۔ (دیکھیے کتاب القرآۃ ص ۴۵)

وثانیاً - اس میں سورۃ فاتحہ کی تصریح موجود نہیں ہے۔ اس لیے یہ اثر مجمل ہے۔

وثالثاً - اس کی سند میں مثنیٰ بن صباح راوی کمزور ہے۔ امام بخاریؒ لکھتے ہیں کہ اس کے دماغ میں فتور آگیا تھا۔ (ضعفاء صغیر ص ۳۰) امام نسائیؒ اس کو متروک کہتے ہیں۔ (ضعفاء صغیر نسائی ص ۵۳) حافظ ابن حجرؒ لکھتے ہیں کہ وہ ضعیف ہے (تقریب ص ۳۴۶) امام یحییٰ القطانؒ اور ابن مہدیؒ اس کی روایت کو قبول نہیں کرتے تھے۔ امام احمدؒ کہتے ہیں کہ وہ محض ہیچ ہے۔ ابن معینؒ اس کو لیس بذاك اور ابن عدیؒ ضعیف کہتے ہیں (میزان الاعتدال جلد ۳ ص ۷)۔ امام ترمذیؒ، ابن سعدؒ، علیؒ بن الجنیدؒ، دارقطنیؒ، ابن حبانؒ، ساجیؒ ابو احمد الحاکمؒ، سحنونؒ اور امام عقیلیؒ وغیرہ سب اس کی تضعیف کرتے ہیں۔

(تہذیب التہذیب جلد ۱۰ ص ۳۶)

حدیث ابو ہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ - اس روایت کی سند میں محمدؒ بن عبداللہؒ بن

عمیر رح موجود ہے۔ امام بخاری رح لکھتے ہیں کہ وہ ضعیف تھا (ضعفاء ص ۲۸) امام مسلم رح لکھتے ہیں کہ امام یحییٰ القطان رح اس کی تضعیف کرتے تھے۔ (مسلم جلد ۱ ص ۲۰) امام نسائی رح اس کو متروک کہتے ہیں۔ (ضعفاء صغیر ص ۲۵) امام بیہقی رح لکھتے ہیں کہ وہ قابل احتجاج نہیں۔ (کتاب القرأۃ ص ۵۴) امام دارقطنی رح کہتے ہیں کہ وہ ضعیف ہے۔ (دارقطنی جلد ۱ ص ۱۲۱) امام ترمذی رح کہتے ہیں کہ وہ قوی نہیں (ترمذی جلد ۲ ص ۱) امام یحییٰ رح بن معین رح اس کو ضعیف کہتے ہیں۔ (میزان الاعتدال جلد ۲ ص ۷۷ ولسان المیزان جلد ۵ ص ۲۱۶) علاوہ ازیں اس روایت میں صلوٰۃ مکتوبہ کی قید ہے۔ حالانکہ فریق ثانی کے نزدیک صلوٰۃ تراویح ..... صلوٰۃ عید اور صلوٰۃ وتر وغیرہ میں بھی امام کے پیچھے قرأت فاتحہ ضروری ہے۔ حضرت ابوہریرہ رض سے ایک موقوف اثر بھی مروی ہے۔ کہ سکتۂ امام میں قرأت فاتحہ کے بغیر نماز مکمل نہیں ہوسکتی (کتاب القرأۃ ص ۶۶) لیکن اس کی سند میں اسحاق بن عبداللہ بن ابی فروہ نہایت ضعیف اور کمزور راوی موجود ہے۔ جس کی پوری بحث اپنے مقام پر آئے گی۔ انشاء اللہ العزیز

روایت عمرو بن شعیب رح عن ابیہ ..... الخ عمرو بن شعیب عن ابیہ عن جدہ کے روایتی سلسلہ میں محدثین کا کلام معروف و مشہور ہے۔ امام یحییٰ القطان رح فرماتے ہیں کہ اس کی سند ہمارے نزدیک ضعیف اور کمزور ہے۔ (ترمذی جلد ۱ ص ۴۳، ۱ ص ۸۲) امام ابوداؤد رح ایک سوال کے جواب میں فرماتے ہیں کہ وہ آدھی حجت بھی نہیں۔ امام ابوزرعہ رح فرماتے ہیں کہ محدثین اس لیے ان پر کڑی جرح کرتے ہیں کہ انھوں نے اپنے باپ سے چند روایتیں سنیں ہیں اور وہ باپ دادا کی تمام غیر مسموع روایات کو بلا تحاشا[1] بیان کرتے ہیں۔ (میزان الاعتدال جلد ۲ صفحہ ۲۸۹) حافظ ابن حجر رح لکھتے ہیں کہ انھوں نے عن ابیہ عن جدہ کے طریق سے کچھ بھی نہیں سنا۔ وہ کتاب سے نقل کرکے محض تدلیس سے کام لیتے ہیں۔ (طبقات المدلسین ص ۱۱) امام طحاوی رح بھی ان کی سند کو منقطع سمجھتے ہوئے اس کو ضعیف کہتے ہیں (طحاوی جلد ۱ ص ۳۵)

---

[1] حضرات محدثین کرام رح کا یہ ضابطہ ہے۔ اگر استاد اپنی کتاب اور بیاض سے روایت کرنے کی شاگرد کو اجازت نہ دے۔ تو وہ اس کتاب اور بیاض سے روایات بیان کرنے کا مجاز نہیں اور اس کی ایسی روایتیں قابل حجت نہیں ہوسکتیں۔ (شرح نخبۃ الفکر ص ۱۰۰)

امام حاکم رح کہتے ہیں کہ ان کی روایت مرسل ہونے کی وجہ سے ضعیف سمجھی جاتی ہے۔ (مستدرک جلد ا ص ۱۰۷) محدث ابن حزم رح لکھتے ہیں کہ عمرو بن شعیب کتاب سے روایت نقل کرتے ہیں جو کسی طرح بھی صحیح نہیں ہے اما حدیث عمرو بن شعیب عن ابیہ عن جدہ فصحیفۃ لا تصح۔ (محلی ابن حزم جلد ا ص ۲۳۲)

امام علی بن المدینی فرماتے ہیں کہ عمرو بن شعیب جب عن ابیہ عن جدہ کے طریق سے روایت نقل کرے تو وہ کتاب سے (جو انھوں نے پائی تھی) نقل کرتا ہے فھو ضعیف المداوہ ضعیف ہے۔ ابن عدی فرماتے ہیں کہ وہ فی نفسہ ثقہ ہے مگر عن ابیہ عن جدہ کے طریق سے مرسل ہے ابن حبان فرماتے ہیں کہ جب وہ طاوس اور سعید بن المسیب وغیرہ ثقات سے روایت نقل کرے تو حجت ہے۔ اور جب عن ابیہ عن جدہ کے طریق سے روایت کرے تو اگر جدہ سے عبداللہ رح مراد ہیں تو حدیث منقطع ہوگی اور اگر محمد مراد ہوں تو مرسل ہوگی (تہذیب التہذیب جلد ۸ ص ۵۴) اور محدث ساجی فرماتے ہیں کہ

قال ابن معین ھو ثقہ فی نفسہ و ماروی عن ابیہ عن جدہ لا حجۃ فیہ ولیس بمتصل وھو ضعیف... الخ

(تھذیب التھذیب جلد ۸ ص ۸)

امام ابن معین نے فرمایا کہ وہ فی نفسہ ثقہ ہے لیکن جب عن ابیہ عن جدہ سے روایت کرے تو حجت نہیں اور اس کی سند متصل نہیں بلکہ ضعیف ہے۔

امام میمونی فرماتے ہیں کہ میں نے امام احمد بن حنبل سے سنا:

یقول لہ اشیاء مناکیر انما یکتب حدیثہ یعتبر بہ فاما ان یکون حجۃ فلا (ایضاً ص ۴۹)

انھوں نے فرمایا کہ اس سے بہت سی منکر اشیا بھی ہیں اس کی حدیث اعتبار کے لیے تو لکھی جاسکتی ہے لیکن حجت کسی صورت میں نہیں ہو سکتی۔

اور امام اثرم فرماتے ہیں کہ امام احمد بن حنبل نے فرمایا کہ میں اس کی حدیثیں لکھ لیتا ہوں کبھی کبھی تو اس سے احتجاج کر لیتا ہوں۔

وربما وجس فی القلب منہ شیٔ (ایضاً ص ۴۹)

اور کبھی اس سے دل میں کھٹکا گذرتا ہے۔

اس سے معلوم ہوا کہ مؤلف خیر الکلام نے (۱۹۳ و ۱۹۴) میں بحوالہ تحفۃ الاحوذی جلد ا ص ۲۶۷)

امام احمدؒ اور امام علیؒ بن المدینیؒ کے بارے میں جو یہ لکھا ہے کہ وہ عمروؒ بن شعیبؒ کی روایت کو قابل اعتبار سمجھتے ہیں صحیح نہیں ہے اور علامہ ذہبیؒ نے عمرو بن شعیبؒ کی روایت کو جو حسن کہا ہے تو اس سے اس کی دوسرے طرق سے روایت مراد ہے نہ کہ عن ابیہ عن جدہ کے طریق سے کیونکہ اس پر امام الجرح والتعدیل امام یحییٰؒ بن سعید القطانؒ اور یحییٰؒ بن معینؒ وغیرہ کی مفصل جرح موجود ہے۔

امام ابن حبانؒ اپنا فیصلہ یہ بیان کرتے ہیں کہ فی روایتہ عن ابیہ عن جدہ مناکیر کثیرۃ لا یجوز عندی الاحتجاج بشیء منہا۔ (اسعاف المبطأ برجال الموطأ ص۲۱)

عمروؒ بن شعیبؒ کی عن ابیہ عن جدہ کے طریق سے میرے نزدیک کوئی روایت قابل احتجاج نہیں ہے کیونکہ ان میں کثرت سے نکارت ہوتی ہے۔

حافظ ابن حجرؒ لکھتے ہیں: بعض محدثینؒ ان کی مطلقاً تضعیف کرتے ہیں اور جمہور ان کی توثیق کرتے ہیں اور بعض دیگر ان کی بعض روایتوں کو ضعیف اور کمزور سمجھتے ہیں اور اپنا فیصلہ یوں ارقام فرماتے ہیں:

ومن ضعفہ مطلقا فمحمول علی روایتہ عن ابیہ عن جدہ (تہذیب التہذیب ج۸ ص۵)	جو حضرات ان کی مطلقاً تضعیف کرتے ہیں۔ سو ان کی یہ تضعیف صرف عن ابیہ عن جدہ کے طریق پر محمول ہوگی۔

علامہ سید سلیمان ندویؒ (المتوفی ۱۳۷۳ھ) لکھتے ہیں کہ اور یہ بیچارے اس لیے ضعیف سمجھے جاتے تھے کہ ان کو کتاب مل گئی تھی جس سے حدیثیں نقل کرتے وقت وہ تدلیس سے کام لیتے تھے۔ (خطبات مدراس ص ۵۳) عمروؒ بن شعیبؒ عن ابیہ عن جدہ کے طریق سے ایک اور روایت بھی مروی ہے کہ جس نے سکتات امام میں سورۂ فاتحہ کی قرأت نہ کی تو اس کی نماز کامل ادا نہ ہوگی۔ (کتاب القرأۃ ص ۵۵-۵۴)

لیکن اس کی سند میں علاوہ عمروؒ بن شعیبؒ عن ابیہ عن جدہ کے محمدؒ بن عبداللہؒ بن عبیدؒ بن عمیرؒ واقع ہے جس کا حال ابھی آپ معلوم کر چکے ہیں۔

ہشامؒ بن عروہ رح کی روایت: ان کی روایت موقوف ہونے کے علاوہ ضعیف بھی

ہے اس کی سند میں موسیٰ بن مسعود ایک راوی ہے۔ امام احمدؒ اس میں کلام کرتے ہیں۔ ترمذیؒ ان کی تضعیف کرتے ہیں۔ امام ابن خزیمہؒ کا بیان ہے کہ اس سے احتجاج درست نہیں۔ بندارؒ اس کو ضعیف الحدیث کہتے ہیں۔ (میزان الاعتدال جلد ۳ ص ۲۸۱) ابوحاتم رح کہتے ہیں کہ مؤمل بن اسماعیل اور ابوحذیفہ (موسیٰ) دونوں کی کتابوں میں بہت غلطیاں ہیں۔ عمروؒ بن علی الفلاسؒ کہتے ہیں کہ کوئی صاحبِ بصیرت محدث اس سے احتجاج نہیں کر سکتا۔ ابواحمد حاکمؒ کا بیان ہے کہ وہ قوی نہ تھا۔ ابن قانعؒ کہتے ہیں کہ اس میں ضعف ہے۔ امام حاکمؒ کہتے ہیں کہ وہ کثیر الوہم اور سیئ الحفظ تھا۔ ساجیؒ اس کو ضعیف کہتے ہیں۔ دارقطنیؒ اس کو کثیر الوہم بتاتے ہیں۔ (تہذیب التہذیب جلد ۱۰ ص ۳۷۱)

علاوہ ازیں اس روایت میں فصاعدًا کی زیادت بھی موجود ہے۔ کیا فریق ثانی سورۃ فاتحہ کے علاوہ کسی اور سورت کا مقتدی کے لیے جواز سمجھتا ہے؟

اثر ابوسلمہؒ یا ابوہریرہؓ۔ یہ اثر بھی موقوف ہونے کے علاوہ ضعیف ہے۔ اس کی سند میں موسیٰ بن مسعود واقع ہے جس کی حقیقت آپ کو معلوم ہو چکی ہے۔ مزید برآں رواۃ کو اس کا پورا یقین بھی نہیں کہ یہ روایت حضرت ابوسلمہؒ تابعی سے ہے یا حضرت ابوہریرہؓ سے مؤلف خیر الکلام کا اس کو مختلف فیہ ہونے کی وجہ سے حدیث حسن کہنا (ملاحظہ ہو خیر الکلام ص ۲۳۷) غلط ہے۔ کیونکہ یہ راوی نرا مختلف فیہ ہی نہیں بلکہ جمہور محدثین کرامؒ کی اس پر کڑی جرح منقول ہے جیسا کہ بیان ہو چکا ہے۔

اثر سعیدؒ بن جبیر رح۔ یہ اثر بھی موقوف ہونے کے علاوہ ضعیف اور کمزور ہے۔ اس کی سند کا ایک راوی عبداللہ بن رجاء مکی ہے۔ امام احمدؒ اور ازدی رح کہتے ہیں کہ اس کی روایت میں نکارت ہوتی ہے۔ (میزان جلد ۲ ص ۳۷) ساجیؒ کا بیان ہے عندہ مناکیر (تہذیب التہذیب جلد ۵ ص ۲۱۱) کہ وہ صاحبِ مناکیر ہے۔ اس سند کی کڑی کا دوسرا ضعیف راوی عبداللہ بن عثمان بن خثیم ہے اسکے بارے حضرات محدثین کرامؒ کے متضاد اقوال منقول ہیں امام ابن معینؒ اسکو ثقہ حجۃ کہتے ہوئے بھی یہ فرماتے ہیں احادیثہ لیست بالقویۃ۔ امام ابوحاتمؒ ما بہ بأس صالح الحدیث کہنے کے باوجود فرماتے ہیں وکان یخطئ اور نیز فرمایا لا یحتج بہ (میزان الاعتدال ج ۲ ص ۵۶) امام نسائیؒ نے ایک مرتبہ ثقہ اور ایک مرتبہ لیس بالقوی کہا اور امام علی بن المدینیؒ اسکو منکر الحدیث کہتے ہیں۔ (تہذیب التہذیب ج ۵ ص ۳۱۵)

امام دارقطنی رحہ کا بیان ہے۔ ضعیف لیثؒ وہ ضعیف ہے اور محدثین اس کو ضعیف اور کمزور سمجھتے ہیں۔ (نصب الرأیہ جلد ۱ ص ۳۵۳) مبارکپوری صاحبؒ کی ستم ظریفی دیکھیے کہ وہ مولانا عبدالحیؒ کے رسالہ امام الکلام ص ۱۷۳ کی آڑ لیتے ہوتے اس ضعیف اور کمزور راوی اثر کو صحیح کہتے ہیں۔ (دیکھیے ابکار المنن ص ۱۶۷) فوا اسفا۔

سعیدؒ بن جبیرؒ کا بعینہٖ اس مضمون کا اثر کتاب القرأۃ ص ۶۹، ۷۰ میں بھی مذکور ہے، لیکن سند میں وہی عبداللہ بن عثمان بن خثیم ہے۔

یہ ہیں وہ روایات و آثار جن سے یہ حضرات سکتات امام میں مقتدی کے لیے قرأت سورۃ فاتحہ تجویز کرتے ہیں۔ ابھی تک جو کچھ عرض کیا گیا ہے وہ سکتاتِ امام کا روایتی پہلو تھا۔ اب آپ درایتی پہلو بھی سن لیجئے۔ جہاں تک سکتاتِ امام کا ثبوت مل سکتا ہے وہ صرف دو سکتے ہیں، پہلا سکتہ تکبیر تحریمہ کے بعد کا سکتہ ہے اور فریق ثانی کو اس امر میں اتفاق ہوگا کہ نہ تو اس میں قرأت سورۃ فاتحہ کا ثبوت ہے اور نہ گنجائش اور دوسرا سکتہ سورۃ فاتحہ کی قرأت سے فارغ ہونے کے بعد امام اس لیے کرتا ہے تاکہ امام

حتّٰی یترادّ الیہ نفسہ۔ (نسائی جلد ۱ ص ۱۰۳) قرأت سے فارغ ہونے کے صرف سانس لے سکے۔

(ابوداؤد جلد ۱ ص ۱۱۳، ترمذی جلد ۱ ص ۳۴، دارمی ص ۱۳۶)

اور صرف اس سکتہ میں سورۂ فاتحہ کی قرأت کیسے ممکن ہے؟ اور پھر ایک سکتہ کے سکتات کیسے بن گئے؟ خود مبارکپوری صاحب لکھتے ہیں:

بل السکتۃ الثانیۃ کانت لان یترادّ الیہ نفسہ کما صرّح بہ قتادۃؒ۔ بلکہ دوسرا سکتہ تو صرف اس لیے ہوتا تھا کہ امام قرأت سے فراغت کے بعد سانس لے سکے۔ جیسا کہ حضرت قتادہؒ نے اس کی تصریح کی ہے۔

(تحفۃ الاحوذی جلد ۱ ص ۲۰۹)

شیخ الاسلام ابن تیمیہؒ لکھتے ہیں کہ امام احمدؒ، امام مالکؒ، امام ابو حنیفہؒ اور جمہور اہل اسلام اس کے ہرگز قائل نہ تھے کہ سورۃ فاتحہ کے بعد امام اس لیے سکتہ کرے تاکہ مقتدی اس میں سورۃ فاتحہ پڑھ لیں اور نہ یہ حضرات سکتہ کے وجوب کے قائل تھے اور نہ استحباب کے۔

(تنوّع العبادات ص ۸۵)

اور دوسرے مقام پر لکھتے ہیں:

ولم نعلم نزاعا بين العلماء انه لا يجب على الامام ان يسكت ليقرأ المأموم بالفاتحة ولا غيرها الى ان قال۔ ولا يستحب للامام السكوت ليقرأ المأموم عند جماهير العلماء وهذا مذهب مالکؒ وابی حنیفۃؒ و احمد بن حنبلؒ وغيرهم۔

یعنی جہاں تک ہمیں معلوم ہے علماء کا اس بات پر اتفاق ہے کہ امام پر سکتہ واجب نہیں ہے تاکہ مقتدی سورۂ فاتحہ پڑھ لیں۔ امام مالکؒ، امام ابوحنیفہؒ اور امام احمدؒ بن حنبلؒ وغیرہ جمہور اہلِ اسلام اس پر بھی متفق ہیں۔ کہ امام کے لیے یہ بات مستحب بھی نہیں ہے کہ وہ سکتہ کرے تاکہ مقتدی قرآت کر سکیں۔

(فتاویٰ جلد ۲ ص ۱۴۶)

قاضی محمد بن عبداللہ ابوبکرؒ ابن العربیؒ[1] المالکی الاندلسی (المتوفی ۵۴۳ھ) مجوزِ سکتات سے یوں خطاب کرتے ہیں کہ

عجباً لك كيف يقدر المأموم فی الجهرية على القراءة اينازع القرآن الامام ام يعرض عن استماعه ام يقرأ اذا سكت قيل له فان لم يسكت وقد اجمعت الامة على ان سكوت الامام غير واجب فمتى يقرأ؟

تعجب ہے تم پر مقتدی کو جہری نمازوں میں قرآت پر کیسے قادر تصور کیا جائے؟ کیا وہ قرأتِ قرآن پر امام سے منازعت کرتا رہے؟ یا استماع سے اعراض کرے؟ یا جب امام سکتہ اختیار کرے تو اس وقت وہ قرآت کرے؟ اگر امام سکتہ نہ کرے تو مقتدی کب پڑھے؟ کیونکہ تمام امت کا اس بات پر اتفاق ہے کہ امام پر سکتہ واجب نہیں ہے۔

(عارضۃ الاحوذی جلد ص بحوالہ اوجز المسالک جلد ۱ ص ۲۴۸)

حافظ ابن القیمؒ لکھتے ہیں کہ آں حضرت صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم سے کسی صحیح حدیث سے یہ بات ثابت نہیں ہو سکتی کہ آپ نے محض اس لیے سکتہ اختیار کیا ہو تاکہ مقتدی سورۃ فاتحہ پڑھ لیں۔ (بحوالہ غیث الغمام ص ۱۷۵)

---

[1] موصوف بہت بڑی قدر و منزلت کے مالک تھے متبحر علمی ذہانت اور خصائل و عادات میں بے نظیر تھے۔ علامہ ذہبیؒ ان کو الحافظ، العلامہ اور القاضی لکھتے ہیں۔ (تذکرہ جلد ۴ ص ۸۶)

محمدؒ بن اسمٰعیلؒ بن الصلاح امیر یمانی (المتوفی ۱۱۸۲ھ) لکھتے ہیں کہ[1]

ثم اختلف القائلون بوجوب القرأة فقیل فی محل سکتات الامام وقیل فی سکوتہ بعد تمام القرأة ولا دلیل لھذین القولین فی الحدیث۔ (سبل السلام شرح بلوغ المرام جلد ۱ صفحہ ۱۰۶)	امام کے پیچھے مقتدی کے لیے قرأت تجویز کرنے والے آپس میں مختلف ہیں۔ ایک گروہ یہ کہتا ہے کہ امام کے سکتات میں قرأت کرنی چاہیے۔ اور دوسرا گروہ کہتا ہے کہ جب امام قرأت سے فارغ ہو جائے تو اس وقت مقتدی کو قرأت کرنی چاہیے لیکن ان دونوں باتوں کا حدیث میں کوئی ثبوت نہیں ہے۔

ان اقتباسات سے یہ بات آفتاب نیمروز کی طرح ثابت ہو گئی ہے کہ سکتات امام کا کسی حدیث سے ثبوت نہیں ملتا۔ اور امت کا اس پر اجماع و اتفاق ہے کہ نہ تو امام پر سکتہ واجب ہے اور نہ مستحب اور یہ بات بعید از قیاس اور انصاف ہے کہ شریعت حقہ مقتدی کو امام کے پیچھے قرأت سورۃ فاتحہ کا مکلف تو بنائے لیکن اس کو قرأت کا موقع اور محل نہ بتلائے، یہ تو ایسا ہی ہوا جیسا کسی نے کہا ہے ؎

درمیانِ قعرِ دریا تختہ بندم کردہ
باز می گوئی کہ دامن تر مکن ہشیار باش

یہ ایسی خرافات ہے، جس سے شریعت حقہ کا دامنِ انصاف بالکل مبرا اور پاک ہے امام ابوبکر الجصاص رحؒ فرماتے ہیں کہ مقتدی کا کام تو یہ ہے کہ وہ امام کی پیروی کرے اور جائز نہیں کہ امام مقتدی کا تابع ہو۔ تو اس قائل کا قول کہ امام سکتہ کرے تاکہ مقتدی قرأت کر لے۔ آں حضرت صلی اللہ تعالیٰ علیہ وآلہ وسلم کے اس قول کے خلاف ہے جس میں آپ نے فرمایا کہ امام اس لیے مقرر کیا جاتا ہے تاکہ اس کی اقتداء کی جائے اور پھر باوجود اس کے یہ معاملہ آں حضرت صلی اللہ تعالیٰ علیہ وآلہ وسلم کے اس ارشاد کے مخالف ہے جس میں آپ نے فرمایا ہے کہ اور جب امام قرأت کرے

[1] نواب صاحبؒ لکھتے ہیں کہ امام صنعانی و علامہ یمین و شاعر مجید و مجتہد مفید و محدث کامل و عارف واصل است، عامل بود بکتاب و سنت بحسب اجتہاد نفس خود تقید بتقلید احدے از اہل علم نداشت۔
(تقصار جیود الاحرار من تذکار جنود الابرار ص ۸۰)

تو تم خاموش رہو اس حدیث میں آپ نے مقتدی کو امام کی قرآت کے لیے خاموشی کا حکم دیا ہے اور سکتات کا قائل امام کو مقتدی کے لیے انصات کا حکم دے رہا ہے۔ اور امام کو مقتدی کا تابع بنا رہا ہے اور یہ قول بالکل اُلٹ ہے۔

اور اس پر بحث کرتے ہوئے مزید ارقام فرماتے ہیں:

وقولہ انما جعل الامام لیؤتم بہ فاذا قرأ فانصتوا اخبار منہ من ان من الائتمام بالامام الانصات لقرأتہ وھذا یدل علی انہ غیر جائز ان ینصت الامام لقرأۃ المأموم لانہ لو کان مأمورا بالانصات لہ لکان مأمورًا بالائتمام بہ فیصیر الامام مأموما والمأموم اماما فی حالۃ واحدۃ وھذا فاسد ..... الخ (احکام القرآن جلد ۳ ص ۵۱)

آں حضرت صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ امام اس لیے مقرر کیا جاتا ہے تاکہ اس کی اقتدا کی جائے پس جب وہ پڑھے تو تم خاموش رہو اس میں آپ نے خبر دی ہے کہ امام کی اقتدا میں یہ امر شامل ہے کہ اس کی قرآت کے لیے خاموشی اختیار کی جائے اور یہ ارشاد صاف بتاتا ہے کہ جائز نہیں کہ امام مقتدی کی قرآت کے لیے انصات کرے کیونکہ اگر وہ اس کا مامور ہوتا تو وہ اقتدا کا مامور ہوتا تو ایک ہی حالت میں امام مقتدی ہو جاتا اور مقتدی امام اور یہ بالکل فاسد ہے۔

پندرھواں اعتراض ۔ حضرت امام بخاریؒ، امام بیہقیؒ[1] اور مبارک پوری صاحبؒ[2] وغیرہ فرماتے ہیں کہ خطبہ جمعہ کے وقت اتنی توجہ اور خاموشی کا حکم اور تاکید آئی ہے کہ اگر کوئی شخص شور و غل مچاتا ہو تو اس کو یہ کہنا بھی صحیح نہیں ہے کہ خاموش ہو جاؤ جیسا کہ صحیح حدیث[3] میں آتا ہے۔

اذا قلت لصاحبک یوم الجمعۃ انصت فقد لغوت۔ (بخاری جلد ۱ ص ۱۲۸، مسلم ۱ ص ۲۸۱)

یعنی جب تم کسی کو جمعہ کے خطبہ کے وقت یہ کہو کہ خاموش ہو جاؤ تو تم نے ایک بیجا اور بے ہودہ حرکت کی۔

اس سے معلوم ہوا کہ خطبۂ جمعہ کے وقت ایسی توجہ اور خاموشی مطلوب ہے کہ امر بالمعروف اور

---

[1] جزء القرآۃ ص ۳۵ [2] کتاب القرآۃ ص ۸۴

[2] تحقیق الکلام جلد ص وغیرہ [3] یہ روایت نسائی جلد ۱ ص ۲۰۷، ابوداؤد جلد ص ۱۵۸، ترمذی جلد ۱ ص ۶۷، ابن ماجہ ص ۷۹ اور طحاوی جلد ۱ ص ۲۱۵ وغیرہ میں بھی موجود ہے۔

نہی عن المنکر بھی اس وقت ساقط ہے لیکن مع ہذا آں حضرت صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے ارشاد[1] فرمایا ہے کہ اذا جاء احدکم یوم الجمعۃ والامام یخطب فلیرکع رکعتین ولیتجوز فیہما (مسلم جلد ۱ ص ۲۸۷) —— جب تم میں سے کوئی شخص اس حالت میں آئے کہ امام جمعہ کا خطبہ پڑھ رہا ہو تو اس آنے والے کو مختصر طریق سے دو رکعت نماز پڑھ لینی چاہیے۔

اس روایت سے معلوم ہوا کہ خطبہ کے وقت نماز پڑھنا جائز ہے، جس میں بہر حال تلاوت قرآن کریم کی جاتی ہے اور یہ انصات کے منافی نہیں۔ لہٰذا اگر کوئی شخص امام کے پیچھے بحالت اقتداء قرأت کرتا ہے تو وہ بھی آیت استماع اور انصات کی مخالفت نہیں کر رہا۔

جواب ۔ جمہور اہلِ اسلام خطبہ کے وقت نماز پڑھنا جائز نہیں سمجھتے۔ امام نوویؒ لکھتے ہیں کہ امام مالکؒ، امام لیثؒ بن سعدؒ، امام ابو حنیفہؒ اور جمہور حضرات صحابہؓ و تابعینؒ اور سلفؒ کا مسلک یہ ہے کہ خطبہ کے وقت نماز صحیح نہیں ہے۔ حضرت عمرؓ، حضرت عثمانؓ اور حضرت علیؓ کا یہی مسلک ہے۔ (شرح مسلم جلد ۱ ص ۲۸۷)

علامہ عراقیؒ کا بیان ہے کہ حضرت ابن عمرؓ، ابن عباسؓ، عروہؒ بن زبیرؓ، مجاہدؒ، عطاءؒ بن ابی رباحؒ، سعیدؒ بن المسیبؒ، محمدؒ بن سیرینؒ، امام زہریؒ، قتادہؒ، ابراہیم نخعیؒ اور قاضی شریحؒ کا بھی یہی مذہب ہے۔ (فتح الملہم جلد ۲ ص ۴۱۵)

امام ترمذیؒ لکھتے ہیں کہ کوفے کے فقہاء اور محدثین کا یہی مسلک تھا۔ (جلد ۱ ص ۶۷) جب جمہور اہلِ اسلام کے نزدیک خطبہ کے وقت نماز پڑھنا جائز نہیں۔ تو اس پر مقتدی کی قرأت خلف الامام کو قیاس کرنا صحیح نہ ہوگا اور جس طرح خطبہ کے وقت نماز استماع اور انصات کے منافی ہے اسی طرح قرأت خلف الامام بھی منافی ہے، جمہور کا کہنا ہے کہ گو آیت واذا قرئ القرآن ..... الآیۃ کا شان نزول صرف نماز ہے لیکن یہ آیت اپنے عموم الفاظ کے اعتبار سے خطبہ کو بھی شامل ہے۔ اس لیے خطبہ کی حالت میں بھی ہر ایسے قول و فعل سے اجتناب ضروری ہے جو استماع و انصات کے منافی ہو اور ظاہر ہے کہ نماز قولاً و فعلاً استماع و انصات کے منافی ہے۔ لہٰذا نماز بھی صحیح

---

[1] یہ روایت ابو داؤد جلد ۱ ص ۱۵۹، نسائی جلد ۱ ص ۱۵۷، ترمذی جلد ۱ ص ۶۷، ابن ماجہ ص ۷۹ اور طحاوی جلد ۱ ص ۱۷۹ وغیرہ میں بھی موجود ہے بعض میں مختصر اور بعض میں قدرے تفصیل سے۔

نہ ہوگی اور آں حضرت صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا ہے کہ

يصلي ما كتب له ثم ينصت اذا تكلم الامام (بخاري جلد۱ ص ۱۲۱، مسلم جلد۱ ص ۲۸۳، طيالسي ص ۷۵)

امام کے آنے سے پہلے جتنی نماز کوئی پڑھنا چاہے پڑھ لے اور پھر جب امام خطبہ شروع کرے تو اس وقت نماز ترک کر کے خاموش ہو جائے۔

اس صحیح حدیث سے معلوم ہوا کہ امام کے خطبہ پڑھنے سے قبل نماز پڑھنا جائز ہے لیکن خطبہ شروع ہونے کے بعد گنجائش نہیں نکلتی اور بغیر خاموشی اور انصات کے کوئی چارہ نہیں اور طیالسی کے یہ الفاظ بھی مدنظر رکھیے فاذا تكلم الامام استمع وانصت۔ جب امام خطبہ پڑھے تو مقتدی اس وقت توجہ کرے اور خاموش رہے اور حضرت نبیشة الهذلیؓ آں حضرت صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم سے روایت کرتے ہیں کہ

فان لم يجد الامام خرج صلى ما بدا له وان وجد الامام قد خرج جلس فاستمع وانصت الحديث (مجمع الزوائد جلد۲ ص ۱۷۱، وقال رواه احمد ورجاله رجال الصحيح خلا شيخ احمد وهو ثقة... انتهى)

اگر امام ابھی خطبہ کے لیے نہ آیا ہو تو جتنی نماز پڑھی جا سکتی ہے پڑھنی چاہیے اور جب امام خطبہ کے لیے آ چکا ہو تو اس وقت ہر شخص کو بیٹھ کر توجہ اور خاموشی اختیار کرنی چاہیے۔ علامہ ہیثمیؒ کہتے ہیں کہ اس روایت کے سب راوی بخاری کے راوی ہیں۔ ہاں مگر امام احمدؒ کے استاذ لیکن ہیں وہ بھی ثقہ۔

لہ ان کا نام علی بن اسحاقؒ ہے۔ (فتح الملہم جلد۲ ص ۴۱۵) ابن معینؒ ان کو ثقہ اور صدوق کہتے ہیں۔ ابن سعدؒ نسائیؒ اور محدث محمد بن حمدویہؒ سب ان کو ثقہ کہتے ہیں۔ ابن حبانؒ ان کو ثقات میں لکھتے ہیں۔ (تہذیب التہذیب جلد۷ ص ۲۸۲) حافظ ابن حجرؒ لکھتے ہیں کہ وہ ثقہ تھے۔ (تقریب ص ۲۶۹) حافظ ابن حجرؒ مقدمہ فتح الباری ص ۴ میں لکھتے ہیں کہ ہم فتح الباری میں جو حدیث بغیر گرفت کے نقل کریں گے۔ وہ صحیح یا حسن ہوگی۔ اور یہ روایت حافظ موصوف نے فتح الباری جلد۲ ص ۲۹۷ میں نقل کی ہے اور اس پر کوئی گرفت نہیں کی۔ مؤلف خیر الکلام نے (ص ۵۶۳، ۵۶۴ میں) یہ اعتراض کیا ہے کہ اس کی سند میں عطاء خراسانیؒ ہے اور حافظ ابن حجرؒ لکھتے ہیں کہ وہ ارسال تدلیس اور کثرت وہم کا شکار تھے۔ اور بخاری نے ان کی کوئی حدیث نہیں لی۔ (تقریب ۱۷۹) اور مقدمہ فتح الباری ص ۴۳۶ میں لکھتے ہیں کہ وہ بخاری کی شرط پر نہیں ہے۔ یہ علامہ ہیثمیؒ کا وہم ہے۔ (باقی صفحہ آئندہ پر)

اس صحیح روایت سے بھی معلوم ہوا کہ نماز کی گنجائش صرف اس وقت ہے۔ جب امام خطبہ کے لیے ابھی نہ آیا ہو۔ لیکن جب امام خطبہ کے لیے آچکا ہو تو پھر نماز کی گنجائش ہے اور نہ سلام و کلام کی اور خطبہ کی حالت میں نماز پڑھنے کی حدیث کا جواب جمہور نے یہ دیا ہے کہ یہ ایک مخصوص واقعہ ہے۔ بعض رواۃ نے نقل بالمعنیٰ کے پیش نظر اس کو تعمیم کا جامہ پہنا دیا ہے۔ اصل واقعہ یہ ہے کہ حضرت سلیک غطفانی رضؓ فقر و فاقہ کا شکار تھے۔ ان کی خستہ حالی اور پریشانی کو دیکھ کر آں حضرت صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے ان کے لیے چندہ کرنے کا قصد فرمایا اور اس کا حکم دیا کہ کھڑے ہو کر دو رکعتیں پڑھ لیں تاکہ لوگ ان کی پراگندہ صورت اور بے بسی کو دیکھ لیں اور دل کھول کر اس کی اعانت اور امداد کریں۔ چنانچہ روایت کے اصل الفاظ یہ ہیں:

جاء رجل یوم الجمعۃ والنبی صلی اللہ علیہ وسلم یخطب بھیئۃ بذۃ فقال لہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اصلیت قال لا قال صل رکعتین وحث الناس علی الصدقۃ الحدیث۔

(نسائی جلد ا ص ۱۵۸)

آں حضرت صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم خطبہ ارشاد فرما رہے تھے کہ ایک شخص نہایت خستہ حالی میں آیا۔ آپ نے فرمایا: تم نے نماز پڑھی ہے؟ کہا: نہیں۔ آپ نے فرمایا کہ کھڑے ہو کر دو رکعتیں پڑھو۔ اور لوگوں کو آپ نے صدقہ اور خیرات کی تلقین فرمائی تاکہ اس کی امداد و اعانت ہو سکے۔

(بقیہ پچھلا صفحہ) کہ اس کو صحیح کی شرط پر مانتے ہیں۔ (محصلہ) مگر یہ حافظ ابن حجر رح کا وہم ہے کیونکہ صحیح بخاری جلد ۲ ص ۷۳۲ اور ص ۷۹۶ میں عطاءؒ کی روایت موجود ہے۔ محدث ابو مسعود الدمشقیؒ اور ان کے پیروکار اور علامہ قسطلانیؒ وغیرہ تصریح کرتے ہیں کہ یہ عطاء خراسانیؒ ہے۔ لہٰذا یہ علامہ ہیثمی رح کا وہم نہیں بلکہ حافظ ابن حجر رح کا وہم ہے اور جس بنا پر مؤلف مذکور انکار کرتے ہیں کہ چونکہ یہ کمزور ہے لہٰذا بخاری کی شرط پر نہیں اتر سکتا۔ نہایت کمزور ہے۔ کیونکہ اس سے ضعیف تر راوی صحیح بخاری میں موجود ہیں۔ ہم ان شاء اللہ تعالیٰ عرض کر سکتے ہیں۔ اور حافظ ابن حجر رح نے تہذیب التہذیب جلد ۷ ص ۲۱۲ میں نشان دہی کی ہے کہ یہ مسلم، ابوداؤد، نسائی، ترمذی اور ابن ماجہ کا راوی ہے۔ اس لحاظ سے بھی وہ صحیح مسلم کا راوی ہے اور یہ روایت بالکل صحیح ہے۔ اور اصولِ حدیث کی رو سے اس کے حسن ہونے میں تو کوئی کلام نہیں ہو سکتا۔ البتہ نہ ماننے کا کوئی علاج نہیں۔

اور مسند احمد کی روایت کے الفاظ یوں ہیں۔ آں حضرت صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ

ان ھذا الرجل دخل المسجد فی ھیئۃ بذۃ فامرتہ ان یصلی رکعتین وانا ارجوان یفطن لہ رجل فیتصدق علیہ۔ (فتح الباری ۲ ص ۳۲۶)

یہ شخص مسجد میں داخل ہوا اور یہ بہت شکستہ حال تھا۔ میں نے اس کو اس امید سے دو رکعتیں نماز پڑھنے کا حکم دیا ہے تاکہ کوئی صاحب دل اس کو دیکھ لے اور اس پر صدقہ کرے۔

اس سے معلوم ہوا کہ یہ ایک مخصوص واقعہ تھا۔ اور روایات میں سے بعض نے اس کو عمومی رنگ میں پیش کر دیا ہے اور ایک روایت میں یہ بھی مروی ہے جو محض بطور تائید پیش کی جاتی ہے، جس کی مزید تائید معتمر کا مرسل کرتا ہے۔ (دار قطنی جلد ۱ ص ۱۶۹)

وامسك عن الخطبۃ حتی فرغ من صلاتہ۔ (دار قطنی جلد ۱ ص ۱۶۹ و زیلعی جلد ۲ ص ۲۰۳)

کہ جب تک وہ شخص نماز سے فارغ نہ ہو گیا۔ آپ نے خطبہ بند کر دیا تھا۔

ایک اور روایت میں یہ الفاظ بھی آتے ہیں جو محض تائیداً پیش کی جا رہی ہے نہ کہ استدلالاً

ارکع رکعتین ولا تعد لمثل ھذا۔ (دار قطنی جلد ۱ ص ۱۶۹ و زیلعی جلد ۱ ص ۱۶۹)

اب دو رکعتیں پڑھ لے لیکن پھر کبھی ایسا نہ کرنا۔

حافظ ابن حجر رح لکھتے ہیں:

واما قصۃ سلیك رضی اللہ تعالیٰ عنہ فقد ذکر الترمذی انھا اصح شیئ روی فی ھذا الباب واقوی۔ (فتح الباری جلد ۲ ص ۲۲۵)

امام ترمذی رح کا ارشاد ہے کہ اس باب میں سلیک رضی اللہ تعالیٰ عنہ کا واقعہ سب سے زیادہ صحیح اور قوی تر ہے۔

چونکہ یہ شخص نہایت ہی غریب تھا اس لیے آں حضرت صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے اس کے لیے دلسوزی سے چندہ کیا اور جب دوسرے اور تیسرے جمعہ پھر آیا تو پھر بیٹھ گیا آپ نے فرمایا اٹھ اور نماز پڑھ۔ (فتح الباری جلد ۱ ص ۴۹۹) اور ہمارے خیال میں یہ بھی اس کی طرف لوگوں کو توجہ دلانے کے لیے تھا تاکہ لوگ اس مفلوک الحال کو دل کھول کر

چندہ دیں بلکہ امام بخاریؒ روایت نقل کرتے ہیں کہ جب وہ دوسرے جمعہ پر آیا تو اس وقت آں حضرت صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم خطبہ دے رہے تھے۔ آپ نے فرمایا: ان یصدقوا علیہ وان یصلی رکعتین۔ (جزء القراۃ ص ۳۷) کہ اس پر صدقہ کریں۔ اور اس کو دو رکعتیں پڑھنے کا حکم دیا اور بقول مؤلف خیر الکلام حافظ ابن حجرؒ نے اس کے لیے چندہ مانگنے کو جزو علت کہا ہے۔ (خیر الکلام ص ۵۶۵) مگر یہ جزو علت نہیں پوری علت ہے کیونکہ آپ نے دو تین جمعے متواتر صرف اسی خستہ حال شخص کو نماز کا حکم دیا ہے رہا امام نوویؒ اور حافظ ابن حجرؒ کا مسلم کی روایت کے پیش نظر یہ کہنا کہ یہ نص ہے اس میں تاویل کی گنجائش نہیں۔ (محصلہ خیر الکلام ص ۵۶۵ والاعتصام ص ۷۔ ۱۲ اکتوبر ۱۹۶۲ء) درست نہیں۔

اوّلاً۔ اس لیے کہ روایت بالمعنیٰ کا یہ جواب نہیں ہے۔

وثانیاً۔ اگر الفاظ یہی ہوتے تو کم از کم حضرات خلفاء ثلاثہ رضؓ کبھی اس کے خلاف نہ کرتے ان کا عمل ہی اس کے غیر نص ہونے کی دلیل ہے اور جمہور اہل اسلام کی تائید اس پر مستزاد ہے امام نسائیؒ سنن الکبریٰ میں اس حدیث کا یہ باب قائم کرتے ہیں: باب الصلوٰۃ قبل الخطبۃ (زیلعی جلد ۲ ص ۲۰۴) گویا امام نسائیؒ کی تحقیق یہ ہے کہ یہ واقعہ (نماز پڑھنے کا) خطبہ شروع ہونے سے پہلے پیش آیا تھا اور امام نسائیؒ کا ایسا سمجھنا محض بے وجہ نہیں ہے کیونکہ یخطب مضارع کا صیغہ ہے اور زمانہ حال و مستقبل دونوں کا اس میں احتمال موجود ہے۔ اور زمانہ استقبال[1] مراد

---

[1] اسی مفہوم کو پیش نظر رکھتے ہوئے بعض محققین نے یخطب کا معنیٰ یرید الخطبۃ کیا ہے۔ دیکھئے فتح الملہم جلد ۲ ص ۴۱۷، فیض الباری جلد ۲ ص ۳۴۴۔ امام نووی رحؒ اذا امّن الامام فامّنوا کی شرح میں لکھتے ہیں۔ قالوا معناہ اذا اراد التامین۔ (شرح مسلم جلد ۱ ص ۱۷۴) علماء کا بیان ہے کہ جب امام آمین کہنے کا ارادہ کرے تو تم بھی آمین کہو۔ جب امّن ماضی میں ارادہ تامین کی گنجائش نکل سکتی ہے تو یخطب میں یرید الخطبۃ کا احتمال کیوں بعید ہے؟ علاوہ بریں بخاری جلد ۱ ص ۱۵۶ میں (وقال الحافظ فی الفتح جلد ۲ ص ۳۲۸ متفق علیہ) اصل الفاظ میں تردد ہے۔ والامام یخطب او قد خرج کہ وہ امام خطبہ پڑھ رہا ہو یا خطبہ کے لیے آرہا ہو او قد خرج جملہ ہوتے ہوئے فریق ثانی کا دعویٰ اور کمزور ہو جاتا ہے۔ دیکھیے مزید تحقیق کے لیے عارضۃ الاحوذی جلد ۲ ص ۳۰۲۔ (باقی اگلے صفحہ پر)

لینے کی صورت میں حدیث کے معنی یہ ہوں گے۔ جب تم میں کوئی شخص آئے۔ درآں حالیکہ امام خطبہ پڑھنا چاہتا ہو اور اس کا ارادہ کرتا ہو (جو قرائن سے معلوم ہو سکتا ہے) تو خطبہ سے قبل ہی تم نماز پڑھ لیا کرو۔ یہی وجہ ہے کہ حدیث میں صرف دو رکعتیں پڑھنے کا حکم دیا گیا ہے تاکہ امام کے خطبہ شروع کرنے سے پہلے ہی فارغ ہو کر استماع اور انصات پر صحیح طور پر عامل ہو سکے۔

(بقیہ پچھلا صفحہ) مؤلف خیر الکلام نے دو باتیں ایسی کہی ہیں جن پر بے ساختہ ہنسی آتی ہے پہلی بات یہ کہ والامام یخطب او قد خرج میں تردد صرف سعیدؒ کے بعض شاگردوں کو ہے۔ روحؒ بن قاسمؒ اور سفیانؒ بن علیہؒ کی روایت میں تردد نہیں اسی طرح شعبہؒ کے بعض شاگرد نضرؒ بن شمیلؒ ابو زید ہرویؒ وہبؒ بن جریرؒ بغیر تردد کے بیان کرتے ہیں۔ (دار قطنی جلد ۱ ص ۱۶۸) اور او یہاں تنویع کے لیے ہے (محصلہ ص ۵۶۷)۔ مگر ہم نے بخاری شریف جلد ۱ ص ۱۵۶ کا حوالہ دیا ہے جس کی سند یوں ہے: حدثنا آدم اخبرنا شعبۃ قال حدثنا عمرو بن دینار قال سمعت جابر بن عبد اللہ .... الخ نہ تو اس سند میں سعیدؒ ہے اور نہ اس کے وہ مذکور شاگرد ہیں جن کا ذکر مؤلف مذکور نے کیا ہے۔ اس لیے حرف او کے ساتھ ہی اصل روایت ہے جو برائے شک ہے اور اگر حرف او تنویع کے لیے ہوتا اور خطبہ اور غیر خطبہ کی حالت اجازت نماز کے لیے برابر ہوتی تو جمہور اور خصوصاً حضرات خلفاء ثلاثہ رض اس کے خلاف نہ کرتے بلکہ وہ دونوں حالتوں کو برابر سمجھتے رہا مؤلف خیر الکلام کا یہ کہنا کہ جمہوریت حدیث کے معاملہ میں کوئی حجت نہیں (۵۶۳) تو یہ شکست فاش کی واضح علامت ہے۔ حق جماعت کے ساتھ ہوتا ہے اور امت کی اکثریت کبھی غلط بات پر مجتمع نہیں ہو سکتی اور یہاں جمہور کے پاس صحیح روایات بھی ہیں محض جمہوریت ہی نہیں ہے جیسا کہ مؤلف خیر الکلام اپنے ناخواندہ حواریوں کو سمجھا رہے ہیں۔ دوسری بات مؤلف خیر الکلام لکھتے ہیں کہ پھر یہ کہنا کہ یخطب مضارع کا صیغہ ہے اور زمانہ حال و مستقبل دونوں کا اس میں احتمال ہے۔ قواعد نحویہ سے بے خبری پر مبنی ہے کیونکہ عامل حال اور حال کا زمانہ ایک ہونا چاہیے پس خطبہ کا زمانہ وہی ہونا چاہیے جو آنے کا ہے ... الخ (ص ۵۶۶) بے شک یہ قواعد نحو سے بے خبری پر مبنی ہے اور ساری عمر پڑھا پڑھا کر بھی مؤلف خیر الکلام کو نحو کے بالکل ابتدائی گرامر بھی معلوم نہیں۔ ان کو معلوم ہونا چاہیے کہ جس حال اور عامل حال کا زمانہ ایک ہوتا ہے وہ ایسا حال ہے جو ترکیب میں حال واقع ہوا اور یہاں یخطب مضارع کا صیغہ ہے جو خود عامل ہے اور اس میں حال و استقبال کا معنی پایا جاتا ہے یہ راکبا کی طرح حال نہیں ہے جس کا عامل اور ہوتا ہے۔ اور اس حال میں عامل حال اور حال کا زمانہ ایک ہوتا ہے۔ بات اور حال کی ہے اور وہ بے خبری میں چسپاں دوسرے حال پر کر رہے ہیں۔

الحاصل خطبہ کے وقت نماز پڑھنا جمہور کے نزدیک صحیح حدیث کی روشنی میں ممنوع ہے۔ اور جس حدیث سے اجازت ثابت ہوتی ہے اس کا صحیح محمل بھی آپ جمہور کی طرف سے سُن چکے ہیں۔ دریں حالات خطبہ کی حالت میں نماز کو جائز تصور کرتے ہوئے اس پر قرأت خلف الامام کے جواز کو قیاس کرنا ایک بے حقیقت اور بے اصل بات ہے، خصوصاً جب کہ مسئلہ مذکورہ منصوص ہے۔

سولھواں اعتراض — امام بخاری رح، مبارک پوری رح اور مفتی کلانوری صاحب وغیرہ لکھتے ہیں کہ جب امام قرأت کر رہا ہو اور کوئی شخص آکر اس کی اقتدا کرنا چاہتا ہے۔ تو لامحالہ اس کو تکبیر تحریمہ کہنے کے بعد ہی اقتدا نصیب ہو سکتی ہے اور اس کا تکبیر تحریمہ کہنا آیت استماع و انصات کے منافی ہے۔ لہذا مانعین قرأت خلف الامام کا عمل بھی آیت مذکورہ پر نہ ہوا۔ (جزء القرأة ص ۳۵ و تحقیق الکلام جلد ۱ ص ۲۱ وغیرہ)

جواب — پہلے پوری تفصیل کے ساتھ یہ بات عرض کی جا چکی ہے کہ آیت کا مخاطب ہر ایسا شخص ہے جو امام کی اقتداء کر چکا ہو اور امام ابن جریر وغیرہ کے حوالے سے نقل کیا جا چکا ہے کہ

فالانصات خلفه لقرأته واجب على من كان مؤتمابه۔ — جو آدمی امام کی اقتداء کر چکا ہو۔ امام کی قرأت کے لیے خاموش ہونا اس پر واجب ہے۔

رہا وہ شخص جس نے مطلقاً امام کی اقتداء نہ کی ہو یا ابھی اقتداء کرنے کا ارادہ ہی کر رہا ہو تو وہ شخص اس آیت کا مخاطب نہیں ہے اور تکبیر تحریمہ علمائے احناف کی تحقیق میں شرط ہے۔ (دیکھیے خانیہ جلد ۱ ص ۴۰ و سراجیہ ص ۱۰ و ہدایہ جلد ص ۸۲ اور شرح وقایہ جلد ۱ ص ۱۶۰ وغیرہ) اور شرط خارج ہوتی ہے۔ (و شرط الشئ خارج عنه هامش کنز ص ۳۰) لہٰذا قرأت امام کے وقت مقتدی کا تکبیر تحریمہ کہنا آیت استماع و انصات کے کسی طرح مخالف اور منافی نہیں ہے۔ ہاں اس کا قرأت کرنا یقیناً منافی ہے۔ قاضی مقبول احمد صاحب یہ کہتے ہیں کہ یہاں آیت کو اپنے عموم پر کیوں نہیں رکھا گیا؟ اور جو شخص نماز میں شریک نہ ہوا ہو وہ شور و غل مچاتا ہے (محصلہ الاعتصام ص ۱۰، ۵ اکتوبر ۱۹۲۲ء) لیکن ان کو معلوم ہونا چاہیے کہ جس شخص نے اقتداء

نہ کی ہو اس کے لیے انصات و استماع مستحب ہے، اس کو شور و غل کا حق کس نے دیا ہے؟
اور آیت استحباب کے حکم میں اپنے عموم پر ہے ہاں وجوب صرف مقتدی کے لیے ہے۔
کیونکہ شان نزول بھی خلف الامام کا مسئلہ ہے۔ کما مر۔

سترھواں اعتراض ۔ حضرت امام بخاریؒ، امام بیہقیؒ اور مبارکپوری صاحبؒ وغیرہ کہتے ہیں کہ جو لوگ امام کے پیچھے قرأت کرنے کے منکر ہیں۔ ان کا بھی آیت استماع و انصات پر عمل نہیں ہے کیونکہ وہ بھی امام کے پیچھے ثناء وغیرہ پڑھنے کے قائل ہیں۔ اگر امام کے پیچھے قرأت کرنا صحیح نہیں تو ثناء وغیرہ کی قرأت کیسے صحیح ہوتی ہے؟ لہذا ثناء وغیرہ کی قرأت کرنیوالے بھی آیت استماع و انصات پر عامل نہ ہوئے۔

(جزء القرأۃ ص ۷، ص ۱۰، کتاب القرأۃ ص ۱۵۷، تحقیق الکلام ج ۲ ص ۴۶)

جواب ۔ ان اکابر کا یہ اعتراض بھی سطحی قسم کا ہے اور قابل التفات نہیں ہے۔

اولاً ۔ اس لیے کہ اگر صورت مذکورہ میں مقتدی سے مدرک مراد ہے تو ظاہر ہے کہ اس کے لیے صرف ثناء کی قرأت کرنا ہے۔ اور امام کو ثناء، تعوذ اور تسمیہ بھی پڑھنا ہے۔ اگر مدرک امام سے پہلے قرأت ثناء سے فارغ نہ ہوا۔ تو امام کے ساتھ تو بہر حال فارغ ہو ہی جائے گا۔ اور جب امام قرأت قرآن (سورۃ فاتحہ) شروع کرے گا تو مدرک ثناء کے پڑھنے سے فارغ ہو چکا ہو گا۔ لہذا مدرک باوجود ثناء پڑھنے کے آیت مذکورہ کا مخالف نہ ہوا۔

ثانیاً ۔ اگر صورت مذکورہ میں مقتدی سے مسبوق مراد ہے تو محققین فقہائے احنافؒ کی تصریح سے یہ بات ثابت ہے کہ جب امام جہر سے قرأت کر رہا ہو تو مقتدی کو اس وقت ثناء پڑھنا جائز نہیں ہے۔ (فتاوی قاضی خان جلد ۱ ص ۴۷، فتاوی سراجیہ ص ۱۶ اور فتح القدیر جلد ۱ ص ۳۴۵ وغیرہ میں اس کی تصریح موجود ہے، بلکہ علامہ حلبی الحنفی رحمۃ اللہ علیہ (المتوفی ۹۵۶ھ) نے اس کی تصریح کی ہے کہ ولا یاتی الثناء مطلقاً۔ (کبیری ص ۳۰۴) کہ جب امام قرأت شروع کر چکا ہو تو مقتدی کو کسی بھی نماز میں ثناء نہیں پڑھنی چاہیے۔ جہری نمازوں میں قرأت امام کا علم مقتدی کو آسانی سے ہو سکتا ہے اور سری نمازوں میں قرائن اور شواہد سے اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔

مؤلف خیر الکلام نے ص ۵۹۹ میں امام ابوجعفرؒ کے حوالہ سے جو یہ نقل کیا ہے کہ مقتدی جب امام کو سورۂ فاتحہ میں پائے تو بالاتفاق ثناء پڑھے۔ (حلیۃ المصلی ص ۶۵ محصلہ) اس میں بالاتفاق سے تمام فقہاءِ احناف کا اتفاق مراد نہیں ہے بلکہ صرف امام ابویوسف رحؒ اور امام محمدؒ کا اتفاق مراد ہے۔ (صغیری ص ۱۲۸ اور کبیری ص ۳۳۹)

وثالثاً ۔ قاضی شوکانی رحؒ لکھتے ہیں کہ

وظاهر التقييد بقوله من القرآن يدل على انه لا بأس بالاستفتاح حال قرأة الامام بماليس بقرآن والتعوذ والدعاء (الخ)

اور من القرآن کی ظاہری قید اس پر دلالت کرتی ہے کہ امام کی قرأت کے وقت ثناء اور تعوذ اور دعاء وغیرہ جو قرآن نہیں، پڑھنے میں کوئی حرج نہیں ہے۔

(نیل الاوطار جلد ۲ ص ۲۲۶)

اور نواب صاحبؒ لکھتے ہیں:

وایں روایات (یعنی فلا تقرأوا بشیء من القرآن وغیرہ) وتخواں دلالت وارند بر آنکہ منہی عنہ نزد قرأت امام ہماں قرآن کریم ست فقط وہا ماقرأۃ توجہ واستعاذہ وتخواں (یعنی ثناء وغیرہ) پس لا بأس بہ است۔ ونہی متناول آں نیست و نہ بوجہے از وجوہ بر آں دلالت وارد۔ (دلیل الطالب ص ۲۹۴) مگر سورۂ فاتحہ کو نواب صاحبؒ نے مستثنیٰ قرار دیا ہے اور یہی مضمون مولانا عبد الصمد صاحبؒ نے بیان کیا ہے۔ (اعلام الاعلام ص ۱۹۲)

اس سے معلوم ہوا کہ مقتدی کو صرف قرأتِ قرآن سے منع کیا گیا ہے۔ ثناء، تحمید، تسبیح اور تشہد وغیرہ سے اس کو منع نہیں کیا گیا۔ اور آیت واذا قرئ القرآن... الآیۃ اور حدیث فلا تقرأوا بشیء من القرآن اس کی تائید کرتی ہے۔ اس بحث کو پیش نظر رکھنے سے حضرت امام بخاری رحؒ، امام بیہقی رحؒ اور مبارکپوری صاحبؒ وغیرہ کا یہ مغالطہ بھی دور ہو جاتا ہے کہ تمہارے نزدیک فرض (یعنی قرأت) سے غیر فرض (یعنی ثناء وغیرہ) کی اہمیت زیادہ ہے کہ ان دیگر امور میں امام کفایت نہیں کر سکتا۔ مگر قرأت میں کفایت کر سکتا ہے۔ (جزء القرأۃ ص ۷، کتاب القرأۃ ص ۱۵۷، تحقیق الکلام جلد ۲ ص ۴۲)

یہ بات تو جانے دیجئے کہ ان اکابر کے نزدیک صرف سورۂ فاتحہ کی قرأت کی اہمیت کیوں

ہے اور قرآن کریم کی باقی ایک سو تیرہ سورتوں کی اہمیت کیوں نہیں ہے آخر وہ سورتیں بھی تو قرآن کریم کی ہیں ؟ ـــ سچ ہے ؛ ہے یہ گنبد کی صدا جیسی کہو ویسی سنو

مگر قرآن و حدیث کی فہمائش کے علاوہ قاضی شوکانی رح اور نواب صاحب بھی صحیح بات کہنے اور لکھنے پر مجبور ہیں کہ منھی عنہ نزد قرأت امام ہماں قرآن کریم است، فقط۔ اس لیے جب مقتدی کو قرأتِ امام کے وقت صرف قرآنِ کریم کی قرأت سے منع کیا گیا ہے۔ تو ثناء وغیرہ کا سوال اٹھانا دور از کار بات ہے۔

اٹھارواں اعتراض ـــ حضرت امام بخاری رح وغیرہ لکھتے ہیں کہ جب صبح کی نماز کی جماعت کھڑی ہو تو تمہارے نزدیک صبح کی سنتیں قریب ہی پڑھنی جائز ہیں۔ کیا تمہارا یہ فعل آیت استماع وانصات کے منافی نہیں ہے ؟ لہٰذا تمہارا عمل بھی تو اس آیت پر نہ ہوا۔ (جزء القرأۃ ص)

جواب ـــ پہلے عرض کیا جا چکا ہے کہ اس آیت کا وجوبی طور پر مخاطب صرف وہ شخص ہے جو امام کی اقتدا اختیار کر چکا ہو۔ جس نے ابھی تک امام کی اقتدار نہیں کی وہ اس کا وجوبی طور پر مخاطب نہیں ہے۔ لہٰذا جماعت کے پاس سنتیں پڑھنے والا کسی طرح بھی آیت کا مخالف نہ ہوگا۔ علاوہ ازیں محققین علماء احناف رح نے اس کی تصریح کی ہے کہ اس کو سنتیں ترک کر کے جماعت میں شریک ہونا چاہیے۔ چنانچہ حافظ ابن ہمام رح لکھتے ہیں کہ صحیح یہ ہے کہ مسجد کے علاوہ اگر اور کوئی جگہ نہ ہو تو نمازی کو صبح کی سنتیں پڑھنا جائز نہیں ہیں کیونکہ ترک مکروہ فعل سنت پر مقدم ہے۔ آگے ارشاد فرماتے ہیں کہ

واشد ما یکون کراھیۃ ان یصلیھا مخالطا للصف کما یفعلہ کثیر من الجھلۃ۔ (فتح القدیر جلد ۱ ص ۴۱۳ طبع مصر)	اور سب سے زیادہ کراہت اس بات میں ہے کہ صف کے پاس ہی صبح کی سنتیں پڑھی جائیں جیسا کہ بہت سے جاہل پڑھ لیا کرتے ہیں۔

غرضیکہ امام بخاری رح کا یہ اعتراض بھی کسی طرح ان کے لیے مفید نہیں ہے اور نہ اس طرح ان کا مطلب پورا ہو سکتا ہے۔

انیسواں اعتراض ـــ مبارکپوری صاحب رح وغیرہ لکھتے ہیں کہ آیت مذکورہ خطبہ کو بھی شامل ہے

لے جب صبح کی جماعت ہو رہی ہو تو اس وقت صبح کی سنتوں سے متعلق حضرات فقہاء اور محدثین کا اختلاف ہے۔

(باقی اگلے صفحہ پر)

حالانکہ تمہارے نزدیک جب خطیب یاایھا الذین آمنوا صلوا علیہ وسلموا تسلیما۔ پڑھتا ہو تو سامعین کو آہستہ آہستہ درود شریف پڑھنا جائز ہے۔ (کفایہ جلد ۱ ص ۴۸ اور شرح وقایہ جلد ۱ ص ۱۷۵) لہذا آیت استماع و انصات پر تمہارا عمل بھی نہ ہوا۔

(تحقیق الکلام جلد ۲ ص ۴۳)

جواب — یہ تحقیق نقل کی جا چکی ہے کہ آیت کا شان نزول صرف نماز ہے۔ نزول آیت کے وقت خطبہ کا وجود بھی نہ تھا۔ ہاں عموم الفاظ میں خطبہ بھی شامل ہے۔ اس لیے بالطبع اور ثانوی حکم کی ظاہری مخالفت سے مقصودِ اوّلین اور بالذات حکم کی مخالفت کرنی کیسے جائز اور صحیح ہو سکتی ہے؟ علاوہ ازیں اگرچہ بعض علمائے احناف نے خطبہ کے وقت دل میں درود شریف پڑھنے کی اجازت دی ہے بلکہ اس کو صواب اور صحیح کہا ہے۔ لیکن محققین آہستہ پڑھنے سے بھی منع کرتے ہیں۔ چنانچہ امام قاضی خانؒ[1] (المتوفی ۵۹۲ھ) لکھتے ہیں کہ

(پچھلے صفحہ کا بقیہ حاشیہ) ایک گروہ کہتا ہے کہ پاس ہی پڑھ لی جائیں۔ جیسا کہ حضرت عبداللہ رضؓ سے موقوفاً و مرفوعاً روایتیں آتی ہیں۔ علامہ ہیثمیؒ ایک کے بارے میں لکھتے ہیں کہ رواتہ ثقات اور دوسری کے بارے میں لکھتے ہیں کہ رجالہ موثقون (مجمع الزوائد جلد ۲ ص ۷۵) دوسرا گروہ کہتا ہے کہ جماعت کے بعد پڑھ لی جائیں جیسا کہ بعض احادیث میں آتا ہے لیکن اس مضمون کی بیشتر حدیثیں ضعیف ہیں۔ تیسرا گروہ کہتا ہے کہ اگر صبح کی سنتیں رہ جائیں تو ان کی قضا نہیں ہے۔ لیکن یہ قول مخدوش ہے۔ چوتھا گروہ کہتا ہے کہ سورج نکلنے کے بعد پڑھی جائیں (یہ ضروری نہیں کہ وہی جگہ اور وہی وضو ہو) جیسا کہ صحیح اور مرفوع حدیث میں آتا ہے۔ (ترمذی جلد ۱ ص ۵۷، مستدرک جلد ۱ ص ۲۷۴، سنن الکبریٰ جلد ۲ ص ۴۸۴) چونکہ آں حضرت صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے بیماری اور تندرستی، اقامت اور کسی حالت میں صبح کی سنتیں ترک نہیں کیں۔ (طیالسی ص ۲۲۰، زاد المعاد جلد ۱ ص ۱۸۵) لہذا یہی آخری مسلک قوی تر ہے۔

[1] حسنؒ بن منصورؒ امام کبیر اور بحر عمیق تھے، بڑے زیرک اور نکتہ رس تھے، بڑے عابد اور فقیہ النفس تھے۔ ان کا شمار مجتہدین فی المسائل میں ہوتا ہے۔ (فوائد بہیہ ص ۶۴، ۶۵) صاحب جواہر المضیہ (علامہ ابو محمد عبدالقادرؒ ۷۷۵ھ) ان کو الامام الکبیر سے یاد کرتے ہیں۔

(جواہر المضیہ جلد ۱ ص ۲۰۵)

ومشائخنا قالوا بانہ لا یصلی علی النبی صلی اللہ علیہ وسلم بل یستمع وینصت لان الاستماع فرض والصلوٰۃ علی النبی صلی اللہ علیہ وسلم یمکن بعد ھذہ الحالۃ۔ (خانیہ جلد ۱ ص ۷۰)

ہمارے مشائخ کا بیان ہے کہ خطبہ کی حالت میں درود شریف پڑھنا صحیح نہیں ہے کیونکہ استماع اور انصات ضروری اور فرض ہے اور سامع کو خطبہ کے لیے نہایت خاموشی سے توجہ کرنی چاہیے اور درود شریف کا پڑھنا اس کے بعد بھی ممکن ہے۔

فتاویٰ سراجیہ[1] ص ۱۷ میں لکھا ہے کہ فقیہ حسام الدین نے آہستہ پڑھنے کی اجازت دی ہے لیکن شمس الائمہ سرخسیؒ[2] (المتوفی ۴۸۳ھ) آہستہ پڑھنے کی بھی اجازت نہیں دیتے۔ اور مبسوط سرخسی جلد ۲ ص ۲۹ میں آہستہ پڑھنے کی بھی صراحت کے ساتھ ممانعت بیان کی گئی ہے، حافظ ابن ہمام رح لکھتے ہیں کہ محققین کا بیان ہے کہ چونکہ استماع اور انصات فرض اور ضروری ہے۔ اس لیے حضرت امام ابو حنیفہ رح کے نزدیک خطبہ کے وقت آہستہ درود شریف پڑھنے کی بھی اجازت نہیں ہے۔ (فتح القدیر جلد ۲ ص ۴۲۱، طبع مصر) اور یہی مسلک علامہ ابن عابدین شامی رح (المتوفی ۱۲۵۲ھ) کا ہے۔ (بحوالہ فتح الملہم جلد ۲ ص ۴۲) لہٰذا مبارک پوری صاحبؒ کا یہ اعتراض بھی بے بنیاد ہے۔

بیسواں اعتراض — شیخ الاسلام ابن تیمیہؒ سری نمازوں میں امام کے پیچھے سورۂ فاتحہ پڑھنے کے استحباب پر استدلال کرتے ہوئے تحریر فرماتے ہیں کہ ذکر قرآت اور دعا کے بغیر سکوت اختیار کرنا نہ مامور بہ ہے اور نہ عبادت ہے بلکہ وساوس کا دروازہ کھولنے کا ایک سبب ہے۔ اس لیے اللہ تعالیٰ کے ذکر میں مشغول ہونا سکوت سے افضل ہوگا۔ اور قرآت قرآن سے بہتر ذکر اور کیا ہو سکتا ہے۔ لہٰذا سری نمازوں میں امام کے پیچھے

---

[1] علامہ سراج الدین اودی رح المتوفی فی حدود ۵۷۰ھ۔

[2] امام، علامہ، حجت، متکلم، مناظر، اصولی اور مجتہد تھے، مبسوط کی پندرہ جلدیں (باب الشروط تک) بغیر مراجعہ کتب کے زبانی انھوں نے املا کرائی تھیں، جب کہ حق گوئی کی پاداش میں حکومت وقت نے پرانے دستور کے مطابق ایک تاریک کنوئیں میں ان کو محبوس کر رکھا تھا۔ (فوائد بہیہ ص ۱۵۸)

سورۂ فاتحہ کا پڑھنا مستحب ہوگا۔ (مصلحہ فتاوٰی جلد ۲ ص ۱۵۰)

جواب۔ شیخ الاسلام علیہ الرحمۃ کا یہ استدلال بھی درست نہیں ہے۔

اوّلاً۔ اس لیے کہ مقتدی کا فریضہ استماع و انصات ہے نہ کہ قرأۃ اور استماع وسماع کا فرق پہلے عرض کیا جا چکا ہے۔

وثانیاً۔ صحیح حدیث سے ثابت ہے کہ ظہر اور عصر کی نماز میں سورۂ فاتحہ کے بعد کم و بیش پچیس تیس آیتیں پڑھنی مسنون ہیں اور مقتدی کے لیے دیگر حضرات سلف و خلف کی طرح شیخ الاسلام رح کے نزدیک بھی ما زاد علی الفاتحہ پڑھنے کی گنجایش نہیں ہے۔ اگر کم و بیش تیس آیتوں کے طویل وقفہ میں مقتدی پر وساوس کا دروازہ نہیں کھلتا تو امید واثق ہے کہ سورۂ فاتحہ کے مختصر سی سات آیتوں کے وقفہ میں بھی باب وسوسہ مسدود ہی رہے گا۔

وثالثاً۔ خود شیخ الاسلام رح اس کے قائل ہیں کہ مقتدی کے لیے ما زاد علی الفاتحہ میں قرأت کی بجائے استماع افضل ہے۔ نہ معلوم یہاں ذکر، قرأت اور دعا کے بغیر سکوت کیوں اعلیٰ اور افضل ہو گیا ہے؟ اس لیے سورۂ فاتحہ کی قرأت کے وقفہ میں بھی استماع افضل رہے گا کیونکہ بقول شیخ الاسلام رح آیت واذا قرئ القرآن کا اوّلین مصداق صرف سورۂ فاتحہ ہے۔ جیسا کہ پہلے عرض کیا جا چکا ہے اور سری نماز میں بھی قرأۃ قرآن یقیناً ہوتی ہے۔ ہاں اگر واذا جھر بالقرآن کا ارشاد ہوتا۔ تو بات الگ تھی۔ ہم نے شیخ الاسلام رح کے جواب میں جو باتیں عرض کی ہیں وہ ہماری اپنی اختراع نہیں بلکہ خود موصوف نے بیان کی ہیں۔

وایضًا ففی اجماع المسلمین علیٰ انہ فیما یزاد علی الفاتحۃ یؤمر بالاستماع دون القرأۃ دلیل علیٰ ان استماعہ لقرأۃ الامام خیر لہ من قرأتہ معہ بل علیٰ انہ مأمور بالاستماع دون القرأۃ مع الامام۔

نیز مسلمانوں کے اس اجماع میں کہ ما زاد علی الفاتحہ میں مقتدی کو قرأۃ کے بجائے استماع کا حکم ہے اس امر پر دلیل ہے کہ مقتدی کو استماع کا حکم ہے اور اس امر پر دلیل ہے کہ مقتدی کا استماع اس کے پڑھنے سے بہتر اور افضل ہے بلکہ اس کو صرف حکم ہی یہ ہے کہ وہ قرأت نہ کرے

(فتاوی جلد ۲ ص ۱۴۵) اور استماع کرے۔

اور لکھتے ہیں کہ

فان الکتاب والسنۃ امرت المؤتم بالاستماع دون القرأۃ والامۃ متفقون علی ان استماعہ لما زاد علی الفاتحۃ افضل من قرأۃ ما زاد علیھا۔ (فتاوی جلد ۲ ص۱۴۳)	کتاب اور سنت نے مقتدی کو یہ حکم دیا ہے کہ وہ قرأت نہ کرے بلکہ سنے اور امت اس پر متفق ہے کہ "ما زاد علی الفاتحۃ" میں استماع قرأت سے بہتر اور افضل ہے۔

موصوف کی ان عبارتوں کو پیش نظر رکھ کر بخوبی یہ اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ ہمارے نقل کردہ جملہ جوابات خود شیخ الاسلام کی عبارات سے ماخوذ ہیں۔ باقی استماع کا معنی اور مطلب پوری تشریح کے ساتھ پہلے نقل کیا جا چکا ہے۔ اس میں الجھ کر جادۂ مستقیم سے پہلو تہی کرنا ارباب تحقیق کو زیب نہیں دیتا۔

قارئین کرام! ہم نے آیت کے سلسلے میں کافی وقت لیا ہے۔ اگرچہ فریق ثانی کی جانب سے اس سلسلے میں بعض لچر پوچ اور لایعنی اعتراضات یا استدلالات اور بھی کیے گئے ہیں لیکن ہمیں ابھی آپ سے بہت کچھ عرض کرنا ہے اس لیے ہم ان کو نقل کرنے اور جواب عرض کرنے میں مزید آپ کے دماغ کو پریشان نہیں کرتے اور باب اول کو یہیں ختم کرتے ہیں۔

باب دوم

پہلے باب میں قرآن کریم کی آیت اور حضرات صحابہ کرامؓ و تابعینؒ اور دیگر جمہور سلف و خلفؒ سے اس کی تفسیر نقل کی گئی ہے کہ واذا قرئ القرآن... الآیۃ کا شانِ نزول صرف نماز ہے۔ اور مقتدی کو امام کے پیچھے کسی نماز میں قرأۃ کرنا جائز نہیں ہے اور یہ کہ آیت کی یہ تفسیر مؤید بالاجماع ہے۔ اور آیت کی تفسیر پر جتنے اہم سوالات کیے گئے تھے ان کے تفصیلی جوابات بھی عرض کیے جا چکے ہیں۔ اب باب دوم میں آں حضرت صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کی صحیح صریح اور مرفوع قولی اور فعلی حدیثیں نقل کی جاتی ہیں۔ جن سے بخوبی یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ امام کا وظیفہ پڑھنا اور مقتدی کا خاموش رہنا ہے۔ فریق ثانی کی طرف سے ان پر جو سوالات کیے گئے ہیں ان کو نقل کر کے ان کے مسکت جوابات بھی عرض کر دیے گئے ہیں:۔

داریم بہ اخلاص سرے بر خطِ تسلیم | با قول نبی چون و چرا را نہ شناسیم
قرآن و حدیث است شفائے دلِ رنجور | قانون و اشارات و شفا را نہ شناسیم

پہلی حدیث:

امام مسلمؒ [1] علیہ الرحمہ فرماتے ہیں کہ ہم سے اسحاقؒ [2] بن ابراہیمؒ نے بیان کیا۔ وہ فرماتے ہیں کہ ہم سے

---

[1] امام مسلمؒ (المتوفی ۲۶۱ھ) صحیح مسلم شریف کے مؤلف ہیں جو بخاری شریف کے بعد تمام حدیث کی کتابوں میں پہلے درجہ پر (حاشیہ [1] کا بقیہ اور حاشیہ [2] اگلے صفحہ پر دیکھئے)

جریر[۱] نے بیان کیا۔ وہ سلیمان[۲] تیمی رح سے روایت کرتے ہیں۔ وہ قتادہ[۳] رح سے روایت کرتے ہیں۔ وہ یونس[۴] رح بن جبیر رح سے اور وہ حطان[۵] رح بن عبداللہ الرقاشی رح سے روایت کرتے ہیں۔ وہ حضرت ابوموسیٰ الاشعری رضی اللہ تعالیٰ سے (المتوفی ۵۲ھ) روایت کرتے ہیں۔ انھوں نے ایک طویل حدیث میں فرمایا :

(بقیہ نوٹ نمبر ا و نمبر ۲ پچھلا صفحہ) صحیح تسلیم کی جاتی ہے اور امت کا اس پر اجماع اور اتفاق ہے۔ کہ بخاری و مسلم دونوں کی تمام روایتیں صحیح ہیں۔ علامہ ذہبی رح ان کو الامام، الحافظ اور حجۃ الاسلام لکھتے ہیں۔ (تذکرہ جلد ۲ ص ۱۵۰)

یہ وہی مشہور امام ہیں جو ابن راہویہ رح سے مشہور ہیں۔ مقدمہ میں ان کا ترجمہ نقل کیا جا چکا ہے۔

[۱] علامہ ابوالقاسم لالکائی رح کا بیان ہے کہ جریر رح بن عبدالحمید رح کی ثقاہت پر سب کا اتفاق ہے اور ان کی بڑی خوبی یہ تھی کہ تدلیس نہیں کرتے تھے۔ (تہذیب التہذیب جلد ۲ ص ۷۶) علامہ ذہبی رح ان کو الحافظ اور الحجۃ لکھتے ہیں۔ (تذکرہ جلد ۱ ص ۲۵۰)

[۲] امام مسلم نے ایک سائل کے جواب میں فرمایا کہ کیا تم سلیمان رح سے بڑا حافظ حدیث چاہتے ہو؟ (مسلم جلد ا ص ۱۷۴ و ہدایہ ص ۹۴) علامہ ابن سعد ان کو ثقہ اور کثیر الحدیث لکھتے ہیں (طبقات جلد ۷ قسم دوم ص ۱۸) ابن حماد حنبلی رح ان کو امام اور شیخ الاسلام لکھتے ہیں۔ (شذرات الذہب جلد ا ص ۲۱۲) امام ابن معین رح، امام احمد رح، نسائی اور عجلی رح سب ان کو ثقہ کہتے ہیں۔ امام ثوری رح کا بیان ہے کہ وہ حفاظ بصرہ میں تھے۔ امام شعبہ رح فرماتے تھے کہ سلیمان رح خالص اور مجسم یقین تھے۔ امام یحییٰ رح کا بیان ہے کہ مجھے کسی ایسے شخص کی صحبت کبھی نصیب نہیں ہوئی جس کے دل میں سلیمان رح تیمی سے زیادہ خوف خدا موجود ہو۔ ابن حبان رح کہتے ہیں کہ وہ ثقہ، متقن، حافظ، صاحب سنت اور بصرہ کے عبادت گذاروں میں تھے۔ (تہذیب التہذیب جلد ۴ ص ۲۰۲) علامہ ذہبی رح ان کو الحافظ، الامام اور شیخ الاسلام لکھتے ہیں۔ (تذکرہ جلد ا ص ۱۴۲)

[۳] محدث ابن ناصر الدین رح کا بیان ہے کہ وہ مفسر قرآن آیۃ فی الحفظ اور نسب دانی کے امام تھے۔ (شذرات الذہب جلد ا ص ۱۵۳) ابن سعد رح ان کو ثقہ، مامون اور حجت لکھتے ہیں۔ (طبقات جلد ۷ قسم دوم ص ۱) عبدالرحمٰن رح بن مہدی رح کا بیان ہے کہ قتادہ رح حمید رح کے جیسے پچاس آدمیوں سے زیادہ بڑے حافظ تھے۔ (تہذیب الاسماء جلد ا قسم اول ص ۵۷) حافظ ابن القیم رح لکھتے ہیں کہ وہ بصرہ کی جماعت افتاء کے ایک معزز رکن تھے۔ (اعلام الموقعین جلد ا ص ۲۲) ابن سیرین رح کا بیان ہے کہ قتادہ رح سب لوگوں سے زیادہ بڑے حافظ تھے (کتاب العلل ترمذی ۲ ص ۲۳۸ اور

(باقی حاشیہ اگلے صفحہ پر دیکھیے)

ان رسول اللّٰہ صلی اللّٰہ علیہ وسلم خطبنا فبین لنا سنتنا وعلمنا صلوٰتنا فقال اذا صلیتم فاقیموا صفوفکم ثم لیؤمکم احدکم فاذا کبر فکبروا واذا قرأ فانصتوا واذا قال غیر المغضوب علیھم ولا الضالین فقولوا آمین۔ الحدیث

(مسلم جلد ۱ ص ۱۷۴)

کہ آنحضرت صلی اللّٰہ تعالیٰ علیہ وسلم نے ہمیں خطاب فرمایا اور سنت کے مطابق زندگی بسر کرنے کی تلقین فرمائی اور نماز کا طریقہ بتلایا اور یہ فرمایا کہ نماز پڑھنے سے قبل اپنی صفوں کو درست کر لو۔ پھر تم میں سے ایک تمہارا امام بنے۔ جب وہ تکبیر کہے تو تم بھی تکبیر کہو اور جب وہ قرأت کرے تو تم خاموش رہو اور جب وہ غیر المغضوب علیھم ولا الضالین کہے تو تم آمین کہو۔

اس صحیح روایت سے معلوم ہوا کہ قرأت کرنا امام کا فریضہ اور ڈیوٹی ہے۔ مقتدیوں کا وظیفہ صرف خاموش رہنا اور انصات کرنا ہے اور ان کے لیے بغیر انصات کے اور کوئی گنجائش نہیں ہے اور چونکہ یہ روایت مطلق ہے۔ لہٰذا سری اور جہری تمام نمازوں کو شامل ہے۔ اور مقتدیوں کو کسی نماز میں امام کے پیچھے قرأت کرنے کی اجازت اور گنجائش نہیں ہے۔ یہ روایت صحیح مسلم کے علاوہ حدیث وغیرہ کی دیگر معتبر اور مستند کتابوں میں بھی موجود ہے۔

(بقیہ حاشیہ پچھلا صفحہ) تہذیب التہذیب جلد ۸ ص ۱۵۱)۔ علامہ ذہبیؒ ان کو الحافظ اور العلامہ لکھتے ہیں۔ (تذکرہ جلد ۱ ص ۱۱۵) حافظ ابن کثیر رح ان کو احد علماء التابعین والائمۃ العاملین لکھتے ہیں (البدایہ والنہایہ جلد ۹ ص ۳۱۳) امام بیہقی رح ان کو حافظ حدیث لکھتے ہیں (سنن الکبریٰ جلد ۲ ص ۱) ۱۱۷ھ میں ان کی وفات ہوئی ہے۔

[4] یونسؒ بن جبیرؒ امام مسلمؒ کا بیان ہے کہ وہ حدیث کے بیان کرنے میں پختہ کار محدث تھے۔ (مسلم جلد ۱ ص ۱۷۴) امام ابن معینؒ عجلیؒ اور ابن سعدؒ ان کو ثقہ کہتے ہیں۔ نسائی رح ان کو ثقہ اور ثبت کہتے ہیں۔ ابن حبانؒ ان کو ثقات میں لکھتے ہیں۔ (تہذیب التہذیب جلد ۱۱ ص ۴۳۶)

[5] حطانؒ بن عبداللّٰہ الرقاشی رح، امام عجلیؒ اور ابن سعدؒ ان کو ثقہ کہتے ہیں۔ محدث ابن مدینیؒ ان کو ثبت کہتے ہیں۔ ابن حبان رح ان کو ثقات میں لکھتے ہیں۔ (تہذیب التہذیب جلد ۲ ص ۳۹۲) حضرت ابو موسیٰ الاشعریؓ جلیل القدر اور صاحب مناقب صحابی ہیں۔

جس طرح کہ حاشیہ[۱] سے بخوبی اس کا اندازہ ہو سکتا ہے۔ حافظ ابو عوانہ رح کی بعض سندیں ملاحظہ فرمائیں:

امام ابو عوانہ[۲] رح فرماتے ہیں کہ ہم سے الصائغ[۳] رح نے مکہ مکرمہ میں بیان کیا۔ وہ فرماتے ہیں کہ ہم سے علی[۴] بن عبد اللہ رح نے بیان کیا۔ وہ کہتے ہیں کہ ہم سے جریر رح نے بیان کیا۔ وہ سلیمان رح تیمی سے اور وہ قتادہ رح سے اور وہ ابو غلاب یونس رح بن جبیر رح سے اور وہ حطان رح بن عبد اللہ رح سے روایت کرتے ہیں۔ وہ فرماتے ہیں کہ حضرت ابو موسیٰ الاشعری رضہ نے فرمایا:

---

[۱] یہ روایت ابو داؤد جلد ۱ ص ۱۴۰، مسند احمد جلد ۴ ص ۴۱۵، دار قطنی جلد ۱ ص ۱۲۵، بیہقی جلد ۲ ص ۱۵۵، ابن ماجہ ص ۶۱، محلی ابن حزم رح جلد ۳ ص ۲۴۰۔ مشکوٰۃ جلد ۱ ص ۸۱۔ جامع صغیر سیوطی ص ۱۰۰۔ مغنی ابن قدامہ جلد ۱ ص ۶۰۲۔ فتاوی ابن تیمیہ رح جلد ۲ ص ۱۴۴، نیل الاوطار جلد ۲ ص ۲۴۹۔ نصب الرایہ جلد ۲ ص ۱۴۔ توضیح النظر ص ۲۴۰۔ شرح بلوغ المرام جلد ۱ ص ۲۴۵۔ فتح الباری جلد ۲ ص ۲۰۱۔ زہر الربی جلد ۱ ص ۱۴۶۔ درایہ ص ۹۹۔ ابن کثیر جلد ۲ ص ۲۸۰۔ اعلاء السنن جلد ۴ ص ۴۲۔ کتاب القرأۃ ص ۸۷۔ امام الکلام ص ۱۱۔ کنز العمال جلد ۲ ص ۹۹، ۱۸۶۔ فتح القدیر جلد ۱ ص ۲۴۱۔ شرح نقایہ ص ۸۳۔ عون الباری جلد ۲ ص ۴۹۴۔ عون المعبود جلد ۱ ص ۲۲۵۔ تنقیح الرواۃ جلد ۱ ص ۱۵۲۔ عمدۃ القاری جلد ۳ ص ۶۔ فصل الخطاب ص ۷۶۔ آثار السنن جلد ۱ ص ۸۵۔ جوہر النقی جلد ۱ ص ۱۵۳۔ تحفۃ الاحوذی جلد ۱ ص ۲۵۹۔ کتاب العلل جلد ۱ ص ۱۶۴۔ شرح المقنع الکبیر جلد ۱ ص ۱۳۔ منتقی الاخبار جلد ۲ ص ۱۳۴۔ تعلیق المغنی جلد ۱ ص ۱۲۴۔ فتح الملہم جلد ۲ ص ۲۲۔ جزء القرأۃ ص ۵۶۔ تنوع العبادات ص ۸۶۔ ازالۃ الستر ص ۱۵۔ خاتمۃ الخطاب ص ۱۶۔ بذل المجہود جلد ۲ ص ۵۵۔ برہان العجائب ص ۱۰۴ اور عقیدۃ المحمدیہ جلد ۲ ص ۱۹۳ وغیرہ حدیث، تفسیر، شرح حدیث اور کتب فقہ میں نقل کی گئی ہے۔ حافظ ابن کثیر رح اس طرح لکھتے ہیں:

کما رواہ مسلم فی صحیحہ من حدیث ابی موسیٰ الاشعری رضی اللہ تعالیٰ عنہ قال قال رسول اللہ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم انما جعل الامام لیؤتم بہ فاذا کبر فکبروا واذا قرأ فانصتوا ۔۔ اھ (تفسیر جلد ۲ ص ۲۸۰) اور قاضی شوکانی رح نے روایت اسی طرح نقل کی ہے۔ اور فرماتے ہیں رواہ احمد و مسلم ... الخ (نیل الاوطار ج ۲ ص ۲۵۰) اور امام احمد رح نے کتاب الصلوٰۃ ص ۵۲ میں اسی طرح نقل کی ہے۔

(باقی نوٹ نمبر ۲، ۳ و ۴ اگلے صفحہ پر دیکھئے)

خطبنا رسول الله صلی الله علیه وسلم فعلمنا سنتنا وبین لنا صلوتنا فقال اذا کبر الامام فکبروا واذا قرأ فانصتوا (صحیح ابو عوانہ جلد ۲ ص ۱۳۳)

کہ آں حضرت صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے ہم سے خطاب کیا اور سنت کی تعلیم دی اور نماز کا طریقہ بتلایا اور فرمایا کہ جب امام تکبیر کہے تو تم بھی تکبیر کہو اور جب امام قرأت کرے تو تم خاموش رہو۔

امام ابو عوانہؒ فرماتے ہیں کہ ہم سے سلیمان[1] رح بن اشعث سجستانیؒ نے بیان کیا۔ وہ فرماتے ہیں کہ ہم سے عاصمؒ[2] بن نضر رح نے بیان کیا۔ وہ فرماتے ہیں کہ ہم سے معتمر[3] رح نے بیان کیا۔ وہ فرماتے ہیں کہ میں نے اپنے والد سلیمان تیمیؒ سے سنا۔ وہ فرماتے ہیں (حدثنا قتادة) ہم سے قتادہ رحؒ نے بیان کیا۔ وہ ابو غلاب یونسؒ بن جبیرؒ سے اور وہ حطانؒ بن عبداللہ الرقاشیؒ سے روایت کرتے ہیں۔ وہ حضرت ابو موسیٰ الاشعری رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت کرتے ہیں۔ انھوں نے فرمایا:

(بقیہ نوٹ پچھلا صفحہ) ؎۱ امام ابو عوانہؒ کا نام یعقوبؒ بن اسحاقؒ ہے (المتوفی ۳۱۶ھ) علامہ ذہبیؒ ان کو الحافظ اور الثقۃ الکبیر لکھتے ہیں۔ (تذکرہ جلد ۳ ص ۲)

؎۲ الصائغ کا نام محمدؒ بن اسمٰعیلؒ بن سالمؒ تھا۔ (المتوفی ۲۷۶ھ) محدث ابو حاتم رح ان کو صدوق کہتے ہیں۔ ابن خراشؒ ان کو اہل فہم و اہل امانت کہتے ہیں۔ ابن حبانؒ ان کو ثقات میں لکھتے ہیں۔ (بغدادی جلد ۲ ص ۳۹ و تہذیب التہذیب جلد ۹ ص ۵۸)

؎۳ علیؒ بن عبداللہؒ بن مدینیؒ۔ (المتوفی ۲۳۴ھ) علامہ ذہبیؒ ان کو حافظ العصر قدوہ اور مفزع ارباب هذا الشان لکھتے ہیں۔ (تذکرہ جلد ۲ ص ۱۵) امام نسائیؒ رح فرماتے ہیں کہ وہ ثقہ مامون اور احد الائمہ فی الحدیث تھے۔ (تہذیب التہذیب جلد ۷ ص ۳۵۶)

؎۱ صحاح ستہ میں مشہور کتاب سنن ابو داؤد کے مصنف ہیں۔ علامہ ذہبیؒ ان کو الامام الثبت اور سید الحفاظ لکھتے ہیں (تذکرہ جلد ۲ ص ۱۵۲) ۲۷۵ھ میں ان کی وفات ہوئی ہے۔

؎۲ محدث ابن حبانؒ ان کو ثقات میں لکھتے ہیں (تہذیب التہذیب جلد ۵ ص ۵۸) حافظ ابن حجر علیہ الرحمۃ ان کو صدوق لکھتے ہیں (تقریب ص ۱۸۵) کسی کی جرح ان پر منقول نہیں ہے۔

؎۳ علامہ ذہبیؒ ان کو الامام، الحافظ اور الثقۃ لکھتے ہیں۔ (تذکرہ جلد ۱ ص ۲۴۶)

ان النبی صلی اللہ علیہ وسلم خطبنا فکان ما بین لنا من صلوٰتنا ویعلمنا سنتنا قال اقیموا الصفوف ثم لیؤمکم احدکم فاذا کبر الامام فکبروا واذا قرأ فانصتوا

(صحیح ابو عوانہ ج۲ ص۱۲۳، ابو داؤد ج۱ ص۱۴۰)

کہ آں حضرت صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے ہمیں خطاب فرمایا اور نماز کا طریقہ سکھایا اور سنت کی تعلیم دی اور فرمایا کہ صفیں درست کیا کرو۔ تم میں ایک امامت کا فریضہ انجام دے جب امام تکبیر کہے تو تم بھی تکبیر کہو اور جب امام قرأت کرے تو تم خاموش رہو۔

امام ابو عوانہؒ فرماتے ہیں کہ ہم سے سہلؒ بن بحر جند سابوریؒ نے بیان کیا وہ فرماتے ہیں کہ ہم سے عبداللہؒ[1] بن رشیدؒ نے بیان کیا۔ وہ فرماتے ہیں کہ ہم سے ابو عبیدہ رح نے بیان کیا۔ وہ قتادہؒ سے روایت کرتے ہیں وہ فرماتے ہیں:

قال قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اذا قرأ الامام فانصتوا واذا قال غیر المغضوب علیھم ولا الضالین فقولوا آمین۔

(ابو عوانہ جلد ۲ ص ۱۳۲)

آں حضرت صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے فرمایا کہ جب امام قرأت کرے تو تم خاموش رہو اور جب امام غیر المغضوب علیھم ولا الضالین پڑھے تو تم آمین کہو۔

---

[1] عبداللہؒ بن رشیدؒ اور ابو عبیدہؒ کو علامہ سمعانیؒ مستقیم الحدیث لکھتے ہیں۔ (کتاب الانساب ص ۱۳۷)۔ مولانا ظفر احمد صاحبؒ لکھتے ہیں کہ سہلؒ بن بحرؒ کا ترجمہ مجھے نہیں مل سکا۔ لیکن کنز العمال جلد۱ ص۳ میں لکھا ہے کہ صحیح ابو عوانہ کی تمام حدیثیں صحیح ہیں۔ (اعلاء السنن جلد۴ ص ۴۹) اور تدریب الراوی ص۵۵ میں ابو عوانہ کو صحیح کتابوں میں شمار کیا ہے اور علامہ ذہبیؒ نے ابو عوانہ کو الصحیح المسند کے الفاظ سے بیان کیا ہے (تذکرہ جلد۳ ص۲) راقم الحروف کہتا ہے کہ مبارک پوری صاحبؒ کو بھی اس کا اقرار ہے چنانچہ وہ ایک سند کی تحقیق میں لکھتے ہیں کہ اور حافظ ابو عوانہؒ کی سند کا بھی صحیح ہونا ظاہر ہے۔ کیونکہ انھوں نے اپنے صحیح میں صحت کا التزام کیا ہے۔ (بلفظہٖ تحقیق الکلام جلد ۲ ص ۱۴۱) محقق نیمویؒ نے اس کو متابعت میں پیش کیا تھا (تعلیق الحسن جلد۱ ص ۸۵) اور مبارک پوری صاحبؒ نے تصحیح طلب کی تھی۔ (ابکار المنن ص ۱۵۲) مگر یہ عبارت خود ہی ان کا جواب ہے۔ خود اپنی پسند کے جواب سے بہتر جواب اور کیا ہو سکتا ہے؟ وکفی بنفسك الیوم علیك حسیبًا۔ مولانا عبداللہ صاحب روپڑی مرحوم نے الکتاب المستطاب ص ۸۶ میں اور مؤلف خیر الکلام نے ص ۴۱۶ اور ص ۴۱۷ میں ابو عبیدہؒ اور سہلؒ بن بحرؒ کے بارے میں ادھر ادھر کے راویوں کا نام لسان المیزان اور کتاب الکنی دولابیؒ سے نقل کر کے ان کی جو تضعیف

(بقیہ اگلے صفحہ پر دیکھئے)

ان تمام صحیح روایات سے معلوم ہوا کہ قرأت کرنا امام کا کام ہے اور مقتدیوں کا کام صرف خاموش رہنا اور انصات کرنا ہے اور آپؐ نے یہ ارشاد نہیں فرمایا کہ جب امام جہر کرے تو تم خاموش رہو بلکہ یہ ارشاد فرمایا ہے کہ جب امام قرأت کرے تو تم خاموش رہو اور یہ مفہوم عبارۃ النص کے طور پر جہری اور سرّی سب نمازوں کو شامل ہے جیسا کہ مخفی نہیں ہے۔ مناسب معلوم ہوتا ہے کہ اس حدیث پر فریق ثانی کی طرف سے جو اعتراضات وارد کیے گئے ہیں۔ ان کو نقل کرکے ان کے جوابات بھی ہدیۂ ناظرین کر دیے جائیں۔ تاکہ فن روایت اور درایت کے لحاظ سے اس حدیث کی حقیقت بھی آشکارا ہو جائے اور اعتراضات کی پوزیشن بھی واضح ہو جائے۔

پہلا اعتراض

حضرت امام بخاریؒ اور مبارکپوری صاحبؒ وغیرہ کہتے ہیں کہ اس حدیث کی سند میں سلیمان تیمیؒ مدلس ہیں اور وہ عنعنہ سے روایت کرتے ہیں۔ اس لیے حسب قاعدہ محدثین یہ روایت قابل استدلال نہیں ہو سکتی۔ (جزء القرأۃ ص ۵۶، تحقیق الکلام جلد ۲ ص ۸۴ وغیرہ)

جواب۔ یہ سوال بالکل سطحی قسم کا ہے:

اوّلاً—— اس لیے کہ تمام محدثین کا اس بات پر اتفاق[1] ہے کہ مدلس راوی جب حدثنا وغیرہ الفاظ سے تحدیث کرے تو تدلیس کا الزام اس پر سے رفع ہو جاتا ہے اور ہم پہلے ابو عوانہ اور ابو داؤد کی صحیح سند کے ساتھ ان کی تحدیث (سلیمان تیمیؒ قال حدثنا قتادۃؒ) نقل کر چکے ہیں اور معتمرؒ بن سلیمانؒ پر بھی مدلس ہونے کا الزام ہے۔ مگر ابو عوانہ اور ابو داؤد کی سابق روایت میں وہ بھی سمعت فرماتے ہوئے تحدیث کرتے ہیں۔

(پچھلا صفحہ۔ حاشیہ) کی ہے وہ بالکل غلط ہے۔ بھلا صحیح ابو عوانہ کے یہ ضعیف راوی کیسے ہو سکتے ہیں جو بتصریح محدثین صحیح ہے۔ ابو عوانہ کی سند میں جو راوی ہیں وہ بالکل ثقہ ہیں اور جن راویوں کی انھوں نے نشاندہی کی ہے وہ راوی ابو عوانہ کے ہرگز نہیں ہیں۔

[1] شرح نخبۃ الفکر ص ۵۳، تعلیق المغنی جلد ۱ ص ۱۷۰، اور تحقیق الکلام جلد ۱ ص ۹۲ وغیرہ ہیں محدثین کا یہ قاعدہ نقل کیا گیا ہے۔

وثانیًا ۔ جملہ محدثین کا یہ طے شدہ قاعدہ ہے کہ اگر مدلس راوی کا کوئی متابع موجود ہو تو تدلیس کا عیب اور طعن اس سے اٹھ جاتا ہے۔ چنانچہ مبارک پوری صاحبؒ لکھتے ہیں کہ تدلیس کا طعن متابعت سے اٹھ جاتا ہے۔ (تحقیق الکلام جلد ۱ ص ۶۲) اور صحیح ابوعوانہؒ کی روایت میں ابوعبیدہؒ سلیمان تیمیؒ کے متابع ہیں جیسا کہ عرض کیا جا چکا ہے۔ مولانا محمد حسن صاحب محدث فیض پوریؒ فرماتے ہیں کہ صحیح ابوعوانہ کی مستقل سند میں ابوعبیدہ الحدادؒ سلیمان تیمی رح کے متابع ہیں اور اس کی سند اعلیٰ درجہ کی صحیح ہے۔ (فی غایۃ الصحۃ) (الدلیل المبین ص ۸۱) علاوہ ازیں دارقطنی جلد ۱ ص ۱۲۵ اور سنن الکبریٰ جلد ۲ ص ۱۵۶ میں ان کے دو اور متابع موجود ہیں۔ عمرؒ بن عامرؒ[1] اور سعیدؒ بن ابی عروبہؒ[2] جب سلیمان تیمیؒ خود تحدیث کرتے ہیں اور ان کے تین ثقہ راوی متابع موجود ہیں تو پھر اعتراض کی کیا وقعت رہ جاتی ہے؟

دوسرا اعتراض:

حضرت امام بخاریؒ، امام دارقطنیؒ اور امام ابوداؤدؒ وغیرہ فرماتے ہیں کہ واذا قرأ فانصتوا کی زیادت محفوظ نہیں ہے۔

لم یجیٔ بہ الا سلیمان التیمیؒ فی ھذا الحدیث۔ (جزء القرأۃ ص ۵۶ وکتاب الکنیٰ ص ۳۸، دارقطنی جلد ۱ ص ۱۲۵ وابوداؤد جلد ۱ ص ۱۴۰)	کیونکہ سلیمان تیمیؒ کے بغیر اس حدیث میں یہ زیادت اور کسی سے مروی نہیں ہے۔

---

[1] عمرؒ بن عامرؒ۔ یہ مسلم کے رواۃ اور رجال میں تھے۔ امام ابن معینؒ اور محدث عجلیؒ ان کو ثقہ کہتے ہیں اور امام احمدؒ ان کو ثقہ اور ثبت فی الحدیث کہتے ہیں۔ (تہذیب التہذیب جلد ۷ ص ۴۶۷)

[2] علامہ ذہبیؒ ان کو الامام، الحافظ اور احد الاعلام لکھتے ہیں۔ امام ابن معینؒ اور نسائیؒ ان کو ثقہ کہتے ہیں۔ (تذکرہ جلد ۱ ص ۱۶۷) امام دارقطنیؒ (المتوفی ۳۸۵ھ) اور امام بیہقیؒ نے اس پر یہ اعتراض کیا ہے کہ عمرؒ بن عامرؒ اور سعیدؒ بن ابی عروبہؒ کی سند میں سالمؒ بن نوحؒ واقع ہے۔ جو قوی نہیں ہے اس لیے یہ روایت متابعت کے قابل نہیں ہے۔ (دارقطنی جلد ۱ ص ۱۲۵ و سنن الکبریٰ جلد ۲ ص ۱۵۶) لیکن یہ اعتراض چنداں وزنی نہیں ہے۔ کیونکہ سالمؒ بن نوحؒ سے امام مسلمؒ (مثلاً جلد ۱ ص ۲۳۶،

جواب۔ ان اکابر کا یہ عذر قابلِ سماعت نہیں ہے:

اوّلاً[1] اس لیے کہ سلیمان تیمیؒ بلا اختلاف ثقہ اور ثبت، متقن اور حافظ تھے۔ (جیسا کہ آپ پہلے پڑھ چکے ہیں) اور تمام محدثین کا اس امر میں اتفاق ہے کہ ثقہ کی زیادت قابل قبول ہے۔ چند نقول ملاحظہ فرمائیں۔

علامہ قسطلانیؒ (المتوفی ۹۲۳ھ) لکھتے ہیں کہ صحیح مسلک یہ ہے کہ ثقات کی زیادت مطلقاً قابل قبول ہے۔ (قسطلانی جلد ۱ صفحہ ۵) علامہ حازمیؒ (الشافعیؒ المتوفی ۵۸۴ھ) لکھتے ہیں کہ ثقہ راوی کی زیادت مقبول ہے۔ (کتاب الاعتبار صفحہ ۷) امام ترمذیؒ لکھتے ہیں کہ ثقہ اور حافظ راوی کی زیادت قابل قبول ہوتی ہے۔ (کتاب العلل ۲ صفحہ ۲۴۰) امام حاکمؒ کا بیان ہے کہ فقہائے اسلام کا اس بات پر کلی اتفاق ہے کہ متون اور اسانید میں ثقات کی زیادت مقبول ہوگی۔ (مستدرک جلد ۱ صفحہ ۳) امام بیہقیؒ لکھتے ہیں کہ محدث ابن خزیمہؒ کا بیان ہے کہ حافظ متقن اور مشہور راوی کی زیادت کا انکار ہرگز نہیں کیا جا سکتا بلکہ اس کی زیادت بہرحال قابل قبول ہوگی۔ لیکن اگر کوئی ایسا راوی جو اس کے ہم پایہ نہ ہو اور متواتر حدیث میں ایک جملہ زائد کرے تو وہ زیادت قابل قبول نہیں ہے۔ (محصلہ کتاب القراءۃ صفحہ ۹۵) لیکن سلیمان تیمیؒ تو دوسرے راویوں سے بڑے حافظ ہیں۔

(بقیہ حاشیہ پچھلا صفحہ) ص ۲۹۹، صفحہ ۳۵۰، صفحہ ۳۵۶، جلد ۲ صفحہ ۱۸۶، صفحہ ۲۲۳، صفحہ ۲۹۵، صفحہ ۳۴۴، صفحہ ۳۹۷، صفحہ ۳۹۸ وغیرہ میں) اور ابن خزیمہؒ اور ابن حبانؒ نے اپنے صحیح میں احتجاج کیا ہے۔ (جوہر النقی جلد ۱ صفحہ ۱۵۲) امام احمدؒ فرماتے ہیں کہ ما بحدیثہ بأس ان کی حدیث میں کوئی خرابی نہیں۔ ابو زرعہؒ ان کو لا بأس بہ اور صدوق کہتے ہیں۔ امام یحییؒ کہتے ہیں ما بأس بذلک ان میں کوئی خرابی نہیں۔ ابن عدیؒ ان کی حدیثوں کو اقرب الی الصواب کہتے ہیں۔ ابن حبانؒ ان کو ثقات میں لکھتے ہیں۔ ساجیؒ ان کو صدوق اور ثقہ کہتے ہیں۔ ابن شاہینؒ ان کو ثقات میں لکھتے ہیں۔ ابن قانعؒ ان کو ثقہ کہتے ہیں حافظ ابن حجرؒ ان کو ثقہ کہتے ہیں۔ (تہذیب التہذیب جلد ۳ ص ۴۴۳) فریق ثانی ان کا موازنہ ذرا محمد بن اسحاقؒ سے کر دیکھے جن کی روایت سے ان کا احتجاج ہے۔ ع: وبضدھا تتبین الاشیاء

[1] امام دارقطنیؒ نے تشہد کے باب میں وحدہ لا شریک لہ کی زیادت کو جس میں سلیمان تیمیؒ متفرد ہیں صحیح تسلیم کیا ہے۔ دیکھو دارقطنی جلد ۱ ص ۱۳۴

امام نووی ؒ لکھتے ہیں کہ جمہور محدثین اور علماء فقہ و اصول اس بات پر متفق ہیں کہ ثقہ راوی کی زیادت اور تفرد مقبول ہے۔ (تلخیص المستدرک جلد ۱ ص ۳۱) علامہ ماردینی ؒ لکھتے ہیں کہ ثقہ کی زیادت مقبول ہے۔ (الجوہر النقی جلد ۱ ص ۱۵۵) علامہ زیلعی ؒ کا بیان ہے کہ ثقہ متقن اور حافظ راوی کی زیادت قابل قبول ہوتی ہے۔ (زیلعی جلد ۱ ص ۳۳۶) حافظ ابن حجر ؒ بھی اس کی تصریح کرتے ہیں۔ (شرح نخبۃ الفکر ص ۳۷) علامہ جزائری ؒ لکھتے ہیں کہ ثقہ کی زیادت مقبول ہے۔ (توجیہ النظر ص ۲۶۳) مولانا شمس الحق عظیم آبادی ؒ لکھتے ہیں کہ ثقہ راوی جب تنہا کوئی زیادت نقل کرے تو وہ صحیح ہے اور اگر کوئی دوسرا بھی اس کے ساتھ اس زیادت کو بیان کرتا ہو تو اس کے صحیح ہونے میں تو کوئی کلام ہی نہیں۔ (تعلیق المغنی جلد ۲ ص ۳۸)

نواب صاحب ؒ لکھتے ہیں کہ وشک نیست کہ زیادت ثقہ مقبول است۔ (بدور الاہلہ ص ۵۶) مبارکپوری صاحب ؒ لکھتے ہیں کہ ثقہ کی زیادت مقبول ہے (تحفۃ الاحوذی جلد ۱ ص ۲۰۵) مولانا گنگوہی ؒ تحریر فرماتے ہیں کہ اور زیادت ثقہ کی باتفاق جملہ محدثین قدیم و جدید کہ جن میں خود بخاری علیہ الرحمۃ بھی ہیں صحیح و معتبر ہے۔ اس میں کسی کو اختلاف نہیں۔ (ہدایۃ المعتدی ص ۵)

ان تمام اقتباسات سے یہ بات یقیناً اور حتماً ثابت ہو جاتی ہے کہ سلیمان تیمی ؒ (جو بلا نکیر الامام، الحافظ ثقہ، ثبت اور شیخ الاسلام تھے) کی واذا قرأ فانصتوا کی زیادت بالکل صحیح اور معتبر ہے۔ اس کا انکار کرنا فن حدیث کے طے شدہ اصول سے انحراف کرنا ہے جو یقیناً مردود ہے۔ امام بخاری ؒ فرماتے ہیں کہ

لہ یہ سب بحث روایتی حیثیت سے تھی اور درایتی لحاظ سے بھی یہ زیادت بالکل صحیح ہے مبارکپوری صاحب لکھتے ہیں کہ ثقہ کی زیادت اس وقت شاذ اور ناقابل قبول ہوتی ہے جب اصل روایت کے منافی ہو اگر اصل اور ماقبل کے منافی نہ ہو تو جمہور محققین کے نزدیک وہ زیادت قابل قبول ہوتی ہے۔ (ابکار المنن ص ۲۷) اور شیخ الاسلام ابن تیمیہ ؒ لکھتے ہیں کہ واذا قرأ فانصتوا کی زیادت ماقبل (انما جعل الامام لیؤتم بہ) کے ہرگز منافی نہیں ہے بلکہ اس کے عین مطابق ہے کیونکہ انصات کرنا اور خاموش رہنا ائتمام اور اقتداء کے ہرگز منافی نہیں ہے بلکہ جو لوگ امام کے پیچھے قرأت کے وقت خاموشی اختیار نہیں کرتے وہ درحقیقت مؤتم اور مقتدی کہلانے کے مستحق نہیں ہیں اس لیے کہ ان کی امام کے پیچھے قرأت کرنا سراسر

والزيادة مقبولة والمفسر يقضي على المبهم اذا رواه اهل التثبت ... اھ (بخاری ج۱ ص۲۱)

زیادت مقبول ہے اور مفسر روایت مبہم پر حاکم ہے جب کہ اہلِ تثبت اس کو روایت کریں۔

امام خطیب بغدادیؒ لکھتے ہیں کہ

قال الجمهور من الفقهاء واصحاب الحديث زيادة الثقة مقبولة اذا انفرد بها ..... اھ (کفایہ ص۴۲۴)

جمہور فقہاءؒ اور محدثینؒ یہ فرماتے ہیں کہ ثقہ راوی جب منفرد ہو تو اس کی زیادت قابل قبول ہے

اور مختلف اقوال و آراء نقل کرنے کے بعد لکھتے ہیں کہ

والذي نختاره من هذه الاقوال ان الزيادة الواردة مقبولة على كل الوجوه ومعمول بها اذا كان راويها عدلا حافظا ومتقنا ضابطا ..... اھ (کفایہ ص۴۲۵)

ان اقوال میں سے جو قول ہم اختیار کرتے ہیں وہ یہ ہے کہ زیادت جہاں بھی وارد ہو وہ بہر صورت مقبول اور قابلِ عمل ہے جب کہ اس کا راوی عادل حافظ اور متقن ضابطہ ہو۔

اور نواب صاحبؒ فرماتے ہیں کہ ونیز زیادت ثقہ مقبول است مطلقاً نزد جماہیر از اہلِ حدیث وفقہ و اصول قالہ النوویؒ ..... اھ (ھدایۃ السائل ص۱۹۱) اور علامہ محدث حسین بن محسن انصاریؒ نے شاذ اور معلل پر بڑی نفیس بحث کی ہے اور لکھتے ہیں کہ جب ثقہ راوی زیادت نقل کرے تو وہ مستقل حدیث کے حکم میں ہے اس کو رد کرنے کا کیا معنیٰ ہے (البیان المکمل ص۷۷، المنضم مع الدارقطنی) اور امام نوویؒ لکھتے ہیں کہ

ومذهب الجمهور من الفقهاء والمحدثين قبولها مطلقا (تقريب النواوي مع تدريب الراوي ص۱۵۶)

جمہور فقہاءؒ اور محدثینؒ کا مذہب یہ ہے کہ زیادتِ ثقہ مطلقاً مقبول ہے۔

اور علامہ سیوطیؒ لکھتے ہیں کہ

وقد ادعى ابن الطاهر الاتفاق على هذا القول ..... اھ (تدریب الراوی ص۱۵۶)

اور ابن طاہرؒ نے دعویٰ کیا ہے کہ اس قول پر سب کا اتفاق ہے۔

(بقیہ حاشیہ پچھلا صفحہ) اقتدار کے خلاف ہے۔ (فتاوی جلد ۲ ص۱۴۴)

مؤلف خیر الکلام ص ۲۸۰ میں ایک راوی کے بارے میں لکھتے ہیں کہ جب ان کا ثقہ ہونا ثابت ہوا تو اس صورت میں ان کا تفرد کوئی مضر نہیں ہوگا۔۔۔اھ

حافظ ابن حجرؒ ایک مقام پر لکھتے ہیں:

وعلی تقدیر تفرد الاوزاعیؒ بذکرھا لا یستلزم ذلک تخطئته لانها تکون زیادة من ثقة حافظ غیر منافية لرواية رفقته فتقبل ولا تکون شاذة ولا معنی لرد الروايات الصحيحة بهذه التعليلات الواهية۔(فتح الباری جلد ۱ ص ۲۴۷ طبع مصر۔)

اگر تسلیم بھی کر لیا جائے کہ اس زیادت کے ذکر کرنے میں اوزاعیؒ متفرد ہے تب بھی اس سے یہ ثابت نہیں ہوتا کہ یہ ان کی خطا ہے کیونکہ یہ ثقہ اور حافظ کی زیادت ہے اور یہ اس کے باقی رفقاء کی روایت کے منافی نہیں ہے سو یہ قابل قبول ہے اور شاذ نہیں ہے اور صحیح روایات کو ان رکیک بہانوں سے (کہ یہ شاذ ہیں) ٹھکرانے کا کوئی معنیٰ نہیں ہے۔

اور قاضی شوکانیؒ نے بھی اس کا ذکر کیا ہے۔(نیل الاوطار جلد ۱ ص ۱۹۱) اور دوسرے مقام پر لکھتے ہیں:

ولا یلتفت الی تعلیل الحدیث به اذا کان الرافع ثقة۔(نیل جلد ۱ ص ۲۰۲)

اور شاذ کہہ کر روایت کو معلول قرار دینے کی طرف کوئی توجہ نہیں کی جا سکتی جب کہ رافع ثقہ ہے۔

حضرات محدثین کرامؒ، فقہاء عظامؒ اور ارباب اصول کا یہ اتفاقی اجماعی اور طے شدہ قاعدہ ہے کہ جب راوی ثقہ اور حافظ ہو اور وہ زیادت نقل کرے تو مطلقاً اس کی روایت مقبول ہے اور بحمد اللہ تعالیٰ سلیمان تیمیؒ ثقہ اور حافظ ہیں لہٰذا ان کی زیادت واذا قرأ فانصتوا بہر حال مقبول ہے اور اس میں کوئی شک نہیں ہے۔ مؤلف خیر الکلام کا (ص ۴۱۵، ص ۴۱۷ میں) اور اسی طرح قاضی مقبول احمد صاحب کا (ملاحظہ ہو الاعتصام ص ۹ ۱۹ اکتوبر ۱۹۶۲ء)

امام بیہقیؒ کی تقلید میں اس کو شاذ کہنا بالکل غلط اور قطعاً باطل ہے اور تمام اصول کے خلاف ہے۔ جس کی حیثیت ایک پرکاہ کی بھی نہیں ہے اور اصول حدیث کے پیش نظر اس کو کوئی سننے کے لیے تیار نہیں ہے۔ اپنے جی کو خوش کرنے یا اپنے حواریوں کا غم ہلکا کرنے کے لیے وہ بڑے شوق سے اس کو شاذ کہتے پھریں۔

وثانیاً۔ اس زیادت کے نقل کرنے میں سلیمان تیمیؒ متفرد نہیں، بلکہ صحیح ابوعوانہ کی روایت

میں ابو عبیدہؒ بھی اس زیادت کو نقل میں سلیمان تیمیؒ کے ساتھ ہیں اور ابو عوانہؒ کی سند کا صحیح ہونا خود مبارک پوری صاحبؒ کو بھی مسلم ہے۔ جیسا کہ آپ ملاحظہ فرما چکے ہیں۔ نیز عمرؒ بن عامر اور سعیدؒ بن ابی عروبہؒ بھی اس زیادت کو بیان کرتے ہیں اور دونوں ثقہ ہیں اور ان کی سند علیٰ شرط مسلم صحیح ہے کما مرّ۔ الغرض فریق ثانی کا یہ اعتراض سراسر باطل ہے اور یہ اس حدیث کی صحت پر کسی طرح اثر انداز نہیں ہو سکتا۔ چنانچہ شیخ الاسلام ابن تیمیہؒ لکھتے ہیں کہ

وما اعله البخاری فلیس بقادح فی صحتہٖ (تنوع العبادات ص۸۵)

امام بخاریؒ (وغیرہ) نے اس حدیث کو معلول ٹھہرانے کی جو کوشش کی ہے تو اس سے اس کی صحت پر کوئی اثر نہیں پڑ سکتا۔

الحاصل سلیمان تیمیؒ کی یہ روایت بلا شک و شبہ بالکل صحیح ہے اور اس میں ان کی غلطی بتلانا ان پر بہتان باندھنا ہے۔ امام احمدؒ سے کسی نے سوال کیا کہ لوگوں کا خیال ہے کہ سلیمان تیمیؒ نے خطا کی ہے تو امام احمدؒ نے جواب دیا، جس شخص نے سلیمان تیمیؒ کی طرف خطا کی نسبت کی ہے وہ ان پر بہتان باندھتا ہے (الجوہر النقی جلد ۲ صفحہ ۱۵۵) اس روایت میں اصل قصور اور خطا ان رواۃ کی ہے جنھوں نے یہ صحیح زیادت ترک کر دی ہے۔ فسامحھم اللہ تعالیٰ بعموم فضلہ۔

مؤلف خیر الکلام نے اپنے پیشرو حضرات کے نقش قدم پر چل کر واذا قرأ فانصتوا کی زیادت کو ایڑی چوٹی کا زور لگا کر دھینگا دھینگی غیر مقبول اور شاذ بنانے کی کوشش ناکام کی ہے۔ اور شاذ کی تعریف پر مطلقاً غور نہیں کیا اور غور کرنے کی ضرورت بھی نہ تھی کیونکہ پھر تو قلعی کھل جاتی تھی اگرچہ انھوں نے صفحہ ۴۱۸ میں شرح نخبہ اور مقدمہ ابن الصلاح وغیرہ سے شاذ کی تعریف نقل کی ہے لیکن لفظ یخالف فیہ الناس پر غور نہیں کیا شاذ کی تعریف سنیے حضرت امام شافعیؒ فرماتے ہیں کہ

قال الشافعیؒ لیس الشاذ من الحدیث ان یروی الثقۃ ما لا یرویہ غیرہ ھذا لیس بشاذ وانما الشاذ ان یروی الثقۃ حدیثا یخالف فیہ الناس

شاذ وہ حدیث نہیں ہے جس کو ثقہ روایت کرے اور دوسرے روایت نہ کرتے ہوں بلکہ شاذ وہ روایت ہے جس کو ثقہ روایت کرتا ہو مگر اس میں دوسرے لوگوں کی مخالفت کرے

هذا الشاذ من الحديث

یہ ہے شاذ۔

(معرفۃ علوم الحدیث ص۱۱۹)

امام مسلمؒ فرماتے ہیں کہ

وعلامة المنكر في حديث المحدث اذا ما عرضت روايته للحديث على رواية غيره من اهل الحفظ والرضى خالفت روايته روايتهم او لم تكد توافقها فاذا كان الاغلب من حديثه كذلك كان مهجور الحديث غير مقبوله ولا مستعمله۔ ... اھ (مسلم جلد ۱ ص ۵)

اور محدث کی قابل انکار حدیث کی علامت یہ ہے کہ جب اس کی روایت دوسرے اہلِ حفظ اور پسندیدہ راویوں کی روایت پر پیش کی جائے تو اس کی روایت ان کی روایت کے مخالف ہو یا ممکن ہی نہیں کہ اس کے موافق ہو پس جب اس کی حدیث پر اغلب یہ ہو تو اس کی حدیث متروک اور غیر مقبول ہوگی اور قابل عمل نہ ہوگی۔

حافظ ابن حجرؒ لکھتے ہیں کہ

لان الزيادة اما ان تكون لا تنافى بينها وبين رواية من لم يذكرها فهذه تقبل مطلقاً لانها فى حكم الحديث المستقل الذى يتفرد به الثقة ولا يرويه عن شيخه غيره واما ان تكون منافية بحيث يلزم من قبولها رد الرواية الاخرى فهذه هى التى يقع الترجيح بينها وبين معارضها فيقبل الراجح ويرد المرجوح .... اھ

(شرح نخبۃ الفکر ص ۳۷)

کیونکہ زیادت یا تو ایسی ہوگی کہ اس میں اور دوسرے راویوں کی روایت میں جنھوں نے اس کو ذکر نہیں کیا منافاۃ نہ ہوگی تو ایسی زیادت مطلقاً مقبول ہے کیونکہ یہ مستقل حدیث کے حکم میں ہے جس کے بیان میں ثقہ راوی متفرد ہو اور اس کے شیخ سے اور کوئی روایت نہ کرتا ہو اور یا وہ زیادت ایسی ہوگی کہ وہ دوسرے راویوں کی روایت کے منافی ہوگی اس حیثیت سے کہ اس کے قبول کر لینے سے دوسری روایت کا رد لازم آتا ہو تو اس میں اور اس کی معارض میں ترجیح کا سوال ہوگا راجح کو قبول کیا جائے گا اور مرجوح کو رد کر دیا جائیگا۔

اور تدریب الراوی میں ہے۔

ثم يفسرون الشذوذ بمخالفة الثقة من هو اوثق منه والمنقول عن ائمة الحديث المتقدمين كابن مهدي ويحيى القطان واحمد وابن معين وابن المديني والبخاري وابي زرعة وابي حاتم والنسائي والدارقطني وغيرهم اعتبار الترجيح فيما يتعلق بالزيادة المنافية بحيث يلزم من قبولها رد الرواية الاخرى ... اه

(تدريب الراوي ص ۱۵۷)

پھر حضرات محدثینؒ شذوذ کی تعریف یہ کرتے ہیں کہ ثقہ راوی ثقہ تر راوی کی مخالفت کرے اور متقدمین ائمہ حدیث مثلاً ابن مہدیؒ یحییٰ القطانؒ، احمدؒ، ابن معینؒ، ابن المدینیؒ بخاریؒ، ابو زرعہؒ، ابو حاتمؒ، نسائیؒ اور دار قطنیؒ وغیرہ یہ فرماتے ہیں کہ اعتبار ترجیح کا اس منافی زیادت سے متعلق ہے جس کا قبول کر لینا دوسری روایت کے رد کو مستلزم ہو۔

اور توجیہ النظر میں ہے۔

وزيادة راوي الصحيح والحسن تقبل مطلقاً ان لم تكن منافية لرواية من لم يذكرها لانها حينئذ كالحديث المستقل الذي ينفرد به الثقة ولا يرويه عن شيخه غيره فان كانت منافية لها بحيث يلزم من قبولها رد الرواية الاخرى بحث عن الراجح منهما فان كان الراجح منهما رواية من لم يذكر تلك الزيادة لمزيد ضبطه او كثرة عدده او غير ذلك من موجبات الرجحان ردت تلك الزيادة وان كان الراجح

صحیح اور حسن کے راوی کی زیادت مطلقاً مقبول ہے اگر وہ ان راویوں کی روایت کے مخالف نہ ہو جنہوں نے اس کا ذکر نہیں کیا کیونکہ وہ اس وقت مستقل حدیث کے حکم میں ہے جس کو ثقہ راوی انفرادی طور پر بیان کرتا ہے اور اس کے شیخ سے کوئی اور اس کا راوی نہیں ہے۔ پس اگر وہ زیادت دوسری روایت کے جس میں زیادت نہیں ہے بایں طور منافی ہو کہ اس زیادت کے قبول کر لینے سے اس روایت کا رد لازم آتا ہو تو یہاں راجح و مرجوح کی بحث چلے گی۔ اگر راجح ان راویوں کی روایت ہے جنہوں نے اس کو ذکر نہیں کیا۔ مزید ضبط

منها روایۃ من ذکر تلك الزیادۃ قبلت ..... اھ

(توجیہ النظر ص ۲۱۹ و ۲۲۰)

یا کثرۃ عدد یا ترجیح کے اور اسباب میں سے کوئی سبب ہو تو اس زیادت کو رد کر دیا جائیگا اور اگر راجح اس کی روایت ہے جس نے اس کو ذکر کیا ہے تو زیادت قبول کر لی جائے گی۔

ان تمام اقتباسات سے روز روشن کی طرح یہ بات ثابت ہو گئی کہ شاذ اور غیر مقبول روایت میں حضرات محدثین کرامؒ کے نزدیک ایک بنیادی شرط ہے وہ یہ کہ اس کی روایت باقی ثقات کی روایت کے مخالف اور منافی ہو اور مخالفت اور منافات بھی بایں طور کہ اس کے تسلیم کر لینے سے ان باقی ثقات کی روایت (جس کو وہ اپنے ثقہ شیخ سے صحیح اور متصل سند کیساتھ روایت کرتے ہیں اور ان میں وجوہ ترجیح بھی موجود ہیں جن کو نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔) کا رد لازم آتا ہو اور اس زیادت کی اصل حدیث کے ساتھ موافقت کی مطلقاً کوئی راہ نہ پیدا ہوتی ہو (او لم تکد توافقھا) لیکن یہاں واذا قرأ فانصتوا کی زیادت کا معاملہ ہرگز ایسا نہیں ہے کیونکہ اس کی اصل روایت سے قطعاً کوئی مخالفت اور منافات نہیں ہے بلکہ یہ تو حدیث کے اول حصہ کی مؤید ہے جیسا کہ ہم نے شیخ الاسلام ابن تیمیہؒ کے حوالہ سے نقل کیا ہے جس کا کوئی جواب مؤلف خیر الکلام نے نہیں دیا بلکہ جوام کو مغالطہ دینے کے لیے یہ لکھ مارا ہے کہ قبول کرنے والوں نے شذوذ کا کوئی جواب نہیں دیا (ص ۲۲۴) ان کو معلوم ہونا چاہیے کہ واذا قرأ فانصتوا کی زیادت انما جعل الامام لیؤتم بہ کی عین مؤید ہے۔ اس کے منافی اور مخالف ہرگز نہیں اس لیے یہ کسی صورت میں شاذ اور غیر مقبول نہیں ہے۔ رہا مؤلف خیر الکلام کا یہ کہنا کہ جو لوگ اس زیادتی کو بقیہ حدیث کے منافی قرار دیتے ہیں۔ ان کی تقریر یہ ہے کہ شروع حدیث میں یہ جملہ ہے انما جعل الامام لیؤتم بہ کہ امام کی پیروی کرو اور حضرت ابو ہریرہؓ کی روایت میں یہ لفظ بھی ہے فلا تختلفوا علیہ۔ سنن کبریٰ جلد ۲ ص ۱۵۶ اس کے ساتھ مخالفت نہ کرو یعنی جس طرح امام کرے اسی طرح کرو اس جملہ کا تقاضا یہ ہے کہ مقتدی امام کے پیچھے پڑھے (الحصلہ ص ۴۳۱) تو یہ سب ان کی غفلت کا نتیجہ ہے:

اولاً — اس لیے کہ حضرت ابو موسیٰؓ کی روایت میں انما جعل الامام لیؤتم بہ کا حصہ عمرؒ بن عامر اور سعیدؒ بن ابی عروبہ کے طریق سے آتا ہے اور مؤلف خیر الکلام توضؒ میں ان کی حدیث کو شاذ کہتے ہیں۔ پھر بقول ان کے اس شاذ پر بنیاد رکھنا کیونکر صحیح ہے؟ اور لطف کی بات یہ ہے کہ اس روایت کا راوی سالمؒ بن نوحؒ ہے جو مؤلف خیر الکلام کے نزدیک ضعیف ہے۔

وثانیاً — فلا تختلفوا علیہ کا جملہ محمدؒ بن عجلانؒ کی روایت میں ہے اور وہ ان کے نزدیک وہمی ہیں پھر اس کا کیا اعتبار؟

وثالثاً۔ اگر امام کی مخالفت کا یہی معنیٰ ہے تو مقتدی نہ صرف یہ کہ سورۃ فاتحہ ہی پڑھیں بلکہ مازاد بھی پڑھیں اور جہر کے ساتھ پڑھیں اور ہر ایک امام کی طرح مصلی پر کھڑا ہو۔ کیونکہ جو امام کرتا ہے سو مقتدی بھی کریں فلا تختلفوا علیہ پر پورا عمل ہونا چاہیے۔ الغرض ان رکیک وجوہات سے اس صحیح زیادت کا انکار اور اس کو شاذ کہنا سراسر باطل ہے۔

تیسرا اعتراض

مبارک پوری صاحبؒ (وغیرہ) لکھتے ہیں کہ اس حدیث کی سند میں قتادہؒ مدلس ہے اور عنعنہ سے روایت کرتا ہے اور مدلس کی معنعن روایت قابلِ التفات نہیں ہوتی۔
(تحقیق الکلام جلد ۲ ص ۱۸ و ابکار المنن ص ۵۸ وغیرہ)

جواب: یہ اعتراض بھی باطل ہے:

اولاً — اس لیے کہ یہ روایت مسلمؒ کی ہے اور بخاریؒ و مسلمؒ کی ثقہ روات سے مروی جملہ روایات کے صحیح ہونے پر امت کا اجماع و اتفاق ہے۔ اگر صحیحین کی معنعن حدیثیں صحیح نہیں تو امت کا اتفاق اور اجماع کس چیز پر واقع ہوا ہے جبکہ راوی بھی سب ثقہ ہیں

وثانیاً — یہ روایت ابو عوانہؒ کی ہے اور باقرار مبارکپوری صاحبؒ انہوں نے اپنے صحیح میں صحت کا التزام کیا ہے۔ لہٰذا قتادہؒ کی اس سند کا صحیح ہونا ظاہر ہے۔

وثالثاً — محدثین کا اتفاق ہے کہ مدلس راوی کی تدلیس صحیحینؒ میں کسی طرح بھی مضر نہیں ہے

---

[1] صحیحین کی تدلیس کے مضر نہ ہونے کا یہ قاعدہ امام نوویؒ و قسطلانیؒ کے علاوہ علامہ سخاویؒ (المتوفی ۹۰۲ھ)
(باقی نوٹ اگلے صفحہ پر)

چنانچہ امام نوویؒ لکھتے ہیں کہ

وما فی الصحیحین من التدلیس فمحمول علی السماع من جہۃ اُخریٰ۔

صحیح بخاری ومسلم میں جو تدلیس واقع ہو تو وہ دوسرے دلائل سے سماعت پر محمول ہے۔

(مقدمہ ص ۱۸ وشرح مسلم جلد ۱ ص ۳۳)

یعنی اگر صحیحین میں کوئی مدلس راوی عنعنہ سے روایت کرتا ہے تو محدثین کرامؒ کے نزدیک وہ ایسی ہے جیسے اس راوی نے حدثنا اور اخبرنا وغیرہ سے تحدیث کی ہو اور علامہ قسطلانیؒ لکھتے ہیں کہ امام اعمشؒ، قتادہؒ اور سفیان ثوریؒ وغیرہ سے بخاری ومسلم میں جو روایتیں عنعنہ سے مروی ہیں وہ سماع پر محمول ہیں۔ اگرچہ ہمیں ان کی تحدیث پر اطلاع نہ ہو سکے۔ کیونکہ امام بخاریؒ ومسلمؒ سے متعلق ہم یہی اچھا اور نیک گمان قائم کر سکتے ہیں۔ (قسطلانی جلد ۱ ص ۹) امام سبکیؒ نے علامہ مزیؒ سے سوال کیا کہ امام بخاریؒ اور امام مسلمؒ نے جو روایتیں عنعنہ کے ساتھ نقل کی ہیں کیا ان میں صراحت کے ساتھ تحدیث بھی ثابت ہے؟ تو انھوں نے جواب دیا کہ اکثر روایات میں اس کا ثبوت موجود نہیں ہے مگر ہمیں تحسین ظن کے بغیر اور کوئی چارہ نہیں ہے۔ (تدریب الراوی ص ۵۹)

مؤلف خیر الکلام نے ص ۴۲۰ میں یہ لکھ کر اپنا دل خوش کر لیا ہے کہ مگر یہ قاعدہ ان احادیث میں چلتا ہے جہاں تنقید نہ ہوئی ہو۔ یہ قاعدہ ہر جگہ جاری نہیں ہوتا..... الخ مؤلف مذکور کو معلوم ہونا چاہیے کہ قاعدہ مذکورہ بخاری اور مسلم کی تمام مدلس راویوں سے متعلق ہے صحیحین کی کوئی مدلس روایت اس قاعدہ سے مستثنیٰ نہیں اور ایسی کوئی تنقید ان پر نہیں ہو سکی جس سے انکی مدلس روایت ضعیف ہو سکے لہٰذا صحیحین کے رواۃ کی تدلیس کی آڑ لے کر صحیح حدیث کا انکار کرنا قانون روایت اور فن حدیث کے بالکل خلاف ہے جو بہر صورت مردود ہے۔ ہاں اگر کوئی راوی ضعیف ہوتا تو معاملہ جدا ہوتا۔

ورابعاً ـــــ قتادہؒ کا شمار طبقہ اُولیٰ کے ان مدلسین میں ہوتا ہے جن کی تدلیس کسی کتاب میں مضر

(بقیہ حاشیہ پچھلا صفحہ) نے فتح المغیث ص ۷۷ میں اور امام سیوطیؒ نے تدریب الراوی ص ۱۴۴ میں اور محدث عبدالقادر القرشیؒ (المتوفی ۷۷۵ھ) نے الجواہر المضیہ جلد ۲ ص ۴۲۹ میں اور نواب صاحبؒ نے ہدایۃ السائل ص ۱۹۱ میں پوری صراحت اور وضاحت کے ساتھ بیان کیا ہے۔

نہیں ہے۔ چنانچہ امام حاکمؒ لکھتے ہیں کہ مدلسین کا ایک گروہ ایسا ہے جو اپنے جیسے یا اپنے سے بڑھ کر یا اپنے سے کچھ کم ثقہ راویوں سے روایت کرتا ہے، مگر وہ اس زمرہ سے خارج نہیں جن کی روایتیں قابل قبول ہوتی ہیں سوا ایسے۔ مدلسین میں ابوسفیان طلحہ بن نافعؒ اور قتادہؒ بن دعامہ خصوصیت سے قابل ذکر ہیں۔ (معرفت علوم الحدیث ص ۱۰۳) علامہ جزائریؒ علامہ ابن حزمؒ سے محدثین کا ضابطہ بیان کرتے ہوئے ان مدلسین کی فہرست بتاتے ہیں جن کی روایتیں باوجود تدلیس کے صحیح ہیں اور ان کی تدلیس سے صحت حدیث پر کوئی اثر نہیں پڑتا۔ چنانچہ لکھتے ہیں کہ

منهم كان جلة اصحاب الحديث وائمة المسلمين كالحسن البصري وابي اسحاق السبيعي وقتادة بن دعامة وعمرو بن دينار وسليمٰن الاعمش وابي الزبير وسفيان الثوري وسفيان بن عيينة۔ (توجيه النظر ص ۲۵۱)

ان مدلسین میں جلیل القدر محدث اور مسلمانوں کے امام شامل ہیں جیسے حسن بصریؒ، ابو اسحاق السبیعیؒ قتادہ بن دعامہؒ، عمروؒ بن دینارؒ، سلیمٰن اعمشؒ، ابوالزبیرؒ، سفیان ثوریؒ اور سفیان بن عیینہ وغیرہ۔

معلوم ہوا کہ پہلے تو صحیحین میں کسی راوی کی تدلیس مضر نہیں۔ قتادہؒ کی ہو یا کسی اور راوی کی اور پھر قتادہؒ کا شمار محدثین کے نزدیک ان مدلسین میں ہوتا ہے جن کی تدلیس کسی محل اور کسی موقع پر مضر نہیں ہے۔ امام نوویؒ فرماتے ہیں کہ امام دارقطنی رح نے جو یہ کہا ہے کہ قتادہ رح مدلس ہیں۔ لہٰذا یہ روایت متصل نہیں مردود ہے اس لیے کہ ولا شك عندنا ان مسلماً رحمه الله تعالىٰ يعلم هذه القاعدة ويعلم تدليس قتادةؒ فلولا ثبوت سماعه عنه ولم يحتج به الى ان قال و نسبة الى مثل قتادة الذى محله من العدالة والحفظ والعلم والغاية العالية۔ (شرح مسلم ج ۱ ص ۲۰۹) ——— اور ہمارے نزدیک اس میں قطعاً کوئی شک نہیں کہ امام مسلم رح یہ قاعدہ جانتے ہیں کہ مدلس کا عنعنہ قبول نہیں اور وہ یہ بھی جانتے ہیں کہ قتادہ رح مدلس ہیں۔ اگر امام مسلمؒ کے نزدیک قتادہؒ کا سماع ثابت نہ ہو تو وہ اس سے احتجاج نہ کرتے۔ (پھر آگے فرمایا) اور امام دارقطنیؒ نے قتادہؒ جیسی شخصیت کی طرف ایسی بات منسوب کی ہے جن کا مقام عدالت اور حفظ اور علم اور کمال کے انتہائی درجہ کو پہنچا ہوا ہے ——— یہ حضرات محدثین کرامؒ کا طے شدہ ضابطہ ہے۔ علامہ ابن حزمؒ کی ظاہریت نہیں جیسا کہ مؤلف خیر الکلام نے کہا ہے اور امام حاکمؒ نے بھی

اس کی تصریح کی ہے۔ کما مر۔

وخامساً۔ ہم مبارکپوری صاحبؒ اور ان کے اتباع کے مشکور ہوں گے کہ وہ بخاری[1] و مسلم[2] کی ان جملہ روایات پر جن میں قتادہؒ نے عنعنہ کیا ہے۔ خط تنسیخ کھینچ دیں اور یا ان کے غیر صحیح ہونے کا کھلا اعلان کر دیں ؎

من نگویم کہ ایں مکن آں کن
مصلحت بیں وکار آساں کن

مؤلف خیر الکلام نے وہی پرانی رٹ لگائی ہے کہ قتادہؒ مدلس ہیں اور حافظ ابن حجرؒ نے ان کو اپنی کتاب طبقات المدلسین میں تیسرے درجہ کا مدلس کہا ہے جن کی روایت بدون تصریح سماع صحیح نہیں اور امام حاکمؒ کا قول مجمل ہے اور معرفت علوم الحدیث ص۱۰۱ میں ہے کہ سلیمان شاذکونی فرماتے ہیں کہ جو شخص حدیث پر عمل کرنا چاہے وہ اعمشؒ اور قتادہؒ کی وہی روایت لے جس میں وہ سماع کی تصریح کریں اور بخاری میں قتادہؒ کی جو معنعن روایتیں ہیں وہ امام شعبہؒ کے طریق سے ہیں۔ (محصلہ خیر الکلام ص۴۲۰، ص۴۲۱) مگر یہ باتیں نہایت کمزور اور ضعیف ہیں۔

اولاً ـــ اس لیے کہ قتادہؒ کی تدلیس کے بارے میں امام حاکمؒ کا قول مجمل نہیں بڑا مفصل ہے۔ وہ ان کو طبقہ اولیٰ کا مدلس بتاتے ہیں جس طبقہ کی تدلیس قطعاً مضر نہیں ہوتی اور یہ محدثین کے ہاں طے شدہ امر ہے اور ہم نے فتح المغیث، تدریب الراوی اور ہدایۃ السائل وغیرہ کے حوالے درج کر دیے ہیں کہ صحیحین کی تدلیس مضر نہیں ہے۔ اس کا یہ جواب جو مؤلف خیر الکلام نے دیا ہے کہ مگر یہ قاعدہ ان احادیث میں چلتا ہے جہاں تنقید نہ ہوئی ہو۔ یہ قاعدہ ہر جگہ جاری نہیں ہوتا اور حدیث زیر بحث پر تنقید ہو چکی ہے بلفظہٖ (ص۴۲۰) قطعاً باطل اور سراسر مردود ہے۔ یہ کہاں لکھا ہوا ہے کہ بخاری اور مسلم کی اُن روایتوں میں تدلیس مضر ہے جن پر تنقید ہوئی ہو ـــ حوالہ درکار ہے مطلب انکے نزدیک یہ ہوا کہ بخاری

---

[1] مثلاً بخاریؒ جلد ۱ ص$\frac{۱۰۳}{۱}$، ص$\frac{۱۸۳}{۱}$، ص$\frac{۳۲۵}{۱}$، ص$\frac{۴۶۱}{۱}$، ص$\frac{۴۸۶}{۲}$، ص$\frac{۷۹۰}{۲}$، ص$\frac{۷۹۱}{۲}$، ص$\frac{۷۹۳}{۲}$، ص$\frac{۸۳۳}{۲}$، ص$\frac{۸۳۵}{۲}$ -

[2] مثلاً مسلم جلد ۱ ص۱۸۸، ص$\frac{۱۹۲}{۱}$، ص$\frac{۱۹۳}{۱}$، ص$\frac{۲۵۵}{۱}$، ص$\frac{۲۵۷}{۱}$، ص$\frac{۲۳۶}{۱}$، ص$\frac{۲۳۷}{۱}$، ص$\frac{۴۱۹}{۱}$، ص$\frac{۴۲۰}{۱}$ وغیرہ وغیرہ۔

مسلم کی سب روایتیں صحیح نہیں کیونکہ انکی بعض روایتوں پر تنقید ہو چکی ہے تو پھر پرویز صاحب اور مودودی صاحب کا کیا قصور ہے؟ وہ بھی تو یہی کہتے ہیں کہ بخاری و مسلم کی سب روایتیں صحیح نہیں ہیں اور یہی فریق ثانی کے شیخ الحدیث صاحب کہہ رہے ہیں مگر کسی غیر مقلد کو اس پر واویلا مچانے کی توفیق نہیں ہوئی؟ آخر کیوں؟ اگر انکی رائے کے مطابق کوئی اور بھی صحیحین کی بعض روایتوں پر تنقید کرے تو انکو چیں بجبیں نہیں ہونا چاہیے۔ بلا شک حافظ ابن حجر رحمہ اللہ تعالیٰ نے طبقات المدلسین میں قتادہ رح کو تیسرے طبقہ کا مدلس کہا ہے مگر آخر میں اس سے رجوع کر لیا ہے۔

چنانچہ قاضی شوکانی رحمہ حافظ ابن حجر عسقلانی رح کے حوالہ سے لکھتے ہیں:

ونقل عنه انه قال لست راضياً عن شيء من تصانيفي لانها عملتها في ابتداء الامر ثم لم يتهيأ لي من يحررها معي سوى شرح البخاري ومقدمته والمشتبه والتهذيب ولسان الميزان وروى عنه في موضع آخر انه اثنى على شرح البخاري والتعليق والنخبة ..... اھ (البدر الطالع ص۸۹ طبع اول ۱۳۴۸ھ)

حافظ ابن حجر رح سے نقل کیا گیا ہے کہ انھوں نے فرمایا کہ میں اپنی کسی تصنیف پر راضی نہیں ہوں کیونکہ وہ میں نے ابتدائی دور میں لکھی ہیں اور تحریر کرنیوالا رفیق بھی مجھے میسر نہ ہو سکا (اس لیے ان تصانیف میں سقم رہ گیا ہے) ہاں فتح الباری اس کا مقدمہ مشتبہ تہذیب اور لسان المیزان پر میں خوش ہوں اور ان سے دوسری جگہ مروی ہے کہ انھوں نے فتح الباری، تعلیق اور نخبہ کی بڑی تعریف کی ہے

اس سے معلوم ہوا کہ حافظ موصوف بغیر ان چند کتابوں کے جن میں فتح الباری بھی ہے اپنی اور کسی تصنیف پر نہ راضی ہیں اور نہ اعتماد کرتے ہیں کیونکہ زندگی کے ابتدائی دور میں وہ کتابیں لکھی ہیں جن میں علم و عقل خام ہوتے ہیں اور قابلِ اعتماد رفیق بھی ان کو نصیب نہیں ہو سکا۔ تاکہ اس کی امداد شامل ہو جاتی اور ان کی ابتدائی کتابوں میں طبقات المدلسین بھی ہے۔ بخلاف اس کے فتح الباری اور دیگر چند کتابوں پر جن کے نام اوپر بیان ہو چکے ہیں وہ بڑے راضی ہیں اور فتح الباری (مثلاً جلد ۲ ص ۲۰۲ وغیرہ) میں قتادہ رح کی معنعن روایت کو صحیح کہہ رہے ہیں۔ لہٰذا انھوں نے اپنے سابق نظریہ سے رجوع کر لیا ہے۔ اور مؤلف خیر الکلام ص ۲۰۶ میں ایک مقام پر لکھتے ہیں کہ اس کی سند میں قتادہ رح ہے جو تیسرے طبقہ کے مدلسین سے ہے اور یہاں عن کے ساتھ روایت کرتا ہے مگر بعض علماء نے اس حدیث کو صحیح قرار دیا ہے ..... الخ مؤلف مذکور نے اس روایت

سے استدلال کیا ہے اور اس کی صحت پر کوئی کلام نہیں کیا کیوں؟ اس لیے کہ ع:

آخر کو ہم دونوں در جاناں پہ جا ملے

وثانیاً — حضرات محدثین عظام رحمہ کے ضابطہ پر تو مؤلف خیر الکلام مطمئن نہیں ہیں اور سلیمان شاذکونی کی لاتوں کا سہارا تلاش کرتے ہیں اور یہ بتانے کی زحمت ہی گوارا نہیں کرتے کہ وہ کون ہے؟ امام بخاریؒ فرماتے ہیں کہ فیہ نظر۔ ابن معینؒ نے اس کو حدیث میں جھوٹا کہا۔ ابو حاتم رحمہ اس کو متروک الحدیث اور نسائیؒ لیس بثقہ کہتے ہیں اور صالح جزرہؒ فرماتے ہیں کان یکذب فی الحدیث کہ حدیث میں جھوٹ کہتا تھا اور امام احمدؒ فرماتے ہیں کہ وہ شراب پیتا اور بیہودہ حرکتوں میں آلودہ تھا اور نیز فرمایا کہ در ب دمیک میں شاذکونی سے بڑا جھوٹا اور کوئی داخل نہیں ہوا۔ بغویؒ فرماتے ہیں کہ رماہ الائمۃ بالکذب ائمہ حدیث نے اس کو جھوٹ سے متہم کیا ہے اور امام یحییٰ بن معینؒ فرماتے ہیں کہ کان یضع الحدیث کہ وہ جعلی روایتیں بنایا کرتا تھا۔ امام ابو احمد الحاکمؒ اس کو متروک الحدیث اور امام ابن مہدیؒ اس کو خائب اور نامراد کہتے تھے۔ امام عبد الرزاقؒ نے اس کو عدو اللہ، کذاب اور خبیث کہا اور صالح جزرہؒ کہتے ہیں کہ آناً فاناً سندیں گھڑ لیتا تھا اور صالح بن محمدؒ نے یہ بھی فرمایا کہ وہ کذاب اور لونڈے بازی سے متہم تھا۔ (محصلہ لسان المیزان جلد ۳ ص ۸۴ تا ۸۷) یہ ہے مؤلف خیر الکلام کا وکیل لاحول ولا قوۃ الا باللہ امام بخاریؒ نے شعبہؒ کے طریق کے علاوہ بھی بغیر تحدیث اور سوائے متابعت کے قتادہؒ کی بہت سی روایتیں لی ہیں۔ مثلاً جلد ۱ ص ۷۶، ص ۸۱، ص ۸۲، ص ۱۳۸، ص ۱۴۰، ص ۱۵۲، ص ۱۷۶، ص ۱۷۸، ص ۲۵۷، ص ۲۷۸، ص ۳۲۵، ص ۳۳۰، ۳۴۱، ۳۴۳، ۳۴۴، ۳۸۳، ۳۸۵، ۴۰۱، ۴۶۱، ۴۸۱، ۴۸۷ وغیرہ وغیرہ۔ کیا ان تمام روایتوں کو ضعیف سمجھا جائے۔ مؤلف خیر الکلام ہوش میں آکر جواب دیں۔ نری لفاظی بیکار ہے۔

وثالثاً — امام دارقطنیؒ ایک سند اس طرح نقل کرتے ہیں: عن قتادۃ عن ابی غلاب عن حطان بن عبد اللہ الرقاشی ... الخ اور آخر میں لکھتے ہیں کہ وھذا اسناد متصل حسن (جلد ۱ ص ۱۳۴) یہاں قتادہؒ عن سے روایت کرتے ہیں لیکن امام دارقطنیؒ اس کو متصل اور حسن کہتے ہیں۔

لطیفہ : اس حدیث میں سلیمان تیمیؒ وحدہ لا شریک له کی زیادت نقل کرنے میں متفرد ہیں اور امام دارقطنیؒ فرماتے ہیں کہ خالفہ ھشام وسعید وابان وابو عوانۃ وغیرھم عن قتادۃ ... اھ کہ یہ سب راوی سلیمانؒ تیمی کی مخالفت ہیں۔ بایں ہمہ یہ روایت نہ معلل ہے اور نہ شاذ بلکہ متصل اور حسن ہے مگر افسوس کہ یہی سلیمانؒ تیمیؒ جب واذا قرأ فانصتوا کی زیادت نقل کریں اور ان کے ثقہ متابع بھی موجود ہوں تو روایت فوراً شاذ ہو جائے آخر کیوں ؟

ودایگا۔ تحدیث کبھی یوں ہوتی ہے کہ خود راوی کہتا ہے حدثنی فلاں یا سمعت فلاناً یا اسی قسم کے اور الفاظ استعمال کرتا ہے اور کبھی لفظ عن ہوتا ہے لیکن اوپر کا راوی حدثہ یا یحدثہ کہتا ہے یہ بھی تحدیث ہی ہوتی ہے اور واذا قرأ فانصتوا کی روایت میں قتادہؒ کی تحدیث موجود ہے لہٰذا ان کو مدلس کہہ کر ان کی روایت کو رد کرنا قطعاً باطل اور یقیناً مردود ہے۔ چنانچہ ابو داؤد اور ابو عوانہ میں یوں ہے کہ

المعتمرؒ قال سمعت ابی ثنا قتادۃ عن ابی غلاب یحدثہ عن حطان بن عبد اللہ الرقاشی ... اھ (ابو داؤد جلد ۱ ص ۱۴۰ / ابو عوانہ ج ۲ ص ۱۳۲)	معتمرؒ کہتے ہیں کہ میں نے اپنے باپ (سلیمان تیمیؒ) سے سنا وہ فرماتے ہیں کہ ہم سے قتادہؒ نے بیان کیا وہ ابو غلاب سے روایت کرتے ہیں انھوں نے قتادہؒ سے بطریق حطانؒ بن عبد اللہ الرقاشیؒ حدیث بیان کی۔

اس سے معلوم ہوا کہ ابو غلابؒ نے قتادہؒ سے حدیث بیان کی ہے۔ تحدیث اور کیا ہوتی ہے ؟ اور مولانا خلیل احمد صاحب سہارنپوریؒ اس کی شرح میں لکھتے ہیں :

یحدثہ ای یحدث ابو غلاب قتادۃ عن حطان بن عبد اللہ الرقاشی ... اھ (بذل المجہود جلد ۲ ص ۱۲۱)	یعنی ابو غلابؒ نے قتادہؒ سے حطانؒ بن عبد اللہ الرقاشیؒ کے طریق سے حدیث بیان کی ہے۔

اس لیے قتادہؒ کی تدلیس کا بہانہ بھی سراسر باطل ہے کیونکہ اس روایت میں تحدیث موجود ہے صرف غیر بالغ نظر لوگوں نے لفظ عن سے دھوکا کھایا اور دیا ہے۔ امام نوویؒ

لکھتے ہیں کہ

وکذا قال وحدّث وذکر وشبہھا فکلہ محمول علی الاتصال والسماع۔ (شرح مسلم جلد ۱ ص ۲۱)

اور اسی طرح لفظ قال اور حدّث اور ذکر اور ان کی مانند اور الفاظ اتصال اور سماع پر محمول ہیں۔

لہذا اصول حدیث کے رُو سے قتادہؒ کی یہ روایت متصل اور صحیح ہے باقی خوئے بدرا بہانہ ہائے بسیار مؤرخ اسلام علامہ عبدالرحمٰن بن خلدونؒ (المتوفی ۸۰۸ھ) بخاری اور مسلم کی صحت اور مزیّت پر بحث کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ

ومن اجل ھذا قیل فی الصحیحین بالاجماع علی قبولھما من جھۃ الاجماع علی صحۃ ما فیھما من الشروط المتفق علیھا فلا تاخذک ریبۃ فی ذلک فالقوم احق الناس بالظن الجمیل بھم۔

اور اسی واسطے کہا گیا کہ بخاری اور مسلم کی روایات کے قبول کرنے پر اجماع ہے اس لیے کہ جو صحت کی متفق علیہا شرطیں ان میں موجود ہیں ان پر اجماع ہو چکا ہے لہٰذا اس بارے میں ذرہ بھر شک نہ کرو کیونکہ وہ حضرات تمام لوگوں میں ظنِ جمیل کے زیادہ مستحق ہیں۔

اور صحیح مسلم کے بارے میں لکھتے ہیں کہ

ثم جاء الامام مسلم بن الحجاج القشیری رحمہ اللہ تعالیٰ فالّف مسندہ الصحیح حذا فیہ حذو البخاری فی نقل المجمع علیہ ... اھ (مقدمۃ ص ۴۴۵)

پھر امام مسلمؒ بن الحجاج القشیریؒ آئے اور انھوں نے اپنا مسند صحیح تالیف کیا جس میں وہ امام بخاریؒ کے نقش قدم پر چلتے رہے اور مجمع علیہا روایتیں نقل کرتے رہے۔

اور حضرت شاہ ولی اللہ صاحبؒ فرماتے ہیں کہ

ولکن الشیخان لا یذکران الا حدیثاً قد تناظر فیہ مشائخھما واجمعوا علی القول بہ والتصحیح لہ اھ (حجۃ اللہ البالغۃ ج ۱ ص ۱۳۴)

اور لیکن امام بخاریؒ اور امام مسلمؒ صرف وہی حدیث ذکر کرتے ہیں جس میں انھوں نے اپنے اساتذہ سے بحث و مناظرہ کیا ہوتا ہے اور جس کے بیان کرنے اور تصحیح پر ان سب کا اجماع ہو چکا ہے

اور علامہ حسین بن محسنؒ لکھتے ہیں کہ

وقد حصل الاتفاق على الحكم بصحة ما في الصحیحین غیر المستثنیٰ... الخ — بے شک اس بات پر اتفاق حاصل ہو چکا ہے کہ بخاری اور مسلم میں تمام روایتیں بغیر استثناء کے صحیح ہیں۔

(البیان المکمل ص ۲)

حضرات محدثین کرامؒ کا یہ فیصلہ ہے لیکن غیر مقلدین حضرات کے شیخ الحدیث صاحب بخاریؒ اور مسلمؒ کی صحیح روایات کو بھی مودودی صاحب اور پرویز صاحب کی طرح تنقید کا نشانہ بنا رہے ہیں۔ فوا اسفا۔ —— ترجمان الحدیث ماہ نومبر ۱۹۷۴ء صفحہ ۳۳ میں جو بات ہمارے حق میں لکھی ہے وہ خود ان حضرات پر سو فیصد فٹ ہے۔ وہ لکھتے ہیں کہ

"ہم ناظرین کرام سے ایمان اور دیانت داری کا واسطہ دیکر پوچھتے ہیں کہ اگر محدثین اور رواۃ حدیث کے متعلق یہ رائے صحیح ہے جس کا اظہار یہ حضرات کر رہے ہیں تو ازراہ انصاف بتلایا جائے کہ گیا محدثین کی امانت و دیانت محفوظ رہی؟ منکرین حدیث نے آخر کونسا تیر مارا جس کے زخموں سے ہم پریشان ہیں؟"

چوتھا اعتراض۔ مبارکپوری صاحب (وغیرہ) لکھتے ہیں کہ واذا قرأ فانصتوا کی زیادت کو امام بخاریؒ، ابوداؤدؒ، ابوحاتمؒ، ابن معینؒ، حاکمؒ، دارقطنیؒ، ابن خزیمہؒ، ذہلیؒ، ابو علی نیشاپوریؒ اور امام بیہقیؒ وغیرہ تسلیم نہیں کرتے۔ اس لیے یہ زیادت صحیح نہیں ہو سکتی۔ (تحقیق الکلام جلد ۲ ص ۸۳)

جواب۔ ان حضرات کا اس زیادت کو صحیح نہ تسلیم نہ کرنا اس بات پر مبنی تھا کہ اس زیادت کے بیان کرنے میں سلیمان تیمیؒ متفرد ہیں، نیز قتادہؒ کی طرح وہ مدلس بھی ہیں اور ان باتوں کے تسلی بخش اور مسکت جوابات آپ ملاحظہ فرما چکے ہیں۔ لہٰذا اس زیادت کے صحیح ہونے میں کوئی کلام نہیں ہو سکتا۔ اور مبارکپوری صاحبؒ اور ان کے اتباع مردم شماری کے لحاظ سے حق و باطل، صحیح و غلط میں تمیز قائم رکھنا ضروری سمجھتے ہیں تو وہ بھی سن لیں:

حضرت ابوموسیٰ الاشعری رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی حدیث میں واذا قرأ فانصتوا کی زیادت کو صحیح سمجھنے والے یہ حضرات ہیں:

۱۔ امام احمدؒ بن حنبلؒ (مسند احمد ۲ ص ۳۸۶، تعلیق الحسن جلد ۲ ص ۸۹، فتح الملہم جلد ۲ ص ۲۲)

۲۔ امام مسلمؒ (صحیح مسلم جلد ۱ ص ۱۷۴، درایہ ص ۹۴)

۳- امام نسائیؒ (بحوالہ فتح الملہم جلد ۲ ص ۲۲)

۴- امام ابن جریرؒ (تفسیر جلد ۹ ص ۱۱)

۵- علامہ ابن حزمؒ (بحوالہ فتح الملہم جلد ۲ ص ۲۲)

۶- امام منذریؒ (عون المعبود جلد ۱ ص ۲۳۵
تعلیق المغنی جلد ۱ ص ۱۲۴، تحقیق الکلام ۲
ص ۸۳، نفحۃ العنبر ۷۹)

۷- حافظ ابن کثیرؒ (تفسیر جلد ۲ ص ۲۸۰)

۸- امام اسحاق بن راہویہؒ (جوہر النقی جلد ۲ ص ۱۵۶
تنوع العبادات ص ۸۶)

۹- امام ابوبکر بن اثرمؒ (فتح الملہم جلد ۲ ص ۲۲)

۱۰- حافظ ابن حجرؒ (فتح الباری جلد ۲ ص ۲۰۱)

۱۱- امام ابو زرعہ رازیؒ (مقدمہ فتح الباری ص ۳۴۵
قسطلانی و تدریب الراوی ص ۴۳ و مقدمہ مسلم
ص ۱۳ و ازالۃ الستر ص ۵۲)

۱۲- امام موفق الدین ابن قدامہؒ (مغنی جلد ۱ ص ۶)

۱۳- امام شمس الدین ابن قدامہؒ (شرح مقنع للکبیر
جلد ۲ ص ۱۳

۱۴- امام ابن خزیمہؒ (برہان العجائب ص ۱۰۴،
نفحۃ العنبر ص ۷۹)۔

۱۵- امام ابو عمر بن عبد البرؒ (نفحۃ العنبر ص ۷۹)

۱۶- شیخ الاسلام ابن تیمیہؒ (فتاوی جلد ص ۴۱۲
و تنوع العبادات ص ۸۶)

۱۷- امام ابو عوانہ (کیونکہ باقرار مبارکپوری صاحبؒ
انھوں نے اپنی صحیح میں صحت کا التزام کیا
ہے اور حضرت ابو موسیٰ الاشعریؓ کی روایت
متعدد اسانید سے انھوں نے صحیح میں
درج کی ہے۔

۱۸- نواب صدیق حسن خاں صاحبؒ
(عون الباری جلد ۱ ص ۳۲۳)

۱۹- علامہ ماردینیؒ (الجوہر النقی جلد ۲ ص ۱۵۶)

۲۰- علامہ عینیؒ (عمدۃ القاری جلد ۳
ص ۵۶)

۲۱- امام ابن معینؒ [1]

---

[1] امام مسلمؒ سے ایک سائل نے دریافت کیا کہ آپ نے اپنی صحیح میں حضرت ابوہریرہؓ کی روایت کی سند کیوں بیان نہیں کی جب کہ وہ بھی آپ کے نزدیک صحیح ہے تو امام موصوف نے جواب ارشاد فرمایا کہ

لیس کل شیٔ عندی صحیح وضعتہ ههنا انما وضعت ههنا ما اجمعوا علیہ۔ (مسلم جلد ۱ ص ۱۷۴)

میں نے ہر اس حدیث کو جو میرے نزدیک صحیح ہے اپنی صحیح میں درج کرنے کا التزام نہیں کیا بلکہ میں نے تو صرف وہ روایتیں درج کی ہیں جن پر محدثین کا اجماع واقع ہوا ہے۔

(بقیہ حاشیہ اگلے صفحہ پر دیکھیے)

۲۲- امام عثمانؒ بن ابی شیبہؒ ۲۴- امام علیؒ بن المدینی رحؒ

۲۳- امام سعید بن منصور خراسانی رحؒ ۲۵- امام ابن صلاحؒ وغیرہ وغیرہ محدثینؒ و فقہاءؒ اس حدیث کی تصیح کرتے ہیں۔ جب سو فیصدی حنفی ومالکی اور حنبلی اس حدیث کو صحیح سمجھتے ہیں اور جب شوافع اور غیر مقلدین حضرات کا ذمہ دار منصف مزاج اور معتدبہ گروہ واذاقرأ فانصتوا کی زیادت کو صحیح سمجھتا ہے تو اس کے صحیح ہونے میں کیا شک ہے؟ اور یہ بھی طے شدہ قاعدہ ہے کہ اثباتؒ نفی پر مقدم ہوتا ہے۔ تو پھر نہ معلوم اس زیادت کی صحت کا انکار کیسے ہو سکتا ہے؟ اگر محض مردم شماری سے مبارک پوری صاحبؒ میدان جیتنا چاہتے ہیں تو اس میں بھی ان کی شکست یقینی ہے۔ رہا مبارکپوری صاحبؒ کا امام ابن خزیمہؒ کو اس زیادت کی صحت کے منکرین میں شمار کرنا تو یہ باطل ہے۔ کیونکہ برہان العجائب کے حوالہ سے نقل کیا جا چکا ہے کہ امام

(بقیہ حاشیہ پچھلا صفحہ) حافظ ابن صلاحؒ نے مقدمہ صفحہ ۹ میں اور امام سیوطیؒ نے تدریب الراوی صفحہ ۴۲ میں اور علامہ جزائریؒ نے توجیہ النظر ص ۱۴۰ میں اس کی تصریح کی ہے کہ امام مسلمؒ کی مرومااجمعوا علیہ کے جملہ سے یہ محدث ہیں۔ امام احمدؒ بن حنبلؒ، امام یحییٰؒ بن معینؒ، امام عثمانؒ بن ابی شیبہؒ، امام سعیدؒ بن منصورؒ خراسانی اور حافظ ابن حجرؒ ان میں امام علیؒ بن المدینیؒ کا ذکر بھی کرتے ہیں۔ (مقدمہ فتح الباری ص۳۰۲) اور امام ابن صلاحؒ فرماتے ہیں کہ جس حدیث کو امام مسلم اپنے صحیح میں صحیح سمجھتے ہیں اس کا صحیح ہونا نفس الامر میں یقینی ہے۔ (غایتہ المأمول جلد ۱ ص ۶) اس لحاظ سے گویا یہ تمام ائمہ حدیث حضرت ابو موسیٰ الاشعریؓ کی اس زیادت والی روایت کو صحیح تسلیم کرتے ہیں۔

ؒ اثبات کا نفی پر مقدم ہونا محدثین کا طے شدہ مسئلہ ہے۔ امام نوویؒ لکھتے ہیں کہ اثبات کو نفی پر ترجیح ہوتی ہے۔ (شرح مسلم جلد ۲ صفحہ ۵۰)

حافظ ابن حجرؒ لکھتے ہیں کہ المثبت اولیٰ من النافی۔ (شرح نخبۃ الفکر ص۹۴) امام بیہقیؒ لکھتے ہیں کہ المثبت اولیٰ من النافی (سنن الکبریٰ جلد ۲ ص۳۱) امیر یمانیؒ لکھتے ہیں: والاثبات مقدم ص۹ (سبل السلام جلد ۱ ص ۲۴۲) نواب صاحبؒ لکھتے ہیں کہ اثبات مقدم است بر نفی (بدور الاہلہ ص ۳۷۹) مبارکپوری صاحبؒ لکھتے ہیں کہ من اثبت مقدم علیٰ من نفی۔ (تحفۃ الاحوذی جلد ص ۱۹۱) مؤلف خیر الکلام کا یہ کہنا کہ یہاں جرح ہی اثبات ہے۔ تصحیح اثبات نہیں ہے کیونکہ تصحیح ظاہر سند کے اعتبار سے ہے۔ اور (حاشیہ اگلے صفحہ پر دیکھئے)۔

موصوف رحؒ اس زیادت کو صحیح تسلیم کرتے ہیں۔ اسی طرح امام ابن معینؒ کو بھی منکرین صحت میں شمار کرنا غلط ہے۔ کیونکہ نقل کیا جاچکا ہے کہ وہ مسلم کی تمام مسند روایتوں کو صحیح سمجھتے تھے جن میں حضرت ابو موسیٰ الاشعری رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی واذا قرأ فانصتوا کی زیادت والی روایت بھی شامل ہے۔ علاوہ بریں امام ابن معینؒ اور امام ابو حاتم رحؒ نے حضرت ابو موسیٰ الاشعری رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی روایت میں واذا قرأ فانصتوا کی زیادت پر کلام نہیں کیا بلکہ انھوں نے حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی روایت میں اس زیادت پر کلام کیا ہے، جس کا ذکر عنقریب ہوگا۔ (دیکھیے کتاب العلل ابن ابی حاتم جلد ا ص ۱۶۴ و سنن الکبریٰ جلد ۲ ص ۱۵۶ و بغیۃ الالمعی جلد ۲ ص ۱۷) اس لیے حضرت ابو موسیٰ الاشعری رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی روایت میں اس زیادت کے انکار کرنے والوں میں ان کا شمار کرنا جہالت اور غفلت پر مبنی ہے۔

ووٹوں کی دنیا میں بھی دیکھ لیجیے کہ اس زیادت کے صحیح تسلیم کرنے والے زیادہ ہیں یا اس کے غلط قرار دینے والے: ع —— چلی تھی برچھی کسی پر کسی کے آن لگی

پانچواں اعتراض

امام نوویؒ لکھتے ہیں کہ امام بیہقی رحؒ اور حافظ ابو علیؒ کہتے ہیں کہ حضرت قتادہؒ کے جملہ تلامذہ میں سے سلیمان تیمیؒ واذا قرأ فانصتوا کی زیادت کو نقل کرنے میں متفرد ہیں اور ائمہ حفاظ کی تضعیف

(بقیہ حاشیہ پچھلا صفحہ) تضعیف شذوذ پر مطلع ہونے کی بنا پر بس جرح ہی اثبات ہے۔ (ص ۴۲۲) محض جی بہلانے کا ایک بہانہ ہے یا ایک لنگڑا بہانہ ہے، اس شعبدہ بازی سے اثبات کو نفی اور نفی کو اثبات بنا دینا کون تسلیم کرتا ہے؟ تصحیح صرف ظاہر سند کے لحاظ نہیں بلکہ ٹھوس اصول کے اعتبار سے ہے اور جرح کا مفہوم یہاں یہ ہے کہ روایت صحیح نہیں اور نفی کیا ہوتی ہے؟

ےہ برہان العجاب مولانا محمد بشیر سہسوانی رحؒ (المتوفی ۱۳۲۶ھ ۱۹۰۸ء) غیر مقلد کی تالیف ہے۔

ےہ امام مسلم کی ایک عبارت ملاحظہ کیجیے جس سے امام بیہقی رحؒ نے اصل مضمون کا حلیہ بگاڑ دیا ہے:

وفی حدیث جریرؒ عن سلیمان التیمیؒ عن قتادةؒ من الزیادة واذا قرأ فانصتوا ولیس فی حدیث احد منھم فان اللہ عزوجل

جریرؒ سلیمان تیمیؒ کے طریق سے قتادہؒ سے روایت کرتے ہیں اور اس میں واذا قرأ فانصتوا کی زیادت بھی موجود ہے اور کسی کی روایت میں یہ مضمون نہیں ہے

(باقی حاشیہ اگلے صفحہ پر)

امام مسلم رحمۃ اللہ علیہ کی تصحیح پر مقدم ہے۔

(بقیہ حاشیہ پچھلا صفحہ) قال علی لسان نبیہ صلی اللہ علیہ وسلم سمع اللہ لمن حمدہ الا فی روایۃ ابی کامل وحدہ عن ابی عوانۃ (مسلم جلد ۱ ص ۱۷۴)

کہ اللہ تعالیٰ نے اپنے نبیؐ کی زبان پر سمع اللہ لمن حمدہ کا حکم دیا ہے مگر یہ مضمون صرف ابو کاملؒ کی روایت میں ہے جس کو وہ ابو عوانہ سے روایت کرتے ہیں۔

اس عبارت کو آپ اچھی طرح دیکھ لیں اور پھر امام بیہقی رہ کے اس ادعاء کی داد دیں۔ وہ لکھتے ہیں کہ واذا قرأ فانصتوا لیس فی حدیث احد منھم (کتاب القرأۃ ص ۸۷) واذا قرأ فانصتوا کی زیادت ان میں سے کسی کی روایت میں نہیں ہے۔ امام مسلمؒ کے قول ولیس فی حدیث احد منھم کا تعلق ماقبل واذا قرأ فانصتوا سے نہیں ہے بلکہ اس کا تعلق مابعد فان اللہ قال علی لسان نبیہ کے ساتھ ہے اور یہ مضمون صرف ابو کاملؒ کی روایت میں ہے اور کسی نے اس کو نقل نہیں کیا۔ مگر امام بیہقی رہ ولیس فی حدیث احد منھم کا تعلق ماقبل واذا قرأ فانصتوا کے ساتھ جوڑ کر خود غلط فہمی کا شکار ہوتے ہیں اور دوسروں کو مغالطہ دے رہے ہیں فسامحہ اللہ تعالیٰ بعموم فضلہ والعصمۃ بید اللہ تعالیٰ۔

امام بیہقی رہ ایک مقام پر تحریر کرتے ہیں کہ بعض علماء نے آیت کی تفسیر میں زیدؓ بن اسلمؒ کا قول نقل کیا ہے لیکن اس نے پوری عبارت نقل نہیں کی اور اس کا یہی وتیرہ ہے کہ عبارات میں سے وہ صرف اس حصہ کو نقل کر دیتا ہے جو اس کے مفید مطلب ہو سکتا ہے اور باقی عبارت چھوڑ دیتا ہے تاکہ دیکھنے والا غلط فہمی میں مبتلا ہو جائے کہ یہ ناقل کی دلیل ہے اور وہ اپنے دل میں یہ نہیں سوچتا کہ علیم بذات الصدور اس کے اس فعل سے واقف ہے اور بسا اوقات اس کی کتاب کو پڑھنے والا اس کی تلبیس پر مطلع ہو جاتا ہے۔ اللہ تعالیٰ اپنے فضل وکرم کے ساتھ ایسی مغالطہ آفرینی سے محفوظ رکھے (کتاب القرأۃ ص ۱۴۹) مگر امام بیہقی رہ دوسروں کی شکایت کرتے کرتے خود اس کے مرتکب ہو گئے ہیں۔ والمعصوم من عصمہ اللہ تعالیٰ۔

آپ ہی خود اپنے جوروجفا کو دیکھیں
ہم اگر عرض کریں گے تو شکایت ہو گی۔

مؤلف خیر الکلام نے ص ۲۴۸ میں غلط فہمی کے عنوان سے یہ بے مغز بات کہی ہے کہ امام بیہقی رہ کی غلطی نہیں معترض کی غلطی ہے اور پھر آگے لکھا ہے کہ اور یہ بھی ہو سکتا ہے کہ کچھ عبارت امام مسلمؒ کی ہو اور کچھ امام بیہقیؒ نے اپنی طرف سے کو دی ہو۔ (محصلہ) مؤلف مذکور کو معلوم ہونا چاہیئے کہ ادھر ادھر کی باتیں حقیقت پر پردہ نہیں ڈال

(بقیہ حاشیہ اگلے صفحہ پر)

وانو سیماو لم یروھا مسندۃ فی صحیحہ (نووی شرح مسلم جلد ا صفحہ ۱۷۵) خصوصاً جب کہ اس روایت کو امام مسلمؒ نے اپنے صحیح میں باسند پیش بھی نہیں کیا۔ اس سے معلوم ہوا کہ یہ روایت مسلم کی مسند روایتوں میں شامل نہیں ہے۔

جواب۔ یہ بات جانے دیجیے کہ اس زیادت کے نقل کرنے میں سلیمان تیمیؒ منفرد ہیں یا کوئی اور بھی اس کو بیان کرتا ہے؟ اور یہ بات بھی جانے دیجیے کہ حفاظ حدیث اس کی تصحیح پر متفق ہیں یا تضعیف پر؟ دیکھنا یہ ہے کہ کیا یہ حدیث جو حضرت ابوموسیٰ الاشعریؓ رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے مروی ہے اور جس میں واذا قرأ فانصتوا کی زیادت ہے۔ امام مسلمؒ کی مسند روایتوں میں ہے یا غیر مسند میں؟ امام نوویؒ کا یہ خیال کہ یہ مسند نہیں باطل اور مردود ہے۔ حافظ ابن حجرؒ اور قاضی شوکانیؒ لکھتے ہیں کہ وھو حدیث صحیح اخرجہ مسلم من حدیث ابی موسیٰ الاشعری رضی اللہ تعالیٰ عنہ (فتح الباری جلد ۲ ص ۱۹۲ و نیل الاوطار جلد ۲ ص ۱۰۷) حضرت ابوموسیٰ الاشعری رضی اللہ تعالیٰ کی یہ روایت صحیح ہے اور امام مسلمؒ نے اس کی تخریج کی ہے۔ فریق ثانی اصول حدیث کی کتابوں کی طرف مراجعت کر کے دیکھ لے کہ محدثین کی اصطلاح میں تخریج کا کیا مطلب ہوتا ہے؟ اور کوئی محدث جب کسی سند کے ساتھ روایت بیان کرتا ہے اور اسی سند کے رواۃ میں سے کسی کی زیادت کو بیان کرتا ہے تو اس کی کیا حیثیت ہوتی ہے۔ مسند ہوتی ہے یا غیر مسند؟

علاوہ بریں اگر یہ تسلیم بھی کر لیا جائے کہ یہ روایت امام مسلمؒ نے باسند پیش نہیں کی تو کیا ابوعوانہؒ اور ابوداؤدؒ وغیرہ نے بھی اس کو مسند روایت نہیں کیا؟ اور کیا کسی حدیث کی تصحیح اس میں ہی منحصر ہے کہ امام مسلمؒ اسے باسند نقل کریں تو صحیح ہوگی ورنہ ضعیف ہوگی؟ الغرض حضرت ابوموسیٰ الاشعریؓ رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی روایت امام مسلمؒ کی مسند روایتوں میں شامل ہے۔ اور امام نوویؒ کا یہ کھلا قصور ہے کہ اس کو غیر مسند قرار دیتے ہیں۔ یہی وہ عبارت ہے جس سے مولانا ثناء اللہ صاحب مرحوم

(بقیہ حاشیہ پچھلا صفحہ) سکتیں۔ بفضلہ تعالیٰ عربی دان کثرت سے موجود ہیں کسی ثالث عربی دان سے دریافت کر لیں کہ غلطی امام بیہقیؒ کی ہے یا بقول مؤلف مذکور معترض کی خواہ مخواہ کا تعصب اور جرات نہ بن سکتی ہو اس کو بھی بنا ڈالنا علماء کی شان کے خلاف ہے۔

امرتسری کو غلط فہمی ہوئی۔ اور علی رؤس الاشہادان کو شکست فاش ہوئی تھی۔ اس زیادت کے صحیح ہونے میں قدر برابر شک و شبہ نہیں۔ المبتدع ع

ترا ہی جی نہ چاہے تو باتیں ہزار ہیں

چھٹا اعتراض:

حافظ ابن حجرؒ، امیر یمانی رحؒ اور مبارکپوری صاحبؒ وغیرہ لکھتے ہیں۔ کہ واذا قرأ فانصتوا کی زیادت صحیح ہے مگر اس سے مراد مازاد علی الفاتحہ کی قرأت ہے۔ یعنی جب امام اور تم (مقتدی) سورۃ فاتحہ کی قرأت سے فارغ ہو جاؤ تو امام قرأت کرے اور تم خاموش رہو کیونکہ واذا قرأ فانصتوا عام ہے اور حضرت عبادہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی حدیث سورۃ فاتحہ کے ساتھ مخصوص ہے۔ (تحفۃ الاحوذی جلد ۱ ص ۲۶، فتح الباری جلد ۲ ص ۱۹۲، سبل السلام جلد ۱ ص ۲۴۵)

جواب: ان حضرات کی یہ توجیہ اور تاویل قطعاً باطل ہے۔ اس لیے کہ مسلم اور ابو عوانہ وغیرہ کے حوالہ سے صحیح روایت ان الفاظ کے ساتھ آں حضرت صلی اللہ تعالیٰ علیہ وآلہ وسلم سے نقل کی جا چکی ہے۔

واذا قرأ فانصتوا واذا قال غیر المغضوب علیہم ولا الضالین۔ فقولوا۔ آمین

کہ جب امام قرأت کرے تو تم خاموش رہو اور جب امام غیر المغضوب علیہم ولا الضالین کہے تو تم آمین کہو۔

یہ عقدہ تو فریق ثانی ہی حل کرے گا کہ غیر المغضوب علیہم ولا الضالین سے قبل وہ کون سی قرأت ہے جس میں امام کا فریضہ قرأۃ کرنا اور مقتدیوں کا وظیفہ خاموش رہنا بتلایا گیا ہے؟ شاید ان کے نزدیک[۱] اس اثناء میں سورۃ یٰسین کی قرأت سنت ہو جس کی امام قرأت کرتا رہے اور اس وقت مقتدی خاموش رہیں؟ اس صحیح حدیث کو پیش نظر رکھ کر بخوبی یہ

---

[۱] مؤلف خیر الکلام لفظ قرأت پر بحث کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ یہ اثر اگرچہ مطلق ہے مگر قرأت بالاجماع چونکہ فاتحہ سے شروع ہوتی ہے اس واسطے اس اثر سے فاتحہ خلف الامام کا پڑھنا ثابت ہوتا ہے۔ (صفحہ ۵۲۱) اس اعتبار سے مقتدی کو سورۃ فاتحہ کی قرأۃ کے وقت اولاً و بالذات خاموش رہنا ضروری ہے کیونکہ بالاجماع قرأت یہاں ہی سے شروع ہوتی ہے۔

اندازہ ہو سکتا ہے کہ یہ تاویل قطعی طور پر باطل اور مردود ہے کیونکہ واذا قرأ فانصتوا کے حکم میں مقتدیوں کے لیے سورۃ فاتحہ کی قرأت کی ممانعت اولاً اور بالذات ہے اور قرآن کریم کی بقیہ سورتوں کی ممانعت ثانیاً اور بالتبع ہے۔ فریق ثانی کے سطحی قسم کے لوگ عموماً یہ مطالبہ کیا کرتے ہیں کہ ہمیں ایسی صحیح روایت بتلاؤ جس میں سورۃ فاتحہ کی قرأت کی مقتدیوں کے لیے ممانعت آئی ہو۔ سو طلبہ کرام کو مسلم اور ابو عوانہ کی یہ صحیح حدیث پیش نظر رکھنی چاہیے اور حدیث نمبر ۳ وغیرہ ملاحظہ کریں اور اگر بالفرض اس حدیث میں واذا قرأ فانصتوا کی زیادت نہ بھی مذکور ہوتی تب بھی یہ روایت اس پر دلالت کرتی ہے کہ قرأت کرنا امام کا کام ہے نہ کہ مقتدیوں کا اس زیادت کے بغیر روایت کا مضمون یہ ہو گا۔ جب تم نماز پڑھنا چاہو تو اپنی صفیں درست کر لو۔ اور ایک تم میں سے امام بنے۔ جب امام تکبیر کہے تو تم بھی تکبیر کہو اور جب امام غیر المغضوب علیھم ولا الضالین پڑھے تو تم آمین کہو۔ اگر مقتدیوں پر بھی سورۃ فاتحہ کی قرأت لازم ہوتی تو اذا قال غیر المغضوب علیھم ولا الضالین کے بجائے اذا قلتم غیر المغضوب علیھم ولا الضالین۔ ہوتا جیسا کہ فقولوا آمین میں قولوا جمع کا صیغہ ہے حالانکہ غیر المغضوب علیھم ولا الضالین۔ پڑھنے کی نسبت صرف امام کی طرف ہوتی ہے اور یہ اس امر کی بین دلیل ہے کہ سورۃ فاتحہ پڑھنا صرف امام کا کام ہے۔ مقتدیوں کا کام صرف خاموش رہنا اور انصات کرنا ہے۔ ہاں البتہ آمین کہنے میں مقتدی برابر کے شریک ہیں اور صحیح مسلم جلد ۱ ص ۱۷۶ کی ایک روایت میں اس طرح آتا ہے کہ اذا قال القاری غیر المغضوب علیھم ولا الضالین فقال من خلفہ آمین الحدیث کہ جب پڑھنے والا غیر المغضوب علیھم ولا الضالین کہے تو جو اس کے پیچھے ہیں وہ آمین کہیں اس روایت میں شارع نے امام کو قاری اور پڑھنے والا کہا ہے اگر سب کے لیے قرأۃ لازم ہوتی تو صرف امام ہی قاری نہ ہوتا۔ (الدلیل المبین ص ۲۸۹) رہا حضرت عبادہؓ کی روایت کا حوالہ دینا تو اپنے مقام پر آئے گا کہ قرأت سورۃ فاتحہ برائے مقتدی کی کوئی روایت صحیح نہیں ہے۔ لہٰذا اس صحیح روایت سے اس کا تعارض قائم کرنا اور پھر اس کی تاویل اور توجیہ کرنا انصاف سے بعید تر ہے۔ ؎

لہ یہ روایت بخاری جلد ۱ ص ۱۰۸، نسائی جلد ۱ ص ۱۳۲ اور طیالسی صفحہ ۳۳۶ وغیرہ میں بھی مذکور ہے۔

یہ کاوشیں بے سبب ہیں کیسی، کدورتوں کی کچھ انتہا بھی
زبان رکھتے ہیں ہم بھی آخر کبھی تو پوچھو، سوال کیا ہے؟

مؤلف خیر الکلام نے (ص ۴۲۳ و ص ۴۲۴ میں) یہ کہ کر جان چھڑانے کی ناکام کوشش کی ہے کہ معترض نے یہ سمجھا ہے کہ دونوں جملوں میں ترتیب ہے حالانکہ واؤ ترتیب کے لیے نہیں ہوتی جیسے مرزائی لفظ مُتَوَفِّيكَ وَرَافِعُكَ میں ترتیب ثابت کرنے میں غلطی کرتے ہیں اسی طرح معترض نے بھی غلطی کی ہے اور دار قطنی جلد ۱ ص ۱۲۵ میں فانصتوا کا جملہ ولا الضالین کے بعد ہے مگر سند میں محمد بن یونس ہے جو ضعیف ہے۔ حدیث اگرچہ ضعیف ہے مگر اس سے انصات کے محل کی تعیین ہوتی ہے (محصلہ) اور قاضی مقبول احمد صاحب نے الاعتصام ۲۶ اکتوبر ۱۹۹۲ء ص ۸ میں بزعم خویش قرآن وحدیث کی چند مثالیں دے کر آخر میں یہ کہا ہے کہ جب یہ ثابت ہو گیا کہ واؤ ہمیشہ ترتیب کے لیے نہیں ہوتی اور اس زیر بحث حدیث میں بھی ترتیب نہیں ہے تو مولانا موصوف کا طلبہ کو نصیحت کرنا محض طفل تسلی ہے اور اس فقرہ سے ما زاد علی الفاتحہ مراد لینے میں کوئی رکاوٹ نہیں۔ اھ

الجواب: یہ جو کچھ کہا گیا ہے بالکل بے جان ہے:

اولاً — اس لیے کہ اگرچہ جمہور نحاۃ وغیرہ اس کے قائل ہیں کہ حرف واؤ ترتیب کا فائدہ نہیں دیتا لیکن بعض اکابر ائمہ یہ فرماتے ہیں کہ اس میں ترتیب ہوتی ہے چنانچہ علم نحو کی مشہور کتاب مغنی اللبیب میں ہے کہ

وقول بعضهم ان معناها الجمع المطلق غير سديد لتقييده الجمع بقيد الاطلاق وانما هي للجمع لا بقيد وقول السيرافي ان النحويين واللغويين اجمعوا على انها لا تفيد الترتيب مردود بل قال بافادتها اياه قطربؒ والربعيؒ والفراءؒ وثعلبؒ

اور بعض کا یہ کہنا کہ حرف واؤ کا معنی جمع مطلق ہے درست نہیں ہے کیونکہ جمع کے ساتھ اطلاق کی قید لگ گئی ہے حالانکہ یہ بغیر قید کے جمع کے لیے ہے اور سیرافیؒ کا یہ کہنا کہ جملہ نحوی اور لغوی اس امر پر متفق ہیں کہ واؤ ترتیب کا فائدہ نہیں دیتی بالکل مردود ہے کیونکہ قطربؒ، ربعیؒ، فراءؒ

وابو عمرو والزاهد وهشام والشافعي ونقل الامام في البرهان عن بعض الحنفية انها للمعية ... اھ (جلد ۲ ص ۳۱)

ثعلبؒ، ابو عمرو الزاہدؒ، ہشامؒ اور امام شافعیؒ فرماتے ہیں کہ ترتیب کا فائدہ دیتی ہے اور امام نے برہان میں بعض حنفیوں سے نقل کیا ہے کہ واؤ معیت کے لیے ہے۔

اور علامہ رضی لکھتے ہیں کہ

ونقل بعضهم عن الفراء والكسائي وثعلب والربعي وابن درستويه وبه قال بعض الفقهاء انها للترتيب ... اھ (رضی جلد ۲ ص ۳۰۶)

بعض نے فراءؒ، کسائیؒ، ثعلبؒ، ربعیؒ اور درستویہؒ سے نقل کیا ہے اور اسی کے بعض فقہاء قائل ہیں کہ حرف واو ترتیب کے لیے ہے۔

امام نوویؒ فرماتے ہیں کہ بہت سے فقہاء شافعیہ اور بعض نحویوں[۱] کا یہی مذہب ہے کہ حرف واو ترتیب کو چاہتا ہے (محصلہ شرح مسلم جلد ۱ ص ۲۱۲) اس سے معلوم ہوا کہ حرف واؤ کو ترتیب کے لیے ماننے والے بڑے بڑے ائمہ ہیں جن میں امام شافعیؒ وغیرہ بھی ہیں۔ لہٰذا معترض کو استدلال میں مرزائیوں سے تشبیہ دے کر اپنے دلِ ماؤف کی بھڑاس نکالنا اور حواریوں کو خوش کرنے کی بے جا سعی کرنا علمی دنیا میں اس کی کوئی وقعت نہیں۔

وثانیاً — جن حضرات نے یہ کہا ہے کہ حرف واو ترتیب کے لیے نہیں اس کا مطلب یہ ہے کہ ترتیب ضروری اور واجب نہیں یہ کب کہا ہے کہ ترتیب ناجائز اور حرام ہے؟ کسی سُنّی عالم نے حضرت عبداللہ بن عمرؓ کی یہ روایت پیش کی تھی کہ آں حضرت صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم بقید حیات تھے اور ہم یوں کہا کرتے تھے۔ ابوبکرؓ و عمرؓ و عثمانؓ۔ (ترمذی جلد ۲ ص ۲۱۲ قال حسن صحیح) یعنی اس ترتیب سے ہم ان کا تذکرہ کیا کرتے تھے تو اس پر ایک رافضی بدحواس ہو کر بولا کہ حرف واو ترتیب کے لیے نہیں ہوتا سُنّی عالم بولا کہ ترتیب ناجائز اور حرام بھی تو نہیں ہے۔

وثالثاً — حدیث زیر بحث کے تین جملے ہیں: فاذا كبر فكبروا واذا قرأ فانصتوا واذا قال غير المغضوب عليهم ولا الضالين فقولوا آمين تو مؤلف خیر الکلام وغیرہ

---

[۱] اور ابن رشدؒ نے نحاۃ کوفیہ کا یہی مسلک نقل کیا ہے کہ واو میں ترتیب ہوتی ہے۔ (بدایۃ المجتہد ج ۱ ص ۱۶)

کے ذہن کے مطابق واذا قرأ فانصتوا اور واذا قال غیر المغضوب علیہم .... الخ جو حرف واو کے ساتھ مذکور ہیں فاذا کبر فکبروا سے پہلے بھی ہو سکتے ہیں تو مطلب یہ ہوگا کہ امام کے تکبیر کہنے سے پہلے ہی تم خاموش رہا کرو اور غیر المغضوب .... الخ پڑھا کرو اس لحاظ سے ما قبل التکبیر میں بھی انصات کی صورت نکل آئی جو فریق ثانی کو بڑی مفید رہے گی اور امام بھی تکبیر سے پہلے ہی غیر المغضوب علیہم .... الخ پڑھ لیا کرے گا اور مقتدی بھی آمین کہہ لیا کریں گے کیونکہ حرف واو ترتیب کو نہیں چاہتا اس طرح انشاء اللہ تعالیٰ سب مسئلے حل ہو جائیں گے۔

ورابعاً۔ دارقطنی کی روایت کے متعلق خود مؤلف خیر الکلام نے ضعیف ہونے کا اقرار کیا ہے پھر اس سے تعیین محل کا سہارا بالکل بیکار ہے انتہائی تعجب ہے کہ صحیح ابو عوانہ اور صحیح مسلم کے ثقہ راویوں کی متابعت تو مؤلف کے نزدیک کالعدم ہے مگر محمد بن یونس (جس کے بارے میں مولانا شمس الحق صاحبؒ غیر مقلد لکھتے ہیں کہ ھو ضعیف لا یحتج بہ (تعلیق المغنی جلد ۱ ص ۱۲۵) کی روایت سے تعیین محلِ انصات ضرور ہو سکتا ہے۔ سبحان اللہ تعالیٰ! آپ نے ملاحظہ کیا کہ فریقِ ثانی کس طرح بے جان اور بے وزن دلیلوں کا سہارا لیتا ہے۔

دوسری حدیث:

امام نسائیؒ[1] فرماتے ہیں کہ ہم سے جارودؒ[2] بن معاذ ترمذیؒ نے بیان کیا۔ وہ فرماتے ہیں کہ ہم سے ابو خالدؒ[3] الاحمرؒ نے بیان کیا۔ وہ محمدؒ بن عجلانؒ[4] سے روایت کرتے ہیں اور وہ زیدؒ[5] بن اسلمؒ

---

[1] امام نسائیؒ (المتوفی ۳۰۳ھ) جن کی کتاب سنن نسائیؒ صحاح ستہ میں تیسرے درجہ پر مانی جاتی ہے۔

علامہ ذہبیؒ ان کو الحافظ الامام اور شیخ الاسلام لکھتے ہیں (تذکرہ جلد ۲ ص ۲۴۱)

[2] امام نسائی رح ان کو ثقہ کہتے ہیں۔ ابن حبانؒ ان کو ثقات میں لکھتے ہیں اور کہتے ہیں کہ مستقیم الحدیث ہیں۔ (تہذیب التہذیب جلد ۲ ص ۵۳) حافظ ابن حجرؒ ان کو ثقہ کہتے ہیں۔ (تقریب ص ۶۴)

[3] امام وکیعؒ ابن معینؒ اور ابن مدینیؒ ان کو ثقہ کہتے ہیں۔ امام نسائیؒ لا باس بہ اور ابو ہشام رفاعیؒ ثقہ اور امین کہتے ہیں۔ ابو حاتمؒ ان کو صدوق کہتے ہیں۔ ابن سعدؒ ان کو ثقہ اور کثیر الحدیث کہتے ہیں عجلیؒ کا بیان ہے کہ وہ ثقہ اور ثبت تھے۔ (بغدادی جلد ۹ ص ۲۲ و تہذیب التہذیب جلد ۴ ص ۱۸۱) علامہ

(باقی اگلے صفحہ پر)

سے روایت کرتے ہیں اور وہ ابوصالحؒ[۱] سے اور وہ حضرت ابوہریرہؓ سے روایت کرتے ہیں وہ فرماتے ہیں:

قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم انما جعل الامام لیؤتم بہ فاذا کبر فکبروا واذا قرأ فانصتوا واذا قال سمع اللہ لمن حمدہ فقولوا اللّٰھم ربنا ولک الحمد۔

(نسائی ج ۱ ص ۱۰۷)

کہ آں حضرت صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا ہے کہ امام اس لیے مقرر کیا جاتا ہے کہ اس کی اقتدار کی جائے سو جب وہ تکبیر کہے تو تم بھی تکبیر کہو اور جب امام قرأت کرے تو تم خاموش رہو اور جب وہ سمع اللہ لمن حمدہ کہے تو تم اللّٰھم ربنا لک الحمد کہو۔

(باقی پچھلے صفحے کے حاشیے) ذہبیؒ ان کو الحافظ الصدوق اور مشہور محدث لکھتے ہیں (تذکرہ جلد ۱ ص ۲۵)

۴ امام ترمذیؒ ان کو ثقہ اور مامون فی الحدیث کہتے ہیں۔ (ترمذی جلد ۱ ص ۶ و کتاب العلل جلد ۲ ص ۲۳۷) امام بیہقیؒ ان کو ثقات میں شمار کرتے ہیں۔ (سنن الکبریٰ جلد ۲ ص ۴) امام نوویؒ لکھتے ہیں کہ وہ امام فقیہ اور عابد تھے۔ (تہذیب الاسماء قسم دوم جلد ۱ ص ۸۷) ابن عماد حنبلیؒ کا بیان ہے کہ وہ عابد پابند شریعت اور صداقت شعار تھے۔ (شذرات الذہب جلد ۱ ص ۲۲۴) علامہ ذہبیؒ ان کو الامام اور القدوہ لکھتے ہیں۔ (تذکرہ جلد ۱ ص ۱۵۵) امام احمدؒ سفیانؒ بن عیینہؒ ابن معینؒ عجلیؒ ابو حاتمؒ نسائیؒ اور ابو زرعہؒ ان کو ثقہ کہتے ہیں۔ یعقوبؒ بن شیبہؒ ان کو صدوق وسط کہتے ہیں۔ ابن حبانؒ ان کو ثقات میں لکھتے ہیں۔ ساجیؒ ان کو اہلِ صدق میں شمار کرتے ہیں۔ ابن سعدؒ ان کو عابد ناسک اور فقیہ بتاتے ہیں۔ (تہذیب التہذیب جلد ۹ ص ۲۳۴) مولانا شمس الحقؒ ان کو ثقہ لکھتے ہیں۔ (تعلیق المغنی جلد ۱ ص ۱۲۴ و عون المعبود جلد ۱ ص ۲۳۵) اور خطیب بغدادیؒ فرماتے ہیں کہ وہ ثقہ تھے۔ (تاریخ جلد ۲ ص ۳۰۴)

۵ زیدؒ بن اسلمؒ کو علامہ ذہبیؒ الامام اور الفقیہ لکھتے ہیں۔ (تذکرہ جلد ۱ ص ۱۲۴) امام احمدؒ ابو زرعہؒ، ابو حاتمؒ محمدؒ بن سعدؒ، نسائیؒ، ابن خراشؒ۔ اور یعقوبؒ بن شیبہؒ سب ان کو ثقہ کہتے ہیں (تہذیب التہذیب جلد ۳ ص ۳۹۶)

۱ ابوصالحؒ کا نام ذکوانؒ تھا۔ امام احمدؒ ان کو ثقہ اجل الناس اور اوثق الناس کہتے ہیں۔ (تذکرہ جلد ۱ ص ۸۳) امام ابن معینؒ، ابو حاتمؒ، ابو زرعہؒ، ابن سعدؒ، ساجیؒ اور عجلیؒ سب ان کو ثقہ کہتے ہیں۔ محدث حربیؒ اور ابن حبانؒ ان کو ثقات میں لکھتے ہیں۔ (تہذیب التہذیب جلد ۳ ص ۲۱۹) حضرت ابوہریرہؓ جلیل القدر

(باقی اگلے صفحہ پر)

اس صحیح روایت[1] سے بھی معلوم ہوا کہ تمام نمازوں میں امام کا وظیفہ[2] قرآۃ کرنا اور مقتدیوں کا فریضہ خاموش رہنا ہے۔ اس حدیث پر جو اعتراضات کیے گئے ہیں وہ ملاحظہ کیجئے اور ساتھ ہی ان کے جوابات بھی دیکھ لیجئے۔

پہلا اعتراض:

حضرت امام بخاری[3]، امام بیہقیؒ اور مبارکپوری صاحبؒ وغیرہ فرماتے ہیں کہ واذا قرأ فانصتوا کی زیادت نقل کرنے میں ابو خالد الاحمرؒ متفرد ہیں لہٰذا یہ زیادت قابل قبول نہیں۔ (جزء القرآۃ ص۵۶، کتاب القرآۃ ص۹۱، ابکار المنن ص۱۵۲ اور مؤلف خیر الکلام نے صفحہ ۴۳۲ اور ۴۳۴ میں اس روایت کو شاذ کہ کر گلو خلاصی چاہی ہے اور قاضی مقبول احمد صاحب نے بھی اس کو شاذ کہ کر اپنے دل کو تسکین دی ہے۔ (ملاحظہ ہو الاعتصام ۱۹ اکتوبر ۱۹۶۲ء ص۱۰ کالم ۱)

جواب۔ اس زیادت کے رد کرنے کا یہ بہانہ محض بے کار ہے۔

(پچھلے صفحے کا باقی) صحابی ہیں۔ نواب صدیق حسن خاں صاحبؒ اس سند کو نقل کرنے کے بعد لکھتے ہیں کہ رجال اسنادہ ثقات۔ (دلیل الطالب ص ۲۹۴)

[1] یہ روایت ابن ماجہ ص ۶۱، ابوداؤد جلد۱ ص ۸۹، مسند احمد ۴ ص ۴۱۵، دارقطنی جلد۱ ص ۱۲۴، سنن الکبریٰ جلد۲ ص۱۵۶، محلی جلد۳ ص ۲۴۰، جزء القرآۃ ص ۵۶، کتاب القرآۃ ص ۹۱، ابن جریر جلد۹ ص ۱۱۰، ابن کثیر جلد۲ ص ۲۸۳، الجوہر النقی جلد۲ ص ۱۵۶، تعلیق المغنی جلد۱ ص۱۲۴، عون المعبود جلد۱ ص ۲۳۵، درایہ ص ۹۴، زیلعی جلد۲ ص۱۶، مسلم جلد۱ ص ۱۷۴، آثار السنن جلد۲ ص۸۷، ابکار المنن ص ۱۵۳، اعلاء السنن جلد۴ ص ۵۵، دلیل الطالب ص۲۹۴، روح المعانی جلد۹ ص ۱۳۳، بذل المجہود جلد۲ ص ۵۵ اور فتح الملہم ص۲۲ وغیرہ میں مروی ہے۔

[2] نواب صدیق حسن خان صاحبؒ لکھتے ہیں کہ ودر حدیث ابوہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ وابو موسیٰ رضی اللہ تعالیٰ عنہ است واذا قرأ فانصتوا پس حظ مؤتم انصات واستماع قرأت امام است وانصات خاص بجہریہ نیست بلکہ شامل سریہ ہم است پس واجب سکوت باشد مطلقاً نزد قرآت الخ (ہدایۃ السائل ص ۱۹۳)

[3] امام بخاریؒ لکھتے ہیں کہ لم یتابع علیہ مبارکپوری صاحبؒ ایک سند کی تحقیق میں لکھتے (باقی اگلے صفحہ پر)

(باقی اگلے صفحہ پر)

اوّلاً[۱] — اس لیے کہ جب ابوخالد الاحمرؒ بلا اختلاف ثقہ اور ثبت ہیں تو پھر ان کی زیادت کیوں قابل قبول نہ ہوگی ؟

ثانیاً[۲] — اس زیادت کے بیان کرنے میں ابوخالد الاحمرؒ متفرد نہیں بلکہ محمدؒ بن سعد[۳] انصاری اشہلیؒ بھی اس زیادت کو نقل کرتے ہیں - اور اس روایت کے باقی وہی راوی ہیں جن کی توثیق عرض کردی گئی ہے - البتہ محمدؒ بن عبد اللہؒ بن مبارکؒ کا ذکر نہیں ہوا - اور یہ بھی وہ بھی ثقہ ، نواب صدیق حسن خانصاحبؒ لکھتے ہیں کہ ابو خالد از ثقاتِ اثبات است ، بخاریؒ و مسلمؒ بوئے احتجاج کردہ اند - دریں صورت تفرد ش مضر نیست ، و نیز وے نہ تنہا بایں زیادت متفرد است ، بلکہ ابوسعید محمدؒ بن سعد انصاریؒ نیز تابع او دریں زیادت بودہ است - (دلیل الطالب ص ۲۹۴)

غرضیکہ یہ زیادت بھی سابق کی طرح بالکل صحیح ہے اور اس کے غیر صحیح ہونے کا ادنیٰ احتمال بھی پیدا نہیں ہوتا -

دوسرا اعتراض :

مبارک پوری صاحبؒ لکھتے ہیں کہ محمدؒ بن عجلانؒ میں کچھ کلام اور مقال ہے - نیز وہ مدلس بھی ہے -

(پچھلے صفحہ کا بقیہ) ہیں کہ امام بخاریؒ کا محمدؒ بن عبد اللہؒ بن الحسنؒ سے متعلق لا یتابع علیہ کہنا ہرگز مضر نہیں کیونکہ محمد مذکور ثقہ تھے - (تحفۃ الاحوذی جلد ۱ ص ۲۳۱) کیا ہم بھی مبارک پوری صاحب سے اس انصاف کی امید رکھ سکتے ہیں -

[۱] یہ روایت نسائی جلد ۱ ص ۱۰۷ ، دارقطنی جلد ۱ ص ۱۲۴ ، عون المعبود جلد ۱ ص ۲۲۵ ، نصب الرایہ جلد ۲ ص ۱۶ اور تعلیق المغنی جلد ۱ ص ۱۲۴ وغیرہ میں مذکور ہے -

[۲] امام نسائیؒ ان کو ثقہ کہتے ہیں (جلد ۱ ص ۱۰۷) دارقطنیؒ ان کو ثقہ کہتے ہیں (جلد ۱ ص ۱۲۵) زیلعیؒ کہتے ہیں کہ وہ ثقہ تھے (جلد ۲ ص ۱۶) ابن حبانؒ ان کو ثقات میں لکھتے ہیں - (تہذیب التہذیب جلد ۹ ص ۲۵۴) مولانا شمس الحقؒ ان کو ثقہ کہتے ہیں (عون المعبود جلد ۱ ص ۲۲۵ و تعلیق المغنی جلد ۱ ص ۱۲۴)

[۳] حافظ ابن حجرؒ لکھتے ہیں کہ وہ ثقہ اور حافظ تھے (تقریب ص ۳۲۷) الحاصل اس روایت کے بھی جملہ راوی ثقہ ہیں - اور اصول حدیث کی رو سے یہ روایت اعلیٰ درجہ کی صحیح ہے -

اس لیے یہ روایت صحیح نہیں ہو سکتی۔ (ابکار المنن صہ ۱۵۲)

جواب۔ مبارک پوری صاحبؒ ان میں مقال کا شاید مطلب[1] ہی نہیں سمجھے۔ رہی ان کی تدلیس تو وہ بھی مفروغ عنہ ہے۔

اوّلاً۔ بقول بعض یہ مکحولؒ کے درجہ کے مدلس تھے۔ مگر فریقِ ثانی مکحولؒ کی تدلیس سے صرفِ نظر کر جاتا ہے۔[2]

ثانیاً۔ اگر ان کی تدلیس مضر ہوتی تو امام بخاریؒ اور ابو داؤدؒ وغیرہ ضرور اس کا تذکرہ کرتے مگر وہ صرف ابو خالد الاحمر کے تفرد کی شکایت کرتے ہیں۔

ثالثاً۔ دیگر محدثینؒ کو عموماً اور علامہ ذہبیؒ کو خصوصاً یہ قاعدہ معلوم ہے لیکن وہ محمد بن عجلانؒ کی متعدد معنعن حدیثوں اور روایتوں کو صحیح کہتے ہوئے تصحیح کرتے ہیں۔ (مثلاً تلخیص مستدرک جلد ۱ صہ ۵ وغیرہ)

رابعاً۔ محدثینؒ اور محققینؒ کے صنیع سے معلوم ہوتا ہے کہ محمدؒ بن عجلانؒ، قتادہؒ، سفیانؒ ثوری اور حسن بصریؒ وغیرہ کی طرح ان مدلسین میں شامل ہیں جن کی تدلیس کسی صورت میں مضر نہیں ہے۔

خامساً۔ محمدؒ بن عجلانؒ کے دو متابع بھی موجود ہیں۔ خارجہؒ بن مصعبؒ اور یحییٰؒ بن علاءؒ (دیکھیے سنن الکبریٰ جلد ۲ صہ ۱۵۱) اور گو یہ کمزور اور ضعیف ہیں لیکن متابعت میں پیش کرنے پر مبارک پوری صاحبؒ کو بھی کوئی اعتراض نہیں بلکہ وہ اس کا اقرار کرتے ہیں۔[3]

---

[1] بعض لوگوں نے ان میں یہ کلام کیا ہے کہ امام بخاریؒ و مسلمؒ نے ان سے احتجاج نہیں کیا۔ لیکن یہ اعتراض باطل ہے۔ اوّلاً۔ اس لیے کہ ثقہ اور ثبت راوی کے لیے یہ شرط نہیں کہ ان سے امام بخاریؒ و مسلمؒ نے ضرور احتجاج کیا ہو۔ ثانیاً۔ امام مسلمؒ نے ان سے احتجاج کیا ہے (مستدرک جلد ۱ صہ ۴، بذل المجہود جلد ۲ ص ۵۵ اور مسلم جلد ۲ صہ ۳۱ وغیرہ ملاحظہ کر لیجیے) محمدؒ بن عجلانؒ بطریق سعید مقبریؒ عن ابی ہریرہؓ کی بعض روایتوں پر کچھ کلام کیا گیا ہے (کتاب العلل ترمذی جلد ۲ صہ ۲۳۰ و تہذیب التہذیب جلد ۹ صہ ۳۴۱) لیکن وہ بھی صرف چند روایتیں ہیں اور علامہ ذہبیؒ نے ان کا جواب بھی دے دیا ہے (میزان جلد ۳ صہ ۱۰۲) مگر ہم نے جو سند پیش کی ہے وہ سعید مقبریؒ کے طریق سے نہیں بلکہ زیدؒ بن اسلمؒ کے طریق سے ہے۔

[2] دیکھئے ابکار المنن صہ ۱۳۱/۱۲۹ اور دیگر محدثینؒ بھی اس قاعدہ کو صحیح تسلیم کرتے ہیں۔ (باقی اگلے صفحہ پر)

سادساً — جرح کرنے والے جرح پر بھی متفق نہیں ہیں۔ بعض ابو خالدؒ کا تفرد بتاتے ہیں اور بعض محمد بن عجلانؒ کی تدلیس اس سے بھی جرح کمزور ہو جاتی ہے۔ (اعلاء السنن جلد ۴ صفحہ ۵۹)

سابعاً — اگر محمدؒ بن عجلانؒ میں واقعی کوئی کلام ہوتا۔ یا ان کی تدلیس مضر ہوتی تو حضرات محدثین کرامؒ کی ایک بہت بڑی جماعت اس حدیث کی ہرگز تصحیح نہ کرتی، حالانکہ اس حدیث کی ذیل کے ائمہ حدیث تصحیح کرتے ہیں:

۱۔ امام احمدؒ بن حنبلؒ (الجوہر النقی جلد ۲ صفحہ ۱۵۷) ۲۔ امام مسلم رحمۃ اللہ علیہ (جلد ۱ صفحہ ۱۷۴)
۳۔ علامہ ابن حزمؒ (محلی جلد ۳ صفحہ ۲۴۰) ۴۔ امام نسائیؒ " (جلد ۱ صفحہ ۱۰۷)
۵۔ دارقطنیؒ (جلد ۱ صفحہ ۱۲۴) ۶۔ ابن جریرؒ " (تفسیر جلد ۹ صفحہ ۱۱۱)
۷۔ حافظ ابو عمرؒ بن عبد البرؒ (جوہر النقی جلد ۲ صفحہ ۱۰۷) ۸۔ حافظ ابن کثیرؒ (تفسیر جلد صفحہ ۲۲۳)
۹۔ علامہ ماردینیؒ (جوہر النقی جلد ۲ صفحہ ۱۵۷) ۱۰۔ امام منذریؒ (زیلعی جلد ۲ صفحہ ۱۶ و تعلیق المغنی
۱۱۔ علامہ جمال الدینؒ (نصب الرایہ جلد ۲ صفحہ ۱۶) جلد ۱ صفحہ ۱۲۴)
۱۲۔ مولانا شمس الحق عظیم آبادیؒ (عون المعبود ۱۳۔ نواب صدیق حسن خاں صاحبؒ
جلد ۱ صفحہ ۲۳۵ تعلیق المغنی جلد ۱ صفحہ ۱۲۴) (دلیل الطالب صفحہ ۲۹۴)

بلکہ نواب صاحب تحریر فرماتے ہیں کہ

وهذا الحديث مما ثبت عند اهل السنن وصححه جماعة من الائمة۔ (دلیل الطالب صفحہ ۲۹۴)

یہ حدیث ارباب سنن کے نزدیک ثابت اور محقق ہو چکی ہے اور ائمہ حدیث کی ایک بہت بڑی جماعت نے اس کی تصحیح کی ہے۔

اور شیخ الاسلام ابن تیمیہؒ کا حوالہ باب اول میں نقل کیا جا چکا ہے کہ وہ بڑی شد و مد سے واذا قرأ فانصتوا کی روایت اور اس میں زیادت کو صحیح ثابت کرتے ہیں، علامہ ابن حزم رح

(بقیہ پچھلا صفحہ) ملاحظہ ہو میزان الاعتدال جلد ۱ ص ۳ و مقدمہ نووی ص ۱۶ و کتاب القراۃ ص ۱۲۹ و تدریب الراوی ص ۸۰، اور اعلاء السنن ص ۲۴، اور لکھا ہے وهذا مجمع بين المحدثين مگر یہ یاد رکھیے کہ اصل راوی صرف مدلس ہو ضعیف اور کمزور نہ ہو۔ ورنہ متابعت بے سود ہوگی۔

لکھتے ہیں کہ بعض کا خیال ہے کہ اس زیادت میں محمد بن عجلانؒ نے خطا کی ہے۔ مگر ہم ثقہ راوی کے بارے میں کسی واضح برہان کے بغیر یہ کہنے کی جرأت نہیں کر سکتے۔ بہر حال سند کے لحاظ سے یہ زیادت بالکل صحیح ہے (محلی ابن حزم جلد ۳ ص ۲۴۲) انصاف سے فرمائیے کہ کسی حدیث کی تصحیح کے لیے اس سے بڑھ کر حضرات محدثین کرامؒ کے پاس اور کیا ثبوت ہو سکتا ہے؟ مگر ؎

آنکھیں اگر ہیں بند تو پھر دن بھی رات ہے
اس میں بھلا قصور ہے کیا آفتاب کا۔

الحاصل حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی یہ روایت بھی اور اس کی پوری سند بالکل صحیح اور بے غبار ہے اور محض تعصب کی وجہ سے اس کو شاذ کہکر رد کرنا بے سود ہے۔

تیسری حدیث: امام بیہقیؒ[1] فرماتے ہیں کہ ہم سے حافظ ابو عبد اللہؒ[2] نے بیان کیا وہ فرماتے ہیں کہ ہم سے جعفر خلدیؒ[3] نے بیان کیا۔ وہ فرماتے ہیں کہ ہم سے الحسن بن علیؒ بن شبیب المعمریؒ[4]

---

[1] امام بیہقیؒ کا ترجمہ باب اول میں نقل کیا جا چکا ہے۔

[2] حافظ ابو عبد اللہ الحاکمؒ صاحب مستدرک کا ترجمہ بھی باب اول میں نقل کیا جا چکا ہے۔

[3] جعفر بن محمدؒ بن نصیر الخلدیؒ، علامہ خطیبؒ ان کو ثقہ، صادق، دیندار اور فاضل لکھتے ہیں (تاریخ خطیب جلد ۷ ص ۲۲۶)

[4] علامہ ذہبیؒ ان کو الحافظ، العلامہ اور البارع لکھتے ہیں اور لکھتے ہیں کہ وہ حفظ اور فہم سے بہرہ ور تھے۔ امام دارقطنیؒ ان کو صدوق اور حافظ کہتے ہیں (تذکرہ جلد ۲ ص ۲۱۵) ابن عدیؒ ان کو کثیر الحدیث اور امام ربانی کہتے ہیں۔ (ایضاً) حافظ ابن حجرؒ لکھتے ہیں کہ تمام محدثین ان کے عادل ضابطہ اور صاحب فضیلت ہونے پر متفق ہو چکے ہیں۔ موسیٰؒ بن ہارونؒ کا بیان ہے کہ وہ اوثق الناس اور اثبت الناس تھے اور ان کی یہ خوبی تھی کہ تدلیس نہیں کرتے تھے۔ محدث عبدان اہوازیؒ کا بیان ہے کہ میں نے معمریؒ جیسا محدث تمام روئے زمین پر نہیں دیکھا۔ (لسان المیزان جلد ۲ ص ۲۲۱ تا ۲۲۵ اور علامہ خطیبؒ لکھتے ہیں کہ وہ علم کا ظرف تھے فہم و حفظ سے متصف تھے۔ ان کی احادیث میں کچھ

نے بیان کیا۔ وہ فرماتے ہیں کہ ہم سے احمدؒ بن مقدامؒ نے بیان کیا۔ وہ کہتے ہیں کہ ہم سے طفاویؒ نے بیان کیا۔ وہ کہتے ہیں کہ ہم سے ایوبؒ نے بیان کیا۔ وہ زہریؒ سے روایت کرتے ہیں اور وہ حضرت انسؓ بن مالک سے روایت کرتے ہیں وہ فرماتے ہیں:

ان النبیؐ صلی اللہ علیہ وسلم قال اذا قرأ الامام فانصتوا۔ (کتاب القراءۃ ص ۹۲)	کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ جب امام قراءۃ کرے تو تم خاموش رہو۔

اس روایت میں بھی مقتدی کا وظیفہ (تمام نمازوں میں) خاموشی اور امام کا فریضہ قراءۃ بتلائی گئی ہے اور اگر انصاف کا دامن ہاتھ سے نہ چھوڑا جائے تو اس روایت پر بھی کوئی معقول اعتراض وارد نہیں ہو سکتا۔ گو امام بیہقیؒ نے یہ فرمایا ہے کہ واذا قرأ فانصتوا کی زیادت بیان کرنے میں العمریؒ متفرد ہیں۔ لیکن جب معمریؒ ثقہ ثبت اور الحافظ اور الامام ہیں تو ان کی یہ صحیح روایت اور زیادتِ بیان کس طرح رد کی جا سکتی ہے؟ معمریؒ کے طریق سے ایک روایت کی امام حاکمؒ اور علامہ ذہبیؒ دونوں علی شرط الشیخین تصحیح کرتے ہیں (مستدرک جلد ۱ ص ۳۵۸) مؤلف خیر الکلام نے ص ۴۳۵ اور ۴۳۶ میں یہ لکھا ہے کہ معمریؒ

(بقیہ پچھلا صفحہ) غرائب اور افراد بھی تھے۔ دارقطنی فرماتے ہیں کہ وہ صدوق اور حافظ تھے، ان پر جرح موسیٰؒ بن ہارونؒ نے از روئے عداوت کی ہے۔ (البغدادی جلد ۸ ص ۳۷۰)

۱ امام ابو حاتمؒ ان کو صالح الحدیث اور صداقت شعار کہتے ہیں۔ محدث صالح جزرہؒ، مسلمہ بن قاسمؒ ابن عبد البرؒ اور دیگر محدثین ان کو ثقہ کہتے ہیں۔ ابن خزیمہؒ ان کو دانا محدث کہتے ہیں۔ نسائیؒ لا بأس بہ اور ابن عدیؒ صدوق کہتے ہیں۔ (تہذیب التہذیب جلد ۱ ص ۸۱) علامہ ذہبیؒ ان کو احد الاثبات المسندین لکھتے ہیں۔ (میزان الاعتدال جلد ۱ ص ۴۲)

۲ علامہ ذہبیؒ ان کو مشہور محدث اور ثقہ لکھتے ہیں۔ (میزان جلد ۳ ص ۸۹) امام ابن معینؒ ان کو لیس بہ بأس اور ابن مدینیؒ ثقہ کہتے ہیں اور ابو داؤدؒ اور ابو حاتمؒ لیس بہ بأس سے ان کی توثیق کرتے ہیں ابن حبانؒ ثقات میں لکھتے ہیں دارقطنیؒ کا بیان ہے کہ بخاریؒ نے ان سے احتجاج کیا ہے ابن عدیؒ کا بیان ہے کہ تمام متقدمین ان کی ثقاہت پر متفق ہیں۔ (تہذیب التہذیب جلد ۹ ص ۳۰۹)

۳ امام احمدؒ ابن معینؒ، ابو زرعہؒ، نسائیؒ، ابن سعدؒ، دارقطنیؒ اور ابو داؤدؒ سب ان کو ثقہ کہتے ہیں۔ ابو حاتمؒ

(باقی اگلے صفحہ پر)

صاحبِ غرائب و افراد ہیں اور بعض محدثینؒ نے ان کو کذاب کہا ہے۔ عبدانؒ کہتے ہیں کہ انھوں نے یہ حسد سے کہا ہے اور بغدادیوں کی طرح یہ بھی موقوف کو مرفوع کر دیا کرتا تھا اور حدیث میں اضافے کرنے کی ان کی عادت تھی۔ (محصلہ خیر الکلام بحوالہ لسان المیزان)

الجواب: بخاری اور مسلم میں ایسے متعدد راوی موجود ہیں۔ مؤلف خیر الکلام کا شوق ہو تو ہم ماشاء اللہ تعالیٰ با حوالہ عرض کر سکتے ہیں اس لیے صاحبِ غرائب و افراد ہونا اصول حدیث کے لحاظ سے کوئی جرح نہیں ہے۔ اصل بات یہ ہے کہ بعض لوگوں نے محض عداوت اور دشمنی کی وجہ سے ان پر جرح کی ہے اور کبھی یہ کہا کہ یہ موقوف کو مرفوع کر دیتے ہیں اور کبھی یہ کہا کہ یہ اضافے کرتے ہیں اور ان کے بڑے دشمن اور معاند موسیٰؒ بن ہارونؒ نے ان کی واذا قرأ فانصتوا کی زیادت پر بھی انکار کیا تھا (ملاحظہ ہو لسان المیزان جلد ۱ ص ۲۲۴) اور ان کی تقلید کرتے ہوئے لوگ اس پر جرح کرتے اور اس زیادت کا انکار کرتے ہیں جب محدثینؒ کے سامنے حقیقت حال کھل گئی تو انھوں نے بالآخر یہ فیصلہ کیا چنانچہ حافظ ابن حجرؒ لکھتے ہیں کہ

فاستقر الحال آخرا علی توثیقہ فان غایۃ ما قیل فیہ انہ حدث باحادیث لم یتابع علیھا وقد علمت من کلام الدارقطنیؒ انہ رجع عنھا فان کان قد اخطأ فیھا کما قال خصمہ فقد رجع عنھا وان کان مصیبا بھا کما کان یدعی فذاك ارفع لہ واللہ اعلم۔ (لسان المیزان جلد ۱ ص ۲۲۵)

پس آخر میں بات ان کی توثیق پر پکی ہو گئی ہے زیادہ سے زیادہ ان کے بارے میں جو کہا گیا ہے وہ یہ ہے کہ وہ ایسی حدیثیں بیان کرتے ہیں جن میں ان کی متابعت نہیں پائی گئی لیکن تم امام دارقطنیؒ کے کلام سے معلوم کر چکے ہو کہ انھوں نے رجوع کر لیا تھا سو اگر واقعی انھوں نے ان احادیث میں خطا کی تھی جیسا کہ ان کا خصم کہہ رہا ہے تو اس سے ان کا رجوع ثابت ہے اور اگر وہ مصیب تھے جیسا کہ ان کا دعویٰ تھا تو یہ ان کی شان کو اور اونچا کرنے کا سبب ہے۔

(بقیہ پچھلا صفحہ) ان کو صالح الحدیث اور ابن عبد البرؒ ثقہ اور حافظ کہتے تھے۔ ابن حبانؒ ثقات میں لکھتے ہیں۔ (تہذیب التہذیب جلد ۱ ص ۱۲۳)

[4] ان کا ترجمہ مقدمہ میں نقل کیا جا چکا ہے۔ حضرت انس رضی اللہ تعالیٰ عنہ مشہور صحابی ہیں۔

اس سے معلوم ہوا کہ معمرؒ بھی ثقہ ہیں اور ثبت بھی۔ اور ان کی یہ زیادت جو واذا قرأ فانصتوا سے وارد ہوئی ہے بالکل صحیح ہے کیونکہ دوسری اسانید میں ثقہ راویوں سے بھی یہ مروی ہے اور قرأت خلف الامام انصات کے بالکل خلاف ہے اور حضرت ابوہریرہؓ اور حضرت انسؓ کی روایتیں باب سوم میں آئیں گی کہ وہ بھی امام کے پیچھے سب یا بعض نمازوں میں قرأت کے قائل نہ تھے اور شاذ مقبول کی مثال ایسی ہے جیسے ایک مستقل حدیث ہو جس کو ثقہ راوی بیان اور روایت کرتا ہو انصاف کی دنیا میں اس کے رد کرنے کی کوئی وجہ نہیں اور کسی حافظ کی قرآنِ کریم میں غلطی سے کوئی جملہ بڑھا دینا یہ شاذ مردود کی مثال ہے اس کو مؤلف خیر الکلام اپنے پاس ہی رکھیں۔ بات ثقہ راویوں کی زیادت کی ہو رہی ہے۔ الغرض واذا قرأ فانصتوا کی زیادت بالکل صحیح ہے ایک رتی شک اس کی صحت میں نہیں ہے۔ قرآنِ کریم کی آیت میں فاستمعوا وانصتوا کا حکم تھا اور حضرت ابوموسٰی الاشعریؓ، حضرت ابوہریرہؓ اور حضرت انسؓ بن مالک کی صحیح اور مرفوع روایتوں میں بھی اس کی تصریح ہے کہ واذا قرأ الامام فانصتوا اور ایک ایک سند کا صحیح ہونا بھی آپ معلوم کر آئے ہیں۔ اب ان کے حجت ہونے میں کیا شبہ ہو سکتا ہے؟ نواب صاحبؒ لکھتے ہیں کہ حدیث صحیح حجت است برامت در رنگ حجیت کتاب عزیز۔ (دلیل الطالب صفحہ ۸۰۰) اور لکھتے ہیں کہ اصل در امر[1] وجوب فعل مامور بہ است۔

(بدور الاہلہ ص ۲۲)

اور نیز تحریر فرماتے ہیں کہ امر بشیئ نہی است از اضداد او۔ (بدور الاہلہ ص ۳۴۸) الغرض مقتدی کے لیے استماع اور انصات کے وجوب کا حکم اور امام کے پیچھے قرأت کرنے کے ممنوع اور منہی عنہ ہونے کا حکم قرآن کریم اور صحیح حدیث سے ثابت ہے۔ دیکھیے فریق ثانی

---

[1] ارباب اصول کا اس امر پر تقریباً اتفاق ہے کہ امر مطلق کا مفاد وجوب ہے، چنانچہ شیخ الاسلام ابن تیمیہؒ لکھتے ہیں: "وامره المطلق على الايجاب" (القواعد النورانية الفقهية، طبع مصر ص ۵۲، لشیخ الاسلام) یعنی صاحبِ شرع کا امر مطلق وجوب پر محمول ہوتا ہے، شیخ الاسلام ابن دقیق العیدؒ فرماتے ہیں: "وظاهر الامر الوجوب" (احکام الاحکام جلد ۱ ص ۳۵) امر ظاہری طور پر وجوب کے لیے ہوتا ہے اور نواب صاحبؒ لکھتے ہیں کہ صیغۂ امر بے صارف محمول بر وجوب است۔

(افادة الشیوخ ص ۱۰۶)

مانتا ہے یا نہیں۔ کہیں وہ یہ نہ ارشاد فرمادے کہ ؎

یہ سب سوچ کر دل لگایا ہے ناصح!

نئی بات کیا آپ فرما رہے ہیں۔

قرآنِ کریم کی آیت اور حضرت ابو موسیٰ الاشعری رضی اللہ تعالیٰ عنہ و حضرت ابو ہریرہؓ و حضرت انسؓ بن مالک کی پیش کردہ صحیح روایتیں اپنے عموم الفاظ کے اعتبار سے سرّی اور جہری سب نمازوں کو شامل ہیں۔ جس کا مطلب یہ ہے کہ امام کے پیچھے اقتداء کر لینے کے بعد مقتدی کو سوائے استماع، انصات اور خاموش رہنے کے کوئی چارہ نہیں ہے۔ اب بعض ایسی روایتیں پیش کی جاتی ہیں۔ جن میں خاص طور پر جہری نمازوں میں مقتدیوں کو امام کے پیچھے قرأت کرنے کی سخت تنبیہ اور ممانعت آئی ہے۔ اور بعض روایتیں وہ بھی ہیں جن میں جہری نمازوں کی کوئی قید مذکور نہیں ہے بلکہ وہ سب نمازوں کو شامل ہیں۔

چوتھی حدیث[1]۔ حضرت امام مالکؒ، امام ابن شہاب زہریؒ سے روایت کرتے ہیں اور وہ ابن اُکیمہ لیثیؒ سے روایت کرتے ہیں۔ اور وہ حضرت ابو ہریرہؓ سے روایت کرتے ہیں۔ وہ فرماتے ہیں:

---

[1] حضرت امام مالکؒ اور امام ابن شہاب زہریؒ دونوں کا ترجمہ مقدمہ .... میں نقل کیا جاچکا ہے اور حضرت ابو ہریرہؓ صحابی ہیں۔ ابن اُکیمہ لیثیؒ کا نام عمارہ تھا۔ امام ابو حاتمؒ اور یحییٰ بن سعیدؒ ان کو ثقہ کہتے ہیں۔ امام یعقوبؒ بن سفیانؒ ان کا مشہور تابعین میں شمار کرتے ہیں۔ ابن حبانؒ ان کو ثقات میں لکھتے ہیں۔ (تہذیب التہذیب جلد ۷ ص ۴۱۱) امام بیہقیؒ فرماتے ہیں کہ ابن اُکیمہؒ اور ان کے بھائی دونوں ثقہ ہیں۔ (الجوہر النقی جلد ۲ ص ۵۸ و مرقات جلد ۱ صہ ۵۲۴) شیخ الاسلام ابن تیمیہؒ لکھتے ہیں کہ ابو حاتم رازیؒ ان کو صحیح الحدیث و حدیثہ مقبول لکھتے ہیں۔ ابو حاتم بستیؒ کا بیان ہے کہ ان سے ان کے پوتے عمرؒ بن مسلمؒ، امام زہریؒ اور سعید بن ابی ہلالؒ نے روایت کی ہے۔ (فتاویٰ جلد ۲ صہ ۱۳۵) حافظ ابن حجرؒ لکھتے ہیں کہ وہ ثقہ ہیں۔ (تقریب ۲۷۶) مبارکپوری صاحبؒ لکھتے ہیں کہ وہ ثقہ اور اوساط تابعین میں تھے۔ (تحفۃ الاحوذی جلد ۱ صہ ۲۵۴) اور دوسرے مقام پر لکھتے ہیں کہ ثقہ راوی کی یہ شرط نہیں کہ اس سے روایت کرنے والے ایک سے زیادہ ہوں۔ (باقی اگلے صفحہ پر)

ان رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم
انصرف من صلوٰۃ جھر فیھا بالقرأۃ
فقال ھل قرأ معی منکم احداً نفا فقال
رجل نعم انا یا رسول اللہ قال فقال
رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم انی
اقول مالی انازع القرآن فانتھی الناس
عن القرأۃ مع رسول اللہ صلی اللہ علیہ

کہ آنحضرت صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم ایک جہری نماز سے فارغ ہوئے اور یہ ارشاد فرمایا۔ کیا تم میں سے کسی نے ابھی میرے ساتھ قرأت کی ہے؟ ایک شخص بولا۔ جی ہاں یا رسول اللہ! میں نے قرأت کی ہے۔ آپ نے ارشاد فرمایا جبھی تو میں (اپنے دل میں) کہہ رہا تھا کہ میرے ساتھ قرآن کریم کی قرأت میں منازعت اور کھینچا تانی کیوں ہو رہی ہے؟ اس ارشاد کے بعد جن نمازوں میں آپ جہر سے

(بقیہ پچھلا صفحہ) جیسے ابن اُکیمہ لیثی رحمۃ اللہ علیہ ثقہ ہیں۔ حالانکہ امام زہریؒ کے علاوہ اور کسی نے ان سے روایت نہیں کی۔ (ابکار المنن ص ۶۱) امام ابن معینؒ کا بیان ہے کہ ابن اُکیمہؒ کی توثیق کے لیے یہی ایک دلیل کافی ہے کہ امام زہریؒ جیسے جلیل القدر امام ان سے روایت کرتے ہیں۔ (الجوہر النقی جلد ۲ ص ۱۵۸) حافظ ابن کثیرؒ اس حدیث کی امام ترمذیؒ اور ابو حاتمؒ سے تحسین اور تصحیح نقل کرتے ہیں۔ (تفسیر ابن کثیر ۲ ص ۲۲۳) مولانا میر صاحبؒ ایک حدیث کی تحقیق میں لکھتے ہیں کہ یہ موطا امام مالک رحمۃ اللہ علیہ کی مسند روایت ہے جس کی صحت میں کلام نہیں ہو سکتا۔ (بلفظہٖ تفسیر واضح البیان ص ۴۶۰)

علامہ ذہبی رحمۃ اللہ علیہ اور مبارکپوری صاحبؒ وغیرہ نے جو یہ کہا ہے کہ ابن اُکیمہ لیثیؒ ثقہ ہیں۔ مگر امام زہریؒ کے علاوہ اور کسی نے ان سے روایت نہیں کی تو یہ ان کا وہم ہے۔ حافظ ابن تیمیہؒ کا حوالہ پہلے نقل ہو چکا ہے کہ ان سے ان کے پوتے عمرؒ بن مسلمؒ (ان کی روایت صحیح مسلم جلد ۲ ص ۱۶۰ میں ہے ملاحظہ کیجیے) امام زہریؒ اور سعیدؒ بن ابی ہلالؒ نے روایت کی ہے۔ علاوہ ازیں ان سے ایک چوتھے راوی بھی ہیں۔ چنانچہ مستدرک جلد ۳ ص ۴۴۸ میں ہے عن ابی الحویرث عن عمارۃ بن اُکیمۃ اللیثیؒ..... الخ ابو الحویرث کا نام عبد الرحمٰنؒ بن معاویہؒ تھا۔ ابن معینؒ ان کو ثقہ کہتے ہیں۔ (میزان جلد ۲ ص ۱۲۸) ابن حبانؒ ان کو ثقات میں لکھتے ہیں (تہذیب التہذیب جلد ۱ صفحہ ۲۷۲) لہٰذا علامہ ذہبیؒ اور مبارکپوری صاحبؒ کی رائے صحیح نہیں ہے۔ ع خذ ما تراہ ودع شیئاً سمعت بہ۔

وسلم فیما جھر فیه رسول اللہ صلی اللہ علیه وسلم بالقرأۃ حین سمعوا ذلك من رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم۔ (موطا امام مالک ص ۲۹، ۳۰)

قرأت کیا کرتے تھے۔ لوگوں نے آپ کے پیچھے قرأت ترک کر دی تھی۔

یہ روایت موطا امام مالک کے علاوہ حدیث کی دیگر معتبر اور مستند کتابوں میں مذکور ہے[1] جس کے صحیح ہونے میں قطعاً کوئی کلام نہیں ہو سکتا۔ جہری نمازوں میں امام کے پیچھے قرأت کی ممانعت میں یہ روایت قطعی ہے۔

یہ واقعہ صبح کی نماز کا ہے۔ (دیکھئے سنن الکبریٰ جلد ۲ ص ۱۵۷ و ابوداؤد جلد ۱ ص ۱۲۰ وغیرہ) جس میں تقریباً تمام حضرات صحابہ کرامؓ موجود ہوں گے، مگر ان میں آپ کے پیچھے قرأت کرنے والا صرف ایک شخص تھا اور آپ نے ان دیگر حضرات کو کچھ بھی نہیں کہا جنھوں نے قرأت نہیں کی تھی بلکہ اسی کو ڈانٹ ڈپٹ کی جس نے قرأت کی تھی اور حضرات صحابہ کرامؓ میں سے کسی نے اس کا حوالہ نہیں دیا کہ حضرت آپ نے تو قرأت کرنے کا خود حکم دیا ہے۔ پھر کیا ممانعت کا کوئی جدید حکم آیا ہے؟ اور محال ہے کہ آپ نے امام کے پیچھے قرأت کرنے کا حکم دیا ہو اور اس پر عمل کرنے والا صرف ایک ہی شخص ہو اور آپ نے قیام، رکوع، سجود اور قعدہ وغیرہ کو نیز تسبیح، تحمید اور تشہد کو ناگوار نہیں فرمایا۔ اگر ناگوار گزری ہے تو صرف مقتدی کی قرأت، جہری نمازوں میں اس سے بڑھ کر امام کے پیچھے قرأت کے منع ہونے کا اور کیا ثبوت پیش کیا جا سکتا ہے؟ مؤلف خیر الکلام کا (ص ۳۴۲ میں) یہ کہنا کہ اگرچہ حدیث میں لفظ مطلق قرأت ہے کہ جہری نمازوں میں قرأت سے باز آ گئے مگر قرائن کی

---

[1] یہ روایت نسائی جلد ۱ ص ۱۰۶، ابوداؤد جلد ۱ ص ۱۲۰، ترمذی جلد ۱ ص ۴۲، ابن ماجہ ص ۶۱، مسند احمد جلد ۲ ص ۳۰۱، محلی جلد ۳ ص ۲۴۰، جزء القرأۃ ص ۵۵، ۲۲، سنن الکبریٰ جلد ۲ ص ۱۵۷، کتاب القرأۃ ص ۹۹، کتاب الاعتبار ص ۱۹۷، الجوہر النقی جلد ۲ ص ۱۵۸، ابن کثیر جلد ۳ ص ۲۲۳، مرقات جلد ۱ ص ۵۳۴، فتاوی ابن تیمیہ ۲ ص ۱۴۹، عقیدۂ محمدیہ جلد ۲ ص ۱۸۹، فتح الملہم ۲ ص ۲۳، بذل المجہود ۲ ص ۵۷، تحقیق الکلام ۲ ص ۱۲۵، ابکار المنن ص ۱۵۵، فصل الخطاب ص ۳۳، اور اعلاء السنن جلد ۴ ص ۸۷ وغیرہ کتابوں میں مذکور ہے۔

بنا پر مطلق کی تقیید ہو سکتی ہے الخ بالکل ایک بے وقعت بات اور مطلب پرستی کے لیے صرف ایک بہانہ ہے جس کو ماننے کے لیے کوئی تیار نہیں ہے اور یہی بے سود بہانہ قاضی مقبول احمد صاحب نے کیا ہے۔ (ملاحظہ ہو الاعتصام ۲۶؍ اکتوبر ۱۹۶۲ء صد۱) اور انھوں نے اس مطلق قرأت کو ما زاد علی الفاتحہ پر محمول کر کے بالکل ایک اور غیر معقول بات کہی ہے جو طفل تسلی سے کچھ کم نہیں ہے۔ امام ابوبکر الرازیؒ فرماتے ہیں کہ یہ روایت جہر اور سر دونوں پر دلالت کرتی ہے کیونکہ آں حضرت صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے جہر اور سر کا کوئی فرق بیان نہیں کیا۔ ہاں البتہ راوی نے اس کی تاویل یہ کی اور وہ یہ سمجھے کہ یہ جہر سے متعلق ہے۔ (محصلہ احکام القرآن جلد ۳ صد ۵۱)

فریق ثانی کی طرف سے اس روایت پر جو اعتراضات کیے گئے ہیں ان کو ان کے جوابات کے ساتھ ملاحظہ کر لیجئے۔

پہلا اعتراض: امام بیہقیؒ، علامہ حازمیؒ، علامہ ابن حزمؒ، امام نوویؒ اور مبارکپوری صاحبؒ وغیرہ لکھتے ہیں کہ ابن اکیمہ لیثی مجہول ہے۔ بنابریں یہ روایت قابل التفات نہیں۔ (سنن الکبریٰ ج۲ ص ۱۵۹، کتاب القرأۃ ص ۹۹، کتاب الاعتبار ص ۹۰، محلی جلد ۳ ص ۲۴۰، شرح مہذب جلد ۳ ص ۳۶۸ و ابکار المنن ص ۱۵۵ وغیرہ)

جواب: ان اکابر کا یہ اعتراض بے بنیاد ہے۔ اوّلاً۔ پوری تشریح کے ساتھ ابن اکیمہؒ کی توثیق نقل کی جا چکی ہے۔ اور باقرار میر صاحبؒ و مبارکپوری صاحبؒ موطا کی مسند روایت پر کلام نہیں کیا جا سکتا۔ اور ابن اکیمہؒ ثقہ تھے۔ پھر بھی اعتراض کیے جانا انصاف کے بالکل منافی ہے۔

ثانیاً حضرات محدثین کرامؒ کا یہ ضابطہ ہے کہ اگر کسی راوی کی دیگر محدثینؒ توثیق کریں (بلکہ اس سے روایت کرنے والا بھی اگر وہ اہل توثیق سے ہو خود توثیق کر دے) تو اس پر جہالت کا الزام نہیں ہوتا۔ وہ ثقہ اور عادل راویوں کی صف میں آجاتا ہے۔ (شرح نخبۃ الفکر ص ۷۰ و غنیۃ الالمعی ص ۲۵۲ مولانا شمس الحقؒ المنضم مع معجم الصغیر للطبرانیؒ) اور ابن اکیمہؒ کو دیگر محدثینؒ بھی ثقہ کہتے ہیں۔ اور امام زہریؒ (جن کا اہل توثیق میں پایہ بہت بلند تھا) بھی توثیق کرتے ہیں۔ اور چار راوی ان سے فن حدیث میں روایت کرتے ہیں۔ اندریں حالات ان کو مجہول کہتے جانا انصاف کا خون کرنا ہے۔

ثالثاً۔ مبارکپوری صاحبؒ لکھتے ہیں کہ اگر کسی راوی پر جہالت کا الزام ہو اور امام ابن

حبانؒ اس کی توثیق کر دیں۔ تو جہالت کا الزام رفع ہو جاتا ہے۔ (ابکار المنن ص ۱۳۱) اور ابن اکیمہؒ کو ابن حبانؒ ثقات میں لکھتے ہیں۔ غرضیکہ کسی راوی سے متعلق ثقہ، ثبت اور عادل ہونے کے جتنے قواعد محدثین کرامؒ کے نزدیک ثابت ہیں۔ وہ تمام ابن اکیمہؒ میں پائے جاتے ہیں۔ اور جہالت سے نکلنے کا کوئی ضابطہ ایسا نہیں جو ان میں نہ پایا جاتا ہو۔ پھر فریق ثانی ہی انصاف سے فرمادے کہ ابن اکیمہؒ نے وہ کون سا جرم کیا ہے کہ ان کے لیے جہالت کے چکر سے نکلنے کے لیے کوئی دروازہ نہیں کھلتا۔ شاید وہ سمجھتے ہوں کہ توثیق کا نام ہی جہالت ہے۔ ع

نام ان کا رکھ لیا ہے آسماں تحریریں

الحاصل فن حدیث کے لحاظ سے اس حدیث کے صحیح اور معتبر ہونے میں مطلقاً کوئی کلام نہیں ہے۔ رہا اس حدیث کا حضرت ابوہریرہؓ کے موقوف اثر (اقرأ بها فی نفسك) سے معارضہ کرنا تو اس کی بحث اپنے مقام پر آجائے گی۔ انشاء اللہ العزیز۔

دوسرا اعتراض۔ حضرت امام بخاریؒ، امام بیہقیؒ، امام نوویؒ، مولانا ابو عبد الرحمٰن محمد عبد اللہؒ اور مبارکپوریؒ صاحب وغیرہ لکھتے ہیں کہ فانتھی الناس عن القرأۃ حین سمعوا ذالك من رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا جملہ حضرت ابوہریرہؓ نے بیان نہیں کیا بلکہ یہ حضرت امام زہریؒ کا بیان ہے۔ اور امام زہریؒ کی عادت تھی کہ مرفوع حدیث میں اپنا قول ملا دیا کرتے تھے۔ اور اس دعویٰ کی دو دلیلیں ہیں۔ **اوّل**۔ امام لیثؒ بن سعدؒ اور ابن جریجؒ فانتھی الناس الخ کا ٹکڑا اپنی روایت میں بیان نہیں کرتے۔ **دوم**۔ امام اوزاعیؒ، امام زہریؒ سے روایت کرتے ہیں کہ

قال الزھری فاتعظ الناس فلم یکونوا یقرأون۔ (جزء القرأۃ ص ۲۳، ابوداؤد جلد ۱ ص ۱۲۰، سنن الکبریٰ جلد ۲ ص ۱۵۸)	امام زہریؒ نے فرمایا کہ اس قول سے لوگوں نے نصیحت حاصل کر لی اور امام کے پیچھے قرأت ترک کر دی۔

اس سے ثابت ہوا کہ یہ جملہ امام زہریؒ کا مدرج ہے اور یہ حضرات یہ بھی فرماتے ہیں کہ امام اوزاعیؒ نے یہ بات تو اچھی طرح محفوظ رکھی ہے (کہ فانتھی الناس الخ امام زہری کا مدرج ہے)۔ مگر شومئ قسمت کہ الا انہ لم یحفظ اسنادہ۔ لیکن وہ اس کی سند محفوظ نہیں.... رکھ سکے۔

(جزء القراۃ ص ۲۳، کتاب القراۃ ص ۹۶ و سنن الکبریٰ جلد ۲ ص ۱۵۸، شرح مہذب ص ۳۲۰، عقیدۂ محمدیہ جلد ۲ ص ۱۹۰ وغیرہ واللفظ للبیہقیؒ)

جواب۔ ان حضرات کا یہ کہنا کہ یہ قول امام زہریؒ کا ہے اور مطلب یہ ہے کہ تابعینؒ نے امام کے پیچھے قرأت ترک کر دی تھی ..... محض دفع الوقتی پر مبنی ہے اور اصول کے لحاظ سے یہ غلط ہے۔

اوّلاً۔ اس لیے کہ امام بیہقیؒ کا بیان ہے کہ جو جملہ حدیث مرفوع کے ساتھ بیان ہو وہ مرفوع ہی ہوگا۔ اِلّا یہ کہ اس کے مدرج ہونے پر قاطع دلیل قائم ہو۔ (تلخیص الجبیر ص ۱۲۶) اور کمزور سند اور محض احتمال سے ادراج ثابت نہیں ہو سکتا۔ چنانچہ حافظ ابن حجرؒ لکھتے ہیں کہ محض احتمال سے ادراج ثابت نہیں ہو سکتا۔ (فتح الباری جلد ۱۱ ص ۴۲۵) اور اس کے مدرج ہونے کی کوئی عقلی اور نقلی صحیح دلیل موجود نہیں ہے۔

ثانیاً۔ امام بیہقیؒ[1]، علامہ حازمیؒ[2]، حافظ ابن حجرؒ[3] اور امام نوویؒ[4] لکھتے ہیں۔ واللفظ لہٗ۔

وبیّنا ان الصحیح بل الصواب الذی علیہ الفقہاء والاصولیون ومحققوا المحدثون انہ اذا روی الحدیث مرفوعًا وموقوفًا او موصولًا ومرسلًا حکم بالرفع والوصل لانہا زیادۃ ثقۃ وسواء کان الرافع والواصل اکثر او اقل فی الحفظ والعدد۔ (شرح مسلم جلد ۱ ص ۲۵۶)

ہم بیان کر آئے ہیں کہ صحیح بلکہ خالص حق بات یہ ہے جس پر فقہاء، علماءِ اصول اور محقق محدثین متفق ہیں کہ جب کوئی حدیث مرفوع اور موقوف روایت کی گئی ہو۔ یا موصول اور مرسل بیان ہوئی ہو تو اس صورت میں حدیث مرفوع اور متصل ہی سمجھی جائے گی چاہے رفع اور وصل کرنے والے حفظ اور عدد میں زیادہ ہوں یا کم حدیث بہر حال مرفوع ہوگی۔

علامہ عراقیؒ فرماتے ہیں کہ اگر ایک ہی ثقہ راوی سے معاً دو مسلوں میں اختلاف پیدا ہو کہ

---

[1] کتاب القراۃ ص ۴۶

[2] کتاب الاعتبار ص ۱۲

[3] تلخیص الجبیر ص ۱۲۶

[4] شرح مسلم جلد ۱ ص ۲۵۶۔ اور امام نوویؒ نے جلد ۱ ص ۲۸۲ و جلد ۱ ص ۲۷۴ و جلد ۲ ص ۴۰ میں بھی اس کا ذکر کیا ہے اور جلد ۱ ص ۲۸۲ میں حضرت امام بخاریؒ اور امام مسلمؒ کا خاص طور پر نام ذکر کیا ہے۔

کسی وقت وہ موصول بیان کرتا ہے اور کسی وقت مرسل یا کسی وقت وہ مرفوع بیان کرتا ہے اور کسی وقت موقوف۔ تو صحیح قول کی بنا پر اس کے موصول اور مرفوع ہونے کا حکم کیا جائے گا نہ کہ مرسل اور موقوف ہونے کا۔ (شرح الفیہ جلد ۱ ص ۸۳)

نواب صاحب لکھتے ہیں کہ اذا کان الواصل ثقۃ فھو مقبول۔ (دلیل الطالب صفحہ ۲۷۰)

اور نیز فرماتے ہیں کہ

اختلافے کہ در رفع و وقف اوست قادح در حجیت نہ باشد چہ رفع زیادت است (ایضاً صفحہ ۱۴۴)

اور نیز لکھتے ہیں کہ قال شیخنا و برکتنا الشوکانیؒ وھو الحسن اذا جاءت الزیادۃ من طریق الثقۃ۔ (ایضاص ۴۶۱) امام زہریؒ کی ثقاہت اور عدالت بھی بالاتفاق مسلم ہے۔ اس لیے اس طے شدہ قاعدہ کے رو سے یہ جملہ بھی مرفوع ہی ہوگا۔

ثالثاً۔ امام ابو داؤدؒ، ابن ابی السرحؒ[1] سے روایت کرتے ہیں وہ معمرؒ[2] سے اور وہ امام زہریؒ سے وہ فرماتے ہیں کہ

قال ابو ھریرۃؓ فانتھی الناس۔ (ابو داؤد جلد ۱ ص ۱۲۰) کہ حضرت ابو ہریرہؓ نے فرمایا۔ لوگوں نے قرأت ترک کردی تھی۔

---

[1] ابن ابی السرحؒ کا نام احمد بن عمروؒ بن عبداللہؒ بن عمروؒ بن السرح تھا۔ محدث علیؒ بن الحسنؒ بن خلفؒ کا بیان ہے کہ وہ ثقہ ثبت اور صالح تھے۔ ابو زرعہؒ اور ابو حاتمؒ لا بأس بہ سے ان کی توثیق کرتے ہیں۔ ابن یونسؒ ان کو فقیہ اور من الصالحین الاثبات کہتے ہیں۔ امام نسائیؒ ان کو ثقہ کہتے ہیں (تہذیب التہذیب جلد ۱ ص ۶۴) جب یہ ثقہ اور ثبت ہیں تو امام ابو داؤدؒ کے باقی چار اساتذہ اگر اس کو نقل نہیں کرتے تو نہ کریں زیادت ثقہ مطلقاً مقبول ہے۔ اس لیے مؤلف خیر الکلام کا یہ عذر لنگ بھی قابل سماعت نہیں ہے اور اسی طرح لیثؒ بن سعدؒ وغیرہ کا اس جملہ کو نکال دینا اور امام زہریؒ کا سانس چھوڑنے یا کھانسی وغیرہ کی وجہ سے اس کو آہستہ پڑھنا بھی ہرگز ادراج کی دلیل نہیں ہے۔

[2] معمرؒ بن راشد کو علامہ ذہبیؒ الامام الحجۃ احد الاعلام اور عالم یمن لکھتے ہیں (تذکرہ جلد ۱ ص ۱۶۸) حافظ ابن حجرؒ لکھتے ہیں کہ وہ ثقہ اور ثبت تھے (تقریب ص ۳۴۶) امام احمدؒ بن حنبلؒ سے سوال کیا گیا کہ امام

(باقی اگلے صفحہ پر دیکھئے)

اس صحیح روایت سے معلوم ہوگیا کہ یہ حضرت ابوہریرہؓ کا قول ہے۔ نہ یہ کہ امام زہریؒ کا مدرج ہے۔ جب معمرؒ کا اثبت الناس فی الزہریؒ ہونا محدثین کا طے شدہ قاعدہ ہے۔ تو امام لیثؒ بن سعدؒ اور ابن جریجؒ کا اس جملہ کو نہ نقل کرنا اس کے مدرج ہونے کی ہرگز دلیل نہیں ہو سکتی۔ بلکہ اس میں صحیح اور صواب بات معمرؒ ہی کی ہوگی خصوصاً جبکہ وہ مثبت بھی ہیں۔

رابعاً۔ گو امام اوزاعیؒ بہت بڑے محدث فقیہ اور امام تھے۔ لیکن کتب الرجال میں اس کی تصریح موجود ہے کہ امام زہریؒ سے جو روایت وہ کرتے ہیں وہ حجت نہیں ہو سکتی حافظ ابوعمرؒ بن عبدالبرؒ لکھتے ہیں کہ امام اوزاعیؒ کی امام زہریؒ اور یحییٰؒ بن ابی کثیرؒ سے جملہ روایتیں ضعیف اور کمزور ہیں۔ (کتاب الانصاف ص ۱۰۲ و کتاب العلم ص ۲۰۱) امام ابن معینؒ کا بیان ہے کہ اوزاعیؒ فی الزھری لیس بذاك (تہذیب التہذیب جلد ۶ ص ۲۴۱) کہ امام اوزاعیؒ زہریؒ سے روایت کرنے میں قابل اعتبار نہیں ہیں۔ امام یعقوبؒ بن شیبہؒ کا بیان ہے کہ امام اوزاعیؒ ثقہ اور ثبت تھے۔ لیکن انکی زہریؒ سے جملہ روایتیں کمزور اور ضعیف ہیں۔ (ایضاً) یہ راوی ضعیف نسبتاً نہیں ہے جیسا کہ مؤلف خیر الکلام نے ص ۴۴۰ میں لکھا ہے۔ اور دھوکہ دیا ہے بلکہ یہ محدثینؒ کی تصریح کے مطابق زہریؒ کی روایت میں حقیقتہً ضعیف ہے۔ انصاف شرط ہے کہ امام معمرؒ کی روایت کو (جو اثبت الناس فی الزھریؒ ہیں) چھوڑ کر امام اوزاعیؒ کی روایت کو (جن کی زہریؒ

(بقیہ پچھلا صفحہ) زہریؒ کے تلامذہ میں سے زیادہ ثبت کون ہے؟ فرمایا معمرؒ اثبت الناس فی الزھریؒ۔ (مقدمہ فتح الباری ص ۴۵۵) امام ابن معینؒ کا بیان ہے کہ معمرؒ اثبت الناس فی الزھریؒ۔ (تذکرہ جلد ۱ ص ۱۷۹) لہٰذا زہریؒ کی سب سے زیادہ معتبر اور مستند روایت صرف معمرؒ بن راشدؒ کے طریق ہی سے ہو سکتی ہے۔ اس لیے اس متصل حدیث کو مرسل کہنا جیسا کہ مؤلف خیر الکلام نے ص ۴۳۹ میں کہا ہے بالکل باطل اور مردود ہے۔ اور قاضی مقبول احمد صاحب نے اسے موقوف صحابی اور فہم صحابی کہہ کر گلو خلاصی چاہی ہے جو انتہائی جہالت ہے۔ یہ فہم صحابی نہیں یہ روایتاً حدیث ہے کہ جب آں حضرت صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے یہ فرمایا تو اس کے نتیجے میں لوگ ہر قسم کی قرأت سے بالکل باز آگئے۔ یہ روایت ہے نہ کہ فہم صحابی۔ اس لئے یہ حدیث بالکل صحیح اور قابل قبول ہے۔ البتہ نہ ماننے کا کوئی علاج نہیں۔

کے طریق سے تمام روایتیں کمزور اور ضعیف ہیں۔ کیونکر ترجیح دی جا سکتی ہے؟ امام بیہقی رحمہ اللہ پر امام اوزاعی رحمہ اللہ کی یہ نوازش ہوتی ہے کہ اتنا تو وہ یاد رکھ سکے ہیں کہ یہ جملہ مرفوع حدیث میں نہیں ہے۔ مگر سند محفوظ نہیں رکھ سکے۔ امام بیہقی علیہ الرحمۃ کو کیا مصیبت درپیش ہے کہ وہ ان لایعنی اور بے سند باتوں اور تار عنکبوت سے معمر رحمہ اللہ کی صحیح روایت کو رد کر کے اصول شکنی کرتے ہیں؟ مگر سچ ہے ایک غلطی کے درست کرنے کے لیے متعدد[1] غلطیوں کا ارتکاب کرنا پڑتا ہے۔

خامساً۔ اگر یہ جملہ بالفرض حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ کا نہ ہو بلکہ امام زہری رحمہ اللہ کا ہو۔ تب بھی کامیابی اور فتح جمہور ہی کی ہوگی۔ فریق ثانی کو بغیر حرماں نصیبی کے اور کچھ حاصل نہ ہوگا۔ شیخ الاسلام ابن تیمیہ رحمہ اللہ لکھتے ہیں کہ اگر بالفرض فانتہی الناس الخ کو امام زہری رحمہ اللہ کا مدرج ہی تسلیم کر لیا جائے۔ تب بھی یہ اس بات کی ایک بہت بڑی وزنی دلیل ہوگی کہ امام کے پیچھے قرأت کرنا صحیح نہیں ہے کیونکہ امام زہری رحمہ اللہ اپنے وقت میں سنت اور حدیث کے بہت بڑے امام تھے۔ اگر امام کے پیچھے قرأت کرنا ضروری ہوتا تو یہ مسئلہ امام زہری رحمہ اللہ سے کیسے مخفی رہ سکتا تھا؟ جب امام زہری رحمہ اللہ یہ فرماتے ہیں کہ جہری نمازوں میں لوگوں نے قرأت ترک کر دی تھی۔ تو یہ اس بات کی کھلی اور معقول دلیل ہے کہ حضرات صحابہ رضی اللہ عنہم و تابعین رحمہم اللہ امام کے پیچھے قرأۃ نہیں کیا کرتے تھے اور اسی پر امام موصوف رحمہ اللہ نے ان کو عامل پایا (فتاویٰ جلد ۲ ص ۱۴۵)

سادساً۔ راقم الحروف کہتا ہے کہ فریق ثانی اس جملہ کو امام زہری رحمہ اللہ کا مدرج تسلیم کرتا ہے۔

اگر یہ جملہ (فانتہی الناس الخ) سرے سے اس حدیث میں نہ ہو اور روایت مالی انازع القرآن پر ہی ختم ہو جائے (جیسا کہ امام لیث رحمہ اللہ بن سعد وغیرہ کی روایت یہیں ختم ہوتی ہے) تو پھر بھی یہ حدیث جمہور کی دلیل ہے۔ کیونکہ آنحضرت صلی اللہ تعالیٰ علیہ وآلہ وسلم کے پیچھے قرآت کرنیوالا

---

[1] مثلاً یہ کہ صحیح اور ضعیف حدیث کا تعارض ہو تو صحیح قابل اخذ اور ضعیف متروک ہوگی۔ ثقہ کی زیادت[2] مقبول ہوگی۔ واصل[3] اور رافع کی روایت کو ترجیح ہوگی۔ مثبت[4] کو نافی پر ترجیح ہوگی۔ امام معمر[5] اثبت الناس فی الزہری رحمہ اللہ ہیں۔ امام اوزاعی رحمہ اللہ فی الزہری لیس بذاک وغیرہ وغیرہ تمام طے شدہ قواعد کو محض ایک غلط بات کو درست کرنے کے لیے ٹھکرایا جا رہا ہے۔ فوا عجباہ واا سفاہ۔

صرف ایک ہی شخص تھا اور اس کو بھی آپ نے گوارا نہ فرمایا۔ پہلے آپ نے نماز سے فارغ ہو کر فوراً سوال کیا۔ اور پھر اس شخص کے اقرار کرنے کے بعد مالی انازع القرآن کے جملہ سے اس کی قرأت کو ناپسند کرتے ہوئے ڈانٹ ڈپٹ اور تنبیہ فرمائی اگر فانتہی الناس کا جملہ سرے سے نہ ہو تو کیا اس تنبیہ کے بعد بھی اس کا حضرات صحابہ کرامؓ سے احتمال ہے کہ وہ باقاعدہ امام کے پیچھے قرأت کرتے رہے؟ حاشا و کلاّ۔ راقم کہتا ہے کہ اگر اس حدیث میں اور کچھ بھی نہ ہوتا صرف یہی جملہ ہوتا۔ ھل قرأ معی منکم احدٌ[1] تو پھر بھی یہ جمہور کی دلیل کے لیے کافی ہوتا، حالانکہ جملہ فانتہی الناس حضرت ابوہریرہؓ کا ارشاد ہے، جیسا کہ بسند صحیح آپ ملاحظہ کر چکے ہیں۔

اصلی بات یہ ہے کہ امام زہریؒ کے فانتھی الناس الخ کے مضمون کے سمجھنے میں فریق ثانی کو غلطی[2] واقع ہے جس کے سبب انھوں نے پیچ در پیچ غلطیوں کا ارتکاب کیا ہے اور ایک بے بنیاد

---

[1] آپؐ نے ھل قرأ ارشاد فرمایا ہے۔ ھل جھر نہیں فرمایا جس سے سورۂ فاتحہ کی قرأت ہر طرح ممنوع ہو گی۔ اس لیے ھل قرأ کو جہر پر حمل کرنا یا ھل قرأ کو ما زاد علی الفاتحہ پر حمل کرنا جیسا کہ امام بیہقیؒ وغیرہ نے کیا ہے۔ (سنن الکبریٰ جلد ۲ ص ۱۵۹ وغیرہ) یقیناً باطل اور مردود ہے اور تحمل النصوص علی ظواھرھا کے خلاف ایسا مطلب مراد لینا ہرگز صحیح نہیں۔ رہا یہ سوال کہ اگر پڑھنے والے نے آہستہ قرأت کی تھی تو حضور صلی اللہ تعالیٰ علیہ وآلہ وسلم کو کیسے علم ہوا؟ تو یہ بڑی سطحی قسم کی بات ہے۔ احادیث میں آتا ہے کہ آپ کو نماز کی حالت میں ایک مخصوص کیفیت حاصل تھی جس سے آپ مقتدیوں کے رکوع و سجود اور خشوع کو ملاحظہ کر لیتے تھے۔ (مشکوٰۃ جلد ۱ ص ۸۴) ایک موقع پر آپ نے فرمایا کہ ان لوگوں کا کیا حال ہے جو اچھی طرح وضو کر کے نہیں آتے جس کی وجہ سے ہم پر قرآن کریم کی قرأۃ ملتبس ہو جاتی ہے (نسائی جلد ۱ ص ۱۱۱) حافظ ابن کثیرؒ اسی مضمون کی ایک اور روایت کے متعلق لکھتے ہیں کہ اسناد حسن و متن حسن۔ اس سے معلوم ہوا کہ آپ مقتدیوں کے وضو کے نقصان سے متاثر ہوتے تھے۔ اس سے یہ بھی معلوم ہوا کہ مقتدی کی نماز امام کی نماز سے (صحتہً و فساداً) وابستہ اور متعلق ہوتی ہے۔ (تفسیر ابن کثیر جلد ۴ ص ۵۴۱) لہٰذا مقتدی کی آہستہ قرأت سے آپ کا متاثر ہونا بعید نہ تھا۔ اس لیے نماز کی حالت میں آپ کی طبیعت لطیف تر اور شفاف تر ہو جاتی تھی۔

[2] امام زہریؒ مرفوع حدیث بیان کر رہے تھے جس میں فانتھی الناس الخ کا جملہ بھی تھا۔ امام موصوفؒ

(باقی اگلے صفحہ پر)

اور پادر ہوا بات کی درستی کے لیے قدم قدم پر ٹھوکریں کھائی ہیں۔

تیسرا اعتراض: مبارک پوری صاحبؒ وغیرہ لکھتے ہیں کہ اس حدیث سے امام کے پیچھے صرف جہری نمازوں میں قرآت کی ممانعت آتی ہے۔ حالانکہ تم سری اور جہری نمازوں میں امام کے پیچھے قرآت کے منکر ہو۔ لہٰذا تمہارا دعویٰ عام اور دلیل خاص ہے۔ (تحقیق الکلام وغیرہ)

(بقیہ حاشیہ پچھلا صفحہ) کے شاگرد بکثرت تھے۔ ایک نے یہ جملہ براہ راست امام زہریؒ سے نہ سنا تو رفیق سبق سے پوچھا کہ امام زہریؒ نے کیا فرمایا تھا۔ وہ بولے فانتھی الناس الخ کہا تھا۔ اس سے بعض کو یہ دھوکہ ہوا کہ شاید یہ جملہ امام زہری کا مدرج ہے۔ حالانکہ یہ جملہ بھی مرفوع حدیث میں موجود تھا۔ (فتح الملہم جلد۲ ص ۳۱۲ و اعلاء السنن جلد ۴ ص ۸۸) چنانچہ روایت یوں ہے کہ

وقال عبد الله بن محمد الزهري من بينهم قال سفيان وتكلم الزهري بكلمة لم اسمعها فقال معمر انه قال فانتهى الناس الخ

اپنے ساتھیوں میں سے عبداللہ بن محمدؒ نے یہ بیان کیا کہ سفیانؒ نے فرمایا کہ امام زہریؒ نے ایک کلمہ بیان کیا لیکن میں خود ان سے نہ سن سکا۔ میں نے پوچھا کہ انھوں نے کیا فرمایا ہے؟ امام معمرؒ نے فرمایا کہ زہریؒ نے فانتھی الناس الخ کا جملہ بیان کیا ہے۔

(ابوداؤد جلد ۱ ص ۱۲۰، کتاب القرآۃ ص ۹۹، سنن الکبریٰ ۲ ص ۱۵۸)

اور کتب احادیث میں اس کی متعدد نظریں موجود ہیں۔ مثلاً زہیرؒ کا بیان ہے کہ ابو الزبیرؒ حدیث بیان کر رہے تھے۔ ایک جملہ میں نہ سن سکا۔ وہ جملہ مجھے میرے رفیق درس یاسین زیاتؒ نے بتایا۔ (طیالسی ص ۲۴۰) حضرت جابر بن سمرہؓ فرماتے ہیں کہ آنحضرت صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم حدیث ارشاد فرما رہے تھے لیکن ایک جملہ میں نہ سن سکا۔ میں نے اپنے رفیق سے پوچھا تو اس نے مجھے بتلایا (ترمذی جلد ۲ ص ۴۵، ابوداؤد جلد ۲ ص ۲۳۲، طیالسی ص ۱۰۱، بغدادی جلد ۱ ص ۱۹۶) حضرت عبداللہ بن قرطؓ فرماتے ہیں کہ آں حضرت صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے حدیث بیان کی مگر ایک خفیف سا کلمہ میں نہ سن سکا۔ میں نے پہلو میں اپنے رفیق سے پوچھا تو اس نے مجھے بتایا (مستدرک جلد ۴ ص ۲۲۱) حضرت اسماء بنت ابی بکرؓ فرماتی ہیں کہ جناب رسول خدا صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے حدیث بیان کی لیکن ایک جملہ اہل مجلس کے رونے اور شور و غل کی وجہ سے میں نہ سن سکی۔ میرے قریب جو صاحب بیٹھے تھے۔ میں نے ان سے دریافت کیا تو انھوں نے وہ جملہ مجھے بتایا۔ (نسائی جلد ۱ ص ۲۲۴ و مشکوٰۃ جلد ۱ ص ۲۶) اور یہ تمام جملے مرفوع حدیث کے ساتھ تھے۔ یہی حال فانتھی الناس الخ کے جملہ کا ہوا ہے۔

جواب :۔ یہ ٹھیک ہے کہ جمہور اہلِ اسلام تمام نمازوں میں امام کے پیچھے قرآۃ کے عدم جواز کے قائل ہیں لیکن یہ دعویٰ کس نے کیا ہے کہ تمام نمازوں میں مقتدی کے لیے عدم جوازِ قرآۃ کی دلیل صرف یہی ایک حدیث ہے۔ ہاں جہری نمازوں میں عدم جواز قرآۃ خلف الامام کی ایک دلیل یہ روایت بھی ہے باقی سری نمازوں کے لیے قرآن کریم کی آیت۔ حضرت ابوموسیٰ الاشعریؓ، حضرت ابوہریرہؓ اور حضرت انس بن مالکؓ کی حدیث واذا قرء فانصتوا پہلے بیان ہو چکی ہے۔ بقیہ دلائل اپنے مقام پر بیان ہوں گے۔ انشاء اللہ تعالیٰ یہ نقد تو وصول کر لیجیے۔ اور ادھار کے منتظر رہیے۔ دنیا بامید قائم است۔

باقی امام بیہقیؒ وغیرہ کا ابن اُکیمہؒ کی روایت کا علاءؒ بن عبدالرحمٰنؒ کی روایت سے معارضہ کر کے علاءؒ بن عبدالرحمٰنؒ کی روایت کو ترجیح دینا سو یقیناً مردود ہے، جس کی پوری تشریح اپنے مقام پر آئے گی۔ انشاء اللہ العزیز۔ اور یہ بات بھی اپنے مقام پر انشاء اللہ تعالیٰ باحوالہ آئے گی کہ حضرت ابوہریرہؓ جہری نمازوں میں امام کے پیچھے قرآۃ نہیں کرتے تھے۔ لہٰذا مؤلف خیر الکلام کا یہ کہنا کہ حضرت ابوہریرہؓ کا فتویٰ جہری نمازوں کو بھی شامل ہے بالکل بے کار ہے۔

پانچویں حدیث۔ امام عبداللہؒ[1] فرماتے ہیں کہ مجھ سے والد ماجد امام احمدؒ بن حنبلؒ نے بیان کیا۔ وہ فرماتے ہیں کہ ہم سے یعقوبؒ بن ابراہیمؒ[2] نے بیان کیا۔ وہ محمدؒ بن عبداللہ[3] بن مسلمؒ سے روایت کرتے ہیں

---

[1] علامہ ذہبیؒ ان کو الامام الحافظ اور الحجۃ لکھتے ہیں۔ (تذکرہ جلد ۲ ص ۲۱۳) امام احمدؒ کا ترجمہ مقدمہ میں نقل کیا جا چکا ہے۔

[2] علامہ ابن معینؒ اور عجلیؒ ان کو ثقہ کہتے ہیں۔ ابن سعدؒ ان کو ثقہ اور مامون کہتے ہیں۔ ابن حبانؒ ان کو ثقات میں لکھتے ہیں۔ (تہذیب التہذیب جلد ۱۱ ص ۳۸۰) علامہ ذہبیؒ ان کو الامام اور الحافظ لکھتے ہیں۔ (تذکرہ جلد ۱ ص ۳۰۴)

[3] امام احمدؒ ان کو صالح الحدیث اور لا باس بہ کہتے ہیں۔ ابن معینؒ ایک روایت میں ان کو صالح کہتے ہیں۔ ابو حاتمؒ کہتے ہیں کہ ان کی روایتیں لکھی جا سکتی ہیں۔ امام ابوداؤدؒ ان کو ثقہ کہتے ہیں۔ ابن عدیؒ کا بیان ہے کہ مجھے ان کی کسی حدیث میں خرابی معلوم نہیں اور میں نے ان کی کوئی حدیث منکر نہیں دیکھی۔ واقدیؒ ان کو کثیر الحدیث اور صالح کہتے ہیں۔ یہ صحاح ستہ کے راوی ہیں (اور یہ بالکل ایک ظاہر امر ہے کہ صحاح ستہ کے راوی میں اگر کوئی کمزوری ہو تو قابل برداشت ہوتی ہے جبکہ متابع میں کوئی ثقہ راوی ہو) صحیح بخاری میں ان کی دو حدیثیں ہیں۔ (تہذیب التہذیب جلد ۹ ص ۲۷۹) امام زہریؒ کا ترجمہ مقدمہ میں گزر چکا ہے۔

وہ امام زہریؒ سے روایت کرتے ہیں۔ وہ فرماتے ہیں کہ مجھ سے عبدالرحمٰن بن ہرمزؒ نے بیان کیا۔ وہ عبداللہ بن بحینہؓ [1] سے روایت کرتے ہیں۔ وہ فرماتے ہیں کہ آں حضرت صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ

هل قرأ احد منكم معي أنفا قالوا نعم قال اني اقول مالي انازع القرأن فانتهى الناس عن القرأة معه حين قال ذلك۔ (مسند احمد جلد ۵ ص ۳۴۵)

کیا تم میں سے کسی نے ابھی میرے ساتھ قرأت کی ہے؟ حضرات صحابہ کرامؓ نے عرض کیا جی حضرت قرأت کی ہے۔ آپ نے ارشاد فرمایا تب ہی تو میں (دل میں) کہہ رہا تھا کہ میرے ساتھ قرآنِ کریم کی قرأت میں منازعت اور کشمکش کیوں کی جارہی ہے؟ آپ کا یہ ارشاد جب سنا تو لوگوں نے آپ کے پیچھے قرأت ترک کر دی۔

امام ابوبکر ہیثمیؒ (المتوفی ۸۰۷ھ) اس حدیث [3] کے بارے میں تحریر فرماتے ہیں کہ رواه احمد ورجال احمد رجال الصحيح۔ (مجمع الزوائد جلد ۲ ص ۱۰۹) یہ روایت امام احمدؒ نے بیان کی ہے اور امام احمدؒ کی سند کے تمام راوی صحیح بخاری کے راوی ہیں۔ اس کے آگے علامہ ہیثمیؒ نے امام بزارؒ کا وہ اعتراض نقل کیا ہے جو عنقریب آرہا ہے۔ الغرض سند کے لحاظ سے یہ روایت بھی صحیح ہے۔ اور اس میں جہری نماز کی کوئی قید بھی مذکور نہیں ہے۔ لہٰذا یہ روایت جہری اور سری تمام نمازوں کو شامل ہے۔ گویا اس روایت کے پیشِ نظر حضرات صحابہ کرامؓ نے آں حضرت صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کے پیچھے تمام نمازوں میں قرأت ترک کر دی تھی۔ (ملاحظہ ہو احکام القرآن جلد ۳ ص ۵۲ للجصاص الرازیؒ) اور اگر اس روایت میں جہر کی قید بھی ہو جیسا کہ مجمع الزوائد جلد ۲ ص ۱۱۰

---

[1] امام ذہبیؒ ان کو الحافظ اور ثبت لکھتے ہیں۔ (تذکرہ ۱ ص ۹۱)

[2] بحینہ اُن کی والدہ کا نام تھا (نووی ۱ ص ۲۱۱، طبقات ابن سعد جلد ۴ قسم دوم صفحہ ۲۰) والد کا نام مالک تھا۔ (صحیح مسلم ۱ ص ۲۱۱) مدینہ سے تیس میل دور مقام ریم میں متوطن ہو گئے تھے (استیعاب جلد ۱ ص ۳۵۱) اور جلیل القدر و فضلائے صحابہؓ میں ان کا شمار تھا۔ (اصابہ جلد ۴ ص ۱۴۱) المتوفی ۵۵ھ

[3] یہ روایت سنن الکبریٰ جلد ۲ ص ۱۵۸ اور کتاب القرأة ص ۹۸ وغیرہ میں بھی مذکور ہے۔

کی ایک روایت میں ہے صلی صلوٰۃ یجھر فیھا الخ تب بھی جہری نمازوں میں ترک قرأۃ خلف الامام پر سابق روایات کی طرح یہ صریح دلیل ہے۔ اس روایت پر امام بزارؒ اور امام بیہقیؒ وغیرہ نے یہ اعتراض کیا ہے کہ اس میں محمدؒ بن عبداللہؒ بن مسلمؒ نے خطا کی ہے۔ اصل روایت عن ابن اکیمہ عن ابی ھریرۃؓ الخ تھی۔ لیکن انھوں نے عن ابن بحینہ کر دی ہے۔ اور پھر محض لفظوں کے ذریعوں رعب جمانے کی سعی کی ہے کہ ھذا اخطأ لا شك فیه ولا ارتیاب۔ (سنن الکبریٰ ۲ ص ۱۵۹ وغیرہ) لیکن محض ظن اور اٹکل سے ایسے لا یعنی اور بیکار اعتراض کون سنتا ہے؟ کیا ابن اکیمہؒ اور حضرت ابوہریرہؓ کے علاوہ عبداللہ بن بحینہؓ جناب رسول خدا صلی اللہ تعالیٰ علیہ وآلہ وسلم سے ترک قرآت خلف الامام کی روایت نقل کرنے کے مجاز نہیں تھے؟ اور کیا امام احمدؒ بن حنبلؒ اور علامہ ہیثمیؒ وغیرہ کو یہ غلطی اور خطا معلوم نہ ہو سکی؟ نہ تو اس میں اندراج کی غلطی سے انتقال سند ہے جیسا کہ مؤلف خیر الکلام نے ص ۴۴۱ میں کہا ہے اور نہ یہ روایت ضعیف ہے۔ وعلی سبیل التنزل اگر یہ روایت عن ابن اکیمہؒ عن ابی ھریرۃؓ ہی ہو۔ تب بھی یہ صحیح روایت پہلی روایت کی مؤید ہو گی اور اس کا صحیح ہونا آپ معلوم ہی کر چکے ہیں۔ حالانکہ یہ روایت عبداللہؓ ابن بحینہؓ ہی سے مروی ہے۔ امام معمرؒ اور سفیانؒ بن عیینہؒ کی زہریؒ عن ابن اکیمہ الخ کی روایت اپنے مقام پر صحیح ہے۔ نہ تو دونوں میں تعارض ہے اور نہ اختلاف۔ رہا اس روایت میں قرأ کو جہر پر حمل کرنا یا اس میں قرأت کو ما زاد علی الفاتحۃ پر محمول کرنا جیسا کہ امام بیہقیؒ نے کیا ہے۔ (سنن الکبریٰ جلد ۲ ص ۱۵۹) تو محض فرسودہ اور بے حقیقت تاویل ہے۔ اور خالص سینہ زوری پر محمول ہے۔ فسامحه الله تعالیٰ بعموم فضله۔

لہ علامہ ہیثمیؒ وغیرہ کہتے ہیں کہ اس روایت کے جملہ راوی بخاری کے راوی ہیں۔ اگر اس روایت کو ابن اکیمہ سے تسلیم کیا جائے تو ابن اکیمہؒ بخاری کے راوی نہیں ہیں۔ لہٰذا ان کا رجالہ رجال الصحیح کہنا ہی امام بزارؒ کی تردید کے لیے کافی ہے اور اپنے وقت میں اگر علامہ ہیثمیؒ کو صحت اور سقم کی پرکھ نہیں تو اور کس کو تھی؟ تو مؤلف خیر الکلام کا ہیثمیؒ پر اعتراض بے سود ہے اگرچہ مسند احمد کی بعض روایتیں ضعیف و کمزور ہیں مگر یہ سند بالکل صحیح ہے کیونکہ اس کے جملہ راوی بخاری کے راوی ہیں۔

چھٹی حدیث: امام بزارؒ[1] فرماتے کہ ہم سے محمدؒ[2] بن بشارؒ اور عمروؒ بن علیؒ نے بیان کیا۔ وہ دونوں فرماتے ہیں کہ ہم سے ابو احمدؒ[3] نے بیان کیا۔ وہ فرماتے ہیں کہ ہم سے یونسؒ[4] بن ابی اسحاقؒ نے اپنے باپؒ[5] سے بیان کیا۔ وہ ابو الاحوصؒ[6] سے روایت کرتے ہیں اور وہ حضرت عبداللہؓ بن مسعود سے روایت کرتے ہیں۔ انھوں نے فرمایا:

---

[1] صاحب مسند احمدؒ بن عمروؒ بن عبدالخالقؒ (المتوفی ۲۹۲ھ) علامہ ذہبیؒ ان کو الحافظ اور العلامہ لکھتے ہیں۔ (تذکرہ جلد ۲ ص ۲۰۴)

[2] حافظ ابن حجرؒ ان کو الحافظ اور عجلیؒ ان کو ثقہ اور کثیر الحدیث کہتے ہیں۔ ابو حاتمؒ صدوق اور نسائیؒ لا باس کہتے ہیں۔ مسلمہؒ بن قاسمؒ ان کو ثقہ اور مشہور کہتے ہیں۔ دار قطنیؒ ان کو من الحفاظ والاثبات کہتے ہیں ابن حبانؒ ثقات میں لکھتے ہیں۔ (تہذیب التہذیب جلد ۹ صـ۷۱) عمروؒ بن علیؒ کو امام ابو زرعہؒ من فرسان الحدیث اور دار قطنیؒ من الحفاظ کہتے ہیں۔ ابن حبانؒ ثقات میں لکھتے ہیں۔ مسلمہؒ بن قاسمؒ ان کو ثقہ اور حافظ کہتے ہیں۔ (تہذیب التہذیب جلد ۸ صـ۸۱)

[3] ان کا نام محمدؒ بن عبداللہؒ بن الزبیرؒ تھا۔ امام ابن نمیرؒ ابن معینؒ اور عجلیؒ ان کو ثقہ کہتے ہیں۔ بندارؒ کا بیان ہے کہ میں نے ان سے بڑا حافظ نہیں دیکھا۔ محدث ابو زرعہؒ اور ابن خراشؒ ان کو ثقہ کہتے ہیں امام ابو حاتمؒ ان کو حافظ الحدیث کہتے ہیں۔ امام نسائیؒ لیس بہ باس ابن قانعؒ ثقہ اور ابن سعدؒ ان کو صدوق اور کثیر الحدیث کہتے ہیں۔ (ایضاً جلد ۹ صـ۲۵۵)

[4] امام ابن معینؒ اور ابن سعدؒ ان کو ثقہ کہتے ہیں۔ ابن عدیؒ حسن الحدیث اور نسائیؒ لا باس بہ کہتے ہیں۔ عجلیؒ ان کو جائز الحدیث کہتے ہیں اور ابن شاہینؒ ان کو ثقات میں لکھتے ہیں۔ (ایضاً جلد ۱۱ صـ۴۳۳)

[5] ابو اسحاق السبیعیؒ علامہ ابن ناصر الدینؒ ان کو بڑے حفاظ اور ائمہ دین میں شمار کرتے ہیں (شذرات الذہب جلد ۱ صـ۱۷۴) امام نوویؒ لکھتے ہیں ان کی توثیق جلالت اور ثناء پر سب کا اتفاق ہے (تہذیب الاسماء جلد ۲ صـ۱۷۱) علامہ ذہبیؒ ان کو الحافظ اور احد الاعلام لکھتے ہیں۔ (تذکرہ جلد ۱ صـ۱۰۵) امام احمدؒ ابن معینؒ، نسائیؒ، عجلیؒ اور ابو حاتمؒ وغیرہ سب ان کو ثقہ کہتے ہیں۔ (تہذیب التہذیب جلد ۸ صـ۶۵)

[6] ان کا نام عوفؒ بن مالکؒ بن نضلہ تھا۔ امام ابن معینؒ، ابن سعدؒ اور نسائیؒ ان کو ثقہ کہتے ہیں۔ ابن حبانؒ ان کو ثقات میں لکھتے ہیں۔ (ایضاً جلد ۸ صـ۱۶۹) حضرت ابن مسعودؓ جلیل القدر صحابی تھے جن کے کچھ مناقب باب اوّل میں بیان ہو چکے ہیں۔

كانوا يقرأون خلف النبي صلى الله عليه وسلم فقال خلطتم عليّ القرآن۔ (احکام القرآن جلد ۳ ص۵۱ وطحاوی جلد ۱ ص۱۰۶، الجوہر النقی جلد ۲ ص۱۶۲)

کہ لوگ آں حضرت صلی اللہ تعالیٰ علیہ وآلہ وسلم کے پیچھے قرأت کرتے تھے۔ آپ نے ارشاد فرمایا کہ تم نے مجھ پر قرآن مجید کی قرأت خلط ملط کر دی ہے۔

اس روایت سے معلوم ہوا کہ آپ نے اپنے پیچھے قرأت کرنے والوں کی قرأت کو گوارا نہ فرمایا اور مخصوص لہجہ میں ناپسندیدگی کا اظہار کرتے ہوئے تنبیہ فرمائی اور اس میں چونکہ جہری نماز کی قید نہیں۔ اس لیے سب نمازوں کو یہ روایت شامل ہو گی۔ اور آہستہ قرأت کرنے بلکہ مقتدیوں کے عدم تکمیل وضو سے آپ کا متاثر ہونا پہلے نقل ہو چکا ہے۔ علامہ ہیثمی رح لکھتے ہیں کہ یہ روایت مسند احمد، مسند ابو یعلیٰ اور مسند بزار میں مروی ہے۔ اور مسند احمد کی روایت کے جملہ راوی صحیح بخاری کے راوی ہیں۔ (مجمع الزوائد جلد ۲ ص۱۱۰) علامہ ماردینی رح لکھتے ہیں کہ وهذا سند جيد کہ یہ عمدہ اور کھری سند ہے۔ (الجوہر النقی جلد ۲ ص۱۶۲) اور قرأت چونکہ مطلق ہے اس لیے سورۃ فاتحہ اور قرآن کریم کی جملہ سورتوں کی قرأت کو شامل ہے کیونکہ آں حضرت صلی اللہ تعالیٰ علیہ وآلہ وسلم نے جہر اور سر کا کوئی فرق بیان نہیں فرمایا۔ (احکام القرآن جلد ۳ ص ۵۱)

اس روایت میں قرأت کو جہر پر یا قرأت کو ما زاد علی الفاتحة پر بجبر محمول کرنا جیسا کہ امام بیہقی رح کی تقلید میں کرنے والوں نے (جن میں قاضی مقبول احمد صاحب بھی ہیں) کیا ہے بالکل غلط ہے ایسی لایعنی تاویلات کو کون مانتا ہے؟

بعض طرق میں اس کا ذکر آتا ہے کہ حضرات صحابہ رض آپ کے پیچھے جہر سے قرأت کرتے تھے مگر فیجهرون کے الفاظ سنداً و معناً محل نظر ہیں۔ یہ روایت دارقطنی جلد ۱ ص ۱۳۰ میں ہے، لیکن پوری سند یوں ہے: عن يونس بن ابی اسحٰق عن الاحوص ..... الخ اور گو تعلیق المغنی میں کہا ہے: اسناده حسن مگر مؤلف خیر الکلام کے اصول سے یہ صحیح نہیں ہے وہ لکھتے ہیں کہ

اس کی سند میں ابو اسحاق سبیعی رح ہیں حافظ ابن حجر رح نے ان کو تیسرے طبقہ کے مدلسین

میں شمار کیا ہے۔ طبقات المدلسین ص ۱۴ اور نہ اس طبقہ کی روایات بدون تصریح سماع مقبول نہیں ہوتیں۔ ...... الخ (خیر الکلام ص ۴۶۸) بقول ان کے یہ نہ تو صحیح ہے اور نہ مقبول علاوہ ازیں امام احمدؒ فرماتے ہیں کہ یونسؒ کی اپنے والد سے روایت ضعیف ہے۔ (تہذیب التہذیب جلد ۱۱ ص ۴۳۴) اور مؤلف خیر الکلام نے ص ۱۹۰ میں لکھا کہ بعض اہل علم ابو اسحاقؒ کو ان کے اختلاط کی وجہ سے چھوڑ چکے ہیں۔ (میزان جلد ۲ ص ۲۹۲) لہٰذا متروک کی روایت کا کیا اعتبار۔ کم از کم ان کو اپنے پیش کردہ اصول کا خیال تو ملحوظ رکھنا چاہیئے۔

ساتویں حدیث: امام بیہقیؒ فرماتے ہیں کہ ہم سے ابو الحسن[1] علیؒ بن احمد حمامی مقریؒ نے بیان کیا۔ وہ فرماتے ہیں کہ ہم سے احمدؒ[2] بن سلیمان فقیہہؒ نے بیان کیا۔ وہ فرماتے ہیں کہ ہم سے ابراہیم[3] بن ہیثم رح نے بیان کیا۔ وہ فرماتے ہیں کہ ہم سے آدمؒ[4] رح نے بیان کیا۔ وہ فرماتے ہیں کہ

---

[1] علامہ خطیبؒ لکھتے ہیں کہ وہ صادق دیندار، فاضل اور حسن الاعتقاد تھے۔ (بغدادی جلد ۱۱ ص ۳۲۹) مؤلف خیر الکلام نے (ص ۴۴۷ میں) یہ کہا ہے کہ ابن ابی الفوارسؒ کہتے ہیں ضعیف جداً! سخت ضعیف ہے۔ میزان جلد ۲ ص ۲۱۷، اور لسان المیزان جلد ۴ ص ۱۹۴) مگر یہ ان کی جہالت ہے کیونکہ جن کی تضعیف ابن ابی الفوارسؒ نے کی ہے وہ علیؒ بن احمدؒ بن ابی قیس المقریؒ الرفاعی ...... الخ ہیں جن کی وفات ۳۵۲ھ میں ہوئی ہے۔ دیکھئے لسان جلد ۴ ص ۱۹۴ وغیرہ اور زیر بحث سند میں علیؒ بن احمد بن عمرؒ بن حفصؒ ابو الحسن المقری المعروف بابن الحمامیؒ ہیں جن کی وفات ۴۱۷ھ میں ہوئی (دیکھئے بغدادی جلد ۱۱ ص ۳۳۰) اس لیے مؤلف خیر الکلام کا ص ۴۴۷ میں یہ کہنا کہ پھر یہ حدیث بالکل منکر شاذ اور ضعیف ہے۔ انتہی بلفظہ قطعاً باطل اور مردود ہے۔

[2] علامہ ذہبیؒ ان کو الامام، الحافظ، الفقیہ اور شیخ العلماء لکھتے ہیں۔ (تذکرہ جلد ۳ ص ۶۹)

[3] امام بیہقیؒ لکھتے ہیں کہ وہ ثقہ تھے۔ (بحوالہ الجوہر النقی جلد ۱ ص ۱۰) دار قطنیؒ ان کو ثقہ لکھتے ہیں (جلد ۱ ص ۱۸) ابن عدیؒ ان کو مستقیم الحدیث کہتے ہیں۔ ابن حبانؒ ان کو ثقات میں لکھتے ہیں۔ (لسان المیزان جلد ۱ ص ۱۲۳) خطیبؒ ان کو ثقہ اور ثبت لکھتے ہیں۔ (بغدادی جلد ۶ ص ۲۰۶)

[4] آدمؒ ابن ابی ایاسؒ، امام ابو داؤدؒ، ابن معینؒ اور عجلیؒ ان کو ثقہ کہتے ہیں۔ ابو حاتمؒ ان کو ثقہ اور

(باقی اگلے صفحہ پر)

ہم سے ابن ابی ذئبؒ[1] نے بیان کیا۔ وہ محمد رحؒ بن عمروؒ[2] سے اور وہ محمد بن عبدالرحمٰن رحؒ[3] بن ثوبانؒ سے اور وہ حضرت ابو ہریرہؓ سے روایت کرتے ہیں وہ فرماتے ہیں کہ آں حضرت صلی اللہ تعالیٰ علیہ و آلہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ

ما کان من صلوٰۃ یجھر فیھا الامام بالقرأۃ فلیس لاحد ان یقرأ معہ۔ (کتاب القرأۃ ص ۹۹، وص ۱۲ طبع اشرف پریس)

جس نماز میں امام جہر سے قرأت کرتا ہو۔ اس نماز میں کسی کو یہ حق حاصل نہیں کہ امام کے ساتھ قرأت کرے۔

یہ روایت بھی اس بات کو واشگاف کرتی ہے کہ جہری نمازوں میں امام کے پیچھے کسی مقتدی کو اس کی گنجایش نہیں ہے کہ وہ امام کے پیچھے کسی قسم کی قرأت کرے۔ امام بیہقیؒ نے قرأت سے جہر اور ما زاد علی الفاتحۃ کی قرأت مراد لی ہے۔ لیکن یہ قطعاً غلط ہے۔ جناب رسولِ خدا صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم مامور من اللہ تھے۔ اور آپ کو فاصدع بما تؤمر کا حکم تھا۔ مطلق قرأت اور سورۂ فاتحہ کی مقید قرأت میں نیز نفسِ قرأت اور جہر بالقرأۃ میں آپ اچھی طرح فرق جانتے تھے۔ پھر نہ معلوم آپ نے اتنی رازداری اور کنایہ سے کام کیوں لیا؟ آپ نے یہ کیوں نہ فرما دیا کہ فلیس لاحد ان یجھر معہ اور یہ کیوں نہ فرما دیا: فلیس لاحد ان یقرأ معہ غیر سورۃ الفاتحۃ آپ کے الفاظ تو یہ ہیں فلیس لاحد ان یقرأ معہ کسی کو یہ حق نہیں کہ امام کے ساتھ کسی قسم کی قرأت کرے۔ آپ کے مطلق حکم کو بلا دلیل مقید کر دینا

(بقیہ گذشتہ صفحہ) مامون کہتے ہیں۔ نسائیؒ لا بأس بہ کہتے ہیں۔ ابن حبانؒ ثقات میں لکھتے ہیں (تہذیب التہذیب جلد ۱۰ ص ۱۹۲)

[1] ثقہ، فقیہ اور فاضل تھے۔ (تقریب ص ۳۲۹)

[2] امام ابو زرعہؒ، نسائیؒ اور ابن سعدؒ ان کو ثقہ کہتے ہیں۔ ابو حاتمؒ ان کو ثقہ اور صالح الحدیث کہتے ہیں۔ (ایضاً جلد ۹ ص ۳۷۴)

[3] ابن سعدؒ، ابو زرعہؒ، نسائیؒ ان کو ثقہ کہتے ہیں۔ ابو حاتمؒ کا بیان ہے کہ وہ تابعیؒ ہیں تھے اور ایسے ثقہ تھے کہ ان کے مثل سے سوال نہیں ہو سکتا۔ ابن حبانؒ ان کو ثقات میں لکھتے ہیں (ایضاً جلد ۹ ص ۲۹۴) حضرت ابو ہریرہؓ مشہور صحابی تھے۔ غرضیکہ اس روایت کا ایک ایک راوی ثقہ اور ثبت ہے۔

اور مطلق قرأت کو مقید قرأت پر بغیر کسی حجت کے حمل کرنا سینہ زوری نہیں تو اور کیا ہے؟ ایک اور بات اس روایت کے بارے میں امام بیہقیؒ سے نکلی ہے، وہ بھی بہت ہی عجیب ہے۔ وہ لکھتے ہیں کہ یہ روایت منکر ہے۔ اگر کوئی روایت صرف امام بیہقیؒ کے منکر کہنے سے منکر ہو جایا کرتی ہے تو پھر ان سے کوئی جھگڑا نہیں۔ لیکن اصول حدیث کے لحاظ سے یہ روایت کسی طرح منکر نہیں ہے۔ حضرات محدثین کرامؒ کی اصطلاح میں منکر وہ روایت ہوتی ہے جس کی سند میں کوئی ایسا راوی موجود ہو جو فاحش غلطی اور کثرتِ خطا کا مرتکب ہوا ہو۔ یا اپنے سے زیادہ کسی ثقہ راوی کی مخالفت کرتا ہو۔ (دیکھیے شرح نخبۃ الفکر ص ۵۵ و ۵۹ وغیرہ) لیکن اس روایت کے تمام راوی ثقہ اور ثبت ہیں۔ جیسا کہ آپ ملاحظہ کر چکے ہیں اور اس روایت میں کوئی ایسا راوی موجود نہیں۔ جو کسی ثقہ راوی کی مخالفت کر رہا ہو۔ اگر امام بیہقیؒ کی مراد اس روایت کو علاءؒ بن عبدالرحمٰنؒ کی روایت کے خلاف بتانا ہے۔ تو اس کی حقیقت بھی عنقریب آشکارا ہو جائے گی۔ انشاء اللہ العزیز۔ اندریں حالات اس کو منکر کہنا اصول کے خلاف ہے جو کسی طرح مسموع نہیں ہو سکتا۔ اور باقرار مبارکپوری صاحبؒ یہ نقل ہو چکا ہے کہ امام بیہقیؒ کا کوئی قول بلا دلیل حجت نہیں ہو سکتا۔ مؤلف خیر الکلام (ص ۴۴۶ میں) لکھتے ہیں کہ امام بیہقیؒ فرماتے ہیں کہ اس حدیث سے طبیعت نفرت کرتی ہے۔ کیونکہ جو صحیح روایات حضرت ابوہریرہؓ سے وارد ہیں یہ بوجہ ان کے خلاف ہونے کے شاذ ہے۔۔۔۔ الخ اگر امام بیہقیؒ کی طبیعت صحیح حدیث کو نہیں مانتی تو نہ مانے۔ صحیح حدیث کو ماننے والے بھی دنیا میں بفضلہ تعالیٰ موجود ہیں اور حضرت ابوہریرہؓ سے جہری نمازوں میں کوئی روایت خلف الامام قرأت کی ثابت نہیں ہے۔ جیسا کہ بیان ہو گا۔ (انشاء اللہ تعالیٰ) لہٰذا خلاف کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔

آٹھویں روایت: امام بیہقیؒ فرماتے ہیں کہ ہم سے حافظ ابو عبد اللہؒ نے بیان کیا۔ وہ فرماتے ہیں کہ ہم سے ابوبکرؒ بن اسحاق الفقیہ اور ابوبکرؒ[1] بن عبد اللہؒ نے بیان کیا۔ وہ دونوں فرماتے

---

[1] امام ابو عبد اللہؒ کا ترجمہ باب اوّل میں گزر چکا ہے۔ ابوبکرؒ بن اسحاق الفقیہؒ اور ابوبکرؒ بن عبد اللہؒ کی سند ڈبل ہے مگر مزید تسلی اور تسکین کے لیے (کیونکہ ابوبکر الفقیہ تو مشہور امام ہیں) ابوبکرؒ بن عبد اللہ کا ترجمہ سن لیں۔ علامہ ذہبیؒ ان کو الحافظ الامام، الاوحد، المعدل اور محدث نیشاپور لکھتے ہیں۔ (المتوفی ۳۸۸ھ) (تذکرہ جلد ۳ ص ۲۰۳)

ہیں کہ ہم سے احمد بن بشر بن سعد المرثدیؒ اور حسنؒ[1] بن سفیانؒ نے بیان کیا۔ وہ دونوں کہتے ہیں کہ ہم سے فضیل[2] بن عبد الوہابؒ اور محمد بن خالد بن عبد اللہ الواسطیؒ نے بیان کیا۔ وہ دونوں کہتے ہیں کہ ہم سے خالد[3] بن عبد اللہ الطحانؒ نے بیان کیا۔ وہ عبد الرحمٰن[4] بن اسحاقؒ سے روایت کرتے ہیں۔ اور وہ سعید[5] مقبریؒ سے اور وہ حضرت ابو ہریرہؓ سے وہ فرماتے ہیں کہ آں حضرت صلی اللہ تعالیٰ وسلم نے ارشاد فرمایا:

---

[1] سند کی یہ کڑی بھی ڈبل ہے۔ اور حسن بن سفیانؒ کا ترجمہ باب اول میں امام زہریؒ کے اثر میں نقل ہو چکا ہے کہ وہ جلیل القدر امام تھے۔

[2] یہ کڑی بھی ڈبل ہے۔ امام ابن معینؒ کہتے ہیں کہ فضیلؒ ثقہ اور لا بأس بہ تھے۔ محدث عبد الرحمٰنؒ اپنے والد سے ان کی توثیق نقل کرتے ہیں۔ (بغدادی جلد ۱۲ ص ۳۹۳) ابو حاتمؒ ان کو صدوق اور ابو بکر بزارؒ لیس بہ بأس کہتے ہیں، ابن حبانؒ ثقات میں لکھتے ہیں۔ (تہذیب التہذیب جلد ۸ ص ۲۹۳)

[3] امام احمدؒ، ابن سعدؒ، ابو زرعہؒ اور نسائیؒ ان کو ثقہ کہتے ہیں۔ ابو حاتمؒ ان کو ثقہ اور صحیح الحدیث کہتے ہیں۔ امام ترمذیؒ ان کو ثقہ اور حافظ کہتے ہیں۔ محمد بن عمارؒ ان کو اثبت کہتے ہیں۔ ابن حبانؒ ثقات میں لکھتے ہیں (ایضاً ج ۳ ص ۱۰۰) امام احمدؒ ان کو من افاضل المسلمین کہتے ہیں۔ (بغدادی جلد ۸ ص ۲۹۴) علامہ ذہبیؒ ان کو الحافظ اور الامام لکھتے ہیں۔ (تذکرہ جلد ۱ ص ۲۴۹)

[4] امام احمدؒ ان کو صالح الحدیث کہتے ہیں۔ ابن معینؒ ثقہ کہتے ہیں۔ یعقوبؒ بن شیبہؒ صالح اور یعقوبؒ بن سفیانؒ لا بأس بہ کہتے ہیں۔ ابو حاتمؒ حسن الحدیث کہتے ہیں۔ ابو داؤدؒ ثقہ کہتے ہیں۔ نسائیؒ (جلد ۲ ص ۱۰۸ میں) لیس بہ بأس کہتے ہیں۔ ابن خزیمہؒ بھی لیس بہ بأس کہتے ہیں۔ ابن عدیؒ صالح الحدیث اور ساجیؒ صدوق کہتے ہیں۔ ابن سعدؒ ان کی توثیق کرتے ہیں اور ابن حبانؒ ثقات میں لکھتے ہیں۔ ترمذیؒ کہتے ہیں کہ امام بخاریؒ نے ان کی توثیق کی ہے۔ (تہذیب التہذیب جلد ۶ ص ۱۳۸) مؤلف خیر الکلام ص ۱۸۸ میں لکھتے ہیں کہ ابن معینؒ نے ان کو ضعیف کہا اور امام احمدؒ نے منکر الحدیث کہا یہ جرحیں اگرچہ مبہم ہیں مگر ان سے راوی مرتبہ سے گر جاتا ہے اھ (محصلہ) **الجواب:** امام ابن معینؒ نے ان کو ثقہ کہا ہے اور امام احمدؒ نے ان کو صرف ابو الزنادؒ کی روایت میں منکر کہا ہے اور یہ روایت سعید مقبریؒ سے ہے اور لطف یہ ہے کہ خود مؤلف مذکور جرح کو مبہم کہتے ہیں اور خیر الکلام ص ۱۸۷ میں لکھا ہے کہ پھر اس پر جو جرحیں کی گئی ہیں۔ (باقی اگلے صفحہ پر دیکھئے)

کل صلوٰۃ لا یقرأ فیھا بام الکتاب فھی خداج الا صلوٰۃ خلف امام (کتاب القرأۃ ص ۱۳۵، طبع دھلی و ص ۱۷۱ طبع اشرف پریس)

کہ ہر وہ نماز جس میں سورۃ فاتحہ نہ پڑھی جائے تو وہ نماز ناقص ہوتی ہے، مگر ہاں وہ نماز اس سے مستثنیٰ ہے جو امام کے پیچھے پڑھی جائے۔

اس روایت میں خلف امام اور ام الکتاب کی قید خاص طور پر ملحوظ رکھنی چاہئے۔ اور یہ بھی کہ آپ نے تمام نمازوں میں سورۃ فاتحہ کی قرأت کو ضروری اور لازم ٹھہرایا ہے۔ مگر مقتدی کے لئے اس کی قرأت کی مطلقاً گنجایش نہیں چھوڑی اور امام بیہقیؒ وغیرہ جہاں قرأت سے ما زاد علی الفاتحۃ مراد لے کر گلو خلاصی کیا کرتے ہیں۔ یہ روایت ان کی اس تاویل کو بھی باطل ٹھہراتی ہے۔ کیونکہ اس میں خاص طور پر ام الکتاب کی قید موجود ہے جو نظر انداز نہیں کی جا سکتی۔ اور اس صحیح روایت سے بھی فریق ثانی کا یہ مطالبہ آسانی سے پورا ہو جاتا ہے کہ امام کے پیچھے سورۃ فاتحہ نہ پڑھنے کی ایک ہی صحیح صریح مرفوع حدیث پیش کرو۔

(بقیہ پچھلا صفحہ) مفسر نہیں محدثین اور اصول فقہ والوں کے ہاں اس قسم کی جرح مقبول نہیں ہوتی اور امام احمدؒ کی اصطلاح منکر الحدیث کے بارے میں بالکل جدا ہے چنانچہ حافظ ابن حجرؒ لکھتے ہیں کہ ان ابن حنبلؒ یطلق علی من یغرب علی اقرانہ فی الحدیث ای یأتی بالغرائب انہ منکر الحدیث... انتہی (ہامش تدریب الراوی ص ۲۳۴) امام احمدؒ بن حنبلؒ فرماتے ہیں کہ جو راوی اپنے باقی ساتھیوں سے متفرد ہو کر کوئی غریب حدیث بیان کرے تو وہ منکر الحدیث ہوتا ہے اور ظاہر ہے کہ غریب حدیث صحیح بھی ہو سکتی ہے۔ کما لا یخفی۔ یہ یاد رہے کہ اس سند میں راوی عبد الرحمٰنؒ بن اسحاقؒ المدنی ہیں جو کہ رجال مسلم میں سے ہیں نہ کہ الواسطی جن پر امام بیہقیؒ نے امام ابن معینؒ اور امام احمدؒ کا کلام نقل کیا ہے۔ (ملاحظہ ہو کتاب القرأۃ ص طبع دہلی) کیونکہ المدنی سے خالدؒ بن عبد اللہ الطحان الواسطیؒ کی اور المدنی کی سعید مقبریؒ سے روایت ہے۔ (ملاحظہ ہو تہذیب التہذیب جلد ۶ ص ۱۳۷) مگر الواسطی اس پوزیشن میں نہیں۔ امام بیہقیؒ غلطی کا شکار ہوتے ہیں۔ (فصل الخطاب ص) اور اسی عبد الرحمٰنؒ بن اسحاقؒ سے فریق ثانی ابو داؤد جلد ۱ ص ۱۲۰ کی روایت فانتھی الناس کے مرسل ہونے پر استدلال کرتا ہے۔ (فصل الخطاب ص ۸۰ للعلامۃ الکشمیریؒ)

۵ علامہ ذہبیؒ ان کو الامام، المحدث، اور ثقہ لکھتے ہیں۔ (تذکرہ جلد ۱ ص ۱۱۰) غرضیکہ حضرت ابوہریرہؓ تک تمام روات ثقہ اور ثبت ہیں۔

اعتراض: بیہقیؒ اس پر یہ اعتراض کرتے ہیں کہ اصل روایت میں الا صلوٰۃ خلف امام کا جملہ نہیں ہے جیسا کہ علاءؒ بن عبد الرحمٰنؒ نے حضرت ابوہریرہؓ کا موقوف اثر نقل کیا ہے اور اس میں یہ جملہ مذکور نہیں ہے اور یہ خالد الطحانؒ کی خطا ہے کہ وہ یہ جملہ زائد کر کے حدیث کا مطلب بگاڑ رہے ہیں

(کتاب القرأۃ ص ۱۳۵ محصلہ)

جواب: یہ اعتراض چنداں وقعت نہیں رکھتا: اوّلاً: اس لیے کہ مرفوع حدیث کو موقوف اثر کے تابع بنا کر مطلب لینا خلافِ اصول ہے۔ وثانیاً: اس کی بحث اپنے مقام پر آئے گی۔ کہ اعتبار راوی کی مرفوع حدیث کا ہوتا ہے۔ اس کی اپنی ذاتی رائے کا اعتبار نہیں ہوتا۔ وثالثاً: خالد الطحانؒ بالاتفاق ثقہ اور ثبت تھے۔ اور ثقہ کی زیادت بالاتفاق مقبول ہوتی ہے تو پھر نہ معلوم یہ غدر اور غلطی ان کے سر کیسے تھوپی جاسکتی ہے؟ ورابعاً: الزامی طور پر یہ کہا جاسکتا ہے کہ اگر واقعی اس حدیث کے مضمون میں غلطی واقع ہوئی ہے تو کیوں نہ ہو کہ الا صلوٰۃ خلف امام کی زیادت صحیح ہو۔ اور علاءؒ بن عبد الرحمٰن کی روایت میں غلطی اور خطا کی وجہ سے یہ زیادت چھوٹ چکی ہو۔ اور اس زیادت کے ترک کر دینے یا چھوٹ جانے کی وجہ سے حدیث کا مضمون بدل گیا ہو بلکہ قرین انصاف بھی یہی بات ہے کہ غلطی خالد الطحانؒ کی نہ ہو جو ثقہ اور ثبت تھے بلکہ یہ غلطی اور خطاء علاءؒ بن عبد الرحمٰنؒ کی ہو۔ کیونکہ ان پر کتب رجال میں کلام اور جرح کا ثبوت ملتا ہے۔ چنانچہ حافظ ابن عبد البرؒ اور علامہ ذہبیؒ اور حافظ ابن حجرؒ لکھتے ہیں کہ امام ابن معینؒ فرماتے تھے لیس حدیثہ بحجۃ کہ علاءؒ بن عبد الرحمٰنؒ کی حدیث حجت نہیں ہوسکتی، ابن عدیؒ ان کو لیس بالقوی کہتے ہیں۔ ابو حاتمؒ کا بیان ہے کہ ان کی بعض حدیثیں منکر ہوتی ہیں۔ ابو زرعہ کا بیان ہے کہ وہ کوئی زیادہ قوی نہ تھے، امام ابو داؤدؒ کا بیان ہے کہ محدثین نے ان کی صیام شعبان کی حدیث ان کے مناکیر میں شامل کی ہے، محدث خلیلیؒ کا بیان ہے کہ ان کی ایسی روایتیں بھی ہیں۔ جن میں ان کا کوئی متابع نہیں ہے۔ (دیکھئے کتاب الانصاف ص ۱۶ میزان الاعتدال جلد ۲ ص ۲۱۲ اور تہذیب التہذیب جلد ۸ ص ۱۸۶) اس لیے قرین قیاس اور مبنی بر انصاف صرف یہی بات ہے کہ اس زیادت کے ترک کرنے میں غلطی علاءؒ بن عبد الرحمٰنؒ کی ہے اور یہ روایت ان کی منکر روایتوں میں شمار ہے۔ مؤلف خیر الکلام کا ص ۱۸۷ میں یہ کہنا کہ علاءؒ بن عبد الرحمٰنؒ پر جرح مبہم ہے، اور نور الانوار کے حوالہ سے لکھا ہے کہ جرح مبہم اثر انداز نہیں ہوتی۔ پس وہ ثقہ ٹھہرے۔

امام مسلمؒ نے ان سے استشہاد کیا ہے، لہٰذا ان کے ہاں بھی ثقہ تھے۔ اور اُمت نے مسلم کی روایات کو جن پر تنقید نہیں ہوئی صحیح کہا ہے لہٰذا بالاجماع صحیح ہوئی۔ (محصلہ) محض تسکین قلب کا سامان ہے۔ امام ابن معینؒ نے ان پر مفسر جرح کی ہے اور جرح مبہم سے بھی مؤلف مذکور کے نزدیک راوی گر جاتا ہے اور اس پر ابن معینؒ وغیرہ نے تنقید کی ہے۔ لہٰذا یہ کسی طرح صحیح نہیں یہ ان کی غلطی ہے اور خالد الطحانؒ کی زیادت بلاشک وشبہ صحیح ہے کیونکہ وہ ثقہ ثبت صحیح الحدیث اور اثبت ہیں۔ الغرض یہ روایت بالکل صحیح ہے نہ اس میں خالد الطحانؒ کا وہم ہے اور نہ عبد الرحمٰنؒ بن اسحٰقؒ کا، جیسا کہ امام بیہقیؒ وغیرہ نے کہا ہے۔ امام مسلمؒ نے مقدمہ میں یہ بتلایا ہے کہ وہ استشہاد میں متکلم فیہ راوی کو بھی لے لیتے ہیں۔ (ملاحظہ ہو صـ۴) ۔ لہٰذا ان کا مسلم میں آجانا جبکہ ان پر تنقید بھی ہوئی ہے ثقاہت کا ثبوت نہیں۔

نویں حدیث: امام بیہقیؒ فرماتے ہیں کہ ہم سے ابو الحسن[1] علی بن احمدؒ بن عبدانؒ نے بیان کیا۔ وہ فرماتے ہیں کہ ہم سے احمدؒ[2] بن عبید الصفارؒ نے بیان کیا۔ وہ کہتے ہیں کہ ہم سے محمدؒ[3] بن غالبؒ نے بیان کیا۔ وہ کہتے ہیں کہ ہم سے ابو عمرؒ[4] نے بیان کیا۔ وہ کہتے ہیں کہ ہم سے ہمامؒ[5] نے بیان کیا۔ وہ کہتے ہیں کہ ہم سے زیاد الاعلمؒ[6] نے بیان کیا۔ وہ حسنؒ[7] سے روایت کرتے ہیں

---

[1] علامہ خطیبؒ لکھتے ہیں کہ وہ ثقہ تھے۔ (بغدادی جلد ۱۱ ص ۳۲۹)

[2] علامہ ذہبیؒ ان کو الحافظ اور الثقہ لکھتے ہیں۔ دار قطنیؒ کہتے ہیں کہ وہ ثقہ اور ثبت تھے۔ (تذکرہ جلد ۳ ص ۸۷)

[3] علامہ ذہبیؒ ان کو الحافظ اور الامام کہتے ہیں۔ (تذکرہ جلد ۲ ص ۱۷۲) دار قطنیؒ ان کو ثقہ اور مامون اور حافظ ابن حجرؒ ان کو الحافظ کہتے ہیں۔ (لسان المیزان جلد ۵ ص ۳۳۷) اور ابن حبانؒ ثقات میں لکھتے ہیں۔ (ایضاً ص ۳۳۸) نیز امام دار قطنیؒ نے ان کو مکثر مجود اور حافظ ابن حجرؒ نے متقن کہا ہے۔ (ایضاً)

[4] علامہ ذہبیؒ ان کو الحافظ اور العلامۃ لکھتے ہیں۔ (تذکرہ جلد ۱ ص ۳۶۷)

[5] ذہبیؒ ان کو الامام، الحجۃ اور الحافظ کہتے ہیں۔ (تذکرہ جلد ۱ ص ۱۸۸)

[6] امام احمدؒ، ابن معینؒ، ابو داؤدؒ، نسائیؒ اور ابن سعدؒ سب ان کو ثقہ کہتے ہیں۔ ابو زرعہؒ ان کو شیخ کہتے اور ابن حبانؒ ان کو ثقات میں لکھتے ہیں۔ (تہذیب التہذیب جلد ۳ ص ۳۶۲)

[7] امام حسن بصریؒ کا ترجمہ مقدمہ میں نقل کیا جا چکا ہے۔

اور وہ حضرت ابو بکرہ رضی اللہ سے:

انه دخل المسجد والنبي صلى الله عليه وسلم راكع فركع قبل ان يصل الى الصف فقال النبي صلى الله عليه وسلم زادك الله حرصا ولا تعد۔ (سنن الکبریٰ جلد ۲ ص ۹۰)

وہ کہتے ہیں کہ جب وہ مسجد میں داخل ہوئے تو آں حضرت صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم رکوع میں چلے گئے تھے۔ چنانچہ صف میں ملنے سے قبل ہی وہ (تکبیر تحریمہ ادا کر کے) رکوع میں چلے گئے اور آہستہ آہستہ چلتے چلتے صف میں مل گئے۔ آپ نے ارشاد فرمایا کہ اللہ تعالیٰ تجھے نیکی کرنے پر اور حریص کرے پھر ایسا نہ کرنا۔

ظاہر ہے کہ حضرت ابو بکرہ بغیر سورۂ فاتحہ پڑھے۔ رکوع میں شامل ہو گئے تھے۔ مع ہذا ان کی اس رکعت کو اور ان کی اس نماز کو جناب رسول خدا صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے مکمل اور صحیح سمجھا۔ اور ان کو اعادۂ نماز کا حکم نہیں دیا اور یہ دعویٰ کہ انھوں نے وہ رکعت دوبارہ پڑھی تھی بالکل بے بنیاد بات ہے بلکہ ایک توجیہ کے لحاظ سے عدم اعادہ کا صریح حکم ارشاد فرمایا۔ اگر سورۂ فاتحہ کا پڑھنا ہر رکعت

۱؎ ان کا نام نفیع بن الحارث تھا جنگ طائف کے دن مشرف بہ اسلام ہوتے تھے۔ فضلائے صحابہ میں تھے۔ بصرہ میں اقامت پذیر ہو گئے تھے۔ اور وہیں ۴۹ھ میں وفات پائی۔ (مقدمہ تجرید البخاری ص ۳)

۲؎ یہ روایت صحیح بخاری جلد ۱ ص ۱۰۸ مشکوٰۃ جلد ۱ ص ۹۹ و زیلعی جلد ۲ ص ۳۰ و مسند احمد، ابو داؤد جلد ۱ ص ۱۰۰ و نسائی جلد ۱ ص ۱۰۱ اور الجامع الصغیر للسیوطی مع الشرح جلد ۲ ص ۲۷ وغیرہ میں بھی موجود ہے یہ بخاری شریف کی روایت ہے جس کے صحیح ہونے میں کوئی کلام نہیں ہو سکتا۔ اور مزید تسلی کے لیے ہم نے سنن الکبریٰ کے روایت کی توثیق بھی نقل کر دی ہے۔

۳؎ یہ جملہ بین القوسین اور بریکٹ میں تھا کتابت کی غلطی کی وجہ سے قوس رہ گئے تھے۔ یہ حدیث کے ترجمہ میں داخل نہیں ہے جیسا کہ الاعتصام ۲ر نومبر ۱۹۶۲ء ص ۱۲ میں اس کو غلط ترجمہ اور اضافہ کہکر پھبتی اڑانے کی بے جا سعی کی گئی ہے۔ اور چونکہ تکبیر تحریمہ جمہور اہل اسلام کے نزدیک فرض ہے۔ اس لیے بین القوسین اس کا اضافہ کیا گیا ہے۔ حدیث مسیٔ الصلوٰۃ میں جو صحیح اور مشہور حدیث ہے ثم کبر ثم اقرأ کی تصریح موجود ہے اور حافظ ابن رشدؒ لکھتے ہیں کہ فمفهوم هذا ان التكبيرة الاولى هي الفرض فقط (بدایۃ المجتہد جلد ۱ ص ۱۱۸) اس حدیث کا مفہوم یہ ہے کہ فرض صرف تکبیر تحریمہ ہی ہے۔

(حاشیہ نمبر ۴ اگلے صفحہ پر دیکھیے)

میں رکن اور ضروری ہے تو حضرت ابو بکرہ رض کی نماز کیسے صحیح ہو گئی تھی ؟ آں حضرت صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے حضرت ابو بکرہ رض کے رکوع میں شریک ہونے کو بنظر کراہت نہیں دیکھا جیسا کہ قاضی مقبول احمد صاحب نے سمجھا ہے۔ (دیکھئے الاعتصام ۱۶ نومبر سنہ ۱۹۶۲ء صفحہ ۵) بلکہ بحالت رکوع چل کر صف سے ملنے کو پسند نہیں فرمایا اور دونوں باتوں میں بڑا فرق ہے۔ اس سے صاف اور واضح طور پر معلوم ہوا کہ مقتدی کے لیے سورۂ فاتحہ کی قرأت ضروری نہیں ہے۔ وہو المطلوب۔

مؤلف خیر الکلام نے کہا ہے کہ قرآت خلف الامام کو ضروری قرار دینے والوں کے دو قول ہیں ایک یہ کہ رکوع کی حالت میں اگر امام کو پائے تو اس رکعت میں فاتحہ فرض نہیں ہوتی ...... الخ (صفحہ ۴۵) لہٰذا یہ حضرات تو ہمارے ہمنوا ہو گئے۔ رہے دوسرے حضرات جو یہ کہتے ہیں کہ وہ رکعت اس کی شمار نہ ہو گی تو اس کا جواب انشاء اللہ تعالیٰ اپنے مقام پر آئے گا اور اس حکم میں حضرت ابو بکرہ رض کی خصوصیت بھی نہیں۔ جیسا کہ ظاہر ہے اور اسی حدیث سے جمہور اہل اسلام اور حضرات ائمہ

(پچھلے صفحہ کا حاشیہ نمبر ۴) بعض محدثین اس کو لَا تَعُدْ پڑھتے ہیں۔ یعنی نماز کے لیے دوڑ کر نہ چلا کرو۔ بلکہ اطمینان اور وقار سے چلو اور بعض اس کو لَا تُعِدْ پڑھتے ہیں۔ یعنی پھر جماعت میں تاخیر اور تنہا صف کے پیچھے نماز شروع کرنے کی حرکت نہ کرنا اور بعض اس کو لَا تُعِدْ پڑھتے ہیں۔ یعنی تمھاری نماز بالکل صحیح ہے۔ نماز کا اعادہ نہ کرو۔ امام نوویؒ نے (حاشیہ مشکوٰۃ صفحہ ۹۹ ملاحظہ کریں) اور حافظ ابن حجرؒ نے لَا تُعِدْ کو بھی نقل کیا ہے۔ (دیکھئے فتح الباری جلد ۲ ص ۲۱۴) قاضی شوکانیؒ اور نواب صدیق حسن خانصاحبؒ نے یہ دعویٰ کیا ہے کہ حضرت ابو بکرہ رض نے دوبارہ نماز پڑھی اور اس کا اعادہ کیا اور انھوں نے طبرانی کی اس روایت سے استدلال کیا ہے صل ما ادرکت واقض ما سبقك (امام الکلام ص ۱۵) لیکن حضرت مولانا عبدالحی صاحب لکھنوی رح نے غیث الغمام (ص ۴۶ تا ص ۵۰ میں) اس کا عقلاً و نقلاً خوب رد کیا ہے۔ وہ بحث وہاں ہی ملاحظہ کریں یہاں اتنی بات پیش نظر رکھیں کہ طبرانی کی روایت کی سند کیا ہے ؟ اور اگر سند صحیح بھی ثابت ہو جائے تو اس حدیث کا معنی یہ ہے کہ جو کارروائی تم نے کی پھر ایسا نہ کرنا بلکہ جو حصہ نماز کا تمھیں جماعت کے ساتھ مل جائے اس کو جماعت کے ساتھ پڑھو اور جو چھوٹ جائے اس کو جماعت کے بعد اکیلے پڑھو۔ اس سے یہ ثابت کرنا کہ اس نماز کے اعادہ کا حکم دیا خالص کم فہمی ہے۔

لے امام بیہقیؒ لکھتے ہیں کہ حضرت ابن عمرؓ، حضرت ابن مسعودؓ، حضرت ابو بکرؓ، حضرت زید بن ثابتؓ، حضرت عبداللہ بن زبیرؓ اور حضرت ابو ہریرہؓ وغیرہ بڑی محنت اور مشقت سے رکوع میں ملنے کی کوشش کیا کرتے تھے اور یہ اس کی واضح (بقیہ اگلے صفحہ پر دیکھئے)

اربعہؒ نے مدرک رکوع کے مدرک رکعت ہونے پر استدلال اور احتجاج کیا ہے جس کی پوری تفصیل اپنے محل میں بیان ہوگی۔ انشاء اللہ تعالیٰ۔ علامہ ابن حزمؒ ایک موقع پر حضرت ابوبکرہؓ کی ایک روایت سے یوں استدلال کرتے ہیں کہ

فھذا آخر فعل رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کان ابوبکرۃؓ شھدہ وانما کان اسلمہ یوم الطائف بعد فتح مکۃ وبعد حنین۔ (محلی جلد ۴ صفحہ ۲۷۴)

یہ فعل اور عمل آنحضرت صلی اللہ تعالیٰ علیہ وآلہ وسلم کا آخری عمل ہے کیونکہ اس میں ابوبکرہؓ موجود اور حاضر تھے۔ اور وہ فتح مکہ اور حنین کے بعد طائف کے دن مشرف باسلام ہوتے تھے۔

اس صحیح اور مرفوع حدیث سے بھی یہ بات ثابت ہوئی کہ امام کے ساتھ رکوع میں ملنے والے کی وہ رکعت صحیح ہے۔ اگر اس پر سورہ فاتحہ کا پڑھنا ضروری ہوتا، جیسا کہ فریق ثانی کا زعم ہے تو یقیناً اس رکعت کا اعتبار نہ ہوتا اور فریق ثانی کے دعوی کے مطابق کہ جو شخص امام کے پیچھے ہر رکعت میں سورہ فاتحہ نہ پڑھے۔ اس کی نماز ناقص ہے، کالعدم ہے، بیکار ہے اور باطل ہے۔ (بلفظہٖ جیسا کہ سخن ہائے گفتنی میں عرض کیا جا چکا ہے) یہ نماز بھی کالعدم اور باطل ہونی چاہیئے تھی۔ عیاذاً باللہ تعالیٰ۔

تکبیر تحریمہ میں احناف کے نزدیک اتنا قیام جس میں تکبیر تحریمہ ادا ہو سکے فرض ہے جب فرض ہے تو حضرت ابوبکرہؓ پر یہ فرض کیسے مخفی رہا پس لازمی امر ہے کہ حضرت ابوبکرہؓ نے بحالتِ قیام ہی تکبیر تحریمہ ادا کی ہوگی، تو مؤلف خیر الکلام کا (ص ۴۵۳) میں یہ کہنا کہ ابوبکرہؓ نے قیام میں تکبیر کہہ کر رکوع کیا ہوگا۔ ایک فرضی

(بقیہ حاشیہ پچھلا صفحہ) دلیل ہے کہ مدرک رکوع مدرک رکعت ہے۔ ورنہ یہ اکابر اس کی زحمت ہرگز گوارا نہ کرتے (یعمناہ) اور امام بیہقیؒ نے حضرت ابوہریرہؓ سے ایک مرفوع روایت بھی نقل کی ہے کہ جس نے امام کے ساتھ رکوع پالیا۔ اس نے وہ رکعت پالی۔ (سنن الکبریٰ جلد ۲ ص ۹۰) اس روایت کی سند میں یحییٰؒ بن ابی سلیمانؒ ہے جو متکلم فیہ ہے لیکن امام حاکم اور علامہ ذہبیؒ ان کی ایک سند کے بارے میں لکھتے ہیں کہ صحیح ولم یذکر بجرح (مستدرک جلد ا ص ۲۷۳) اور دوسرے مقام پر امام حاکمؒ لکھتے ہیں کہ وہ ثقات بصریین میں تھے۔ اور علامہ ذہبیؒ لکھتے ہیں کہ وہ ثقہ تھے۔ (مستدرک جلد ا ص ۲۱۶) اسی مضمون کی ایک اور مرفوع حدیث بھی امام بیہقیؒ نے نقل کی ہے۔ اور حضرت ابن مسعودؓ اور ان کے ساتھیوں کا بھی اسی پر عمل تھا۔ (الادب المفرد ص ۱۵۳)

بات ہے۔ بالکل غلط ہے۔ یہ فرضی بات نہیں ایک واضح اور کھلی حقیقت ہے اور اس کا انکار کرنا بے سود ہے۔

دسویں حدیث: امام ابن ماجہؒ[1] فرماتے ہیں کہ ہم سے علیؒ بن محمدؒ[2] نے بیان کیا۔ وہ فرماتے ہیں کہ ہم سے وکیعؒ[3] نے بیان کیا۔ وہ اسرائیلؒ[4] سے روایت کرتے ہیں۔ وہ ابو اسحاق (السبیعیؒ)[5] سے اور وہ ارقمؒ[6] بن شرحبیل سے اور وہ حضرت ابن عباسؓ سے (ایک طویل حدیث میں جس کا ضروری خلاصہ یہ ہے) روایت کرتے ہیں۔ وہ فرماتے ہیں کہ آں حضرت صلی اللہ تعالیٰ علیہ وآلہ وسلم جب مرض الموت میں مبتلا ہوئے تو حضرت ابوبکرؓ کو آپ نے امامت سپرد کی۔ تاکہ وہ لوگوں کو نماز پڑھایا کریں۔ ایک مرتبہ آپؐ کو خیال ہوا کہ میں باجماعت نماز ادا کروں۔ پہلے آپؐ کو تکلیف زیادہ تھی۔ پھر جب مرض میں تخفیف ہوئی۔ تو آپؐ دو آدمیوں کے سہارے پر آہستہ آہستہ چل کر مسجد میں پہنچے

---

[1] امام ابن ماجہؒ صاحب السنن (المتوفی ۲۷۳ھ) علامہ ذہبیؒ ان کو الحافظ الکبیر لکھتے ہیں۔ ابو یعلی الخلیلیؒ ان کو ثقہ کبیر اور متفق علیہ کہتے ہیں۔ (تذکرہ جلد ۲ ص ۱۸۹)

[2] علامہ ذہبیؒ لکھتے ہیں کہ وہ الحافظ، الثبت، محدث اور عالم قزوین تھے۔ (تذکرہ جلد ۲ ص ۷۹)

[3] وکیعؒ، الامام، الحافظ، الثبت، محدث العراق اور احد الائمۃ الاعلام تھے۔ (تذکرہ جلد ۱ ص ۲۸۲) حافظ ابن حجرؒ ان کو ثقہ حافظ اور عابد لکھتے ہیں۔ (تقریب ص ۳۸۵)

[4] حافظ ابن حجرؒ لکھتے ہیں کہ وہ ثقہ تھے بلاوجہ لوگوں نے ان میں کلام کیا ہے۔ (ایضاً ص ۳۲) امام احمدؒ، عجلیؒ، یعقوبؒ بن شیبہ، ابوحاتمؒ، ابن نمیرؒ، ابن سعدؒ اور نسائیؒ سب ان کو ثقہ کہتے ہیں۔ ابن حبانؒ ثقات میں لکھتے ہیں۔ (تہذیب التہذیب جلد ۱ ص ۲۶۲) علامہ ذہبیؒ لکھتے ہیں کہ وہ الامام، الحافظ، الحجۃ، صالح، خدا ترس اور علم کا ظرف تھے۔ جن لوگوں نے ان میں کلام کیا ہے۔ ان کا قول مردود ہے۔ امام بخاریؒ و مسلمؒ نے ان سے احتجاج کیا ہے۔ (تذکرہ جلد ۱ ص ۱۹۹)

[5] ان کا ترجمہ حدیث نمبر ۹ میں نقل ہو چکا ہے۔

[6] محدث ابو زرعہؒ اور ابن سعدؒ ان کو ثقہ، اور ابن عبدالبرؒ ان کو ثقہ اور جلیل القدر محدث کہتے ہیں۔ ابن حبانؒ ثقات میں ثقات میں لکھتے ہیں (تہذیب التہذیب جلد ۱ ص ۱۹۸) حافظ ابن حجرؒ لکھتے ہیں کہ وہ ثقہ تھے۔ (تقریب ص ۲۵)

اور آپ کے پاؤں مبارک زمین پر گھسٹتے جاتے تھے۔ اس سے پہلے حضرت ابوبکرؓ نماز شروع کر چکے تھے۔ اور ایک حد تک قرأت بھی کر چکے تھے۔ غرضیکہ آپ صفوں میں سے گزرتے ہوئے حضرت ابوبکرؓ کے پہلو میں جا پہنچے چنانچہ وہ پیچھے ہٹ آئے اور ان کی جگہ آں حضرت صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم تشریف لے گئے اور بیٹھ کر نماز پڑھائی۔ چونکہ آپ بیماری کی وجہ سے بلند آواز سے بول نہیں سکتے تھے۔ اس لیے حضرت ابوبکرؓ نے لوگوں تک آواز پہنچانے میں مکبّر کا فریضہ انجام دیا اور جب آپؐ پہنچے تو

واخذ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم من القرأۃ من حیث کان بلغ ابوبکر رضؓ۔

وہیں سے آپ نے قرأت شروع کی جہاں تک ابوبکرؓ قرأت کر چکے تھے۔

(ابن ماجہ ص ٨٨ و مسند احمد جلد ١ ص ٢٣٢)

اور ایک روایت میں (جو اس روایت کے لیے بطور شاہد اور تائید کے نقل کی جاتی ہے) یوں ہے: فقرأ من المکان الذی بلغ ابوبکر رضؓ من السورۃ۔ (مسند احمد جلد ١ ص ٢٠٩)

آں حضرت صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے سورت کے اس مقام سے قرأۃ شروع کی جہاں تک کہ حضرت ابوبکرؓ قرأت کر چکے تھے۔

اور ایک روایت میں اس طرح ارشاد ہوا ہے:

فاستفتح النبی صلی اللہ علیہ وسلم من حیث انتھٰی ابوبکر رضؓ من القرآن۔

اور جناب رسول خدا صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے قرآن کے اس حصہ سے قرأت شروع کی جس تک حضرت ابوبکرؓ قرأت کر چکے تھے۔

(سنن الکبریٰ جلد ٣ ص ٨١ و مسند احمد ج ١ ص ٢٣٢)

اور ایک روایت میں اس طرح آیا ہے:

فاستتم رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم من حیث انتھی ابوبکر رضؓ من القرأۃ ..... الخ (طحاوی جلد ١ ص ١٩٧)

کہ آں حضرت صلی اللہ تعالیٰ علیہ وآلہ وسلم نے وہاں سے قرأت پوری کی جہاں تک حضرت ابوبکر رضؓ قرأت کر چکے تھے۔

یہ روایت[1] سند کے لحاظ سے بالکل صحیح ہے۔ اس کا ایک ایک راوی ثقہ ہے جیسا کہ آپ

---

[1] یہ روایت طحاوی جلد ١ ص ٢٣٥، مشکل الآثار جلد ٢ ص ٢٧، طبقات ابن سعدؒ جلد ٣ ص ١٣١، نصب الرایہ جلد ٢ ص ٥١ و درایہ ص ١٠١ اور فتح الباری جلد ٢ ص ١٣٥، دار قطنی ص ١٥٣ وغیرہ میں مذکور ہے اور ازالۃ الخفا جلد ١ ص ٤٨ میں ہے واخرجہ ابو یعلی الموصلی فی مسندہ ..... الخ

ملاحظہ کر چکے ہیں۔ اور مؤلف خیر الکلام کو بھی اس کا اقرار ہے۔ چنانچہ وہ لکھتے ہیں کہ اگرچہ روایات مذکورہ بالا کے رواۃ ثقہ ہیں..... الخ ص ۴۵۹ حافظ ابنِ حجرؒ لکھتے ہیں کہ مسند احمد اور ابن ماجہ کی سند قوی ہے[۱]۔ (فتح الباری جلد ۵ ص ۹۲۹) چونکہ آں حضرت صلی اللہ تعالیٰ علیہ وآلہ وسلم بیمار تھے، جلدی جلدی چلنا آپ کے لیے دشوار تھا اور دو آدمیوں کے سہارے سے آپ مسجد میں پہنچے، حتیٰ کہ آپ کے پاؤں مبارک زمین پر گھسٹتے جاتے تھے اور نماز آپ کے تشریف لانے سے قبل ہی شروع ہو چکی تھی۔ ظاہر ہے کہ حضرت ابو بکرؓ سورۃ فاتحہ مکمل پڑھ چکے ہوں گے اور ان حالات کے پیش نظر یہی بات قرین انصاف ہے۔ اور اس میں تو ذرا برابر شک و شبہ کی گنجائش نہیں ہے کہ سورۃ فاتحہ اگر مکمل نہ ہوتی ہو گی تو اس کا اکثر حصہ تو یقیناً پڑھا جا چکا ہو گا۔ اور آپ نے وہیں سے اور اُس آیت سے قرأت شروع کی جہاں تک حضرت ابو بکرؓ قرأت کر چکے تھے اور جن کے نزدیک سورۃ فاتحہ مقتدی پر لازم ہے۔ وہ سب سورۃ فاتحہ کے لزوم کے قائل ہیں اور جو منکر ہیں وہ بھی سب سورۃ فاتحہ کے منکر ہیں۔ اس میں قائل بالفصل کوئی بھی نہیں[۲] الغرض آں حضرت صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم سے پوری سورۃ فاتحہ چھوٹ گئی تھی یا اس کا اکثر حصہ مگر باوجود اس کے آپ کی نماز ادا ہو گئی۔ اور آپ نے اس نماز کو صحیح اور درست سمجھا، نہ آپ کی نماز کالعدم ٹھہری اور نہ باطل اور بیکار (عیاذاً باللہ تعالیٰ) اگر ہر رکعت میں امام کے

---

[۱] اور دوسرے مقام پر لکھتے ہیں واسنادہٗ حسن (فتح الباری جلد ۲ ص ۱۲۸)

[۲] قاضی شوکانیؒ کی تحقیق سے معلوم ہوتا ہے کہ آپ سے پوری فاتحہ چھوٹ چکی تھی۔ وہ لکھتے ہیں کہ کیا بعید ہے کہ جس رکعت میں آپ نے حضرت ابو بکرؓ کو پالیا تھا۔ اس رکعت کے علاوہ باقی سب رکعتوں میں آپ نے پوری اور مکمل سورۃ فاتحہ پڑھی ہو، آگے لکھتے ہیں:

لان النزاع انما ھو فی وجوب الفاتحة فی جملة الصلوٰة لا فی وجوبھا فی کل رکعة۔ کیونکہ سورۃ فاتحہ کے ہر ہر رکعت میں وجوب کا جھگڑا نہیں ہے بلکہ سورہ فاتحہ کے جملہ نماز میں وجوب کا جھگڑا اور نزاع ہے۔ (نیل الاوطار جلد ۲ ص ۱۴۲)

علامہ عبدالرحمٰن جزائریؒ لکھتے ہیں کہ مقتدی پر فرض ہے کہ امام کے پیچھے فاتحہ پڑھے مگر جس صورت میں امام ساری فاتحہ یا اس کا کچھ حصہ پڑھ چکا ہو تو اس صورت میں امام اس کا متحمل ہو جاتا ہے۔

(باقی حاشیہ اگلے صفحہ پر)

پیچھے اقتدا کرنیوالے پر سورۂ فاتحہ کا پڑھنا لازم اور ضروری ہوتا تو آں حضرت صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کی یہ نماز ہرگز صحیح نہ ہوتی ؟ حالانکہ آپؐ کی یہ نماز بالکل صحیح تھی اور امام شافعیؒ[1] و حافظ ابن حجرؒ[2] وغیرہ اس کی تصریح کرتے ہیں کہ بیماری کے دنوں میں آپؐ نے صرف یہی[3] ایک نماز جماعت سے ادا کی تھی - اور اس لحاظ سے آپ کے اس آخری فعل اور عمل سے بھی یہ حکم آشکارا ہو گیا کہ

(بقیہ حاشیہ پچھلا صفحہ) (فقہ المذاہب الاربعہ، جلد۱ ص ۲۲۹) اور مولف خیر الکلام نے بھی یہ حوالہ نقل کیا ہے دیکھئے ص ۴۹ ؟ اور خود مؤلف مذکور لکھتے ہیں کہ جو لوگ فاتحہ خلف الامام کو فرض سمجھتے ہیں - ان میں سے بعض کے ہاں رکوع میں شامل ہونے سے رکعت ہو جاتی ہے اور ان میں سے بعض اس طرف بھی گئے ہیں کہ جہری نمازوں میں اگر مقتدی پوری فاتحہ یا آدھی فاتحہ کے بعد آئے تو اس سے ساری فاتحہ یا آدھی فاتحہ ساقط ہو جاتی ہے - اھ (خیر الکلام ص ۴۵۹) قاضی صاحبؒ اور مؤلف خیر الکلام نے تو اس طرح گلوخلاصی کر کے وقت پاس کر لیا ہے - لیکن تمام دنیا کے علماء احناف کو کھلا چیلنج اور انعامی چیلنج کرنے والے تو ہر ہر رکعت میں قرأت فاتحہ کو ضروری سمجھتے ہیں -

[1] کتاب الام جلد ۲ ص ۱۸۵ - [2] فتح الباری جلد ۲ ص ۱۴۵ -

[3] روایات اور محدثینؒ کا اس باب میں شدید اختلاف ہے کہ مرض الموت میں آپ نے مسجد میں باجماعت ایک نماز پڑھی تھی یا دو ؟ یہ نماز جہری تھی یا سری ؟ آپ امام تھے یا مقتدی ؟ وغیرہ وغیرہ صحیح یہ ہے کہ یہ ایک ہی نماز تھی جیسا کہ امام شافعیؒ وغیرہ نے فرمایا ہے اور یہ ظہر کی نماز تھی (بخاری جلد ۲ ص ۶۹۳) مؤلف خیر الکلام کا یہ کہنا کہ ظہر میں قرأت کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا کیونکہ وہ سری نماز ہے ..... الخ (ص ۴۶۵) بالکل مردود ہے - سری نمازوں میں قرأت ہوتی ہے جہر نہیں ہوتا ایک آدھ آیت کو قدرے آواز سے پڑھ لینا سر کے خلاف نہیں - مؤلف خیر الکلام نے محض اپنی گاڑی چلانے کے لیے قرأۃ کو نماز پر حمل کیا ہے جو بالکل بے دلیل ہے اور ان بالا دلائل سے آنکھیں بند کر کے وہ یہ لکھتے ہیں کہ آں حضرت صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم ابتدا ہی سے امام تھے جو بالکل بے بنیاد ہے کیونکہ حضرت عائشہ رضؓ کی صحیح روایت صلی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم فی مرضہ الذی توفی فیہ خلف ابی بکرؓ قاعدًا جو اوپر گذر چکی ہے بالکل اس کے خلاف ہے اور یہ بھی صحیح روایت میں موجود ہے کہ جب حضرت ابوبکرؓ پیچھے ہٹنے لگے تو آپؐ نے اشارہ فرمایا کہ پیچھے مت ہٹو اگر ابتداء سے

مقتدی پر سورۂ فاتحہ لازم نہیں ہے۔ امام بخاریؒ کے حوالہ سے آئے گا کہ یہ نماز ظہر کی تھی۔ اس سے معلوم ہوا کہ سری نمازوں میں بھی امام کے پیچھے قرأت ترک کرنا نہ صرف یہ کہ سنت رسول اللہ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کے مطابق ہے بلکہ آپ کا آخری عمل بھی یہی ہے۔ امام بخاریؒ ایک مقام پر تحریر فرماتے ہیں:

انما یؤخذ بالآخر فالآخر من فعل النبی صلی اللہ علیہ وسلم۔ (بخاری جلد ۱ ص ۹۶)

یعنی آں حضرت صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کا جو آخری عمل ہوگا۔ قابل عمل صرف وہی ہوگا۔

(بقیہ حاشیہ پچھلا صفحہ) امامت کا ارادہ ہوتا تو ایسا نہ فرماتے، ہاں اس کے بعد آپ نے امامت کا فریضہ ادا کیا ہے اور امام طحاویؒ وغیرہ کی بھی یہی مراد ہے کہ آپ بالآخر امام تھے اور ابتدا میں آپ نے حضرت ابوبکرؓ کی اقتدا کی تھی۔ چنانچہ حضرت عائشہؓ کی روایت میں یوں آتا ہے: صلی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم فی مرضہ الذی توفی فیہ خلف ابی بکرؓ قاعداً کہ آں حضرت صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے حضرت ابوبکرؓ کی اقتدا میں بیٹھ کر نماز پڑھی۔ (نسائی جلد ۱ ص ۱۲۷، طحاوی جلد ۱ ص ۲۳۲ بیہقی جلد ۳ ص ۸۲، ترمذی جلد ۱ ص ۴۸، محلی ابن حزم جلد ۳ ص ۶۹، ترمذیؒ فرماتے ہیں حسن صحیح) اور امام بخاریؒ (جلد ۱ ص ۹۹) نے یہ باب قائم کیا ہے۔ باب من قام الی جنب الامام لعلة اور امام نوویؒ (جلد ۱ ص ۱۷۹) نے باب استخلاف الامام اذا عرض لہ عذر اور امام نسائیؒ (جلد ۱ ص ۱۲۷) نے باب صلوٰة الامام خلف رجل من رعیتہ قائم کر کے اور یہ حدیث اس باب میں نقل کر کے اس امر کو مبرہن کیا ہے۔ یہ دلائل بھی ملاحظہ ہوں اور قاضی مقبول احمد صاحب کی یہ تعلی بھی دیکھیں کہ کیا مولانا سرفراز صاحب کسی حدیث سے ثابت کر سکتے ہیں کہ آپ پہلے بطور مقتدی شامل ہوئے تھے؟ ہرگز نہیں ۔۔۔۔۔۔ الخ (الاعتصام ۱۶ نومبر ۱۹۹۲ء ص ۹) اور پھر جب حضرت ابوبکرؓ کو آپ کی آمد کا علم ہوا تو خود پیچھے ہٹ گئے۔ اور آں حضرت صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کو اپنی جگہ پر بٹھا دیا اور آپ نے وہیں سے قراۃ شروع کی جہاں تک حضرت ابوبکرؓ پڑھ چکے تھے اور صدیقؓ نے مکبر کا فریضہ ادا کیا (دیکھئے نووی جلد ۱ ص ۱۷۹، فتح الباری جلد ۲ ص ۱۴۴ وغیرہ) اور یہی بات صحیح اور صواب ہے ولیس وراء عبادان قریة حافظ ابن حجرؒ نے الفاظ حدیث کے ظاہری تعارض کی وجہ سے تعدد واقعہ کو الصواب کہا ہے (الدرایہ ص ۱۰۰) مگر گہری نگاہ سے دیکھا جائے تو واقعہ صرف ایک ہی ثابت ہوتا ہے۔ جیسا کہ امام شافعیؒ کے حوالہ سے عرض کیا گیا ہے تطبیق آسانی سے ہو سکتی ہے اور تعدد واقعہ کی ضرورت ہی پیش نہیں آتی۔

الحمد للہ تعالیٰ کہ جس طرح جمہور کا مسلک متعدد صحیح و مرفوع قولی حدیثوں سے حق ثابت ہو چکا ہے اسی طرح آپ کے آخری عمل سے بھی اس کی تائید ہوتی ہے۔ اس روایت سے متعلق فریق ثانی کی طرف سے جو اعتراضات وارد کیئے گئے ہیں۔ مناسب معلوم ہوتا ہے کہ ان کو نقل کر کے ان کے جوابات بھی عرض کر دیے جائیں۔

پہلا اعتراض: مولانا مبارک پوری صاحبؒ لکھتے ہیں کہ اس حدیث کی سند میں ابو اسحاق السبیعیؒ واقع ہیں اور وہ مدلس تھے اور عنعنہ سے روایت کرتے ہیں۔ علاوہ بریں آخر عمر میں وہ اختلاط کا شکار بھی ہو چکے تھے۔ اس لیے ان کی روایت کار آمد نہیں ہو سکتی۔ (او کما قال تحقیق الکلام جلد ۲ ص وغیرہ) اور یہی عذر لنگ مؤلف خیر الکلام نے کیا ہے کہ ابو اسحاق رہ تیسرے درجے کے مدلس ہیں جن کی روایت بدوں تصریح سماع مقبول نہیں (محصلہ خیر الکلام صہ ۴۶۸، ۴۶۹) مگر بخاری میں ان کی معنعن حدیثوں کا کوئی جواب نہیں دیا۔ اور انشاء اللہ تعالیٰ تاقیامت دے بھی نہ سکیں گے۔

جواب: حضرت قتادہؒ کی تدلیس کے ضمن میں حضرات محدثین کرامؒ کا یہ ضابطہ نقل کیا جا چکا ہے کہ تدلیس کرنیوالے راویوں کا ایک گروہ وہ بھی ہے جن کی تدلیس کسی طرح مضر نہیں ہے اور محدثینؒ ان کی معنعن حدیثوں کو بھی صحیح سمجھتے ہیں، جن میں خصوصیت سے ابو اسحاق السبیعیؒ کا نام بھی پیش کیا گیا ہے۔ رہا ابو اسحاق السبیعی کی تخلیط کا سوال تو وہ بھی چنداں باعث تشویش نہیں ہے۔ کیونکہ علامہ ذہبیؒ ناقد فن رجال لکھتے ہیں کہ وہ ائمہ تابعین رہ اور اثبات میں تھے، بڑھاپے کی وجہ سے ان پر کچھ نسیان طاری ہو گیا تھا۔ ولم یختلط (میزان الاعتدال جلد ۲ ص ۲۹۳) لیکن وہ مختلط نہیں ہوتے تھے۔ اور تصریح کرتے ہیں کہ اس زمانہ میں ان سے صرف ابن عیینہؒ نے سماعت کی ہے اور دوسری جگہ لکھتے ہیں کہ

قلت ما اختلط ابو اسحاق ابدًا وانما یعنی بذلک التغیر ونقص الحفظ۔ (تذکرہ ۱ صہ ۱۱۵)	میں کہتا ہوں کہ ابو اسحاق تخلیط سے کبھی دوچار نہیں ہوئے تھے۔ ہاں ان کے حفظ میں کچھ تغیر اور نقص واقع ہو چکا تھا۔

اور فن اصول حدیث کا یہ طے شدہ قاعدہ ہے کہ معمولی وہم، تغیر یسیر اور نسیان کی وجہ سے ثقہ روات

لہ امام عبد اللہ بن مبارکؒ فرماتے ہیں کہ وہم سے کون بچ سکتا ہے؟ (لسان المیزان جلد ۱ صہ ۱۷) امام احمدؒ فرماتے

کی روایتوں کو ہرگز رد نہیں کیا جا سکتا۔ بہرحال ابواسحاق السبیعیؒ کی تدلیس اور تخلیط کا بہانہ کر کے ان کی صحیح روایت کو رد کرنا سراسر باطل ہے۔

بعض محدثین (جن میں حافظ ابن حجرؒ وغیرہ بھی ہیں) اختلاط وغیرہ کا لفظ ان کی طرف منسوب کرتے ہیں لیکن صرف لغوی اور عمومی معنوں میں جس سے ان کی ثقاہت اور عدالت پر کوئی دھبہ نہیں لگ سکتا اور اسی لیے وہ ان کی روایت کی تصحیح اور تحسین کرتے ہیں۔ مگر مبارکپوری صاحبؒ[1]

(بقیہ حاشیہ پچھلا صفحہ) ہیں کہ امام یحییٰ بن سعیدؒ پختہ کار محدث تھے اور بہت کم خطا ان سے سرزد ہوتی تھی۔ مگر باوجود اس کے چند حدیثوں میں ان سے بھی خطا ہوئی ہے آگے فرماتے ہیں: ومن یعری من الخطاء و التصحیف (بغدادی جلد ۱۴ ص ۱۴۰) یعنی متن اور سند میں خطاء سے کون محفوظ رہ سکتا (بلکہ سکا) ہے۔

علامہ ذہبیؒ لکھتے ہیں کہ ابوالحسن القطانؒ نے ہشامؒ بن عروہؒ اور سہیلؒ بن ابی صالحؒ پر جو تخلیط کا الزام لگایا ہے وہ باطل ہے۔ ہاں ان کے حافظہ میں کچھ نقص ضرور پیدا ہو چکا تھا۔ لیکن کیا وہ نسیان سے معصوم تھے؟ پھر کیا ہوا؟ کیا اس قسم کا وہم امام مالکؒ، امام شعبہؒ اور امام وکیعؒ وغیرہ اکثر ائمہ اور ثقات کو پیش نہیں آتا رہا؟ تو کیا ان کی روایتیں رد کر دی جائیں گی؟ خبط چھوڑ دے اور ائمہ ثقات سے بدظنی نہ کر (میزان الاعتدال جلد ۲ ص ۲۵۵)

محدث عقیلیؒ نے امام علیؒ بن المدینیؒ پر جرح کی تھی۔ علامہ ذہبیؒ لکھتے ہیں:

فمالك عقل یا عقیلی اتدری فی من تکلم۔ — یعنی اے عقیلیؒ تیری عقل کو کیا ہو گیا ہے؟ تو کس امام میں کلام کر رہا ہے۔

پھر آگے جوشِ تحریر میں آ کر عقیلیؒ سے ملتی جلتی عقل والوں کو الٹی میٹم کرتے ہیں۔

وانما اشتہی ان تعرفنی من ھوالثقة الثبت الذی ما غلط۔ — میں چاہتا ہوں کہ میرے سامنے تم کسی ایسے ثقہ کا نام تو ذرا ہمت کر کے پیش کرو جس سے غلطی سرزد نہ ہوئی ہو

(میزان جلد ۲ ص ۲۳۱)

اور مؤلف خیر الکلام لکھتے ہیں کہ کبھی کبھی غلطی کا ہو جانا یہ کوئی ایسا اعتراض نہیں جس سے حدیث ضعیف ہو جائے پس یہ حدیث صحیح ہے ..... الخ ص ۳۰۷۔

اگر وہم اور اختلاط کی مزید تحقیق مطلوب ہو تو (فتح المغیث ص ۱۳ وغیرہ) اصول حدیث کی کتابوں کا مطالعہ کیجئے۔

[1] (حاشیہ اگلے صفحہ پر دیکھئے)

اس قاعدہ سے غافل اور بے خبر ہیں اور خواہ مخواہ ان کو مورد الزام ٹھہراتے ہیں۔

دوسرا اعتراض: مبارکپوری صاحب لکھتے ہیں کہ یہ حدیث اسرائیل بن یونس نے ابو اسحاق السبیعی سے روایت کی ہے اور ان سے اسرائیل کی سماعت اختلاط کے بعد ہوئی تھی۔ لہٰذا یہ روایت قابل توجہ نہیں (بمعناہ تحقیق الکلام جلد ۲ ص)

جواب: یہ اعتراض بھی مردود ہے۔ **اولاً** اس لیے کہ ابو اسحاق اس اصطلاحی تخلیط کا تو کبھی شکار ہی نہیں ہوئے جس کے سبب ان کی روایت کمزور اور ضعیف سمجھی جا سکے اور ان کے معمولی وہم اور تغیر حفظ سے ان کی حدیث کی صحت پر کوئی اثر نہیں پڑتا۔ اس لیے اگر اسرائیل کی سماعت ابو اسحاق کے لغوی اختلاط یا نقص حفظ کے بعد بھی ہو تو اس کا اثر اور فرق کیا نکلے گا؟ **ثانیاً** امام ترمذی لکھتے ہیں کہ ابو اسحاق کے جملہ تلامذہ میں اسرائیل ابو اسحاق کی روایتوں میں اصح اثبت اور احفظ واقع ہوتے ہیں (جلد ۱ ص) امام ابن مہدی کا بیان ہے کہ اسرائیل کو اپنے دادا ابو اسحاق کی جملہ روایتیں اس طرح یاد تھیں جیسا کہ مسلمانوں کو سورۃ فاتحہ یاد ہوتی ہے۔ (تذکرہ جلد ۱ ص ۱۹۹ و تہذیب التہذیب جلد ۱ ص ۲۶۱) علامہ ذہبی کا بیان ہے کہ اسرائیل صحیحین کے راوی ہیں۔ وھو فی الثبت کالاسطوانۃ۔ یعنی وہ حدیث کے بیان کرنے میں ایسے مضبوط تھے، جیسے ستون۔ البتہ ہاں امام شعبہ ان سے زیادہ ثبت تھے لیکن ابو اسحاق سے روایت کرنے میں اسرائیل امام شعبہ سے بھی زیادہ ثبت تھے۔ (میزان جلد ۱ ص ۹۸) اور تذکرۃ الحفاظ ج ۱ ص ۲۵۴ میں ایک حدیث کے بارے میں جس میں اسرائیل عن ابی اسحاق ..... الخ ہے فرماتے ہیں اسنادہ قوی امام دارقطنی

لہ حافظ ابن حجر نے اس روایت کی ایک جگہ تصحیح (فتح الباری جلد ۵ ص ۲۶۹) اور دوسری جگہ تحسین کی ہے (جلد ۲ ص ۱۲۵) اور مبارکپوری صاحب کی بڑی ہی سعادت ہے کہ ان کو حافظ صاحب کی صرف تحسین ہی ملی ہے اور اس پر بھی وہ بڑے ناراض ہیں۔ اگر ان کی تصحیح بھی مل جاتی تو نہ معلوم ان پر کیا گذرتی؟ مگر از راہ بزرگی یہ نہ سوچا کہ نہ ابو اسحاق رح کی تدلیس مضر ہے اور نہ نقص حفظ اور تغیر کی وجہ سے ان کی حدیث ضعیف ہے بلکہ ان کی روایت اصول حدیث کے رو سے بہر حال صحیح ہے۔ لا شک فیہ۔

کا بیان ہے کہ امام عبدالرحمن بن مہدی نے فرمایا کہ ابو اسحاق کی روایتوں میں اسرائیل امام شعبہ اور سفیان ثوری سے بھی زیادہ ثقہ تھے ۔ (دارقطنی جلد ۲ ص ۳۱۸) اور تقریباً یہی مضمون حافظ ابن حجر نے بھی نقل کیا ہے ۔ (درایہ ص ۲۲ و تہذیب التہذیب جلد ۱ ص ۲۶۳) مولانا شمس الحق صاحب اسرائیل عن ابی اسحاق ..... الخ کی روایات کے بارے میں یہ فیصلہ درج کرتے ہیں کہ کلہا صحیحۃ (التعلیق المغنی جلد ۲ ص ۳۹۱) اور حافظ ابن حجر اسرائیل عن ابی اسحاق ..... الخ کی سند کی تصحیح کرتے ہیں ۔ حافظ ابن القیم، ابو اسحاق کے تمام تلامذہ اور اصحاب میں اسرائیل کو اتقن لکھتے ہیں ۔ (زاد المعاد جلد ۲ ص ۳۳۶) اور لطف بالائے لطف یہ ہے کہ مبارکپوری صاحب نے تحقیق الکلام اور ابکار المنن میں جوش جوانی میں سب اناپ شناپ لکھ مارا ہے ۔ لیکن جب تحفۃ الاحوذی لکھنے کی باری آئی اور عقل اور علم میں پختگی ہو گئی اور اپنی ذمہ داری کا گہرا احساس ہوا تو اس قاعدہ کے لکھنے پہ مجبور ہو گئے کہ اسرائیل ابو اسحاق سے روایت کرنے میں امام شعبہ اور سفیان ثوری سے بھی زیادہ قوی اور ثبت تھے ۔ (تحفۃ الاحوذی جلد ۲ ص ۱۷)

اب انصاف شرط ہے کہ ہم مبارکپوری صاحب کی اس سے بڑھ کر اور کیا تسلی کر سکتے ہیں ؟

وثالثاً ۔ اس روایت میں اسرائیل کے ایک اور ثقہ اور ثبت متابع بھی موجود ہیں جن کا نام زکریا بن ابی زائدہ ہے ۔ چنانچہ عبداللہ بن احمد اپنے والد امام احمد بن حنبل سے روایت کرتے ہیں ۔ اور وہ یحییٰ

لہ مثلاً دیکھئے فتح الباری جلد ۶ ص ۴۵۸ وجلد ۷ ص ۵۰ وغیرہ ۔ اگر مبارکپوری صاحب اور ان کے اتباع کے نزدیک اسرائیل عن ابی اسحاق ..... الخ کی سند ضعیف اور کمزور ہے تو ازراہ کرم بخاری (مثلاً جلد ۱ ص ۵۵، ۱ ص ۲۲۶، ۱ ص ۳۱۱، و ص ۳۹۵ ، ۲ ص ۵۷۹ و ۲ ص ۱۰۵۵ وغیرہ) اور مسلم کی تمام حدیثوں پہ قلم پھیر دیں ۔ کیونکہ ان میں ابو اسحاق کا اختلاط کارفرما ہو گا ۔ قاضی مقبول احمد صاحب ان کو نسیان کا مرض لگا کر یہی قرار دیتے ہیں ۔ (دیکھئے الاعتصام ص ۶ ، ۱۶ نومبر ۱۹۶۲ء) لہٰذا بخاری اور مسلم سے اس مد کی سب روایتیں نکال دیں ۔ ملاحظہ کیجئے کہ غیر مقلدین کے تعصب اور گروہ بندی کی وجہ سے صحیحین کی کتنی احادیث غیر صحیح قرار پاتی ہیں ۔ نعوذ باللہ تعالیٰ من شرور انفسنا ۔

لہ اس سند کے باقی راویوں کی توثیق پہلے نقل کی جا چکی ہے یحییٰ بن ابی زکریا کو حافظ ابن کثیر من الائمۃ الثقات لکھتے ہیں ۔ (البدایہ والنہایہ جلد ۱۰ ص ۱۸۴) علامہ ذہبی ان کو الحافظ ، الثبت ، المتقن اور الفقیہ لکھتے ہیں ۔ (تذکرہ جلد ۱ ص ۲۴۶) حافظ ابن حجر لکھتے ہیں کہ وہ ثقہ اور متقن تھے ۔ (تقریب ص ۳۹۱)

بن ابی زکریاؒ سے اور وہ زکریا بن ابی زائدہؒ سے اور وہ ابو اسحاق السبیعیؒ سے اور وہ ارقم بن شرحبیلؒ سے اور وہ حضرت عبداللہ بن عباسؓ سے حدیث کا وہی مضمون ہے جو پہلے نقل کیا جا چکا ہے۔ (مسند احمد جلد ۱ ص ۲۳۳) جب اسرائیلؒ خود اوثق اور اثبت ہیں اور ان کا متابع بھی ثقہ اور ثبت ہے تو پھر ان کی روایت کیوں صحیح نہیں ہے؟ الغرض نہ تو یہ روایت شاذ ہے جیسا کہ الاعتصام ۱۶ر نومبر ۱۹۶۲ء ص ۶ میں اس پر بلا وجہ زور لگا تعصب کا مظاہرہ کیا گیا ہے اور نہ یہ مرجوح اور بخاری کی روایت راجح ہے۔ راجح اور مرجوح کا سوال تعارض کے وقت ہوتا ہے۔ جب دونوں میں تعارض ہی نہیں تو راجح و مرجوح کا سوال بالکل بیکار ہے دونوں صحیح ہیں۔ ایک مجمل ہے اور دوسری مفصل ہے جس میں زیادت ثقہ ہے۔ جو باتفاق جملہ محدثین کرامؒ قابل قبول ہے۔

حضرت ابن عباسؓ کی روایت کا شاہد:

اسدؒ[1] بن موسیٰؒ اپنی کتاب فضائل صحابہؓ میں فرماتے ہیں کہ ہم سے ابو معاویہؒ[2] نے بیان کیا۔ وہ

---

[1] علامہ ذہبیؒ ان کو صداقت شعار مشہور اور حافظ لکھتے ہیں۔ (میزان جلد ۱ ص ۳۴۹) امام عجلیؒ، ابو زرعہؒ، ابو داؤدؒ، نسائیؒ یعقوبؒ بن سفیانؒ اور ابو بکر البزارؒ سب ان کو ثقہ کہتے ہیں۔ امام قطانؒ ان کو لا بأس بہ اور ابن معینؒ صالح کہتے ہیں امام احمدؒ ان کو ثقہ اور حلو الحدیث اور علامہ ابن سعدؒ ان کو ثقہ اور کثیر الحدیث کہتے ہیں۔ ابن حبانؒ ان کو ثقات میں لکھتے ہیں۔ (تہذیب التہذیب جلد ۳ صفحہ ۳۳) غرضیکہ اس سند کے بھی جملہ رواۃ ثقہ اور ثبت ہیں۔

[2] امام بخاریؒ اسد بن موسیٰؒ کو مشہور الحدیث اور امام نسائیؒ اور ابن یونسؒ ثقہ کہتے ہیں۔ خلیلیؒ ان کو صالح کہتے ہیں اور ابن حبانؒ ان کو ثقات میں لکھتے ہیں۔ (تہذیب التہذیب جلد ۱ ص ۲۶۰) مولانا شمس الحقؒ صاحبؒ کا بیان ہے کہ وہ ثقہ اور صدوق تھے (التعلیق المغنی جلد ۱ ص ۵) امام حاکمؒ اور علامہ ذہبیؒ ایک سند کو جس میں اسد بن موسیٰؒ ہے علیٰ شرط مسلم صحیح کہتے ہیں (المستدرک مع التلخیص جلد ۳ ص ۱۳۹)

[3] مبارک پوری صاحبؒ لکھتے ہیں کہ مجھے کتب اسماء الرجال میں ان کا پتہ نہیں مل سکا۔ نہ معلوم وہ کون اور کیسا تھا؟ اگر ایسے مشہور اور ثقہ محدث کا پتہ بھی مبارکپوری صاحبؒ کو نہیں مل سکا تو ان کو کیا ملے گا؟ ان کا نام محمدؒ بن خازمؒ اور لقب ضریر تھا۔ حافظ ابن کثیرؒ ان کو احد مشائخ الحدیث الثقات المشہورین لکھتے ہیں۔ (البدایہ والنہایہ جلد ۱۰ ص ۲۲۵) علامہ ذہبیؒ ان کو احد الائمۃ الاعلام الثقات (میزان جلد ۳ ص ۳۶۲) اور ثقہ اور ثبت لکھتے ہیں (میزان جلد ۲ ص ۹۹) امام عجلیؒ

(باقی اگلے صفحہ پر دیکھئے)

عبدالرحمٰنؒ بن ابی بکرؓ سے اور وہ ابن ابی ملیکہؒ سے اور وہ حضرت عائشہؓ سے روایت کرتے ہیں۔ اس حدیث کا بعینہٖ مضمون وہی ہے جو حضرت عبداللہؓ بن عباسؓ کی روایت میں گذر چکا ہے (حافظ بدرالدین عینیؒ نے عمدۃ القاری جلد ۲ ص ۱۴۷ میں نقل کیا ہے)

تیسرا اعتراض: مبارکپوری صاحبؒ لکھتے ہیں کہ اس حدیث کی سند میں اضطراب ہے کیونکہ پیش کردہ سندوں میں عن ابن عباس عن النبی صلی اللہ علیہ وسلم ..... الخ ہے۔

(بقیہ پچھلا صفحہ) یعقوبؒ بن سفیانؒ اور نسائیؒ ان کو ثقہ کہتے ہیں۔ ابن خراشؒ ان کو صدوق کہتے ہیں کہ وہ ثقہ اور متقن تھے۔ ابن سعدؒ ان کو ثقہ اور کثیر الحدیث کہتے ہیں (تہذیب التہذیب جلد ۹ ص ۱۳۷) حافظ ابن حجرؒ ان کو ثقہ کہتے ہیں (تقریب ص ۳۱۸) علامہ خطیبؒ نے ان کا پورا ترجمہ نقل کیا ہے (بغدادی جلد ۵ ص ۲۴۲)

ے جمہور محدثینؒ واقعی ان کی تضعیف کرتے ہیں مگر ابن عدیؒ کہتے ہیں کہ ان کی حدیثیں لکھی جا سکتی ہیں۔ امام ساجیؒ ان کو صدوق کہتے ہیں اور فرماتے ہیں کہ ان میں ضعف ہے مگر قابل برداشت ہے۔ فیہ ضعف یحتمل۔ ابن حبانؒ ان کی توثیق کی طرف مائل ہیں۔ ان کے الفاظ یہ ہیں ینفرد عن الثقات ما لا یشبہ حدیث الاثبات یعنی وہ ثقہ راویوں سے ایسی روایات میں منفرد ہوتے ہیں جو اثبات یعنی ثقہ اور ثبت راویوں کی روایات کے مشابہ نہیں ہوتیں کم ہوتی ہیں۔ (تہذیب التہذیب جلد ۶ ص ۱۳۶) امام ابن معینؒ نے ان کو ضعیف ابوحاتمؒ نے لیس بقوی فی الحدیث اور نسائیؒ نے لیس بثقہ اور متروک الحدیث کہا ہے لیکن مؤلف خیر الکلام نے ص ۴۷ وص ۴۸ میں الرفع والتکمیل ص ۸ کے حوالہ سے لکھا ہے کہ یہ جرح مفسر نہیں اور عام فقہاءؒ اور محدثینؒ کے نزدیک اس کا اعتبار نہیں۔ (محصلہ) البتہ امام بخاریؒ اور امام احمدؒ نے اس راوی کو منکر الحدیث کہا ہے۔ (تہذیب جلد ۶ ص ۱۳۶) لیکن مؤلف خیر الکلام لکھتے ہیں کہ اگر امام بخاریؒ کسی راوی کو منکر الحدیث کہیں تو اس سے روایت کرنا ان کے ہاں جائز نہیں۔ امام احمدؒ اور اس قسم کے لوگ کسی کو منکر کہیں تو اس سے یہ لازم نہیں آتا کہ وہ قابل احتجاج نہیں ہے۔ (بلفظہٖ ص ۴۹) اور ہم نے تو ان کو صرف شاہد کے طور پر پیش کیا ہے نہ کہ بطور احتجاج کے۔ اور مؤلف خیر الکلام ایک مقام میں لکھتے ہیں کہ ان (آثار) کے بعض راوی اگرچہ ضعیف ہیں مگر متابعت میں ذکر کرنے سے کوئی حرج نہیں ہے۔ (بلفظہٖ ص ۳۱۶)

ے ذہبیؒ ان کو امام فقیہ حجت فصیح اور بلند مرتبہ لکھتے ہیں اور کہتے ہیں کہ ان کی ثقاہت پر سب کا اتفاق اور اجماع ہے۔ (تذکرہ جلد ۱ ص ۹۱)

اور مسند بزار[1] کی روایت میں عن ابن عباسؓ عن ابیہ العباسؓ عن النبی ﷺ ...... الخ اس لیے یہ روایت قابلِ احتجاج نہیں ہو سکتی۔ (تحقیق الکلام جلد ۲ ص ۳ ملخصاً)

جواب: مبارکپوری صاحبؒ کو لفظ اضطراب تو آتا ہے، مگر افسوس کہ وہ حقیقتِ اضطراب سے ناواقف ہیں۔ محدثین کرامؒ کے نزدیک اضطراب کی چند شرطیں ہیں۔ ایک شرط یہ ہے کہ دونوں سندیں ہم پایہ اور ہم مرتبہ ہوں ورنہ اضطراب نہ ہوگا۔ صحیح قابل اخذ ہوگی اور ضعیف قابل رد ہوگی۔ (دیکھیے شرح نخبۃ الفکر ص ۹۴ وغیرہ) اور ہم نے حضرت ابن عباسؓ کی جو سندیں بیان کی ہیں وہ بالکل صحیح ہیں اور ایک ایک راوی ثقہ اور ثبت ہے اور مسند بزارؒ کی روایت میں قیس بن ربیع واقع ہے۔ امام بخاریؒ کا بیان ہے کہ امام وکیعؒ ان کو ضعیف کہتے تھے۔ (ضعفاء صغیر ص ۲۹) امام نسائیؒ اس کو متروک الحدیث لکھتے ہیں (ضعفاء صغیر نسائی ص ۵۱) امام ابوحاتمؒ اور امام یحییٰؒ اس کو لیس بالقوی اور ضعیف کہتے تھے۔ امام احمدؒ اس کو کثیر الخطاء اور ابن مدینیؒ و دارقطنیؒ اس کو ضعیف کہتے تھے (میزان الاعتدال جلد ۲ ص ۳) اور لطف یہ ہے کہ خود

---

[1] یہ روایت نصب الرایہ جلد ۲ ص ۸۵ میں بھی ذکر کی گئی ہے۔ اور مسند احمد جلد ۱ ص ۲۰۹، اور دارقطنی جلد ۱ ص ۱۵۳ وغیرہ میں بھی آتی ہے۔

[2] اگر کوئی صاحب حضرت ابن عباسؓ کی کم سنی کا بہانہ کرتے ہوئے ان کی روایت کے مرسل ہونے کا دعویٰ کرے تو یہ بھی باطل ہوگا۔ کیونکہ اگر بالفرض حضرت ابن عباسؓ کی روایت مرسل بھی ہو، تب بھی حضرات صحابہؓ کے مراسیل بالاتفاق حجت ہیں، جس کی پوری تفصیل اپنے مقام پر بیان ہوگی۔ انشاء اللہ العزیز۔ علاوہ بریں اس میں قدرے اختلاف ہے کہ آں حضرت صلی اللہ تعالیٰ علیہ وآلہ وسلم کی وفات کے وقت حضرت ابن عباسؓ کی عمر دس سال تھی یا پندرہ؟ مسند احمد جلد ۱ ص ۳۷۳ میں اور مستدرک جلد ۳ ص ۵۳۴ میں بسند قوی اور صحیح یہ روایت موجود ہے کہ آپ کی وفات کے وقت ان کی عمر پندرہ برس کی تھی اور اسی کو امام نوویؒ (جلد ۱ ص ۱۹۶) وغیرہ نے ترجیح دی ہے اور یہ روایت مرض الموت کی ہے۔ اس لیے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما کی کم سنی وغیرہ کے بہانے سے ان کی روایت کو مرسل قرار دینا مردود اور باطل ہوگا اور بخاری جلد ۲ ص ۷۵۳ کی روایت سے آپ کی وفات حسرت آیات کے وقت ان کی عمر دس سال ثابت ہے۔ واللہ تعالیٰ اعلم۔

مبارکپوری صاحبؒ بھی اس کو ضعیف اور کمزور بتاتے ہیں۔ (تحقیق الکلام جلد ۲ ص) اس لیے اس حدیث کے اضطراب کا دعویٰ قطعاً مردود اور باطل ہے۔ یہ حدیث بلا چون وچرا صحیح ہے۔ البتہ لا تسلم کا کوئی جواب نہیں ہے۔

چوتھا[1] اعتراض: مبارکپوری صاحبؒ لکھتے ہیں (اور اسی کو مؤلف خیر الکلام نے دوہرایا ہے ملاحظہ ہو ص ۲۶۴) کہ اس روایت سے یہ بات ثابت نہیں ہو سکتی کہ آں حضرت صلی اللہ تعالیٰ علیہ وآلہ وسلم سے سورۃ فاتحہ چھوٹ گئی اور مع ہذا آپ کی نماز درست ہو گئی بلکہ روایات سے ثابت ہے کہ آپ نماز پوری کیے بغیر حجرہ میں تشریف لے گئے تھے۔ تو یقیناً آپ نے وہاں نماز مکمل کی ہو گی اور اس دعویٰ پر یہ حدیث نقل کی ہے:

فما قضى النبي صلى الله عليه وسلم الصلوٰة حتى ثقل فخرج يهادى بين الرجلين۔

پس آپ نے ابھی نماز مکمل نہ کی تھی کہ آپ کے مرض میں اضافہ اور تیزی ہو گئی۔ سو آپ دو آدمیوں کا سہارا لے کر مسجد سے باہر تشریف لے گئے۔

اس میں حرف فاء ہے جو تعقیب بلا مہلہ کے لیے آتا ہے۔ لہٰذا اس روایت[2] سے ترک قرأت

---

[1] یہ روایت مشکل الآثار جلد ۱ ص ... اور المختصر ص ۴۹ و طحاوی جلد ۱ ص ۲۳۵ وغیرہ میں مروی ہے اور سنن الکبریٰ جلد ۳ ص ۸۱ کے الفاظ یہ ہیں فما قضى رسول الله صلى الله عليه وسلم الصلوٰة حتى ثقل جداً فخرج يهادى بين الرجلين وان رجليه لتخطان الارض فمات رسول الله صلى الله عليه وسلم ولم يوص۔ سو آپ نے نماز پوری نہ کی تھی۔ حتیٰ کہ آپ پر بیماری کا غلبہ ہو گیا۔ پس آپ دو آدمیوں کے سہارے سے تشریف لے گئے اور آپ کے پاؤں مبارک زمین پر گھسٹتے جاتے تھے۔ پس آپ کی وفات ہو گئی اور آپ نے کوئی وصیت نہ کی۔ فمات میں بھی حرف فاء ہے۔ کیا مبارکپوری صاحبؒ کی تحقیق میں مسجد سے نکلنے کے فوراً بعد آپ کی وفات ہو گئی تھی۔ یا چار پانچ دن کے بعد وفات ہوئی تھی؟ (دیکھئے البدایہ والنہایہ جلد ۵ ص ۲۲۵ وغیرہ) اگر ان کے نزدیک ہر مقام پر حرف فاء تعقیب بلا مہلہ کے لیے آتا ہے تو وہ إِذَا قُمْتُمْ إِلَى الصَّلٰوةِ فَاغْسِلُوا الآية میں اور إِذَا قَرَأْتَ الْقُرْآنَ فَاسْتَعِذْ بِاللّٰهِ میں اور إِذَا صَلَّيْتُمْ عَلَى الْمَيِّتِ فَأَخْلِصُوا لَهُ الدُّعَاءَ میں اور تزوج فلان فولد له وغیرہ وغیرہ مقامات میں کیا ارشاد فرمائیں گے؟ اور اگر ان مقامات میں حرف فاء تفصیل کے لیے ہے یا کسی اور مناسب

(بقیہ اگلے صفحہ پر دیکھئے)

سورۂ فاتحہ کا مسئلہ اور بصورت ترک تکمیلِ نماز کا ادعا صحیح نہیں ہے۔ (بمعناہ تحقیق الکلام جلد ۲ ص۱)

جواب: مبارک پوری صاحبؒ کا یہ دعویٰ کرنا کہ آپ نماز کی تکمیل کے بغیر مسجد سے باہر نکل کر تشریف لے گئے تھے نہ معلوم کس بات پر مبنی ہے؟ اس دعویٰ کا ثبوت تو کسی روایت سے نہیں مل سکتا۔ اس روایت سے تو اتنا ہی ثبوت ملتا ہے کہ نماز کی تکمیل سے قبل ہی آپ پر بیماری کا زور ہو گیا۔ اور اگر فخرج میں حرف فاء کو مبارکپوری صاحبؒ تعقیب بلامہلہ کے لیے سمجھتے ہیں اور اس پر اپنے دعوے کی بنیاد رکھتے ہیں تو یہ ان کو سراسر مضر پڑے گا۔ جیسا کہ ظاہر ہے۔ علاوہ بریں اس کی تصریح موجود ہے کہ آں حضرت صلی اللہ تعالیٰ علیہ وآلہ وسلم نے نہ صرف یہ کہ نماز ہی پوری کی، بلکہ حضرات صحابہ کرامؓ کو نماز کے بعد خطاب بھی فرمایا تھا۔ چنانچہ ایک روایت میں یوں الفاظ آتے ہیں: فصلّٰی لھم وخطبھم (بخاری ۲ ص۸۵۱) آپ نے حضرات صحابہ کرامؓ کو نماز پڑھائی اور ان سے خطاب فرمایا

اور ایک روایت میں یوں آتا ہے:

ثم خرج الی الناس فصلّٰی لھم وخطبھم۔ (بخاری ۲ ص ۶۳۹ و فتح الباری) پھر آں حضرت صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم (اپنے حجرہ سے) لوگوں کی طرف نکلے ان کو نماز پڑھا کر ان سے خطاب

(بقیہ حاشیہ پچھلا صفحہ) معنیٰ میں مستعمل ہوا ہے تو فخرج میں حرف فاء سے کوئی ایسا مناسب اور موزوں معنیٰ کیوں نہیں لیا جا سکتا تاکہ دوسری صحیح روایات سے تعارض پیدا نہ ہو اور اگر مبارکپوری صاحبؒ اس پر بضد ہیں کہ حرف فاء تعقیب بلامہلہ کے لیے ہی ہونا چاہیے تو کامیابی پھر بھی جمہور کی ہوگی۔ کیونکہ قرآن کریم کی آیت واذا قرئ القراٰن فاستمعوا لہ... الاٰیۃ اور حدیث اذا قرأ الامام فانصتوا میں بھی ان کے اصول کے تحت حرف فاء تعقیب بلامہلہ کے لئے ہوگا۔ اور مطلب یہ ہوگا کہ امام کی قرأت شروع کرنے کے فوراً بعد مقتدیوں پر استماع اور انصات واجب ہے۔ اور سبھی جانتے ہیں کہ امام کی قرأت سورۂ فاتحہ سے شروع ہوا کرتی ہے۔ نہ کہ ما زاد علی الفاتحہ سے۔ لہٰذا مقتدیوں پر سورۂ فاتحہ کا پڑھنا ممنوع ٹھہرا۔ اور قرأت کو ما زاد علی الفاتحہ پر حمل کرنے کی رٹ باطل ہو گئی ؎

خوش نوایانِ چمن کو غیب سے مژدہ ملا
دام میں صیاد اپنے مبتلا ہونے کو ہے

جلد ۱۰ ص ۱۴۰ و عمدۃ القاری جلد ۱۰ ص ۱۷۱) فرمایا۔

اس صحیح اور صریح روایت سے معلوم ہوا کہ آپؐ نے جماعت کے ساتھ نماز کی تکمیل کی۔ اور پھر حضرات صحابہ کرامؓ سے خطاب بھی کیا۔ اور جو روایت مبارکپوری صاحبؒ نے پیش کی ہے۔ اس سے ان کا مدعیٰ ثابت نہیں ہوتا۔ کیونکہ اس کا مفہوم تو صرف اتنا ہے کہ تکمیل نماز سے قبل ہی آپ کا مرض بڑھ گیا تھا۔ اور اس کا کون منکر ہے؟ اور نماز اور خطاب سے فارغ ہونے کے بعد آپؐ دو آدمیوں کے سہارے سے جیسے تشریف لائے تھے۔ ویسے ہی واپس تشریف لے گئے۔ اگر مبارک پوری صاحبؒ یہ سمجھے بیٹھے ہیں کہ بحالت نماز مرض بڑھ نہیں سکتا یا تکمیل نماز کے بغیر ہی دو آدمیوں کے سہارے پر گھر جانا ہی متحقق ہو سکتا ہے۔ تو ہماری بلا سے مبارک پوری صاحبؒ جانیں اور ان کی سمجھ۔ بہر صورت مسئلہ یہ ثابت ہو چکا ہے کہ آں حضرت صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے آخری باجماعت نماز میں سورۃ فاتحہ مکمل یا اس کا اکثر حصہ نہیں پڑھا تھا۔ معہذا آپؐ کی نماز صحیح ہو گئی تھی۔ وہو المطلوب۔

پانچواں اعتراض: مولوی محمد صادق صاحب سرگودھوی (غیر مقلد) لکھتے ہیں کہ اگر آپؐ نے امام ہونے کے باوجود سورۃ فاتحہ ترک کی تو حنفیہ بھی کہتے ہیں کہ امام پر سورۃ فاتحہ واجب ہے تو حنفیہ کا اعتراض جیسا کہ اہل حدیث پر ہے۔ ویسا ہی ان حنفیوں پر بھی ہے۔ (خیر الکلام ص ۶۰)

جواب: یوں معلوم ہوتا ہے کہ مولوی صاحب نے فقہائے حنفیہ کی کتابیں دیکھنے کی زحمت گوارا نہیں کی۔ ورنہ وہ اس قسم کی سطحی بات ہرگز تحریر نہ کرتے۔ علماء احناف کے نزدیک سورۃ فاتحہ کی قرأۃ اس امام پر ضروری ہے جو اوّل سے آخر تک امامت کا فریضہ ادا کر رہا ہو۔ اگر کسی نے اس حالت میں امام کی اقتداء کی ہو کہ امام سورۃ فاتحہ پڑھ چکا ہو یا رکوع کے لیے سر جھکا چکا ہو۔ اور امام کو حدث کو لاحق ہو گیا ہو تو ایسے مقتدی کو امام اپنا نائب اور خلیفہ بنا سکتا ہے اور ایسے نائب امام کی نماز بغیر سورۃ فاتحہ پڑھے بھی جائز اور صحیح ہے۔ اور رکوع کی حالت میں بھی مسبوق کو نائب اور خلیفہ بنانا جائز ہے۔ (دیکھئے ہدایہ جلد ۱ ص ۱۱۰ وغیرہ) اور حضرت ابن عباسؓ کی حدیث کا بھی یہی مطلب ہے کیونکہ آں حضرت صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے پہلے حضرت ابوبکرؓ کی اقتداء کی تھی اور بعد کو آپ نے امامت کا فریضہ ادا کیا تھا جیسا کہ اس کی پوری تشریح

پہلے ہو چکی ہے۔ لہٰذا حنفیوں پر تو مطلقاً اعتراض وارد نہیں ہو سکتا۔ ہاں البتہ اپنے آپ کو اہلِ حدیث کہلانے والے اور صَلُّوا كَمَا رَأَيْتُمُوْنِيْ أُصَلِّيْ کی حدیث پر عامل ہونے کے مدعی اس صحیح حدیث سے کبھی عہدہ برآ نہیں ہو سکتے اور شاید کہ تا قیامت ہو بھی نہ سکیں۔ خلاصہ کلام یہ ہے کہ دیگر صحیح قولی احادیث کی طرح آں حضرت صلی اللہ تعالیٰ علیہ وآلہ وسلم کی اس صحیح اور فعلی حدیث سے بھی یہ امر ثابت ہو گیا ہے کہ آں حضرت صلی اللہ تعالیٰ علیہ وآلہ وسلم کی آخری باجماعت نماز بغیر سورۃ فاتحہ پڑھے بھی درست اور صحیح ہو گئی تھی اور یہی جمہور اہلِ اسلام کا مسلک ہے اور آپ کے آخری فعل کے حق اور درست ہونے میں کس کو کلام ہو سکتا ہے؟ کیونکہ اس کے بعد نسخ کا احتمال بھی نہیں ہو سکتا۔ اس لیے ازراہِ انصاف خدا تعالیٰ سے ڈر کر فریقِ ثانی کو اپنے اس فتویٰ پر نظرِ ثانی کرنی چاہیے کہ جو شخص امام کے پیچھے ہر رکعت میں سورۃ فاتحہ نہ پڑھے۔ اس کی نماز ناقص ہے، کالعدم ہے، بیکار ہے اور باطل ہے۔ آں حضرت صلی اللہ تعالیٰ علیہ وآلہ وسلم کے اس آخری عمل کے پیشِ نظر یہ فتویٰ کس بے باکی اور جسارت پر مبنی ہے۔ اللہ تعالیٰ ہماری کوتاہیاں اور لغزشیں معاف کرے۔

گیارھویں حدیث: امام احمدؒ بن منیعؒ فرماتے ہیں کہ ہم سے اسحٰق[۱] ازرقؒ نے بیان کیا وہ فرماتے ہیں کہ ہم سے سفیان ثوریؒ[۲] اور شریکؒ[۳] نے بیان کیا۔ وہ دونوں روایت

---

۱ علامہ ذہبیؒ ان کو الحافظ اور الحجۃ لکھتے ہیں۔ (تذکرہ جلد ۲ صفحہ ۶۰)

۲ حافظ ابن حجرؒ لکھتے ہیں کہ وہ ثقہ تھے۔ (تقریب ص ۳۲۵) علامہ ذہبیؒ ان کو الحافظ اور الثقہ لکھتے ہیں (تذکرہ جلد ۲ صفحہ ۲۹۴) حافظ ابن کثیرؒ ان کو احد الائمۃ الحدیث لکھتے ہیں۔ (البدایہ والنہایہ جلد ۱۰ ص ۲۲۷)

۳ سفیان ثوریؒ کا ترجمہ مقدمہ میں گزر چکا ہے اور شریکؒ ان کے متابع ہیں۔ علامہ ذہبیؒ ان کو الحافظ الصادق اور احد الائمہ لکھتے ہیں۔ (میزان جلد ۲ ص ۲۹۶) نیز لکھتے ہیں کہ وہ احد الائمۃ الاعلام، حسن الحدیث، امام، فقیہ اور کثیر الحدیث تھے وحدیثہ من اقسام الحسن (تذکرہ ۱ ص ۲۱۴) علامہ ابن سعدؒ ان کو ثقہ مامون اور کثیر الحدیث کہتے ہیں۔ (تہذیب التہذیب جلد ۴ ص ۳۳۶) یہ یاد رہے کہ

(باقی اگلے صفحہ پر دیکھئے)

کرتے ہیں موسیٰ بن ابی عائشہؓ سے۔ وہ عبداللہؓ بن شدادؓ سے اور وہ حضرت جابرؓ بن عبداللہؓ سے روایت کرتے ہیں۔ وہ فرماتے ہیں کہ

قال النبی صلی اللہ علیہ وسلم من کان لہ امام فقرأۃ الامام لہ قرأۃ (بحوالہ فتح القدیر جلد ۱ ص ۲۳۹)

آں حضرت صلی اللہ تعالیٰ علیہ وآلہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ جس آدمی نے امام کی اقتدا کی تو امام کی قرأۃ مقتدی کو بس ہے۔

اس روایت[۳] میں جہری اور سری نماز کی کوئی قید موجود نہیں ہے۔ اس لیے یہ اپنے عموم پر ہے کیونکہ اس میں حرف مَنْ شرطیہ ہے جو عموم کے لیے ہے۔ بخلاف لا صلوٰۃ لمن لم یقرأ کے کہ وہاں حرف من موصولہ یا موصوفہ ہے جس میں عموم و خصوص دونوں آسکتے ہیں۔ اور اس کا مطلب بالکل واضح ہے کہ امام کے پیچھے جب کسی نے اقتدا اختیار کر لی ہو تو مقتدی کو جدا اور الگ قرآت کرنے کی مطلقاً ضرورت نہیں ہے۔ بلکہ امام کا پڑھنا گویا مقتدی کا پڑھنا ہے

(بقیہ حاشیہ پچھلا صفحہ) ہم نے شریکؒ کو صرف متابع کے طور پر پیش کیا ہے۔ استدلال امام سفیان ثوریؒ سے ہے جو ثقہ اور ثبت تھے۔ (ترجمان الحدیث ص ۲۱ ماہ جولائی ۷۳ء میں تضدوات کے چند نمونے کا عنوان قائم کر کے اور ہماری اس عبارت سے لفظ متابع ہضم کر کے جو اعتراض کیا ہے، علمی طور پر خالص بددیانتی ہے۔ ہم نے سفیان ثوریؒ کو ان کا متابع نہیں بتایا بلکہ ان کو سفیان ثوریؒ کا متابع کہا ہے مگر مضمون نگار نے ص۲۲ میں دجل کا ثبوت دیا ہے۔ چنانچہ وہ لکھتے ہیں جبکہ سفیان ثوریؒ اس کا متابع موجود ہے۔

[۱] امام حمیدانؒ ان کو ثقات میں شمار کرتے ہیں۔ امام ابن معینؒ اور یعقوبؒ بن سفیانؒ ان کو ثقہ کہتے ہیں۔ اور ابن حبانؒ ان کو ثقات میں لکھتے ہیں۔ (تہذیب التہذیب جلد ۱۰ ص ۳۵۲) حافظ ابن حجرؒ ان کو ثقہ عابد لکھتے ہیں۔ (تقریب ۳۶۷) امام بخاریؒ ان کو ثقہ کہتے ہیں (جلد ۲ ص ۴۳۳)

[۲] یہ حضرت ام المومنین میمونہؓ کے بھانجے تھے (بخاری جلد ۱ ص ۴۷ و ۴۷) حافظ ابن عبدالبرؒ لکھتے ہیں کہ آں حضرت صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کے زمانہ میں ان کا تولد ہوا تھا۔ امام عجلیؒ، خطیبؒ، ابو زرعہ، نسائیؒ، ابن سعدؒ اور واقدیؒ سب ان کو ثقہ کہتے ہیں۔ ابن حبانؒ ان کو ثقات میں لکھتے ہیں۔ تہذیب التہذیب جلد ۵ ص ۲۵۲)

[۳] یہ روایت شرح نقایہ جلد ۱ ص ۸۳ آثار السنن جلد ۱ ص ۸۷، روح المعانی جلد ۹ ص ۱۳۴، تحقیق الکلام جلد ۲ ص ۱۴۸، ابکار المنن ص ۱۹۰ فتح الملہم جلد ۲ ص ۲۳، حاشیہ طحاوی جلد ۱ ص ۱۲۸، اعلاء السنن جلد ۴ ص ۹۳ اور بغیۃ الالمعی جلد ۲ ص ۸ وغیرہ کتابوں میں اجمالاً و تفصیلاً نقل کی گئی ہے۔

اور ما زاد علی الفاتحہ کی قرأت میں فریق ثانی کا کلی اتفاق ہے کہ اس میں امام کی قرأت مقتدی کی قرأت سمجھی جائے گی اور مقتدی پر الگ قرأت لازم نہیں ہے۔

حضرت جابرؓ بن عبداللہؓ جلیل القدر صحابی تھے۔ اور باقی سب راوی ثقہ اور ثبت ہیں۔ جیسا کہ آپ ملاحظہ کر چکے ہیں اور مبارکپوری صاحبؒ نے اپنی انتقاد طبع کے تحت گو آئیں بائیں شائیں سے کام لینے اور گلو خلاصی کی ناکام کوشش کی ہے، لیکن اتنی بات تسلیم کیے بغیر وہ کوئی مفر نہیں پاتے کہ بظاہر صحیحؒ ہے کیونکہ موصول بھی ہے۔ اس کے تمام رواۃ بالاتفاق ثقہ بھی ہیں اور کوئی علت قادحہ بھی بظاہر اس میں نہیں پائی جاتی ..... الخ (بلفظہٖ تحقیق الکلام جلد ۲ ص ۱۴۸)

انصاف کا تقاضا تو یہ تھا کہ جب تمام راوی ثقہ ہیں اور سند بھی موصول ہے۔ اور بظاہر کوئی علت قادحہ بھی اس میں پائی نہیں جاتی۔ تو مبارکپوری صاحب جناب رسولِ خدا صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کی صحیح حدیث کے سامنے سر تسلیم خم کر دیتے۔ اور یا صحیح تسلیم کرتے ہوئے۔ اس کا کوئی معقول جواب دیتے۔ مگر چونکہ اپنی رائے کو ترک نہیں کرنا۔ اس لیے ان حضرات کی طرف سے صحیح حدیث کو معلول ٹھہرانے کی کوشش اور سعی کی گئی ہے۔ مبارک پوری صاحبؒ نے جو کچھ کہا اس کو آپ پڑھ لیں اور ساتھ ساتھ جواب بھی ملاحظہ کرتے جائیں۔

پہلا اعتراض: مبارکپوری صاحبؒ لکھتے ہیں (اور یہی اعتراض خیر الکلام از ص ۴۷۱ تا ۴۷۵ میں پانی کی طرح بلویا گیا ہے) کہ یہ روایت مرفوع نہیں ہے اور اس کی دلیلیں یہ ہیں:

(۱) اگر یہ طریق مرفوع ہوتا۔ تو محدثین کرامؒ، امام سفیان ثوریؒ، شریکؒ اور جریرؒ کو امام ابو حنیفہؒ کا مخالف ہرگز نہ بتاتے۔

(۲) اگر یہ روایت صحیح ہوتی تو امام طحاویؒ، علامہ ماردینیؒ، حافظ زیلعیؒ اور محدث عینیؒ وغیرہ محل احتجاج میں ضرور اس کو پیش کرتے۔

(۳) حافظ ابن ہمامؒ نے مسند احمدؒ بن منیعؒ کے جس نسخہ سے یہ روایت نقل کی ہے۔ اس میں کاتب کی غلطی کی وجہ سے عبداللہؓ بن شدادؓ کے بعد عن جابرؓ کا جملہ زیادہ ہو گیا ہے۔ اور

---

[1] نواب صدیق حسن خان صاحبؒ مسند احمد بن منیع کے طریق سے دو سندوں کا حوالہ دیتے ہوئے لکھتے ہیں کہ والاسناد الاول صحیح علیٰ شرط الشیخین والثانی علیٰ شرط مسلم اھ (ھدایۃ السائل ص ۲۰۲)

حقیقت میں یہ روایت مرسل ہے۔ (بمعناہ تحقیق الکلام جلد ۲ ص ۱۴۰ وابکار المنن ص۱۶۰)

جواب: مبارکپوری صاحب کا یہ دعویٰ بمعہ پیش کردہ دلائل کے ازسرتاپا لغو اور بیہودہ ہے۔ یہ روایت مرفوع ہے مرسل نہیں ہے، ترتیب وار ہر شق کا جواب ملاحظہ کیجئے:

پہلی شق کا جواب: یہ دعویٰ کرنا کہ جریرؒ، سفیانؒ اور شریکؒ وغیرہ امام ابوحنیفہ رح کی مخالفت کرتے ہوئے اس کو مرسل روایت کرتے ہیں باطل ہے، چنانچہ علامہ آلوسیؒ ان کی روایت کو کئی سندات کے ساتھ نقل کرکے لکھتے ہیں۔ (علامہ آلوسیؒ ثقہ ناقل ہیں ان کو متأخر آدمی کہکر ٹال دینا جیساکہ مؤلف خیر الکلام نے ص۲۷۳ میں کیا ہے نرے تعصب پر مبنی ہے اور اہل علم کی شان کے لائق نہیں ہے)

فھولاء سفیانؒ وشریکؒ وجریرؒ وابو الزبیرؒ رفعوہ بالطرق الصحیحۃ فبطل عدھم فیمن لم یرفعہ۔ (روح المعانی جلد ۹ ص۱۳۲)

سو یہ امام مثلاً سفیان ثوریؒ، شریکؒ، جریرؒ اور ابو الزبیرؒ (وغیرہ) صحیح اسانید کے ساتھ اس روایت کو مرفوع نقل کرتے ہیں جو لوگ یہ دعویٰ کرتے ہیں کہ انھوں نے اس کو مرفوع روایت نہیں کیا۔ ان کا قول سراسر باطل ہے۔

اور اسی طرح فتح القدیر جلد ۱ ص ۲۳۹ میں بھی ہے۔

اس سے معلوم ہوا کہ امام بیہقی رح دارقطنی رح اور ابن عدیؒ وغیرہ کا یہ دعویٰ کہ اس روایت کو تنہا حضرت امام ابوحنیفہ رح ہی مرفوع بیان کرتے ہیں اور اس رفع میں ان کا اور کوئی ساتھی نہیں محض باطل ہے اور امام ابوحنیفہ رح سے اس روایت کو نقل کرنے والے بھی اس کو مرفوع ہی بیان کرتے ہیں۔ چنانچہ امام بیہقی رح لکھتے ہیں:

ھذا الحدیث رواہ جماعۃ من اصحاب ابی حنیفۃؒ موصولاً وخالفھم عبد اللہؒ بن المبارکؒ الامام فرواہ عنہ مرسلاً۔ (کتاب القرأۃ ص ۱۰۱)

امام ابوحنیفہؒ کے اصحاب اور تلامذہ میں سے ایک بہت بڑی جماعت نے اس کو مرفوع اور موصول بیان کیا ہے لیکن امام عبد اللہؒ بن مبارکؒ اس کو مرسل روایت کرتے ہیں۔

اسحٰق ازرقؒ، ابویوسفؒ اور یونسؒ بن بکیرؒ وغیرہ کی روایتیں دارقطنی جلد ۱ ص۱۲۲ اور ص۱۲۳ میں مذکور ہیں اور محمد بن الحسنؒ، محمدؒ بن الفضلؒ البلخیؒ، سلیمؒ بن مسلمؒ، مکیؒ بن ابراہیمؒ، علیؒ بن یزید الصدائیؒ

اور مروانؒ بن شجاعؒ کی روایتیں عقود الجواہر المنیفہ فی ادلۃ الاحکام لمذہب ابی حنیفہؒ میں مذکور ہیں۔ (کذا فی الدلیل المبین ص ۹۵ لمولانا المحدث محمد حسن فیض پوریؒ) لہذا اسحاق ازرقؒ کی روایت کو شاذ، غلط اور ضعیف قرار دینا جیسا کہ مؤلف خیر الکلام نے کیا ہے۔ (ملاحظہ ہو ص ۴۷۲ و ۴۷۳) محض بے بنیاد امر اور نرا باطل دعویٰ ہے۔ علاوہ ازیں مؤلف خیر الکلام خود ایک مقام پر لکھتے ہیں کہ جب ان کا ثقہ ہونا ثابت ہوا تو اس صورت میں ان کا تفرد کوئی مضر نہیں ہوگا..... الخ ص ۲۸۸ اور اسحٰق ازرقؒ تو چوٹی کے ثقہ اور ثبت ہیں۔ پھر تفرد کا ناکام بہانہ کون سنتا ہے اور کون ان کی اس صحیح زیادت کو شاذ مانتا ہے؟

اور دوسرے مقام پر امام بیہقیؒ لکھتے ہیں:

وھکذا رواہ جماعۃ عن ابی حنیفۃؒ موصولاً۔ (سنن الکبریٰ ج ۲ ص ۱۵۹)

اسی طرح امام ابو حنیفہؒ سے ایک بڑی تعداد نے اس کو مرفوع اور موصول بیان کیا ہے۔

اور نواب صدیق حسن خانؒ لکھتے ہیں کہ

وبالجملہ ایں حدیث بطرق متعددہ ارسالاً و رفعاً مروی شدہ و دروی دلالت است برآنکہ مؤتم در پس امام فاتحہ نخواند زیراکہ قرأت امام قرأت مؤتم است اھ (ہدایت السائل ص ۲۰۰)

خلاصۂ کلام یہ ہے کہ یہ حدیث متعدد طرق سے مرسلاً اور مرفوعاً مروی ہے اور اس میں دلیل ہے کہ مقتدی امام کے پیچھے فاتحہ نہ پڑھے کیونکہ امام کی قرأت مقتدی کی قرأت ہے ۔۔ الخ

پہلے اس کی تحقیق گزر چکی ہے کہ ثقہ راوی کی زیادت بالاتفاق مقبول ہوتی ہے۔ خواہ وہ زیادت متنِ حدیث میں ہو۔ خواہ سند میں اور جب حدیث کے مرفوع اور مرسل ہونے کا جھگڑا ہو تو وہ حدیث جمہور علماء کے نزدیک مرفوع ہی سمجھی جائے گی۔ نیز مثبت کو نافی پر ترجیح ہوگی۔ اگر بالفرض اس زیادت کو تنہا حضرت امام ابو حنیفہؒ ہی بیان فرماتے۔ تب بھی حضرات محدثین کرامؒ کے طے شدہ اصول اور ضوابط کے تحت یہ روایت مرفوع اور موصول ہی ہوتی حالانکہ جریرؒ، سفیانؒ، شریکؒ اور ابو الزبیرؒ وغیرہ سب ثقہ راوی اس کو مرفوع اور موصول بیان کرتے ہیں اور امام ابو حنیفہؒ سے بھی ایک بڑی جماعت اس کو مرفوع اور موصول ہی روایت کرتی ہے۔ امام ابن مبارکؒ چونکہ اس کو مرسل بیان کرتے ہیں اور دوسرے اس کو مرفوع

بیان کرتے ہیں۔ اس لیے قاعدہ کے مطابق مرفوع اور متصل ہی کو ترجیح ہے۔ نہ کہ اس کے مرسل ہونے کو علاوہ ازیں خود امام ابن مبارکؒ کا بیان ہے کہ جب امام ابو حنیفہؒ اور سفیان ثوریؒ کسی بات پر متفق ہو جائیں تو میرا قول بھی وہی ہو گا (تبییض الصحیفہ ص۱۶) اور امام ابو حنیفہؒ اور امام سفیان ثوریؒ دونوں اس روایت کو مرفوع اور موصول بیان کرتے ہیں اور امام حاکمؒ علامہ شمس الدین ابن قدامہؒ، علامہ ماردینیؒ، حافظ ابن ہمامؒ، ملا علی القاریؒ اور علامہ آلوسیؒ وغیرہ اس روایت کو مرفوع ہی نقل کرتے ہیں۔ اور یہ مثبت بھی ہیں اور مبارک پوری صاحبؒ لکھتے ہیں،

فقول ہؤلاء العارفین مقدم علی من لم یعرف۔ (ابکار المنن ص۱۲۸) سو ان جاننے والوں کی بات نہ جاننے والوں کی بات سے بہرحال مقدم ہے۔

اس لیے مبارکپوری صاحبؒ کے اعتراض کی یہ شق قطعاً باطل اور مردود ہے اور اسی طرح مؤلف خیر الکلام (ص ۲۷۳) کا اس کے جواب سے عاجز ہو کر اس کو مصادرہ علی المطلوب کہہ کر گلو خلاصی کرنا بے معنی بات ہے کیونکہ دعوے یہ ہے کہ عن جابرؓ کا جملہ مسند احمدؒ بن منیعؒ میں مذکور ہے اور دلیل یہ ہے کہ یہ مسلّم ثقات اس کو اسی طرح نقل کرتے ہیں۔ اگر مؤلف مذکور کا یہ خانہ ساز مصادرہ مضر ہے تو تمام کتب حدیث میں یہ جاری ہے کما لا یخفیٰ تو پھر کوئی روایت صحیح نہیں ہو سکتی بھلا ایسے ناکام بہانوں سے صحیح حدیث ضعیف قرار دی جا سکتی ہے؟ معاذ اللہ تعالیٰ۔

دوسری شق کا جواب: جمہور اہل اسلام کے پاس قرآن کریم کی آیت اور حضرت ابو موسیٰ الاشعریؓ، حضرت ابو ہریرہؓ اور حضرت انسؓ بن مالک وغیرہ کی صحیح اور مرفوع حدیثیں موجود ہیں۔ لہٰذا اگر امام طحاویؒ وغیرہ ائمہ نے حضرت جابرؓ کی یہ روایت اپنے استدلال میں پیش نہیں کی۔ تو کیا بغیر اس روایت کے ان کی ضرورت اور حاجت پوری نہیں ہو سکتی تھی؟ اور کیا ان کے دعوے کی صرف یہی ایک حدیث دلیل رہ گئی تھی کہ بغیر اس کے بیان کرنے کے ان کا دعویٰ ناکام اور تشنہ رہتا؟ ہاں جہاں اور حدیثیں موجود ہیں۔ وہاں ان کی دلیل ایک یہ حدیث بھی ہے اور فرض کر لیجئے کہ ان حضرات کو مسند احمدؒ بن منیعؒ کی سند سے اس روایت کا علم ہی نہ تھا تو کیا اس سے یہ لازم آتا ہے کہ سرے سے یہ حدیث ہی نہ ہو؟ کسی حدیث کا کسی موقع پر بیان نہ کرنا اس کے عدم کی دلیل کیسے بن گئی؟

علاوہ ازیں امام ابن قدامہؒ، ماردینیؒ، ابن ہمامؒ، ملا علی قاریؒ اور آلوسیؒ وغیرہ باقاعدہ اس روایت سے استدلال کرتے ہیں اور اس کو مرفوع اور موصول ہی سمجھتے ہیں اور اسی طرح اس کو نقل بھی کرتے ہیں۔

مؤلف خیر الکلام ص ۲۷۳ میں (وبنحوہ فی ص ۲۳۸) لکھتے ہیں کہ باقی رہا ارسال اور وصل کا اختلاف اس کے متعلق بیان ہو چکا ہے کہ راوی اسے مختلف حالات کی بنا پر کبھی متصل بیان کر دیتے ہیں اور کبھی مرسل۔ یہ اختلاف کوئی مضر نہیں۔ ثقہ کی زیادتی اس جگہ قابل قبول ہے۔ انتہٰی اور یہی ہم کہتے ہیں۔

تیسری شق کا جواب: اگر مسند احمدؒ بن منیعؒ کے نسخہ میں جو حضرات محدثین کرامؒ کے نزدیک متداول کتاب تھی۔ کاتب نے عن جابرؓ کے الفاظ زیادہ کر دیے تھے تو نہ معلوم بخاری، مسلم، نسائی، ابوداؤد اور دیگر حدیث کی کتابوں میں کاتبوں نے کیا کچھ شگوفے کھلائے ہوں گے؟ اور اللہ تعالیٰ ہی بہتر جانتا ہے کہ انھوں نے حذف و اضافہ اور قطع و برید کر کے اصل مضمون کو کیا سے کیا کر دیا ہوگا؟ پھر حدیث کی کتابوں پر کیا اعتبار ہو سکتا ہے؟ اور شاید اسی بداعتقادی کی وجہ سے بیشتر غیر مقلد حضرات (مثلاً عبداللہ چکڑالوی، اسلم جیراجپوری، غلام احمد پرویز، ڈاکٹر احمد الدین وغیرہ) انکار حدیث کے فتنہ میں گرفتار اور مبتلا ہوتے ہیں۔ اور شاید تصحیح حدیث کی یہ شرط ہو کہ اگر مبارکپوری صاحبؒ اور ان کی جماعت کسی حدیث کو صحیح قرار دیں تو صحیح ہوگی۔ ورنہ اس کو ردی کی ٹوکری میں پھینک دیا جاتا۔ العیاذ باللہ تعالیٰ۔

محترم جب سند کے تمام راوی بالاتفاق ثقہ اور ثبت ہیں۔ اور بظاہر اس میں کوئی علت قادحہ بھی نہیں اور موصول بھی ہے تو بلاوجہ محض ہوائے نفسانی کے لیے کاتب بیچارے پر کیوں ایسا سنگین الزام عائد کیا جاتا ہے؟ اور کیوں طے شدہ قواعد[1] اور اصول سے انحراف کیا جاتا ہے؟ فتح الباری کے حوالہ سے

---

[1] مثلاً یہ کہ سند کے جملہ رواۃ بالاتفاق ثقہ ہیں۔ سند موصول ہے۔ بظاہر اس میں کوئی علت قادحہ بھی نہیں پائی جاتی۔ ثقہ کی زیادت مقبول ہوتی ہے۔ موصول اور مرسل کے جھگڑے میں حدیث مرفوع ہی سمجھی جائیگی۔ مثبت کو نافی پر ترجیح ہوتی ہے۔ عدم علم عدم شے کی دلیل نہیں ہوتی۔ عارف کے قول کو جاہل کے قول پر ترجیح ہوتی ہے۔ اسقاط اور ادراج محض احتمال سے ثابت نہیں ہو سکتا وغیرہ وغیرہ یہ تمام اصول ایسے ہیں جو خود مبارکپوری صاحبؒ کے نزدیک بھی مسلم ہیں۔ مگر افسوس کہ عملی طور پر وہ سب سے گریز کرتے ہیں۔ فوا اسفا۔

یہ بات نقل کی جا چکی ہے کہ ادراج و اسقاط محض احتمال سے ثابت نہیں ہو سکتا۔ اور قاضی شوکانی لکھتے ہیں کہ ادراج مجرد دعوے سے ثابت نہیں ہو سکتا۔ (نیل الاوطار جلد ۱ ص ۲۵۱)

حضرات! یہ ہے مبارکپوری صاحب کا انصاف اور دیانت؟ اس سے بڑھ کر تعصب اور کیا ہو سکتا ہے؟

بصورت مرسل بھی یہ روایت حجت ہے:

اگر یہ بھی تسلیم کر لیا جائے کہ یہ روایت مرسل ہے، تب بھی جمہور کا احتجاج اس روایت سے صحیح ہوگا۔ مرسل کی حجیت کے بارے میں ہم پہلے کچھ بحث با حوالہ کر چکے ہیں۔ امام ترمذیؒ لکھتے ہیں کہ بعض اہل علم کے نزدیک حدیث مرسل بھی حجت ہے۔ (کتاب العلل جلد ۲ ص ۲۳۹) امام نوویؒ لکھتے ہیں کہ امام مالکؒ، ابو حنیفہؒ، امام احمدؒ اور اکثر فقہائے کرامؒ کا یہ مسلک ہے کہ حدیث مرسل بھی حجت ہے۔ (مقدمہ نووی ص ۱۷) علامہ جزائریؒ کا بیان ہے کہ علماء سابقین میں امام سفیان ثوریؒ، امام مالکؒ اور امام اوزاعیؒ وغیرہ مرسل حدیث کو بھی حجت سمجھتے تھے۔ (توجیہہ النظر ص ۲۴۵ و الحطہ فی ذکر الصحاح الستۃ ص ۱۰۹ نواب صاحبؒ) اور نواب صاحبؒ لکھتے ہیں لیکن اعلال بارسال موجب ترک او نیست، زیرا کہ قبول مراسیل مذہب جمعے از فحول علماء اصول است۔ (دلیل الطالب ص ۳۲۵) اور ایسے مرسل کے حجت ہونے میں جس کی تائید کسی اور حدیث سے ہوتی ہو۔ گو وہ مرسل ہی کیوں نہ ہو۔ سب کا اتفاق ہے۔ چنانچہ امام بیہقیؒ، امام نوویؒ، حافظ ابن القیمؒ اور مبارکپوری صاحبؒ نے اس کی تصریح کی ہے۔ (کتاب القراۃ ص ۱۴۳، مقدمہ نووی ص ۱۷، زاد المعاد جلد ۱ ص ۱۰۵، ابکار المنن ص ۱۳۸) اور مبارکپوری صاحبؒ ایک مقام میں لکھتے ہیں اور مرسل معتضد کے حجت ہونے میں کوئی شبہ نہیں (تحقیق الکلام جلد ۱ ص ۹۱) اسی قاعدہ کو پیش نظر رکھتے ہوئے علامہ آلوسیؒ یہ جواب دیتے ہیں کہ اگر حضرت جابرؓ کی یہ روایت مرسل بھی ہو تب بھی مرسل حدیث اکثر ائمہؒ کے نزدیک حجت ہے تو ہمیں عمل کے لیے یہی کافی دلیل ہے۔ (روح المعانی جلد ۱ ص ۹۱)

یہ حکم تو عام مراسیل کا تھا۔ لیکن اگر کسی دلیل سے حضرت عبد اللہؓ بن شدادؓ کا صحابی ہونا ثابت ہو جائے تو ان کی روایت مراسیل صحابہؓ کے قسم کی ہوگی اور حضرات صحابہ کرامؓ کے مراسیل

بالاتفاق قابل قبول ہیں۔ بعض محققین کا بیان ہے کہ عبداللہؓ بن شدادؓ صحابی تھے۔ اس کا ثبوت یہ ہے کہ جو کتابیں صرف حضرات صحابہ کرامؓ کے حالات اور سوانح بیان کرنے کے لیے مخصوص ہیں۔ ان کا ذکر بھی ان کتابوں میں آتا ہے۔ (فصل الخطاب ص ۹۷) حافظ ابو عمرؒ بن عبدالبرؒ الاستیعاب فی معرفۃ الاصحاب (جلد ۱ ص ۳۹۹) میں ان کا تذکرہ کرتے ہیں۔ تہذیب التہذیب جلد ۵ ص ۲۵۲ اور تقریب ص ۲۰۲) میں درج ہے۔ ولد علی عہد رسول اللہ علیہ وسلم کہ حضرت عبداللہؓ بن شدادؓ کی ولادت آں حضرت صلی اللہ تعالیٰ علیہ وآلہ وسلم کے عہد اور زمانہ میں ہوئی تھی۔ اور اسی طرح اسد الغابۃ فی معرفۃ الصحابۃؓ اور تجرید اسماء الصحابہؓ میں ان کا ذکر ہے۔ اور حافظ ابن حجرؒ لکھتے ہیں عبد اللہؓ بن شدادؓ من صغار الصحابۃؓ۔ (فتح الباری جلد ۳ ص ۲۰، ۴ ص ۲۵۶) کہ عبداللہؓ بن شدادؓ نو عمر صحابہؓ میں شمار ہوتے ہیں۔ حافظ ابن حجرؒ لکھتے ہیں کہ جو صحابی آں حضرت صلی اللہ تعالیٰ علیہ وآلہ وسلم کی خدمت اقدس میں کافی عرصہ رہا ہو یا جس نے آپ کی معیت میں دشمنانِ اسلام سے جہاد کیا ہو یا جس نے آپ کے جھنڈے کے نیچے شہادت کا رتبہ پایا ہو۔ ایسے صحابی کا مرتبہ یقیناً اس صحابی سے زیادہ ہے جس نے آپ کی خدمت اقدس میں کافی وقت نہ گذارا ہو۔ یا جس نے آپ کی معیت میں دشمنانِ اسلام سے جنگ نہ کی ہو، یا جس کو آپ کی معیت میں شہادت نصیب نہ ہوئی ہو، یا جس نے آپ سے معمولی گفت گو کی ہو یا تھوڑی مسافت آپ کے ساتھ طے کی ہو۔ پھر آگے لکھتے ہیں:

او رآہ علیٰ بعد او حال الطفولیۃ وان کان شرف الصحبۃ حاصلاً للجمیع ومن لیس لہٗ منھم سماع منہ فحدیثہٗ مرسل من حیث الروایۃ وھم مع ذالک معدودون فی الصحابۃ لما نالوہ من شرف الرؤیۃ انتہیٰ۔

(شرح نخبۃ الفکر ص ۸۳)

اور اسی طرح ان کا درجہ اس صحابی سے زیادہ ہو گا جس نے آں حضرت صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کو دور سے دیکھا ہو یا جس نے بچپن میں آپ کو دیکھا ہو۔ اگرچہ صحابی ہونے کا شرف ان سب کو حاصل ہو گا۔ ان میں سے جس نے براہ راست آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے سماعت نہیں کی۔ اس کی حدیث مرسل ہو گی لیکن شرف صحبت کی بنا پر ان کا شمار بھی بہر صورت حضرات صحابہ کرامؓ ہی میں کیا جاتے گا۔

اس سے معلوم ہوا کہ حضرات صحابہ کرامؓ کا دینی خدمات انجام دینے کی وجہ سے آپس میں یقیناً بہت تفاوت ہے، لیکن مع ہذا جنھوں نے عہد طفولیت اور بچپن کے زمانہ میں اپنی آنکھوں سے جناب رسول اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کو دیکھا ہے۔ ان کا شمار بھی صحابہؓ میں ہے اور اور وہ صغار صحابہؓ میں شامل ہیں اور چونکہ ان کی روایتیں براہِ راست جناب رسول خدا صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم سے نہیں ہوتیں بلکہ حضرات صحابہ کرامؓ سے ہوتی ہیں۔ اس لیے بعض محدثین کرامؒ نے ایسے صغار صحابہؓ کو کبار تابعینؒ میں شمار کر دیا ہے۔ وَلِكُلٍّ وِجْهَةٌ اور ایسے صغار صحابہؓ کی روایات مراسیل ہوں گی۔ مؤلف خیر الکلام ص ۲۷۸ میں لکھتے ہیں کہ صحابہؓ کی مرسل اگرچہ بالاتفاق حجت ہے، مگر اس جگہ صحابہؓ سے وہی لوگ مراد ہیں جنھوں نے سن تمیز میں آں حضرت صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کو دیکھا۔۔۔ الخ مگر یہ محض فرار کا ایک ناکام بہانہ ہے امام نوویؒ فرماتے ہیں کہ جمہور محدثینؒ کے نزدیک پانچ سال کا بچہ سن تمیز کو پہنچ جاتا ہے لیکن صحیح یہ ہے۔ (جو عبد اللہؓ بن الزبیرؓ کے واقعہ سے ظاہر ہے) کہ چار سال سے کم عمر میں بھی تمیز حاصل ہو جاتی ہے۔ (شرح مسلم جلد ۱ ص ۲۸) اور حضرت عبد اللہؓ بن شدادؓ جو صغار صحابہؓ میں شمار ہوتے ہیں تین چار سال سے کیا کم ہوں گے جب کہ انھوں نے آپ کی زیارت کی ہوگی۔

مراسیل حضرات صحابہ کرامؓ:

مراسیل صحابہؓ کے بارے میں تقریباً تمام علماء کرام متفق ہیں کہ وہ حجت ہیں۔ چنانچہ امام شافعیؒ فرماتے ہیں کہ مراسیل سے حجت صحیح نہیں ہے مگر حضرات صحابہ کرامؓ اور سعید بن المسیبؒ کے مراسیل حجت ہیں۔ (مقدمہ فتح الملہم ص ۳۴ عن الوجیز لابن برہانؒ) امام بیہقیؒ لکھتے ہیں کہ حضرات صحابہ کرامؓ کے مراسیل حجت ہیں۔ (شرح مسلم جلد ص ۲۸۳ و مقدمہ ص ۱۷) اور دوسرے مقام پر لکھتے ہیں کہ ہمارے نزدیک اور دیگر تمام علماء کے نزدیک صحابی کا مرسل حجت ہے۔ (شرح مہذب جلد ۴ ص ۴۸۳) اور علامہ سیوطیؒ تدریب الراوی ص ۶۶ میں تصریح کرتے ہیں کہ حضرات صحابہ کرامؓ کے مراسیل حجت ہیں اور التوضیح (نول کشور ص ۴۶۸) میں لکھا ہے فمرسل الصحابی مقبول بالاجماع کہ صحابی کا مرسل اجماعاً مقبول ہے۔ علامہ نیمویؒ لکھتے ہیں کہ صحابی کا مرسل حجت ہے (تعلیق الحسن جلد ۲ ص ۷۷) اور قاضی شوکانیؒ لکھتے ہیں کہ حضرات صحابہ کرامؓ کے مراسیل حدیث مسند کے حکم میں ہیں۔

(نیل الاوطار جلد ا ص ۱۴۱) نواب صاحبؒ لکھتے ہیں کہ و مراسیل صحابہؓ حجت است (دلیل الطالب ص ۳۸) اور دوسرے مقام پر لکھتے ہیں کہ مرسل صحابی محکوم بصحت است بر مذہب صحیح۔ ایضاً ص ۵۹٦) اگر فریقِ ثانی اس قاعدہ کو تسلیم نہیں کرتا تو براہ کرم دیگر حضرات صحابہ کرامؓ کی مرسل روایات عموماً اور حضرت عائشہؓ کی بخاری شریف کی پہلی روایت (جس میں بدء الوحی کا ذکر ہے اور جو ان کی ولادت سے بھی تقریباً پانچ سال پہلے کا واقعہ ہے) خصوصاً اور نیز حضرت ابن عمرؓ حضرت ابن عباسؓ اور حضرت انسؓ کی روایتیں جن میں ابتدائے اسلام کے احکام ہیں۔ کتابوں سے خارج کر دیں اور اگر حضرت عبد اللہؓ بن شدادؒ کو تابعی ہی تسلیم کر لیا جیسا کہ تقریب ص ۲۰۷ میں ہے کہ وہ کبار تابعینؒ اور ثقات و فقہائیں تھے۔ تب بھی کوئی حرج نہیں ہے، چنانچہ امام بیہقیؒ فرماتے ہیں کہ

وکذلک مراسیل کبار التابعین اذا انضم الیہا ما یؤکدھا من عدالۃ رجال من ارسل منہم حدیثہ و شہرتہم واجتنابہ روایۃ الضعفاء والمجہولین۔ (کتاب القراۃ ص ۱۴۳)

اور اسی طرح (جس طرح حضرات صحابہؓ کے مراسیل حجت ہیں) کبار تابعینؒ کے مراسیل بھی حجت ہیں جب کہ ان کے رواۃ میں عدالت اور شہرت موجود ہو اور کمزور اور مجہول رواۃ کی روایت سے اجتناب وغیرہ کی صفات شامل ہوں۔

اور امام شافعیؒ فرماتے ہیں کہ جو شخص غور و فکر اور قلت غفلت سے متصف ہو کر علمی دلائل پر نگاہ ڈالیگا تو وہ کبار تابعینؒ کے مراسیل کے علاوہ دیگر مراسیل سے منقبض ہوگا جس کے دلائل ظاہر ہیں۔ (الرسالۃ ص ۶۴ جو کتاب الام کی ساتویں جلد کے آخر منضم ہے)

الحاصل حضرت جابرؓ کی یہ روایت صحیح اور مرفوع ہے، اس کو مرسل بتلانے کی تمام دلیلیں بیکار اور لایعنی ہیں اور اگر بالفرض مرسل بھی ہو تب بھی جمہور کے نزدیک حدیث مرسل بھی حجت ہے۔ اور خاص طور پر کبار تابعینؒ کے مراسیل تو امام شافعیؒ اور امام بیہقیؒ کے نزدیک بھی حضرات صحابہ کرامؓ کے مراسیل کی طرح حجت ہیں اور حضرت عبد اللہؓ بن شدادؒ تو صغار صحابہؓ میں سے تھے جن کے مراسیل بالاتفاق حجت ہیں۔ خلاصہ امر یہ ہے کہ حضرات محدثین کرامؒ کے نزدیک کسی روایت کے صحیح اور حجت ہونے کے لیے کوئی قاعدہ اور ضابطہ ایسا نہیں ہے جو سو فیصدی اس روایت میں

سند پایا جاتا ہو اگر باوجود اس کے یہ روایت مرفوع اور صحت نہیں ہے تو عالم اسباب میں صحت حدیث کے لیے کوئی اور معیار موجود نہیں ہے۔

دوسرا اعتراض: مولانا مبارک پوری صاحبؒ لکھتے ہیں کہ حافظ ابن حجرؒ تحریر فرماتے ہیں کہ

حدیث من کان لہٗ امام فقرأۃ الامام لہ قرأۃ من حدیث جابرؓ ولہٗ طرق عن جماعۃ من الصحابۃؓ وکلھا معلولۃ ... انتہی۔ (تلخیص الحبیر جلد ۱ ص ۸۵)

من کان لہٗ امام فقرأۃ الامام لہ قرأۃ کے الفاظ سے حدیث حضرت جابرؓ سے مروی ہے (جس کی متعدد اسانید بالکل صحیح ہیں) اور یہ حدیث حضرت جابرؓ کے علاوہ دیگر حضرات صحابہ کرامؓ کی ایک کافی جماعت سے بھی مروی ہے، لیکن وہ سب طرق معلول ہیں۔

مبارکپوری صاحب نے یہ عبارت تحقیق الکلام جلد ۲ ص ۱۳ اور ابکار المنن ص ۱۵۶ میں نقل کی ہے اور اس پر اعتراض کی بنیاد رکھی ہے۔

جواب: یہ روایت متعدد اسانید کے ساتھ حضرت جابرؓ سے مروی ہے۔ امام حاکمؒ نے علم اصول حدیث کی مشہور کتاب معرفت علوم الحدیث میں تیئیسویں ۲۳ نوع اس موضوع پر قائم کی ہے۔ ھذا النوع من ھذا العلم معرفۃ المشھور من الاحادیث المرویۃ عن رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ..... الخ پھر ان مشہور احادیث کے بعد یہ حدیث بھی بیان کی ہے ومنہ من کان لہٗ امام فقرأۃ الامام لہ قرأۃ اور دیگر متعدد احادیث بھی ذکر کی ہیں پھر فرماتے ہیں فکل ھذہ الاحادیث مشھورۃ باسانیدھا وطرقھا..... الخ (معرفت علوم الحدیث طبع قاھرہ ص ۹۲) اس سے بھی ثابت ہوا کہ من کان لہ امام فقرأۃ الامام لہ قرأۃ کی حدیث نہ صرف یہ کہ مرفوع اور صحیح ہے بلکہ مشہور حدیث ہے محض تعصب مذہبی میں آکر اس کا انکار کرنا کس قدر نا انصافی ہے اور ایسے ٹھوس ثبوت اور علم ہی کی وجہ سے ہم حافظ ابن حجرؒ کی اس بات کو رد کرتے ہیں اور کم و بیش چالیس سندیں اس روایت کی تو اس ناکارہ اور کوتاہ علم کو بھی معلوم ہیں۔ وَفَوْقَ كُلِّ ذِي عِلْمٍ عَلِيمٌ اور ان میں ستائیس کے قریب فی الجملہ معلول ہیں ایک صحیح اور مرفوع سند آپ سن اور پڑھ چکے ہیں اور عنقریب چند ایک دیگر صحیح اسانید بمع توثیق روات ہم آپ سے عرض کریں گے۔ انشاء اللہ العزیز۔ باقی حافظ ابن حجرؒ کا یہ دعوٰی نہایت مجمل اور بے دلیل ہے اور آں حضرت صلی اللہ تعالیٰ علیہ وآلہٖ وسلم کی حدیث کی تصحیح یا تضعیف

بلا دلیل کون سنتا ہے؟ بعض علماء کرام نے حافظ صاحب موصوف سے انتہائی عقیدت اور حسنِ ظنی کرتے ہوئے اس کی توجیہہ یہ بیان کی ہے کہ حافظ صاحب موصوفؒ کی عبارت میں دو چیزیں ہیں:

(۱) کہ یہ روایت حضرت جابرؓ سے مروی ہے۔

(۲) کہ یہ روایت حضرت جابرؓ کے علاوہ دیگر حضرات صحابہ کرامؓ سے بھی متعدد طرق کے ساتھ مروی ہے اور کلہا معلولۃ میں ھا کی ضمیر ان طرق کی طرف راجع ہے جو دیگر حضرات صحابہؓ کرام سے مروی ہیں اور ان کی عبارت لکنہ حدیث ضعیف عند الحافظ سے بھی یہی طرق مرادؔ ہیں نہ کہ حضرت جابرؓ کی حدیث اور حضرت جابرؓ کی روایت مسکوت عنہا ہے اور یہ حافظ صاحبؒ کی عبارت کلہا معلولۃ کی زد میں نہیں آتی اور گویا حافظ صاحب موصوفؒ نے ایک لطیف حیلہ کرتے ہوئے گول مول حکم صادر کر کے حضرت جابرؓ کی روایت سے گلو خلاصی کرنے کی کوشش فرمائی ہے، مگر ناکام۔ اگر حافظ صاحب موصوفؒ کی مراد یہ ہو کہ دیگر حضرات صحابہ کرامؓ سے من وعن وہی روایت کے ایسے ہی الفاظ مروی ہیں جو حضرت جابرؓ سے مروی ہیں اور وہ طرق سب معلول ہیں۔ تو شاید بظاہر یہ صحیح ہو اور اس صورت میں اس عبارت کی اس سے بہتر توجیہہ اور نہیں ہو سکتی اور اگر مراد یہ ہو کہ دیگر حضرات صحابہ کرامؓ سے جو روایتیں مروی ہیں گو ان کی روایت کے الفاظ تو یہ نہیں لیکن ان کا مفہوم اور مضمون اس سے ملتا جلتا ہے اور وہ تمام طرق معلول ہیں تو یہ قطعاً باطل ہے۔ بطور نمونہ دیگر حضرات صحابہ کرامؓ کی بعض صحیح روایتیں نقل کر کے ان کے اس دعویٰ کے بطلان کو آشکارا کیا جائے گا۔ انشاء اللہ العزیز۔ اس لیے آپ ان صحیح روایات کو دیکھ کر یہ کہتے ہوئے حافظ صاحبؒ کے اُدھار سے نظر پھیر لیجئے اور یہ نقد وصول کر لیجئے کہ شنیدہ کے بود مانند دیدہ یاخُذُ مَا صَفَا وَدَعْ مَا کَدَرَ۔

تیسرا اعتراض: امام بیہقیؒ اور مولانا مبارک پوری صاحبؒ وغیرہ لکھتے ہیں کہ حضرت جابرؓ کی اس حدیث میں قرأت سے ما زاد علی الفاتحہ کی قرأت مراد ہے اور اس کا قرینہ یہ ہے کہ ایک شخص نے ظہر یا عصر کی نماز میں سَبِّحِ اسْمَ رَبِّكَ الْأَعْلَى کی قرأت کی تھی تو آپ نے اس موقع پر مقتدیوں کو قرأت سے منع کیا تھا۔ (کتاب القرأۃ صفحہ ۱۴۸ و تحقیق الکلام جلد ۲ صفحہ ۱۹۲)

جواب: یہ روایت حضرت جابرؓ سے مروی ہے اور ان کی روایت میں قرأت کو مَا زَادَ عَلَی الْفَاتِحَۃ کی قرأت پر حمل کرنا توجیہ القول بما لا یرضیٰ بہ قائلہ کا ارتکاب کرنا ہے کیونکہ حضرت جابرؓ راوی حدیث اس قرأت سے صرف سورۃ فاتحہ کی قرأت مراد لیتے ہیں۔ چنانچہ وہ ارشاد[۱] فرماتے ہیں کہ

مَنْ صَلّٰی رَکْعَۃً لَمْ یَقْرَأْ فِیْھَا بِاُمِّ الْقُرْاٰنِ فَلَمْ یُصَلِّ اِلَّا وَرَاءَ الْاِمَامِ (موطا امام مالک ص۲۸ و ترمذی جلد ۱ ص۴۲)

جس کسی نے نماز کی ایک رکعت بھی ایسی پڑھی جس میں اس نے سورۃ فاتحہ نہ پڑھی تو اس کی نماز ادا نہ ہوگی مگر ہاں امام کے پیچھے۔

اور یہ بات باقرار مبارکپوری صاحبؒ اپنے مقام پر آئے گی کہ راوی حدیث (خصوصاً جب کہ صحابی ہو) اپنی مروی حدیث کی مراد کو دوسروں سے زیادہ بہتر جانتا ہے لہٰذا حضرت جابرؓ کی اس صحیح روایت میں قرأت سے ما زاد علی الفاتحہ کی قرأت مراد لینا قطعاً اور یقیناً باطل ہے، یہ یاد رہے کہ یہ روایت حضرت جابرؓ سے مرفوعاً بھی مروی ہے۔ چنانچہ نواب صدیق حسن خاں صاحبؒ لکھتے ہیں کہ در حدیث جابرؓ عن النبی صلی اللہ علیہ وسلم آمدہ کہ فرمودہ من صلی رکعۃ لم یقرأ فیھا بام القراٰن فلم یصل الا وراء الامام رواہ الطحاوی فی معانی الآثار بسند متصل مرفوع ورواہ الترمذی موقوفاً وقال حسن صحیح ... اھ (ہدایۃ السائل ص۲۰۴) نواب صاحبؒ نے جو کچھ کہا بالکل صحیح کہا ہے کیونکہ یہ روایت طحاوی جلد ۱ ص۱۰۶ میں متصل اور مرفوع سند سے مروی ہے۔ سند یوں ہے بحر بن نصرؒ (امام ابو حاتمؒ فرماتے ہیں کہ وہ صدوق اور ثقہ تھے۔ امام ابن خزیمہؒ فرماتے ہیں کہ وہ ثقہ تھے مسلمہ بن قاسمؒ فرماتے ہیں کہ وہ ثقہ فاضل اور مشہور تھے۔ امانی الاحبار ج ۱ ص۳۷) قال حدثنا یحییٰ بن سلامؒ (امام بیہقیؒ فرماتے ہیں کہ وہ کثیر الوہم ہیں اور اس حدیث کے مرفوع بیان کرنے میں ان کا وہم ہے۔ (محصلہ کتاب القرأۃ ص ۱۱۰) بے شک ان پر بعض نے جرح کی ہے۔ امام دارقطنیؒ ان کی

---

۱ امام مالکؒ ابو نعیم وہب بن کیسانؒ سے روایت کرتے ہیں۔ وہ فرماتے ہیں کہ میں نے حضرت جابرؓ بن عبد اللہؓ سے سنا۔ انہوں نے یہ ارشاد فرمایا... الخ حضرت امام مالکؒ کا ترجمہ مقدمہ میں گزر چکا ہے اور حضرت جابرؓ جلیل القدر صحابی تھے۔ ابو نعیم وہب بن کیسانؒ کا ترجمہ سن لیجئے۔ امام نسائیؒ اور ابن معینؒ ان کو ثقہ کہتے ہیں۔ ابن سعدؒ ان کو ثقہ اور محدث کہتے ہیں عجلیؒ ان کو ثقہ اور تابعی کہتے ہیں۔ ابن حبانؒ ان کو ثقات میں لکھتے ہیں اور امام احمدؒ بھی ان کو ثقہ کہتے ہیں۔ (تہذیب التہذیب جلد ۱۱ ص ۱۶۶) امام ترمذیؒ لکھتے ہیں ھذا حدیث حسن صحیح (ا ص۴۲)

تضعیف کرتے ہیں اور امام ابن عدیؒ فرماتے ہیں کہ باوجود ان کے ضعیف ہونے کے ان کی حدیث لکھی جاسکتی ہے امام ابن حبان رح ان کو ثقات میں لکھتے ہیں اور فرماتے ہیں ربما اخطأ امام ابو زرعہؒ فرماتے ہیں لا بأس به وربما یہم امام ابو حاتم رح ان کو شیخ اور صدوق کہتے ہیں امام ابو العربؒ ان کو من الحفاظ اور من خیار خلق اللہ کہتے ہیں لسان المیزان ج ۶ ص ۲۶۰ و ص ۲۶۱ الغرض ان کی یہ حدیث حسن درجہ سے کسی طرح کم نہیں ہے قال حدثنا مالکؒ عن وہبؒ بن کیسانؒ عن جابرؓ بن عبد اللہؓ عن النبی صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم ــــ (الحدیث) لہٰذا مؤلف خیر الکلام کا (ص ۴۹۳ میں) یہ مطالبہ بھی پورا ہو گیا کہ حدیث قرأۃ الامام...الخ بصورت مرفوع زیر بحث ہے غرضیکہ یہ ارشاد مطلق اور صریح ہے اس کو محض لفظوں کی کرامت سے مقید کرنا اور مجمل قرار دینا جیسا کہ مؤلف مذکور نے ص ۵۱۹ میں کیا ہے بالکل باطل ہے اور اسی طرح اس کو رکوع والی رکعت سے مقید کرنا بلا دلیل ہے ۔ نماز صرف وہی رکعت نہیں بلکہ تمام رکعات نماز اور صلوٰۃ ہے اور امام موفق الدین ابن قدامہؒ اور علامہ شمس الدین الحنبلیؒ بھی اس روایت کو مرفوع روایت کرتے ہیں ۔ چنانچہ لکھتے ہیں کہ رواہ الخلال عن جابر رضا ان النبی صلی اللہ علیہ وسلم قال کل صلوٰۃ لا یقرأ فیہا بام القرآن فہی خداج الا ان یکون وراء الامام (مغنی جلد ۱ ص ۴۰۶ واللفظ لہ وشرح مقنع جلد ۲ ص ۱۲) یعنی آں حضرت صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے فرمایا کہ جو نماز بھی سورۃ فاتحہ کے بغیر پڑھی جائے تو وہ ناقص ہوتی ہے مگر ہاں یہ کہ امام کے پیچھے ہو ۔ باقی ظہر یا عصر کی نماز میں ایک شخص کا سبح اسم ربک الاعلیٰ کی قرأت کرنا تو اس حدیث کا سیاق ہی بالکل الگ اور جدا ہے ۔ وہاں ان بعضکم خالجنیہا کے الفاظ موجود ہیں (دیکھئے مسلم جلد ۱ ص ۱۷۲) اس لیے خارجی اور بیرونی قرائن ڈھونڈنے کی بجائے خود حضرت جابرؓ کا بیان اور تفسیر زیادہ قابل قبول ہے اور ان کی مرضی کے خلاف اس روایت میں قرأت کو ما زاد علی الفاتحہ پر حمل کرنا انصاف کا خون کرنا ہے ۔ علاوہ بریں حدیث نمبر ۱۲ میں حضرت جابر رضا کی مرفوع حدیث میں ام القرآن کا خاص لفظ موجود ہے جیسا کہ اپنے مقام پر آتے گا ۔ انشاء اللہ العزیز ۔

چوتھا اعتراض: مبارک پوری صاحبؒ لکھتے ہیں کہ حضرت جابرؓ کی حدیث سورۃ فاتحہ کے بارے میں نص صریح نہیں ہے۔ اور حضرت عبادہؓ بن الصامت کی روایت سورۃ فاتحہ کے بارے میں نص صریح ہے لہٰذا حضرت عبادہؓ کی روایت کو ترجیح ہوگی۔ (تحقیق الکلام جلد ۲ ص ۱۶۵)

جواب: حضرت عبادہؓ الصامت کی روایت جو صحیح اور صریح ہے وہ صرف امام اور منفرد کے حق میں ہے۔ اس کا مقتدی سے کوئی تعلق نہیں ہے جیسا کہ بیان ہوگا۔ انشاء اللہ العزیز۔ اور جو روایت حضرت جابرؓ کی ہے، وہ مقتدی کے حق میں ہے۔ اور حضرت جابرؓ کی اپنی صریح اور صحیح روایت میں مذکور ہے کہ قرأت سے سورۃ فاتحہ کی قرأت مراد ہے، علاوہ ازیں لفظ قرأۃ مصدر ہے جو مضاف ہے اور عربی کے طے شدہ قاعدہ کے لحاظ سے یہ سورۃ فاتحہ اور غیر فاتحہ ہر قسم کی قرأت کو شامل ہے۔ چنانچہ امیر یمانیؒ لکھتے ہیں کہ لان لفظ قرأۃ الامام اسم جنس مضاف یعم کل ما یقرأہ الامام (سبل السلام جلد ۱ ص ۲۶۲) بے شک لفظ قرأۃ الامام اسم جنس ہے جو مضاف ہے اور یہ ہر اس قرأت کو عام ہے جو امام پڑھتا ہو۔ اور نواب صاحبؒ لکھتے ہیں کہ زیرا کہ مصدر مضاف یکے از صیغ عموم باشد کما تقرر فی الاصول وقرأۃ الامام دریں جا مصدر مضاف واقع شدہ پس شامل جمیع قرأت امام باشد و ایں عموم مخصوص است باحادیث صحیحہ مثل حدیث عبادہؓ ..... الخ (دلیل الطالب صفحہ ۲۹۲) لیکن شیخ الاسلام ابن تیمیہؒ وغیرہ کے حوالہ سے آئے گا کہ حضرت عبادہؓ کی خلف الامام کی قید سے کوئی روایت صحیح نہیں لہٰذا تخصیص کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا اور مؤلف خیر الکلام ایک مقام پر لکھتے ہیں کہ اگرچہ ان آثار میں فاتحہ کا ذکر نہیں بلکہ مطلق قرأت کا ذکر ہے اور قرأت فاتحہ ہی سے شروع ہوتی ہے جیسا کہ حدیث سے معلوم ہوتا ہے۔ (ترمذی جلد ۱ ص ۱۱۹) الخ اور حضرت جابرؓ کی روایت کو سورۃ فاتحہ کے بارے میں غیر صریح کہنا ثابت شدہ حقائق سے چشم پوشی کرنا ہے۔ رہی حضرت عبادہ رضؓ کی خلف الامام کی قید اور مضمون سے روایت تو اپنے مقام پر پوری تفصیل آئیگی کہ ایک روایت بھی صحیح نہیں ہے۔ اندریں حالات حضرت جابرؓ کی حدیث کا حضرت عبادہ رضؓ کی حدیث سے تعارض قائم کرکے ثانی کو اول پر ترجیح دینا صرف تسکینِ قلب کا سامان ہے اور بس۔

پانچواں اعتراض: مبارک پوری صاحب لکھتے ہیں کہ حدیث من کان لہ امام فقرأۃ الامام سے تو نفس کفایت ہی معلوم ہوتی ہے۔ حالانکہ حنفیہ امام کے پیچھے قرأت کی ممنوعیت اور حرمت بھی ثابت کرتے ہیں۔ (بمعناہ تحقیق الکلام جلد ۲ صفحہ ۴۲)

جواب: قرأت خلف الامام کی ممنوعیت اور حرمت کے صرف حنفیہ ہی قائل نہیں، بلکہ جمہور اہلِ اسلام ان کے ساتھ ہیں خصوصاً جہری نمازوں میں جس کی پوری تحقیق گذر چکی ہے اور جمہور اہلِ اسلام عموماً اور حنفیہ نے خصوصاً یہ دعویٰ کب کیا ہے کہ ہم نفس کفایت حرمت اور ممنوعیت وغیرہ سب کچھ اس ایک روایت ہی سے ثابت کرتے ہیں؟ نفسِ کفایت اس روایت سے معلوم ہوگئی اور فریق ثانی کی یہ رٹ تو باطل ہوگئی کہ جو شخص امام کے پیچھے ہر رکعت میں سورۃ فاتحہ نہ پڑھے، اس کی نماز ناقص ہے کالعدم ہے بیکار ہے اور باطل ہے۔ باقی رہی ممنوعیت اور حرمت وغیرہ تو دیگر احادیث سے اور قرآن کریم کی نص فاستمعوا وانصتوا اور حدیث واذا قرأ فانصتوا وغیرہ سے ثابت ہے کیونکہ صیغہ امر وجوب کے لیے ہوتا ہے اور خدا تعالیٰ اور اس کے رسول برحق صلی اللہ تعالیٰ علیہ وآلہ وسلم کے امر کی مخالفت حرام بھی ہے اور ممنوع بھی جیسا کہ پہلے نواب صاحبؒ کے حوالہ سے یہ بات ثابت کی جا چکی ہے۔

چھٹا اعتراض: مُبارکپوری صاحبؒ لکھتے ہیں کہ حضرت جابرؓ کی حدیث سے معلوم ہوتا ہے کہ نماز کی ہر رکعت میں سورۃ فاتحہ کا پڑھنا ضروری ہے اور اس کے بغیر نماز نہیں ہو سکتی حالانکہ احناف کہتے ہیں کہ اگر پچھلی دونوں رکعتوں میں سورۃ فاتحہ نہ پڑھی گئی ہو۔ تو نماز جائز ہے۔ تو حنفیہ کا عمل بھی حدیث جابرؓ پر نہ ہوا۔ (بمعناہ تحقیق الکلام جلد ۲ ص ۲۱۴)

جواب: مبارکپوری صاحبؒ نے اپنے اس دعویٰ کے اثبات کے لیے بعض فقہائے کرامؒ کی عبارتیں بھی نقل کی ہیں لیکن کیا مولانا کو یہ معلوم نہیں کہ جتنی حدیثیں آں حضرت صلی اللہ تعالیٰ علیہ وآلہ وسلم کی طرف منسوب کی جاتی ہیں۔ ان میں ہر ہر حدیث آپ کی فرمودہ نہیں ہے۔ اور نہ عملی طور پر آپ سے ثابت ہے، بلکہ ان میں بہت حدیثیں جعلی، خانہ ساز، ضعیف، شاذ، منکر اور معلول وغیرہ سبھی کچھ موجود ہیں۔ اسی طرح یہاں بھی آپ سمجھ سکتے ہیں کہ نہ تو فقہ حنفی

کی ہر ہر جزئی امام ابوحنیفہ رح کی فرمودہ ہے اور نہ ہر ہر جزئی قابل عمل ہے اور مجتہد کا مصیب اور مخطی ہونا اس پر مستزاد ہے۔ پھر بعض فقہاء رح کی غیر معصوم آرا کو حتمی اور ضروری سمجھ کر تمام احناف کا مسلک بتانا اور پھر اس پر اعتراض کی بنیاد رکھنا محض باطل اور مردود ہے۔ اور اگر بعض نے ایسا لکھا ہے تو اس کو سہو و نسیان پر حمل کرنے کا دروازہ بند نہیں ہو جاتا اور احکام عمد و سہو میں فرق مخفی نہیں ہے۔ (دیکھئے بدور الاہلہ ص۴۶ وغیرہ) لیکن مسئلہ زیر بحث میں تو حضرت امام ابوحنیفہ رح سے یہ روایت منقول ہے کہ پچھلی دونوں رکعتوں میں قرأت سورۂ فاتحہ ضروری ہے اور اسی روایت کو حافظ ابن ہمام رح نے پسند کیا اور ترجیح دی ہے (فصل الخطاب ص۲۸) اور حضرت شاہ صاحب رح تحریر فرماتے ہیں کہ حافظ ابن ہمامؒ اور علامہ بدر الدین عینیؒ (وغیرہ) نے ثم افعل ذلک فی صلوتک کلھا[1] کی حدیث سے پچھلی دونوں رکعتوں میں سورہ فاتحہ کے وجوب پر استدلال کیا ہے (فیض الباری جلد ۲ ص ۲۰۰) اور نیز علامہ سندھی حنفی رح (المتوفی ۱۱۴۰ھ) اسی حدیث سے ہر ایک رکعت میں وجوب سورۂ فاتحہ پر احتجاج کرتے ہیں (سندھی رح علی البخاری جلد ۱ ص۹۵) اور اسی طرح دیگر محققین علماء احناف بھی پچھلی دونوں رکعتوں میں قرأت سورۂ فاتحہ کو ضروری سمجھتے ہیں۔ لہٰذا مبارکپوری صاحب رح کا قیاس ساقط الاعتبار ہے جملہ علماء احناف پر یہ اعتراض تو ہرگز وارد نہیں ہو سکتا۔ البتہ مبارکپوری صاحب رح کا مقتدی کو اَللّٰھُمَّ اِنِّیْ وَجَّھْتُ وَجْھِیَ لِلَّذِیْ فَطَرَ السَّمٰوٰتِ ..... الآیۃ پڑھنے کا حکم دینا (دیکھئے ابکار المنن ص۱۱۶ وغیرہ) یقیناً حدیث لا تقرأوا بشیء من القرآن کے مخالف ہے۔

ساتواں اعتراض: مبارکپوری صاحب رح وغیرہ کہتے ہیں کہ اس حدیث فقرأۃ الامام لہ میں لہٗ کی ضمیر حرف مَن کی طرف نہیں لوٹتی بلکہ یہ ضمیر امام کی طرف راجع ہے۔ اس صورت میں حدیث کا معنیٰ یہ ہو گا کہ جس شخص نے امام کی اقتدا کی۔ تو امام کی قرأت صرف امام کے لیے ہے یعنی مقتدی کو اپنی الگ اور جدا قرأت کرنا ہو گی۔ (بمعناہ تحقیق الکلام جلد ۲ ص۱۶۹)

جواب: یہ اعتراض یا بزعم خود جواب محض بیہودہ اور لغو ہے: اولاً۔ اس لیے کہ سو فیصدی[2]

---

[1] یہ روایت بخاری جلد ۱ ص ۱۰۵، مسلم جلد ۱ ص۱۷۰ اور نسائی جلد ۱ ص۱۴۲ وغیرہ میں مروی ہے۔

[2] یہ قاعدہ ہدایت النحو ص۲۱، کافیہ ص۱۷، جامی ص۶۷، مفصل ص۸۱، رضی جلد ۱ ص۹۷۔ متن متین ص۹۱ سوال کابلی ص۲۲۴ اور سوال باسولی وغیرہ نحو کی کتابوں میں بیان کیا گیا ہے۔

نحاۃ کا اس بات پر اتفاق اور اجماع ہے کہ جب جملہ خبر واقع ہو تو لابدی ہے کہ اس جملہ میں ربط پیدا کرنے والی کوئی چیز ہو مظہر ہو یا ضمیر جو مبتدا کی طرف راجع ہو، عام اس سے کہ مذکور ہو یا مقدر اس حدیث میں من کان له امام حرف من مبتدا ہے جو شرط کے معنی کو متضمن ہے اور جملہ فقراءۃ الامام له قراءۃ اس کی خبر ہے جو جزاء پر مشتمل ہے۔ اگر لہ کی ضمیر حرف من کی طرف راجع نہ ہو تو مولانا مبارکپوری صاحبؒ اور ان کے اتباع ہی یہ ارشاد فرمائیں کہ من کی طرف کونسی ضمیر راجع ہوگی یا ربط پیدا کرنے والی یہاں کیا چیز ہے؟ کیا علم نحو فریق ثانی سے اتنا مرعوب یا ان کا اتنا خیر خواہ ہے کہ اس کو یہاں اپنا عمل کرنے کی توفیق ہی نہیں اور نہ اس میں اس کی ہمت اور جرأت ہے

قارئین کرام! ملاحظہ فرمایئے کہ مبارکپوری صاحبؒ (مع اپنے اتباع کے) کیسے جگر اور دل کے مالک ہیں کہ حضرات محدثین کرامؒ کے تمام طے شدہ اصول اور ضوابط کو روندتے آئے ہیں جیسا کہ آپ پڑھ چکے ہیں اور ابھی ؎

ابتدائے عشق ہے روتا ہے کیا
آگے آگے دیکھئے ہوتا ہے کیا

اور ان کی یہ ستم ظریفی بھی دیکھئے کہ وہ کس بے جگری کے ساتھ گرامر اور نحو کے مسلمات کو بھی پامال کرتے جا رہے ہیں جن کے تسلیم کرنے میں غیر مسلموں اور دہریوں کو بھی کبھی تامل نہیں ہوا۔ مؤلف خیر الکلام ص۴۹۵ میں لکھتے ہیں کہ بلکہ ضمیر مقدر بھی ہو سکتی ہے جیسے اَلَّذِیْنَ مَنُوْا اِنْ یَّذَرُھُمْ۔ الخ

الجواب: بے شک مقدر بھی ہو سکتی ہے۔ مگر وہاں جہاں ظاہر اور مذکور نہ ہو یہاں مقدر ماننے کا کون سا داعیہ ہے جبکہ ضمیر ظاہر موجود ہے؟ باقی علامہ ابوالحسن حنفی سندھیؒ کے حاشیہ ابن ماجہ ص۶۱ کے حوالہ سے جو عبارت مؤلف خیر الکلام نے ص۴۹۴ میں اپنی تائید کے لیے نقل کی ہے۔ قِیْلَ یَحْتَمِلُ ... الخ تو لفظ قیل سے علامہ موصوفؒ نے اس کی تمریض اور تضعیف کر دی ہے کیونکہ عموماً یہ لفظ تمریض کے لیے آتا ہے نہ وہ اس تاویل پر راضی ہیں اور نہ یہ ان کا اپنا قول ہے جیسا کہ مؤلف خیر الکلام نے ص۴۹۴ میں یہ لکھ کر علامہ ابوالحسن حنفیؒ نے بھی ضمیر مقدر نکالی ہے راہ فرار اختیار کی ہے۔ اللہ تعالیٰ ہر ایک کو صحیح بات سمجھنے کا سلیقہ عطا فرمائے۔

وثانیاً۔ چونکہ فریق ثانی کا عامل بالحدیث ہونے کا دعویٰ ہے (اور ان کے زعم میں دوسرے لوگ جو ان سے اختلاف رائے رکھتے ہیں صرف فقہ اور اماموں کے قول سے احتجاج کیا کرتے

ہیں) اس لیے بطور نمونہ صرف چند حدیثیں پیش کی جاتی ہیں تاکہ اس خود ساختہ قاعدہ کے تحت ان کا مطلب ہمیں سمجھا دیا جائے:

(۱) من کان فی حاجۃ اخیہ کان اللہ فی حاجتہ (بخاری وغیرہ) آپکے اس قاعدہ کے رُو سے اس کا معنیٰ یہ ہوگا کہ اللہ تعالیٰ اپنی ہی حاجات پوری کرتا رہتا ہے۔ (العیاذ باللہ تعالیٰ)

(۲) من فرّج عن مسلم کربۃ فرّج اللہ عنہ (بخاری وغیرہ) آپ کے اس قاعدہ کے لحاظ سے معنیٰ یہ ہوگا۔ اللہ تعالیٰ اپنی ذات سے مصائب دور کرتا ہے (عیاذاً باللہ تعالیٰ)

(۳) من بنیٰ للہ مسجداً بنی اللہ لہٗ بیتاً فی الجنۃ (متفق علیہ) آپ کے گھریلو ضابطہ کے لحاظ سے معنیٰ یہ ہوگا کہ اللہ تعالیٰ اپنے لیے جنت میں گھر بناتا ہے۔ (نعوذ باللہ تعالیٰ) (من عادیٰ لی ولیا فقد بارزتہ بالحرب۔ (صحیحین) آپ کے خود ساختہ قانون کے لحاظ سے معنیٰ یہ ہوگا کہ اللہ تعالیٰ اپنے نیک بندوں کو جنگ کرنے کا چیلنج کرتا ہے (معاذ اللہ تعالیٰ) اسی طرح من کان للہ کان اللہ لہٗ، ومن کان یؤمن باللہ والیوم الآخر فلیکرم ضیفہٗ اور من کنت مولاہ فعلی رضٰ مولاہ وغیرہ وغیرہ سینکڑوں حدیثیں ایسی ہیں جن میں اس خانہ ساز قاعدہ کو جاری کرنے کے بعد نہ توحید باقی رہ سکتی ہے۔ اور نہ اللہ تعالیٰ کی ذات منزہ اور مبرا ثابت ہو سکتی ہے اور اسی طرح اسلام کے دیگر اہم مسائل کا ثابت کرنا مشکل ہو جاتا ہے۔ اور اس افصح العرب والعجم کی ذاتِ گرامی کی طرف ایسے مہمل احکام منسوب ہوتے ہیں جن کی فصاحت و بلاغت مسلّم چلی آتی ہے کہ نہ تو آج تک آپکا اس فن میں کوئی نظیر پیدا ہوا اور نہ ہوگا۔ ع

بعد از خدا بزرگ توئی قصہ مختصر

آٹھواں اعتراض: بعض نہایت سطحی قسم کے دوست یہ کہہ دیا کرتے ہیں کہ اگر امام کی قرأت مقتدیوں کے لیے کافی ہے۔ تو مقتدیوں کو رکوع، سجود اور تشہد وغیرہ امور ادا کرنے اور تسبیحات پڑھنے کی بھی ضرورت نہ ہونی چاہیئے کیونکہ امام ہی سب کچھ کرتا رہے گا بلکہ لوگوں کو اپنے گھروں میں آرام سے بیٹھا رہنا چاہیئے۔ امام خود سب کچھ ادا کرتا رہیگا۔ (ایک صاحب)

جواب: امام مقتدی کی طرف سے صرف قرأتِ قرآن میں کفایت کرتا ہے جیسا کہ آیت واذا قرئ القرآن... الآیۃ۔ اور حدیث واذا قرأ الامام فانصتوا وغیرہ دلائل بسط اور تفصیل کے ساتھ

پہلے نقل کئے جاچکے ہیں اور نواب صاحبؒ کے حوالہ سے عرض کیا جاچکا ہے کہ مقتدی کو ممانعت صرف قرأت کی ہے اور حدیث میں اس کی تصریح موجود ہے کہ جب امام تکبیر کہے تو تم بھی کہو۔ جب وہ رکوع اور سجود وغیرہ کرے تو تم بھی کرو۔ ہاں مگر جب امام قرأت شروع کرے۔ تم خاموش رہو۔ اس لیے باقی امور کو قرأت پر قیاس کرنا مع الفارق ہونے کے ساتھ نص کے مقابلہ میں ہے جو ہر طرح سے مردود ہے۔ بہرحال حضرت جابرؓ کی یہ مرفوع حدیث سنداً و معنیً بالکل صحیح ہے اور جمہور کی دلیل اور حجت ہے البتہ حقائق سے چشم پوشی کرنے کا کوئی جواب نہیں ہو سکتا۔

نواں اعتراض: مؤلف خیر الکلام لکھتے ہیں کہ اس حدیث کا مفہوم صرف اس قدر ہے کہ امام کی قرأت کا ثواب مقتدی کو ملتا ہے۔ مولانا عبد الحیؒ لکھنویؒ فرماتے ہیں کہ امام کی قرأت کا مقتدی کے لیے حکمی قرأت ہونے کا یہ مطلب ہے کہ شارع نے مقتدی کو امام کی قرأت سے قاری کے حکم میں کیا ہے اور اس کو اس کا ثواب عطا کیا ہے (عمدۃ القاری جلد ۱ ص ۱۷۱) جیسا کہ حدیث میں آتا ہے کہ جو شخص مسجد میں بیٹھ کر نماز کا منتظر ہو وہ نماز میں ہوتا ہے پس ثابت ہوا کہ یہ حدیث قرأت خلف الامام کے منافی نہیں۔ اھ (محصلہ ص ۴۹۱، ص ۴۹۲)

الجواب: یہ سب کچھ قلتِ فہم کا نتیجہ ہے، مولانا عبد الحیؒ نے بحوالہ علامہ عینیؒ اس شبہ کا جواب دیا ہے کہ حساً اور ظاہراً تو امام قرأت کرتا ہے پھر اس کی قرأت کو مقتدی کی قرأت کیوں قرار دیا گیا ہے۔ جواب یہ دیا کہ جتنا ثواب امام کو ملے گا شریعت نے اتنا ہی ثواب مقتدی کے لیے بیان کیا ہے کہ اگرچہ وہ خاموش بھی رہے گا۔ (جیسا کہ ما زاد علی الفاتحہ میں وہ خاموش رہتا ہے) تب بھی اس کو پورا ثواب ملے گا نہ یہ کہ وہ پیچھے پڑھتا بھی رہے جیسا کہ منتظرِ صلوٰۃ کو نماز کا ثواب ملتا ہے یہ مطلب تو ہرگز نہیں کہ وہ بیٹھا بھی رہے اور ساتھ ہی وہ رکوع و سجود وغیرہ کی حرکات بھی کرتا رہے یہ تو دو متضاد چیزیں ہیں یہ بھلا کیسے جمع ہو سکتی ہیں؟ ہاں جس طرح منتظرِ نماز کو اپنے وقت میں حکمی نماز کا ثواب ملتا ہے اور جب وہ دوسرے موقع پر نماز ادا کرے گا تو اس کو حقیقی نماز کا ثواب ملے گا۔ اسی طرح نمازی کو بحالتِ اقتداء حکمی قرأت کا ثواب ملتا ہے اور فراغتِ امام کے بعد جب مسبوق اپنی قرأت کرے گا یا وہ منفرد ہو کر نماز پڑھیگا تو اس کو حقیقی قرأت کا ثواب ملے گا۔ اگر یہ مطلب نہ لیا جائے تو حکمی نماز کے

ساتھ تشبیہ اور تنظیر درست نہیں ہے کیونکہ حقیقی اور حکمی نماز دو الگ الگ حالتوں میں ہوتی ہے۔ کما لا یخفیٰ۔

بارھویں حدیث :

امام احمدؒ فرماتے ہیں کہ ہم سے اسودؒ[1] بن عامرؒ نے بیان کیا۔ وہ کہتے ہیں کہ ہم سے حسنؒ[2] بن صالحؒ نے بیان کیا اور وہ ابوالزبیرؒ[3] سے روایت کرتے ہیں اور وہ حضرت جابرؓ[4] سے، وہ فرماتے ہیں کہ آں حضرت صلی اللہ تعالیٰ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا :

من کان لہٗ امام فقرأۃ الامام لہٗ قرأۃ — یعنی جس آدمی نے امام اقتداء کرلی ہو تو امام کی قرأت ہی مقتدی کی قرأت ہے۔

---

[1] علامہ ذہبیؒ ان کو الحافظ اور احد الاثبات لکھتے ہیں (تذکرۃ جلد ۱ ص ۳۲۵) امام ابن معینؒ ان کو لا باس بہ اور ابن مدینیؒ ان کو ثقہ اور ابو حاتمؒ ان کو صدوق اور صالح اور ابن سعدؒ ان کو صالح فی الحدیث کہتے ہیں۔ اور ابن حبانؒ ان کو ثقات میں لکھتے ہیں (تہذیب التہذیب جلد ۱ صفحہ ۳۴۰) اور حافظ ابن حجرؒ ان کو ثقہ کہتے ہیں تقریب ۳۹

[2] علامہ ذہبیؒ ان کو الامام اور القدوہ لکھتے ہیں۔ ابو حاتمؒ ان کو ثقہ حافظ اور متقن کہتے ہیں (تذکرہ جلد ۱ صفحہ ۲۰۱) امام احمدؒ ان کو ثقہ اور ابن معینؒ ان کو ثقہ اور مامون کہتے ہیں، امام ابو زرعہؒ ان کو متقن فقیہ عابد اور زاہد کہتے ہیں، ابن حبانؒ ان کو ثقات میں لکھتے ہیں، ابن سعدؒ ان کو فقیہ، حجت، صحیح الحدیث اور کثیر الحدیث کہتے ہیں۔ دارقطنیؒ ان کو ثقہ اور عابد کہتے ہیں (تہذیب التہذیب جلد ۲ ص ۲۸۵) حافظ ابن حجرؒ لکھتے ہیں کہ وہ ثقہ فقیہ اور عابد تھے (تقریب صفحہ ۸۹)

[3] ابو الزبیر کا نام محمدؒ بن مسلمؒ بن تدرسؒ تھا۔ علامہ ذہبیؒ ان کو الحافظ اور المکثر لکھتے ہیں۔ (تذکرہ جلد ۱ ص ۱۱۹) امام ابن معینؒ، نسائیؒ اور یحیی القطانؒ ان کو ثقہ کہتے ہیں، یعقوبؒ بن شیبہؒ ان کو ثقہ اور صدوق اور ابن مدینیؒ ان کو ثقہ اور ثبت اور ابن سعدؒ ان کو ثقہ اور کثیر الحدیث کہتے ہیں۔ ابن عدیؒ ان کو ثقہ کہتے ہیں۔ ابن حبانؒ ان کو ثقات میں لکھتے ہیں۔ محدث ساجیؒ کا بیان ہے کہ وہ احکام میں حجت تھے (تہذیب التہذیب جلد ۹ ص ۴۴۱) عطاءؒ بن ابی رباحؒ کا بیان ہے کہ جب ہم حضرت جابرؓ سے احادیث کی سماعت کرکے واپس آتے اور آپس میں مذاکرہ اور تکرار کرتے تو ابوالزبیرؒ حفظ روایات اور ان کی ادائیگی میں ہم سب سبقت لے جاتے تھے (ترمذی جلد ۲ ص ۲۴۰ و مسند دارمی ص ۴۹)

[4] یہ روایت مسند احمد جلد ۳ ص ۳۳۹، شرح معانی الآثار جلد ۱ ص ۱۲۸، فتح الملہم جلد ۲ ص ۲۴ اور بلوغ الامانی جلد ۲ ص ۱۰ وغیرہ کتابوں میں موجود ہے۔

اس حدیث کا مطلب اور مفہوم بھی بلکہ متن و عن الفاظ بھی وہی ہیں جو پہلے گزر چکے ہیں اور یہ روایت سابق کی طرح اس بات پر صراحت کے ساتھ دلالت کرتی ہے کہ مقتدی کو امام کے پیچھے قرأت کرنے کی قطعاً ضرورت نہیں ہے۔ اس روایت کے جملہ رواۃ ثقہ اور ثبت ہیں جیسا کہ آپ پڑھ چکے ہیں۔ اس سند پر فریق ثانی کی طرف سے کوئی اعتراض راقم کی نظر سے نہیں گذرا۔ زیادہ سے زیادہ یہ کہا جا سکتا ہے کہ ابو الزبیرؒ مدلس تھے اور وہ اس روایت کو عنعنہ سے روایت کرتے ہیں۔ لیکن یہ سوال باطل ہے۔

اوّلًا۔ اس لیے کہ حافظ ابن القیمؒ لکھتے ہیں کہ جمہور محدثین ابو الزبیرؒ کی معنعن حدیثوں کو صحیح سمجھتے ہیں (زاد المعاد جلد ۴ ص ۹۵)

وثانیًا۔ پہلے تو جیہ النظر کے حوالہ سے نقل کیا جا چکا ہے کہ ابو الزبیرؒ کا شمار ان مدلسین میں ہے جن کی تدلیس کسی صورت میں مضر نہیں ہے۔ ایک سند یوں آتی ہے عن ابی الزبیر عن سعید بن جبیرؒ... الخ امام دارقطنیؒ لکھتے ہیں۔ هذا اسناد صحیح (جلد ا ص ۱۳۳) امام دارقطنیؒ ان کی معنعن سند کو بھی صحیح کہتے ہیں۔

وثالثًا۔ حضرت عبد اللہؓ بن شدادؒ وغیرہ ان کے ثقہ متابع موجود ہیں۔ بہر حال یہ روایت متصل اور صحیح ہے اس میں کوئی کلام نہیں ہو سکتا۔ چنانچہ حافظ شمس الدینؒ ابن قدامہؒ لکھتے ہیں۔

وهذا اسناد صحیح متصل رجاله کلهم ثقات۔ کہ یہ سند صحیح اور متصل ہے اور اس کے تمام راوی ثقہ ہیں۔

(شرح مقنع الکبیر جلد ۲ ص ۱۱ برحاشیہ مغنی)

حافظ شمس الدینؒ کا ترجمہ پہلے نقل کیا جا چکا ہے[۱] اور علامہ ذہبیؒ ان کو الامام اور شیخ الاسلام لکھتے ہیں (تذکرہ جلد ۴ ص ۲۷۳) مؤلف خیر الکلام نے ص ۴۸۰ و ص ۴۸۱ میں دارقطنیؒ اور بیہقیؒ کی روایتوں کا سہارا لے کر حسنؒ بن صالحؒ اور ابو الزبیرؒ کے درمیان جابر جعفی کا واسطہ بتایا ہے مگر مسند احمد کی سند میں کوئی واسطہ نہیں اور یہ روایت صحیح اور متصل ہے جیسا کہ ابھی ابن قدامہؒ کے حوالہ سے عرض ہو چکا ہے۔

تیرھویں حدیث: امام ابن ابی شیبہؒ فرماتے ہیں کہ ہم سے مالکؒ بن اسمٰعیلؒ نے بیان کیا وہ حسنؒ

---

[۱] علامہ ذہبیؒ ان کو الحافظ، عدیم النظیر، الثبت اور النحریر لکھتے ہیں (تذکرہ جلد ۲ ص ۱۸۰) حافظ ابن کثیرؒ لکھتے باقی حاشیہ نمبر ۱ اور نمبر ۲ اگلے

بن صالح سے روایت کرتے ہیں۔ وہ ابو الزبیرؒ سے اور وہ حضرت جابرؓ سے اور وہ آں حضرت صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم سے روایت کرتے ہیں۔ آپ نے فرمایا: کل من کان لہ امام فقرأتہ لہ قرأۃ۔

(الجوهر النقی جلد ۲ ص ۱۵۹)

ہر وہ شخص جس نے امام کی اقتداء کرلی ہو تو امام کا پڑھنا اس کا پڑھنا ہے۔ اس روایت کے بھی تمام راوی ثقہ ہیں، علامہ ماردینیؒ فرماتے ہیں ھٰذا اسناد صحیح (الجوهر النقی) کہ یہ سند بالکل صحیح ہے۔

چودھویں حدیث: امامؒ عبدالرحمنؒ بن حمیدؒ فرماتے ہیں کہ ہم سے ابو نعیمؒ نے بیان کیا: وہ فرماتے ہیں کہ ہم سے حسنؒ بن صالحؒ نے بیان کیا وہ ابو الزبیرؒ سے روایت کرتے ہیں اور وہ حضرت جابرؓ سے اور وہ آں حضرت صلی اللہ تعالیٰ علیہ وآلہ وسلم سے روایت کرتے ہیں، آپ نے فرمایا:

من کان لہ امام فقرأۃ الامام لہ قرأۃ   کہ جس کا امام قرأت کرتا ہو تو اس کے امام کی قرأت ہی اس مقتدی کی قرأت ہے۔

یہ روایت بھی صحیح ہے، علامہ آلوسیؒ اس کو علیٰ شرط مسلم صحیح کہتے ہیں (روح المعانی جلد ۹ ص ۱۳۴)

(بقیہ حاشیہ پچھلا صفحہ نمبر ۲ مکمل) ہیں کہ وہ احد الاعلام ومن ائمۃ الاسلام تھے اور فرماتے ہیں کہ انہوں نے مصنف نامی ایک کتاب لکھی ہے نہ ان سے پہلے کسی نے ایسی کتاب لکھی ہے اور نہ بعد (البدایہ جلد ۱۰ ص ۳۱۵) حافظ ابن حجرؒ ان کو ثقہ اور حافظ لکھتے ہیں۔ (تقریب ص ۲۱۳)

۲ (پچھلا صفحہ) علامہ ذہبیؒ ان کو الحافظ اور الحجۃ لکھتے ہیں (تذکرۃ جلد ۱ ص ۳۶۴) حافظ ابن حجرؒ ان کو ثقہ اور متقن لکھتے ہیں (تقریب ص ۲۴۴) امام نسائیؒ، عجلیؒ، ابو حاتمؒ اور یعقوبؒ بن شیبہؒ سب ان کو ثقہ کہتے ہیں، ابن حبانؒ اور ابن شاہینؒ ان کو ثقات میں لکھتے ہیں۔ عثمانؒ بن ابی شیبہؒ ان کو صدوق، ثبت، متقن اور امام الائمۃ کہتے ہیں۔ (تہذیب التہذیب جلد ۱ ص ۴) باقی رواۃ کی توثیق گذر چکی ہے۔

۵ علامہ ذہبیؒ ان کو الامام اور الحافظ لکھتے ہیں اور فرماتے ہیں کہ کان من الائمۃ الثقات (تذکرہ جلد ۲ ص ۱۰۴) ان کی وفات ۲۴۹ھ میں ہوئی ہے۔

۶ ان کا نام فضلؒ بن دکینؒ تھا۔ علامہ ذہبیؒ ان کو الحافظ اور الثبت لکھتے ہیں۔ (تذکرہ ۱ ص ۳۳۵) حافظ ابن حجرؒ لکھتے ہیں کہ وہ ثقہ اور ثبت تھے (تقریب ص ۳۰۰) باقی رواۃ کا ترجمہ پہلے گذر چکا ہے۔

۷ یہ روایت الجوہر النقی جلد ۲ ص ۱۵۹، فتح القدیر جلد ۱ ص ۲۳۹، شرح نقایہ جلد ۱ ص ۸۵ اور روح المعانی جلد ۹ ص ۱۳۴ وغیرہ میں موجود ہے۔

اعتراض: مبارکپوری صاحبؒ لکھتے ہیں کہ مسند عبدؒ بن حمیدؒ کے قلمی نسخہ صـ۲۲ میں (جو مولانا شمس الحق کے کتب خانہ میں موجود ہے) حسنؒ بن صالحؒ کے بعد جابر جعفی کا نام موجود ہے۔ اور جابر مذکور ضعیف تھا۔ کیونکہ بعینہٖ یہ روایت دارقطنی جلد۱ صـ۱۲۶ اور کتاب القرأۃ صـ۱۰۱ میں مذکور ہے اور ان میں ایسا ہی لکھا ہے۔ لہٰذا یہ روایت کمزور ہے۔ (تحقیق الکلام جلد ۲ صـ۱۶۱)

جواب: نہ معلوم مبارکپوری صاحبؒ اتنے زود فراموش کیوں واقع ہوتے ہیں؟ — ع:

تمہیں عادت ہے بھول جانے کی

اگر کاتب کا قلم مسند احمدؒ بن منیعؒ کے نسخہ میں عن جابرؓ کا جملہ زیادہ لکھ سکتا ہے۔ تو کیا وجہ ہے کہ وہ عبدؒ بن حمیدؒ کے قلمی نسخہ میں جابر جعفی کا جملہ نہیں لکھ سکتا؟ وہ کوئی بڑا منطقی اور فلسفی قلم ہے۔ کہ بظاہر مطبوعہ نسخوں میں تو کام کر سکتا ہے لیکن زاویہ خمول میں پڑے ہوئے قلمی نسخہ میں مجبور و لاچار ہو کر رہ جاتا ہے؟ وہ قلم تھا یا کسی یونیورسٹی کا ماہر پروفیسر تھا؟ کیا بعید ہے کہ وہ قلم تقدیری ہو جو مبارکپوری صاحبؒ کی بگڑی ہوئی قسمت کو سنوارنے کے لیے پھر ایک مرتبہ چل پڑا ہو؟

حافظ شمس الدین ابن قدامہؒ کے حوالہ سے پہلے نقل کیا جا چکا ہے کہ وہ حسنؒ بن صالحؒ کی ابوالزبیرؒ سے روایت کو متصل بیان کرتے ہیں اور اس کی تصریح کرتے ہیں والحسن بن صالح ادرك ابا الزبير (جلد ۲ صـ۱۱) کہ حسنؒ بن صالحؒ نے ابوالزبیرؒ اور ان کے زمانہ کو پایا ہے۔ اور اصول حدیث کا یہ قاعدہ ہے (جیسا کہ مسلم شریف کے مقدمہ وغیرہ میں بیان کیا گیا ہے) کہ جمہور محدثینؒ کے نزدیک اتصال سند کے لیے امکان لقاء کافی ہے۔

حسنؒ بن صالحؒ کی ولادت ۱۰۰ھ میں ہوئی ہے اور ابوالزبیرؒ کی وفات ۱۲۸ھ میں (دیکھئے تذکرۃ الحفاظ جلد ۱ صـ۱۱۹ وغیرہ) اگر اٹھائیس سال کے اس طویل عرصہ کے اندر بھی امکانِ لقاء ثابت نہیں ہو سکتا اور سند متصل نہیں ہو سکتی تو سرے سے فن روایت اور حدیث کا ہی انکار کر دیجئے اور منکرین حدیث کی طرح یہ کہتے ہوئے حدیث سے سبکدوشی اختیار کر لیجئے کہ ے

یہ امت روایات میں کھو گئی

حقیقت خرافات میں کھو گئی

مؤلف خیر الکلام صـ۴۸۱ میں لکھتے ہیں کہ مگر حدیث کے فن کی بنیاد ہر جگہ امکان پر نہیں ہوتی اس

میں وقوع کو بھی دیکھا جاتا ہے ..... الخ

الجواب: یہی وہ غیر صحیح نظریہ ہے جس کو امام مسلمؒ نے صحیح کے مقدمہ میں پُر زور الفاظ سے رد کیا ہے اور اتصالِ سند کے لئے غیر مدلس میں امکانِ لقاء کو کافی سمجھا ہے اور یہی نظریہ جمہور محدثین کرامؒ نے اپنایا ہے۔ علاوہ ازیں خود مؤلف خیر الکلام صد ۲۴۳ میں لکھتے ہیں کہ کیونکہ صحتِ حدیث کے لیے صرف استاد اور شاگرد کی ملاقات کا ممکن ہونا کافی ہے۔ عدم ثبوت سے نفی لازم نہیں آتی۔ اھ بلفظہٖ اور یہی کچھ ہم کہنا چاہتے ہیں خواہ مخواہ دوسرے کی معقول بات کو توڑ مروڑ دینا کہاں کا انصاف ہے؟

علاوہ ازیں امام احمدؒ ابو بکرؒ بن ابی شیبہؒ شمس الدینؒ بن قدامہؒ حافظ مزیؒ[1] علامہ ماردینیؒ حافظ ابن ہمامؒ ملا علی قاریؒ اور علامہ آلوسیؒ وغیرہ یہ سند اسی طرح نقل کرتے ہیں عن حسنؒ بن صالحؒ عن ابی الزبیرؒ ..... الخ اور اس میں جابر جعفی کا ذکر تک نہیں کرتے۔ مگر شومئی قسمت کا کیا کہنا کہ ان کو نہ تو قلمی نسخہ دستیاب ہو سکا ہے اور نہ مہربان قلم مل سکا ہے۔ ورنہ ذراسی جنبش ان کے لیے بھی کر ہی گذرتا — ع:

کلکِ ما نیز زبانے و بیانے دارد

رہا دارقطنی اور بیہقی کی سند میں حسنؒ بن صالحؒ اور ابو الزبیرؒ کے درمیان جابر جعفی کا واقع ہونا تو یہ اس پیش کردہ سند کے عدمِ اتصال کی دلیل نہیں ہو سکتی۔ ہو سکتا ہے کہ حسنؒ بن صالحؒ نے یہ روایت براہِ راست ابو الزبیرؒ سے بھی سُنی ہو۔ اور جابر جعفی سے بھی سنی ہو کسی وقت وہ ابو الزبیرؒ سے روایت بیان کرتے ہوں گے اور کسی وقت جابر جعفی سے یا یوں کہ لیجئے کہ

---

[1] باقی حضرات کے حوالے اور ان کے تراجم آپ پہلے پڑھ چکے ہیں، حافظ مزیؒ نے اپنی کتاب اطراف میں یہ سند یوں ہی نقل کی ہے اور اس میں جابر جعفی کا ذکر نہیں ہے۔ (دیکھئے الجوہر النقی جلد ۲ صـ ۱۵۹) علامہ ذہبیؒ لکھتے ہیں کہ جمال الدین ابو الحجاج یوسفؒ بن الزکی المزیؒ (المتوفی ۷۴۲ ھ) العالم، الحبر، الحافظ، الاوحد، محدث الشام، ثقہ، حجت اور کثیر العلم تھے۔ نیز لکھتے ہیں کہ طبقات رجال اور معرفت روات میں کبھی کسی آنکھ نے ان کا نظیر نہیں دیکھا ہو گا (تذکرہ جلد ۴ صـ ۲۶۵)، علامہ ذہبیؒ اور حافظ ابن کثیرؒ وغیرہ کو ان سے شرف تلمذ حاصل ہے: — ع

این خانہ ہمہ آفتاب است

جب صحت حدیث کا خیال دامنگیر ہوتا ہوگا اسوقت ابوالزبیرؒ کا طریق بیان کر دیتے ہونگے اور جب محض روایت پیش کرنا ہی مدنظر ہوتا ہوگا اس وقت وہ جابر جعفی کی سند سے روایت بیان کر دیتے ہونگے اور فن حدیث میں اسکی بکثرت مثالیں موجود ہیں اور علماء اصول اسکو اپنی اصطلاح میں المزید فی متصل الاسانید سے تعبیر کرتے ہیں چنانچہ حافظ ابن حجرؒ لکھتے ہیں کہ اگر بعض طرق میں راوی اور مروی عنہ کے درمیان زائد راوی آجاتے تو یہ اس کی دلیل نہیں کہ جس طریق میں زائد راوی کا تذکرہ نہیں ہوا۔ وہ منقطع ہو یا اس سے عدم لقاء ثابت ہو (دیکھئے شرح نخبۃ الفکر ص۴۵ وغیرہ) حضرت مولانا محدث محمد حسن صاحب فیض پوریؒ لکھتے ہیں کہ ابوالزبیرؒ سے ذیل کے حضرات روایت کرتے ہیں۔ الحسنؒ بن صالحؒ جیسا کہ مسند احمد وغیرہ کا حوالہ ہم نے دیا اور ایوب السختیانیؒ بھی۔ (موطا امام محمد و کتاب القرآۃ) اور عبد اللہؒ بن لہیعہؒ بھی (کتاب القرآۃ) اور الفضلؒ بن عطیہؒ (کتاب القرآۃ) اور جابر جعفی اور لیثؒ بن ابی سلیمؒ بھی (طحاوی جلد ۱ ص۱۰۲ و دار قطنی جلد ۱ ص۱۲۶) (الدلیل المبین ص۲۲۹)

اگر مبارکپوری صاحبؒ اس پر مُصر ہیں کہ کاتب صاحب کی غلطی ہی تسلیم کی جائے تو تب ہی دل کو تسکین ہو سکتی ہے ورنہ نہیں۔ تو لیجئے ہم ان کی اس ضد کو بھی مان لیتے ہیں۔ یہ کیوں نہیں ہو سکتا کہ اصل عبارت یوں ہو:

عن الحسن بن صالح وعن جابر الجعفی ... الخ مطلب یہ ہوا کہ ابو نعیمؒ نے حسنؒ بن صالحؒ اور جابر جعفی دونوں سے روایت کی ہو، لیکن کاتب سے قلمی نسخہ میں صرف حرف واؤ چھوٹ گیا ہو، کیونکہ واو کا کتابت میں چھوٹ جانا بہت آسان ہے۔ بہ نسبت اس کے کہ کسی دیانت دار کاتب کا قلم عن جابر زیادہ لکھدے۔ اگر کاتب کی غلطی کی توجیہ و تاویل ہی معتبر ہو سکتی ہے تو یوں کیوں نہ ہو جاتے ؟ بلکہ ابن ماجہ ص۶۱ کے بعض نسخوں میں اصل عبارت ہی اسی طرح ہے جس طرح ہم نے تحریر کی ہے۔ عن الحسن بن صالح وعن جابر ... الخ اور مولف خیر الکلام نے ص۲۸۱ میں اس کو دبی زبان سے تسلیم کیا ہے۔

پندرھویں حدیث: امام محمدؒ فرماتے ہیں کہ ہم سے امام ابو حنیفہؒ نے بیان کیا، فرماتے ہیں کہ ہم سے موسیٰؒ بن ابی عائشہؒ نے بیان کیا۔ وہ عبد اللہؓ بن شدادؓ سے روایت کرتے ہیں اور وہ حضرت جابرؓ سے، انھوں نے فرمایا کہ آں حضرت صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: من کان له امام فقرآة الامام له قرآة (موطاء امام محمد ص۹۴) کہ امام کا پڑھنا ہی مقتدی کو کافی ہے اور بس، اعلیٰ

الگ قرأت نہیں ہے۔ یہ روایت کتاب الآثار لابی یوسفؒ ص۲۳ اور طحاوی جلد ۱ ص۱۵۹ اور کتاب الآثار لمحمد ص۱۷ میں بھی ہے مؤلف خیر الکلام نے ص۲۸۷ میں لکھا ہے کہ محدثینؒ کہتے ہیں کہ اس میں امام ابوحنیفہؒ نے غلطی سے جابرؓ کا لفظ بڑھا دیا ہے۔

الجواب: امام ابوحنیفہؒ ثقہ اور ثبت ہیں اور دیگر ثقہ راوی بھی اس حدیث کو اسی طرح بیان کرتے ہیں، اس روایت کے صحیح ہونے میں کوئی شک نہیں ہے ہاں البتہ امام ابوحنیفہؒ اور ان کے تلامذہ سے تعصب اور عناد کا کوئی علاج نہیں ہے اور اس متعصبانہ انداز سے امام صاحبؒ کی جلالت اور حدیث کی صحت پر کوئی زد نہیں آتی۔

سولھویں حدیث: امام محمدؒ[1] فرماتے ہیں کہ ہم سے اسرائیلؒ نے بیان کیا۔ وہ کہتے ہیں کہ ہم سے موسیٰ بن ابی عائشہؒ نے بیان کیا۔ وہ عبداللہ بن شدادؓ سے روایت کرتے ہیں اور وہ فرماتے ہیں:

امر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم فی العصر، قال فقرأ رجل خلفہ فغمزہ الذی یلیہ فلما ان صلی قال لم غمزتنی؟ قال کان رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم قد امك فکرھت ان تقرأ خلفہ فسمعہ النبی صلی اللہ علیہ وسلم فقال من کان لہ امام فان قرأۃ الامام لہ قرأۃ.....

(موطا امام محمدؒ ص۹۹)

کہ آنحضرت صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے عصر کی نماز میں امامت کرائی اور ایک شخص نے آپ کے پیچھے قرأت کی جو نمازی اس کے ساتھ کھڑا تھا، اس نے اس کا بدن فرا دبا دیا تاکہ وہ قرأۃ سے باز آجائے۔ جب نماز ادا ہوچکی تو اس نے کہا تم نے مجھے کیوں ٹہوکا دیا تھا؟ منع کرنے والے نے کہا کہ چونکہ حضور آگے قرأت کرتے تھے میں نے مناسب سمجھا کہ تم بھی قرأت کرو، آپ نے سنا تو ارشاد فرمایا کہ امام کا پڑھنا مقتدی کا پڑھنا ہے

اس روایت کے تمام رواۃ کا ذکر پہلے ہو چکا ہے اور گو اس میں حضرت جابرؓ کا ذکر نہیں لیکن اس میں کوئی حرج نہیں ہے۔ **اولاً** اس لیے کہ حضرت عبداللہ بن شدادؓ خود صغار صحابہؓ میں تھے۔ اور حضرات صحابہؓ کے مراسیل بالاتفاق حجت ہیں۔ **وثانیاً** ویسے بھی کبار تابعینؒ کے مراسیل صحیح اور حجت ہیں جیسا کہ نقل کیا جا چکا ہے۔ **وثالثاً** ہم نے یہ روایت پہلی روایت کی تائید میں پیش کی ہے اور مرسل معتضد کے

---

[1] امام محمدؒ: مؤلف خیر الکلام ص۱۳۳ میں لکھتے ہیں کہ علامہ ذہبیؒ فرماتے ہیں کہ امام نسائیؒ وغیرہ نے امام محمدؒ کو حافظہ کی بنا پر کمزور قرار دیا ہے۔ (محصلہ)

الجواب: مؤلف خیر الکلام ص۳ میں لکھتے ہیں کہ جرح کرنے والا اگر متعنت اور متشدد ہو تو اس کی توثیق تو معتبر ہے مگر جرح نہیں۔ پھر آگے لکھتے ہیں کہ متشددین میں ابوحاتمؒ نسائیؒ ابن معینؒ ابن قطانؒ کو شمار کرتے ہیں۔ بلفظہ۔ لہٰذا امام نسائیؒ کی جرح کا کوئی اعتبار نہیں اور امام محمدؒ ثقہ ہیں جیسا کہ ابتداء کتاب میں باحوالہ ان کی توثیق نقل کردی گئی ہے۔

حجت ہونے میں کوئی شبہ نہیں ہے۔

مؤلف خیر الکلام ص۴۸۹ میں لکھتے ہیں کہ محدثین کا خیال ہے کہ یہ حدیث مرسل ہونے اور امام محمدؒ کی وجہ سے ضعیف ہے۔

الجواب: ہم باحوالہ عرض کر چکے ہیں کہ جمہور محدثین کے نزدیک مرسل صحیح ہے اور یہ بھی عرض کیا جا چکا ہے کہ امام محمدؒ ثقہ ہیں اور امام نسائیؒ متعنت ہیں۔ ان کی جرح کا اعتبار نہیں، امام ابن قدامہؒ فرماتے ہیں کہ

ولنا ما رواہ الامام احمد عن وکیع عن سفیان عن موسٰی بن ابی عائشۃ عن عبد اللہ بن شدادؓ قال قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم من کان لہ امام فان قرأۃ الامام لہ قرأۃ۔ (مغنی ابن قدامۃ جلد ا ص۵۶۲)

اور ہماری دلیل وہ حدیث ہے جو امام احمدؒ نے وکیعؒ سے روایت کی ہے اور وہ سفیانؒ سے اور وہ موسٰیؒ بن ابی عائشہؒ سے اور وہ حضرت عبد اللہؓ بن شدادؓ سے روایت کرتے ہیں وہ فرماتے ہیں کہ آں حضرت صلی اللہ تعالٰے علیہ وسلم نے فرمایا کہ جس کا امام ہو تو بے شک اس کے امام کی قرأت اسی کی قرأت ہے۔

یہ روایت بھی اپنے مفہوم کے لحاظ سے بالکل واضح ہے اور پہلے عرض کیا جا چکا ہے کہ حضرت عبد اللہؓ بن شدادؓ صحابی ہیں، لہٰذا ان کی روایت مرسل صحابی ہونے کے اعتبار سے مرفوع ہے اور اس میں امام محمدؒ بھی نہیں ہیں جن پر فریق ثانی ناک بھوں چڑھاتا ہے۔ امام وکیعؒ بن الجراحؒ کو علامہ ذہبیؒ الامام، الحافظ، الثبت محدث العراق اور احد الائمۃ الاعلام لکھتے ہیں۔ (تذکرہ جلد ا ص۲۸۲) اور سفیانؒ اس سند میں ثوری ہیں جن کا ترجمہ مقدمہ میں بیان ہو چکا ہے اور بقیہ رواۃ کے تراجم بھی پہلے عرض کیے جا چکے ہیں۔

ایک شاہد: امام بیہقیؒ فرماتے ہیں کہ ہم سے قاضی ابو عمروؒ بن حسینؒ بن محمدؒ بن ہیثمؒ نے بیان کیا، وہ فرماتے ہیں کہ ہم سے ابو الحسین عبد الواحدؒ بن حسن نیشاپوریؒ نے بیان کیا۔ وہ کہتے ہیں کہ ہم سے حسینؒ بن مهمان عسکریؒ نے بیان کیا۔ وہ کہتے ہیں کہ ہم سے عبد اللہؒ بن حمادؒ نے بیان کیا۔ وہ کہتے ہیں کہ ہم سے سلیمانؒ بن سلمہؒ نے بیان کیا۔ وہ محمدؒ بن اسحاق اندلسیؒ سے روایت کرتے ہیں۔ وہ کہتے ہیں کہ ہم سے مالکؒ بن انسؒ نے بیان کیا، وہ یحییٰؒ بن سعید انصاریؒ سے اور

وہ سعیدؒ بن المسیبؒ سے اور وہ حضرت نواسؓ بن سمعان سے روایت کرتے ہیں وہ فرماتے ہیں کہ

صلیت مع رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم صلوٰۃ الظہر وکان عن یمینی رجل من الانصار فقرأ خلف النبی صلی اللہ علیہ وسلم وعلی یساری رجل من مزینۃ یلعب بالحصی فلما قضی صلوٰتہ قال من قرأ خلفی؟ قال الانصاری انا یا رسول اللہ قال لا تفعل من کان لہ امام فقرأۃ الامام لہ قرأۃ۔
(کتاب القرأۃ ص۱۳۹)

میں نے آں حضرت صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کے پیچھے ظہر کی نماز پڑھی میرے دائیں پہلو میں ایک انصاری آپ کے پیچھے قرأت کر رہا تھا اور میرے بائیں پہلو میں قبیلہ مزینہ کا ایک شخص سنگریزوں سے کھیل رہا تھا۔ جب آپ نماز سے فارغ ہوئے تو فرمایا کس نے میرے پیچھے قرأت کی ہے؟ انصاری نے کہا کہ میں نے یا رسول اللہؐ! آپ نے فرمایا پھر ایسا نہ کرنا جو شخص امام کی اقتدا اختیار کرلے تو امام کا پڑھنا ہی مقتدی کے لیے کافی ہے۔

امام بیہقیؒ فرماتے ہیں کہ اگر اس روایت کی سند میں محمدؒ بن اسحاق عکاشی ہے۔ تو وہ کذاب تھا ان کان ھو العکاشی... الخ کہتے ہیں واقعی عکاشی کذاب ہے لیکن سند میں اندلسیؒ کا ذکر ہے اگرچہ بعض نے عکاشی اور اندلسی کو ایک کہا ہے لیکن محدث ابن عدیؒ ان کو دو بتاتے ہیں اور فرماتے ہیں ھو رجل لا یعرف یعنی وہ مجہول اور مستور ہے اور حافظ ابن حجرؒ بھی دو ہی قرار دیتے ہیں۔ چنانچہ لکھتے ہیں کہ والراجح التفرقۃ (لسان جلد ۵ ص۶۷) کہ راجح بات یہ ہے کہ دونوں الگ الگ ہیں اور مؤلف خیر الکلام ایک مقام پر لکھتے ہیں کہ ان کے بعض راوی اگرچہ ضعیف ہیں مگر متابعت میں ذکر کرنے سے کوئی ہرج نہیں ہے (ص۳۱۶) اور دوسری جگہ لکھتے ہیں کہ مستور کی روایت کو متابعت میں ذکر کرنے سے کوئی ہرج نہیں ہے (ص۲۲۵) اور یہ روایت ہم نے بھی صرف تائید اور شاہد کے لیے پیش کی ہے تو اس میں کیا ہرج ہے؟ بہر حال ہمارا استدلال اس روایت سے نہیں بلکہ محض شاہد کے طور پر ہم نے اس کو نقل کیا ہے۔

ان سابق پیش کردہ روایات سے معلوم ہوا کہ ظہر اور عصر کی قید کو صرف امام ابو حنیفہؒ ہی نہیں بیان کرتے بلکہ دوسرے ثقہ راوی بھی اس کو بیان اور نقل کرتے ہیں۔ اس شاہد کے علاوہ تین روایتیں بسند صحیح نقل کی جاچکی ہیں۔ جن میں ظہر یا عصر کی قید موجود ہے۔ اس شاہد کو چھوڑ کر بھی امام ابو حنیفہؒ

کے علاوہ اسرائیلؒ اور طلحہؒ (جو دونوں ثقہ اور ثبت راوی ہیں) اپنی روایت میں ظہر یا عصر کی نماز کا ذکر کرتے ہیں۔ لہٰذا جو حضرات ظہر وغیرہ کی قید بیان کرنے میں صرف امام ابو حنیفہ رحؒ کو متفرد کہتے ہیں۔ ان کی تحقیق صحیح نہیں ہے۔

سترھویں حدیث: امام بیہقیؒ فرماتے ہیں کہ ہم سے حافظ ابو عبداللہؒ نے بیان کیا وہ فرماتے ہیں کہ ہم سے حافظ ابو علیؒ نے بیان کیا۔ وہ فرماتے ہیں کہ ہم سے عبداللہؒ بن سلیمانؒ بن الاشعثؒ نے بیان کیا۔ وہ فرماتے ہیں کہ ہم سے عبدالملکؒ بن شعیبؒ بن لیثؒ بن سعدؒ نے بیان کیا۔ وہ فرماتے ہیں کہ ہم سے عبداللہؒ بن وہبؒ نے بیان کیا۔ وہ فرماتے ہیں کہ مجھ سے لیثؒ بن سعدؒ نے بیان کیا۔ وہ طلحہؒ سے روایت کرتے ہیں وہ موسیٰؒ بن ابی عائشہؒ سے، وہ عبداللہؓ بن شدادؓ بن الہاد سے، وہ

۱؎ امام بیہقیؒ کا ترجمہ ص۱۱۷ میں اور حافظ ابو عبداللہؒ اور حافظ ابو علیؒ کا باب اول میں مجاہدؒ بن جبیرؒ کے اثر کے ذیل میں اور لیثؒ بن سعدؒ کا مقدمہ میں اور موسیٰؒ بن ابی عائشہؒ اور عبداللہؓ بن شدادؓ کا عنقریب گذر چکا ہے۔ عبداللہؒ بن اشعثؒ علامہ ذہبیؒ ان کو الحافظ اور الثقہ (میزان جلد ۲ ص۴۳) اور العلامۃ اور قدوۃ المحدثین اور الحافظ الکبیر لکھتے ہیں۔ (تذکرہ جلد ۲ ص۲۹۸) حافظ ابن حجرؒ لکھتے ہیں کہ وہ من کبار الحفاظ اور من ائمۃ الاعلام تھے (لسان جلد ۳ ص۲۹۵) محدث خلیلیؒ کا بیان ہے کہ وہ حافظ اور امام وقت اور متفق علیہ تھے (ایضاً ص۲۹۶) اور وہ امام ابوداؤدؒ صاحب سنن کے فرزند ارجمند تھے۔

۲؎ ابو حاتمؒ ان کو صدوق اور نسائیؒ ثقہ کہتے ہیں، ابن حبانؒ ان کو ثقات میں لکھتے ہیں، صحیح مسلم میں ان کی پچاس حدیثیں ہیں (تہذیب التہذیب جلد ۶ ص۳۹۸) حافظ ابن حجرؒ لکھتے ہیں کہ وہ ثقہ تھے (تقریب ص۲۴۵)

۳؎ علامہ ذہبیؒ لکھتے ہیں کہ وہ الامام، الحافظ، الفقیہ اور احد الائمۃ الاعلام تھے۔ ایک لاکھ حدیث ان سے مروی ہے (تذکرہ جلد ۱ ص۲۸۰) خلیلیؒ کا بیان ہے کہ وہ بالاتفاق ثقہ تھے۔ (تہذیب التہذیب ج۶ ص۷۳)

۴؎ امام احمدؒ ان کو لا بأس بہ، ابن معینؒ ان کو معروف، ابو زرعہؒ ان کو ثقہ اور ابو حاتمؒ ان کو صالح کہتے ہیں۔ امام لیثؒ ان کی تعریف کرتے تھے۔ ابن حبانؒ ان کو ثقات میں لکھتے ہیں (ایضاً جلد ۵ ص۱۶) حافظ ابن حجرؒ لکھتے ہیں کہ وہ ثقہ تھے (تقریب ص۱۸۱) اور تہذیب التہذیب وغیرہ میں تصریح ہے کہ لیثؒ بن سعدؒ نے اسی طلحہؒ سے روایت کی ہے روی عنہ اللیث ..... الخ اور اس سند میں بھی لیثؒ بن سعدؒ، طلحہؒ سے روایت کرتے ہیں، پتہ نہیں چلتا کہ مؤلف خیر الکلام نے ص۲۸۵ میں یہ کہہ کر جان چھڑانے کی ناکام سعی کی ہے۔

ابو الولید سے اور وہ حضرت جابرؓ سے روایت کرتے ہیں۔ وہ فرماتے ہیں:

ان رجلاً صلی خلف النبی صلی اللہ علیہ وسلم فی الظہر والعصر یعنی یقرأ فاومی الیہ رجل فنہاہ فابیٰ فلما انصرف قال اتنہانی ان اقرأ خلف النبی صلی اللہ علیہ وسلم فتذاکرا حتی سمع النبی صلی اللہ علیہ وسلم فقال رسول اللہ علیہ وسلم من صلی خلف امام فان قرأۃ الامام لہ قرأۃ۔

(کتاب القرأۃ ص ۱۰۲)

کہ ظہر یا عصر کی نماز میں ایک شخص نے آں حضرت صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کے پیچھے قرأت کی۔ اثنائے نماز میں ایک آدمی نے اشارہ سے اس کو قرأت سے منع کیا۔ لیکن وہ قرأت سے باز نہ آیا۔ جب نماز سے فارغ ہوئے تو قرأت کرنیوالے نے منع کرنے والے کو کہا کہ تم مجھے آں حضرت صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کے پیچھے قرأت سے کیوں روکتے ہو؟ دونوں آپس میں تکرار کر رہے تھے کہ آپ نے ان کی گفتگو سن لی اور ارشاد فرمایا کہ جو شخص امام کے پیچھے نماز پڑھتا ہو اس کو (الگ قرأت نہیں کرنی چاہیے بلکہ) امام کی قرأت ہی اس کو کافی اور بس ہے۔

اور اس روایت کا ذکر اپنی سند کے ساتھ امام ابن قدامہؒ نے بھی کیا ہے مگر اس میں ظہر یا عصر کا ذکر نہیں اور آخر میں ہے:

فقال رسول صلی اللہ علیہ وسلم اذا کان لک امام یقرأ فان قراتہ لک قرأۃ۔ (مغنی ج ۱ ص ۶۰۹)

کہ آں حضرت صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے فرمایا کہ جب تیرا امام قرأۃ کر رہا ہو تو اس کی قرأت ہی تیرے لیے کافی ہے۔

اس صحیح روایت میں ظہر یا عصر کی نماز کا ذکر ہے جو بالاتفاق سری نمازیں ہیں۔ اور آپ کے پیچھے قرأۃ کرنیوالا صرف ایک شخص تھا حالانکہ حضرات صحابہ کرامؓ جس طرح نماز اور جماعت کی پابندی کرتے وہ اور کس سے ہو سکتی ہے؟ اور ان میں سے ہر ایک کی یہی دلی خواہش ہوتی تھی کہ آں حضرت صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کی اقتدا میں نماز پڑھی جائے مگر باوجود اتنی بڑی جماعت کے کثیر التعداد حضرات صحابہؓ میں سری نماز میں آپ کے پیچھے قرأۃ کرنیوالا صرف ایک ہی شخص ملتا ہے اور باقی سب خاموش رہتے ہیں۔ لیکن آں حضرت صلی اللہ تعالیٰ علیہ وآلہ وسلم اس ایک شخص کی قرأت کو بھی گوارا نہیں فرماتے اور اس کو امام کے پیچھے قرأت کرنے سے منع کرتے ہیں۔ اگر امام کے پیچھے قرأت کرنے کی اجازت ہوتی خصوصاً سری نمازوں میں تو یقیناً آپ اس کی تائید فرماتے اور قرأت سے روکنے والے کو تنبیہ فرماتے اور اگر

امام کے پیچھے قرأت کی گنجائش ہوتی خاص کر سری نمازوں میں تو عین نماز کی حالت میں احسانِ صلوٰۃ سے صرفِ نظر کرتے ہوئے منع کرنے والے صحابی قرآت کرنے والے کو منع کرنے کی کبھی جرأت نہ کرتے۔ اور اگر سری نمازوں میں امام کے پیچھے قرآت کا استحباب یا جواز بھی ہوتا تو منع کرنیوالے کو آپ فرما دیتے کہ ایک جائز اور مستحب حکم کی وجہ سے تم نے نماز میں اپنی توجہ کیوں دوسری طرف مبذول کر دی تھی؟ اور دوسرے حضرات صحابہ کرامؓ بھی منع کرنیوالے کو یہ نہیں کہتے کہ بھائی تم نے اثنائے نماز میں بلاوجہ اس سے الجھنے کی کوشش کی ہے، یہ بھی تو اچھا کام ہی کر رہا تھا۔ اگر انصاف سے کام لیا جائے تو بغیر کسی خارجی قرینہ کے یہ روایت اس پر دلالت کرتی ہے کہ جہری نمازوں کا تو قصہ ہی چھوڑ دیے ان میں بھلا امام کے پیچھے قرآت کی کب اجازت نکل سکتی ہے؟ سری نمازوں میں بھی امام کے پیچھے قرآۃ کرنا نہ تو جائز ہے اور نہ مستحب پھر ضروری کہاں سے ہوگا؟ اور چونکہ آں حضرت صلی اللہ تعالیٰ علیہ وآلہٖ وسلم نے مطلق قرآۃ سے منع کیا ہے۔ اس لیے اس کو محض اپنی رائے سے قرآۃ دون قرآۃ پر حمل کرنا باطل اور مردود ہوگا۔ اور یہ روایت حضرت جابرؓ سے مروی ہے، جو قرأت کا اوّلین اطلاق سورۂ فاتحہ اور ام الکتاب میں منحصر سمجھتے ہیں۔ لہٰذا قرأت کو ما زاد علی الفاتحہ پر حمل کرنا توجیہ القول بما لا یرضی بہ قائلہ کا ارتکاب کرنا ہوگا۔ جو محض بے بنیاد اور بیکار ہے۔

پہلا اعتراض: امام بیہقیؒ فرماتے ہیں کہ اس روایت میں لیثؒ سے اوپر کی سند میں عبدالملکؒ بن شعیبؒ نے غلطی کی ہے ...... الخ (کتاب القرآۃ ص۱۰۲) اور اسی کا ذکر مؤلف خیر الکلام نے ص۸۴ میں کیا ہے۔)

جواب: جب یہ راوی بالاتفاق ثقہ ہیں اور با دلائل پہلے یہ بات نقل کی جا چکی ہے کہ ثقہ کی زیادت متن اور سند دونوں میں بالاجماع حجت ہے اور یہ بھی ثابت کیا جا چکا ہے کہ جب حدیث کے ارسال اور اتصال اور رفع و وقف کے بارے میں ثقہ رواۃ کا اختلاف ہو تو بالاتفاق وہ حدیث موصول اور مرفوع ہی متصور ہوگی اور ثقہ رواۃ کی تحدیث صحیح ہوتی ہے اس لیے امام بیہقیؒ وغیرہ کا یہ خلافِ اصول اعتراض قابلِ التفات نہیں ہو سکتا۔

یہ حدیث بھی بہر حال موصول اور مرفوع ہی ہو گی۔

دوسرا اعتراض: امام بیہقیؒ اور امام دارقطنیؒ وغیرہ فرماتے ہیں کہ اس حدیث کی سند میں ابو الولید مجہول ہے تو یہ روایت کیسے صحیح ہو سکتی ہے؟ (کتاب القرأت ص۱۰۳ و دارقطنی جلد ۱ ص۱۲۳ اور مؤلف خیر الکلام ص ۴۸۳ میں لکھتے ہیں کہ اس کی سند میں ابو الولید مجہول ہے۔ لہٰذا یہ قابل اعتبار نہیں)

جواب: واقعی یہ اعتراض قدرے معقول نما ہے لیکن درحقیقت یہ بھی نہایت ہی سطحی ہے اور غلط فہمی کا نتیجہ ہے، کیونکہ ابو الولید کوئی الگ اور جداگانہ ہستی نہیں، بلکہ ابو الولید عبد اللہؓ بن شدادؓ کی کنیت تھی۔ چنانچہ امام حاکمؒ لکھتے ہیں:

عبد اللہؓ بن شدادؓ هو بنفسه ابو الوليد ومن تهاون بمعرفة الاسامي اورثه مثل هذا الوهم۔

یعنی ابو الولید خود بعینہٖ عبد اللہؓ بن شدادؓ تھے لیکن جن لوگوں نے رواۃ کے ناموں میں غفلت اور کوتاہی سے کام لیا ان کو ایسا وہم ہو جانا کچھ بعید نہیں ہے۔

پھر آگے تحریر فرماتے ہیں کہ

عبد اللہؓ بن شدادؓ اصله مدینی وكنيته ابو الوليد۔

عبد اللہؓ بن شدادؓ در اصل مدنی تھے اور ابو الولید ان کی کنیت تھی۔

(معرفت علوم الحدیث، طبع قاہرہ ص۱۸۱)

؎ لطیفہ: امام بیہقیؒ لکھتے ہیں کہ بعض نے ایک طریق سے یہ روایت نقل کی ہے اور اس میں ابو الولید کا جملہ ساقط کر دیا ہے اور دوسرے طریق میں عبد اللہؓ بن شدادؓ کا نام اڑا دیا ہے اور یہ مغالطہ دینے کی کوشش کی ہے کہ ابو الولید عبد اللہؓ بن شدادؓ کی کنیت ہے، لیکن یہ انصاف سے بعید ہے۔ (کتاب القرأۃ ص۱۰۳) امام حاکمؒ وغیرہ نے امام بیہقیؒ کا مغالطہ تو ایسا نکالا کہ ان کو شاید لب کشائی کی ہمت ہی نہ رہے۔ مگر خود انھوں نے سنن الکبریٰ جلد ۲ ص۱۵۹ میں ابو الولید کا جملہ ساقط کر دیا ہے اور پہلے نقل کیا جا چکا ہے کہ امام بیہقیؒ نے امام مسلمؒ کی ایک عبارت میں مغالطہ دینے کی سعی فرمائی ہے۔ فسامحه الله تعالى بعموم فضله۔

علاوہ ازیں تاریخ بغدادی جلد ۹ ص ۴۷۳، جامع المسانید جلد ۱ ص ۳۱۳، کتاب الکنیٰ دولابی ؒ جلد ۲ ص ۱۴۳، تہذیب التہذیب جلد ۵ ص ۲۵۱، لسان المیزان جلد ۹ ص ۲۲۵، تقریب ص ۲۰۲ اور توجیہ النظر ص ۱۹۱ وغیرہ کتابوں میں اس کی تصریح موجود ہے کہ ابوالولید عبداللہ بن شدادؓ کی کنیت تھی، گویا اس لحاظ سے سند کی اصلی عبارت یوں تھی: عن عبد اللہ بن شداد ابی الولید ... الخ رواۃ میں سے کسی نے ابوالولید کو سابق سے الگ سمجھ کر ایک جدا ہستی اور مستقل راوی سمجھ لیا ہے اور اسی حقیقت کو امام بیہقیؒ اور دارقطنیؒ نہ پا سکے۔ عربی زبان میں کنیت نام سے پہلے بھی آتی ہے اور نام کے بعد بھی آسکتی ہے۔ مثلاً دیکھئے محمدؒ بن عبدالرحمٰنؒ ابوالاسود، محمدؒ بن المقاتلؒ ابوالحسن (صحیح بخاری جلد ۱ ص ۱۹۱ وغیرہ) اور یحییٰؒ بن یحییٰؒ ابوزکریا (بخاری جلد ۲ ص ۶۴۰ وغیرہ) وغیرہ وغیرہ اور جملہ ابوالولید اعادۂ جار کے ساتھ عبداللہؓ بن شدادؓ سے بدل بھی ہوسکتا ہے۔ (ہامش شرح نخبۃ ص ۱۱۷)

مؤلف خیر الکلام کا صریح بہتان: جب ان ٹھوس حوالوں سے مؤلف مذکور کا سر چکرایا تو انھوں نے یہ لکھ مارا کہ پھر امام حاکمؒ تو غلطی کی نسبت امام ابوحنیفہؒ کی طرف کر رہے ہیں کہ وہ ابوالولید کو الگ سمجھ کر سند میں بڑھا رہے ہیں کیونکہ ان کو رواۃ کے اسامی کی معرفت نہیں ... الخ ص ۴۸۱) حالانکہ یہ امام حاکمؒ پر خالص بہتان ہے۔ امام حاکمؒ نے اوّل سے آخر تک اس عبارت میں کہیں اس کی تصریح نہیں کی کہ اس میں امام ابوحنیفہؒ نے غلطی کی ہے وہ تو من تهاون بمعرفة الاسامی اورثه مثل هذا الوهم کے عمومی الفاظ بول رہے ہیں کیونکہ مَنْ شرطیہ عموم کے لیے ہوتا ہے جیسا کہ بیان ہوگا، لیکن غیر مقلدین کے شیخ الحدیث کے نزدیک اس حرف مَنْ سے صرف امام ابوحنیفہؒ ہی مراد ہیں۔ اور (ص ۴۸۰ میں مؤلف مذکور لکھتے ہیں کہ اسی بنا پر حاکم نے امام ابوحنیفہؒ پر اعتراض کیا ہے ___ اور آگے لکھتے ہیں کہ امام ابوحنیفہؒ کو مورد طعن قرار دیا ہے ..... الخ امام حاکمؒ نے اس وہم کی نسبت قطعاً امام ابوحنیفہؒ کی طرف نہیں کی۔ وہ تو حرف من استعمال کر رہے ہیں جو غیر مقلدین حضرات کے شیخ الحدیث کے نزدیک عموم کے لیے نص قطعی ہے جیسا کہ اپنے مقام پر بیان ہوگا انشاء اللہ تعالیٰ یہ ہے ان کی دیانت۔ فوا اسفا۔

اٹھارھویں حدیث: امام حاکمؒ فرماتے ہیں کہ ہم سے ابو احمد بکرؒ بن محمدؒ بن حمدانؒ الصیرفیؒ نے بیان کیا۔ وہ فرماتے ہیں کہ ہم سے عبد الصمدؒ بن فضل البلخیؒ نے بیان کیا۔ وہ فرماتے ہیں کہ ہم سے مکیؒ بن ابراہیمؒ نے بیان کیا۔ وہ امام ابو حنیفہؒ سے روایت کرتے ہیں اور وہ موسیٰؒ بن ابی عائشہؒ سے اور وہ عبد اللہؒ بن شدادؒ بن الهاد سے اور وہ حضرت جابر رضی اللہ عنہ سے۔

ان رجلا قرأ خلف رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم فی الظهر او العصر فاومأ الیہ رجل فنهاه فلما انصرف قال اتنهانی (الحدیث)

(بحوالہ روح المعانی جلد ۹ صلا۱۳۴)

وہ فرماتے ہیں کہ ظہر یا عصر کی نماز میں ایک شخص آں حضرت صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کے پیچھے قرأت کر رہا تھا۔ نماز ہی کی حالت میں ایک شخص نے اشارہ سے اسے قرأت کرنے سے منع کیا مگر وہ باز نہ آیا۔ نماز کے بعد کہنے لگا تم مجھے قرأت سے منع کرتے ہو؟

یہ روایت امام ابو یوسفؒ کی کتاب الآثار صلا۲۳ میں بھی ہے اس کے آخر میں ہے کہ آں حضرت صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے فرمایا کہ من صلّی خلف امام فان قرأۃ الامام لہ قرأۃ۔

آگے روایت کا بعینہٖ وہی مضمون ہے جو پہلے گزر چکا ہے۔ پہلی روایت میں اصل مضمون اور اس کی تشریح دیکھ لیں۔ امام حاکمؒ مستدرک جلد ۱ صلا۴۹۶، ۲ صلا۴۲۲ وغیرہ میں ایک سند اس طرح پیش کرتے ہیں۔ اخبرنا بکرؒ بن محمدؒ بن حمدانؒ الصیرفی نا عبد الصمدؒ بن الفضل البلخیؒ نا مکیؒ بن ابراهیمؒ .... الخ اور فرماتے ہیں۔ صحیح ہے علامہ ذہبیؒ تلخیص المستدرک میں اس کے بارے میں صحیحؒ کہتے ہوئے صحت کا فیصلہ صادر کرتے ہیں اور بقیہ رواۃ کا ترجمہ گذر چکا ہے۔ مؤلف خیر الکلام صلا۴۸۸ میں لکھتے ہیں کہ اس حدیث کے جملہ راوی سوائے امام ابو حنیفہ رح کے ثقہ ہیں اور جابرؓ کے ذکر میں امام ابو حنیفہ رح کی طرف غلطی کی نسبت کی گئی ہے ... الخ اور اس سے پہلے بحوالہ سنن الکبریٰ جلد ۲ صلا۱۵۹ لکھتے ہیں کہ ایک جماعت نے امام ابو حنیفہ رح سے اسی طرح موصول بیان کی ہے اور عبد اللہؒ بن المبارکؒ نے ان سے مرسل بیان کی ہے۔ جابرؓ کا ذکر نہیں کیا اور یہی محفوظ ہے۔

الجواب: پہلے عرض کیا جا چکا ہے کہ امام ابو حنیفہؒ ثقہ اور ثبت تھے لہٰذا ان کی تضعیف بغیر تعصب کے اور کوئی حقیقت نہیں رکھتی اور حسب امام بیہقیؒ خود فرماتے ہیں کہ روایت کی ایک

خاصی جماعت اس روایت کو موصول بیان کرتی ہے اور اس میں حضرت جابرؓ کا ذکر ہے اور تنہا امام ابن مبارکؒ اس کو مرسل بیان کرتے ہیں تو جماعت کی روایت موصول ہی کیوں نہ محفوظ ہو جب کہ حقیقۃً وہ ہے بھی صحیح محفوظ اور موصول۔

انیسویں حدیث: امام حاکمؒ فرماتے ہیں کہ ہم سے حافظ ابو علیؒ نے بیان کیا۔ وہ فرماتے ہیں کہ ہم سے ابو یحییٰ زکریا[۱] بن الحارثؒ نے بیان کیا وہ فرماتے کہ ہم سے محمد بن ازہر سجزیؒ[۲] نے بیان کیا وہ فرماتے ہیں کہ ہم سے خلف[۳] بن ایوبؒ نے بیان کیا وہ فرماتے ہیں کہ ہم سے قاضی ابو یوسفؒ[۴] نے بیان کیا۔ وہ امام ابو حنیفہ رحؒ سے روایت کرتے ہیں۔ وہ موسیٰؒ بن ابی عائشہؒ سے اور وہ عبد اللہؓ بن شداد ابو الولیدؓ سے اور حضرت جابرؓ سے اور وہ آں حضرت صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم سے روایت کرتے ہیں، آپ نے ارشاد فرمایا:

من صلّٰی خلف امام فانّ قرأتہ لہ قراۃ۔ کہ جو آدمی امام کے پیچھے نماز پڑھے سو اس کے امام کا پڑھنا مقتدی کا پڑھنا ہے۔ (اس کو الگ قرأت کی ضرورت نہیں) (معرفت علوم الحدیث ص ۱۷۰، طبع قاہرہ)

---

[۱] علامہ عبد القادر القرشیؒ لکھتے ہیں کہ الامام المثی الفقیہ احد مشائخ اصحاب ابی حنیفۃ فی عصرہ واحد العباد تھے۔ (الجواہر جلد ۱ ص ۲۴۵)

[۲] علامہ عبد القادر القرشیؒ لکھتے ہیں کہ وہ من آئمۃ اصحابنا الخراسانیین اور اصحاب طبقہ عالیہ میں تھے۔ (الجواہر المضیہ جلد ۲ ص ۳۱) اور فاضل لکھنویؒ نے ان کی بڑی تعریف کی ہے۔ (فوائد بہیہ ص ۱۶۰)

[۳] محدث ابن حبانؒ ان کو ثقات میں لکھتے ہیں۔ علامہ خلیلیؒ ان کو صدوق اور مشہور کہتے ہیں۔ (تہذیب التہذیب جلد ۳ ص ۱۴۸)، علامہ ذہبیؒ کا بیان ہے کہ وہ احد الفقہاء الاعلام، صاحب علم، عامل اور بڑے خدا پرست تھے (میزان جلد ۱ ص ۳۱۱)

[۴] قاضی ابو یوسفؒ اور امام ابو حنیفہ رحؒ کا ترجمہ مقدمہ میں نقل کیا جا چکا ہے اور دیگر رواۃ کے تراجم بھی بیان کر دیے گئے ہیں

فائدہ: محدثین کرامؒ کی اصطلاح میں سند کے ایک راوی کے بدلنے سے روایت بدل جاتی ہے۔ اسی اصول کے پیش نظر ہم نے ان حدیثوں کا الگ الگ شمار کیا ہے۔ اس امر کو بخوبی ملحوظ رکھیں تاکہ غلط فہمی پیدا نہ ہو۔

یہ روایت بھی سند کے لحاظ سے بالکل صحیح ہے جیسا کہ آپ ملاحظہ کر چکے ہیں۔ علامہ ذہبیؒ ایک سند کو جس میں انا ابو یوسف القاضیؒ انا ابو حنیفہؒ ... الخ آتا ہے لکھتے ہیں: ھٰذا اسناد متصل عال (تذکرہ جلد ۱ ص ۱۷۲) کہ یہ سند متصل اور بلند پایہ ہے اور مضمون و مفہوم کے اعتبار سے بھی یہ روایت واضح ہے جیسا کہ ظاہر ہے۔ مؤلف خیر الکلام سے رہا نہیں گیا۔ صفحہ ۴۹۰ میں لکھتے ہیں کہ یہ حدیث بھی امام ابو حنیفہؒ کی ہے ... الخ

الجواب: ہاں یہ روایت امام ابو حنیفہؒ سے مروی ہے جو ثقہ اور ثبت ہیں بغیر کسی متعصب کے کون ان کی روایت کو رد کر سکتا ہے؟ جن کی علمی تحقیق سے امام یحییٰ القطانؒ اور ابن معینؒ وغیرہ ائمہ جرح و تعدیل نے اپنے دامن بھرے اور ان کی تقلید کو اپنے گلے کا ہار بنایا ہے۔ دیکھئے طائفہ منصورہ اور مقام ابی حنیفہؒ وغیرہ۔ رہا مؤلف خیر الکلام کا ص ۴۹۷ میں بحوالہ تحقیق الکلام جلد ۱ ص ۱۳۶ یہ لکھنا کہ ابن عبد البرؒ نے لکھا ہے کہ وہ اہلحدیث کے ہاں سئ الحفظ ہیں اور علی بن المدینیؒ نے سخت ضعیف کہا ہے (محصلہ) تو یہ بے سود ہے خود مؤلف خیر الکلام ص ۴۹ الرفع والتکمیل ص ۸ کے حوالہ سے لکھتے ہیں کہ سئ الحفظ جرح غیر مفسر ہے جو قابل اعتبار نہیں (محصلہ) اور اسی صفحہ میں لکھتے ہیں کہ اگر تعدیل کرنے والے زیادہ ہوں تو ان کا اعتبار ہوگا۔ اور ہم مبسوط اور با حوالہ بحث عرض کر چکے ہیں کہ اکثر امت نے امام موصوفؒ کو ثقہ کہا ہے اور مؤلف خیر الکلام ص ۲۱ میں لکھتے ہیں کہ اور مبہم جرح توثیق کے بعد مقبول نہیں ہوتی۔ اور ص ۲۲ میں لکھتے ہیں کہ توثیق کے بعد جرح غیر مفسر معتبر نہیں ہوتی پس وہ قطعاً ثقہ ہے ... الخ اور یہی ہم کہنا چاہتے ہیں اور ان صحیح روایات سے بخوبی یہ اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ حضرت امام ابو حنیفہؒ کے علاوہ امام سفیان ثوریؒ، شریکؒ، طلحہؒ اور ابو الزبیرؒ وغیرہ اس روایت کو موصول بیان کرتے ہیں اور حضرت جابرؓ کا ہر روایت میں ذکر آتا ہے۔ اسی طرح امام ابو حنیفہؒ سے قاضی ابو یوسفؒ مکیؒ بن ابراہیمؒ اور محمد بن الحسنؒ وغیرہ بلکہ بقول امام بیہقیؒ محدثین کی ایک خاصی جماعت اس روایت کو موصول بیان کرتی ہے اور ظہر یا عصر کی قید بیان کرنے میں بھی امام ابو حنیفہؒ متفرد نہیں جیسا کہ آپ ملاحظہ کر چکے ہیں اور ہر ایک روایت کے ایک ایک راوی کی توثیق بھی عرض کر دی گئی ہے۔ اندریں حالات یہ دعویٰ کرنا کہ امام ابو حنیفہؒ اس میں متفرد ہیں یا ان کا کوئی شاگرد متفرد ہے، یا یہ روایتیں معلول ہیں۔ انصاف کا خون کرنا ہے۔ یہ

باحوالہ دلائل بھی دیکھیے اور مؤلف خیر الکلام کی ہوائی طفل تسلی بھی دیکھئے کہ خلاصۂ کلام یہ ہوا کہ یہ حدیث مرسل ہے اور مرسل ضعیف ہوتی ہے اور موصول بیان کرنے والے صرف امام ابوحنیفہؒ ہیں باقی روات سب کے سب ضعیف یا مجہول ہیں... الخ لا حول ولا قوۃ الا باللہ۔

بلیسویں روایت: امامؒ دارقطنیؒ فرماتے ہیں کہ ہم سے محمدؒ بن مخلدؒ نے بیان کیا۔ وہ فرماتے ہیں کہ ہم سے شعیبؒ بن ایوبؒ وغیرہ نے بیان کیا۔ وہ فرماتے ہیں کہ ہم سے زیدؒ بن حبابؒ نے بیان وہ فرماتے ہیں کہ ہم سے معاویہؒ بن صالحؒ نے بیان کیا، وہ فرماتے ہیں کہ ہم سے ابوالزاہریہؒ نے بیان کیا۔ وہ کثیرؒ بن مرۃؒ سے روایت کرتے ہیں اور وہ حضرت ابوالدرداءؓ سے۔ وہ فرماتے ہیں:

۱؎ علامہ ذہبیؒ ان کو الامام شیخ الاسلام اور حافظ زمان لکھتے ہیں (تذکرہ جلد ۳ ص ۱۸۳)

۲؎ حافظ ابن حجرؒ ان کو ثقہ مشہور اور اعلم اہل عصرہ لکھتے ہیں۔ (لسان المیزان جلد ۵ ص ۳۷۴)

۳؎ دارقطنیؒ کہتے ہیں کہ وہ ثقہ تھے، ابن حبانؒ ان کو ثقات میں لکھتے ہیں۔ امام حاکمؒ ان کو ثقہ اور مامون کہتے ہیں (تہذیب التہذیب جلد ۴ ص ۳۴۹)

۴؎ علامہ ذہبیؒ ان کو العابد الثقہ اور الصدوق لکھتے ہیں۔ (میزان جلد ۱ ص ۳۶۲ و تذکرہ جلد ۱ ص ۳۲۰)

علامہ خطیبؒ ان کو صاحب حدیث اور وانا محدث لکھتے ہیں۔ (بغدادی جلد ۸ ص ۴۴۳) امام ابن معینؒ علیؒ بن مدینیؒ عجلیؒ، ابوجعفر بستیؒ، احمدؒ بن صالحؒ، دارقطنیؒ، ابن ماکولاؒ اور یعقوبؒ بن شیبہؒ سب ان کو ثقہ کہتے ہیں، ابن حبانؒ اور ابن شاہینؒ ان کو ثقات میں لکھتے ہیں۔ ابن یونسؒ ان کو حسن الحدیث اور ابو حاتمؒ صدوق اور صالح کہتے ہیں (تہذیب التہذیب جلد ۳ ص ۴۰۳)

۵؎ ان کا ترجمہ باب اول میں حضرت ابن عباسؓ کے اثر کے ذیل میں گذر چکا ہے۔

۶؎ امام ابن معینؒ عجلیؒ، یعقوبؒ بن سفیانؒ اور نسائیؒ ان کو ثقہ کہتے ہیں۔ ابوحاتمؒ اور دارقطنیؒ لا بأس به اور ابن سعدؒ ان کو ثقہ اور کثیر الحدیث کہتے ہیں، ابن حبانؒ ثقات میں لکھتے ہیں۔ (ایضاً جلد ۱۰ ص ۲۱۸)

۷؎ علامہ ابن سعدؒ اور عجلیؒ ان کو ثقہ اور ابن خراشؒ صدوق کہتے ہیں، نسائیؒ لا بأس به کہتے ہیں اور ابن حبانؒ ثقات میں لکھتے ہیں (ایضاً جلد ۸ ص ۴۲۹) حافظ ذہبیؒ ان کو الفقیہ، امام عالم، عامل اور عالم اہل حمص لکھتے ہیں۔ (تذکرہ جلد ۱ ص ۴۹)

سُئل رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم افی کل صلوٰۃ قرأۃ قال نعم فقال رجل من الانصار وجبت ھذہ فقال لی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم وکنت اقرب القوم الیہ ما اری الامام اذا ام القوم الا کفاھم۔

(دارقطنی جلد ۱ ص ۱۲۶)

کہ جناب رسول خدا صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم سے سوال کیا گیا کیا ہر نماز میں قرأۃ ہے ؟ آپ نے فرمایا ہاں۔ ایک انصاریؓ نے کہا پھر تو قرأت ضروری ہوگئی ؟ ابوالدرداءؓ فرماتے ہیں کہ میں تمام اہل مجلس میں جناب رسول خدا صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کے قریب تھا۔ آپ نے مجھ سے خطاب کرتے ہوئے فرمایا میں یہی جانتا ہوں کہ امام کی قرأت مقتدیوں کو کافی ہے۔

یہ روایت مسند احمد جلد ۵ صـ ۴۴۸، نسائی جلد ۱ صـ ۱۰۱، کتاب القرأۃ ص ۱۱۸ و سنن الکبریٰ جلد ۲ صـ ۱۶۲، طحاوی جلد ۱ صـ ۱۲۹ اور مجمع الزوائد جلد ۲ صـ ۱۱۱ وغیرہ کتابوں میں مذکور ہے۔ ہیثمیؒ فرماتے ہیں۔ (اسنادہ حسن) اس روایت میں حضرت ابوالدرداءؓ اس بات کی تصریح کرتے ہیں کہ یہ مسئلہ جناب رسولِ خدا صلی اللہ تعالیٰ علیہ وآلہ وسلم سے دریافت کیا گیا تھا۔ اور جواب بھی آپ ہی نے ارشاد فرمایا ہے اور حضرت ابوالدرداءؓ جلیل القدر صحابی تھے۔ اس لیے غیر رسول اور جناب رسول خدا صلی اللہ تعالیٰ علیہ وآلہ وسلم میں یقیناً فرق اور تمیز کرتے ہوں گے۔ اور اس کی بھی تصریح کرتے ہیں کہ میں سب سے زیادہ آپ کے قریب تھا۔ اور آپ نے خطاب کرتے وقت اور جواب دیتے وقت خاص طور پر میری طرف توجہ فرمائی تھی۔ اگر اتنے قومی اور اندرونی قرائن کے ہوتے ہوئے بھی یہ روایت مرفوع نہیں تو کونسی روایت علم حدیث میں مرفوع ہوگی ؟ چونکہ اس روایت میں سری اور جہری کی کوئی قید مذکور نہیں ہے اس لیے یہ تمام نمازوں کو شامل ہے۔ مؤلف خیر الکلام کا یہ کہنا کہ وہ ما زاد یا جہر پر محمول ہے۔ (صـ ۳۲۱) بالکل مردود ہے کیونکہ بقول مؤلف مذکور قرأت سورۂ فاتحہ سے ہی شروع ہوتی ہے (کما مر) پھر اس کو ما زاد پر کون حمل کرنے دیتا ہے ؟ اور روایت میں لفظ قرأت ہے جہر نہیں قرأ کو جہر پہ حمل بالکل بے بنیاد ہے۔ اور ایسی رکیک اور دور از کار توجیہات کون سنتا ہے ؟

اعتراض : امام نسائیؒ، دارقطنیؒ اور بیہقیؒ فرماتے ہیں کہ یہ روایت حضرت ابوالدرداءؓ پر موقوف ہے۔ زیدؒ بن حبابؒ نے اس حدیث کو مرفوع بیان کرنے میں غلطی کی ہے۔ (نسائی

جلد ۱ ص ۱۰۱، دارقطنی جلد ۱ ص ۱۲۶، کتاب القرأۃ ص ۱۱۵ اور یہی باتیں مؤلف خیر الکلام نے دہراتی ہیں۔ ملاحظہ ہو ص ۴۹۹ و ص ۵۰۰ و ص ۵۰۱) اور یہی کچھ ترجمان الحدیث ماہ دسمبر ۱۹۷۴ء ص ۴۴ تا ص ۴۶ اور ماہ جنوری ۱۹۷۰ء ص ۲۲ تا ص ۲۶ میں کہا گیا ہے کہ فلاں نے اس کو موقوف کہا اور فلاں اور فلاں نے۔

جواب: یہ اعتراض قطعاً باطل ہے: **اولاً** — اس لیے کہ زیدؒ بن حبابؒ بالاتفاق ثقہ ہیں۔ اور ثقہ راوی کی متن اور سند میں زیادت بالاجماع مقبول ہوتی ہے جس کی پوری تفصیل گذر چکی ہے۔ **وثانیاً** — یہ بھی بیان ہو چکا ہے کہ حدیث کے موقوف اور مرفوع ہونے کی صورت میں تمام محدثین کے نزدیک روایت موصول اور مرفوع ہی سمجھی جائے گی۔ **وثالثاً** — اگر تنہا زیدؒ بن حبابؒ ہی اس کو مرفوع روایت کرتے تب بھی یہ حدیث مرفوع ہی ہوتی، کیونکہ زیدؒ بن حبابؒ ثقہ تھے۔ حالانکہ ان کے علاوہ ابو صالحؒ کاتب لیث رح (جن کا ترجمہ باب اول میں حضرت ابن عباسؓ کے اثر میں نقل کیا جا چکا ہے) بھی اس روایت کو مرفوع نقل کرتے ہیں۔ (دیکھئے سنن الکبریٰ جلد ۲ ص ۱۶۲ وغیرہ اور اس کی سند بھی صحیح ہے) جب یہ دونوں راوی ثقہ ہیں۔ اور اس روایت کو مرفوع بیان کرتے ہیں تو یہ حدیث محدثین کے طے شدہ قاعدہ کی رو سے مرفوع ہی ہوگی اور امام بیہقی رح وغیرہ کی بلا دلیل اصول شکنی قابل التفات نہیں ہو سکتی اور نہ اس کو کوئی سننے کے لیے تیار ہے چونکہ یہ اکابر غلطی سے پہلے یہ نظریہ قائم کر چکے ہیں کہ قرأۃ خلف الامام کی اجازت ہے، اس لیے اس کے خلاف تمام روایات کو وہ خواہ مخواہ معلول ٹھہرانے کی کوشش کرتے ہیں۔ اگر خالی الذہن ہو کر پہلے جناب رسول خدا صلی اللہ تعالیٰ علیہ وآلہ وسلم کی احادیث کو ملاحظہ کر لیتے تو یقیناً ایسی رکیک اور بعید از انصاف تاویلات سے ہرگز کام نہ لیتے، فسامحہم اللہ تعالیٰ اور مولانا مبارکپوری صاحبؒ صاحبؒ کا تو معاملہ ہی عجیب ہے وہ امام سفیان رح بن عُیینہ رح اور حضرات صحابہ کرامؓ کے صحیح آثار سے تو جناب رسول خدا صلی اللہ تعالیٰ علیہ وآلہ وسلم کی حدیث کو مقید کرنا گوارا نہیں کرتے، مگر اس مقام پر جناب رسول خدا صلی اللہ تعالیٰ علیہ وآلہ وسلم کی مطلق حدیث کو محض اپنی ناقص عقل اور فہم نارسا کی زنجیروں میں جکڑنا چاہتے ہیں (دیکھئے ابکار المنن ص ۱۶۷)،

اور لطف کی بات یہ ہے کہ یہ سب کچھ بلا دلیل کرتے ہیں :— ع

لڑتے ہیں اور ہاتھ میں تلوار بھی نہیں

باقی جس روایت میں آتا ہے کہ حضرت ابو الدرداءؓ نے کثیر بن مرہؒ سے یہ کہا تھا جیسا کہ بعض کتابوں میں آتا ہے تو وہ اپنے مقام پر صحیح ہے جس کا مطلب یہ ہوگا کہ مرفوعاً بھی یہ روایت آئی ہے اور موقوفاً بھی جب مسئلہ بیان کرنا مقصود ہوگا تو اپنا قول بیان کر دیتے ہوں گے۔ اور جب حدیث کا بیان کرنا ملحوظ ہوتا ہوگا تو مرفوعاً بیان کر دیتے ہوں گے کیونکہ ارسال اور رفع میں رواۃ کے حالات مختلف ہوتے ہیں جیسا کہ پہلے گذر چکا ہے۔

احسن الکلام پر بلا وجہ محض تعصب کی وجہ سے تنقید کرنے والے بزرگ علامہ عراقیؒ کی ایک عبارت کا (جس کا ذکر ص۲۷ میں ہو چکا ہے) حوالہ دے کر لکھتے ہیں۔ لیکن اگر یہ اختلاف ایک راوی کے تلامذہ میں ہے تو پھر ثقہ اور اوثق کے اصول پر اس کی تنقیح کی جائے گی۔ اگر دونوں اسناد بہمہ عیوب سے صاف ہوں گی تو پھر مزید قرائن کو ملحوظ رکھتے ہوئے فیصلہ کیا جائے گا جیسا کہ اس کی تفصیل ہم عرض کر آتے ہیں۔ (ترجمان الحدیث ص۲۵ ماہ جنوری ۱۹۷۵ء)۔

الجواب : پہلے بیان ہو چکا ہے کہ علامہ عراقیؒ کے حوالہ سے صرف یہی ثابت ہوتا ہے کہ ثقہ راوی جب کسی وقت روایت موصول اور کسی وقت مرسل بیان کرے یا کسی وقت مرفوع اور کسی وقت موقوف بیان کرے تو اس کے بارے میں صحیح تر فیصلہ یہ ہے کہ وہ روایت موصول اور مرفوع ہی قرار دی جائے گی نہ کہ مرسل و موقوف۔ علامہ عراقیؒ کی اس عبارت میں راوی کے تلامذہ میں ثقہ اور اوثق کی تنقیح کا کوئی تذکرہ نہیں اور امام نوویؒ لکھتے ہیں کہ اگر بعض ثقہ اور ضابطہ راوی حدیث کو متصل اور بعض مرسل بیان کرتے ہوں یا بعض مرفوع اور بعض موقوف بیان کرتے ہوں یا ایک ہی راوی کسی وقت مرفوع بیان کرتا ہے اور کسی وقت مرسل یا موقوف بیان کرتا ہے تو اس کے متعلق صحیح بات جو محققین محدثینؒ اور فقہاءؒ اور ارباب اصول نے بیان کی ہے اور اسی کو علامہ خطیب بغدادیؒ نے صحیح قرار دیا ہے یہ ہے :

ان الحکم لمن وصله او رفعهٔ سواء کان المخالف لهٔ مثلهٔ او اکثر او احفظ لانه زیادة ثقة وهی مقبولة اهـ (مقدمهٔ شرح مسلم ص ۱۸)

کہ بے شک حکم اس کے موصول یا مرفوع ہونے کا دیا جائے گا۔ عام اس سے کہ اس کا مخالف اس جیسا ہو یا زیادہ ہو یا زیادہ حافظ ہو کیونکہ یہ زیادت ثقہ ہے جو بہر حال مقبول ہے۔

اس عبارت سے تین باتیں نمایاں طور پر ثابت ہیں:

(۱) اس صورت میں موصول اور مرفوع ہونے کا فیصلہ محقق محدثین رح فقہاء رح اور ارباب اصول کا ہے۔

(۲) ایک ہی ثقہ راوی سے یہ اختلاف ثابت ہو تب بھی یہی فیصلہ ہے یا ایک ہی راوی کے تلامذہ جدا جدا ہوں تب بھی یہی فیصلہ ہے۔

(۳) اس میں موصول اور مرفوع بیان کرنیوالے کے مقابلہ میں اکثر یا احفظ یا اوثق کا کوئی اعتبار نہیں کیونکہ یہ زیادت ثقہ ہے جو بہر حال مقبول ہے۔

اکیسویں[۲۱] حدیث: امام حاکم رح فرماتے ہیں کہ ہم سے ابو یحییٰ سمرقندی رح نے بیان کیا وہ کہتے ہیں کہ ہم سے محمد رح بن نصر رح نے بیان کیا۔ وہ فرماتے ہیں کہ ہم سے احمد رح بن عبد الرحمٰن رح بن وہب رح نے بیان کیا۔ وہ کہتے ہیں کہ ہم سے ہمارے چچا (عبد اللہ رح بن وہب رح) نے بیان کیا۔ وہ کہتے ہیں کہ مجھ سے لیث رح بن سعد رح نے بیان کیا۔ وہ یعقوب رح بن ابراہیم رح (امام ابو یوسف رح) سے روایت کرتے ہیں اور وہ نعمان رح بن ثابت رح (امام ابو حنیفہ رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ) سے اور وہ موسیٰ رح بن ابی عائشہ رح سے اور وہ عبد اللہ رض بن شداد ابو الولید رض[۱] سے اور وہ حضرت جابر رض بن عبد اللہ رض سے روایت کرتے ہیں۔ وہ فرماتے ہیں کہ آں حضرت صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے فرمایا:

من صلی خلف امام فان قرأة الامام لهٔ قرأة۔ (معرفت علوم الحدیث ص ۱۷۱)

کہ جو شخص امام کے پیچھے (اس کی اقتداء میں نماز پڑھے تو اس کو امام کی قرآت ہی کافی اور بس ہے۔

---

[۱] چونکہ امام حاکم رح نے اسی روایت کے سلسلے میں اسی صفحہ میں واضح طور پر یہ بیان کر دیا کہ ابو الولید عبد اللہ رض بن شداد رح ہی کی کنیت ہے اس لیے ہم نے عبد اللہ رض بن شداد ابو الولید رض لکھا ہے جیسا کہ پہلے باحوالہ عرض کیا جا چکا ہے مؤلف خیر الکلام کا ص ۱۱۵ میں اس کو مغالطہ کہنا انصاف پر مبنی نہیں ہے کیونکہ جب ابو الولید عبد اللہ رض بن شداد رح ہی کی کنیت ہے تو ایک ہی شخصیت ہے۔

اس سند کے اکثر رواۃ کے تراجم پہلے نقل کئے جا چکے ہیں اور بعض جلیل القدر اور نامور محدث تھے البتہ احمدؒ بن عبدالرحمنؒ بن وہبؒ کا ترجمہ سن لیجئے اگرچہ ابن عدیؒ کہتے ہیں کہ مصر کے اساتذہ اس کے ضعیف ہونے پر متفق ہیں اور ابن یونسؒ فرماتے ہیں کہ اس سے حجت قائم نہیں ہوتی۔ (میزان جلد ا صہ ۵ بحوالہ خیر الکلام صہ ۱۱۵) مگر جمہور محدثین کرامؒ ان کو ثقہ کہتے ہیں۔ محمدؒ بن عبداللہؒ بن الحکمؒ ان کو ثقہ کہتے ہیں اور فرماتے ہیں کہ ہم نے ان کے بارے میں کوئی کلام اور جرح نہیں سنی، عبدالملکؒ ان کو ثقہ کہتے ہیں۔ امام ابو زرعہؒ ان کی تعریف کرتے تھے۔ ابو حاتمؒ ان کو صدوق کہتے ہیں۔ محدث عبدانؒ ان کو مستقیم الامر کہتے ہیں۔ ابن عدیؒ کا بیان ہے کہ محدثین کے نزدیک ان کی حدیثیں قابل برداشت ہیں۔ حافظ ابن حجرؒ لکھتے ہیں کہ امام احمدؒ بن حنبلؒ نے پہلے ان میں کلام کیا تھا۔ لیکن بعد از تحقیق اس سے رجوع کر لیا تھا۔ یہی وجہ ہے کہ امام ابن خزیمہؒ متقدمین میں سے اور امام ابن قطانؒ متاخرین میں سے ان کو ثقہ سمجھتے ہوئے ان پر کلی اعتماد کرتے تھے۔ (تہذیب التہذیب جلد ا ص ۵۴، ۵۵، ۵۷) یہ روایت بھی سند کے اعتبار سے صحیح اور مرفوع ہے۔

مؤلف خیر الکلام نے صفحہ ۱۱۵ میں اس کے جواب میں بھی وہی پرانا رونا رویا ہے کہ امام ابو حنیفہؒ ضعیف ہیں اور متفرد ہیں (محصلہ) جواب پہلے گذر چکا ہے اعادہ کی ضرورت نہیں ہے۔

حضرات! ہم نے متابعات اور شواہد کے علاوہ بیس حدیثیں صحیح اور مرفوع (با سند اور سند کے ایک ایک راوی کی توثیق کے ساتھ آپ سے) باحوالہ عرض کی ہیں۔ اور فریق ثانی کی طرف سے پیش کردہ سوالات کے مسکت جوابات بھی عرض کر دیے ہیں۔ اب ہم آخر میں آپکے سامنے چند اور حدیثیں بطور تائید عرض کرتے ہیں اور سند پوری نقل کر دیتے ہیں۔

بطور شاہد پہلی حدیث: امام بیہقیؒ فرماتے ہیں کہ ہم سے حافظ ابو عبداللہؒ نے بیان کیا۔ وہ فرماتے ہیں کہ ہم سے ابو سعید محمدؒ بن جعفرؒ بن خصیب ہرویؒ نے اپنی کتاب سے بیان کیا۔ وہ فرماتے ہیں کہ ہم سے عبداللہ بن محمود سعدیؒ نے بیان کیا۔ وہ کہتے ہیں کہ ہم سے

اسمٰعیل سدیؒ نے بیان کیا۔ وہ کہتے ہیں کہ ہم سے مالکؒ بن انسؒ نے بیان۔ وہ وہبؒ بن کیسانؒ سے اور وہ حضرت جابرؓ سے روایت کرتے ہیں وہ فرماتے ہیں کہ آں حضرت صلی اللہ تعالیٰ علیہ وآلہٖ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ

کل صلوٰۃ لا یقرأ فیھا بام القرآن فھی خداج الا وراء الامام۔ (کتاب القرأۃ ص۱۱)

ہر وہ نماز جس میں سورۃ فاتحہ نہ پڑھی گئی ہو تو وہ نماز ناقص اور نامکمل ہوتی ہے۔ ہاں مگر وہ نماز جو امام کے پیچھے پڑھی جائے۔

یہ روایت صاف بتلاتی ہے کہ امام کے پیچھے سورۃ فاتحہ اور ام القرآن پڑھنے کی بھی گنجائش نہیں ہے اور اسی کو فریق ثانی ضروری سمجھتا ہے۔ ہاں البتہ امام اور منفرد کی کوئی نماز بغیر سورۃ فاتحہ کے مکمل نہیں ہو سکتی جیسا کہ اس کی تصریح موجود ہے۔

اعتراض: امام بیہقیؒ فرماتے ہیں کہ اسمٰعیل سدیؒ کا دوسرا شاگرد سریؒ بن خزیمہؒ اس روایت کو حضرت جابرؓ سے موقوف روایت کرتا ہے۔ اس لیے یہ عبداللہؒ بن محمود سعدیؒ کی غلطی ہے کہ وہ اس کو مرفوع بیان کرتے ہیں اور یہی بات مؤلف خیر الکلام نے دہرائی ہے۔

(ملاحظہ ہو ص ۵۰۴ و ۵۰۵)

الجواب: عبداللہؒ بن محمود سعدیؒ کو علامہ ذہبیؒ، الحافظ، الثقہ اور صوبہ مرو کا محدث لکھتے ہیں (تذکرہ جلد ۲ ص۲۵۷) امام حاکمؒ ان کو ثقہ اور مامون کہتے ہیں۔ محدث خلیلیؒ ان کو الحافظ اور عالم فن حدیث کہتے ہیں (ایضاً جلد ۲ ص۲۵۵) کیوں نہ ہو کہ حافظ اور ثقہ راوی کی زیادت کو تسلیم کر لیا جائے۔ اور اصول شکنی کا ارتکاب نہ کیا جائے، کہ نہ ہینگ لگے نہ پھٹکڑی، اور یہی امر قرین قیاس اور انصاف ہے۔

مؤلف خیر الکلام نے ص۵۰۵ میں لکھا ہے کہ اس کے ثقہ ہونے سے حدیث کا صحیح ہونا ضروری نہیں اھ یعنی محض اس لیے کہ مؤلف صاحب اور ان کی جماعت اس کو تسلیم کرنے کے لیے تیار نہیں۔ ہاں محمدؒ بن اسحاقؒ جیسا کوئی ضعیف راوی ہوتا تو وہ ضرور مان لیتے اور پھر حدیث صحیح ہو جاتی، باقی امام مالکؒ کا یہ فرمانا کہ اس کی ٹانگ پکڑو یہ اس کے مرفوع ہونے کی نفی یا انکار کی قطعی دلیل نہیں۔ طحاوی کی شرح میں حذ وا برجلہ

کا نسخہ بھی ہے (حاشیہ طحاوی جلد اص ۱۰۱) یعنی ان کی بات مان لو اور ان کے نقش قدم پر چلو اور اس کے پیش نظر خذ وا بجلہ کا مطلب بھی یہ ہو سکتا ہے۔ اس اعتبار سے امام مالکؒ کی تصدیق ہو گی۔ واللہ تعالیٰ اعلم۔

دوسری حدیث: امام بیہقیؒ فرماتے ہیں کہ ہم سے حافظ ابو عبداللہؒ نے بیان کیا، وہ فرماتے ہیں کہ مجھ سے ابو عبداللہ حسینؒ بن محمدؒ ہروی نے بیان کیا۔ وہ کہتے ہیں کہ ہم سے ابوبکر احمدؒ بن محمدؒ بن عمرؒ نے بیان کیا۔ وہ کہتے ہیں کہ ہم سے ابو عبدالرحمٰن محمدؒ بن احمد تمیمیؒ نے بیان کیا۔ وہ کہتے ہیں کہ ہم سے ابو محمد سویدؒ بن سعیدؒ نے زبانی بیان کیا۔ وہ کہتے ہیں کہ ہم سے علیؒ بن مسہرؒ نے بیان کیا۔ وہ عبید اللہؒ بن عمرؓ سے اور وہ نافعؒ سے اور وہ حضرت عبداللہؓ بن عمرؓ اور وہ آں حضرت صلی اللہ تعالیٰ علیہ وآلہ وسلم سے روایت کرتے ہیں کہ آپ نے فرمایا: من کان لہ امام فقرأۃ الامام لہ قرأۃ (کتاب القرأۃ ص ۱۲۵) کہ امام کا پڑھنا مقتدی کا پڑھنا ہے۔ یہ حدیث بھی اپنے مفہوم کے لحاظ سے واضح ہے اور حضرت ابن عمرؓ سے مرفوعاً مروی ہے۔

اعتراض: امام بیہقیؒ فرماتے ہیں کہ یہ حدیث حضرت ابن عمرؓ سے موقوف مروی ہے یہ ابو محمد سویدؒ بن سعیدؒ کی غلطی ہے کہ اس روایت کو مرفوع بیان کرتے ہیں۔

جواب: علامہ ذہبیؒ سویدؒ بن سعیدؒ کو صاحب حدیث اور صاحب حفظ کہتے ہیں۔ امام مسلمؒ نے ان سے احتجاج کیا ہے۔ ابو حاتمؒ ان کو صدوق اور کثیر التدلیس (لیکن اس روایت میں وہ حدثنا سے تحدیث کرتے ہیں) کہتے ہیں بغویؒ ان کا شمار حفاظِ حدیث میں کرتے ہیں۔ صالح جزرہؒ ان کو صدوق اور دارقطنیؒ ان کو ثقہ کہتے ہیں (میزان جلد اص ۴۲۳) محدث عجلیؒ ان کو ثقہ کہتے ہیں۔ مسلمہؒ بن قاسمؒ کا بیان ہے کہ وہ ڈبل ثقہ تھے۔ امام احمدؒ ان کو صالح یا ثقہ کہتے ہیں۔ میمونیؒ امام احمدؒ سے نقل کرتے ہیں کہ مجھے ان میں کسی کا کلام اور جرح معلوم نہیں۔ امام ابوداؤدؒ ان کی صدوق ولا بأس بہ سے توثیق نقل کرتے ہیں (تہذیب التہذیب جلد ۴ ص ۲۷۵) جزریؒ کہتے ہیں کہ وہ ثقہ ہیں اور امام مسلمؒ نے صحیح میں ان سے احتجاج کیا ہے۔ (حصن حصین ص ۱۱۴ باب ماء زمزم لما شرب لہ) اس لیے ضابطہ کے لحاظ سے یہ زیادت بھی صحیح ہو گی اور یہ امام مسلمؒ کی شرط پر صحیح ہے۔

مؤلف خیر الکلام نے ص۵۰۶ میں بعض کتب رجال سے سویدؒ بن سعیدؒ پر جرحی کلمات نقل کر کے آگے لکھا ہے، پس نتیجہ یہ نکلا کہ یہ حدیث قطعاً جھوٹ ہے۔ اس کا مطلب یہ ہوا کہ جن ائمہ نے ان کی توثیق کی ہے جیسے کہ اوپر باحوالہ گزر چکی ہے وہ غلط ہے؟ اور کیا امام مسلمؒ نے صحیح مسلم میں جھوٹے راوی سے احتجاج کیا ہے؟ علاوہ ازیں علامہ خطیب بغدادیؒ اپنی سند کے ساتھ الی محمد بن عبدۃ تا خارجۃ عن ایوب عن نافع عن ابن عمرؓ قال قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم من کان لہ امام فقرأۃ الامام لہ قرأۃ روایت کرتے ہیں۔

(ملاحظہ ہو تاریخ جلد ۱ ص ۳۳)

جس کے راوی اس مذکور سند کے متابع ہیں اور بزعم مؤلف خیر الکلام وغیرہ اگر کچھ سقم بھی اس میں ہے تو دوسری سند سے پورا ہو جاتا ہے۔ علاوہ ازیں اس امر سے اختلاف تو نہیں کیا جا سکتا کہ بعض محدثینؒ نے اس پر جرح کی ہے اور جمہور اس کی توثیق کرتے ہیں اور مختلف فیہ ہونے کی وجہ سے اس کی حدیث حسن تو ضرور ہے خود مؤلف مذکور لکھتے ہیں کہ مختلف فیہ آدمی حدیث حسن ہوتی ہے۔ (خیر الکلام ص۳۲۵) مگر اس حدیث کو قطعاً جھوٹ کہنا خالص اور سفید جھوٹ ہے۔

تیسری حدیث: امام بیہقیؒ فرماتے ہیں کہ ہم سے حافظ ابو عبداللہؒ نے بیان کیا۔ وہ فرماتے ہیں کہ مجھ سے ابو العباس بالویہ بن محمدؒ بن بالویہ مرزبانیؒ نے بیان کیا۔ وہ فرماتے ہیں کہ ہم سے عمرو بن زرارہؒ نے بیان کیا۔ وہ کہتے ہیں کہ ہم سے اسمٰعیلؒ بن ابراہیمؒ نے بیان کیا۔ وہ علیؒ بن کیسانؒ سے اور وہ ابن ابی ملیکہؒ سے اور وہ حضرت ابن عباسؓ سے روایت کرتے ہیں اور وہ جناب رسول خدا صلی اللہ تعالیٰ وآلہ وسلم سے روایت کرتے ہیں۔ آپ نے فرمایا:

كل صلوٰة لا يقرأ فيها بفاتحة الكتاب فلا صلوٰة له الا وراء الامام۔ (کتاب القرأۃ ص ۱۳۷)

یعنی ہر وہ نماز جس میں نمازی سورۃ فاتحہ نہ پڑھے تو اس کی نماز ادا نہ ہو گی۔ ہاں مگر امام کے پیچھے بغیر سورۃ فاتحہ پڑھے بھی نماز صحیح ہے۔

یہ روایت بھی اپنے مدلول کے لحاظ سے بالکل عیاں ہے اور حضرت ابن عباسؓ سے مرفوعاً مروی ہے۔

اعتراض: امام بیہقیؒ اپنے استاد کے حوالہ سے یہ نقل کرتے ہیں کہ علیؒ بن کیسانؒ کا نام

ہم نے صرف اسی سند میں سُنا ہے۔

الجواب: حافظ ابن حجرؒ نے علیؒ بن کیسانؒ کا نہایت مختصر ترجمہ یوں قائم کیا ہے وھو علی بن سلیمان بن کیسان الکیسانی رح (تہذیب التہذیب جلد ۷، ص۳۶۵) اور محدث فیض پوریؒ فرماتے ہیں کہ ابن ابی حاتم رح نے ان کو صالح الحدیث ما اری بحدیثہ بأسا کہا ہے (لسان ج ص۲۳۲) لہٰذا ان کی حدیث حسن یا صحیح ہے (الدلیل المبین ص۱۷۵) اور اگر بالفرض یہ مستور بھی ہو تب بھی مولف خیر الکلام کہتے ہیں کہ مستور بلکہ ضعیف کی روایت متابعت میں پیش کی جا سکتی ہے جیسا کہ باحوالہ پہلے عرض کیا جا چکا ہے۔

چوتھی حدیث: امام بیہقی رح فرماتے ہیں کہ ہم سے حافظ ابو عبد اللہ رح نے بیان کیا۔ وہ فرماتے ہیں کہ ہم سے ابو حامد احمدؒ بن محمدؒ بن قاسم سرخسیؒ نے بیان کیا۔ وہ کہتے ہیں کہ ہم سے احمدؒ بن عبد الرحمٰن سرخسیؒ نے بیان کیا۔ وہ فرماتے ہیں کہ ہم سے اسمٰعیلؒ بن فضلؒ نے بیان کیا۔ وہ فرماتے ہیں کہ ہم سے عیسٰیؒ بن جعفر رح نے بیان کیا۔ وہ فرماتے ہیں کہ ہم سے سفیان ثوریؒ نے بیان کیا۔ وہ اعمش رح سے اور وہ حکمؒ سے اور وہ عبد الرحمٰنؒ بن ابی لیلیٰؒ سے اور وہ حضرت بلالؓ سے روایت کرتے ہیں۔ وہ فرماتے ہیں:

امرنی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ان لا أقرأ خلف الامام۔	کہ آں حضرت صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے مجھے یہ حکم دیا کہ میں امام کے پیچھے قرآت نہ کروں۔

(کتاب القرأۃ ص ۱۲۹)

چونکہ قرآت خلف الامام کا مسئلہ اپنے ایجابی یا سلبی پہلو کے اعتبار سے کسی صحابیؓ سے مخصوص نہ تھا اس لیے حضرت بلالؓ کو کسی خاص مصلحت کے پیش نظر آپ نے خطاب کیا ہو گا۔ ورنہ حکم سب کے لیے عام ہے۔

اعتراض: امام بیہقی رح فرماتے ہیں کہ عیسٰیؒ بن جعفر رح تو ثقہ اور ثبت تھے۔ اس لیے اس میں غلطی اسماعیلؒ بن فضل رح کی ہو گی کہ اس سند میں سفیان ثوریؒ کا ذکر ہے اور وہ اس سے بری ہیں اگر ان سے روایت ہوتی تو اس کے بارے میں اختلاف نہ ہوتا، اسمٰعیلؒ بن فضل رح اگر سچا ہے تو اس کی غلطی ہے۔ جھوٹا ہے تو اس کا افترا ہے۔ (کتاب القرأۃ ص ۱۲۹ بحوالہ خیر الکلام ص ۵۱۰ محصلہ)

الجواب: حدیث کو باطل ٹھہرانے کا یہ نرالا قاعدہ امام بیہقی رح نے تجویز فرمایا ہے۔ کیا قرأت خلف الامام کی روایت کے امام ثوری رح مجاز نہیں؟ یا ان کی کسی دیگر روایت میں اختلاف نہیں ہوا؟ اس سے سند اور حدیث پر کیا اثر پڑتا ہے؟ ہاں یہ بات کہی جا سکتی ہے کہ اسمٰعیل رح بن فضل رح کا حال معلوم نہیں یہ اصول کی بات ہے، مگر مؤلف خیر الکلام کے بیان کے مطابق مستور اور ضعیف کی حدیث بطور تائید و متابعت پیش ہو سکتی ہے اس میں کوئی حرج نہیں۔ اور اصول کے لحاظ سے شاہد و متابع کا بھی کوئی فرق نہیں۔

قارئین کرام! اس مضمون کی کم و بیش ستائیس سندیں راقم الحروف کے بیاض میں ابھی اور موجود ہیں اور حقیقت یہ ہے کہ ان میں ہر ایک سند فریق ثانی کی اجازت یا وجوب قرأت سورۂ فاتحہ خلف الامام کی روایتوں سے اگر زیادہ قوی اور صحیح نہیں تو یقین کیجئے کہ ان سے کسی طرح بھی کم نہیں ہے۔ مگر چونکہ ہمیں آپ سے ابھی بہت کچھ عرض کرنا ہے اس لیے سر دست ان پیش کردہ احادیث پر ہی ہم اکتفا کرتے ہیں اور ان سے ایک حقیقت پسند انسان بخوبی یہ اندازہ لگا سکتا ہے کہ امام کے پیچھے قرأت نہ کرنیوالے کیا بے دلیل ہیں؟ اور کیا ان کے پاس جناب رسول خدا صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کی صحیح حدیثیں موجود نہیں؟ اور نہ کیا جن کتابوں کے حوالے درج کیے گئے ہیں وہ اس دنیا میں موجود نہیں؟ اور کیا ان میں سورۂ فاتحہ اور ام القرآن و ام الکتاب کی تصریح موجود نہیں؟ اور کیا یہ روایتیں صحاح ستہ وماوافق بھا میں نہیں پائی جاتیں؟ اور کیا یہ کتابیں دنیا کے اسلامی کتب خانوں میں موجود نہیں؟ اور کیا ان حدیثوں میں کوئی حدیث صحیح اور مرفوع نہیں؟ اور کیا ان تمام دلائل کو پیش نظر رکھتے ہوئے جمہور اہل اسلام (جو امام کے پیچھے سورۂ فاتحہ اور دیگر کسی قسم کی قرأت کے قائل نہیں ہیں) نماز جیسی اہم اور بنیادی عبادت سے سبکدوش ہو سکتے ہیں یا نہیں؟ یا ان کی نماز بھی ناقص کالعدم بیکار اور محض باطل ہے؟ ان میں سے ایک ایک دعوے کا براہین کے ساتھ اثبات کیا جا چکا ہے اور فریق ثانی کے جملہ بے بنیاد دعاوی کا دلائل سے بطلان ثابت کیا گیا ہے، جیسا کہ آپ دیکھ چکے ہیں۔ الغرض حضرت ابو موسیٰ الاشعری رض، حضرت ابو ہریرہ رض، حضرت انس رض بن مالک، حضرت عبداللہ رض بن بحینہ رض، حضرت عبداللہ رض بن مسعود، حضرت ابو بکرہ رض، حضرت ابن عباس رض، حضرت عائشہ رض،

حضرت جابرؓ بن عبداللہؓ، حضرت عبداللہؓ بن شدادؓ، حضرت نواسؓ بن سمعانؓ، حضرت عبداللہؓ بن عمرؓ، حضرت بلالؓ اور حضرت ابوالدرداءؓ کی اکثر روایتیں صحیح اور مرفوع ہیں اور حضرت ابوموسٰی الاشعریؓ کی حدیث کے علاوہ حضرت ابوہریرہؓ اور حضرت جابرؓ اور حضرت ابن عباسؓ کی مرفوع روایتوں میں سورۃ فاتحہ کا خاص لفظ موجود ہے جیساکہ آپ ملاحظہ فرما چکے ہیں۔ اور آپ یہ بھی ملاحظہ فرما چکے ہیں کہ فریق ثانی کے نزدیک بھی پیش کردہ احادیث کے تقریباً جملہ رواۃ کی ثقاہت، عدالت، امامت اور اتقان مسلّم ہے، محض کسی کے تفرد پر گرفت کی گئی ہے تو کسی کی تدلیس پر کسی کی تخلیط پر اور کسی کے تغیر یسیر پر اور کہیں مرفوع اور موصول روایت کو اصول شکنی کرتے ہوئے موقوف اور مرسل قرار دیا گیا ہے اور کہیں راوی حدیث کی مرضی کے خلاف بلکہ خود مرفوع حدیث کے خلاف حدیث کا مطلب لیا گیا ہے اور ان تمام خلاف قاعدہ باتوں کے علاوہ محض اپنی مرضی سے مطلق قرأت کو مقید کرنے کی ناکام سعی کی گئی ہے اور ایسی ایسی کمزور اور رکیک و ضعیف اور بعید از قیاس و انصاف تأویلات اور توجیہات اختیار کی گئی ہیں کہ فن اصول حدیث بھی ان سے نالاں ہے۔ اور حافظ ابن حجرؒ کے اس دعوے کی حقیقت بھی آپ دیکھ چکے ہیں کہ من کان لہٗ ..... الخ کے تمام طرق معلول ہیں۔

قارئین کرام! ذرا ان راویوں کا ان راویوں سے تقابل کر لیں جن کی روایتوں سے فریق ثانی نے استدلال کیا ہے کیونکہ۔ ع: وبضدھا تتبین الاشیاء

ہم دوسرے باب کو یہاں ختم کرتے ہیں اور تیسرا باب شروع کرتے ہیں۔ واللہ المستعان وھو نعم المعین۔

باب سوم

اہلِ اسلام سے یہ بات مخفی نہیں ہے کہ قرآن کریم اور حدیث شریف کے بعد دینی مسائل میں جن حضرات کی طرف نگاہیں اُٹھ سکتی ہیں۔ وہ شمع نبوت کے پروانے اور فیض رسالت سے مستفید حضرات صحابہ کرام رضؓ کی مخلص جماعت ہی ہو سکتی ہے اور ان کے بعد حضرات تابعین رحؒ کا دور ہے کیونکہ یہی وہ حضرات ہیں جو خیر القرون کے درخشندہ ستارے تھے، جن کی سعی بلیغ کی بدولت دنیا سے کفر و شرک میں روشنی پھیلی، بدعات و رسوم کا خاتمہ ہوا۔ جہالت و تاریکی دنیا سے مٹی اور علم و عرفان کی بارش سے دلوں کی دنیا میں ایمان و بصیرت کی شادابی پیدا ہوئی۔ نیز یہ بات بھی مخفی نہیں کہ حضرات صحابہ کرامؓ شرف صحبت کی برکت سے سب کے سب عادل، ثقہ، متقی، خدا پرست اور پاکباز تھے۔ لیکن فہم قرآن اور تدبر حدیث میں سب برابر نہ تھے۔ اس لحاظ سے ان کے آپس میں مختلف درجات اور متفاوت مراتب تھے۔ چنانچہ امام مسروق رحؒ (المتوفی ۶۳ھ جو الامام الفقیہ اور راحد الاعلام تھے تذکرہ جلد ۱ صفحہ ۴۶) فرماتے ہیں کہ میں نے حضرات صحابہ کرامؓ سے فیض صحبت اٹھایا تو میں نے دیکھا کہ ان سب کا علم چھ بزرگوں کی طرف لوٹتا ہے، حضرت عمرؓ، حضرت علیؓ، حضرت عبداللہؓ بن مسعود، حضرت معاذؓ بن جبل، حضرت ابوالدرداءؓ اور حضرت زیدؓ بن ثابت، پھر میں نے ان چھ بزرگوں سے شرف صحبت حاصل کیا تو دیکھا کہ ان سب کا علم

حضرت علیؓ اور حضرت عبداللہؓ بن مسعود پر ختم ہو گیا ہے (طبقات ابن سعد جلد ۲ ص ۲۵، تذکرۃ الحفاظ جلد ۱ ص ۲۴ و مقدمہ ابن الصلاح ص ۲۶۲ مع شرح العراقیؒ) امام حاکمؒ نے بھی امام مسروقؒ سے یہ روایت نقل کی ہے، اس میں انھوں نے حضرت علیؓ، حضرت ابن مسعودؓ اور حضرت ابی بن کعبؓ، حضرت معاذؓ بن جبل، حضرت زیدؓ بن ثابت، حضرت ابو الدرداءؓ، اور حضرت ابو موسٰی الاشعریؓ کا نام لیا ہے (مستدرک جلد ۳ ص ۴۶۵ سکت عنہ الحاکمؒ والذہبیؒ) امام شعبیؒ (المتوفی ۱۰۳ھ) جو امام حافظ، فقیہ، متقن اور علامۃ التابعین تھے۔ تذکرہ جلد ۱ ص ۷۴) کا بیان ہے کہ جناب رسول خدا صلی اللہ تعالٰی علیہ وسلم کے حضرات صحابہؓ میں دینی مسائل میں فیصلہ کرنے والے چھ حضرات تھے۔ تین مدینہ طیبہ میں اور ان کے نام یہ ہیں: حضرت عمرؓ، حضرت ابیؓ بن کعب اور حضرت زیدؓ بن ثابت اور تین کوفہ میں، ان کے اسماء یہ ہیں، حضرت علیؓ، حضرت ابن مسعودؓ اور حضرت ابو موسٰی الاشعریؓ (مستدرک جلد ۳ ص ۴۶۵ وسکتا عنہ)

مولانا مبارک پوری صاحبؒ لکھتے ہیں کہ دینی مسائل کی ترویج اور اشاعت کے لحاظ سے صحابہ کرامؓ کے تین طبقات تھے، پہلا طبقہ وہ ہے جس سے مسائل تو رائج ہوئے ہیں مگر کم۔ اور دوسرا طبقہ متوسط رہا ہے اور تیسرا طبقہ وہ ہے جن سے دین کی بہت زیادہ اشاعت اور ترویج ہوئی ہے۔ ان میں حضرت عمرؓ، حضرت علیؓ، حضرت ابن مسعودؓ، حضرت عائشہؓ، حضرت زیدؓ بن ثابت، حضرت ابن عباسؓ اور حضرت ابن عمرؓ خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔ (تحفۃ الاحوذی جلد ۱ ص ۱۱) نواب صدیق حسن خاں صاحبؒ لکھتے ہیں کہ جن حضرات صحابہ کرامؓ سے دین، علم اور فقہ کی اشاعت ہوئی ہے ان میں حضرت ابن مسعودؓ، حضرت زیدؓ بن ثابت، حضرت ابن عباسؓ اور حضرت ابن عمرؓ پیش پیش تھے۔ (الجنۃ فی الاسوۃ الحسنۃ بالسنۃ ص ۵)۔
الحمد للہ تعالٰی کہ ان حضرات میں بیشتر وہ ہیں جو امام کے پیچھے قرأت کے قائل نہ تھے۔ ؎

وفاؤں کے ہزاروں تیر سے چکے ہیں امتحاں اب تک
مگر وہ ہیں کہ اس پر بھی ہیں ہم سے بدگماں اب تک

حضرت ابو موسٰی الاشعریؓ وغیرہ کی صحیح اور مرفوع حدیثیں عرض کی جا چکی ہیں، اسی طرح

حضرت ابو الدرداءؓ کی صحیح اور مرفوع روایت بھی پیش کی جا چکی ہے اور اس کے موقوف تسلیم کرنے میں تو فریق ثانی کو بھی کسی طرح کا کوئی تامل نہیں ہے۔ مؤلف خیر الکلام کا صـ۵۲۵ میں یہ کہنا کہ یہ ان کا اپنا خیال تھا اور رسول اللہ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کے قول کے مقابلہ میں خیال پر اڑے رہنا ٹھیک نہیں ہوتا، اس لیے انھوں نے اس پہلے قول سے رجوع کیا۔ بالکل ایک بے بنیاد دعوٰے ہے۔ کسی صحیح روایت سے ان کا رجوع ثابت نہیں۔ لفظوں کے ہوائی قلعہ سے کچھ نہیں بنتا اور اس کے خلاف جو روایت ان سے آتی ہے اس کا ذکر جلد دوم میں آئے گا۔ انشاء اللہ العزیز۔ اب اس کے بعد بعض حضرات صحابہ کرام رضہ اور تابعین رحہ و اتباع تابعینؒ کی بعض روایتیں اور آثار سُن لیجئے:

اثر حضرت عبد اللہؓ بن عمرؓ (المتوفی ۷۴ھجر) امام مالکؒ نافعؒ سے روایت کرتے ہیں۔ وہ فرماتے ہیں:

ان عبد اللہؓ بن عمرؓ کان اذا سئل هل یقرأ احد خلف الامام قال اذا صلّی احدکم خلف الامام فحسبه قرأة الامام واذا صلّی وحده فلیقرأ وکان ابن عمرؓ لا یقرأ خلف الامام۔

(موطا امام مالکؒ صـ۲۹ و دارقطنی صـ۱۵۲ وغیرہ)

کہ حضرت عبد اللہؓ بن عمرؓ سے جب یہ سوال کیا جاتا تھا کہ کیا امام کے پیچھے کوئی نمازی قرأت کر سکتا ہے؟ تو وہ اس کے جواب میں ارشاد فرمایا کرتے تھے کہ جب کوئی آدمی امام کی اقتداء کر چکے تو اس کو امام کی قرأت ہی کافی ہے اور جب کوئی اکیلا نماز پڑھے تو اس کو قرأت کرنی چاہئے اور ابن عمرؓ امام کے پیچھے قرأت نہیں کیا کرتے تھے

امام مالکؒ کا ترجمہ مقدمہ میں نقل کیا جا چکا ہے۔ نافعؒ الامام اور العلم تھے۔ (تذکرہ، جلد ۱ صـ۹۴) امام بخاریؒ کا بیان ہے کہ اصح الاسانید یہ ہے مالکؒ عن نافعؒ ابن عمرؓ (ایضًا) اس سے زیادہ قوی سند فن حدیث میں تقریبًا محال ہے، حضرت عبد اللہؓ بن عمرؓ جلیل القدر صحابی تھے۔ علامہ ذہبیؒ لکھتے ہیں کہ وہ الفقیہ اور احد الاعلام فی العلم والعمل تھے۔ وہ اپنی علمی اور عملی قابلیت کی بنا پر خلافت اور حکومت کے

مستحق تھے۔ (ایضاً جلد ۱ صفحہ ۳۵) بہر حال یہ روایت صحیح ہے اور قاسم بن محمد فرماتے ہیں کہ

کان ابن عمرؓ لا یقرأ خلف الامام جہر — عبداللہ بن عمرؓ امام کے پیچھے قرأت نہیں کیا کرتے

اولم یجہر۔ (کتاب القرأۃ ص ۱۳۶) — تھے۔ امام جہر سے پڑھتا یا آہستہ (وہ خاموش رہتے تھے)

اور میر صاحب کو بھی اقرار ہے کہ موطا کی مسند روایت صحیح ہوتی ہے۔ مؤلف خیر الکلام صفحہ ۵۲ میں لکھتے ہیں کہ یہ اثر صحیح ہے۔

اعتراض: مبارکپوری صاحب سے جب اس کی سند پر کلام کرنے کی جرأت بھی نہ ہو سکی اور چونکہ حضرت ابن عمرؓ حدیث رفع یدین کے راوی تھے۔ اس لیے اس روایت کو اپنے حال پر چھوڑ کر آگے نکلنا بھی گوارا نہ ہو سکا۔ تو زمین و آسمان کے قلابے ملانے کی ٹھان لی۔ چنانچہ لکھتے ہیں کہ حضرت ابن عمرؓ کے اس اثر کا حضرت عمرؓ کے اثر سے (جو دارقطنی جلد ۱ ص ۱۲۰ وغیرہ میں ہے) تعارض ہے کہ انھوں نے امام کے پیچھے قرأت کرنے کی اجازت دی تھی اور چونکہ حضرت عمرؓ اپنے بیٹے ابن عمرؓ سے سنت کے زیادہ بڑے عالم تھے، (کاش کہ مبارکپوری صاحب اپنے اس خود ساختہ قاعدہ پر ہی قائم رہتے تو یہی ایک بات تھی۔ صفدر) اس لیے حضرت عمرؓ کے اثر کو ابن عمرؓ کے اثر پر ترجیح ہو گی۔ (ابکار المنن ص ۱۶۵)

جواب: اگر تعارض کا یہی مفہوم ہے تو کہا جا سکتا ہے کہ حضرت عمرؓ سے لاکھوں بلکہ کروڑوں درجے آں حضرت صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم سنت کے زیادہ عالم تھے۔ اس لئے جب آپ نے امام کے پیچھے قرأت سے منع کیا ہے، تو حضرت عمرؓ کے اثر پر آپ کے ارشاد کو بہر حال ترجیح ہو گی، حضرت عمرؓ کا ایک اثر عنقریب ترک قرأت خلف الامام پر ذکر ہو گا اور جس اثر کا مبارک پوری صاحب نے حوالہ دیا ہے تو اس کی حقیقت بھی اپنے مقام پر واضح ہو گی۔ تعجب ہے کہ مبارکپوری صاحب کا وجود بھی اجتماع نقیضین سے کسی طرح کم نہیں تھا۔ یہاں تو یہ لکھ کر وقت پاس کرنے کی ناکام کوشش کی ہے۔ اور دوسرے مقام پر لکھتے ہیں کہ حضرت عمرؓ کا اپنے بیٹے ابن عمرؓ سے مجرد اعلم بالسنۃ ہونا اس کا مقتضی نہیں کہ حضرت عمرؓ کے اثر کو ابن عمرؓ کے اثر پر ترجیح دی جا سکے۔ (ابکار المنن ص ۲۲۱)

شاید مولانا مبارک پوری صاحب کو جلدی سے پینترا بدلنے کا خاص لطف محسوس ہوتا

ہو گا۔ اور وہ ایسی رکیک اور بعید از قیاس توجیہ کر کے دل میں خوشی مناتے ہوں گے کہ

ع : کہ مقابلہ تو دلِ ناتواں نے خوب کیا

مؤلف خیر الکلام نے اس صحیح اثر کا تقابل ان آثار سے کیا ہے جو کتاب القرأۃ صفحہ ۶۴ اور صفحہ ۶۵ میں حضرت ابن عمر رضی سے اس کے خلاف آئے ہیں اور مؤلف مذکور لکھتے ہیں کہ یہ اثر بھی صحیح ہے اس پر مفصل بحث گذر چکی ہے (صفحہ ۵۲) اور یہ بحث انھوں نے صفحہ ۳۷۴ میں کی ہے۔ کہتے ہیں کہ ان آثار میں سے ایک اثر کی سند میں ابو جعفر رازی عیسٰی بن ماہان ہے جو متکلم فیہ ہے مگر حافظ ابن حجرؒ نے لکھا ہے صدوق ہے اور ایک کا راوی یحییٰ بکار ہے وہ ضعیف ہے مگر ابن سعدؒ نے کہا ہے انشاء اللہ ثقہ ہے۔ الخ

الجواب : جب ہمارا پیش کردہ اثر آپ کے اقرار سے بھی صحیح ہے تو اس کے مقابلہ میں ضعیف راویوں کی روایتیں لے کر تنکوں کا پُل بنانا کہاں کا انصاف ہے ؟ بس صحیح لے لیں اور ضعیف کو چھوڑ دیں یہ دونوں راوی نرے متکلم فیہ نہیں بلکہ بہت زیادہ کمزور ہیں پھر کس قدر افسوس ہے کہ آپ ان کے اثر کو بھی صحیح کہہ رہے ہیں پھر صراحت و ابہام وغیرہ کی وجہ سے ترجیح دینا نری شعبدہ بازی ہے۔ صحیح اثر اور ضعیف کا کیا تقابل ؟

اثر حضرت جابر بن عبد اللہ رضی (المتوفی ۷۸ھ) ان کا اثر بسند صحیح حدیث نمبر ۱۱ کے ذیل میں نقل کیا جا چکا ہے کہ وہ امام کے پیچھے سورۂ فاتحہ کی قرأت کے قائل نہ تھے ۔ مؤلف خیر الکلام لکھتے ہیں کہ یہ اثر صحیح ہے (صفحہ ۵۱۹) مؤلف خیر الکلام لکھتے ہیں کہ حضرت جابر رضی صرف رکوع والی رکعت کو بدون فاتحہ صحیح سمجھتے تھے اور یہ روایت اسی پر محمول ہے اور اصول فقہ حنفیہ کی رُو سے مستثنٰی میں کوئی حکم ثابت نہیں ہوتا لہٰذا مقتدی کے لیے اس سے وہ کوئی حکم ثابت نہیں کر سکتے (محصلہ صفحہ ۳۱)

الجواب : حرف مَنْ مؤلف مذکور کے نزدیک ویسے عام ہے اور ہمارے نزدیک بھی یہاں شرطیہ ہونے کی وجہ سے عام ہے اور رکعۃً نکرہ ہے اور ساتھ موصوفہ اور خود مؤلف مذکور کے نزدیک نکرہ موصوفہ عام ہوتا ہے۔ (ملاحظہ ہو ص ۸۳) پھر اس تخصیص کو کون مانتا ہے ؟ غرضیکہ حضرت جابرؓ ہر رکعت میں اور ہر ایسے نمازی کے لیے جو مقتدی ہو یہ حکم بیان

فرماتے ہیں اور مؤلف مذکور کا یہ لکھنا کہ اصول فقہ حنفیہ میں مستثنیٰ میں کوئی حکم نہیں ہوتا بالکل بے خبری پر مبنی ہے کیونکہ یہ بعض اصولیوں کا مسلک ہے۔ توضیح ص۲۹۵ سے ص۲۹۸ تک اس پر مبسوط بحث موجود ہے کہ استثناء میں حکم نفی سے اثبات اور اثبات سے نفی ہوتا ہے لہٰذا یہاں مقتدی کے لیے نفی فاتحہ کا حکم بطریق منطوق ثابت ہے جیسے کلمۂ توحید میں الا اللہ ثابت ہے۔ مبارکپوری صاحبؒ نے یزید فقیرؒ کے اثر سے اس کا معارضہ کیا ہے مگر اس کی پوری تفصیل اپنے مقام پر آئے گی۔ انشاء اللہ العزیز۔ علامہ ذہبیؒ لکھتے ہیں کہ حضرت جابرؓ بلند پایہ فقیہ اور مدینہ طیبہ کے مفتی تھے۔ اور آنحضرت صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم سے انہوں نے بہت سے مفید علوم حاصل کیے تھے۔ (تذکرہ ا ص۴۰) اگر سورۂ فاتحہ کے بغیر مقتدیوں کی نماز نہیں ہوتی، تو حضرت جابرؓ کو مرکز توحید و سنت کا مفتی کیسے انتخاب کر لیا گیا تھا، جو اس کے مخالف اور منکر تھے۔

اثر حضرت زیدؓ بن ثابت (المتوفی ۴۵ھ) امام نسائیؒ فرماتے ہیں کہ ہم سے علیؒ[1] بن حجرؒ نے بیان کیا۔ وہ کہتے ہیں کہ ہم سے اسمٰعیلؒ[2] بن جعفرؒ نے بیان کیا۔ وہ یزیدؒ[3] بن خصیفہؒ سے اور وہ یزیدؒ[4] بن عبداللہؒ بن قسیطؒ سے اور وہ عطاءؒ[5] بن یسارؒ سے روایت کرتے ہیں۔ وہ فرماتے ہیں کہ میں نے حضرت زیدؓ بن ثابت سے دریافت کیا؟ کیا امام کے ساتھ قرأت کی جا سکتی ہے؟

---

[1] علامہ ذہبیؒ ان کو الحافظ الکبیر اور نسائیؒ ثقہ و مامون اور حافظ اور خطیبؒ ان کو صادق، متقن اور حافظ کہتے ہیں۔ (تذکرہ جلد ۲ ص۳۳)

[2] علامہ ذہبیؒ ان کو الامام، العالم اور الثقہ لکھتے ہیں۔ (ایضاً جلد ۱ ص۲۳۱)

[3] امام احمدؒ، ابو حاتمؒ اور نسائیؒ ان کو ثقہ، ابن معینؒ ان کو ثقہ اور حجت۔ ابن سعدؒ ان کو ثبت اور کثیر الحدیث اور حافظ ابن حجرؒ ان کو ثقہ اور مامون کہتے ہیں۔ (تہذیب التہذیب جلد ۱۱ ص۳۴۰)

[4] ابن معینؒ ان کو لا باس بہ، نسائیؒ ان کو ثقہ، ابن عدیؒ ان کو مشہور، ابراہیمؒ بن سعدؒ ان کو فقیہ اور ثقہ اور کثیر الحدیث اور ابن عبدالبرؒ ان کو ثقۃ من الثقات کہتے ہیں (ایضاً ص۳۴۲)

[5] علامہ ذہبیؒ ان کو الامام الربانی اور الفقیہ کہتے ہیں اور فرماتے ہیں کہ وہ ثقہ اور جلیل اور علم کا ظرف تھے۔ (تذکرہ جلد ۱ ص۷۹)

قال لا قرأۃ مع الامام فی شیٔ۔ (نسائی جلد ۱ ص ۱۱۱، مسلم جلد ۱ ص ۲۱۵، ابو عوانہ جلد ۲ ص ۲۰۱، طحاوی ۱ ص ۱۲۴) انھوں نے جواب ارشاد فرمایا کہ امام کے ساتھ کسی نماز میں کوئی قرأت نہیں کی جاسکتی۔

حضرت زید رضؓ بن ثابت کا یہ بسند صحیح اثر اس امر کی واضح دلیل ہے کہ امام کے ساتھ مقتدی کو کسی نماز میں کسی قسم کی قرأت کرنے کا حق نہیں ہے اور ان ایک روایت یوں ہے: من قرأ خلف الامام فلا صلوٰۃ لہ (موطا امام محمد ص ۱۰۰ و کتاب القرأۃ ص ۱۴۷) کہ جس نے امام کے پیچھے قرأۃ کی تو اس کی نماز نہیں ہوتی۔ امام طحاویؒ رح فرماتے ہیں کہ ہم سے یونس بن رح عبد الاعلیٰ رح نے بیان کیا وہ کہتے ہیں کہ ہم سے عبداللہؒ بن وہبؒ نے بیان کیا وہ حیوۃؒ بن شریحؒ سے اور وہ بکرؒ بن عمروؒ سے اور وہ عبید اللہ رح بن مقسم رح سے روایت کرتے ہیں، وہ فرماتے ہیں کہ میں نے قرأت خلف الامام کے بارے میں:

انہ سال عبد اللہ رض بن عمر رض و زید رض بن ثابت و جابر رض بن عبد اللہ رض فقالوا لا تقرؤا خلف الامام فی شئ من الصلوٰۃ۔ (طحاوی جلد ۱ ص ۱۲۹ و زیلعی جلد ۲ ص ۱۲ و اسنادہ صحیح) حضرت عبد اللہؓ بن عمر رض، حضرت زید رض بن ثابت اور حضرت جابر رض سے سوال کیا۔ ان سب نے فرمایا کہ امام کے پیچھے تمام نمازوں میں کوئی قرأت نہ کرو۔

نواب صدیق حسن خاں صاحبؒ لکھتے ہیں کہ و زید رض بن ثابت گفتہ لا قرأۃ مع الامام فی شئ رواہ مسلم و عن جابر رض بمعناہ و ھو قول علی رض و ابن مسعود رض و کثیر من الصحابۃ رض (ھدایۃ السائل ص ۱۹۳) اور امام بخاری رح فرماتے ہیں کہ حضرت ابن مسعود رض، حضرت زید رض بن ثابت اور حضرت ابن عمر رض امام کے پیچھے قرأت کے قائل نہ تھے۔ (جزء القرأۃ ص ۳) علامہ ذہبی رح لکھتے ہیں کہ حضرت زید رض بن ثابت کاتب وحی تھے۔ اور قرآن کریم کے جمع

لہ امام طحاوی رح کا ذکر آئے گا، ابن وہبؒ کا ترجمہ حدیث نمبر ۱ میں گذر چکا ہے۔ یونسؒ بن عبد الاعلیٰؒ کو امام ابو حاتم رح اور نسائی رح ثقہ کہتے ہیں۔ علیؒ بن الحسن رح اور مسلمہ رح بن قاسم رح ان کو حافظ حدیث کہتے ہیں۔ ابن حبان رح ثقات میں لکھتے ہیں (تہذیب التہذیب جلد ۱۱ ص ۴۴۱) حیوۃؒ بن شریح رح الامام القدوۃ شیخ دیار المصریۃ اور کبیر الشان تھے (تذکرہ جلد ۱ ص ۱۷۵) بکرؒ بن عمرو رح کو ابو حاتم رح شیخ اور ابن یونس رح صاحب عبادت

(باقی اگلے صفحہ پر دیکھئے)

کرنے کی خدمت ان کے سپرد کی گئی تھی، حضرت عمرؓ جب حج وغیرہ کے لیے تشریف لے جاتے تو ان کو اپنا نائب اور خلیفہ مقرر کر کے جاتے تھے۔ (تذکرہ جلد ۱ صد ۲۹) اور نواب صاحبؒ کے بیان سے معلوم ہوا کہ امام کے پیچھے ترکِ قرأت بعض یا چند حضرات صحابہ کرامؓ کا عمل اور فتویٰ ہی نہ تھا بلکہ اس مسلک پر حضرات صحابہ کرامؓ کی بھاری اکثریت تھی۔ وہ کثیر من الصحابہؓ۔

اعتراض: امام بیہقیؒ، امام نوویؒ اور مبارکپوری صاحبؒ وغیرہ نے اس اثر کی یہ تاویل کی ہے کہ اس اثر میں قرأت سے مراد مازاد علی الفاتحۃ کی قرأت ہے یا قرأت سے جہر مراد ہے (بیہقی جلد ۲ صد ۱۶۳، شرح مسلم جلد ۱ صد ۲۱۵ وابکار المنن صد ۱۹۶)

جواب: یہ تاویل قطعاً باطل ہے کیونکہ اگر قرآن کریم اور کسی صحیح حدیث سے امام کے پیچھے قرأت کرنے کی اجازت ثابت ہوتی تو تطبیق کے لیے یہ تاویل اختیار کی جا سکتی تھی۔ حالانکہ قرآن کریم اور صحیح و مرفوع حدیثوں سے یہ ثابت کیا جا چکا ہے کہ امام کے پیچھے عام قرأت تو کیا جائز ہوتی سورۃ فاتحہ اور ام القرآن پڑھنے کی بھی اجازت نہیں ہے، باقی حضرت عبادہؓ بن الصامت وغیرہ کی روایتوں کا ذکر بسط اور تفصیل کے ساتھ اپنے مقام پر آئے گا۔ کہ خلف الامام کی قید کے ساتھ کوئی روایت صحیح نہیں ہے۔ اور جو حدیثیں صحیح ہیں۔ وہ صرف امام اور منفرد کے حق میں ہیں، فریق ثانی کی یہ ستم ظریفی بھی قابلِ داد ہے کہ ایک طرف تو لا صلوٰۃ الخ کی روایتوں میں نکرہ پر لائے نفی جنس کو داخل سمجھ کر کے اتنی تعمیم مراد لی جاتی ہے کہ اس کے مقابلہ میں دنیا کے اسلامی کتب خانوں کی کسی کتاب سے کوئی دلیل نہیں پیش کی جا سکتی اور دوسری طرف لا قراۃ مع الامام فی شئ اور لا یقرأ خلف الامام فی شئ من الصلوٰۃ کو ایسا مقید کیا جاتا ہے کہ باوجودیکہ سورۃ فاتحہ ام القرآن اور قرآن عظیم ہے، مگر اس کی قرأت پر نہ تو لا نفی جنس اثر انداز ہو سکتا ہے اور نہ لفظ شئ اور یہ عجیب تر بات ہے کہ لا صلوٰۃ الخ میں نفی کمال تو مراد نہیں لی جا سکتی مگر یہاں لا قراۃ مع الامام فی شئ میں نفس قرأت سے جہر مراد ہو سکتی ہے، سبحان اللہ تعالیٰ! اور ان تینوں حضرات رضؓ سے بیک وقت سوال ہوتا ہے اور وہ اس کی اجازت نہیں

(بقیہ پچھلا صفحہ) و فضیلت اور دارقطنیؒ معتبر کہتے ہیں اور ابن حبانؒ ثقات میں لکھتے ہیں اور یہ صحاح ستہ کے رجال میں ہیں۔ (تہذیب التہذیب جلد ۱ صد ۴۸۶) اور عبیداللہؒ بن مقسمؒ ثقہ اور ثبت تھے (تقریب صد ۲۵۳)

دیتے کہ امام کے پیچھے کسی قسم کی کوئی قرأت کی جا سکے۔ اور ان میں حضرت جابرؓ بھی ہیں، جو ببانگ دہل قرأت سے ام القرآن کی قرأت مراد لیتے ہیں، بہرحال ان حضرات کی یہ تاویل قواعد اور اصول کے نیز صحیح احادیث کے خلاف ہوتے ہوئے۔ بعید از انصاف ہے، جو کسی طرح توجہ کی مستحق نہیں ہے اور صحیح اور مرفوع حدیثوں اور خود حضرت جابرؓ کے قول صریح کے مقابلہ میں یہ تاویل اس کی زیادہ مستحق ہے کہ — ع:

اٹھا کر پھینک دو باہر گلی میں

اثر حضرت عبداللہؓ بن مسعود: امام ابوبکرؒ بن ابی شیبہؒ فرماتے ہیں کہ ہم سے ابوالاحوصؒ[۱] نے بیان کیا۔ وہ منصورؒ سے اور وہ ابو وائلؒ سے روایت کرتے ہیں۔ وہ فرماتے ہیں کہ ایک شخص نے حضرت عبداللہؓ بن مسعود سے دریافت کیا:

اقرأ خلف الامام فقال ان فی الصلوٰۃ شغلا وسیکفیک قرأۃ الامام (الجوہر النقی جلد ۱ ص ۱۷۰)

کیا میں امام کے پیچھے قرأت کر سکتا ہوں، حضرت عبداللہؓ نے فرمایا کہ نماز میں امام قرأت میں مشغول ہے اور تجھے امام کی قرأت ہی کافی ہو جائے گی۔

اس روایت کے تمام راوی ثقہ ہیں چنانچہ علامہ ہیثمیؒ کہتے ہیں ورجالہ موثقون — (مجمع الزوائد جلد ۲ صفحہ ۱۱۰) کہ اس کے تمام راوی ثقہ ہیں اور مؤلف خیر الکلام ص ۵۲ میں لکھتے ہیں کہ صحیح ہے۔ اور کہتے ہیں کہ اثر مطلق ہے۔ اس میں فاتحہ کا بالخصوص ذکر نہیں … الخ

الجواب: مطلق کی نفی سے مقید کی نفی خود بخود ہو جاتی ہے اور اس کے مقابلہ میں نہ تو ان کا کوئی اثر صحیح ہے اور نہ ام الکتاب کی تصریح ہے پھر کیوں اس صحیح اثر کو رد کیا جاتا ہے؟ اس کے صحیح نہ ہونے کی بحث جلد دوم میں آئے گی۔ انشاء اللہ العزیز۔ علاوہ ازیں اس کو مطلق (کہ فاتحہ کو نہ شامل نہ ہو) کہنا بھی درست نہیں کیونکہ ایک روایت

---

[۱] امام ابوبکرؒ بن ابی شیبہؒ کا ترجمہ حدیث نمبر ۱۳ میں اور منصورؒ و ابو وائلؒ کا باب اوّل میں حضرت ابن مسعودؓ کے اثر کے ذیل میں نقل کیا جا چکا ہے۔ ابوالاحوصؒ کا نام سلامؒ بن سلیمؒ تھا۔ علامہ ذہبیؒ ان کو الحافظ اور احد الثقات لکھتے ہیں۔ (تذکرہ جلد ۱ صفحہ ۲۳۰)

میں یوں تصریح آتی ہے جو بطور تائید پیش کی جا رہی ہے۔

ان ابن مسعود رض کان لا یقرأ خلف الامام فیما یجہر فیہ وفیما یخافت فیہ فی الاولیین ولا فی الاخریین و اذا صلّی وحدہٗ قرأ فی الاولیین بفاتحۃ الکتاب وسورۃ... الخ

(موطا امام محمد ص۹۶)

کہ عبد اللہؓ ابن مسعود امام کے پیچھے نہ جہری نماز میں قراۃ کرتے تھے اور نہ سرّی نماز میں نہ پہلی دو رکعتوں میں اور نہ پچھلی دو رکعتوں میں اور جب اکیلے نماز پڑھتے تھے تو پہلی دونوں رکعتوں میں سورہ فاتحہ بھی پڑھتے اور دیگر کوئی اور سورت بھی۔

ان کی اس مفصل روایت سے معلوم ہوا کہ قرأت میں فاتحہ خصوصیت سے شامل ہے۔

اس کی سند یوں ہے: محمدؒ بن ابانؒ بن صالح القرشیؒ (اس پر محدثین کرام رح نے کلام کیا ہے، مگر مؤلف خیر الکلام وغیرہ کی صریح عبارات عرض کی جا چکی ہیں کہ تائید اور متابعت میں ضعیف حدیث بھی پیش کی جا سکتی ہے۔ لہٰذا اس کو تائید اور متابعت میں پیش کرنے میں کوئی حرج نہیں ہے)

عن حماد رح عن ابراہیم رح عن علقمۃ بن قیس رح أن عبد اللہ بن مسعود رض... الخ

باقی تمام راوی ثقہ ہیں اور علقمہ بن قیسؒ کے اثر میں ان کے تراجم آ رہے ہیں۔ امام بیہقیؒ نے حضرت ابن مسعود رض کا ایک اثر یوں نقل کیا ہے

لان اعضّ علی جمر الغضا احبّ الیّ من ان اقرأ خلف الامام۔

(کتاب القرأۃ ص۱۱۶)

یعنی یہ کہ میں جنڈ درخت کے جلتے کوئلوں کو منہ میں پکڑ لوں مجھے اس سے زیادہ پسند ہے کہ امام کے پیچھے قرأت کروں اور پڑھوں ——(اور ظاہر ہے کہ قرآت فاتحہ ہی سے شروع ہوتی ہے)

دوسری سند: امام بیہقیؒ فرماتے ہیں کہ ہم سے حافظ ابو عبداللہ رح اور ابو سعید رح بن ابی عمروؒ نے بیان کیا۔ وہ دونوں فرماتے ہیں کہ ہم سے ابو العباس محمدؒ بن یعقوبؒ نے بیان

لہ حافظ ابو عبداللہ رح اور شعبہ رح کا ترجمہ باب اوّل میں حضرت مجاہد رح کے اثر کے ذیل اور ابن مہدی رح کا سعیدؒ بن المسیبؒ کے اثر کے تحت اور ثوریؒ کا مقدمہ میں گذر چکا ہے۔ ابو العباسؒ کو علامہ ذہبی الامام الثقۃ محدث المشرق لکھتے ہیں (ایضاً ۳ ص۲۷)

گیا۔ وہ فرماتے ہیں کہ ہم سے ہارونؒ رحمہ بن سلیمان رحمہ نے بیان کیا۔ وہ فرماتے ہیں کہ ہم سے عبدالرحمٰن رحمہ بن مہدیؒ نے بیان کیا وہ سفیان (ثوریؒ) سے اور شعبہ رحمہ سے روایت کرتے ہیں وہ دونوں منصورؒ سے اور وہ ابو وائل رحمہ سے کہ ایک شخص نے حضرت عبداللہ رضہ بن مسعود سے سوال کیا:

عن القرأۃ خلف الامام فقال انصت	کہ کیا امام کے پیچھے قرأت کی جا سکتی ہے؟ حضرت
للقرآن فان فی الصلوٰۃ شغلًا وسیکفیک	عبداللہ رضہ نے فرمایا کہ قرآن کے لیے خاموش رہو۔
ذلک الامام۔	امام نماز کے اندر قرأت میں مشغول ہے۔ اور تجھے
(سنن الکبریٰ جلد ۲ ص۱۶۰)	امام کی قرأت کافی ہے۔

حضرت ابن مسعود رضہ کے ان صحیح آثار سے معلوم ہوا کہ وہ تمام نمازوں میں امام کے پیچھے قرأت کے قائل نہ تھے، ان کا ترجمہ اور جناب رسول اللہ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وآلہ وسلم کا ان پر کلی اعتماد باب اول میں وضاحت اور صراحت سے گذر چکا ہے۔

اعتراض: امام بیہقیؒ رحمہ کہتے ہیں: (۱) حضرت ابن مسعود رضہ نے انصات کا حکم دیا ہے اور انصات جہری نمازوں میں ہو سکتا ہے۔

(۲) علقمہؒ کا بیان ہے کہ میں نے نماز میں حضرت ابن مسعود رضہ کو قُلْ رَّبِّ زِدْنِیْ عِلْمًا پڑھتے سنا۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ قرأت کے قائل تھے۔

(۳) عبداللہؒ بن زیاد اسدیؒ کا بیان ہے کہ میں نے ظہر اور عصر کی نماز میں ابن مسعود رضہ سے قرأت سنی ہے۔ (سنن الکبریٰ وکتاب القرأۃ)

جواب: امام بیہقی رحمہ کے اعتراض کی جملہ شقیں مردود ہیں علی الترتیب جواب سن لیجئے (۱) حضرت ابن مسعود رضہ تمام سری اور جہری نمازوں میں امام کے پیچھے قرأت کے قائل نہ تھے اور یہ تمام حضرات فقہاءؒ اور محدثین رحمہ کے نزدیک مشہور و معروف ہے۔ (التعلیق الحسن جلد ا ص ۸۲) انصات کی پوری تحقیق باب اول میں آیت کے ذیل میں عرض کی جا چکی ہے اور فریقِ ثانی کا

---

[۱] یہ امام ابوالعباس رحمہ کے جلیل القدر شیخ اور مشہور محدث تھے (دیکھئے تذکرہ جلد ۳ ص ۲۷) علامہ ذہبیؒ ان کی سند کو صحیح سمجھتے ہیں (ایضاً جلد ا ص ۳۰۲)

شبہ اور مغالطہ بھی نکال دیا گیا ہے وہاں ہی ملاحظہ کر لیں، اعادہ کی ضرورت نہیں ہے۔

(۲) امام بیہقی رح نے اس قول کی کوئی سند نقل نہیں کی اور خود امام بیہقی رح کا ارشاد ہے، ہمیں اللہ تعالیٰ نے اس بات کا ہرگز مکلف نہیں ٹھہرایا کہ ہم اپنا دین، مجہول نامعتبر اور غیر معلوم راویوں سے اخذ کریں۔ (کتاب القراۃ ص۱۲۷ طبع دہلی) علاوہ بریں اس روایت میں اس کا کوئی ذکر نہیں کہ ابن مسعود رح نے امام کے پیچھے یہ آیت پڑھی تھی۔ اور اس کا بھی کوئی ذکر نہیں کہ قیام کی حالت میں پڑھی تھی۔ کیوں یہ ممکن نہیں کہ سجدہ یا تشہد وغیرہ میں بطور دعا یہ آیت پڑھی ہو۔ اور مزید برآں اس آیت سے اُم القرآن اور فاتحۃ الکتاب کے خاص لفظ پر استدلال کیسے صحیح ہو سکتا ہے؟

(۳) عبداللہ رح بن زیاد اسدی رح کی روایت پر روایۃً اور درایۃً کلام اپنے موقع پر عرض کیا جائیگا۔ انشاء اللہ العزیز۔

تیسری سند: حضرت ابن مسعود رض سے تیسری سند کے ساتھ یہ الفاظ مروی ہیں:

قال انصت للقراۃ فان فی الصلوۃ شغلا و سیکفیک ذلک الامام (طحاوی جلد ۱ ص۱۲۹، مجمع الزوائد جلد ۲ ص۱۸۵، کتاب القراۃ ص۱۱۶، موطا امام محمد ص۹۶، فتاوی ابن تیمیہ ج۲ ص۱۳۵ و آثار السنن جلد ۱ ص۸۹ وغیرہ۔

فرمایا قرأت کے لیے خاموش رہو کیونکہ نماز میں امام قرأۃ میں مشغول ہوتا ہے اور وہی امام تمہارے لیے کافی ہے۔ (تمہیں الگ قرأت کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔)

اعتراض: مبارک پوری صاحب رح لکھتے ہیں: (۱) سند میں وہیب رح بن خالد رح ہے، حافظ ابن حجر رح لکھتے ہیں کہ وہ ثقہ اور ثبت تھا۔ لکنہ تغیر قلیلا بآخرہ (تقریب ص۳۸۹) آخر عمر میں تھوڑا سا تغیر ان کے حافظہ میں آچکا تھا۔

(۲) اس اثر کی سند میں نصر رح بن مرزوق رح ہے اور مجھے اس کا ترجمہ نہیں مل سکا۔

(۳) اس میں خصیب رح واقع ہے نہ معلوم وہ کون اور کیسا تھا؟ (ابکار المنن ص۱۹۵)

جواب: یہ تمام شقیں باطل ہیں: (۱) ثقہ اور ثبت راوی کا تغیر یسیر اور قلیل مضر نہیں ہے جیسا کہ گذر چکا ہے۔

(۲) خصیبؒ سے خصیبؒ بن ناصح رح مراد ہیں۔ امام ابوزرعہ رح فرماتے ہیں ما بہ بأس انشاء اللہ اور ابن حبان رح ان کو ثقات ہیں لکھتے ہیں (تہذیب جلد ۳ صہ ۱۴۳)

(۳) نصرؒ بن مرزوق رح کا ترجمہ اگر مبارک پوری صاحبؒ کو نہیں ملا تو کیا حرج ہے۔ علامہ ہیثمیؒ فرماتے ہیں رجالہٗ موثقون (مجمع الزوائد جلد ۲ ص ۱۸۵) اس کے تمام راوی ثقہ ہیں اور علامہ نیموی رح لکھتے ہیں کہ اس کی سند صحیح ہے (آثار السنن جلد ۱ ص ۹۶) اور باقرار مبارکپوری صاحبؒ نہ جاننے والوں پر جاننے والوں کو ترجیح ہوا کرتی ہے۔ قاضی شوکانیؒ لکھتے ہیں ومن علم حجۃ علی من لم یعلم (نیل الاوطار جلد ۱ ص ۳۴۲) کہ جاننے والا نہ جاننے والے پر حجت ہے، یعنی جاننے والے کی بات نہ جاننے والے کی بات پر راجح ہوگی۔ حضرت عبداللہؓ بن مسعودؓ کی بعض صحیح روایتیں باب اول میں نقل کی جا چکی ہیں اور متعدد سندیں ان سے اور بھی مروی ہیں۔ مگر ہمارا مقصد تمام روایات و آثار کا استیعاب نہیں صرف اپنے دعویٰ کو روشن کرنا ہے۔

اثر حضرت عبداللہ رضؓ بن عباس رضؓ: امام طحاویؒ رح فرماتے ہیں کہ ہم سے

لہ امام طحاویؒ ابوجعفر احمد بن محمدؒ بن سلامہ الحنفیؒ (المتوفی ۳۲۱ھ) علامہ ذہبی رح لکھتے ہیں کہ وہ الامام العلامہ اور الحافظ تھے اور انہوں نے بہترین کتابیں لکھی ہیں، محدث ابن یونسؒ کا بیان ہے کہ وہ ثقہ، ثبت فقیہ اور بڑے عقلمند تھے۔ اور انھوں نے اپنے بعد کوئی اپنا نظیر نہیں چھوڑا۔ (تذکرہ جلد ۳ ص ۲۸) مسلمہؒ بن قاسم رح کا بیان ہے کہ وہ ثقہ جلیل القدر، فقیہ البدن اور علماء کے اختلافات کے جاننے میں بڑی مہارت رکھتے تھے (لسان المیزان جلد ۱ ص ۲۷۶) حافظ ابو عمرؒ بن عبدالبرؒ کا بیان ہے کہ وہ تمام فقہاء کے مذاہب پر گہری نگاہ رکھنے والے تھے۔ (الجواہر المضیہ جلد ۱ ص ۱۰۳) امام ابن ندیم رح فرماتے ہیں کہ وکان اوحد اھل زمانہ علماً و زھداً (الفہرست لابن ندیمؒ ص ۳۰۶) کہ وہ اپنے زمانہ میں علم و زہد میں یکتا تھے اور حافظ ابن القیمؒ لکھتے ہیں: امام الحنفیۃ فی وقتہ فی الحدیث والفقہ و معرفۃ اقوال السلف۔ اھ (اجتماع جیوش الاسلامیۃ ص ۹۶) کہ وہ اپنے وقت میں حدیث فقہ اور معرفت اقوال سلفؒ میں احناف کے امام تھے۔

ابراہیم رحہ بن ابی داؤد رحہ نے بیان کیا وہ کہتے ہیں کہ ہم سے ابو صالح عبد الغفار رحہ بن داؤد الحرانی نے بیان کیا وہ کہتے ہیں کہ ہم سے حماد بن سلمہ رحہ نے بیان کیا۔ وہ ابو جمرہ رحہ سے روایت کرتے ہیں کہ میں نے حضرت عبد اللہ رض بن عباس رض سے سوال کیا۔

اقرأ والامام بین یدی قال لا۔ یعنی کیا امام کے پیچھے قرأت کر سکتا ہوں؟

(طحاوی جلد ۱ ص ۱۲۹ والجوہر النقی جلد ۲ ص ۱۷۱ و آثار السنن جلد ۱ ص ۸۹ وغیرہ) حضرت ابن عباس رض نے ارشاد فرمایا۔ ہرگز نہیں۔

اس صحیح روایت میں سری اور جہری کی کوئی قید موجود نہیں ہے۔ اس لیے یہ تمام نمازوں کو شامل ہے اور یہی حضرت ابن عباس رض کا مسلک تھا۔

اعتراض: مبارک پوری صاحب رحہ لکھتے ہیں:

(۱) حماد رحہ بن سلمہ رحہ کا آخر عمر میں حافظہ کچھ خراب ہو گیا تھا۔

(۲) غیر اثر حضرت ابن عباس رض سے اجازت قرأت خلف الامام کی روایت نقل کرتے ہیں اور اس کی سند بالکل بے غبار ہے۔ (ابکار المنن ص ۱۹۶)

جواب: یہ اعتراض بھی باطل ہے: (۱) تغیر یسیر کا محقق حکم پہلے لکھا جا چکا ہے اور حماد رحہ بن سلمہ کا ترجمہ بھی نقل کیا جا چکا ہے کہ امام احمد رحہ وغیرہ فرماتے ہیں کہ جو شخص حماد رحہ بن

۱؎ حافظ ابن حجر رحہ ان کو من الحفاظ المکثرین لکھتے ہیں (لسان المیزان جلد ۱ ص ۲۷۵) کہ وہ حفاظ حدیث میں شمار ہوتے ہیں جن سے بکثرت حدیثیں مروی ہیں۔ علامہ یاقوت حموی رحہ فرماتے ہیں کہ ۲۷۲ ھ میں ان کی وفات ہوئی ہے اور وہ ثقہ اور حفاظ حدیث میں تھے۔ محدث ابن یونس رحہ ان کو ثقہ اور من حفاظ الحدیث کہتے ہیں۔ علامہ سمعانی رحہ بھی ان کو ثقہ اور من حفاظ الحدیث کہتے ہیں اور امام ابن عساکر رحہ بھی ان کو ثقہ من حفاظ الحدیث کی صفت سے یاد کرتے ہیں۔ (امانی الاحبار جلد ۱ ص ۸)

۲؎ وہ ثقہ اور فقیہہ تھے۔ (تقریب ص ۲۴۳)

۳؎ ان کی توثیق باب اول میں سعید رحہ بن المسیب رحہ کے اثر کے تحت نقل ہو چکی ہے۔

۴؎ ان کا نام نصر رحہ بن عمران رحہ تھا جو ثقہ اور ثبت تھے (تقریب ص ۳۷۴) حضرت ابن عباس رض جلیل القدر صحابی ہیں۔

سلمہؒ پر اعتراض کرنا چاہتا ہے تو اس کو اس کے اسلام ہیں متہم سمجھو۔ اصل الفاظ یہ ہیں فاتھمه علی الاسلام۔ اور نواب صاحبؒ لکھتے ہیں کہ گو تم حمادؒ بن سلمہؒ امام است تفرد شش ما دام کہ در مرویش مانعی از اصول نبود مضر نیست۔ (بدور الاہلہ ص۳۳)

(۲) یہ اپنے مقام پر عرض کیا جائے گا کہ عزارہؒ کی روایت میں کوئی غبار ہے یا نہیں؟

علاوہ بریں حضرت ابن عباسؓ کی بسند صحیح دو روایتیں باب اول میں نقل کی جا چکی ہیں۔

ایک اور روایت: حضرت عکرمہؒ فرماتے ہیں کہ حضرت عبداللہ رضؓ بن عباسؓ سے سوال کیا گیا۔

قیل له ان ناسا یقرؤن فی الظهر والعصر فقال لو کان لی علیهم سبیل لقلعت السنتهم ان رسول الله صلی الله علیه وسلم قرأ فکانت قرأته لنا قرأة وسکوته لنا سکوتا۔

(طحاوی جلد ا ص۱۲۱)

کہ کچھ لوگ ظہر اور عصر کی نماز میں قرأت کرتے ہیں کیا یہ درست ہے؟ حضرت ابن عباسؓ نے فرمایا۔ اگر میرا ان پر بس چلتا تو میں ان کی زبانیں کھینچ لیتا، کیونکہ آں حضرت صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے قرأت کی ہمیں بھی قرأت کرنی چاہیئے اور آپ نے سکوت اختیار کیا، ہمیں بھی سکوت کرنا چاہیئے۔

اس اثر میں اگرچہ خلف الامام کی قید مذکور نہیں ہے، لیکن با دنیٰ تامل یہ بات بخوبی معلوم ہو سکتی ہے کہ امام اور منفرد کو تو بالاتفاق قرأت کرنا ضروری ہے۔ پھر نہ معلوم حضرت ابن عباسؓ جیسے

لہ اس اثر کی سند کے راوی یہ ہیں: (۱) امام طحاویؒ (۲) ابن مرزوقؒ، ان کا نام ابراہیمؒ بن مرزوق تھا۔ امام نسائیؒ ان کو صالح اور لا بأس به کہتے ہیں دارقطنیؒ ان کو ثقہ یخطئ کہتے ہیں۔ ابن یونسؒ کہتے ہیں کہ وہ ثقہ اور ثبت تھے۔ ابن ابی حاتمؒ کہتے ہیں کہ وہ ثقہ اور صدوق تھے۔ ابن حبانؒ ان کو ثقات میں لکھتے ہیں اور سعیدؒ بن عثمانؒ کہتے ہیں کہ وہ ثقہ تھے۔ (تہذیب التہذیب جلد ا ص۱۶۳ محصلہ)

(۳) وہبؒ بن جریرؒ ثقہ تھے (تقریب ص۳۸۸) (۴) جریرؒ بن حازمؒ ثقہ تھے۔ (ایضاً ص۶۶)

(۵) ابو یزید مدنی، ابو حاتمؒ، امام احمدؒ اور ابو داؤدؒ ان پر اعتماد کرتے تھے، ابن معینؒ ان کو ثقہ کہتے ہیں (تہذیب التہذیب جلد ۱۲ ص۲۸۰) حافظ ابن حجرؒ ان کو مقبول کہتے ہیں (تقریب ص۴۲۲) (۶) عکرمہؒ ثقہ تھے (ایضاً ص۲۴۲) (۷) حضرت عبداللہؓ بن عباسؓ صحابی ہیں۔

ترجمان القرآن اور حبر الامۃ ان لوگوں کی زبانیں کھینچنے کے لیے کیوں آمادہ ہو گئے تھے؟ اگر ان کے بس اور قدرت میں ہوتا تو ضرور اپنا ارادہ پورا کر گذرتے، ناچار یہ تسلیم کرنا پڑے گا کہ یہ لوگ امام کے پیچھے قرأت کرتے تھے اور حضرت ابن عباسؓ نے ان کی اس مذموم حرکت سے انتہائی نفرت کی اور یہ بھی مت بھولئے کہ پڑھنے والے ظہر اور عصر کی نماز میں پڑھتے تھے جو بالاجماع سری نمازیں ہیں اور یہ ممکن تھا کہ قرأت ما زاد علی الفاتحہ کی قرأت پر حمل کر لیا جاتا، مگر اس کو کیا کیا جائے کہ حضرت ابن عباسؓ امام کے پیچھے مطلقاً قرأت کے قائل نہ تھے، اور گذر چکا ہے کہ حضرت ابن عباسؓ کی مرفوع روایت میں امام کے پیچھے خاص لفظ فاتحۃ الکتاب کے پڑھنے کی ممانعت آئی ہے۔ اور یہ بھی درست نہیں ہو سکتا کہ قرأت کو جہر پر حمل کر لیا جائے، اس لیے کہ قرأت کا تقابل سکوت سے کیا گیا ہے اور سکوت کے معنیٰ آپ پہلے وضاحت کے ساتھ پڑھ چکے ہیں، بہرکیف خود اس اثر کے اندر ایسے قرائن موجود ہیں، جو اس امر کو متعین کر دیتے ہیں کہ یہ بحالتِ اقتداء امام کے پیچھے قرأت کرتے تھے۔ جس پر حضرت ابن عباسؓ طیش میں آ کر یہ ارشاد فرماتے ہیں۔ باقی اثر کے اس حصہ کا مطلب کہ آں حضرت صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے قرأت کی اور ہمارے لیے آپ کی اقتدا ضروری ہے اور آپ نے سکوت بھی کیا۔ اور ہمارے لیے سکوت میں بھی آپ کی پیروی لازمی ہے۔ تو اس کی پوری بحث سکوت کے ذیل میں کی جا چکی ہے کہ آں حضرت صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے بحالتِ امامت قرأت کی اور بحالتِ اقتدا سکوت اختیار کیا۔ یا یہ مطلب ہو کہ آں حضرت صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم ہمارے امام تھے۔ اور آپ کی قرأت ہم سب مقتدیوں کی قرأت تھی۔ اور آپ کا پچھلی دونوں رکعتوں میں سورۃ فاتحہ کے بعد کی قرأت کو ترک کر کے اس سے سکوت اختیار کرنا ہمارے لیے کافی ہوتا تھا تو اس لحاظ سے حدیث من کان لہ امام فقرأۃ الامام لہ قرأۃ کی گویا یہ اثر تفسیر اور تشریح ہو گا۔ اس حصہ کا یہ مطلب ہو یا کوئی اور ہو ہمارا استدلال واضح ہے اور اس پر موقوف نہیں ہے۔ مؤلف خیر الکلام نے ص۱۸۱ میں ہمارے اس مطلب کو "ایک قسم کی تحریف معنوی ہے" سے تعبیر کیا ہے اور دلیل یہ بیان

کی کہ بخاری ج ا صفحہ ۱۰۵ کی روایت میں ابن عباسؓ سے آتا ہے قرأ النبی صلی اللہ علیہ وسلم فیما امر وسکت فیما امر... الخ امام بخاریؒ نے اس سے جہر مراد لی ہے اور اس پر باب الجہر بقرأۃ صلوٰۃ الصبح قائم کیا ہے اور پھر صہ ۳۱۹ اور صہ ۳۲۰ میں لکھتے ہیں کہ امام اسمٰعیلیؒ اور حافظ ابن حجرؒ یہ مطلب لیتے ہیں کہ ابن عباسؓ کو سری نمازوں میں قرأت کا شک تھا اور بعض روایتوں میں ہے کہ وہ نفی کرتے تھے مگر آخر میں قائل ہو گئے تھے لہٰذا اس سے مراد یا تو جہر ہے یا ان کا پہلا نظریہ ہے اور بعض حنفیہ کا مطلب قطعاً غلط ہے (محصلہ)

الجواب: مگر ہم نے استدلال بخاری کی روایت سے نہیں کیا بلکہ طحاوی کی روایت سے کیا ہے جس کے الفاظ اور ہیں اور اس میں تفصیل ہے اور ظہر اور عصر کی قید موجود ہے۔ وہاں اگر یہ ثابت ہو جائے کہ وہ پہلے قرأت میں شک یا انکار کرتے تھے تو بات قدرے معقول ہے مگر اس کا صحیح ثبوت درکار ہے اور در صورت صحت امام بخاریؒ کی روایت کا یہ مطلب لیا جاسکتا ہے مگر ان سے سری نمازوں میں قرأت اور ترک القرأۃ خلف الامام کی روایتیں بالکل صحیح ہیں اور دوسری روایتیں اس پایہ کی نہیں ہیں اس لیے ان کے آئینہ میں ان صحیح روایات کا مطلب لینا غلط ہے۔

اثر حضرات خلفاءِ راشدینؓ: امام عبدالرزاق رح فرماتے ہیں کہ ہم سے موسیٰ بن عقبہؒ[1] نے بیان کیا وہ فرماتے ہیں:

ان ابا بکرؓ وعمرؓ وعثمانؓ کانوا ینھون عن القرأۃ خلف الامام	کہ حضرت ابوبکرؓ (المتوفی ۱۳ھ) اور حضرت عمرؓ (المتوفی ۲۳ھ) اور حضرت عثمانؓ (المتوفی ۳۵ھ)
(بحوالہ عمدۃ القاری جلد ۳ صہ ۶۷ و اعلاء السنن جلد ۴ صہ ۵۸)	امام کے پیچھے قرأت کرنے سے منع کرتے تھے۔

امام عبدالرزاق رح اپنے مصنف میں داؤد بن قیسؒ[2] سے روایت کرتے ہیں اور وہ

---

[1] ثقہ اور حافظ تھے۔ (تقریب ص ۴۲۰)

[2] ثقہ اور فقیہ تھے (تقریب ۳۶۸) ثبت اور کثیر الحدیث تھے (تہذیب التہذیب ص ۲۳۷) حجت اور صغار تابعینؒ میں تھے (میزان الاعتدال جلد ۳ صہ ۲۱۴)

[3] امام شافعیؒ ان کو ثقہ اور حافظ کہتے ہیں امام احمد رح، ابوزرعہ رح، نسائی رح، ابوحاتم رح (باقی اگلے صفحہ پر)

محمد بن عجلانؒ سے روایت کرتے ہیں۔ وہ فرماتے ہیں:

قال علیؓ من قرأ مع الامام فلیس علی الفطرۃ۔۔ (بحوالہ الجوھر النقی جلد ۲ ص ۱۶۹)

کہ حضرت علیؓ (المتوفی ۴۰ھ) نے فرمایا کہ جس شخص نے امام کے ساتھ قرآت کی تو وہ فطرت پر نہیں ہے۔

اور دارقطنی جلد ا ص ۱۲۶ کی روایت یوں ہے:

من قرأ خلف الامام فقد اخطأ الفطرۃ۔

کہ جس نے امام کے پیچھے قرآت کی اس نے فطرت کو کھو دیا۔

امام محمدؒ فرماتے ہیں کہ ہم سے داؤدؒ بن قیسؒ نے بیان کیا۔ وہ فرماتے ہیں کہ ہم سے محمدؒ بن عجلانؒ نے بیان کیا۔ وہ فرماتے ہیں:

ان عمرؓ بن الخطاب قال لیت فی فم الذی یقرأ خلف الامام حجرا (موطا امام محمد ص ۹۸)

کہ حضرت عمرؓ بن الخطاب نے فرمایا۔ کاش جو شخص امام کے پیچھے قرآت کرتا ہے اس کے منہ میں پتھر ڈالے جائیں۔

اور حافظ ابو عمرؒ بن عبدالبرؒ لکھتے ہیں کہ:

ثبت عن علیؓ وسعدؓ وزیدؓ بن ثابت انہ قال لا قرأۃ مع الامام لا فیما اسر ولا فیما جہر (بحوالہ الجوہر النقی جلد ۲ ص ۱۶۹)

حضرت علیؓ اور حضرت سعدؓ اور حضرت زیدؓ بن ثابت سے یہ بات ثابت ہو چکی ہے۔ انھوں نے فرمایا کہ امام کے ساتھ نہ سری نمازوں میں قرأت کی جا سکتی ہے اور نہ جہری نمازوں میں۔

حضرت علیؓ سے ایک دوسری روایت یوں مروی ہے، جو صرف متابعت کے طور پر نقل کی جاتی ہے:

من قرأ خلف الامام فلیس علی الفطرۃ۔

کہ جس شخص نے امام کے پیچھے قرأت کی وہ فطرت پر

(بقیہ حاشیہ پچھلا صفحہ) ابن سعدؒ، ابن مدینیؒ اور ساجیؒ سب ان کو ثقہ کہتے ہیں۔ ابن معینؒ ان کو صالح الحدیث کہتے ہیں، ابن حبانؒ ثقات میں لکھتے ہیں۔ (تہذیب التہذیب جلد ۳ ص ۱۹۸)

[۱] ان کا ترجمہ باب دوم حدیث نمبر ۲ میں نقل کیا جا چکا ہے۔

(طحاوی جلد ۱ ص ۱۲۹ و منتخب کنز العمال ص۱۸۷) ہیں۔

اور گو موسیٰ رح بن عقبہ رح اور محمد رح بن عجلان رح کی روایتیں مرسل ہیں لیکن جمہور ائمہ رح کے نزدیک حدیث مرسل بھی حجت ہے جس کی تحقیق پہلے گذر چکی ہے۔ یہی اعتراض مؤلف خیر الکلام نے ص۱۴۵ میں کیا ہے کہ یہ دونوں اثر ضعیف ہیں کیونکہ یہ دونوں مذکور راوی صغار تابعین رح میں ہیں۔ حضرت عمرؓ سے ان کی لقاء ثابت نہیں ہے۔ (محصلہ) ہم بھی ان کو مرسل مانتے ہیں، مگر معتضد ہے جو حجت ہے اور مرسل معتضد کے حجت ہونے میں تو کوئی شبہ نہیں اور یہ ایک دوسرے کے اعتضاد کے لیے کافی ہیں اور دوسری حدیثیں اس پر مستزاد ہیں، حضرت علیؓ کی دوسری روایت میں ابن ابی لیلیٰ رح اور مختار بن ابی لیلیٰ رح کمزور اور ضعیف ہیں۔ اور اسی وجہ سے مبارکپوری صاحب رح نے اس پر اعتراض کیا ہے (دیکھئے تحقیق الکلام جلد ۲ ص۲۰۹) مگر ہم نے اس سے استدلال نہیں کیا۔ بلکہ اس کو محض متابعت میں نقل کیا ہے، اور بقول مؤلف خیر الکلام ان میں بعض راوی اگرچہ ضعیف ہیں مگر متابعت میں ذکر کرنے سے کوئی حرج نہیں ہے۔ (ص۳۱۶) حضرات خلفاء راشدین رضا اور حضرت سعدؓ بن ابی وقاص، ایسے جلیل القدر اور بلند مرتبہ صحابہؓ کی دینی خدمات اور دیگر علمی اور عملی فضائل کا کون انکار کر سکتا ہے؟ ہاں البتہ کور مغز اور خیرہ چشم کی بات ہی الگ ہے۔ یہ وہی اکابر ہیں جن کو دنیا میں حضرت محمد رسول اللہ تعالیٰ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی زبان فیض ترجمان سے جنتی ہونے کی بشارت اور خوشخبری مل چکی ہے اور اللہ تعالیٰ نے ان کو مومن کا خطاب عنایت فرما کر ابدی رضا کا پروانہ دے دیا ہے۔

حضرت ابو ہریرہ رضؓ (المتوفی ۵۸ھ) اور حضرت عائشہ رضؓ (المتوفاۃ ۵۷ھ) کا اثر:

امام بیہقی رح فرماتے ہیں کہ ہم سے حافظ ابو عبد اللہ رح نے بیان کیا۔ وہ کہتے ہیں کہ مجھ سے ابو یحییٰ سمرقندی[1] رح نے بالمشافہ بیان کیا۔ وہ فرماتے ہیں کہ ہم سے محمد رح بن نصر[2] رح نے بیان کیا، وہ فرماتے

---

[1] ان کا نام محمد رح بن اسحاق سمرقندی رح ہے، جلیل القدر محدث اور فقیہ تھے۔ علامہ ذہبی رح نے (تذکرہ جلد ۲ میں ص ۲۰۱) ان کا نام ذکر کیا ہے

[2] علامہ ذہبی رح لکھتے ہیں کہ وہ الامام شیخ الاسلام اور الفقیہ تھے۔ (تذکرہ جلد ۲ ص۲۰۱) حافظ ابن حجر رح لکھتے ہیں کہ وہ الفقیہ اور الحافظ تھے۔ (تہذیب التہذیب ۹ ص ۴۸۹) ابن حبان رح ان کو احد الائمۃ فی الدنیا کہتے ہیں (ایضاً ص۴۹۰)

ہیں کہ ہم سے محمدؒ بن یحییٰ رحمہ نے بیان کیا۔ وہ کہتے ہیں کہ ہم سے محمدؒ بن یوسف رحمہ نے بیان کیا وہ فرماتے ہیں کہ ہم سے عاصمؒ رحمہ نے بیان کیا، وہ ابو صالحؒ ذکوانؒ سے روایت کرتے ہیں اور وہ حضرت عائشہ رضؓ اور حضرت ابوہریرہ رضؓ سے روایت کرتے ہیں:

انھما کانا یامران بالقرأۃ وراء الامام اذا لم یجہر (سنن الکبریٰ جلد ۲ ص۱۷۱)

کہ حضرت عائشہ رضؓ اور حضرت ابوہریرہ رضؓ دونوں اس بات کا حکم دیتے تھے کہ جب امام جہر سے قرأت نہ کرتا ہو تو اس کے پیچھے قرأت کرنی چاہیے۔

دوسری سند: امام بیہقی رحمہ فرماتے ہیں کہ ہم سے احمدؒ بن محمدؒ بن الحارث رحمہ نے بیان کیا وہ فرماتے ہیں کہ ہم سے ابو محمدؒ بن حیانؒ نے بیان کیا۔ وہ کہتے ہیں کہ ہم سے محمدؒ بن عبد اللہؒ بن رستہؒ نے بیان کیا۔ وہ فرماتے ہیں کہ ہم سے شیبانؒ بن فروخ رحمہ نے بیان کیا وہ کہتے ہیں کہ ہم سے

۱؎ علامہ ذہبیؒ ان کو الامام شیخ الاسلام اور حافظ نیشاپور لکھتے ہیں (تذکرہ ۲ ص۱۱۱) ابو حاتم رحمہ ان کو امام اہل زمانہ اور ابو بکرؒ بن زیادؒ ان کو امیر المومنین فی الحدیث کہتے ہیں (ایضاً ص۱۰۲) حافظ ابن حجر رحمہ ان کو الحافظ لکھتے ہیں۔ (تہذیب التہذیب ۹ ص ۵۱۱)

۲؎ علامہ ذہبیؒ ان کو الحافظ، العابد اور شیخ الشام لکھتے ہیں، امام بخاریؒ ان کو افضل اہلِ زمانہ کہتے ہیں۔ (تذکرہ جلد ۱ ص۴۲۱) امام عجلیؒ اور نسائی رحمہ ان کو ثقہ کہتے ہیں، ابو حاتم رحمہ ان کو صدوق اور ثقہ کہتے ہیں۔ (تہذیب التہذیب ۹ ص۵۳۹)

۳؎ عاصم رحمہ بن بہدلہ رحمہ اگرچہ بعض محدثین نے خطاء و اضطراب اور وہم کی وجہ سے ان میں کلام کیا ہے لیکن جمہور ان کو ثقہ کہتے ہیں چنانچہ امام احمدؒ، علامہ ابن سعدؒ عجلیؒ اور ابو زرعہؒ ان کو ثقہ کہتے ہیں، ابن معینؒ ثقہ اور لا بأس بہ نسائیؒ لیس بہ بأس اور یعقوبؒ بن سفیانؒ ان کو ثقہ کہتے ہیں۔ ابو حاتم رحمہ ان کو صداقت شعار اور صالح الحدیث کہتے ہیں۔ بزارؒ کا بیان ہے کہ مجھے کوئی ایسا محدث معلوم نہیں جو ان سے روایت نہ کرتا ہو۔ امام یحییٰؒ ان کو امام اعمشؒ کا ہم پایہ کہتے ہیں، ابن حبانؒ اور ابن شاہینؒ ان کو ثقات میں لکھتے ہیں (تہذیب التہذیب جلد ۵ ص ۳۹) علامہ ذہبیؒ ان کو حسن الحدیث لکھتے ہیں (میزان جلد ۲ ص۵) حافظ ابن کثیرؒ عاصمؒ بن بہدلہ کی سند کو جید اور قوی کہتے ہیں (ابن کثیر جلد ۴ ص۵۳۶) امام حاکم رحمہ اور

(باقی اگلے صفحہ پر)

حکمؒ بن زہیرؒ نے بیان کیا۔ وہ فرماتے ہیں کہ ہم سے عاصمؒ بن بہدلہ نے بیان کیا۔ وہ ابوصالحؒ سے اور وہ حضرت ابوہریرہؓ اور حضرت عائشہؓ سے روایت کرتے ہیں:

انهما كانا يأمران بالقرأة خلف الامام في الظهر والعصر في الركعتين الاوليين بفاتحة الكتاب وشئ من القرآن وكانت عائشةؓ تقرأ في الاخريين بفاتحة الكتاب۔

(سنن الکبریٰ جلد ۲ ص ۱۷۱)

کہ وہ دونوں ظہر اور عصر کی نماز میں امام کے پیچھے قرأت کرنے کا حکم دیتے تھے اور دونوں فرماتے تھے کہ پہلی دونوں رکعتوں میں سورۃ فاتحہ اور اس کے ساتھ کچھ اور بھی پڑھنا چاہیے اور حضرت عائشہؓ ظہر اور عصر کی پچھلی دونوں رکعتوں میں صرف سورۃ فاتحہ پڑھا کرتی تھیں۔

ان روایتوں سے معلوم ہوا کہ حضرت عائشہؓ اور حضرت ابوہریرہؓ جہری نمازوں میں امام کے پیچھے قرأۃ کے قائل نہ تھے۔ صرف ظہر اور عصر کی سرّی نمازوں میں وہ امام کے پیچھے قرأۃ کے قائل اور اس پر عامل تھے۔ اور وہ دونوں پہلی رکعتوں میں سورۃ فاتحہ کے علاوہ وشئ من القرآن کی قرأت کے بھی قائل تھے۔ اور فریق ثانی اس کا قائل نہیں ہے اور اس روایت سے ظاہر ہوتا ہے کہ ظہر اور عصر کی پچھلی دونوں رکعتوں میں امام کے پیچھے حضرت ابوہریرہ رضؓ قرأت سورۃ فاتحہ کے قائل نہ تھے۔ ہاں حضرت عائشہؓ صدیقہ کا اس پر عمل تھا۔ حضرت عائشہؓ اور حضرت ابوہریرہ رضؓ کا حضرات صحابہ کرام رضؓ میں اور خاص طور پر فن روایت میں جو مقام اور رتبہ ہے اور دین کی جتنی خدمات ان سے سرانجام ہوتی ہیں وہ کس سے مخفی ہیں؟

مبارکپوری صاحبؒ نے عاصمؒ بن بہدلہؒ کی وجہ سے اس روایت پر کلام کیا ہے۔ (دیکھئے تحقیق الکلام جلد ۲ ص ۹۸) لیکن مولانا اپنے گریبان میں منہ ڈال کر ان کا موازنہ فرمائیں۔ محمدؒ بن

(بقیہ حاشیہ پچھلا صفحہ) علامہ ذہبیؒ عاصمؒ بن بہدلہؒ کی روایت کو صحیح کہتے ہیں۔ (مستدرک جلد ۳ صفحہ ۴۱۶)

لے امام احمدؒ ان کو ثقہ اور علامہ ذہبیؒ ان کو من اجل الناس واوثقهم لکھتے ہیں (تذکرہ جلد ۱ ص ۸۳) اصول حدیث اور محدثین کی تصریح کے مطابق یہ حدیث حسن جید قوی اور صحیح ہے۔

اسحاق رح وغیرہ سے کر دیکھیں۔ مؤلف خیر الکلام ص ۵۱۸ میں لکھتے ہیں کہ یہ اثر بھی بظاہر صحیح ہے مگر اس میں ممانعت کا ذکر نہیں اور یہ اثر جہری نماز کی نفی میں صریح نہیں۔

الجواب: ممانعت کا نہ سہی جہری نمازوں میں ترکِ قرآت کا ذکر تو ہے اور اذا الم یجھر شرط اور قید ہے اور صراحت کیا ہوتی ہے؟ اور ترکِ قرآت خلف الامام کی وجہ سے بطلانِ نماز کی رٹ تو باطل ہوتی۔

حضرات! قارئین کرام! ابھی حضرات صحابہ رض کرام کے بہت سے آثار پیش کیے

لہ امام ابن قدامہ رح نے کئی سندات کے ساتھ حضرت علی رض، حضرت ابن عباس رض، حضرت ابن مسعود رض، حضرت ابو سعید رض، حضرت زید رض بن ثابت، حضرت عقبہ رض بن عامر، حضرت جابر رض، حضرت ابن عمر رض اور حذیفہ رض کی روایتیں نقل کی ہیں (مغنی ابن قدامہ رح جلد ۱ ص ۶۰۵) اور حافظ ابو عمر رح بن عبد البر رح کے حوالے سے حضرت علی رض، حضرت سعد رض اور حضرت زید رض بن ثابت کے نام نقل کیے جا چکے ہیں۔ اور امام بخاری رح لکھتے ہیں کہ حضرت ابن مسعود رض، حضرت زید رض بن ثابت اور حضرت ابن عمر رض امام کے پیچھے قرآۃ کے قائل نہ تھے (جزء القرآۃ ص ۳) اور علامہ عینی رح نے مانعین قرآت خلف الامام میں حضرت ابو بکر رض، حضرت عمر رض، حضرت عثمان رض، حضرت علی رض، حضرت عبد الرحمٰن رض بن عوف، حضرت سعد رض بن ابی وقاص، حضرت عبد اللہ رض بن مسعود، حضرت زید رض بن ثابت اور حضرت ابن عباس رض کا ذکر بھی کیا ہے اور اس پر ایک روایت بھی وہ نقل کرتے ہیں (عمدۃ القاری جلد ۳ ص ۶۷) نیز علامہ عینی رح اور ملا علی القاری رح لکھتے ہیں کہ اسّی ۸۰ حضرات صحابہ کرام رض سے امام کے پیچھے قرآت کی ممانعت کا ثبوت ملتا ہے۔ (عمدۃ القاری جلد ۳ ص ۶۷ اور شرح نقایہ جلد ۱ ص ۸۳) بلکہ امام شعبی رح نے تو یہاں تک فرمایا ہے: قال ادرکت سبعین بدریا کلھم یمنعون المقتدی عن القراۃ خلف الامام (روح المعانی جلد ۹ ص ۱۳۵) کہ میں نے ستر ۷۰ عدد بدری حضرات صحابہ کرام رض کو دیکھا ہے کہ وہ سب مقتدی کو امام کے پیچھے قرآت کرنے سے منع کرتے تھے اور صاحب ہدایہ نے جلد ۱ ص ۱۰۱ میں تو اجماع صحابہ رض کا دعویٰ کیا ہے، حافظ ابن عبد البر رح اور شیخ الاسلام ابن تیمیہ رح وغیرہ کی ان عبارتوں کو پیش نظر رکھتے ہوئے جو باب اول میں نقل کی جا چکی ہیں (کہ آیت کا شانِ نزول بالاجماع خلف الامام کا مسئلہ ہے، اور جہری نمازوں میں امام کے پیچھے قرآت کرنا منکر شاذ اور مخالف اجماع ہے) (باقی اگلے صفحہ پر)

جا سکتے ہیں۔ مگر ہمارا مقصد ان کا استیعاب نہیں ہے بلکہ ہم نے عمداً صرف ان حضرات صحابہ کرام رضؓ کے جن پر زیادہ تر علم حدیث فقہ اور دین موقوف ہے۔ (مثلاً حضرات خلفائے راشدینؓ، حضرت ابن عمر رضؓ، حضرت جابر رضؓ، حضرت ابن مسعود رضؓ، حضرت ابن عباسؓ، حضرت زید رضؓ بن ثابت اور حضرت عائشہؓ وغیرہم) صحیح آثار صرف بطور نمونہ عرض کیے ہیں۔ اس سے معلوم ہو جاتا ہے کہ جمہور اہل اسلام کا دامن قرآن کریم صحیح اور مرفوع احادیث کے علاوہ حضرات صحابہ کرام رضؓ کی کیسی باعظمت جماعت سے وابستہ ہے اور آخر میں ہم صرف ایک ہی اثر نقل کر کے حضرات صحابہ کرام رضؓ کے ان پیش کردہ آثار پر اکتفا کرتے ہیں۔ وفیہا کفایۃ لمن لہ ھدایۃ۔

اثر حضرت سعد رضؓ (المتوفی ۵۵ھ) امام بخاریؒ لکھتے ہیں کہ داؤدؒ بن قیسؒ نے ابن بجادؒ سے روایت کی ہے جو حضرت سعدؓ بن ابی وقاص کی اولاد میں تھے اور وہ حضرت سعد رضؓ سے روایت کرتے ہیں۔ وہ فرماتے ہیں:

وددت ان الذی یقرأ خلف الامام فی فیہ جمرۃ (جزء القرأۃ ص۱ و موطا امام محمد ص۹۸)

کہ میں اس کو پسند کرتا ہوں کہ جو شخص امام کے پیچھے قرأت کرتا ہو، اس کے منہ میں آگ کی چنگاری[1] ڈال دوں۔

(بقیہ حاشیہ پچھلا صفحہ) صاحب ہدایہ کا یہ دعویٰ مبنی بر انصاف معلوم ہوتا ہے اور محض تعصب ملی ہی پر اس کو محمول کر لینا قرین قیاس نہیں ہے (واللہ تعالیٰ اعلم بالصواب)۔

[1] یہ سخت الفاظ صرف حضرت سعدؓ ہی سے منقول نہیں بلکہ دوسرے حضرات صحابہ کرامؓ وغیرہم سے بھی اسی طرح کے تہدیدی الفاظ مروی ہیں۔ حضرت عمرؓ فرماتے ہیں کہ جو شخص امام کے پیچھے قرأت کرتا ہے اس کے منہ میں پتھر ڈالنا چاہیے (موطا امام محمد ص۹۸ منتخب کنز ص۱۸۷ و الجوہر النقی ۲ ص۱۶۹، طحاوی ج۱ ص۱۲۹) اور ایک روایت میں نتن (بدبودار چیز) اور ایک میں رضف (گرم پتھر) کے الفاظ آئے ہیں (جزء القرأۃ ص۱ وغیرہ) حضرت انسؓ فرماتے ہیں کہ امام کے پیچھے قرأۃ کرنیوالے کے منہ میں آگ بھر دی جائے (زیلعی جلد ۲ ص۱۶) اور حضرت اسودؒ تابعی کہتے ہیں کہ جو شخص امام کے پیچھے قرأت کرتا ہے، اس کے منہ میں مٹی ڈالی جائے (الجوہر النقی جلد ۲ ص۱۶۹) اور حضرت علقمہؒ تابعی سے مٹی اور رضف دونوں الفاظ منقول ہیں (الجوہر النقی جلد ۲ ص۱۶۹) اور حضرت زیدؓ بن ثابت فرماتے ہیں کہ امام (باقی اگلے صفحہ پر)

اعتراض: امام بخاریؒ فرماتے ہیں کہ یہ روایت صحیح نہیں ہے: (۱) ابن بجادؒ مجہول ہے۔ (۲) آگ کی چنگاری اللہ تعالیٰ کا عذاب ہے اور انسانوں کو ایسی سزا دینے کی صحیح حدیث میں نہی آئی ہے (بخاری جلد ۱ ص ۴۲۳ وغیرہ)

(۳) حمادؒ کہتے ہیں کہ مجھے یہ پسند ہے کہ امام کے پیچھے قرأت کرنیوالے کا منہ شکر سے بھر دیا جاتے۔

جواب: حضرت امام بخاریؒ کا یہ اعتراض تمام شقوں کے ساتھ مخدوش ہے۔ ترتیب وار ہر ایک شق کا جواب ملاحظہ کریں: (۱) ابن بجادؒ کی جہالت کا دعویٰ کر کے اس اثر سے اغماض کرنا صحیح نہیں ہے کیونکہ امام حاکمؒ تحریر فرماتے ہیں:

وولد سعدؓ بن ابی وقاص الی ستۃ خمسین ومأتین فیھم فقہاء وائمہ وثقات وحفاظ۔ (معرفت علوم الحدیث ص ۹۹)	کہ حضرت سعدؓ بن ابی وقاص کی اولاد میں ۲۵۰ھ تک بڑے بڑے فقیہ، امام ثقہ اور حافظ پیدا ہوتے رہے ہیں۔

اور امام بخاریؒ کی وفات ۲۵۶ھ میں ہوئی ہے۔ اس لیے ابن بجادؒ (جو حضرت سعدؓ بن ابی وقاص کی اولاد میں تھے) کی جہالت کو بہانہ بنا کر اس اثر کو رد کرنا صحیح نہیں ہے کیونکہ امام حاکمؒ کی عبارت کے پیش نظر ابن بجادؒ ثقہ حافظ اور امام تھے۔ علامہ عینیؒ عبدالرزاقؒ بن ہمامؒ کے طریق سے روایت نقل کرتے ہیں:

عن داؤدؒ بن قیسؒ عن محمدؒ بن بجادؒ (بکسر الباء الموحدۃ وتخفیف الجیم) عن موسیٰؒ بن سعدؒ	کہ داؤدؒ بن قیسؒ محمدؒ بن بجادؒ سے روایت کرتے ہیں اور وہ موسیٰؒ بن سعدؒ سے روایت کرتے ہیں

(بقیہ حاشیہ پچھلا صفحہ) کے پیچھے قرأت کرنیوالے کی نماز ہی سرے سے نہیں ہوتی (موطا امام محمد ص ۱۰۱) اگرچہ ان میں بعض آثار کمزور ہیں، مگر کچھ صحیح بھی ہیں اور یہ سب مل ملا کر اس امر کی غمازی کرتے ہیں کہ ان کی بھی کچھ نہ کچھ اصل ضرور ہے، اگر نص قرآنی اور صحیح ومرفوع احادیث اور جمہور ائمہؒ کا اس بات پر اتفاق نہ ہوتا کہ امام کے پیچھے قرأت صحیح نہیں ہے تو یہ الفاظ یقیناً غلو اور زیادتی پر محمول ہو سکتے تھے مگر سابق ابواب کو پیش نظر رکھنے کے بعد قرآن کریم اور صحیح حدیث کی مخالفت کرنیوالے کے حق میں یہ الفاظ زیادہ سنگین نہیں ہیں۔ ہاں البتہ ان دلائل سے جو شخص ناواقف ہو اور یہ ناواقفی بھی محض دیانت پر مبنی ہو تو اس کے لیے مزید احتیاط کی ضرورت ہے خصوصاً وہ حضرات جو دنیا سے رخصت ہو چکے ہیں اور جن کی نگاہوں سے اس طرح یکجا جمع کئے ہوئے دلائل نہیں گذر سکے مگر یہ سب دلائل دیکھ کر ضد کرنیوالے کے لیے یہ الفاظ بالکل مناسب ہیں۔

بن ابی وقاص قال ذکر لی ان سعدؓ بن وقاص قال وددت ان الذی یقرأ خلف الامام فی فیہ حجر (عمدۃ القاری جلد ۳ ص ۶۷)

کہ انھوں نے حضرت سعدؓ سے روایت کی انھوں نے فرمایا کہ میں پسند کرتا ہوں کہ جو شخص امام کے پیچھے قرأۃ کرتا ہے اس کے منہ میں پتھر ڈالا جائے۔

اس سے معلوم ہوا کہ بعض ولد سعدؓ سے مراد موسیٰؒ بن سعدؓ ہیں۔ محدث مولانا محمد حسن صاحب فیض پوریؒ فرماتے ہیں کہ

رجال اسنادہ ثقات

اس روایت کی سند کے راوی ثقہ ہیں۔

(الدلیل المبین ص ۳۴۷)

لہٰذا مولف خیر الکلام کا عثمانؒ بن عبد الرحمٰن وقاصیؒ کے متروک اور جھوٹا ہونے سے اس مذکور سند کے ضعف پر استدلال کرنا (ملاحظہ ہو ص ۵۲۳) باطل ہے کیونکہ یہ مذکورہ روایت صحیح اور اس کی سند کے رواۃ ثقہ ہیں جن میں ابن بجادؒ بھی ہیں اور اغلب ہے کہ جزء القراءۃ میں ابن بجادؒ ہی کا ابن نجادؒ بنا ہوا ہے۔ حضرت شاہ ولی اللہ صاحبؒ فرماتے ہیں کہ جس مسئلہ میں جمہور صحابہ کرامؓ کے دو یا تین قول ہوں تو ان سب پر اہلِ علم کے کسی نہ کسی طائفہ نے عمل کیا ہے۔

وآیۃ ذلک ان تظہر فی مثل الموطاء وجامع عبد الرزاقؒ روایا تھوا ھ (حجۃ اللہ جلد ۱ ص ۱۴۱ طبع مصر)

اور اس کی علامت یہ ہے کہ ان کی روایتیں، موطا اور جامع عبد الرزاقؒ میں بیان ہوتی ہوں۔

اس سے معلوم ہوا کہ وہ اقوال صحابہ کرامؓ جو موطاؒ اور جامع عبد الرزاق میں ہوں وہ مستند اور قابل اعتبار ہیں۔

(۲) قلعوں، سواری کے جانوروں اور انسانوں کو جلانے کے بارے حضرات صحابہ کرامؓ میں خلصا اختلاف ہے ایک گروہ جواز کا اور دوسرا عدمِ جواز کا قائل ہے۔ (فتح الباری ج ۶ ص ۱۵۱) حافظ ابن حجرؒ نے جلانے کی حدیثوں کے منسوخ ہونے کا دعویٰ بھی کیا ہے۔ (فتح الباری ج ۲ ص ۱۲۶ و ج ۶ ص ۱۵۱) لیکن یہ بھی لکھا ہے کہ حضرت ابوبکرؓ نے حضراتِ صحابہ کرامؓ کی موجودگی میں باغیوں کو آگ میں جلایا تھا اور حضرت خالدؓ بن الولید نے بھی مرتدین

کو جلایا تھا اور آگے لکھا: واکثر علماء المدینۃ یجیزون الخ (فتح الباری ج۶ ص۱۵۱) اس سے معلوم ہوا کہ نسخ کا مسئلہ اتفاقی نہیں اغلب ہے کہ حضرت سعدؓ بھی جواز کے قائل تھے ان حضرات کا استدلال ان احادیث سے ہے جن میں وددت سے بڑھ کر لقد ھممت (کہ میں البتہ قصد اور ارادہ کر چکا ہوں) کے الفاظ آئے ہیں مثلاً آنحضرت صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے فرمایا کہ میں پختہ ارادہ کر چکا ہوں کہ جو لوگ جماعت کے ساتھ نماز نہیں پڑھتے۔ ان کو گھروں کے اندر بند کر کے آگ میں جلا دوں (بخاری ج۱ ص۸۹ و مسلم ج۱ ص۲۳۲) نیز آپ نے فرمایا کہ جو لوگ جمعہ کی نماز میں شریک نہیں ہوتے ہیں ان کو گھروں میں بند کر کے آگ میں جلانے کا ارادہ کر چکا ہوں۔ (مسلم ج۱ ص۲۳۲ و مشکوٰۃ ص۱۲۱) اور آپ نے فرمایا کہ اگر گھروں میں عورتیں اور بچے نہ ہوتے، تو میں اپنا ارادہ پورا کر چکتا (مسند احمد ص والبوداؤد طیالسی ص۳۰۵) حضرت سعدؓ نے تو خلافِ شرع کام کرنے والوں کے لیے صرف آگ کے عذاب کی آرزو کی ہے لیکن جناب رحمۃ للعٰلمین صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم تو مجرموں کو آگ میں جلانے کا قصد تک فرما چکے تھے اور اگر عورتوں اور بچوں کا سوال سامنے نہ آتا تو آپ یقیناً اپنا ارادہ پورا کر گزرتے کیا یہ روایتیں امام بخاریؒ کے نزدیک صحیح نہیں ہیں؟ اور کیا یہ حدیثیں امام بخاری رحمہ اللہ تعالیٰ کے اس قاعدہ کے لحاظ سے لا تعذبوا بعذاب اللہ کی حدیث کے خلاف ہیں؟ اگر نہیں تو امید قوی ہے کہ حضرت سعدؓ کا اثر بھی مخالف نہ ہوگا، بلکہ اس کو بطریقِ اولیٰ مخالف نہ ہونا چاہیے۔

مع :— "مانتے جس کو نہ تھے لیجیے پہنچے وہاں"

(۳) امام بخاریؒ نے حمادؒ کے قول کی سند بیان نہیں کی تو ایسی بے سند بات کا کیا اعتبار ہے؟ علاوہ ازیں اگر حمادؒ کے قول کی سند بھی مل جائے، تب بھی قرآن کریم صحیح احادیث اور آثار صحابہؓ کے مقابلہ میں حمادؒ کے قول کی کیا وقعت ہے؟ خود امام بخاریؒ لکھتے ہیں کہ جب ایک چیز آں حضرت صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم اور آپ کے حضرات صحابہ کرامؓ سے ثابت ہو جائے تو اسود وغیرہ کی بات کیسے حجت ہو سکتی ہے؟ (جزء القرأۃ، ص۱۱) سچ ہے نقار خانہ میں طوطی کی کون سنتا ہے؟

مؤلف خیر الکلام لکھتے ہیں کہ جو چیز منع ہوتی ہے اس کی تمنا بھی منع ہوتی ہے آپ کی تمنا نہی سے پہلے کی ہے اس کے بعد آپ نے منع کیا قرآن کریم میں ہے: لَا تَتَمَنَّوْا مَا فَضَّلَ اللّٰهُ ... الخ ص۵۲۴

الجواب: بے شک جو چیز منع ہوتی ہے اس کی تمنا بھی منع ہوتی ہے لیکن

جن حضرات کے نزدیک آگ میں جلانا جائز ہے ان کے نزدیک اس کی تمنا بھی جائز ہے۔ باقی قرآنِ کریم میں تمنائے عذاب کی نہی نہیں ہے اس میں حسد سے منع کیا گیا ہے وآں چیزے دیگر است۔

لطیفہ: اگر حضرت حمادؒ کے اس قول کو صحیح بھی تسلیم کر لیا جائے کہ امام کے پیچھے قرأت کرنے والے کا ——— (ملئی فوہ سکرا) منہ شکر سے بھر دیا جاتے تو بھی اس سے حضرت امام بخاریؒ کو کوئی فائدہ نہیں ہوگا۔ اس لیے کہ اگر عین نماز کی حالت میں قاری کا منہ شکر سے بھرنا مراد ہے تو بیچارہ قرأت تو کیا کرے گا۔ جہر کے ساتھ آمین بھی نہیں کہہ سکیگا یک نہ شد دو شد، بلکہ وہ تو آہستہ آمین کہنے سے بھی رہا اور شکر بھی حضرت حمادؒ نے تھوڑی تجویز نہیں کی بلکہ اچھی خاصی تجویز کی ہے جس سے (ملئی فوہ سکرا) اس کا منہ خوب بھر سکے، کیا بعید ہے کہ حمادؒ نے امام کے پیچھے قرأت کی بندش کا یہ طریقہ ایجاد کیا ہو مگر امام بخاریؒ اس کی سطحی مٹھاس کو دیکھ کر ان کو اپنا ہمنوا سمجھ بیٹھے ہوں، مشہور ہے کہ گڑ سے مخالف کو جلدی قابو کیا جا سکتا ہے اور اگر امام کے پیچھے قرأت کرنے والے کا خارج از نماز منہ شکر سے بھرنا مراد ہے تو اس نازک دور میں دوسری اشیاء خوردنی کی طرح شکر کے لیے بھی لوگ سرگرداں پھر رہے ہیں۔ فریق ثانی حضرت حمادؒ کے اس قول کا اعلان کر دے، پھر قدرت خدا کا تماشا دیکھے کہ جماعت کی تعداد کیسے بڑھتی اور اس کو کیسے ترقی حاصل ہوتی ہے؟ بلکہ ہمیں تو یقین ہے کہ عوام تو کیا اچھے خاصے محدث بھی حضرت

ابو سعید الخدریؓ کی مرفوع حدیث ان احق ما اخذ تم علیہ اجرا کتاب اللہ (او کما قال) سے اس شکر خوری پر استدلال کرتے نظر آئیں گے اور حمادؒ کے زمانہ کی شکر سے اس ترقی یافتہ دور کی شکر بدرجہا زیادہ سفید اور عمدہ ہے اور بہت ممکن ہے کہ جو لوگ فریق ثانی سے فرعی مسائل میں قدرے دور ہیں (مثلاً پٹھان وغیرہ) اور چائے کے اشد عادی ہیں اور کھانڈ اور شکر نہ ملنے کی وجہ سے پریشان ہیں۔ اس شکری اعلان کے بعد فریق ثانی کے حلقہ بگوش ہو جائیں اور بیماروں کو تو یونانی قدموں پر قدحے پینے کے لیے مشکر مل جائیگی۔ غرضیکہ اس اعلان کے بعد سورۂ فاتحہ کی برکت سے ہر کس و ناکس کو اس کا سورۂ الشفاء اور سورۂ

السوال وغیرہ ہونا آسانی سے سمجھ آسکتا ہے اور اس کی برکت سے ہمیں توفیق حاصل ہے ہی، فریق ثانی کو بھی بڑی فتح اور کامرانی حاصل ہوگی۔ الغرض امام بخاریؒ نے امام کے پیچھے قرأت کرنے والے کے لیے شکر تجویز فرمائی اور عین نماز کی حالت میں جیسا کہ ان ظاہری الفاظ سے متبادر ہوتا ہے مگر یہ خیال نہ کیا کہ گھر کس کا پورا ہو رہا ہے؟ سچ ہے —

ع:— میری تعمیر میں مضمر ہے اک صورت خرابی کی

حضرات! حضرات صحابہ کرامؓ کے ان مختصر سے آثار کے بعد مشتے نمونہ از خروارے کے طور پر بعض حضرات تابعینؒ و اتباع تابعینؒ وغیرہم کے کچھ آثار آپ کے سامنے عرض کیے جاتے ہیں تاکہ آپ کو حضرات تابعینؒ وغیرہم کا نظریہ بھی بسلسلۂ قرأت خلف الامام معلوم ہو سکے اور اختصاراً نقل سند کے بعد ہم رواۃ کی توثیق بھی عرض کریں گے نیز اور فریق ثانی کی طرف سے پیش کردہ اعتراضات کے جوابات بھی عرض کر دیے جائیں گے۔

اثر علقمہؒ[۱] بن قیسؒ (المتوفی سنہ ۶۸ھ) امام محمدؒ فرماتے ہیں کہ ہم سے امام ابو حنیفہؒ نے بیان کیا وہ فرماتے ہیں کہ ہم سے حمادؒ[۲] نے بیان کیا۔ وہ ابراہیم نخعیؒ[۳] سے روایت کرتے ہیں وہ فرماتے ہیں کہ

---

۱ علامہ ذہبیؒ ان کو امام بارع لکھتے ہیں (تذکرہ جلد ۱ ص ۴۱) امام نوویؒ ان کو صاحب کمال فقیہ لکھتے ہیں (تہذیب الاسماء جلد ۱ ص ۳۴۲) علامہ ابن سعدؒ ان کو کثیر الحدیث لکھتے ہیں (طبقات ابن سعد جلد ۶ ص ۹۲) ابو ظبیانؒ کا بیان ہے کہ میں نے متعدد حضرات صحابہ کرامؓ کو علقمہؒ سے مسائل پوچھتے اور استفسار کرتے دیکھا ہے (تہذیب التہذیب جلد ۷ ص ۲۷۷)

۲ حمادؒ بن ابی سلیمانؒ، امام مسلمؒ اور دیگر محدثینؒ نے ان سے احتجاج کیا ہے (الجواہر المضیہ جلد ۱ ص ۲۲۶) امام احمدؒ ان کی تعریف کرتے تھے اور ان کو قابل اعتبار سمجھتے تھے۔ امام معمرؒ کا بیان ہے کہ میں نے امام زہریؒ، حمادؒ اور قتادہؒ سے بڑھ کر دین کی سمجھ رکھنے والا کوئی نہیں دیکھا۔ امام ابن معینؒ، عجلیؒ اور نسائیؒ ان کو ثقہ کہتے ہیں، ابو حاتمؒ ان کو صدوق اور مستقیم کہتے ہیں۔ ابن عدیؒ لا بأس بہ کہتے ہوئے ان کی توثیق کرتے ہیں۔ (تہذیب التہذیب جلد ۳ ص ۱۶ و ۱۷)

۳ ان کا ترجمہ مقدمہ میں نقل کیا جا چکا ہے۔

ما قرأ علقمة بن قيس قط فيما يجهر فيه ولا فيما لا يجهر فيه ولا الركعتين الاخيرتين ام القرآن ولا غيرها خلف الامام۔

(بحوالہ تعلیق الحسن جلد ۱ ص ۹۰)

علقمہؒ بن قیسؒ نے امام کے پیچھے کبھی کسی نماز میں قرأۃ نہیں کی نہ جہری نمازوں میں اور نہ سری میں (نہ پہلی رکعتوں میں اور نہ پچھلی رکعتوں میں، نہ سورۂ فاتحہ اور نہ کوئی سورت امام کے پیچھے وہ کچھ بھی نہیں پڑھتے تھے۔

اور یہ اثر اپنے مفہوم کے اعتبار سے بالکل واضح ہے کہ حضرت علقمہؒ امام کے پیچھے کسی نماز میں کوئی قرأۃ نہیں کیا کرتے تھے۔

اعتراض: مُبارکپوری صاحبؒ لکھتے ہیں کہ اوّلاً ــ اگرچہ حمادؒ ثقہ تھے مگر مدلس اور مختلط تھے۔ وثانیاً ــ ابراہیم نخعیؒ کی علقمہؒ سے ملاقات ثابت نہیں ہے۔ لہٰذا یہ روایت صحیح نہیں ہے۔ (ابکار المنن ص ۱۶۹)

جواب: جب حمادؒ ثقہ ہیں تو اس روایت میں اختلاط سے کوئی فرق نہیں پڑیگا کیونکہ محدثینؒ نے اس امر کی تصریح کی ہے کہ انکو اختلاط کا عارضہ آخر میں لاحق ہوا تھا اور ابراہیم نخعیؒ کی روایتوں میں وہ خطا نہیں کرتے تھے (تہذیب التہذیب ج ۳ ص ۱۶) خود مبارکپوری صاحبؒ لکھتے ہیں کہ ابراہیم نخعیؒ اور سفیانؒ اور ان کے طبقہ کے مدلسین کی تدلیس مضر نہیں ہے۔ علامہ ذہبیؒ اور حافظ ابن حجرؒ لکھتے ہیں کہ ابراہیم نخعیؒ نے علقمہ سے سماعت کی ہے۔ (تذکرہ جلد ۱ ص ۶۹ و تہذیب التہذیب جلد ۱ ص ۱۷۷) اس لیے مبارکپوری صاحبؒ کا یہ دعوٰی کرنا کہ ابراہیم نخعیؒ نے علقمہؒ سے ملاقات نہیں کی مردود ہے۔ علاوہ بریں اگر یہ بھی تسلیم کر لیا جائے کہ ابراہیم نخعیؒ کی ملاقات علقمہؒ سے نہیں ہوئی تو یہ روایت مرسل ہوگی۔ اور امام دارقطنیؒ، امام طحاویؒ، حافظ ابن قیمؒ اور حافظ ابن حجرؒ وغیرہ اس کی تصریح کرتے ہیں کہ ابراہیم نخعیؒ کی مرسل روایتیں بھی حجت اور صحیح ہیں۔ (دارقطنی جلد ۲ ص ۳۶۱، طحاوی جلد ۱ ص ۱۳۳، زاد المعاد جلد ۴ ص ۲۵۴ و درایہ ص ۱۱۶) اور امام بیہقیؒ تحریر فرماتے ہیں کہ مرسلات ابراہیم صحیحۃ الاحدیث تاجر البحرینؒ[1] ۔ (سنن الکبرٰی جلد ۱ ص ۱۴۸)

---

[1] یاد رہے کہ یہ روایت صرف مرسل ہی نہیں بلکہ مسند اور مرفوع بھی ہے۔ چنانچہ حضرت عبداللہؓ بن مسعود فرماتے ہیں کہ آنحضرت صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کے پاس ایک شخص آیا اس نے کہا کہ حضرت! میں بحرین کے علاقہ میں تجارت کے لیے جانا چاہتا ہوں۔ آپ نے فرمایا کہ دو رکعت نماز پڑھو (رواہ الطبرانی فی الکبیر ورجالہ موثقون مجمع الزوائد جلد ۲ ص ۲۸۳)

کہ تاجر بحرین کے مضمون والی روایت کے علاوہ ابراہیمؒ کی تمام مرسل روایتیں صحیح ہیں، بہر حال یہ روایت فن روایت اور محدثین کے اصول کے ماتحت بالکل صحیح اور حجت ہے۔

اثر عمروؒ بن میمونؒ (المتوفی سنہ ۷۴ھ) وغیرہ ابو بکرؒ بن ابی شیبہؒ فرماتے ہیں ہم سے یزیدؒ بن ہارونؒ نے بیان کیا، وہ اشعثؒ سے اور وہ مالکؒ بن عمارہؒ سے روایت کرتے ہیں، وہ فرماتے ہیں کہ میں نے حضرت عبداللہؓ بن مسعود کے اصحاب اور تلامذہ سے جن میں خصوصیت سے عمروؒ بن میمونؒ قابل ذکر ہیں۔ امام کے پیچھے قرأۃ کرنے سے متعلق سوال کیا۔ کلھم یقولون لا یقرأ خلف الامام (تعلیق الحسن جلد ۱ ص ۹) تو ان سب نے جواب یہ دیا کہ امام کے پیچھے قرأت نہیں کرنی چاہیئے، محقق نیمویؒ نے فرمایا تھا کہ مجھے مالکؒ بن عمارہؒ کا ترجمہ نہیں مل سکا، مبارکپوری صاحبؒ لکھتے ہیں کہ تو اس اثر کا پیش کرنا بے سود ہے۔ (ابکار المنن ص ۱۶۵) مگر ہم ثابت کر چکے ہیں کہ یہ مالکؒ بن عامرؒ ہیں جو ثقہ اور ثبت تھے اور یہ اثر بھی صحیح ہے، حضرت علیؓ جب کوفہ تشریف لے گئے تو آپ نے ارشاد فرمایا کہ

---

۱ علامہ ذہبیؒ ان کو الحافظ اور الامام لکھتے ہیں (تذکرہ جلد ۱ ص ۹۱)

۲ ان کا ترجمہ گذر چکا ہے۔ ۳ وہ ثقہ متقن اور عابد تھے (تقریب ص ۴۰۰)

۴ اشعثؒ بن ابی الشعثاءؒ، امام ابن معینؒ، ابو حاتمؒ، نسائیؒ، ابو داؤدؒ اور بزارؒ سب ان کو ثقہ کہتے ہیں، عجلیؒ ان کو شیوخ کوفہ اور ثقات میں لکھتے ہیں اور ابن حبانؒ اور ابن شاہینؒ ان کو ثقات میں لکھتے ہیں۔ تہذیب التہذیب جلد ۱ ص ۳۵۵) حافظ ابن حجرؒ ان کو ثقہ کہتے ہیں (تقریب ص ۴۱)

۵ یہ مالکؒ بن عمارہؒ نہیں بلکہ مالکؒ بن عامرؒ ہیں جو اشعثؒ سے روایت کرتے ہیں (دیکھئے تہذیب التہذیب جلد ۱ ص ۳۵۵ وغیرہ) علامہ ذہبیؒ ان کو صاحب ابن مسعودؓ قدیم الموت اور ثقہ لکھتے ہیں، (میزان جلد ۱ ص ۳) امام ابن معینؒ، ابو داؤدؒ اور ابن سعدؒ ان کو ثقہ کہتے ہیں، ابن حبانؒ ثقات میں لکھتے ہیں (تہذیب التہذیب جلد ۱۲ ص ۱۶۹) حافظ ابن حجرؒ ان کو ثقہ لکھتے ہیں (تقریب ص ۴۲۵) ابو عطیہؒ ان کی کنیت تھی بخاری ۲ ص ۴۲۵ اور ترمذی جلد ۱ ص ۸۸ میں ان کا ذکر ہے۔

۶ نواب صاحبؒ نے اصحاب علیؓ اور عبداللہؓ میں سے اٹھائیس کے نام بتلائے ہیں جو جلیل القدر محدث اور امام تھے۔ (الجنۃ ص ۶)

اصحاب عبد اللہؓ سرج ھذہ القریۃ (طبقات ابن سعد جلد ۶ ص۴) عبد اللہؓ بن مسعودؓ کے اصحاب اس شہر کے روشن چراغ ہیں اور آپ ملاحظہ کر چکے ہیں کہ اصحاب عبد اللہؓ سب کے سب امام کے پیچھے قرأت کے قائل نہ تھے اور یہی فتویٰ دیا کرتے تھے۔

اثر اسودؒ[1] بن یزیدؒ (المتوفی ۷۵ھ) ابوبکرؒ بن ابی شیبہؒ فرماتے ہیں ہم سے ابن علیہؒ[2] نے بیان کیا۔ وہ ایوبؒ[3] اور ابن ابی عروبہؒ سے روایت کرتے ہیں، وہ دونوں ابومعشرؒ[4] سے وہ ابراہیم نخعیؒ سے اور وہ اسودؒ بن یزیدؒ سے۔

قال لان اعض جمرة احب الیّ من ان اقرأ خلف الامام اعلم انه یقرأ۔

(آثار السنن جلد ۱ ص۹)

انھوں نے فرمایا کہ میں اس بات کو زیادہ پسند کرتا ہوں کہ اپنے منہ میں آگ کی چنگاری ڈال لوں بجائے اس کے کہ میں امام کے پیچھے قرأت کروں جبکہ مجھے علم ہے کہ وہ پڑھتا ہے۔

یہ روایت بھی اپنے مدلول میں واضح ہے۔ مبارکپوری صاحبؒ نے ابراہیم نخعیؒ کی تدلیس کا بہانہ کیا ہے۔ (ابکار وغیرہ) مگر بے سود ہے کیونکہ یہ بات ثابت کی جا چکی ہے کہ

---

[1] علامہ ذہبیؒ ان کو امام فقیہ، زاہد، عابد اور کوفہ کا امام لکھتے ہیں (تذکرہ جلد ۱ ص۴۳) امام نوویؒ لکھتے ہیں کہ ان کی توثیق اور جلالت شان پر سب کا اتفاق ہے (تہذیب الاسماء جلد ۱ ص۱۲۲) محدث ابن حبانؒ ان کو فقیہ کہتے ہیں (تہذیب التہذیب جلد ۱ ص۳۴۲) حافظ ابن کثیرؒ ان کو من کبار التابعین اور من اعیان اصحاب ابن مسعودؓ اور من کبار اھل الکوفۃ لکھتے ہیں (البدایہ والنہایہ جلد ۹ ص۱۲)

[2] ان کا نام اسمٰعیل بن ابراہیمؒ بن مقسمؒ تھا، جو ثقہ اور حافظ تھے۔

[3] ایوبؒ کا ترجمہ باب اول میں حضرت ابن مسعودؓ کے اثر کے تحت اور ابن ابی عروبہؒ کا باب دوم حدیث ۱ کے ذیل میں گذر چکا ہے۔

[4] ابومعشرؒ کا نام زیادؒ بن کلیبؒ تھا۔ محدث عجلیؒ، نسائیؒ، ابن مدینیؒ اور ابوجعفر بستیؒ سب ان کو ثقہ کہتے ہیں، ابن حبانؒ ان کو حفاظ متقنین میں لکھتے ہیں (تہذیب التہذیب جلد ۳ ص ۳۸۳)

ابراہیم نخعیؒ اس طبقہ کے مدلس تھے جن کی تدلیس مضر نہیں ہے اور ان کی جملہ روایتیں (علاوہ ایک روایت تاجر بحرین کے) حجت ہیں، چنانچہ علامہ ذہبیؒ لکھتے ہیں: قلت استقر الامر علی ان ابراہیم حجۃ (میزان الاعتدال جلد ۱ ص۳۵) میں کہتا ہوں یہ طے شدہ بات ہے کہ ابراہیم حجت تھے۔

دوسری سند: ابو بکرؒ بن ابی شیبہؒ، ہشیمؒ[1] سے روایت کرتے ہیں، وہ فرماتے ہیں کہ ہم سے اسمٰعیلؒ[2] بن ابی خالدؒ نے بیان کیا۔ وہ وبرہؒ[3] سے روایت کرتے ہیں اور وہ حضرت اسودؒ بن یزیدؒ سے وہ فرماتے ہیں قال وددت ان الذی یقرأ خلف الامام ملیٔ فاہ ترابا (تعلیق الحسن جلد ۱ ص ۹۰) کہ میں اس کو پسند کرتا ہوں کہ امام کے پیچھے قرآت کرنے والے کا منہ مٹی سے بھر دیا جائے۔

تیسری سند: عبدالرزاقؒ[4] بن ہمامؒ اپنے مصنف میں سفیان ثوریؒ سے روایت کرتے ہیں اور وہ امام اعمشؒ سے اور وہ ابراہیم نخعیؒ سے اور وہ اسودؒ بن یزیدؒ سے وہ فرماتے ہیں کہ

قال وددت ان الذی یقرأ خلف الامام ملیٔ فوہ ترابا (الجوہر النقی جلد ۲ ص۱۶۹)	میں اس کو پسند کرتا ہوں کہ جو شخص امام کے پیچھے قراۃ کرتا ہے اس کا منہ مٹی سے بھر دیا جائے۔

---

[1] ہشیم بن بشیرؒ ثقہ اور ثبت لیکن کثیر التدلیس تھے (تقریب ص۳۸۱) مگر اس روایت میں وہ تحدیث کرتے ہیں۔

[2] امام ابن مہدیؒ، ابن معینؒ، نسائیؒ اور عجلیؒ ان کو ثقہ کہتے ہیں، ابن عمار موصلیؒ ان کو حجت اور یعقوبؒ بن سفیانؒ ان کو ثقہ اور ثبت کہتے ہیں۔ ابو حاتمؒ، یعقوبؒ بن شیبہؒ، ابن حبانؒ اور ابن عیینہؒ ان کو ثقہ، ثبت اور حافظ کہتے ہیں۔ (تہذیب التہذیب جلد ۱ ص۲۹۱)

[3] وبرہ بن عبدالرحمٰنؒ امام ابو زرعہؒ، ابن معینؒ اور عجلیؒ ان کو ثقہ کہتے ہیں۔ ابن حبانؒ ان کو ثقات میں لکھتے ہیں (ایضاً جلد ۱۱ ص۱۱۱)

[4] عبدالرزاقؒ بن ہمامؒ کا ترجمہ اثر حضرت علیؓ میں اور سفیان ثوریؒ کا مقدمہ میں نقل کیا جا چکا ہے۔ بقیہ رواۃ کا ترجمہ بھی گذر چکا ہے۔ امام اعمشؒ ثقہ اور حافظ تھے (تقریب ص۱۶۰) البتہ مدلس تھے، لیکن حضرت قتادہؒ کی بحث ملاحظہ کر لیجئے کہ ان کی تدلیس بھی مضر نہیں ہے۔

غالباً حضرت اسودؒ کے یہی وہ الفاظ ہیں، جن پر حضرت امام بخاریؒ بہت ناراض ہوئے ہیں (دیکھئے جزء القراۃ ص۱۱)

اثر سوید رضؓ بن غفلہ ۱؎ المتوفی ۸۰ھ) ابوبکرؒ بن ابی شیبہؒ فرماتے ہیں کہ ہم سے فضلؒ بن دکینؒ نے بیان کیا۔ وہ زہیرؒ سے روایت کرتے ہیں، وہ ولیدؒ بن قیسؒ سے روایت کرتے ہیں، وہ فرماتے ہیں کہ میں نے حضرت سویدؓ بن غفلہ سے سوال کیا۔ اقرأ خلف الامام فی الظهر والعصر قال لا (تعلیق الحسن جلد ۱ ص۹) کیا میں ظہر اور عصر کی نماز میں امام کے پیچھے قرأت کر سکتا ہوں؟ فرمایا نہیں، اس اثر سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ سائل کو دوسری نمازوں کے بارے میں تو یہ علم تھا کہ ان میں امام کے پیچھے قرأت صحیح نہیں ہے۔ لیکن اس کو صرف ظہر اور عصر کی نماز میں قرأۃ خلف الامام کے بارے میں تردد تھا۔ سو حضرت سویدؓ نے اس کا یہ مغالطہ بھی نکال دیا ہے۔

اعتراض: مبارکپوری صاحب لکھتے ہیں کہ سند میں ولیدؒ بن قیس تجیبی ہے۔ اور حافظ ابن حجرؒ انکو مقبول لکھتے ہیں (تقریب ص۳۸۷) اور علامہ نیمویؒ نے حبل المتین میں لکھا ہے کہ جس راوی کے متعلق حافظ ابن حجرؒ مقبول کہتے ہیں وہ کمزور ہوتا ہے۔ لہٰذا یہ اثر کمزور ہے (ابکار المنن ص۱۹۶) جواب: حبل المتین ہمارے پیش نظر نہیں ہے۔ نہ معلوم محقق

۱؎ علامہ ذہبیؒ لکھتے ہیں کہ ثقہ بلند مرتبہ عابد، زاہد، قانع بالیسیر اور کبیر الشان تھے (تذکرہ جلد ۱ ص۵) امام ابن معینؒ اور عجلیؒ ان کو ثقہ کہتے ہیں، محدث ابن قانعؒ تو ان کو صحابہؓ میں شمار کرتے ہیں (تہذیب التہذیب ۴ ص۲۷۸) حافظ ابن کثیرؒ نقل کرتے ہیں کہ حضرت سویدؓ بن غفلہ نے فرمایا کہ میں آں حضرت صلی اللہ تعالیٰ علیہ وآلہ وسلم کا ہم عمر ہوں کیونکہ میری ولادت بھی عام فیل میں ہوئی ہے اور امام بیہقیؒ ان سے یہ نقل کرتے ہیں کہ میں آں حضرت صلی اللہ تعالیٰ علیہ وآلہ وسلم سے صرف دو سال عمر میں چھوٹا ہوں (البدایہ والنہایہ جلد ۲ ص۲۹۲)

۲؎ ابوبکر بن ابی شیبہؒ اور فضلؒ بن دکینؒ کا ترجمہ گذر چکا ہے۔

۳؎ زہیرؒ بن معاویہؒ ثقہ اور ثبت تھے (تقریب ص۱۱۱)

۴؎ ولیدؒ بن قیسؒ سکونی۔ امام ابن معینؒ ان کو ثقہ کہتے ہیں، امام نسائیؒ ان کی تعریف کرتے ہیں۔ ابن حبانؒ ان کو ثقات میں لکھتے ہیں (تہذیب التہذیب جلد ۱۱ ص۱۴۱) حافظ ابن حجرؒ لکھتے ہیں کہ وہ ثقہ تھے (تقریب ص۳۸۷)

نیموی[1] ہی یہ کس راوی اور کس موقع اور محل پر لکھا ہے ہو سکتا ہے کہ انھوں نے اس راوی کے متعلق لکھا ہو، جس کو دیگر محدثینؒ کمزور بتاتے ہوں اور صرف حافظ ابن حجرؒ ہی اس کو مقبول کہتے ہوں اور ولیدؒ بن قیسؒ کو تو دیگر محدثینؒ بھی ثقہ کہتے ہیں۔ علاوہ بریں مبارکپوری صاحبؒ کو یہ مغالطہ ہوا ہے۔ یہ راوی ولیدؒ بن قیس تجیبیؒ نہیں جن کو حافظ ابن حجرؒ مقبول لکھتے ہیں (اور محدث عجلیؒ تابعی اور ثقہ لکھتے ہیں۔ اور ابن حبانؒ ان کو ثقات میں لکھتے ہیں تہذیب التہذیب جلد ۱۱ ص ۱۴۶) بلکہ یہ ولیدؒ بن قیس سکونیؒ ہیں جو زہیرؒ سے روایت کرتے ہیں (دیکھئے تہذیب التہذیب ۱۱ ص ۱۴۶)

ع: "میں الزام ان کو دیتا تھا قصور اپنا نکل آیا"

اثر نافعؒ[2] بن جبیرؒ (المتوفی ۹۳ھ) امام مالکؒ یزیدؒ[3] بن رومانؒ سے روایت کرتے ہیں اور وہ نافعؒ بن جبیرؒ سے کان یقرأ خلف الامام فیما لا یجھر فیہ الامام (موطا امام مالک ص ۲۹)

---

[1] محقق نیمویؒ کا نام ظہیر احسن ابو الخیر کنیت اور شوق تخلص تھا۔ آپ مولانا علامہ محمد عبد الحیؒ لکھنوی (المتوفی ۱۳۰۴ھ) کے شاگرد رشید تھے، بڑے پایہ کے محدث اور فقیہ تھے، فن اسماء الرجال پر گہری نظر رکھتے تھے، اور خداداد ذہانت اور فطانت میں قاضی شوکانیؒ سے بھی انکا پایہ بہت بلند تھا۔ مگر افسوس کہ ناپائیدار زندگی نے ساتھ نہ دیا اور ان کی قابلیت کے پورے جوہر ابھی اچھی طرح اجاگر نہ ہوئے تھے کہ ۱۷ رمضان ۱۳۲۲ھ میں اللہ تعالیٰ کو پیارے ہو گئے۔ آپ کی مشہور کتاب آثار السنن (مع حاشیہ تعلیق الحسن) کو علماء بڑی قدر کی نگاہ سے دیکھتے ہیں۔ اور فریق ثانی کی نگاہوں میں وہ کانٹے کی طرح کھٹکتی ہے، مولانا مبارکپوری صاحبؒ نے ابکار المنن لکھ کر اپنی جماعت کو یہ باور کرانے کی کوشش کی ہے کہ یہ آثار السنن کا جواب ہے، مگر وہ بری طرح اس میں ناکام رہے ہیں، فریق ثانی کے چیدہ چیدہ علماء کو بلکہ خود مبارکپوری صاحبؒ کو بھی اس کا گہرا احساس تھا اور ہر سلیم الطبع آدمی اس ٹھوس نظریہ کا یقیناً احساس کر سکتا ہے ولیس الخبر کالمعاینۃ۔

[2] امام نوویؒ لکھتے ہیں کہ نافعؒ بن جبیرؒ امام اور فاضل تھے۔ ان کی توثیق اور جلالت شان پر سب کا اتفاق ہے (تہذیب الاسماء جلد ۱ ص ۱۲۲) ابن خراشؒ کہتے ہیں کہ وہ ثقہ، مشہور اور امام تھے۔ وہ مدینہ طیبہ کے صاحب افتاء علماء میں تھے اور ان کے فتاوی معتبر سمجھے جاتے تھے (تہذیب التہذیب جلد ۱۰ ص ۴۰۵) حافظ ابن کثیرؒ ان کو من الثقات النبلاء اور من ائمۃ الاجلاء لکھتے ہیں (البدایہ والنہایہ جلد ۹ ص ۴۰۵)

[3] حضرت امام مالکؒ کا ترجمہ مقدمہ میں گذر چکا ہے، (باقی حاشیہ اگلے صفحہ پر دیکھئے)

کہ وہ امام کے پیچھے صرف ان نمازوں میں قرآت کرتے تھے جن میں امام جہر سے قرآت نہیں کرتا تھا۔ اگر ہر نماز اور ہر رکعت میں امام کے پیچھے قرآت سورۂ فاتحہ ضروری ہوتی۔ تو حضرت نافعؒ بن جبیرؒ سب نمازوں میں امام کے پیچھے قرآۃ کیا کرتے، مگر وہ صرف سرّی نمازوں میں قرآت کرتے تھے۔ اور کیا بعید ہے کہ امام مالکؒ وغیرہ کی طرح وہ بھی استحباب کے قائل ہوں اگر وہ وجوب کے بھی قائل ہوں۔ تب بھی فریق ثانی کی جہری نمازوں میں بطلان نماز کی رٹ تو غلط ہو جائیگی۔ وعلیٰ ہذا القیاس ہم جتنے آثار نقل کریں گے، جن میں صرف جہری نمازوں میں امام کے پیچھے ترک قرآت کا ثبوت ہوگا۔ ان سے ہمارا مدعا بھی محض یہ ہے کہ فریق ثانی کا عمومی نظریہ صحیح نہیں ہے اور بس گو ان میں سرّی نمازوں کے اندر قرآت کا ثبوت بھی ہوگا، استحبابی طور پر ہو یا وجوبی طور پر بہر حال ہمارا مطلب اور مدعا واضح ہے۔

اثر سعیدؒ بن المسیبؒ (المتوفی ۹۴ھ) ابوبکرؒ بن ابی شیبہؒ فرماتے ہیں کہ ہم سے وکیعؒ نے بیان کیا۔ وہ ہشامؒ دستوائیؒ[1] سے اور وہ حضرت سعیدؒ بن المسیبؒ سے روایت کرتے ہیں۔ انھوں نے فرمایا: انصت للامام (آثار السنن جلد ۱ ص۹) یعنی امام کے پیچھے بالکل خاموشی اختیار کرو، اور قرآت نہ کیا کرو۔ حضرت سعیدؒ بن المسیبؒ کا ایک اثر باب اول میں نقل کیا جا چکا ہے اور یہ اثر بھی اپنے معنوی اعتبار سے واضح ہے۔

اعتراض: مبارکپوری صاحبؒ لکھتے ہیں کہ اولاً — اس اثر کی سند میں قتادہؒ مدلس ہیں، جو عنعنہ سے روایت کرتے ہیں۔ ثانیاً[2] — امام بخاریؒ تحریر فرماتے ہیں کہ سعیدؒ بن المسیبؒ، عروہؒ، شعبیؒ، عبیداللہؒ بن عبداللہؒ نافعؒ بن جبیرؒ، ابوالملیحؒ، قاسمؒ بن محمدؒ، ابومجلزؒ، مکحولؒ، مالکؒ بن عونؒ اور سعیدؒ بن ابی عروبہؒ قرآت خلف الامام کے قائل تھے۔ (جزء القرآۃ ص۱۱) لہٰذا یہ اثر حجت نہیں ہو سکتا (ابکار المنن وغیرہ)

(بقیہ حاشیہ پچھلا صفحہ) یزیدؒ بن رومانؒ کو امام نسائیؒ اور ابن معینؒ ثقہ کہتے ہیں۔ علامہ ابن حبانؒ ان کو ثقات میں لکھتے ہیں۔ علامہ ابن سعدؒ ان کو عالم، کثیر الحدیث اور ثقہ کہتے ہیں (تہذیب ۱۱ ص۳۲۵)

[1] ہشام دستوائیؒ ثقہ اور ثبت تھے (تقریب ص۳۶۰) حضرت سعیدؒ بن المسیبؒ کا ترجمہ باب اول میں اور قتادہؒ وکیعؒ اور ابوبکرؒ بن ابی شیبہؒ کا باب ثانی میں نقل ہو چکا ہے۔ وہاں ہی ملاحظہ کر لیں۔

جواب: حضرت قتادہؒ کی تدلیس کا مفصل جواب پہلے دیا جا چکا ہے اور حضرت سعیدؒ بن المسیبؒ کے بسند صحیح دو اثر ہم پہلے عرض کر چکے ہیں اور امام بخاریؒ نے اپنے استدلال میں ان کے اثر کی کوئی سند نقل نہیں کی اور بے سند بات حجت نہیں ہو سکتی۔ اور حضرت عروہؒ بن زبیرؒ نافعؒ بن جبیرؒ اور قاسمؒ بن محمدؒ وغیرہ کو مطلقاً مجوزین قرأت خلف الامام میں شمار کرنا باطل ہے بعض کے آثار اس کے خلاف نقل کیے جا چکے ہیں اور بعض کے عرض کر دیے جائیں گے۔ اور بقیہ آثار کی اسانید پر آثار خصوم میں بحث کی جائیگی۔ انشاء اللہ العزیز

اثر سعیدؒ[1] بن جبیرؓ (المتوفی ۹۴ھ) ابو بکرؒ بن ابی شیبہؒ فرماتے ہیں کہ ہم سے ہیثمؒ نے بیان کیا۔ وہ ابو بشرؒ[2] سے روایت کرتے ہیں۔ وہ فرماتے ہیں کہ میں نے حضرت سعیدؒ بن جبیرؓ سے سوال کیا۔

عن القرأة خلف الامام قال ليس خلف الامام قرأة۔ (تعلیق الحسن جلد ۱ ص ۹۰)

کیا امام کے پیچھے قرأت کی جا سکتی ہے؟ فرمایا کہ امام کے پیچھے کسی قسم کی کوئی قرأت نہیں کی جا سکتی۔

اعتراض: مبارک پوری صاحبؒ لکھتے ہیں کہ اولاً ہیثمؒ مدلس تھے۔ اور عنعنہ سے روایت کرتے ہیں و ثانیاً حضرت سعیدؒ بن جبیرؓ سکتات امام میں قرأت کے قائل تھے (جزء القرأۃ ص ۵۵) اس لیے یہ اثر قابل احتجاج نہیں ہو سکتا (ابکار المنن ص ۱۶۷ وغیرہ)

جواب: یہ بالکل صحیح ہے کہ ہیثمؒ کثیر التدلیس تھے، لیکن حضرت امام بخاریؒ اور علامہ ذہبیؒ ان کی معنعن حدیث سے استدلال کرتے ہیں (دیکھئے صحیح بخاریؒ جلد ۱ ص ۱۰۹ و تذکرہ ج ۱ ص ۲۴۷ وغیرہ) اس سے معلوم ہوتا ہے کہ ان کی تدلیس بھی مضر نہیں ہے، مزید تائید کے لیے

---

[1] علامہ ذہبیؒ لکھتے ہیں کہ وہ علماء اعلام میں تھے (تذکرہ جلد ۱ ص ۶۵) امام نوویؒ کا بیان ہے کہ وہ تابعینؒ کے ائمہ کبار میں تھے۔ تفسیر، حدیث، فقہ، عبادت اور زہد و ورع اور جملہ کمالات میں وہ کبار ائمہ اور سرگروہ تابعینؒ میں تھے۔ (تہذیب الاسماء جلد ۱ ص ۲۱۶)

[2] ابو بشرؒ کا نام جعفرؒ بن ایاسؒ تھا اور وہ ثقہ تھے (تقریب ص ۵۶) ہیثمؒ کا ترجمہ پہلے گزر چکا ہے۔

ایک اور روایت سُن لیجئے امام ابن جریرؒ عبداللہؒ بن مبارکؒ کے طریق سے روایت کرتے ہیں اور وہ بقیہؒ بن ولیدؒ سے، وہ کہتے ہیں کہ میں نے ثابتؒ بن عجلانؒ سے سنا۔ وہ فرماتے ہیں کہ میں نے حضرت سعیدؒ بن جبیرؓ سے سنا۔ انھوں نے فرمایا کہ آیت واذا قرئ القرآن . . . الآیہ خطبہ، جمعہ اور جہری نمازوں میں امام کے پیچھے قرأت کی ممانعت کے بارے میں نازل ہوئی ہے۔ (تفسیر ابن کثیر جلد ۲ صہ ۲۸۳) اور سعیدؒ بن جبیرؒ کے سکتات والے اثر کا جواب باب اوّل اعتراض ۱۱ کے جواب میں دیکھ لیں کہ نہایت کمزور اور ضعیف ہے۔

اثر عروہؓ بن زبیرؓ (المتوفی ۹۴ھ) امام مالکؒ ہشامؒ بن عروہؒ اور وہ اپنے والد عروہؒ بن زبیرؓ سے روایت کرتے ہیں:

انه کان یقرأ خلف الامام اذا لم یجھر فیه الامام بالقرأة (موطا امام مالک صہ ۲۹ و کتاب القرأة صہ ۱)

کہ وہ امام کے پیچھے صرف ان نمازوں میں قرأت کیا کرتے تھے جن میں امام جہر سے قرأت نہیں کیا کرتا تھا۔

اثر ابراہیم نخعیؒ (المتوفی ۹۶ھ) ابوبکرؒ بن ابی شیبہؒ فرماتے ہیں کہ ہم سے ابوخالد الاحمرؒ نے بیان کیا وہ اعمشؒ سے اور وہ حضرت ابراہیم نخعیؒ سے روایت کرتے ہیں کہ انھوں نے فرمایا:

لہ امام نوویؒ لکھتے ہیں کہ ان کے مناقب بیشمار ہیں، ان کی جلالت علو مرتبت اور وفور علم پر سب کا اتفاق ہے فقہ میں ان کو اتنا کمال حاصل تھا کہ مدینہ منورہ کے سات مشہور فقہاء میں سے ایک فقیہ مانے جاتے تھے (تہذیب الاسماء جلد ۱ صہ ۳۳۱) علامہ ذہبیؒ ان کو الامام اور عالم مدینہ لکھتے ہیں (تذکرہ جلد ۱ ص ۵۸) علامہ ابن سعدؒ ان کو ثقہ ثبت کثیر الحدیث فقیہ اور بلند قدر لکھتے ہیں (طبقات ابن سعد جلد ۵ صہ ۱۳۳) ان کا علمی کمال اس قدر تھا کہ بڑے بڑے حضرات صحابہ کرامؓ مسائل میں ان کی طرف رجوع کرتے تھے (البدایہ والنہایہ ۹ صہ ۱۰۱) اس کمال کے باوجود اس قدر محتاط تھے کہ کوئی مسئلہ محض اپنی رائے سے نہ بیان کرتے تھے (تہذیب التہذیب جلد ۷ صہ ۱۸۳)

لہ علامہ ذہبیؒ ان کو الامام، الحافظ، الحجۃ الفقیہ لکھتے ہیں (تذکرہ ۱ صہ ۱۳۶)

خالد الاحمر کا ترجمہ باب دوم حدیث ۲ میں اور ابراہیم نخعیؒ کا مقدمہ میں اور امام اعمشؒ کا حضرت اسودؒ . . .

اقل ما احدثوا القرأة خلف الامام وكانوا لا يقرأون (الجوهر النقی جلد ۲ ص۱۶۹)
یعنی لوگوں نے امام کے پیچھے قرأت کرنے کی بدعت ایجاد کی ہے۔ اور وہ (یعنی حضرات صحابہ کرامؓ وتابعینؒ) امام کے پیچھے قرأت نہیں کیا کرتے تھے۔

اور یہی مضمون بعینہٖ شمس الدین ابن قدامہؒ نے بھی نقل کیا ہے۔ (شرح مقنع جلد ۲ ص۱۲)

امام ابن قدامہؒ نقل کرتے ہیں کہ حضرت ابراہیمؒ نے فرمایا کہ لوگوں نے امام کے پیچھے قرأت کرنے کی بدعت مختار کے زمانہ میں نکالی، کیونکہ وہ لوگوں کو دن کی نمازیں تو پڑھا دیا کرتا تھا۔ مگر رات کی نمازیں نہیں پڑھاتا تھا (اور حاکم ہونے کے باعث ناچار لوگوں کو اس کے پیچھے نمازیں پڑھنی پڑتی تھیں اس لیے) اس سے بدظن ہو کر لوگوں نے اس کے پیچھے قرأت شروع کر دی (مغنی ابن قدامہ جلد ۱ ص۵۶۷) اگر یہ نقل صحیح ہے تو امام کے پیچھے قرأت کرنے کے بدعت ہونے کا اس سے بڑھ کر اور کیا ثبوت مل سکتا ہے؟ تسلیم کرنے والے کے لیے یہ دلائل بڑے مضبوط اور ٹھوس ہیں البتہ نہ ماننے والے کا کوئی علاج نہیں۔

اثر قاسمؒ[۱] بن محمدؒ (المتوفی ۱۰۶ھ) امام مالکؒ یحییٰؒ[۲] بن سعیدؒ اور امام ربیعہؒ[۳] بن عبد الرحمنؒ

۱؎ علامہ ذہبیؒ کا بیان ہے کہ قاسمؒ بن محمدؒ الامام القدوہ اور الفقیہ تھے (تذکرہ جلد ۱ ص۹۰) علامہ ابن سعدؒ لکھتے ہیں کہ وہ رفیع المنزلت و عالی مرتبت فقیہ امام اور بڑے حافظ حدیث تھے اور متورع تھے (طبقات جلد ۵ ص۱۴۳) امام نوویؒ لکھتے ہیں کہ وہ بڑے جلیل القدر تابعی ہیں۔ ان کی جلالت توثیق اور امامت پر سب کا اتفاق ہے (تہذیب الاسماء جلد ۱ ص۵۵) حافظ ابن کثیرؒ لکھتے ہیں کہ وہ احد الفقہاء المشہورین اور افضل اہلِ مدینہ اور اعلم اہلِ زمانہ تھے (البدایہ والنہایہ جلد ۹ ص۲۵۰) امام مالکؒ فرماتے تھے کہ قاسمؒ اس امت کے فقہاء میں تھے (تہذیب التہذیب جلد ۸ ص۳۳۵) ابو الزنادؒ کہتے ہیں کہ میں نے قاسمؒ سے زیادہ سنت کا عالم اور فقیہ نہیں دیکھا (تذکرہ ۱ ص۹۱)

۲؎ علامہ ذہبیؒ ان کو الحافظ، شیخ الاسلام، عالم اور قاضی المدینہ لکھتے ہیں (ایضاً ۱ ص۱۲۸)

۳؎ علامہ ذہبیؒ لکھتے ہیں کہ وہ امام، حافظ، فقیہ اور مجتہد تھے۔ علامہ خطیبؒ کا بیان ہے کہ وہ فقیہ، عالم اور حافظ فقہ اور حدیث تھے (ایضاً جلد ۱ ص۱۴۸)

سے روایت کرتے ہیں اور وہ دونوں حضرت قاسمؒ بن محمدؒ سے کہ وہ کان یقرأ خلف الامام فیما لا یجہر فیہ الامام بالقرأۃ (موطا امام مالک ص۲۹) صرف ان نمازوں میں امام کے پیچھے قرأت کیا کرتے تھے جن میں امام جہر سے قرأت نہیں کرتا تھا۔ یہ اثر بھی جہری نمازوں میں ترک القرأت خلف الامام کے بارے میں بالکل روشن اور واضح ہے۔

امام اوزاعیؒ (المتوفی ۱۵۷ھ) بھی امام کے پیچھے قرأت کے قائل نہ تھے۔ جیساکہ امام ابن قدامہؒ کے حوالہ سے نقل کیا جاچکا ہے اور شیخ الاسلام ابن تیمیہؒ کے فتاوٰی سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ سری نمازوں میں امام کے پیچھے قرأت کے قائل تھے لیکن صرف استحباب کے طور پر چنانچہ وہ تحریر فرماتے ہیں:

ومذہب طائفۃ کالاوزاعیؒ وغیرہ من الشامیین یقرأھا استحبابا وھو اختیار جدنا انتھی (فتاوی جلد ۲ ص۱۴۶)

اور ایک گروہ کا یہ مسلک ہے جیسے امام اوزاعیؒ اور ان کے علاوہ دوسرے شام میں رہنے والے علماء کہ سورۃ فاتحہ کا پڑھنا صرف استحباب کے درجے میں ہے اور اسی مسلک کو ہمارے دادا جان[1] نے اختیار کیا۔

کیا بعید ہے کہ حضرت عبادہؓ بن الصامت اور حضرت مکحولؒ وغیرہ شامی علماء اور ائمہ وغیرہ من الشامیین کی مد میں شامل ہوں اور امام کے پیچھے قرأت سورۃ فاتحہ کے صرف استحباب کے قائل ہوں، آخر شیخ الاسلامؒ کی بات ہے اور اس کی مزید تشریح اپنے مقام پر آئے گی۔ امام اوزاعیؒ کا ترجمہ مقدمہ میں نقل کیا جاچکا ہے۔

امام سفیان ثوریؒ (المتوفی ۱۶۱ھ) بھی سری اور جہری کسی نماز میں امام کے پیچھے کسی قسم کی قرأت کے قائل نہ تھے (جیساکہ تفسیر معالم التنزیل جلد ۲ ص۲۲۶ اور تحفۃ الاحوذی جلد ۱ ص۲۵۷ وغیرہ میں اس کی تصریح موجود ہے) اور امام سفیان ثوریؒ کا ترجمہ مقدمہ میں نقل کیا جاچکا ہے۔

---

[1] علامہ ذہبیؒ ان کو الامام المجتہد شیخ الاسلام اور احد الاعلام لکھتے ہیں (تذکرہ جلد ۴ ص۲۷۸) مجد الدین لقب، عبد السلام نام اور ابو البرکات کنیت تھی (دیکھئے الجنۃ ص۳۸ فی الاسوۃ الحسنۃ بالسنۃ)

امام لیثؒ بن سعدؒ (المتوفی ۱۷۵ھ) کا مسلک بھی ترک القرأۃ خلف الامام تھا جیسا کہ مغنی ابن قدامہؒ کے حوالہ سے مقدمہ میں نقل کیا جاچکا ہے۔ حضرت مولانا السید العلامہ، بحر العلوم، سید الحفاظ محمد انور شاہؒ (المتوفی ۱۳۵۲ھ) تحریر فرماتے ہیں کہ ان کا مسلک بھی امام کے پیچھے ترکِ قرأۃ ہی تھا جیسا کہ حافظ ابو عمرؒ بن عبد البرؒ نے استذکار میں لکھا ہے اور وجوب کا مسلک تو ہرگز نہ تھا، جیسا کہ شیخ الاسلامؒ نے (فتاویٰ جلد ۲ صفحہ ۲۴۲) میں لکھا ہے (فصل الخطاب صفحہ ۸) امام ابن سعدؒ لیثؒ کا ترجمہ بھی مقدمہ میں گزر چکا ہے۔

امام عبد اللہؒ بن المبارکؒ (المتوفی ۱۸۱ھ) امام بخاریؒ فرماتے ہیں کہ ابو وائلؒ حضرت ابن مسعودؓ سے روایت کرتے ہیں کہ امام کے پیچھے قرأت نہ کیا کرو، بلکہ خاموش رہا کرو۔ ابن مبارکؒ فرماتے ہیں کہ اس سے معلوم ہوا کہ جہری نمازوں میں امام کے پیچھے قرأت نہ کرنی چاہیئے کیونکہ انصات جہری نمازوں میں ہی ہو سکتا ہے (جزء القرأۃ ص ۸) اور جہری نمازوں میں ان کا محقق مسلک امام کے پیچھے ترک القرأۃ ہی تھا (معالم التنزیل جلد ۳ ص ۲۶۴، روح المعانی جلد ۹ ص ۱۳۵ اور تحفۃ الاحوذی جلد ۱ ص ۲۵۷ وغیرہ میں اس کی تصریح کی گئی ہے) اور تبییض الصحیفہ مصنفہ علامہ سیوطیؒ جو اپنے وقت کے سب سے بڑے حافظ تھے (تحفۃ الاحوذی جلد ۱ ص ۲۱۴) کے حوالہ سے یہ بات نقل کی جاچکی ہے کہ امام عبد اللہؒ بن المبارکؒ نے فرمایا کہ جس مسئلہ پر حضرت امام ابو حنیفہؒ اور امام سفیان ثوریؒ مجتمع ہو جائیں تو وہی میرا مسلک ہوگا اور چونکہ یہ دونوں بزرگ سری نمازوں میں بھی امام کے پیچھے قرأت کے قائل نہ تھے۔ اس لیے یہی مذہب امام ابن مبارکؒ کا ہوگا۔

امام عبد اللہؒ بن وہبؒ (المتوفی ۱۹۷ھ) حضرت شاہ صاحبؒ لکھتے ہیں کہ امام ابن وہبؒ کا مسلک بھی امام ابن عیینہؒ کی طرح امام کے پیچھے ترکِ قرأت ہی ہے (فصل الخطاب صفحہ ۸) اور محدث مولانا محمد زکریا صاحب اس کی تصریح کرتے ہیں کہ امام ابن وہبؒ اور علامہ اشہبؒ وغیرہ مالکی علماء کا یہی مسلک تھا کہ امام کے پیچھے قرأت نہیں کرنی چاہیئے

(اوجز المسالک جلد ۱ صفحہ ۲۳۹) اور امام ابن وہبؒ کا ترجمہ حدیث ۱۷ کے ذیل میں نقل کیا جاچکا ہے۔

امام سفیانؒ بن عیینہ (المتوفی ۱۹۸ھ) امام ابوداؤدؒ[1] فرماتے ہیں کہ ہم سے قتیبہؒ[2] بن سعیدؒ اور ابن ابی السرحؒ نے بیان کیا، وہ دونوں حضرت سفیانؒ بن عیینہؒ سے روایت کرتے ہیں کہ انھوں نے حضرت عبادہؓ بن الصامت کی مرفوع حدیث (لا صلوٰۃ لمن لم یقرأ بفاتحۃ الکتاب فصاعدًا او کما قال) کا یہ مطلب بیان کیا لمن یصلی وحدہ (ابوداؤد جلد ۱ ص ۱۱۹) یعنی جو شخص تنہا نماز پڑھتا ہو تو اس کو سورۂ فاتحہ کی قرأت کرنی ہوگی، اور یہ حدیث مقتدی کو شامل نہیں ہے، مطلب ظاہر ہے کہ امام کے پیچھے قرأت نہیں کی جاسکتی امام ابن عیینہؒ کا ترجمہ بھی مقدمہ میں نقل کیا جاچکا ہے اور ابن ابی السرحؒ کا ترجمہ باب دوم حدیث ۱۴ میں نقل ہوچکا ہے۔

امام اسحاقؒ بن راہویہؒ (المتوفی ۲۳۶ھ) امام بغویؒ علامہ آلوسیؒ اور مبارکپوری صاحبؒ لکھتے ہیں کہ امام موصوف جہری نمازوں میں امام کے پیچھے قرأت کے قائل نہ تھے (معالم التنزیل جلد ۲ ص ۲۲۴، روح المعانی جلد ۹ ص ۱۳۵ اور تحفۃ الاحوذی جلد ۱ ص ۲۵۷) امام موصوفؒ کا ترجمہ مقدمہ میں نقل کیا جاچکا ہے۔

قارئین کرام! ہم نے بعض حضرات تابعینؒ واتباع تابعینؒ کے آثار باب اول میں (مثلاً حضرت محمدؒ بن کعبؒ، مجاہدؒ بن جبرؒ، حسن بصریؒ، ابوعالیہ الریاحیؒ اور امام زہریؒ وغیرہ کے آثار) اور بعض دیگر اکابر علماء امت اور حضرات ائمہ اربعہؒ کے اقوال مقدمہ میں پوری تفصیل کے ساتھ عرض کر دیے ہیں اور گو ان کے علاوہ ابھی بہت سے آثار اور اقوال اس مضمون کے موجود ہیں۔ لیکن چونکہ ان حضرات کے مسلک کے سمجھنے میں فریق ثانی کو ایک نمایاں غلط فہمی ہوئی ہے۔ اس لیے ہم نے خصوصیت کے ساتھ ان کے نام پیش کیے ہیں۔ ورنہ مقدمہ میں اجماع نقل کیا جاچکا ہے اور اس کے بعد مزید کسی اور صراحت اور وضاحت اور تشریح کی ضرورت باقی نہیں رہتی۔ وفیہ کفایۃ لمن لہ ھدایۃ۔

---

[1] امام ابوداؤدؒ صاحب سنن (المتوفی ۲۷۵ھ) علامہ ذہبیؒ لکھتے ہیں کہ وہ الامام، الثبت اور سید الحفاظ تھے (تذکرہ جلد ۲ ص ۱۵۲) ۱۲ م

[2] قتیبہؒ بن سعیدؒ کو علامہ ذہبیؒ الشیخ، الحافظ اور محدث خراسان لکھتے ہیں (تذکرہ جلد ۲ ص ۳)

حضرات! آپ ملاحظہ کر چکے ہیں کہ آیت واذا قرئ القرآن... الآیۃ کا شانِ نزول صحیح روایات اور اجماعِ امت سے قرأۃ خلف الامام کا مسئلہ ہے اور اکیس ۲۱ عدد صحیح اور مرفوع روایات سے امام کے پیچھے قرأت کی ممانعت اس کتاب میں ثابت کی جاچکی ہے۔ اور آں حضرت صلی اللہ تعالیٰ علیہ وآلہ وسلم کا آخری عمل بھی اس کی تائید کرتا ہے اور متعدد صحیح اور مرفوع حدیثوں سے خاص فاتحہ کا لفظ بھی نقل کیا جاچکا ہے اور فریقِ ثانی کی ہر طرح سے منہ مانگی مُرادیں بھی پوری کی جاچکی ہیں اور حضرات صحابہ کرامؓ کی وہ جماعت جن سے باقرار فریقِ ثانی، دین، علم فقہ اور حدیث مروی اور منقول ہے۔ وہ بھی امام کے پیچھے قرأت کے قائل نہیں تھے۔ اور جلیل القدر حضرات تابعینؒ و اتباع تابعینؒ اور دیگر بڑے بڑے حضرات محدثینؒ اور فقہاءؒ بھی امام کے پیچھے قرأت کے قائل نہ تھے اور جہری نمازوں میں تو امام کے پیچھے قرأۃ کو مخالف قرآن شاذ منکر اور اجماع کے خلاف سمجھتے تھے، جیسا کہ شیخ الاسلامؒ کے حوالہ سے نقل کیا جاچکا ہے اور جو سری نمازوں میں امام کے پیچھے قائل بھی تھے۔ وہ بھی صرف استحباب کے درجہ میں اور آپ یہ بھی دیکھ چکے ہیں کہ مانعین قرأۃ خلف الامام صرف احناف ہی نہیں ——— (جس طرح کہ فریقِ ثانی نے تمام دنیا کے حنفی حضرات کو کھلا اور انعامی چیلنج دے کر یہ مغالطہ دینے کی ناکام کوشش کی ہے کہ یہ صرف احناف کا قول اور ان کا مسلک ہے) بلکہ جمہور اہلِ اسلام اور فقہاءؒ و محدثینؒ کا یہ محقق مسلک ہے اور فریقِ ثانی نے غلطی کی وجہ سے صرف احناف کے مقتدر علماء مفتی محمد کفایت اللہ صاحبؒ، مولانا حسین احمد صاحب مدنیؒ، اور مولانا شبیر احمد صاحبؒ کی خدمت میں چیلنج پیش کر کے یہ سمجھنے یا سمجھانے کی بالکل ناکام سعی کی ہے کہ یہ مسئلہ صرف ان کا ہے اور آپ یہ بھی دیکھ چکے ہیں کہ پیش کردہ روایات میں کم و بیش پچانوے ۹۵ فی صدی روات وہ ہیں، جو ثقہ، ثبت، حافظ اور حجت ہونے کے علاوہ بخاری اور مسلم کے مرکزی روات ہیں اور تقریباً پانچ فی صدی وہ راوی ہیں جن میں بعض حضرات محدثین کرامؒ نے کلام کیا ہے، لیکن ان کو بھی نوے ۹۰ فی صدی اور جمہور محدثینؒ ثقہ کہتے ہیں اور ان کی روایتوں کو صحیح، حسن، صالح، جیّد اور قوی کہتے ہیں، جیسا کہ آپ دیکھ چکے ہیں اور لطف کی بات یہ ہے کہ ان روات کی (بغیر تین چار کے حالانکہ جمہور محدثینؒ کے نزدیک وہ بھی ثقہ ہیں) ثقاہت اور عدالت فریقِ ثانی کے

نزدیک بھی مُسلّم ہے۔ صرف ان پر تدلیس، تخلیط، تغیر لیسیر، وہم اور تفرد وغیرہ کے معمولی الزامات لگائے گئے ہیں یا مرفوع کو موقوف اور موصول کو مرسل کہنے کی بے جا سعی کی گئی ہے اور یا محض اپنی مرضی یا معمولی سے شبہ کی بنا پر مطلق قرأت کو مقید کرنے کی بعید از انصاف کاوش کی گئی ہے، اب ذرا فریق ثانی کی پیش کردہ روایات اور ان کے رواۃ اور رجال کا حال بھی دیکھ لینا تاکہ آپ کو معلوم ہو جائے کہ فریق ثانی کتنے پانی میں ہے۔ ان تمام پیش کردہ دلائل کو سامنے رکھ کر میں فریق ثانی کے اہل علم طبقہ سے نہایت مؤدبانہ اور ملتجی بہ انصاف مطالبہ بلکہ دردمندانہ اپیل کرتا ہوں کہ وہ حق کا ساتھ دے اور تعصب اور غلو سے کام نہ لے اور اگر وہ کسی خاص مصلحت کے پیش نظر اپنی پارٹی کا ساتھ نہ چھوڑ سکے یا نہ چھوڑنا چاہے تو اس چیلنج بازی سے باز آجائے اور یہ الفاظ اور نظریہ واپس لے لے کہ

جو شخص امام کے پیچھے ہر رکعت میں سورہ فاتحہ نہ پڑھے۔ اس کی نماز ناقص ہے، کالعدم ہے، بیکار ہے اور باطل ہے (انتہٰی بلفظہٖ دیکھئے فصل الخطاب ص۔ جس میں تمام دنیا کے علمائے احناف کو کھلا چیلنج دیا گیا ہے)

اس سے قبل کہ باب چہارم شروع کیا جائے یہ کہہ دینا نہایت ضروری سمجھتا ہوں (اور سخن ہائے گفتنی میں بھی عرض کیا جا چکا ہے) کہ ہر مقام پر حضرات محدثین کرامؒ اور فقہائے عظامؒ کے ناموں کے قبل، امام، علامہ، محدث، فقیہہ یا حضرت وغیرہ کے توصیفی القاب نہیں لکھے جا سکے۔ اس لیے کہ ان کے نام بار بار آتے رہے ہیں۔ ورنہ نہ صرف یہ کہ مجھے ان سے عشق اور محبت ہے، بلکہ ان کے نام لینے کو موجب نزول رحمت خداوندی سمجھتا ہوں۔ کیونکہ انھیں کی کاوش اور سعی کی بدولت قرآن کریم اور حدیث شریف ہم تک پہنچی ہے اور اللہ تعالیٰ کی ذات گرامی اور آں حضرت صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کی عظیم الشان ہستی تک ہماری رسائی کا عالم اسباب میں یہی اکابر بہترین ذریعہ اور وسیلہ ہیں اور جہاں ان اکابر سے (خصوصاً حضرت امام بخاریؒ اور امام بیہقیؒ وغیرہ) علمی اور تحقیقی رسہ کشی کی گئی ہے، تو حاشا و کلا ثم حاشا و کلا کہ اس سے ان کی تذلیل اور تحقیر مراد نہیں کیونکہ ان کی تذلیل کو بفحوائے حدیث من عادیٰ لی ولیا فقد بارزتہ بالحرب۔ اللہ

تعالیٰ کی ذات سے اعلانِ جنگ کے مترادف سمجھتا ہوں۔ (العیاذ باللہ تعالیٰ) بلکہ جہاں بھی ان اکابر سے اختلاف کیا گیا ہے۔ وہ صرف ان کی پیش کردہ دلیل کی خامی بتلانا مقصود ہے، وکل احد یؤخذ عنه ویترك الا قول رسول الله صلی الله علیه وسلم۔ ایک بات اور خصوصی طور پر قابلِ ذکر ہے، وہ یہ کہ راقم الحروف نے فریقِ ثانی کی طرف سے پیش کردہ اعتراضات کے مفہوم کو اختصاراً اپنی عبارت میں پیش کیا ہے، مگر صرف بعض مواقع پر الفاظ بھی انھیں کے ہیں جہاں انتہیٰ بلفظہٖ یا بلفظہٖ وغیرہ لکھ کر اشارہ کر دیا ہے۔ ہاں البتہ ان کی کتابوں کے حوالے ضرور درج کر دیے گئے ہیں تاکہ مزید تسلّی اور اطمینان کے لیے اصل کتاب کی طرف بآسانی مراجعت کی جا سکے۔ مجھے اپنی علمی بے بضاعتی کا علم ہے۔ معصومیت کا دعوےٰ کب ہو سکتا ہے؟ اور حضرات انبیاء کرام علیہم الصلوٰۃ والسلام کے بغیر معصوم ہے کون؟ والعصمۃ بید اللہ تعالیٰ وحدہٗ۔

چوتھا باب

قرآنِ کریم، صحیح احادیث، آثار حضرات صحابہ کرامؓ، تابعینؒ و اتباعِ تابعینؒ وغیرہم سے بلکہ جمہور امت سے یہ بات ثابت کی جا چکی ہے کہ امام کے پیچھے قرأت کرنا صحیح نہیں ہے اور جہری نمازوں میں تو مخالف اجماع اور شاذ و منکر ہے۔ قرآن کریم، حدیث شریف اور اجماع امت کے بعد کسی اور دلیل کی نہ گنجایش ہے اور نہ ضرورت، لیکن ہم محض تکمیلِ فائدہ کے لیے نہایت اختصار سے چند عقلی ترجیحی اور قیاسی دلائل بھی اس باب میں عرض کر دیتے ہیں تاکہ اصولِ فقہ کی رُو سے قرآنِ کریم[1]، حدیث شریف[2]، اجماعِ امت[3] اور قیاس[4] کے جملہ دلائل سے آپ کو جمہور اہلِ اسلام کا محقق مسئلہ معلوم ہو جائے کہ امام کے پیچھے مقتدیوں کو سورۃ فاتحہ وغیرہ کسی قسم کی قرأت کرنا درست اور صحیح نہیں ہے۔

پہلی دلیل: علامہ حازمیؒ[1] (المتوفی ۵۸۴ھ) لکھتے ہیں کہ اگر ایک طرف کی حدیث ظاہر

---

[1] ابوبکر محمدؒ بن موسیٰؒ بن عثمان الشافعیؒ علامہ ذہبیؒ لکھتے ہیں کہ وہ الامام، الحافظ، البارع اور النسابہ تھے، نیز لکھتے ہیں کہ وہ ثقہ، حجت، نبیل، زاہد، عابد، متورع اور من الائمۃ الحفاظ تھے (تذکرہ جلد ۴ ص ۱۵۱) اور علامہ تاج الدین السبکیؒ (المتوفی ۷۷۱ھ) ان کو امام متقن اور مبرز لکھتے ہیں (طبقات الشافعیہ، جلد ۴ ص ۱۸۹)

قرآن کے موافق ہو، اور دوسرے طرف کی ایسی نہ ہو، تو وہ حدیث قابلِ اخذ اور حجت ہوگی جو ظاہر قرآن کے موافق ہوگی۔ (کتاب الاعتبار ص۱۱) امام کے پیچھے ترکِ قرأت کی روایتیں نہ صرف یہ کہ ظاہر قرآن کے مطابق ہیں، بلکہ آیت واذا قرئ القرآن ... الآیۃ کا شانِ نزول ہی بالاجماع مسئلہ خلف الامام ہے، جس کی پوری تشریح باب اول میں عرض کی جا چکی ہے اور فریقِ ثانی کی طرف سے پیش کردہ روایات کی تائید میں قرآن کریم کی کوئی آیت موجود نہیں ہے، لہٰذا جمہور کے مسلک کو ترجیح ہوگی۔ مؤلف خیر الکلام نے ص۵۲۹ اور ص۵۳۰ میں اس کا جو جواب دیا ہے وہ بالکل غیر متعلق ہے۔ اوّلاً — اس لیے کہ انصات واستماع قرأت فی السر کے منافی ہیں۔ کما مرّ وثانیاً — خلف الامام کی قید سے روایت نہ صحیح ہے اور نہ مشہور پھر اس سے تخصیص کیسی؟ وثالثاً — اختلاف نفسِ وجوب فاتحہ کا نہیں ہے جس کے لیے انہوں نے تین آیتیں پیش کی ہیں۔ (جو اصل مسئلہ سے بھی غیر متعلق ہیں) بلکہ اختلاف وجوب یا ترکِ فاتحہ خلف الامام میں ہے اور نہ مقتدی کے لیے بحالتِ قرأت امام جواز اور اباحت قرأت کے لیے کوئی آیت موجود نہیں ہے محض کشید ہے بخلاف ترکِ قرآۃ خلف الامام کے کہ اس پر بالاجماع آیت واذا قرئ القرآن ... الآیۃ دلیل ہے۔

دوسری دلیل: علامہ موصوفؒ لکھتے ہیں کہ اگر ایک جانب کی حدیث پر اکثر امت کا عمل ہو اور دوسری جانب اتنا عمل نہ ہو تو اس روایت کو ترجیح ہوگی، جس پر جمہور امت کا اتفاق ہوگا۔ (ایضاً ص۱۱) اور امام کے پیچھے قرأت کے ترک کرنے کا مسئلہ جمہور امت کے اقوال اور عبارات سے آپ معلوم کر چکے ہیں۔ اس اعتبار سے بھی مانعین قرأت خلف الامام کی احادیث اور مسلک کو ترجیح ہوگی۔ مؤلف خیر الکلام ص ۵۳۱ میں اس کا جو جواب دیتے ہیں وہ بالکل ناکام ہے کیونکہ عام کی تخصیص اور مطلق کی تقیید اور تطبیق و ترجیح کا سوال وہاں پیدا ہوتا ہے جہاں دونوں دلیلیں مساوی ہوں اور یہاں ایسا نہیں ہے کیونکہ خلف الامام کی قید سے کوئی روایت صحیح نہیں ہے اور نزاع محض فاتحہ کے ایجاب کا نہیں جس کی حدیث صحیح ہے بلکہ فاتحہ برائے مقتدی میں نزاع ہے اور آیت انصات قطعی ہے وہ بھلا حضرت ابوہریرہؓ کی ضعیف حدیث سے کیونکر منسوخ ہو سکتی ہے؟ اور معدودے چند حضرات صحابہ کرامؓ کے بغیر باقی تمام حضرات قرنِ اول میں خلف الامام

قراۃ کے منکر تھے اور بعد کے لوگوں کی اکثریت کا تو مؤلف مذکور کو بھی دبی زبان سے اقرار ہے اور قراۃ خلف الامام سے منع کرنیوالے بے شمار حضرات صحابہؓ اور تابعینؒ تھے بلکہ وہ تو منہ میں پتھر اور مٹی ڈالنے پر بھی اتر سے ہوئے تھے اور احناف کا مذہب باحوالہ گذر چکا ہے کہ منع قراۃ خلف الامام ہے۔ اس لیے ترک القراۃ خلف الامام جمہور کا مسلک ہونا واضح ہے۔ لا شك فيه۔

تیسری دلیل: علامہ موصوفؒ لکھتے ہیں کہ اگر ایک طرف آں حضرت صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کی قولی حدیث کے ساتھ آپ کا عمل بھی موجود ہو۔ اور دوسری طرف صرف آپ کا قول ہو تو آپ کی اس حدیث کو ترجیح ہوگی جس پر آپ کا قول اور فعل دونوں موجود ہوں۔ (کتاب الاعتبار ص ۱۱) اور باب دوم میں آپ کی بہت سی قولی صحیح اور مرفوع حدیثوں کے علاوہ حدیث ۲۰ میں آپ کا آخری عمل بھی پیش کیا جا چکا ہے کہ آپ نے نظریہ ظاہر ساری ہی سورۃ فاتحہ ترک کی اور آپ کے سامنے حضرت ابوبکرہؓ کی عملی اور فعلی حدیث بھی نقل کی جا چکی ہے۔ اور ایسی کوئی روایت بسندِ صحیح نہیں پیش کی جا سکتی کہ آپ نے اقتداء کی حالت میں امام کے پیچھے سورۃ فاتحہ کی قرأت کی ہے۔ ومن ادعی فعلیہ البیان دیدہ باید۔ اگر قرأت خلف الامام کی روایتیں صحیح بھی ہوں تب بھی ان کو ترجیح نہیں دی جا سکتی حالانکہ ان میں ایک بھی صحیح نہیں ہے۔ اس میں بھی مؤلف خیر الکلام نے ص ۱۳۲ میں کلام کیا ہے مگر معقول نہیں کیونکہ باحوالہ ثابت کیا جا چکا ہے کہ آپ پہلے مقتدی تھے۔ پھر آپ نے امامت اختیار کی اور بالاجماع اور باقرارِ مؤلف مذکور قرأت سورۃ فاتحہ سے شروع ہوتی ہے اور وہی آپ سے چھوٹ گئی تھی اور بایں ہمہ نماز ہوگئی، قرأت سے نماز مراد لینا بے دلیل ہے اور یہ ترک فاتحہ کُلاً یا بعضاً عذر کی وجہ سے نہ تھا بلکہ اقتداء کی وجہ سے تھا۔

چوتھی دلیل: علامہ موصوفؒ لکھتے ہیں کہ اگر ایک طرف کی روایت قیاس کے موافق ہو اور دوسری قیاس کے موافق نہ ہو تو اس روایت کو ترجیح ہوگی، جو قیاس کے مطابق ہوگی (کتاب الاعتبار ص۱۱) اور امام کے پیچھے قرأت ترک کرنا قیاس کے مطابق ہے، اور فریقِ ثانی کا بھی اس امر پر اتفاق ہے کہ مازاد علی الفاتحۃ کی قرأت اور اسی

طرح مقتدیوں کو جہر بالقراۃ کرنے کی اجازت نہیں ہے۔ کیونکہ ما زاد علی الفاتحۃ کی قرأت اور جہر سے پڑھنا امام کا فریضہ ہے تو اس پر سورۃ فاتحہ کی قرأت کو قیاس کرلیں۔ ہاں اگر کسی صحیح سند کے ساتھ امام کے پیچھے مقتدیوں کو قرأت کرنے کی اجازت ہوتی تو الگ بات تھی۔ اس صورت میں قیاس نص کے مقابلہ میں باطل ہوتا۔ مگر خلف الامام کی ایک روایت بھی صحیح نہیں ہے، جیسا کہ بیان ہوگا۔ مؤلف خیر الکلام کا فاتحہ کو نماز کی صحت کے لیے شرط قرار دینا اور قرآن کی قرأت کو رکن قرار دینا بجا ہے مگر مقتدی کے لیے دونوں شرط نہیں اور نزاع صرف اس میں ہے اور ما زاد کو بالاجماع عدم رکن قرار دینا غیر مسلّم ہے قرأت کے سلسلے میں فاتحہ اور ما زاد کا ایک ہی حکم ہے امام اور منفرد کے لیے دونوں ہیں اور اور مقتدی کے لیے دونوں نہیں۔ اس لیے ترک قرأۃ للمقتدی ہی قیاس کے مطابق ہے۔

پانچویں دلیل: اگر ایک طرف کی حدیث محرّم اور دوسری طرف کی مُبیح ہو تو محرّم کو ترجیح ہوگی۔ چنانچہ نواب صدیق حسن خاں صاحبؒ لکھتے ہیں کہ حظر مقدم باشد بر جانب اباحت (بدور الاہلہ ص ۱۸) اور یہ گذر چکا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اور آں حضرت صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے فاستمعوا لہ وانصتوا اور واذا قرأ فانصتوا وغیرہ امر کے الفاظ سے مقتدیوں کو قرأت سے منع کیا ہے اور خدا تعالیٰ اور اس کے برحق رسول صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کے حکم اور امر کا خلاف کرنا یقیناً حرام ہے۔ اور حضرات صحابہ کرامؓ اور تابعینؒ کے جو تہدیدی الفاظ نقل ہو چکے ہیں (کہ امام کے پیچھے قرأت کرنے والے کے منہ میں چنگاری ہو، خاک ہو، نتن ہوں، پتھر ہوں وغیرہ وغیرہ) وہ اس پر مستزاد ہیں۔ اس لیے محرّم کو مُبیح پر ترجیح ہوگی۔ اور اس لحاظ سے بھی جمہور کی دلیل کا پلہ بھاری رہے گا۔ مؤلف خیر الکلام کا ایجاب فاتحہ خلف الامام کا دعویٰ کرکے اور ترکِ قرأت کو تخییر سے تعبیر کرکے ترجیح دینا مردود ہے کیونکہ ایجاب فاتحہ خلف الامام کی جب سرے سے کوئی حدیث ہی صحیح نہیں تو پھر راجح و مرجوح کا کیا سوال؟ اور قرآن کریم و حدیث شریف سے ثابت ہے، کہ مقتدی کو خلف الامام استماع و انصات کا وجوبی حکم ہے پھر تخییر کہاں سے ہے؟

چھٹی دلیل: اس امر پر تمام محدثینؒ اور فقہاءؒ کا اتفاق ہے جن میں خصوصیت سے حضرت امام بخاریؒ اور امام بیہقیؒ قابلِ ذکر ہیں کہ امام کا سترہ مقتدیوں کو کافی ہے اور ان کو الگ سترے

کی ضرورت نہیں ہے (دیکھئے بخاری جلد ا ص ۱۷ اور سنن الکبریٰ جلد ۲ ص ۳۵۲) جب وہی امام، نماز اور مقتدی جمع ہیں تو امام کی قرأت مقتدیوں کو کیوں کافی نہیں ہے؟ جب کہ ما زاد علی الفاتحۃ کی قرأت میں سب کے نزدیک امام کفایت کرتا ہے۔[1] مؤلف خیر الکلام کا یہ کہنا کہ سُترہ نماز کے ارکان اور شرائط سے نہیں قرأۃ نماز کے ارکان سے ہے... الخ صحیح نہیں ہے کیونکہ جیسے سُترہ رکن نہیں اسی طرح مقتدی کے لیے قرأت بھی رکن نہیں مطلق نماز کا جھگڑا نہیں بات مقتدی کی ہو رہی ہے اور جیسے سُترہ آگے ہونے کی وجہ سے بقول مؤلف خیر الکلام بمنزلہ کعبہ ہے اور سب کے لیے ایک ہی کعبہ کافی ہے تو اسی طرح امام بھی سب کے آگے ہوتا ہے اور قرأت میں سب کی کفایت کرتا ہے۔ لہٰذا امام کی قرأت اور سُترہ سب کے لیے کافی ہے۔

ساتویں دلیل: صاحب امر کے آخری قول و فعل سے بظاہر یہی متبادر ہو سکتا ہے کہ پہلا قول اور فعل منسوخ قرار دیا جائے۔ اور اس سے کیا کم ہو سکتا ہے کہ اگر آخری عمل ناسخ نہ ہو۔ تب بھی ترجیح تو اس کو بہر حال ہو گی۔ جیسا کہ حضرت امام بخاریؒ نے ایک مقام پر ارشاد فرمایا ہے وانما یؤخذ بالآخر فالآخر من فعل النبی صلی اللہ علیہ وسلم (بخاری جلد ا ص ۹۶)

---

[1] شیخ الاسلام ابن تیمیہؒ لکھتے ہیں: الامام یحمل عن المأمومین السھو وکذا القرأۃ عند الجمھور (منہاج السنہ جلد ۳ ص ۱۶) امام سہو میں اور جمہور کے نزدیک قرأت میں مقتدیوں کی طرف سے کافی ہوتا ہے۔ اور حضرت عبداللہ رضؓ بن عباسؓ نے ایک جنازہ پر بلند آواز سے قرأت کی۔ پھر ارشاد فرمایا: وانما جھرت لاعلمکم انھا سنۃ والامام کفاھا (منتقٰی ص ۲۶۳) میں نے جہراً اس لیے قرأت کی ہے تاکہ تمہیں اس کا سنت ہونا معلوم ہو جائے ورنہ امام کی قرأت کافی ہے۔ اور حضرت شاہ صاحبؒ لکھتے ہیں کہ حدیث آتی ہے لا صلوٰۃ الا بخطبۃٍ کہ خطبہ کے بغیر نماز نہیں ہو سکتی، حالانکہ فریق ثانی بھی متفق ہے کہ خطبہ پڑھنا صرف امام کا کام ہے۔ (فیض الباری جلد ۲ ص ۷۷) بہر حال جب امام ما زاد علی الفاتحۃ، سُترہ، سہو اور خطبہ وغیرہ میں کفایت کرتا ہے۔ اور لطف یہ ہے کہ باقرار فریق ثانی تو قرأت میں بھی یقیناً وہ کفایت کر سکتا ہے۔

یعنی آں حضرت صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کا سب سے آخری فعل ہی قابلِ عمل ہوگا۔ اور آپ پڑھ چکے ہیں کہ آں حضرت صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے آخری نماز میں باقرار قاضی شوکانی رح پوری سورۂ فاتحہ بحالت اقتداء ترک کی۔ مگر آپ کی نماز صحیح ہو گئی اور آپ کے آخری فعل کے حجت ہونے میں کیا شک ہو سکتا ہے۔

مؤلف خیر الکلام کا حضور علیہ السلام کی ابتداءً اقتداء کا اور پھر ترک فاتحہ کُلاً یا بعضاً کا انکار کرنا بالکل مکابرہ ہے جب یہ روایات سے ثابت ہے کہ امر تو انکار کا کیا معنی؟ باقی نماز میں قیام وقعود اور نیابت وغیرہ میں عذر تو شریعت نے خود بتایا ہے مگر قرأت اور ترک قرأت میں عذر اور غیر عذر کا کوئی فرق نہیں کیا اس لیے قرأت یا ترک قرأت کو دیگر امور پر قیاس کرنا جیسا کہ مؤلف خیر الکلام نے کیا ہے قیاس مع الفارق ہے جو قابل سماعت نہیں ہے۔

آٹھویں دلیل: آں حضرت صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ الامام ضامن [1] امام ضامن اور کفیل ہے ضامن اور کفیل جب قرض وغیرہ ادا کردے تو اصل مقروض سبکدوش ہو جائے گا۔ آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے متعدد حضرات صحابہ کرامؓ کے ابتداءً اس لیے جنازے نہیں پڑھاتے تھے کہ وہ مقروض تھے اور ان کے پاس قرض کی ادائیگی کا کوئی ذریعہ نہ تھا۔ اور جب ان کے قرض کو ان حضرات صحابہ کرامؓ نے اپنے ذمہ لے لیا جو زندہ تھے۔ اور ان کے کفیل اور ضامن بن گئے تو آپ نے اصل کو بری الذمہ سمجھتے ہوئے ان کا جنازہ پڑھا دیا۔

---

[1] یہ روایت حضرت ابوہریرہؓ سے مروی ہے وہ فرماتے ہیں کہ آنحضرت صلی اللہ تعالیٰ علیہ وآلہ وسلم نے ارشاد فرمایا: الامام ضامن امام مقتدیوں کا ضامن اور کفیل ہے۔ یہ روایت ابوداؤد جلد ۱ ص ۸۴، ترمذی جلد ۱ ص ۲۹، معجم صغیر طبرانی ص ۱۲۳، اور مسند احمد جلد ۲ ص ۴۱۹ وغیرہ میں موجود ہے۔ صاحب تنقیح کہتے ہیں کہ مسند احمد کی روایت علی شرط مسلم صحیح ہے اور علامہ زیلعیؒ فرماتے ہیں کہ یہ سند صحیح ہے (نصب الرایہ جلد ۲ ص ۵۷) علامہ ہیثمیؒ لکھتے ہیں کہ بزارؒ نے یہ روایت بیان کی ہے: ورجالہ کلھم موثقون (مجمع الزوائد جلد ۲ ص ۲) اس کے تمام راوی ثقہ ہیں اور یہ روایت حضرت ابو امامہ باہلیؓ سے بھی مروی ہے کہ آں حضرت صلی اللہ تعالیٰ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: الامام ضامن (الحدیث) علامہ ہیثمیؒ لکھتے ہیں کہ امام احمدؒ نے اور طبرانیؒ نے معجم کبیر میں یہ روایت بیان کی ہے ورجالہ موثقون طبرانی کے سب راوی ثقہ ہیں (مجمع الزوائد جلد ۲ ص ۲)

(دیکھیے بخاری و مسلم وغیرہ) باقی باریک فقہی تدقیقات کا یہ مقام نہیں ہے ہم ان کو یہاں نہیں چھیڑتے۔ لہٰذا جب امام سورۂ فاتحہ کی قرأت کرلے تو مقتدیوں کو کافی ہوگی جیسے کہ ما زاد علی الفاتحۃ کی قرأت بالاتفاق مقتدیوں سے ساقط ہے اور امام کی قرأت ہی کفایت کرتی ہے۔ مؤلف خیر الکلام صد ۵۳۵ میں لکھتے ہیں کہ اگر ایک شخص کا بہت سے آدمیوں نے سو سو روپیہ ادا کرنا ہو تو یہ نہیں ہوسکتا کہ ایک شخص کفیل ان سب کی اور اپنی طرف سے ایک سو روپے دے کر سب کی ذمہ داری سے بری ہوجاتے ...... الخ

الجواب: مگر یہ سب کچھ ان کی قلتِ فہم کا نتیجہ ہے کیونکہ یہاں ایک آدمی کا بہت سے آدمیوں نے نہیں دینا بلکہ کئی آدمیوں پر صرف سو روپیہ ہے اور اس کو کفیل ادا کر رہا ہے۔ کیونکہ قرأت جماعت کی نماز میں صرف ایک ہے اور ما زاد علی الفاتحۃ میں تو فریقِ ثانی کو بھی مسلّم ہے کہ امام اور کفیل سب کی طرف سے ادا کر رہا ہے۔ منفرد ہوتے تو ان کو خود پڑھنی ہوتی، لیکن یہاں بحث تو مقتدی کی ہو رہی ہے اور اس پر سرے سے قرأت ہی نہیں جو ہے وہ امام ادا کر رہا ہے۔

نویں دلیل: امام طحاویؒ نے ترکِ قرأت خلف الامام پر متعدد مرفوع حدیثیں اور آثار حضرات صحابہ کرام رضؓ و تابعینؒ وغیرہم نقل کرنے کے بعد اپنی عادت کے مطابق نظر فقہی اور عقلی دلیل یوں بیان کی ہے۔ اگر کوئی شخص رکوع کی حالت میں امام کے ساتھ شریک ہوجاتے اور سورۂ فاتحہ اس سے کلیتہً چھوٹ چکی ہو تو جمہور اہلِ اسلام کے نزدیک (جس کی تحقیق اپنے مقام پر آئیگی۔ اور دو مرفوع روایتیں اور متعدد حضرات صحابہ کرامؓ کے اقوال پہلے نقل بھی ہوچکے ہیں) اس کی وہ رکعت بالکل صحیح اور درست ہے۔ اگر تکبیر تحریمہ اور قیام (جس میں کم از کم تکبیر تحریمہ ادا ہوسکتا ہو) کی طرح مقتدی پر سورۂ فاتحہ بھی پڑھنی لازم اور فرض اور رکن ہوتی تو جیسے تکبیر تحریمہ اور قیام اس سے ساقط نہیں ہوتے اسی طرح اس پر سورہ فاتحہ کا پڑھنا بھی فرض ہوتا اور بغیر اس کے اس کی نماز نہ ہوسکتی۔ حالانکہ جمہور کے نزدیک اس کی یہ رکعت بالکل صحیح ہے۔ اس سے معلوم ہوا کہ مقتدی پر سورۂ فاتحہ کا پڑھنا ضروری نہیں ہے۔ وہو المطلوب (محصلہ طحاوی جلد ا صد ۱۲۸) مؤلف خیر الکلام کہتے ہیں کہ رکوع میں ملنے سے رکعت کا ہوجانا ان احادیث کے منافی نہیں جن میں آتا ہے کہ نماز میں ایک بار فاتحہ پڑھنی چاہیے جیسا کہ ہدایہ اور فتح الباری کے حوالہ سے گذر چکا ہے۔ ہاں ان احادیث کے منافی ہے

جن میں ہر ہر رکعت میں فاتحہ کا ذکر آتا ہے اس صورت کو خاص کر لیا جائے گا یا عذر شرعی پر محمول ہوگا۔ (محصلہ ص ۵۳۶)

الجواب: جس طرح یہ صورت رکوع والی رکعت کے منافی نہیں، اسی طرح یہ ان احادیث کے عین مطابق ہے جن میں قرأت صرف امام کا فریضہ بتلایا گیا ہے باقی مقتدی کے لیے ہر ہر رکعت میں بلکہ کسی بھی رکعت میں قرأت کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا، اس لیے نہ تو یہاں منافاۃ کا سوال ہے اور نہ تخصیص اور عذر شرعی پر حمل کرنے کی ضرورت پیش آتی ہے۔

دسویں دلیل: بحر العلوم، حجۃ الاسلام اور شیخ الاسلام حضرت مولانا محمد قاسم نانوتوی رح (المتوفی ۱۲۹۷ھ) بانی دار العلوم دیوبند نے عقلی رنگ میں یہ مسئلہ یوں سمجھانے کی کوشش کی ہے کہ ہر چیز کا صرف ایک طول اور ایک ہی عرض ہوتا ہے۔ سو باعتبار طول کے ایک رکعت ایک نماز ہے اور ہر رکعت میں سورۂ فاتحہ کا پڑھنا ضروری ہے۔ اور باعتبار عرض کے امام اور مقتدی کی نماز ایک ہے۔ تو یہاں بھی ایک ہی سورۂ فاتحہ کافی ہوگی جس کو امام ادا کر رہا ہے۔ اور اگر امام اور مقتدی کے لیے الگ الگ اور جدا جدا سورۂ فاتحہ ضروری ہو تو اس سے یہ لازم آئے گا کہ ایک چیز کے لیے ایک سے زیادہ عرض ثابت ہو اور یہ اصول موضوعہ کے خلاف ہے (توثیق الکلام صہ۹، تبغییر) مؤلف خیر الکلام لکھتے ہیں کہ ہر رکن چونکہ امام اور مقتدی کو الگ الگ ادا کرنا پڑتا ہے پس قرأت بھی ہر ایک کو الگ الگ ادا کرنی چاہیے۔ (بلفظہ صہ۵۳۶)

الجواب: جب قرأت مقتدی کے لیے رکن ہی نہیں تو اس کے لیے الگ پڑھنے کا کیا سوال؟ مقتدی کا رکن تو صرف استماع و انصات ہے جس کو وہ ادا کر رہا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ مازاد علی الفاتحہ کی قرأت آپ حضرات کے نزدیک بھی مقتدی پر نہیں ہے۔

گیارھویں دلیل: مولانا موصوف رح فرماتے ہیں کہ بسلسلۂ قرأت امام اور مقتدی کی مثال ایسی سمجھ لیں جیسے سواری اور مسافر، مسافر کا کام صرف یہ ہے کہ وہ گاڑی، موٹر، بس، جہاز اور تانگہ وغیرہ میں اطمینان سے سوار ہو کر بیٹھ جائے۔ گاڑی وغیرہ حرکت کرے گی تو مسافر کی مسافت خود بخود طے ہوتی جائے گی اور مسافر کو ساتھ ساتھ دوڑنے کی ضرورت نہیں ہے۔ بالذات حرکت گاڑی کی ہے مگر بالعرض مسافر کی۔ اور باوجودیکہ مسافر آرام کے ساتھ گاڑی وغیرہ میں

بٹھا رہتا ہے۔ یہ کہنا صحیح ہے اور کوئی اس کا انکار نہیں کر سکتا کہ مسافر نے اتنا راستہ طے کیا ہے۔ اسی طرح امام جو بمنزلہ گاڑی کے ہے قرأت کرتا جائے گا اور یہی قرأت مقتدی کو کافی ہو گی (توثیق الکلام ص۱، ص۲ تبغیہ) مولانا کا یہ فرمانا بالکل صحیح ہے کیونکہ ما زاد علی الفاتحۃ کی قرأت میں فریق ثانی بھی متفق ہے کہ امام کی قرأت مقتدیوں کو کافی ہے اور اگر سورۂ فاتحہ کی قرأۃ مقتدیوں کو کافی نہ ہو تو اس مثال کے پیشِ نظر مطلب یہ ہو گا کہ ایک دو اسٹیشن تک مسافر گاڑی کے ساتھ ساتھ بھاگتا چلا جائے اور پھر گاڑی میں بیٹھ جائے۔ جہاں تک گاڑی کا تعلق ہے اس کا سفر خود بخود طے ہوتا جائے گا۔ لیکن طبعی، شرعی اور دیگر ضروریات میں خود کوشش اور کاوش کرنی پڑے گی۔ اور بغیر اپنی ہمت اور حرکت کے دیگر ضرورتیں پوری نہیں ہوں گی۔ مشہور ہے کہ حرکت ہی میں برکت ہوتی ہے۔ اسی طرح جب گاڑی کی مسافت طے ہو جائے گی تو اپنے گاؤں محلہ اور گھر تک پہنچنے کے لیے خود عمل کی ضرورت ہے، اس لیے امام بمنزلہ گاڑی تو ہے لیکن صرف قرأت کی مسافت میں باقی رکوع وسجود، تسبیح وتشہد وغیرہ میں مقتدی کو خود ہی کچھ کرنا ہو گا۔ مؤلف خیر الکلام کا امام کی نماز کو حقیقت اور مقتدی کی نماز کو مجاز سمجھ کر جواب میں دونوں کی نماز کو حقیقتہً سے تعبیر کرنا اور اس پر جواب کی بنیاد رکھنا بالکل غلط ہے نماز تو امام اور مقتدی دونوں کی حقیقتہً ہے، ہاں قرأت میں فرق ہے، امام حقیقی قرأت کرتا ہے اور مقتدی کی قرأت حکمی ہے اور ہم نے کتاب میں اس کی تصریح کر دی تھی کہ اس لیے امام بمنزلہ گاڑی تو ہے لیکن صرف قرأت کی مسافت میں ... الخ لہٰذا مؤلف مذکور کا ہماری عبارت سے مقتدی کی نماز کو مجاز سمجھنا غلط ہے۔

بارھویں دلیل: شمس العلماء مؤرخِ اسلام علامہ شبلی نعمانی رحمہ اللہ (المتوفی ۱۳۳۲ھ) نے حضرت امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ کے حالات میں ایک واقعہ نقل کیا ہے (جس کا خلاصہ راقم کی عبارت میں یہ ہے) کہ چند آدمی[1] مل کر مسئلہ خلف الامام پر امام صاحب رحمہ اللہ سے بحث کرنے آئے، آپ نے فرمایا کہ میں

---

[1] یہ واقعہ مناقب موفق جلد ا ص۱۷۲ و ص۱۷۳ میں مذکور ہے ان جماعۃ من اھل المدینۃ جاؤا الی ابی حنیفۃ رحمہ لیناظروہ فی القرأۃ خلف الامام اھ اور اسی طرح مناقب کردری جلد ا ص۱۴۲ میں بھی ہے اور نواب صاحب رحمہ اللہ بھی اس واقعہ کو تسلیم کرتے ہیں چنانچہ لکھتے ہیں۔ وحکایتی کہ از امام اعظمؒ در بارۂ الزام خصم باختیار یکی برائے مناظرہ از میان جماعۃ وبودن الزام او الزام جماعۃ نقل کردہ اند (باقی اگلے صفحہ پر)

اکیلا اتنے آدمیوں سے کیسے بحث کر سکتا ہوں؟ ایک آدمی کو اپنا وکیل اور مختار بنا لو کہ اس کی فتح تمھاری فتح اور اس کی شکست تمھاری شکست متصور ہو، چنانچہ وہ سب اس پر راضی ہو گئے اور اپنا ایک وکیل انھوں نے انتخاب کر لیا جب وکیل نے بحث شروع کی۔ تو حضرت امام صاحبؒ نے فرمایا کہ مسئلہ تو حل ہو چکا ہے۔ وہ بولا کیسے؟ امام صاحبؒ نے فرمایا کہ جب تم اکیلے سب کی طرف سے وکیل ہو کر گفت گو کر رہے ہو اور تمھاری بات ان سب کی بات سمجھی جاتی ہے تو اسی طرح امام کی قرأت سب مقتدیوں کی قرأت سمجھی جائیگی۔ وہ سب شکست تسلیم کرتے ہوئے لاجواب ہو کر چلے گئے۔ (سیرت النعمان ا صفحہ ۵۱)

مبارک پوری صاحبؒ نے اس پر یہ اعتراض کیا ہے کہ امام صاحبؒ کی طرف اس واقعہ کی نسبت غلط ہے۔ کیونکہ امام جب وکیل ہے تو قیام، رکوع، سجود، تشہد اور سلام وغیرہ جملہ امور میں امام کو وکیل ہونا چاہیئے۔ (بمعناہ تحقیق الکلام جلد ۲ ص) لیکن مبارکپوری صاحبؒ کا یہ اعتراض محض ہیچ اور باطل ہے۔ اس کی پوری تشریح گذر چکی ہے کہ امام مقتدیوں کا وکیل صرف قرأتِ قرآن میں ہے، باقی امور میں ان کا وکیل نہیں ہے اور اس کو ایسا سمجھ لیں جیسے بادشاہ کے حضور میں ایک وفد اپنی معروضات پیش کرنے کے لیے حاضر ہو۔ گفت گو تو صرف وفد کا وکیل اور پارٹی لیڈر ہی کرے گا۔ لیکن ارکان وفد کی طرف سے پارٹی لیڈر کی تائید بھی ضروری ہے، قرأتِ قرآنِ کریم کو اصل معروضات اور تسبیحات و تشہد وغیرہ کو اس کی تائید سمجھ لیجئے۔

نواب صاحبؒ کی یہ عبارت نقل کی جا چکی ہے کہ منہی عنہ نزد قرأت امام ہمہ قرأت قرآنِ کریم است فقط (دلیل الطالب ص۲۹۴) اور دوسرے مقام پر لکھتے ہیں کہ وقول نبوی صلعم اذا قرأ فانصتوا وقول من کان لہ امام فقرأۃ الامام لہ قرأۃ دال است برآنکہ امام متحمل قرأت است از سامع (بدور الاہلہ ص ۵۱) اس لیے مبارک پوری صاحبؒ کا یہ اعتراض (باقی پچھلا صفحہ) لطیفہ شاعرانہ و مجرد تجویز عقلی بیش نیست در مقام استدلال و احتجاج بنصوص قابل التفات نمی تواند شد اھ (ہدایۃ السائل ص ۲۰۴) ہم نے بھی اس واقعہ کو قرآن و حدیث کے دلائل کی مد میں پیش نہیں کیا بلکہ عقلی دلائل میں نقل کر کے نواب صاحبؒ کی عقلی تجویز کی تائید کی ہے۔

سراسر باطل ہے۔ اور حضرت امام ابوحنیفہؒ کا ارشاد سو فی صدی صحیح ہے۔ مؤلف خیر الکلام ص ۵۳۷ میں لکھتے ہیں کہ امام وکیل نہیں بلکہ مقتدی ہے اور ہر نمازی صرف اپنے لیے نماز پڑھتا ہے اور ہر نمازی رب سے باتیں کرتا ہے اور مناجات صرف فاتحہ پڑھنے میں ہوتی ہے اور فاتحہ فرض ہے اور دعا ہے اور یہ امام اور مقتدی دونوں پر لازم ہے۔ (محصلہ)

الجواب: جب صحیح حدیث میں الامام ضامن آتا ہے تو اس کی کفالت اور ضمانت کا انکار کون سنتا ہے؟ وہ مقتدی بھی ہے اور کفیل بھی ہے۔ مقتدی تمام ارکان وافعال میں ہے اور کفیل صرف قرأت میں ہے اور نمازی نماز خدا تعالیٰ کے لیے پڑھتا ہے جس کا ثواب نمازی کو ملتا ہے اور بے شک نمازی اللہ تعالیٰ سے مناجات کرتا ہے مگر وہ مناجات صرف ثناء اور تسبیحات وغیرہ ہی میں ہے قرأت میں تو اس کو صرف انصات واستماع کا حکم ہے جیسا کہ اس کے دلائل گذر چکے ہیں اور مناجات کو صرف فاتحہ میں بند کر دینا عقلاً اور نقلاً باطل ہے۔ سارا قرآن کریم اللہ تعالیٰ سے مناجات ہے اور سب تسبیحات اس سے سرگوشی ہے اور اول سے آخر تک نماز اس سے ہم کلامی ہے۔ باقی امور میں اصالتہً مقتدی خود عمل کرتا ہے اور قرأۃ میں اس کا امام وکالتہً سرگوشی کرتا ہے اور فاتحہ صرف امام پر لازم ہے۔ مقتدی کا فریضہ صرف انصات واستماع ہے، مقتدی پر فاتحہ فرض نہیں ہے۔ فاتحہ دعاء ہے، لیکن مقتدی حکماً دعا خواں ہے اور آمین سے اس کی تصدیق کرتا ہے۔

حضرات! ابھی ترجیحی، عقلی اور قیاسی دلائل اور بھی پیش کیے جا سکتے ہیں مگر ہمارا مقصد دلائل کا استقصاء اور استیعاب نہیں ہے، بلکہ عامۃ المسلمین کو یہ بتلانا مقصود ہے کہ ترک القرأۃ خلف الامام صرف احناف ہی کا مسلک نہیں ہے بلکہ جمہور اہلِ اسلام کا مسلک ہے اور جمہور اپنے اس محقق مسلک پر قرآنِ کریم، صحیح احادیث، آثار حضرات صحابہ کرامؓ، تابعینؒ واتباع تابعینؒ وغیرہم اور اجماعِ اُمت اور قیاس سے ٹھوس وزنی اور صحیح معیاری دلائل اور براہین پیش کرتے ہیں اور وہ ہرگز بلادلیل نہیں ہیں جیسا کہ

آپ ملاحظہ فرما چکے ہیں۔ اب ہم بطور تبرک اس باب کو قرآن کریم کی ایک آیت کے ایک حصہ پر ختم کرتے ہیں، جیسا کہ پہلا باب بھی قرآن کریم کی آیت ہی سے شروع ہوا تھا۔ کہ اوّل باآخر نسبتے دارد۔ اِنَّ عِدَّةَ الشُّهُوْدِ عِنْدَ اللّٰهِ اثْنَا عَشَرَ شَهْرًا۔ اور آخر میں نہایت اخلاص اور دلسوزی کے ساتھ فریق ثانی سے استدعا ہے کہ وہ اپنے اس غلو آمیز نظریہ سے باز آجائے۔ کہ جو شخص امام کے پیچھے ہر رکعت میں سورۂ فاتحہ نہ پڑھے۔ اس کی نماز ناقص ہے، کالعدم ہے، بیکار ہے اور باطل ہے۔ اِس پوری کتاب کو پیش نظر رکھ کر انصاف سے فرمائیں کہ کس کس کی نماز باطل، کالعدم، بیکار اور ناقص ہوگی؟ غور تو کیجئے کہ جمہور امت کی نمازوں پر یہ حکم لگانا کیسی کھلی گستاخی اور بے ادبی ہے۔ اور گویا اس اعلان کے مطابق جمہور امت نماز پڑھتے ہوئے بھی بے نماز ہی ٹھہرے اور تارک صلوٰۃ کے بارے میں جو حدیثیں وارد ہوئی ہیں وہ کس مسلمان سے مخفی ہو سکتی ہیں؟ فریق ثانی نے احناف کے مقتدر علماء حضرت مفتی محمد کفایت اللہ صاحبؒ و حضرت شیخ الاسلام مولانا شبیر احمد عثمانی رح اور حضرت شیخ العرب والعجم مولانا حسین احمد صاحب مدنی رح کی خدمت میں یہ اعلان پیش کیا ہے، جیسا کہ ان کا دعویٰ ہے۔ راقم الحروف، دار العلوم دیوبند کا خوشہ چین اور ان اکابر کے فضالہ علم اور پس خوردہ سے فیضیاب ہوا ہے۔ اس لیے اس حقیر پر یہ لازم تھا کہ اپنے محسن اکابر کا مسلک بیان کرتا اور ان سے سوءِ ظن کو دور کرتا۔ نیز فقیر فروعی مسائل میں اپنے اکابر کی طرح حنفی ہے۔ اس لیے فریق ثانی کا یہ مطالبہ بھی پورا ہو جاتا ہے۔ مگر آج تک ہمارے کسی حنفی بھائی کو یہ توفیق نہ ہوئی۔ کہ وہ امام کے پیچھے سورۂ فاتحہ نہ پڑھنے کی ایک ہی صحیح صریح مرفوع حدیث پیش کر کے انعام لے (بلفظہ فصل الخطاب ص۱) اور انعام کی بابت وہ یوں لکھتے ہیں اور مخالفین کو ایک ہزار روپے کا انعامی کھلا چیلنج دیا ہے (بلفظہ فصل الخطاب ص۱) اب فریق ثانی کو دیانتہً از خود ہی یہ انعام دے دینا چاہئے۔ ورنہ اگر ہم چاہیں تو قانونی اور آئینی طور پر لے سکتے ہیں اور انہیں دینا پڑے گا۔ اور اس سے کیا کم ہے کہ۔۔۔ ع: شادم کہ از رقیباں دامن کشاں گذشتی

حضرات! آپ دیکھ چکے کہ ہمارا مسلک کیا ہے اور اس کے دلائل کیا ہیں؟ ۔۔۔ ع

قیاس کن زگلستانِ من بہارِ مرا

آخری التماس۔ مجھے اس کا پورا احساس ہے کہ جس طرح جمہور اہلِ اسلام کے دلائل اور براہین پیش کرنے کا صحیح حق تھا، میں ادا نہیں کر سکا۔ اہلِ علم حضرات سے التماس اور التجاء ہے کہ وہ مجھے میری کوتاہیوں اور لغزشوں پر مطلع فرماتے رہیں۔ کیونکہ ایک نوعمر آدمی سے جس کو اپنی بے بضاعتی اور کم علمی کا بھی پورا احساس اور اقرار ہو۔ اور ایسے اہم مسئلہ میں جس میں حضرت امام بخاریؒ اور حضرت امام بیہقیؒ وغیرہ ائمہ حدیث اور فرسانِ علم نے خامہ فرسائی کی ہو، لغزشوں کا صادر ہو جانا کچھ بعید نہیں ہے اور اللہ تعالیٰ سے نہایت اخلاص اور صدقِ دل سے دعاء ہے کہ وہ حقیر کو جملہ جسمانی و روحانی، ظاہری اور باطنی بیماریوں سے محفوظ رکھے۔ اور کتاب اللہ اور سنت رسول صلی اللہ تعالیٰ علیہ وآلہ وسلم پر عمل کرنے کی توفیق عطا فرمائے۔ اور حضرات صحابہ کرامؓ، محدثینؒ اور فقہاءؒ اور جمہور اہلِ اسلام کی محبت اور اطاعت کا صحیح جذبہ عطا فرمائے جن کا ذکر موجبِ رحمتِ خداوندی ہے ؎

چلنے میں آگیا کہاں لپٹی ہیں اڑ کے مستیاں
اتنی ہے تند مے یہاں مست ہوں اور پی نہیں

جلد دوم میں فریقِ ثانی کے پیش کردہ دلائل کا جائزہ لیا جائے گا کہ ان کی حقیقت کیا ہے؟ وصلی اللہ تعالیٰ علیٰ خیر خلقہ محمد وعلیٰ آلہ واصحابہ ومتبعیہ اجمعین۔

ابو الزاہد محمد سرفراز خاں صفدر
خطیب جامع گکھڑ ضلع گوجرانوالہ
۳ رمضان المبارک ۱۳۷۴ھ مطابق
۲۵ اپریل ۱۹۵۵ء

پہلا باب

فریق ثانی کا یہ دعویٰ ہے کہ جو شخص امام کے پیچھے ہر رکعت میں سورۂ فاتحہ نہ پڑھے اس کی نماز ناقص ہے کالعدم ہے، بیکار ہے اور باطل ہے۔ انصاف اور دیانت کا تقاضا تو یہ تھا کہ جیسے ہم نے حضرات صحابہ کرامؓ اور تابعینؒ سے متعدد صحیح روایتیں پیش کی ہیں کہ آیت واذا قرئ القراٰن الاٰیۃ کا شان نزول نماز ہے اور اس پر اجماع بھی ہے اسی طرح فریق ثانی بھی کم از کم کسی ایک ہی صحابی سے بسند صحیح یہ روایت نقل کر دیتا کہ فلاں آیت کا شانِ نزول یہ ہے کہ امام کے پیچھے قرأت کرنا صحیح بلکہ ضروری اور واجب ہے اور خاص طور پر سورۂ فاتحہ کا پڑھنا لازمی ہے اور اس کے بغیر اس کی نماز کالعدم ہے بیکار ہے، اور باطل ہے مگر یقین کیجئے کہ دنیا کے کسی اسلامی کتب خانہ میں کوئی ایسی اسلامی کتاب موجود ہی نہیں ہے جسمیں کسی صحابی سے صحیح اور متصل سند کے ساتھ یہ روایت موجود ہو کہ فلاں آیت اس بارے میں نازل ہوئی ہے کہ امام کے پیچھے مقتدیوں پر سورۂ فاتحہ کی قرأت ضروری ہے ورنہ نماز باطل اور کالعدم ہوگی یہ ہے ھل من مبارز میدان کا صحیح مقام، مگر نہ معلوم فریق ثانی اس سے کیوں اغماض کر جاتا ہے ہکیا ہے کوئی خوش نصیب اور زندہ دل غیر مقلد بھائی جو یہ مطالبہ پورا کر دے اور جیسے ہم نے حضرت عبد اللہؓ بن مسعود اور حضرت عبد اللہؓ بن عباسؓ جیسے مفسر قرآن صحابہؓ سے صحیح اسانید کے ساتھ آیت کا شانِ نزول بیان کیا ہے ایسا ہی وہ بھی کسی ایک صحابی سے آیت کا شانِ نزول نقل کر دے (دیدہ باید) باقی انعامی چیلنج کا رعب تو راقم الحروف کثیر العیال اور مفلوک الحال آدمی ہے۔ نہ مال ہے اور نہ لاف وگزاف اور ڈھینگیں مارنے کی عادت ہے۔ دلائل آپ کے سامنے ہیں جو بیان کر دیئے گئے ہیں۔ لیکن بایں ہمہ کوئی ایسی کوئی آیت فریق ثانی پیش نہیں کر سکتا جس کا حضرات صحابہ کرامؓ

اور تابعینؒ سے صحیح اور متصل سند کے ساتھ شان نزول یہ ثابت ہو چکا ہو کہ امام کے پیچھے سورۃ فاتحہ کی قرأت ضروری ہے پھر بھی مجوزین قرأت خلف الامام نے قرآن کریم کی آیات سے اس مدعٰی پر استدلال واحتجاج کرنے کی ناکام سعی کی ہے۔ ہم ان کے قرآنی استدلالات نقل کر کے ان کا صحیح محل عرض کرتے ہیں اور فریق ثانی کی خامی بھی عرض کر دیتے ہیں تاکہ مسئلہ زیر بحث کا کوئی پہلو تشنہ نہ رہے اور حق بات بھی سامنے آجائے۔

پہلی آیت:۔ حضرت امام بیہقیؒ فرماتے ہیں کہ ہر نمازی اپنے لیے نماز پڑھتا ہے اور قرأت نماز کا ایک حصہ ہے یہ کیسے ہو سکتا ہے کہ بعض نماز تو خود مقتدی ادا کرے اور بعض (یعنی قرأۃ سورۃ فاتحہ) اس کا امام ادا کرے حالانکہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے اَنْ لَّیْسَ لِلْاِنْسَانِ اِلَّا مَا سَعٰی (پ ۲۷، سورۃ نجم، رکوع ۲) اور یہ کہ آدمی کو وہی ملتا ہے جو اس نے کمایا۔

اور اسی طرح ایک اور مقام پر ارشاد ہوتا ہے لِتُجْزٰی کُلُّ نَفْسٍ بِمَا تَسْعٰی (پ ۱۶، سورۃ طٰہٰ رکوع ۱) تاکہ بدلہ ملے ہر شخص کو جو اس نے کمایا ہے۔

اس سے معلوم ہوا کہ امام کی قرأت صرف اس کے لیے ہے اور مقتدی کو الگ سورۃ فاتحہ پڑھنی ہوگی۔ (محصلہ کتاب القرأۃ ص ۵۷/۱۴۱) اور یہی کچھ تھوڑے بہت تغیر کے ساتھ خیر الکلام ص ۹۱ میں کہا گیا ہے۔

جواب:۔ یہ استدلال محض باطل ہے اوّلاً اس لیے کہ کسی صحابی یا تابعی سے بسند صحیح ثابت نہیں کہ ان آیتوں کا شانِ نزول قرأۃ خلف الامام کا مسئلہ ہے اور خاص طور پر سورۃ فاتحہ کا پڑھنا ان سے ثابت ہے اور نہ ان آیتوں میں سورۃ فاتحہ اور قرأت کا اور امام و مقتدی کا کوئی لفظ ہی موجود ہے اس لیے دعوٰی کا دلیل سے معمولی سا تعلق بھی نہیں ہے، بلاشک قرآن کریم کی کوئی آیت اور حکم شانِ نزول پر بند نہیں اور قرآن کریم قیامت تک اقوام عالم کے لیے دستور ہے لیکن اگر کسی مسئلہ کے استدلال پر کوئی ایسی آیت پیش کی جائے جس سے نہ تو حضرات صحابہ کرامؓ نے وہ مسئلہ سمجھا ہو۔ اور نہ تابعینؒ نے اور نہ وہ مسئلہ اس کا شانِ نزول ہو تو یقیناً وہ کشید ہوگا۔ مؤلف خیر الکلام اس نقطہ کو نہیں سمجھے یا بالکل پی گئے ہیں۔ وثانیاً پہلے تو قرأت کا فریضہ صرف امام پر ہے مقتدی پر نہیں اور اگر تسلیم بھی کر لیا جائے جیسا کہ بقول مؤلف خیر الکلام فیض الباری کی ایک عبارت سے معلوم ہوتا ہے کہ مقتدی پر بھی قرأت ہے لیکن امام اس کا متحمل ہے تو کیا امام بیہقیؒ وغیرہ کے نزدیک امام کا سُترہ اور سہو وغیرہ مقتدیوں کو کافی نہیں ہے؟ یہ کہنا کہ اسی طرح جماعت کی

صورت میں امام کے آگے سُترہ کا کفایت کرنا اس لیے نہیں کہ امام کا سُترہ مقتدی کو کفایت کرتا ہے بلکہ اصل بات یہ ہے کہ جیسے استقبال کعبہ مقتدی کا فعل ہے اور وہ ہر نمازی سے مطلوب ہے اسی طرح نمازی کے آگے سُترہ کا ہونا ہر نمازی سے مطلوب ہے اگر ایک نمازی ہو تو اس کے آگے ہو اگر جماعت نماز پڑھے تو امام کے آگے ہو جیسے کعبہ ایک ہے اور سب کا ہے اسی طرح سُترہ اگرچہ ایک ہے مگر سب کا ہے نہ خاص امام کا نہ خاص مقتدی کا اھ (خیر الکلام ص۶۵ محصلہ) ان کے لیے سود مند نہیں بلکہ نری ضرع الوقتی ہے۔ اوّلاً تو اس لیے کہ سترۃ الامام سترۃ لمن خلفہ (بخاری جلد ۱ ص۷۱) ایک مسلّمہ قاعدہ ہے پھر اس کا انکار کون تسلیم کرتا ہے و ثانیاً یعنہ یہی دلیل بسلسلۂ قرأت ہماری طرف سے سمجھے کہ منفرد ہو تو اس پر قرأت لازم ہے جماعت کی نماز ہو تو امام کی قرأت مقتدی کے لیے ہے جیسے کعبہ ایک ہے اور سب کا ہے اسی طرح قرأت بھی ایک ہے مگر سب کی ہے نہ خاص امام کی نہ خاص مقتدی کی جیسے مذکورہ دلیل میں باوجود یکہ سُترہ امام کے آگے ہے مگر سب کا ہے، اسی طرح قرأت بھی بظاہر امام کر رہا ہے مگر سب کی ہے جیسے نمازی سے مطلوب یہ ہے کہ سترہ اس کے آگے کی جانب ہو یہ مطلوب نہیں کہ ہر نمازی اس کو گاڑے اسی طرح قرأت میں بھی یہی مطلوب ہے کہ آگے امام قرأت کرے اور مقتدی نہیں نہ یہ کہ سب مقتدی قرأت کریں۔ اور کیا جہری نمازوں میں امام کا جہر مقتدیوں کو کافی نہیں ہے؟ اور کیا ما زاد علی الفاتحہ میں امام کی قرأت مقتدیوں کو کفایت نہیں کرتی؟ دوسری باتوں میں نیابت اور کفالت کا مسئلہ تو الگ رہا نفس نماز میں یہ آیتیں امام بیہقیؒ کے مخالف پڑتی

بیماری اور عجز کے وقت حج کے سلسلے میں نیابت فدین اللہ احق بالقضاء کے تحت جمہور کا مسلک ہے اور من مات وعلیہ صوم صام عنہ ولیہ پر فریق ثانی کا خاصا اصرار ہے و علیٰ ہذا نکاح اور طلاق وغیرہ میں وکالت و نیابت امام بیہقیؒ کے قاعدہ کے خلاف پڑتی ہے اور مالی طور پر ایصال ثواب میں تمام اہل السنت کا اتفاق ہے (دیکھئے نووی ج۱ ص۱۲ و ص۳۲۴ و شرح فقہ اکبر ص۱۵۸) اور منکرین حدیث کا ایصال ثواب کے انکار پر ان آیتوں کو پیش کرنا صحیح نہیں ہے کیونکہ میت نے اپنی زندگی میں کوشش کر کے علم حاصل کیا، شادی کی اور اولاد پیدا ہوئی، مگر دوستوں کی اعانت کی اچھے اخلاق سے برتاؤ کر کے لوگوں کو اپنا گرویدہ بنا لیا اسکی وفات کے بعد لوگوں نے اسکو ایصال ثواب کیا تو اسکو اپنی ہی کوشش کا ثمرہ اور پھل ملا وان لیس للانسان الا ما سعیٰ لہٰذا یہ آیتیں ایصال ثواب کی دلیل میں نہ کہ انکار کی رد دیکھئے کتاب الروح ص۱۵۰ للحافظ ابن القیمؒ و شرح عقیدۃ الطحاوی ص۳۸۴ وغیرہ اجیں سطحی قسم کے لوگوں نے اس آیت کریمہ کو ایصال ثواب کے انکار کے لیے حجت گردانا ہے انکو معلوم ہونا چاہیئے کہ یہ تو قرآن کے خلاف جاتی ہے لیکن ہر بات میں فہم اور تسلیم شرط ہے جو فہم سے محروم ہو اور تسلیم کے لیے آمادہ نہ ہو اس کو بھلا دلائل سے کیا فائدہ حاصل ہو سکتا ہے!۔

ہیں۔ مؤلف خیر الکلام کا یہ کہنا کہ ماذاد علی الفاتحہ اور جہر مقتدی پر ہے ہی نہیں یہ امام کا فریضہ ہے۔ (محصلہ ص۲۷) ہمیں مضر نہیں کیونکہ ہم بھی یہی کہتے ہیں کہ قرأۃ امام کا فریضہ ہے مقتدی کا فریضہ صرف استماع و انصات ہے۔ رہا ان آیتوں کا مطلب تو بالکل واضح ہے کہ توحید و رسالت اور معاد وغیرہ کے بنیادی عقیدوں اور اصولی امور میں جہاں کسی دوسرے کی نیابت اور وکالت کام نہیں آسکتی وہاں ہر ایک کو اپنا عقیدہ اور عمل ہی کام آئے گا وَاَنْ لَّيْسَ لِلْاِنْسَانِ اِلَّا مَا سَعٰى اور جہاں نیابت اور وکالت درست ہے، اتو وہاں بھی اصل اور موکل کی محنت اور مشقت کار فرما ہے کہ اس نے اپنا نائب اور وکیل مقرر اور انتخاب کیا ہے اور اس کو اپنی ہی کوشش اور سعی کا نتیجہ ملتا ہے عام اس سے کہ اس کی سعی بالواسطہ ہو یا بلا واسطہ وہ اس کا موجد ہو یا عامل، داعی ہو یا سبب، علت سب کی ایک ہے۔

دوسری آیت:۔ امام بیہقیؒ اور مولانا عبد الصمد صاحب پشاوریؒ وغیرہ فرماتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے

وَاذْكُرْ رَّبَّكَ فِىْ نَفْسِكَ تَضَرُّعًا وَّخِيْفَةً وَّ دُوْنَ الْجَهْرِ مِنَ الْقَوْلِ بِالْغُدُوِّ وَالْاٰصَالِ وَلَا تَكُنْ مِّنَ الْغٰفِلِيْنَ (پ۹، اعراف، ۲۴)

اور یاد کرتا رہ اپنے رب کو اپنے دل میں گڑگڑاتا ہوا اور ڈرتا ہوا اور ایسی آواز سے جو کہ پکار کر بولنے سے کم ہو صبح کے وقت اور شام کے وقت اور مت رہ بے خبر۔

ان اکابر کا کہنا ہے کہ یہ آیت امام اور مقتدی کو نیز جہری اور سری تمام نمازوں کو شامل ہے اور سورۂ فاتحہ وغیر فاتحہ کی قرأت کو عام ہے، اس سے ثابت ہوا کہ مقتدی کو امام کے پیچھے سورۂ فاتحہ کی اپنے دل میں آہستہ آہستہ قرأت کرنا صحیح ہے اور امام بیہقیؒ اپنی سند کے ساتھ یہی مطلب اس آیت کا حضرت زیدؒ بن اسلمؒ سے نقل کرتے ہیں اور فرماتے ہیں کہ وہ علماء تابعینؒ میں بڑے پایہ کے مفسر تھے۔ (محصلہ کتاب القرأۃ ص۸۲ و اعلام الاعلام ص۱۹۰) اور حافظ ابن تیمیہؒ نے سری نمازوں میں امام کے پیچھے قرأت کے جواز میں یہ آیت پیش کی ہے (ملاحظہ ہو فتاوی ص ۱۴۹/۲ج) اور مؤلف خیر الکلام نے بھی اس استدلال کا ذکر کیا ہے۔ (ملاحظہ ہو خیر الکلام ص۹۸)

جواب:۔ اس آیت سے امام کے پیچھے قرأت سورۂ فاتحہ پر استدلال کرنا باطل ہے اوّلاً اگر واقعی اس آیت سے یہ مسئلہ ثابت ہوتا تو آنحضرت صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم اور حضرات صحابہ کرامؓ اور جمہور سلف و خلفؒ پر یہ مطلب ہرگز مخفی نہ رہتا چونکہ یہ تفسیر صحیح حدیث اور حضرت ابن مسعودؓ اور ابن عباسؓ کی صحیح تفسیر کے (جس کا حوالہ کے ساتھ ذکر جلد اوّل میں ہو چکا ہے) مخالف ہے اس لیے

یہ قابل قبول نہیں ہے لہذا اس کی صحت میں کلام ہے وثانیاً تو اس آیت میں امام کا لفظ ہے اور نہ مقتدی کا نہ قرأت کا اور نہ سورۂ فاتحہ کا مطلق ذکر کو خود ساختہ قیود میں جکڑنا کیوں کر صحیح ہو سکتا ہے؟ علاوہ ازیں اگر آیت کا عموم ملحوظ رکھا جائے تو کیا فریق ثانی سورۂ فاتحہ کے علاوہ کسی اور قرأت کو مقتدی کے لیے تسلیم کرے گا؟ اگر نہیں تو کیوں؟ جو جواب وہ غیر سورۂ فاتحہ کا دے گا۔ فهو جوابنا عن الفاتحة اور امام سیوطیؒ نے نتیجۃ الفکر میں لکھا ہے کہ اس آیت میں ذکر سے قلبی ذکر مراد ہے زبان سے پڑھنا مراد ہی نہیں (کذا فی الدلیل المبین ص۳۶۱) لہذا یہ ہمیں مضر نہیں ہے کما لا یخفی۔ وثالثاً اگر واقعی یہ آیت نماز کے بارے میں ہے تو اس سے صرف امام مراد ہوگا نہ کہ مقتدی کیونکہ اذکر اور ربک ولا تکن میں مفرد صیغے اس پر دلالت کرتے ہیں اور اس سے پہلی آیت فاستمعوا له وانصتوا اور لعلکم ترحمون میں مقتدیوں کو خطاب ہے کیونکہ یہ تمام جمع کے صیغے ہیں جو تقابل کی صورت میں بیان ہوئے ہیں محض مفرد ہی نہیں جس سے جمع بھی مراد ہو سکتی ہے جس طرح ولکو قرأی میں ہے جس سے مؤلف خیر الکلام کو مغالطہ ہوا ہے اور مطلب یہ ہوگا کہ امام کو سری نمازوں میں اپنے دل میں قرأت کرنی چاہیئے اور مقتدیوں کو استماع اور انصات کرنا ہوگا اور پہلے عرض کیا جا چکا ہے کہ استماع اور ہے اور سماع اور، بلکہ قرآن کریم کی ایک دوسری آیت اور صحیح حدیث اس مطلب کی تائید کرتی ہے اور وہ یہ کہ آنحضرت صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم ابتداء میں حضرات صحابہ کرامؓ کو بلند آواز سے قرأت کر کے نماز پڑھایا کرتے تھے مشرکوں نے آپ کو اور قرآن کریم و جبرئیل علیہ السلام کو سب و شتم کا نشانہ بنایا، آپ نے بحالت امامت اتنی آہستہ قرأت شروع کر دی کہ مقتدی نہیں سن سکتے تھے اللہ تعالیٰ کا یہ حکم نازل ہوا۔

وَلَا تَجْهَرْ بِصَلَاتِكَ وَلَا تُخَافِتْ بِهَا ۔۔۔ اور مت پکار کر پڑھ اپنی نماز اور نہ چپکے پڑھ اور ڈھونڈھ
وَابْتَغِ بَيْنَ ذَٰلِكَ سَبِيلًا (پ۱۵، بنی اسرائیل ۱۲) ۔۔۔ لے اس کے بیچ میں راہ۔

اور انہیں کتابوں میں اس آیت کا مفہوم اعتدال فی الدعاء بھی مذکور ہے (بخاری جلد ۲ ص۶۸۶ و مسلم جلد ۱ ص۱۸۳ و ابو عوانہ جلد ۲ ص۱۲۳) ورابعاً حافظ ابن کثیرؒ کے حوالہ سے پہلے یہ نقل کیا جا چکا ہے کہ مقتدیوں کے لیے اس آیت سے قرأت کرنے کا اثبات (بعید منافٍ للانصات المامور به (تفسیر ابن کثیر جلد ۲ ص۲۸۲) بعید ہے اور انصات کے بالکل مخالف

ہے جس کا مقتدیوں کو حکم ہے بہرحال اس آیت سے مقتدیوں کے لیے نفسِ قرأت پر استدلال کرنا انصاف سے بعید اور حکم خداوندی کے سراسر مخالف ہے چہ جائیکہ سورۂ فاتحہ کی قرأت کا حکم اس سے مقتدیوں کے لیے ثابت ہو سکے۔ مؤلف خیر الکلام نے ص۹۹ میں بحوالہ تفسیر نیشاپوری یہ لکھا ہے کہ آہستہ پڑھنا انصات کے منافی نہیں۔ لیکن ہم پہلے باحوالہ کتب لغت عرض کر چکے ہیں کہ آہستہ پڑھنا بھی استماع و انصات کے بالکل منافی ہے، رہی حضرت زیدؒ بن اسلم کی تفسیر تو وہ درایۃً اور روایۃً قابل توجہ نہیں ہے درایۃً تو آپ حافظ ابن کثیرؒ کے حوالہ سے سن ہی چکے ہیں اور خود حضرت زیدؒ بن اسلمؒ سے قرأت خلف الامام کی ممانعت کی تفسیر منقول ہے چنانچہ امام ابن قدامہؒ لکھتے ہیں۔ وقال زيد بن اسلم وابو العالية كانوا يقرؤن خلف الامام فنزلت واذا قرئ القرآن الآية (مغنی جلد ا ص۶۰۵) زیدؒ بن اسلمؒ اور ابو العالیہؒ فرماتے ہیں کہ لوگ امام کے پیچھے قرأت کرتے تھے اس پر یہ آیت واذا قرئ القرآن الآیۃ نازل ہوئی۔ اور روایۃً بھی یہ صحیح نہیں ہے کیونکہ اس روایت کی سند میں عبد العزیزؒ بن محمدؒ ہے گو وہ ثقہ ہے لیکن ابو زرعہؒ اس کو سئی الحفظ سے اور امام احمدؒ اور ابن حبانؒ اس کو یخطی سے اور ابن سعدؒ ان کو یغلط سے اور ساجیؒ ان کو کثیر الوھم سے تعبیر کرتے ہیں (تہذیب التہذیب جلد ۶ ص۳۵۴) کیا معلوم کہ حضرت زیدؒ بن اسلمؒ نے اس آیت کی کیا تفسیر بیان کی تھی اور راوی مذکور کی غلطی اور وہم سے وہ کیا سے کیا ہو گئی ہے۔ مؤلف خیر الکلام ص۵۷ میں لکھتے ہیں مگر یہ جرحیں بھی بلا سند ہونے کی بنا پر مردود ہیں الخ مگر یہ محض ان کی دفع الوقتی ہے امام ابو زرعہؒ، امام احمدؒ، امام ابن حبانؒ وغیرہ کیا ائمہ جرح و تعدیل نہیں؟ اور معتبر کتب رجال میں ان کے اقوال کیا بلا سند ہیں؟ جب سئی الحفظ وغیرہ کی جرح امام ابو حنیفہؒ وغیرہ پر ہو تو وہ مؤلف مذکور کے نزدیک معتبر ہو اور یہاں مردود ہو آخر اس کی وجہ کیا ہے؟ اور ائمہ جرح کے اقوال کے مقابلہ میں اٹکل پچو باتیں کون سنتا ہے؟ باقی آیت کا مطلب بالکل عیاں ہے جو مطلقاً اللہ تعالیٰ کے ذکر، یاد اور دعا پر مشتمل ہے جیسا کہ دوسرے مقام پر ارشاد ہوتا ہے ادْعُوا رَبَّكُمْ تَضَرُّعًا وَّخُفْيَةً۔ (پ۸، اعراف ۷) پکارو اپنے رب کو گڑگڑا کر اور چپکے چپکے اور ایک مقام پر یوں ارشاد ہوتا ہے۔ تَدْعُوْنَهٗ تَضَرُّعًا وَّخُفْيَةً (پ۷، الانعام، ۸) پکارتے ہو تم اس کو گڑگڑا کر اور چپکے چپکے، اور شیخ الاسلام ابن تیمیہؒ خود بنفسِ نفیس تحریر فرماتے ہیں کہ دعا میں سنت

طریقہ یہ ہے کہ آہستہ دعا کی جائے جیسا کہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے۔ وَاذْكُرْ رَبَّكَ فِي نَفْسِكَ الآیۃ (فتاویٰ جلد ا صلا۱۶۶) خلاصہ امر یہ ہے کہ اس آیت کو مقتدیوں کی قرأت (خصوصاً قرأت فاتحہ) پر دلیل بنانا اندرونی اور بیرونی عقلی اور نقلی تمام دلائل کے سراسر مخالف ہے۔ الغرض اس سے مراد ذکر اور دعا ہے گو خطاب آنحضرت صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کو ہے مگر حکم امت کو ہے گفتہ آید در حدیث دیگراں۔

تیسری آیت:۔ مولوی محمد صادق صاحب (خطیب جامع اہلحدیث قلعہ دیدار سنگھ ضلع گوجرانوالہ لکھتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے وَلَا تَزِرُ وَازِرَةٌ وِّزْرَ أُخْرَىٰ (پ۱۵۔ بنی اسرائیل ۲،) اور کسی پر نہیں پڑتا بوجھ دوسرے کا۔

اس آیت سے ثابت ہوا کہ امام کی قرأت سورۂ فاتحہ مقتدیوں کو کفایت نہیں کر سکتی کیونکہ ایک آدمی کا بوجھ دوسرا کیسے اٹھا سکتا ہے؟ (بحوالہ ازالہ ص۵۸ مؤلفہ جناب مولانا قاضی نور محمد صاحب رحمہ اللہ تعالیٰ المتوفی ۲۲ محرم ۱۳۸۲ھ)۔

جواب:۔ یہ استدلال بھی نہایت کمزور ہے اولاً حضرت مولانا قاضی نور محمد صاحبؒ تحریر فرماتے ہیں کہ شریعت کی اصطلاح میں کسی شئے کو جو از قبیل عبادت ہو وزر ہرگز نہیں کہا جاتا اگر کہیں قرآن اور حدیث میں وزر کا لفظ کسی عبادت پر اطلاق کیا گیا ہو تو پیش کریں ورنہ (سورۃ) فاتحہ کو وزر بنانے سے شرمائیں (بلفظہٖ ازالہ ستر ص۶۲) وثانیاً کیا سورۂ فاتحہ ہی وزر ہے یا ما زاد علی الفاتحہ قرآن کریم کی ایک سو تیرہ ۱۱۳ سورتیں بھی وزر ہیں تو صرف فاتحہ کی تخصیص کیوں کی گئی ہے؟ اور ان میں امام کیوں کفایت کر جاتا ہے؟ اور اگر وہ وزر نہیں تو کس منطق کے رو سے وثالثاً جہری نمازوں میں جہر اور سترہ وغیرہ وزر کو امام کیوں اٹھا لیتا ہے کیا ان میں وزر والا فلسفہ اپنا کام نہیں کرتا؟ عجیب بات ہے کہ جناب رسول خدا صلی اللہ تعالیٰ علیہ وآلہٖ وسلم تو فرماتے ہیں کہ مجھے اللہ تعالیٰ نے ایسی سورت (فاتحہ) عطا کی ہے کہ نہ تو تورات و انجیل اور زبور میں ایسی سورت نازل ہوئی ہے اور نہ قرآن کریم میں اس کی مثال موجود ہے۔ (مشکوۃ جلد ۱ ص۱۸۷ و مؤطا امام مالک ص۲۸ و ترمذی جلد ۲ ص۱۱۱ وقال صحیح) آنحضرت صلی اللہ تعالیٰ علیہ وآلہٖ وسلم تو اس سورت کو نعمت عظمیٰ بتلاتے ہیں مگر مدعیان عمل بالحدیث اس کو وزر سے

تعبیر کرتے ہیں فوا اسفا۔ آیت کریمہ کا مفہوم بالکل ظاہر ہے کہ ہر آدمی صرف اپنا ہی بوجھ اٹھائیگا خواہ وہ اس عمل کا موجد ہو یا مروج عامل بالواسطہ ہو یا بلاواسطہ اپنے ہی کیے کا پھل پائے گا اور وہ مغوی اور مضل جو دوسروں کے گناہوں کو اپنے پیٹے ڈالنے کا مدعی ہے اس کو عدالت عالیہ اور سچی سرکار سے گویا یہ خطاب ہوگا۔ ؎ تجھ کو پرائی کیا پڑی اپنی نبیڑ تو۔ ہاں مگر اغوا اور اضلال چونکہ اس کا اپنا عمل ہے لہذا اس کا بوجھ اس پر ضرور پڑے گا اور گمراہ کرنے پر اپنے کیے کا ضرور پھل پائیگا وہ بری الذمہ نہیں ہوسکیگا۔

الغرض امام کے پیچھے مقتدیوں کے لیے قرأت سورۂ فاتحہ کا اس آیت سے اثبات تحریف قرآن کریم کے مترادف ہے۔ (العیاذ باللہ تعالیٰ)

چوتھی آیت:۔ مولانا محمد اسمٰعیل صاحبؒ (خطیب جامع مسجد اہل حدیث گوجرانوالہ) فرماتے ہیں اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے۔ وَمَنْ اَعْرَضَ عَنْ ذِکْرِیْ فَاِنَّ لَہٗ مَعِیْشَۃً ضَنْکًا وَّنَحْشُرُہٗ یَوْمَ الْقِیٰمَۃِ اَعْمٰی (پ۱۶ سورۃ طٰہٰ ۔ رکوع ۷) اور جس شخص نے منہ پھیرا میرے ذکر اور یاد سے تو اس کو ملتی ہے گذران تنگی کی اور لائیں گے ہم اس کو قیامت کے دن اندھا۔

مولانا فرماتے ہیں کہ اس آیت میں ذکر سے مراد امام کے پیچھے سورۃ فاتحہ کا پڑھنا ہے اور جو شخص اس سے اعراض کرتا ہے وہ عذاب خداوندی کا شکار ہوگا۔ (مسئلہ اخبار تنظیم ص۶ کالم ۳ مجریہ ۱۰ ستمبر ۱۹۳۳ء ماخوذ از برہان ساطع ص۳۱)

جواب:۔ فریق ثانی کا وتیرہ ہی عجیب ہے آیت وَاِذَا قُرِئَ الْقُرْاٰنُ کا شان نزول صحیح روایات اور اجماع امت سے خلف الامام کا مسئلہ ہے۔ مگر وہ آیت ان کے نزدیک کافروں کے بارے میں نازل ہوئی ہے اور یہ آیت جو بالاتفاق کفار منافقین اور عصاۃ کے بارے میں نازل ہوئی ہے اس کو وہ مسلمانوں کے بارے میں بتاتے ہیں۔ بعض مفسرین کرام نے اس کا یہ مطلب بیان کیا ہے۔ کہ معیشۃ ضنکا کے یہ معنی ہیں کہ زندگی میں خیر اور بھلائی داخل نہ ہوسکے گویا خیر کو اپنے اندر لینے سے تنگ ہوگئی ہے اور اکثر مفسرینؒ یہ فرماتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ کے ذکر اور قرآن کریم سے اعراض کرنے والے کافروں اور نافرنوں کو اگرچہ مال، اولاد اور دنیا کی ترقی حاصل ہوجاتی ہے۔ لیکن زندگی کا وہ سکون جو خدا تعالیٰ کے احکام ماننے سے ہوتا ہے اس سے وہ یکسر خالی اور محروم رہتے ہیں اور اس دنیائے خاک و گِل میں حقیقی امن اور تسلی بھی ان لوگوں کو نصیب ہوتی ہے۔ جو

اللہ تعالیٰ کی یاد سے اپنے دل کو معمور رکھتے ہیں سچ ہے اللہ تعالیٰ کے ذکر سے دل مطمئن ہو سکتے ہیں۔ الا بذکر اللہ تطمئن القلوب اور آنحضرت صلی اللہ تعالیٰ علیہ وآلہ وسلم نے معیشۃ ضنکا کی تفسیر عذاب قبر سے کی ہے چنانچہ حضرت ابو سعید الخدریؓ سے مروی ہے کہ آنحضرت صلی اللہ تعالیٰ علیہ وآلہ وسلم نے ارشاد فرمایا معیشۃ ضنکا قال عذاب القبر (مستدرک جلد ۲ ص ۳۸۱ قال الحاکم والذہبی علی شرط مسلم) کہ اس آیت میں معیشۃ ضنک سے عذاب قبر مراد ہے۔ اور امام بزارؒ نے بھی حضرت ابو ہریرہؓ سے مرفوعاً یہ روایت نقل کی ہے حافظ ابن کثیرؒ فرماتے ہیں اسناد جید (جلد ۳ ص ۱۶۹) کہ اس کی سند جید اور عمدہ ہے اب مولانا صاحب ہی از راہ بزرگی ارشاد فرمائیں کہ کیا ان تمام حضرات کو عذاب قبر ہوگا جن کے حوالے پوری تفصیل کے ساتھ جلد اول میں بیان ہو چکے ہیں جو قرأت خلف الامام کے قائل نہ تھے؟ اور کیا عذاب قبر مشرکوں، کافروں، منافقوں اور گنہگاروں کو ہوگا یا قرآن کریم اور صحیح احادیث پر عمل کرنے والوں کو جن کا دامن تحقیق اکثر حضرات صحابہؓ و تابعینؒ اور جمہور فقہاءؒ اور محدثینؒ کی معیت سے بھی وابستہ ہے؟ اگر استدلال اسی کا نام ہے تو کیوں نہیں کہا جا سکتا کہ واذا قریٔ القرآن الآیۃ اللہ تعالیٰ کا ذکر ہے اور اس کا حکم ہے اور فریق ثانی اس سے اعراض کرتا ہے الخ ان کی منطق کی رو سے وہ معیشۃ ضنکا کے مستحق ہیں بلکہ یہ مطلب زیادہ صحیح ہوگا۔ کیونکہ اس کا مطلب ہی صحیح روایات اور اجماع امت سے مسئلہ عدم قرأت خلف الامام ثابت ہو چکا ہے اور من اعرض عن ذکری الآیۃ کا یہ مطلب کہ اس سے امام کے پیچھے سورۂ فاتحہ سے اعراض کرنا ہے نہ تو جناب رسول خدا صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم سے اور نہ حضرات صحابہ کرامؓ سے بلکہ کسی بھی معتبر اور مستند مفسرؒ سے یہ ثابت نہیں ہے پھر کیونکر اس سے قرأت خلف الامام کی اور خصوصاً امام کے پیچھے سورۂ فاتحہ کی اجازت ثابت ہے۔ مؤلف خیر الکلام نے ص ۵۸ میں فاقرءوا ما تیسر الآیۃ سے بھی اپنے دعوی پر استدلال کیا ہے مگر ہم نے جلد اول میں باحوالہ بحث عرض کر دی ہے کہ یہ آیت ہی نماز تہجد سے متعلق ہے نہ کہ مسئلہ خلف الامام سے حضرات! اسی قسم کی بعض اور آیات بھی فریق ثانی نے اپنے اس دعوے کے اثبات پر پیش کی ہیں مگر ان کو وہ کسی طرح بھی مفید نہیں ہو سکتیں بخلاف اس کے ہم نے محض حضرات صحابہ کرامؓ سے نہیں بلکہ ان حضرات صحابہ کرامؓ سے جن کا فن تفسیر میں مقام حضرات خلفاء راشدینؓ سے

بھی بڑھا ہوا ہے صحیح اسانید کے ساتھ ایک آیت کا مطلب اور شان نزول پیش کیا ہے اور حدیث تابعینؒ وجمہور مفسّرین سے بلکہ اجماع امت سے بھی آیت کی تفسیر نقل کی جا چکی ہے اور فریق ثانی صحابی چھوڑ کسی تابعی سے بھی بسند صحیح کسی آیت کا مطلب نہیں پیش کر سکا صرف تفسیر بالرائے اور سینہ زوری سے کام لیتا ہے۔

فالی اللہ تعالیٰ المشتکیٰ۔

دُوسرا باب

اس باب میں وہ مرفوع روایات اور احادیث پیش کی جاتی ہیں جن سے فریقِ ثانی نے مقتدی کے لیے امام کے پیچھے ہر رکعت میں سورۃ فاتحہ کے پڑھنے کا وجوب ثابت کیا ہے اور ہم ان پر روایۃً اور درایۃً سنداً اور معنیً کلام کریں گے اور یہ واضح کریں گے کہ ان کا یہ دعویٰ اور اس کی دلیل کہاں تک اور کیسے ان کو مفید ہے ؟ اور دعویٰ و دلیل کی مطابقت کیا ہے ؟

پہلی روایت :۔ حضرت عبادہؓ بن الصامت کا بیان ہے کہ آنحضرت صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا :۔ لا صلوٰۃ لمن لم یقرأ بفاتحۃ الکتاب (بخاری ج ۱ ص ۱۰۴ و مسلم جلد ۱ ص ۱۶۹) کہ جس نے سورۃ فاتحہ نہ پڑھی اس کی نماز نہیں ہوتی۔ چونکہ اس روایت میں مقتدی اور خلف الامام کی کوئی قید مذکور نہیں اس لیے فریقِ ثانی کو اس حدیث سے استدلال کرنے میں علوم آلی خارجی قرائن اور حضرات محدثین کرامؒ کے مفروض اجماع یا ایسے خوش کن الفاظ سے مدد لینے کی ضرورت محسوس ہوئی ہے چنانچہ مبارکپوری صاحبؒ لکھتے ہیں کہ لفظ مَن عام ہے جس میں امام منفرد اور مقتدی سب داخل ہیں (ابکار المنن ص ۱۳۰ تحقیق الکلام جلد ۱ ص ۱۱ و تحفۃ الاحوذی جلد ۱ ص ۲۵۷) اور مولانا محمد ابراہیم صاحب میرؒ لکھتے ہیں کہ غرض تمام محدثینؒ بالاتفاق اس حدیث کو ہر نماز اور ہر نمازی پر شامل

لہ یہ روایت نسائی جلد ۱ ص ۱۰۵ ، ابوعوانہ جلد ۲ ص ۱۲۴ دارمی ص ۱۳۶ ابوداؤد جلد ۱ ص ۱۱۹ ترمذی جلد ۱ ص ۳۱ ابن ماجہ ص ۶۰ دارقطنی جلد ۱ ص ۱۲۲ السنن الکبریٰ جلد ۲ ص ۶۱ جزء القراۃ ص ۲۰ کتاب القراۃ ص ۹ کتاب الاعتبار ص ۹۸ اور مشکوٰۃ جلد ۱ ص ۷۸ وغیرہ کتابوں میں موجود ہے یہ روایت متعدد حضرات صحابہ کرامؓ سے بسندِ صحیح مروی ہے مثلاً حضرت ابن عمرؓ اور حضرت جابرؓ سے صحیح سند سے مرفوعاً مروی ہے لا صلوٰۃ لمن لم یقرأ بفاتحۃ الکتاب (کتاب القراۃ ص ۳۲ کلاھما بطریق اسحاقؒ بن بنان البغدادیؒ۔ وغیرہ)

کہتے ہیں۔ (تفسیر واضح البیان ص۲۴۷) اور مؤلف خیر الکلام لکھتے ہیں کہ یہ حدیث عام ہے اس میں کسی نماز کی تخصیص نہیں امام یا منفرد کا کوئی ذکر نہیں ہے جیسے یہ حدیث امام یا منفرد کو شامل ہے۔ اسی طرح مقتدی کو بھی شامل ہے الخ (ص۴۷)

جواب اوّل:- بلاشبہ سند کے لحاظ سے یہ روایت صحیح ہے لیکن اس روایت سے فریق ثانی کا استدلال صحیح نہیں ہے کیونکہ دعویٰ خاص اور دلیل عام ہے (تقریب تام نہیں نہ ہی منطقی اصطلاح ہی ملحوظ نہیں کیونکہ) نہ اس میں مقتدی کی قید موجود ہے اور نہ خلف الامام کی اور جب تک دعویٰ اور دلیل میں مطابقت نہ ہو کسی باانصاف عدالت میں ایسا دعویٰ ہرگز مسموع نہیں ہو سکتا۔ رہا حرف مَنْ سے استدلال تو وہ بھی قابل التفات نہیں ہے اس لیے کہ فریق ثانی جب تک یہ نہ ثابت کرے کہ حرف مَنْ تعمیم میں نص قطعی ہے اور کبھی کسی مقام میں تخصیص کے لیے مستعمل نہیں ہوا تو پھر ان کا دعویٰ ایک حد تک صحیح ہو سکتا ہے مگر یقین کیجیے کہ اس کا اثبات کارے دارد یہ صحیح ہے کہ بعض اوقات حرف مَنْ عموم کے لیے آتا ہے لیکن لبا اوقات اس میں تخصیص بھی مراد ہو سکتی ہے۔ نہایت اختصار کے ساتھ ہم بعض حوالے درج کرتے ہیں ملاحظہ کریں۔

۱۔ اللہ تعالیٰ ارشاد فرماتا ہے۔ وَيَسْتَغْفِرُونَ لِمَنْ فِي الْأَرْضِ (پ۲۵ شوریٰ-۱) کہ فرشتے زمین پر بسنے والوں کے لیے طلب مغفرت کرتے ہیں۔ اس آیت میں حرف مَنْ ہے اور ظاہر ہے کہ زمین پر سب بسنے والوں کے لئے فرشتے دعا مغفرت نہیں کرتے بلکہ مومنوں کے لیے طلب استغفار کرتے ہیں جیسا کہ دوسرے مقام پر ارشاد ہوتا ہے وَيَسْتَغْفِرُونَ لِلَّذِينَ آمَنُوا (پ۲۴ مومن۱) کہ فرشتے صرف مومنوں کے لیے مغفرت کی دعا کرتے ہیں نہ یہ کہ ہندوؤں، سکھوں، یہودیوں اور نصرانیوں اور دیگر مشرک قوموں کے لیے خواہ وہ انسانوں میں ہوں یا جنوں میں تو یہاں حرف مَنْ تخصیص کے لیے آیا ہے۔

۲۔ اللہ تعالیٰ ارشاد فرماتا ہے۔ ءَأَمِنْتُمْ مَنْ فِي السَّمَاءِ أَنْ يَخْسِفَ بِكُمُ الْأَرْضَ الآية (پ۲۹ ملک-۲) کیا تم نڈر ہو چکے ہو اس سے جو آسمان میں ہے اس سے کہ دھنسا دے تم کو زمین میں یہاں بھی حرف مَنْ ہے اور اس سے مراد صرف اللہ کی ذات ہے نہ کہ ہر ایک مَنْ فِي السَّمَاءِ اور قرآن کریم صحیح احادیث اور اجماع سے یہ بات ثابت ہے کہ آسمانوں میں فرشتے اور ارواح حضرات

انبیاء علیہم السلام اور حضرت عیسٰی علیہ السلام جسدِ عنصری کے ساتھ بلکہ تمام دیگر مومنوں کی روحیں آسمانوں پہ موجود ہیں اور ایک صحیح روایت سے معلوم ہوتا ہے کہ حضرت آدم علیہ السلام کی وہ اولاد جو اہل النار سے ہے پہلے آسمان پر حضرت آدم علیہ السلام کی بائیں جانب موجود ہے (بخاری ج۱ ص۵۰ مسلم ج۱ ص۹۲ والبو عوانہ جلد ۱ ص۱۳۳) اور آسمان پہ کوئی جپہ ایسا نہیں جہاں کوئی نہ کوئی فرشتہ عبادت اور سجدہ میں مشغول نہ ہو (مستدرک جلد ۴ ص۵۴۴) قال الحاکمؒ والذہبیؒ علی شرطہما)

۳۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے أَمْ أَمِنتُم مَّن فِي السَّمَاءِ أَن يُرْسِلَ عَلَيْكُمْ حَاصِبًا (پ۲۹، ملک ۲۰) کیا نڈر ہو چکے ہو تم اُس سے جو آسمان میں ہے اس سے کہ برسائے تمہارے اُوپر پتھروں کا مینہ اس آیت میں بھی حرف مَنْ ہے مگر مراد صرف اللہ تعالیٰ کی ذات ہے۔

۴۔ آنحضرت صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم ارشاد فرماتے ہیں انما ھلک من کان قبلکم (الحدیث، بخاری جلد ۲ ص۱۰۰۳) کہ تم سے پہلے لوگ صرف اس لیے ہلاک ہوئے ہیں کہ احکام خداوندی میں امیر و غریب اور اعلیٰ و ادنیٰ کا فرق کرتے تھے۔ اس حدیث میں حرف مَن ہے مگر مراد صرف بعض قومیں ہیں نہ کہ حضرات انبیاء عظام اور ان کے مومن ساتھی (علیہم الصلوٰۃ والسلام)

۵۔ آنحضرت صلی اللہ تعالیٰ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا لتتبعن سنن من کان قبلکم (الحدیث) (بخاری ج۲ ص۱۰۸۸ ومسلم ج۲ ص۳۳۹) تم پہلے لوگوں کی (جو یہود و نصاریٰ ہیں جیسا کہ اسی حدیث میں اس کی تصریح ہے) اتباع کرو گے جو تمہاری گمراہی کا موجب بنے گی اس میں بھی حرف مَن ہے اور اس سے مراد بعض قومیں ہیں نہ کہ حضرات انبیاء کرام علیہم السلام کیونکہ ان کی اتباع کا تو آپ کو حکم ہے فَبِهُدَاهُمُ اقْتَدِهْ (پ۷۔ انعام) سو آپ ان پیغمبروں کی جن میں اٹھارہ کے صراحۃً نام لیے گئے ہیں اور باقی حضرات کا اجمالاً ذکر ہوا ہے، اقتداء کیجیے اور آپ کی وساطت سے آپ کی تمام امت کو ان کی اتباع اور اقتدار کا حکم دیا گیا ہے۔

۶۔ آنحضرت صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ طاعون اللہ تعالیٰ کا ایک عذاب ہے رجس ارسل علی من قبلکم (بخاری جلد ۱ ص۴۹۴ ومسلم جلد ۲ ص۲۲۸) جو تم سے پہلے لوگوں پر نازل کیا گیا ہے اس حدیث میں بھی حرف مَن ہے حالانکہ یہ عذاب صرف بعض مجرموں پر نازل کیا گیا تھا نہ کہ پیغمبروں اور مومنوں پر علیہم الصلوٰۃ والسلام۔

۷۔ آنحضرت صلی اللہ تعالیٰ علیہ وآلہٖ وسلّم نے ارشاد فرمایا کہ عصر کی نماز تم سے پہلے لوگوں پر پیش کی گئی مگر انہوں نے پرواہ نہ کی۔ عرضت علیٰ من قبلکم (مسلم جلد ا ص ۲۷۵) حالانکہ حضرات انبیاء عظام علیہم السلام اور ان کے پیروکار اس جرم سے مبرّا تھے۔

۸۔ آنحضرت صلی اللہ تعالیٰ علیہ وآلہٖ وسلّم نے ارشاد فرمایا کہ جو زمین پر بسنے والوں پر رحم نہیں کرتے لا یرحمہ من فی السماء (الترغیب والترھیب جلد ۳ ص ۱۵۵ بسند قوی) ان پر آسمان والا رحم نہیں کرے گا، یہاں بھی حرف من ہے اور مراد صرف اللہ تعالیٰ کی ذات ہے۔

۹۔ آنحضرت صلی اللہ تعالیٰ علیہ وآلہٖ وسلّم نے ارشاد فرمایا کہ اللہ تعالیٰ قیامت کے دن فرشتوں کو اور نیک بندوں کو ارشاد فرمائیں گے اخرجوا من النار من ذکرنی یوماً (مشکوٰۃ جلد ۲ ص ۴۵۷ ومستدرک ا ص ۷۰) جن لوگوں نے مجھے ایک دن بھی یاد کیا ہے۔ ان کو دوزخ سے نکال لو اس حدیث میں بھی حرف من ہے لیکن اس سے مراد صرف اہل توحید ہیں گو کتنے ہی گنہگار ہوں نہ کہ کافر اور مشرک حالانکہ وہ بھی خدا کا نام تو لیتے ہیں، اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے اگر آپ ان سے سوال کریں تمہیں کس نے پیدا کیا ہے لیقولنّ اللّٰہ تو ضرور کہیں گے کہ اللہ تعالیٰ نے کتب حدیث میں سینکڑوں مثالیں ایسی موجود ہیں جن سے بخوبی یہ امر واضح ہو جاتا ہے کہ حرف من تخصیص کے لیے بھی استعمال کیا جاتا ہے، ہم نے صرف بطور مثال کے چند نمونے عرض کئے ہیں، اب آپ علمائے عربیت کی چند عبارتیں ملاحظہ کریں۔

۱۔ علامہ زمخشریؒ آیت ۱ کی تفسیر میں لکھتے ہیں کہ حرف من تعمیم کے لیے نہیں بلکہ جنس[1] کے لیے اور جنسیت کل افراد میں بھی متحقق ہو سکتی ہے اور بعض میں بھی لیکن اس مقام میں بعض یعنی اہل ایمان مراد ہیں، کیونکہ اللہ تعالیٰ کے فرشتے کافروں کے لیے دعائے مغفرت نہیں کرتے۔

---

[1] مؤلف خیر الکلام نے ان عبارات کا جو یہ مطلب بیان کیا ہے کہ ان حضرات کے نزدیک حرف من وضع تو عموم کے لیے ہے اور اس مقام پر خصوص کے معنی پر اُس کی دلالت ہے اور وضع و دلالت میں فرق ہے (محصلہ ص ۸۵/۸۶) تو یہ ایک ناکام بہانہ ہے کیونکہ علامہ زمخشریؒ وغیرہ اس کی تصریح کرتے ہیں کہ حرف من تعمیم کے لیے نہیں بلکہ جنس کے لیے ہے تو پھر بیکار مطلب کو کون مانتا ہے؟ اور اگر دلالت کے لحاظ سے خصوص آیا ہے، تب بھی استعمال کے لحاظ سے عموم میں نص قطعی تو نہ رہا وھو المطلوب۔ اور پھر علامہ سید شریف جرجانیؒ کی صریح اور واضح عبارت کا کیا جواب ہے جس میں وہ تصریح فرماتے ہیں کہ یہ عموم کیلئے وضع ہی نہیں بلکہ جنس کے لیے وضع ہیں۔

(تفسیر کشاف جلد ۳ صـ۶۳)

۲۔ امام رازیؒ لکھتے ہیں کہ حرف مَن لا یفید العموم یہاں عموم کا فائدہ نہیں دیتا بلکہ اس سے بعض مراد ہیں (جو اہل ایمان ہیں) (تفسیر کبیر جلد ۷ صـ۴۳۹)

۳۔ علامہ آلوسیؒ لکھتے ہیں کہ حرف مَن یہاں جنس کے لیے ہے نہ کہ عموم کیلیے۔ (روح المعانی صـ۱۲۹/۱۲)

۴۔ امام ابوبکر رازیؒ بھی اسی کے قریب قریب الفاظ لکھتے ہیں (احکام القرآن صـ۴۳۹/۲)

۵۔ ملا احمد صاحبؒ تحریر فرماتے ہیں ما ومن یحتملان العموم والخصوص واصلهما العموم (نور الانوار صـ۹۵) کہ حرف مَا اور مَن عموم اور خصوص دونوں کا احتمال رکھتے ہیں۔ اصل اگرچہ ان دونوں کا عموم ہے۔

مطلب واضح ہے کہ اگرچہ اصل میں دونوں عموم کے لیے ہیں لیکن استعمال کے لحاظ سے دونوں عموم کے لیے نص قطعی نہیں کہ ان میں تخصیص نہ آ سکے بلکہ استعمال میں عموم وخصوص دونوں کا برابر احتمال رکھتے ہیں اور صـ۹۱ میں لکھتے ہیں۔ وکلمة من لیست بمحکمة فی العموم الخ کہ کلمہ مَن عموم میں محکم اور نص قطعی نہیں ہے۔

۶۔ امام اہل عربیت علامہ سید شریف جرجانیؒ (المتوفی ۸۱۶ھ) تحریر فرماتے ہیں (الموصولات لم توضع للعموم بل هی للجنس یحتمل العموم والخصوص (شرح مواقف جلد ۲ صـ۴۵۸ طبع مصر وصـ۲۳۷ طبع لکھنؤ) کہ جملہ موصولات (جن میں مَا و مَن داخل ہیں) عموم کے لیے موضوع ہی نہیں بلکہ ان میں عموم وخصوص دونوں کا احتمال ہے اور ابوبکر محمدؒ بن احمد السرخسیؒ (المتوفی ۴۹۰ھ) لکھتے ہیں ومن هذا القسم کلمة من فانها کلمة مبهمة وهی عبارة عن ذات من یعقل وهی تحتمل الخصوص والعموم الخ (اصول سرخسیؒ جلد ۱ صـ۱۵۵ طبع مصر) کہ اسی قسم سے کلمہ مَن بھی ہے کہ وہ مبہم اور مجمل ہے اور وہ عقل والی شخصیت پر دلالت کرتا ہے اور خصوص وعموم دونوں کا احتمال رکھتا ہے اور اصول فقہ کی مشہور کتاب التوضیح والتلویح صـ۱۵۹ میں بھی اس کی تصریح ہے کہ کلمہ مَن خصوص اور عموم دونوں کے لیے آتا ہے۔

قارئین کرام! آپ قرآن کریم، صحیح احادیث اور ائمہ تفسیر اور علماء عربیت کی واضح عبارات سے یہ معلوم کر چکے ہیں کہ حرف مَن تعمیم کے لیے نص قطعی نہیں ہے اور اسی پر فریق ثانی کے استدلال

کی عبارت قائم تھی جو اس بحث کے بعد پیوند زمین ہو جاتی ہے کیونکہ حرف مِنْ تخصیص کے لیے بھی آتا ہے اور ادب عربی کے ساتھ تعلق رکھنے والے حضرات بخوبی جانتے ہیں کہ بہت کم ایسے مقامات ہوں گے جہاں اندرونی اور بیرونی قرائن سے حرف مِنْ سے حقیقی تعمیم مراد لی جائے۔ حضرت شاہ ولی اللہ نے تو یہاں تک دعویٰ کیا ہے (اور قرائن و شواہد کی روشنی میں ان کا دعویٰ بیجا نہیں ہے)

الاصل فی العمومات التخصیص بما ینا سب المقام (تفہیمات الٰہیہ ج ۱ ص ۲۵)

کہ عمومات میں قاعدہ اور اصل یہی ہے کہ ان میں مقام اور محل کے مناسب تخصیص مراد لی جائے گی۔ قاضی شوکانیؒ لکھتے ہیں کہ عام کو مطلقاً خاص پر حمل کیا جائے گا، امام شافعیؒ اور دیگر ائمہ اصول کا یہی مسلک ہے، وھوالحق (نیل جلد ۱ ص ۱۹۵) مبارکپوری صاحبؒ بحوالہ قاضی شوکانیؒ لکھتے ہیں کہ مطلق کو مقید پر اور عام کو خاص پر حمل کرنا واجب ہے اور یہی قوی ترین مذہب ہے (تحفۃ الاحوذی جلد ۲ ص ۶۳) اور نواب صاحبؒ بھی ایک جگہ لکھتے ہیں کہ درحقیقت ارباب تخصیص است (افادۃ الشیوخ ص ۶۵) اور مؤلف خیر الکلام لکھتے ہیں کہ خاص عام پر اور مقید مطلق پر مقدم ہوتا ہے (ص ۵۲)

ان تمام حوالوں اور دلائل کو پیش نظر رکھتے ہوئے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ میر صاحبؒ کا ہر نماز میں لفظ ہر پر اور مبارکپوری صاحبؒ اور مؤلف خیر الکلام کا حرف مِن پہ اپنے استدلال کی بنیاد رکھنا باطل ہے اور اس سے امام، مقتدی، منفرد اور ہر نمازی ہی مراد لینا صحیح نہیں ہے بلکہ اس سے صرف امام اور صرف منفرد مراد لینا بھی یقیناً صحیح ہے۔ مؤلف خیر الکلام نے ان ٹھوس اور صریح حوالوں سے انتہائی ناراض اور تنگدل ہو کر بلکہ گھبرا کر جو مخلص تلاش کیا وہ یہ ہے

۱۔ مؤلف "احسن الکلام" نے یہ تو تسلیم کر لیا ہے کہ حدیث صحیح ہے مگر اپنی طرف سے یہ اعتراض کیا ہے کہ حدیث عام ہے یعنی مقتدی، امام اور منفرد سب کو شامل ہے اس میں خاص مقتدی کا ذکر نہیں اور نہ خلف الامام کا ذکر ہے۔

۲۔ دوسرے لفظوں میں ان کا یہ مطلب ہوا کہ یہ حدیث لغو اور بیکار ہے کیونکہ اس میں حکم عام ہے نہ منفرد کا ذکر ہے نہ امام کا اور نہ مقتدی کا۔

۳۔ حنفیوں کی معتبر کتاب حسامی میں ہے کہ عام کا حکم یہ ہے کہ جتنے افراد کو وہ لفظ شامل ہو ان تمام کو عام کا حکم قطعی اور یقینی طور پہ شامل ہوتا ہے خاص و عام میں کوئی فرق نہیں اور یہی ہمارا

مذہب ہے۔

۴۔ حنفیوں کی بہترین کتاب توضیح میں ہے کہ ہمارے اور امام شافعیؒ کے نزدیک عام جمیع افراد میں حکم واجب کرتا ہے یعنی عام کے حجت ہونے میں حنفی اور شافعی متفق ہیں۔

۵۔ توضیح میں ہے کہ عام کے حجت ہونے پر امت کا اجماع ہے اس کی دلیل یہ ہے کہ صحابہؓ اور غیر صحابہؓ سے عمومات سے استدلال کرنا ثابت اور مشہور و معروف ہے۔

۶۔ حرف مَنْ کی دلالت عموم پر قطعی ہے کیونکہ من عموم کے لیے موضوع ہے اور بدون قرینہ لفظ اپنے اصل معنی پر قطعاً دلالت کرتا ہے۔

۷۔ مؤلف "احسن الکلام" نے جو حوالے نقل کئے ہیں ان تمام سے صرف یہ بات ثابت ہوتی ہے کہ حرف مَنْ میں بسا اوقات تخصیص بھی مراد ہو سکتی ہے اور اصل میں مَنْ عام ہے مگر یہ بات ثابت نہیں ہوتی کہ لفظ مَنْ عام و خاص دونوں کے لیے موضوع ہے یا دونوں اس میں اصل ہیں۔

۸۔ مؤلف "احسن الکلام" کی اس جگہ روش مرزائیوں کی سی ہے کہ وہ لَا نَبِیَّ بَعْدِیْ کی حدیث میں جمیع افراد کی نفی مراد نہیں لیتے حالانکہ اس میں ہر قسم کی نبوت کی نفی ہے۔

۹۔ قاضی شوکانیؒ فرماتے ہیں کہ جمہور کا مذہب ہے کہ عموم کے لیے ایسے الفاظ ہیں جو اس کے لیے حقیقۃً موضوع ہیں وہ اسماء شرط اور اسماء استفہام اور اسماء موصولات ہیں (ارشاد الفحول ص۱۰۱)

۱۰۔ جو لوگ کہتے ہیں کہ مَنْ جنس کے لیے موضوع ہے ان کے نزدیک بھی یہاں عام ہونا چاہیئے کیونکہ صفت عام ہے، منار اور نور الانوار ص۷۵ میں ہے اگر کوئی شخص یہ کہے مَنْ شَاءَ مِنْ عبیدی العتق فھو حُرٌّ فشاؤا عتقوا (جو شخص کہے میرے غلاموں میں سے جو آزاد ہونا چاہے وہ آزاد ہے اگر وہ چاہیں گے تو آزاد ہو جائیں گے الخ) (محصلہ خیر الکلام از ص۷۵ تا ص۸۰)

الجواب:۔ ترتیب وار ہر ایک شق کا جواب ملاحظہ فرمائیں۔

۱۔ راقم نے یہ ہرگز نہیں کہا کہ یہ حدیث عام ہے اور یہ امام و منفرد اور مقتدی سب کو شامل ہے جیسا کہ مؤلف خیر الکلام نے غلط بیانی سے کام لیا ہے، راقم تو اس حدیث کو عام مانتا ہی نہیں بلکہ یہ کہتا ہے کہ یہ امام و منفرد کے ساتھ خاص ہے اور اسی لیے حرف مَنْ کی تخصیص کی باحوالہ بحث درج کی ہے کہ وہ عموم میں محکم اور نص نہیں ہے راقم نے تو یہ لکھا ہے کہ اس روایت سے فریق ثانی کا

استدلال صحیح نہیں ہے کیونکہ دعوئے خاص اور دلیل عام ہے نہ اس میں مقتدی کی قید موجود ہے اور نہ خلف الامام کی الخ اور دلیل کو بھی اس لیے عام کہا کہ فریق ثانی اس کو عام کہتا ہے اور یہ لفظ عام بھی صرف الزامی طور پر استعمال کیا گیا ہے۔ اللہ تعالیٰ مؤلف خیر الکلام کو حدیث کے عام ہونے اور مقام استدلال میں دلیل کے عام ہونے کے واضح فرق کو سمجھنے کی توفیق بخشے۔

این دعا از من واز جملہ جہاں آمین باد

۴۔ یہ بھی خوب کہی کہ حدیث لغو اور بیکار ہے (معاذ اللہ تعالیٰ) اپنے ناخواندہ حواریوں کو بہکانے کا کیا نرالا ڈھنگ ہے، راقم جب چلا چلا کر یہ کہتا ہے کہ اس حدیث کا مصداق ہی صرف امام اور منفرد ہیں، اندرونی اور بیرونی ٹھوس دلائل سے مقتدی اس میں داخل نہیں تو انصاف سے فرمایئے (بشرطیکہ فریق ثانی انصاف کی قدر کرتا ہو) کہ راقم کے نزدیک یہ حدیث لغو اور بیکار کیونکر ہوتی؟ اور راقم نے یہ کب تسلیم کیا ہے کہ اس میں حکم عام ہے جس پر مؤلف "خیر الکلام" نے بلا وجہ حاشیہ آرائی کی ہے۔

۳۔ حسامی کا حوالہ مؤلف مذکور کو مفید نہیں کیونکہ نزاع اس میں نہیں کہ عام اپنے افراد کو قطعی طور پر شامل ہے یا نہیں؟ بلکہ نزاع اس میں ہے کہ حرف مَنْ عموم کے لیے موضوع ہے یا جنس اور ابہام کے لیے موضوع ہے؟ جب کسی لفظ کو عام تسلیم کر لیا جائے تو اس کا اپنے افراد پر شمول قطعی ہوگا اگر حرف مَنْ ایسا نہیں۔

۴ و۵۔ توضیح وتلویح" کے حوالے بھی مؤلف خیر الکلام کو سود مند نہیں ہیں کیونکہ نہ تو عام کے حجت ہونے میں اختلاف ہے اور نہ لفظ عام کے اپنے جمیع افراد میں حکم واجب کرنے میں یہ دونوں باتیں محل نزاع سے خارج ہیں۔ نزاع صرف اسی میں ہے کہ حرف مَنْ عموم میں محکم اور قطعی ہے یا نہیں؟

۶۔ ہم باحوالہ عرض کر چکے ہیں کہ حرف مَنْ عموم میں محکم اور قطعی نہیں بلکہ یہ مبہم ہے اور موصولات عموم کے لیے موضوع نہیں ہیں اور حافظ ابن ہمامؒ اپنی دقیق کتاب میں تحریر فرماتے ہیں۔

هل الصيغ من اسماء الشرط والاستفهام والموصولات والمحلى والمنفية والجمع باللام والاضافة موضوعة للعموم على الخصوص او مجاز فيه او مشتركة

کیا اسماء، شرط، استفہام، موصولات، محلّی، منفی، جمع باللام اور اضافات کے صیغے علی الخصوص عموم کے لیے موضوع ہیں؟ یا اس میں مجاز ہیں؟ یا مشترک ہیں؟ اس میں اختلاف ہے، امام ابو الحسن اشعریؒ نے قاضی ابو بکر

وتوقف الاشعری مرّةً کالقاضی و الباقلانیؒ کی طرح کبھی تو توقف کیا اور کبھی اشتراک
مرّةً بالاشتراک اھ۔ (التحریر ص۹۵ طبع مصر) کے قائل ہوئے۔

ملاحظہ کیجیے کہ علمِ عربیت کے پہاڑ اور ماہر امام بھی موصولات وغیرہ کے بارے میں حتمی طور پہ یہ کہنے سے قاصر ہیں کہ وہ قطعاً عموم کے لیے موضوع ہیں۔ کوئی تو عموم کے لیے ان کی وضع کو مجازی کہتے ہیں اور کوئی اشتراک اور توقف کے قائل ہیں پھر بھلا مؤلف خیر الکلام کے اس دعویٰ کو کون سنتا اور مانتا ہے کہ مَنْ عموم کے لیے موضوع ہے جب عموم کے لیے وضع ہی نہیں اور کم از کم ائمہ عربیّت کا اس میں شدید اور قوی اختلاف ہے تو حرف مَنْ کی عموم میں قطعیت کا دعویٰ باطل ہے اور جب قطعی طور پہ اس کا معنی عموم ہے ہی نہیں تو قرینہ اور غیر قرینہ کا کیا سوال؟ جس کے پیچھے مؤلف خیر الکلام پڑے ہوئے ہیں اور خصوص کے لیے قرینہ کے طالب ہیں۔

۷۔ جب مؤلف خیر الکلام کو اس کا اقرار ہے کہ حرف مَنْ میں لبا اوقات تخصیص بھی مراد ہو سکتی ہے تو انہیں کے اس اقرار کے موافق یہاں حرف مَنْ سے خاص مراد ہے یعنی امام اور منفرد تاکہ دیگر صحیح اور صریح دلائل سے تعارض بھی نہ ہو اور فصاعداً کی زیادت بھی برمحل ثابت رہے۔

۸۔ مؤلف خیر الکلام کا روّیہ بھی رافضیوں سے کسی طرح کم نہیں کہ وہ دیگر تمام نصوص سے اغماض کر کے محض سینہ زوری سے تِبْیَانًا لِّکُلِّ شَیْءٍ میں لفظ کل کے عموم پر اصرار کر کے اپنے ائمہ کے لیے مَا کَانَ وَمَا یَکُوْنُ کا علم غیب ثابت کرنے پر کمر بستہ ہیں (ملاحظہ ہو اصول کافی جلد۱ ص۱۷۱) باقی حدیث لانبی بعدی نکرہ نفی کے نیچے داخل ہے جس کا حکم واضح ہے۔

۹۔ قاضی شوکانیؒ کا یہ دعویٰ کہ جمہور کے نزدیک موصولات وغیرہ عموم کے لیے وضع ہیں مسموع نہیں کیونکہ ہم باحوالہ عرض کر چکے ہیں کہ یہ عموم کے لیے موضوع ہی نہیں اور ائمہ فن کا اس میں خاصا اختلاف ہے علاوہ ازیں تلویح ص۱۶۷ میں اس کی تصریح ہے کہ حرف مَنْ کی چار قسمیں ہیں شرطیہ، استفہامیہ، موصولہ اور موصوفہ پہلی دونوں قسموں میں وہ عموم کے لیے اور دوسری دونوں قسموں میں (یعنی موصولہ اور موصوفہ ہونے کی صورت میں) عموم اور خصوص دونوں کیلئے استعمال ہوتا ہے اور حدیث زیر بحث میں حرف مَنْ نہ شرطیہ ہے اور نہ استفہامیہ جیسا کہ مخفی نہیں ہے لہٰذا اگر حرف مَنْ اپنی پہلی دو قسموں کے اعتبار سے عام بھی ہو تو جمہور کا یہ ارشاد بجا ہے۔ لیکن

حدیث مذکور میں مَنْ یا موصول ہے یا موصوف اور اس میں عموم و خصوص دونوں مراد ہو سکتی ہے اور یہاں صحیح اور ٹھوس دلیل کے پیش نظر خصوص مراد ہے اور اس عبارت سے بھی واضح ہو گیا کہ مطلق حروف مَنْ عموم کے لیے وضع نہیں اس کی بعض اقسام عموم کے لیے ہیں اور بعض خصوص کے لیے اس لحاظ سے بھی وہ علی الاطلاق عموم میں نص اور محکم نہ رہا اور یہی ہم کہتے ہیں۔

۱۰۔ نور الانوار کے حوالہ میں جو عموم آیا ہے تو بلا شبہ وہ درست ہے ایک تو اس لیے کہ اس میں حرفِ مَنْ شرطیہ ہے اور ابھی گذر چکا ہے کہ وہ استعمال میں عام ہوتا ہے اور دوسرے یہاں مشیئت کے فعل کی اسناد مِنْ عِبَادِیْ میں جمع کی طرف کی گئی ہے اور وہ عام ہے اور مِنْ بیانیہ ہے بخلاف حدیث مذکور کے کہ اس میں لَمْ یَقْرَأ فعل کی اسناد حرفِ مَنْ کی طرف ہے جو موصول یا موصوف ہونے کی وجہ سے عموم و خصوص دونوں کے لیے ہوتا ہے اور یہاں خصوص کے لیے آیا ہے جس کی مفصل بحث کتاب میں مذکور ہے غرض کہ نہ تو یہاں حرف مَنْ عام ہے اور نہ اس کی صفت عام ہے جیسا کہ مؤلف خیر الکلام کو دھوکہ ہوا ہے اور اگر بالفرض عام بھی ہو تو بھی فصاعداً وغیرہ کے قرینہ سے اس سے خاص منفرد ہی لیا جا سکتا ہے چنانچہ خود مؤلف خیر الکلام نے ایک جگہ لکھا ہے کہ پس یہ زیادہ قرین قیاس ہے کہ جو حدیث عام ہے اس سے مراد بھی خاص مقتدی ہی لیا جائے۔ انتہی بلفظہٖ (ص ۳۰۸) تو یہاں اس عام سے خاص منفرد لینے میں کیا رکاوٹ ہے؟ مؤلف خیر الکلام نے ص ۸۳ میں بحوالہ نور الانوار ص ۷۹ یہ لکھا ہے کہ اگر نکرہ کی صفت عام ہو تو عام ہو جاتا ہے اھ مگر یہ قاعدہ تمام احناف کے ہاں مسلّم نہیں ہے، اس پر ارباب اصول نے خاصی بحث کی ہے۔ توضیح و تلویح وغیرہ میں اس پر سیر حاصل بحث موجود ہے۔ اور علامہ تفتازانیؒ لکھتے ہیں کہ۔

والقول بعموم النكرة الموصوفة مما قدح فيه كثير من العلماء الحنفية اھ

نکرہ موصوفہ کے عموم میں بہت سے علماء حنفیہؒ نے کلام کیا ہے۔

(التلویح ص ۲۹۶)

مؤلف مذکور اور ان کی جماعت پر لازم ہے کہ وہ صرف نور الانوار ہی کو نہ دیکھا کریں کیونکہ وہ تو برائے درس طلبہ بڑی مختصر سی کتاب ہے اس میں تمام تفاصیل موجود نہیں ہوتیں دیگر اصول کی کتابوں کو بھی اگر بن پڑے تو (اگرچہ ہیں تو وہ دقیق اور مشکل ہی) پڑھا کریں تاکہ حقیقت

منکشف ہو جائے۔

جواب دوم: ۔ جب یہ بات پایہ ثبوت کو پہنچ چکی ہے کہ حرف مَن عموم میں نص قطعی نہیں تو اب دیکھنا یہ ہے کہ یہ حدیث کس کے حق میں ہے؟ امام اور منفرد کے بارے میں یا مقتدی کے حق میں؟ سو اس سے بہتر طریقہ اور کیا ہو سکتا ہے کہ ہم اسی حدیث کے تمام طرق پر ایک طائرانہ نگاہ ڈالیں شاید کہ کوئی سراغ مل جائے چنانچہ یہ بات زبانِ زد خلائق ہے جو ہندہ یابندہ، جب ہم نے دیکھا تو اسی حدیث میں یہ زیادت بھی مل گئی۔ لاصلوٰۃ لمن لم یقرأ بفاتحۃ الکتاب فصاعداً کہ جس شخص نے سورۂ فاتحہ اور اس سے زیادہ کچھ اور نہ پڑھا تو اس کی نماز نہ ہوگی اگر فریق ثانی کے نزدیک مقتدی کے لیے سورۂ فاتحہ اور فصاعداً اس کے ساتھ کچھ اور بھی پڑھنا جائز ہے تو یہ حکم مقتدی کو بھی شامل ہے، ورنہ یہ حدیث صرف اور صرف اس شخص کے بارے میں ہوگی۔ جس کو سورۂ فاتحہ کے ساتھ فصاعداً کچھ اور بھی پڑھنا ضروری ہے اور وہ صرف امام یا صرف منفرد ہے اس سے مقتدی ہرگز مراد نہیں کیونکہ فریق ثانی کے نزدیک بھی مقتدی کو سورۂ فاتحہ کے علاوہ اور کچھ بھی پڑھنا جائز نہیں ہے تو اس فصاعداً کی زیادت نے یہ بات متعین کر دی ہے کہ حرف مَن سے مراد امام یا منفرد ہے مقتدی اس سے یقیناً خارج ہے۔ یہ زیادت بطریق امام معمرؒ صحیح مسلم جلد ۱ ص ۱۶۹ وابو عوانہ ص ۱۲۴ ج ۲ اور نسائی جلد ۱ ص ۱۰۵ وغیرہ میں بسند صحیح مروی ہے صحیح مسلم اور ابو عوانہ کی سند کے صحیح ہونے میں تو کوئی کلام نہیں ہو سکتا نسائیؒ کے رواۃ یہ ہیں۔

(۱) سویدؒ بن نصرؒ امام نسائیؒ انکو ثقہ کہتے ہیں، ابن حبانؒ ان کو ثقات میں لکھتے ہیں اور ان کو متقن لکھتے ہیں، مسلمہؒ ان کو ثقہ کہتے ہیں (تہذیب التہذیب جلد ۴ ص ۲۸۰) (۲) عبداللہؒ بن مبارکؒ ان کا ترجمہ جلد اول کے مقدمہ میں گذر چکا ہے (۳) امام معمرؒ بن راشدؒ ان کا ترجمہ بھی جلد اول باب اول میں گذر چکا ہے۔ (۴) امام زہریؒ ان کا ترجمہ بھی جلد اول کے مقدمہ میں گذر چکا ہے (۵) حضرت محمودؓ بن الربیع، آنحضرت صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کی وفات کے وقت ان کی عمر پانچ سال کی تھی ابن حبان ان کو صحابہؓ میں لکھتے ہیں ابو حاتمؒ کا بیان ہے کہ انہوں نے جناب رسول اللہ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وآلہ وسلم کو دیکھا ہے لیکن صحبت حاصل نہیں کر سکے، امام عجلیؒ ان کو ثقہ اور من کبار التابعین کہتے ہیں اور یہ حضرت عبادہؓ بن الصامت کے داماد تھے۔

(تھذیب التھذیب جلد ۱۰ ص ۶۳) (۶) حضرت عبادہؓ بن الصامت جلیل القدر صحابی تھے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی رضاعی خالہ حضرت ام حرامؓ بنت ملحان ان کے نکاح میں تھیں ۔ دیکھئے حاشیہ بخاری جلد ۱ ص ۳۹۱ وغیرہ)

اعتراض ۱- فصاعداً کی اس زیادت کے سلسلہ میں جو اعتراضات اس ناچیز کی نگاہ سے گذرے ہیں یہ ہیں (۱) فصاعداً کی زیادت نقل کرنے میں امام معمرؒ متفرد ہیں (جزء القرأۃ ص ۲ کتاب القرأۃ ص ۱۱ تلخیص الحبیر ص ۸۷ تعلیق المغنی جلد ۱ ص ۱۲۲ تحقیق الکلام جلد ۲ ص ۳۲ وابکار المنن ص ۱۲۲ اور مؤلف خیر الکلام نے بھی امام بخاریؒ کے حوالہ سے اس کو شاذ کہا ہے ص ۸۷ ۔ (۲) اگر یہ زیادت صحیح بھی ہو تب بھی اس سے ما زاد علی الفاتحہ کا وجوب ثابت نہیں ہوگا ۔ اور اس حدیث میں فصاعداً کی زیادت اس لیے بیان کی گئی ہے تاکہ یہ وہم دور ہو جائے کہ شاید صرف فاتحہ ہی پڑھنی چاہیے جیسے تقطع الید فی ربع دینار فصاعداً میں ہے (جزء القرأۃ ص ۳ فتح الباری جلد ۲ ص ۱۹۳ وتحقیق الکلام وابکار المنن وغیرہ) (۳) مبارکپوری صاحبؒ لکھتے ہیں کہ حضرت عبد اللہؓ بن عباسؓ سے مروی ہے کہ آنحضرت صلی اللہ تعالیٰ علیہ وآلہ وسلم نے ایک مرتبہ دو رکعت نماز پڑھائی اور ان میں سورۂ فاتحہ ہی پڑھی (فتح الباری جلد ۲ ص ۲۰۲ ۔ کتاب القرأۃ ص ۸ ومسند احمد جلد ۱ ص ۲۴۳ وغیرہ) اگر ما زاد واجب ہوتا تو آپ کیوں ما زاد اور فصاعداً کو ترک کرتے لہٰذا فصاعداً واجب نہ ہوا (تحقیق الکلام جلد ۱ ص ۸ (۴) موصوفؒ لکھتے ہیں کہ حضرت ابوہریرہؓ سے روایت ہے کہ سورۂ فاتحہ سب نمازوں میں کافی ہے اگر زیادہ ہو جائے تو بہتر ہے (کتاب القرأۃ ص ۸) معلوم ہوا کہ ما زاد علی الفاتحہ واجب نہیں ہے (تحقیق الکلام جلد ۱ ص ۱۰) (۵) موصوفؒ لکھتے ہیں کہ حافظ ابن حجرؒ نے اس پر اجماع نقل کیا ہے کہ ما زاد علی الفاتحہ واجب نہیں ہے (فتح الباری جلد ۲ ص ۲۰۲) اور یہ نقل اجماع اس بات کی دلیل ہے کہ ما زاد علی الفاتحہ واجب نہیں ہے (تحقیق الکلام جلد ۱ ص ۱۰) (۶) امام بیہقیؒ لکھتے ہیں کہ آنحضرت صلی اللہ تعالیٰ علیہ وآلہ وسلم نے ارشاد فرمایا ام القرآن عوض من غیرھا ولیس غیرھا عوض منھا (کتاب القرأۃ ص ۹ ومستدرک جلد ۱ ص ۲۳۸) کہ سورۂ فاتحہ باقی تمام سورتوں کا عوض ہے لیکن اس کے علاوہ کوئی اور سورت اس کا عوض نہیں

ہو سکتی لہٰذا سورۃ فاتحہ کا پڑھنا ہی کافی ہے اور فصاعداً کی حاجت نہ ہوگی کیونکہ ع
کل الصید فی جوف الفراٗ یہ ہیں وہ اعتراضات جو فصاعداً کی زیادت کو رد کرنے یا غیر ضروری ٹھرانے کے لیے کئے گئے ہیں۔

جواب:۔ ان جملہ اکابر اور حضرات نے فصاعداً کی زیادت کے سلسلے میں جو اعتراض کئے ہیں ٹھوس دلائل اور واضح براہین کی بنا پر وہ باطل اور بے بنیاد ہیں علی الترتیب شق وار سب کے جوابات سن لیجئے۔

۱۔ ان اکابر کا یہ دعویٰ کہ فصاعداً کی زیادت بیان کرنے میں معمرؒ متفرد ہیں خود ان کے قواعد اور مسلّمات کے خلاف ہے۔ اولاً اس لیے کہ معمرؒ بالاتفاق ثقہ، ثبت اور حجت ہیں اور ثقہ کی زیادت بالاتفاق قابلِ قبول ہوتی ہے جس کی پوری تفصیل پہلے گذر چکی ہے۔ پھر یہ خلاف اصول دعوے کون سنتا ہے کہ معمرؒ کا تفرد مضر ہے و ثانیاً امام زہری کے تمام تلامذہ میں معمرؒ زیادہ قابل اعتماد اور (اثبت الناس فی الزھری) ہیں جیسا کہ عرض کیا جا چکا ہے اس لیے قاعدہ اور ضابطہ کے پیش نظر معمرؒ کی یہ زیادت صحیح اور معتبر ہے اور جن راویوں نے یہ زیادت نقل نہیں کی اصل قصور ان کا ہے و ثالثاً فصاعداً کی زیادت دیگر ثقہ راویوں سے بھی مروی ہے چنانچہ یہی فصاعداً کی زیادت سفیانؒ بن عیینہؒ سے[1] بسند صحیح مروی ہے (ابوداؤد جلد ۱ ص ۱۱۹) علاوہ ازیں فصاعداً کی زیادت امام اوزاعیؒ اور شعیبؒ بن ابی حمزہؒ سے بھی مروی ہے (کتاب القراۃ ص ۱۱) امام اوزاعیؒ کا ترجمہ نقل کیا جا چکا ہے اور شعیبؒ بخاری و مسلم کے مرکزی راوی ہیں حافظ ابن حجرؒ لکھتے ہیں کہ وہ ثقہ اور عابد تھے (تقریب ص ۱۶۹) مؤلف خیر الکلام لکھتے ہیں کہ اس کی سند میں احمدؒ بن ہارون مستملی ہے۔ ذہبیؒ فرماتے ہیں کہ ثقہ راویوں سے منکر روایتیں بیان کرتا ہے (ص ۹۸)

---

[1] سند کے راوی یہ ہیں قتیبہؒ بن سعیدؒ و ابن السرحؒ، سفیانؒ بن عیینہؒ، امام زہریؒ، محمودؒ بن ربیع، حضرت عبادہؓ، ان تمام کی توثیق اپنے اپنے موقع پر نقل کی جا چکی ہے اور ان میں ہر ایک ثقہ اور ثبت ہے مؤلف خیر الکلام نے یہ بیکار بہانہ کیا ہے کہ امام ابوداؤدؒ قتیبہؒ اور ابن سرحؒ کے طریق سے یہ زیادت نقل کرتے ہیں مگر دوسری کتابوں میں قتیبہؒ کی یہ زیادت نہیں لہٰذا ابن سرحؒ متفرد ہیں (محصلہ ص ۸۸) مگر یہ کوئی جواب نہیں کیونکہ دوسری کتابوں میں نہیں تو نہ سہی ابوداؤد میں تو بسند صحیح دونوں سے مروی ہے

الجواب :۔ خود مؤلف مذکور کے قلم سے وہ ایک مقام پر لکھتے ہیں کہ ان کے بعض راوی اگرچہ ضعیف ہیں مگر متابعت میں ذکر کرنے سے کوئی حرج نہیں ہے بلفظہٖ (خیر الکلام ص۳۱۶) اور یہی فصاعدًا کی زیادت عبدالرحمٰنؒ بن اسحاق مدنیؒ سے بھی مروی ہے (کتاب القرأۃ ص۱۱ وفصل الخطاب ص۳۲) اور جلد اول باب دوم حدیث ص۲۱ میں ان کا ترجمہ نقل کیا جا چکا ہے اور ان کے علاوہ یہی فصاعدًا کی زیادت صالحؒ بن کیسانؒ سے بھی منقول ہے (عمدۃ القاری جلد۳ ص۶۹) اور صالحؒ بن کیسانؒ ثبت اور فقیہ تھے (تقریب ص۱۴۹) مؤلف خیر الکلام لکھتے ہیں کہ علامہ عینیؒ نے حوالہ نہیں دیا (محصلہ ص۸۹) الجواب :۔ اگر اس میں کچھ کمزوری بھی ہو تب بھی متابعت میں پیش کرنے میں کوئی حرج نہیں ہے۔ اور خود مؤلف مذکور اس کے قائل ہیں کما مرّ۔

آپ نے دیکھ لیا کہ فصاعدًا کی زیادت کو امام معمرؒ، امام سفیانؒ بن عیینہؒ، امام اوزاعیؒ، امام شعیبؒ بن ابی حمزہؒ، امام عبدالرحمٰنؒ بن اسحاق مدنیؒ اور امام صالحؒ بن کیسانؒ جیسے جلیل القدر ائمہ حدیث اور ثقات وحفاظ نقل کرتے ہیں مگر فریق ثانی کا یہ پادر ہوا دعویٰ ہے کہ اس زیادت کے نقل کرنے میں معمرؒ متفرد ہیں اور دوسرے ثقات ان کی مخالفت کرتے ہیں فوا اسفا۔ فصاعدًا کے بجائے حضرت ابوسعید الخدریؓ سے مرفوع روایت میں ماتیسّر کی زیادت بھی مروی ہے (ابوداؤد جلد۱ ص۱۱۸ مسند احمد جلد۳ ص۴۵ سنن الکبریٰ جلد۲ ص۶۰ اور معرفت علوم الحدیث ص۹۷ وغیرہ) حافظ ابن حجرؒ لکھتے ہیں کہ اس کی سند قوی ہے (فتح الباری جلد۲ ص۲۰۲) اور دوسرے مقام پر لکھتے ہیں کہ اسنادہ صحیح (تلخیص الحبیر ص۸۷) امام نوویؒ لکھتے ہیں کہ ماتیسّر کی زیادت بخاری اور مسلم کی شرط پر صحیح ہے (شرح المہذب جلد۳ ص۳۲۹) قاضی شوکانیؒ، امام ابن سید الناسؒ سے (جو الشیخ العلامۃ المحدث الحافظ الادیب اور البارع تھے۔ تذکرہ جلد۴ ص۲۸۵) نقل کرتے ہیں کہ اسنادہ صحیح ورجالہ ثقات۔ (نیل الاوطار جلد۲ ص۱۰۶) اس کی سند صحیح اور اس کے راوی ثقہ ہیں۔ نواب صاحبؒ بھی اس زیادت کی تصحیح نقل کرتے ہیں (فتح البیان جلد۳ ص۴۲۷) مولانا شمس الحق صاحبؒ لکھتے ہیں کہ حافظ ابن حجرؒ، امام ابن حبانؒ اور علامہ ابن سید الناسؒ وغیرہ اس کی تصحیح کرتے ہیں۔ (عون المعبود جلد۱ ص۳۰۰) حضرت ابوہریرہؓ فرماتے ہیں کہ مجھے آنحضرت صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم

نے حکم دیا کہ جاکر لوگوں میں یہ اعلان کرو کہ ان لا صلوٰۃ الا بقرأۃ فاتحۃ الکتاب وما تیسر (موارد الظمان ص ۱۲۶)

حضرات! فن روایت میں اس سے بڑھ کر کسی روایت کی صحت ناممکن ہے فصاعداً اور ما تیسر کے علاوہ ماذاد کی زیادت بھی مروی ہے (جزء القرأۃ ص ۶۳، کتاب القرأۃ ص ۱۲ مستدرک جلد ۱ ص ۲۳۹ اور سنن الکبریٰ جلد ۲ ص ۳۷ وغیرہ) رہا مبارکپوری صاحبؒ کا یہ اعتراض کہ اس میں جعفرؒ بن میمونؒ ضعیف ہے (تحقیق الکلام جلد ۱ ص ۳۳ جلد ۱ ص ۳۳ وابکار المنن ص ۱۲۲) تو یہ کوئی وقعت نہیں رکھتا امام حاکمؒ ان کو بصرہ کے ثقات میں لکھتے ہیں۔ علامہ ذہبیؒ لکھتے ہیں کہ یہ حدیث صحیح ہے اور جعفرؒ ثقہ ہیں (مستدرک مع التلخیص جلد ۱ ص ۲۳۹) ابن معینؒ ان کو ثقہ اور صالح الحدیث کہتے ہیں۔ دار قطنیؒ ان کو معتبر کہتے ہیں۔ ابن عدیؒ کہتے ہیں کہ ان کی کوئی روایت منکر نہیں ہے ابن حبانؒ اور ابن شاہینؒ ان کو ثقات میں لکھتے ہیں (میزان جلد ۱ ص ۱۹۴ وتہذیب التہذیب جلد ۲ ص ۱۰۹) فصاعداً، ماتیسر اور ماذاد کے علاوہ اور بھی متعدد الفاظ[1] ایسے ہیں جو ماذاد علی الفاتحۃ کی اصلیت پر وضاحت سے دلالت کرتے ہیں اندریں حالات اس زیادت کا انکار کرنا تعصب کے علاوہ سراسر اصول شکنی اور مسلمات کی خلاف ورزی ہے جو قطعاً قابل قبول نہیں۔

---

[1] ایک روایت میں وسورۃ معہا کی زیادت ہے (ترمذی جلد ۱ ص ۳۲ وابن ماجہ ص ۶۱) اور ایک روایت میں وآیتین وثلاث کی زیادت ہے (جزء القرأۃ ص ۱۳) ایک روایت میں والسورۃ کی زیادت ہے (زیلعی جلد ۱ ص ۳۶۳) ایک روایت میں وثلاث آیات فصاعداً کی زیادت ہے (نصب الرایہ جلد ۱ ص ۳۶۵) ایک روایت میں وآیتین من القرآن کی زیادت ہے (مجمع الزوائد جلد ۲ ص ۱۱۵) ایک روایت میں ثم اقرأ بما شئت کی زیادت ہے (مسند احمد جلد ۴ ص ۳۴۰) ایک روایت میں وبما شاء اللہ ان تقرأ کی زیادت ہے (ابوداؤد جلد ۱ ص ۱۳۲) ایک روایت میں وشئی معہا کی زیادت ہے۔ (کتاب القرأۃ ص ۱۳) ایک روایت میں ثم قرأت بما معک من القرآن کی زیادت ہے (کتاب القرأۃ ص ۱۳) اور ایک روایت میں معہا غیرہا کی زیادت ہے (ایضاً) اور ایک روایت میں لفاتحۃ الکتاب وشئی معہا خداج کے الفاظ ہیں (ایضاً ص ۴) اور ایک روایت میں الا بفاتحۃ الکتاب فما فوق ذلک کے الفاظ ہیں (ایضاً ص ۱۵) اور اسی قسم کے الفاظ کتب حدیث میں اور بھی موجود ہیں مگر نمونہ کے لیے ہم انہیں پر اکتفاء کرتے ہیں۔

۲- فریق ثانی کا یہ کہنا کہ ماذاد علی الفاتحۃ کا وجوب اور اس کی رکنیت مسلم نہیں ہے یہ بھی محض اپنے دل کو عارضی تسکین پہنچانے کا سامان ہے اور ان کا ماذاد علی الفاتحۃ کے وجوب سے انکار کرنا باطل ہے اولاً اس لیے کہ جب آنحضرت صلی اللہ تعالیٰ علیہ وآلہ وسلم نے لا صلوٰۃ کے عمومی الفاظ کے تحت سورۂ فاتحہ اور فصاعدًا (وما تیسر اور ماذاد) کا حکم دیا ہے تو جیسے سورۂ فاتحہ واجب ہے اسی طرح فصاعدًا اور ماذاد علی الفاتحۃ بھی واجب ہے اور بلا کسی صحیح منقول یا معقول دلیل کے فصاعدًا کے وجوب کا انکار کون تسلیم کرتا ہے؟ وثانیاً حضرت ابوسعید الخدریؓ کے حوالہ سے مرفوع اور صحیح حدیث (جس کی تصحیح پر امام نوویؒ ابن سید الناسؒ حافظ ابن حجرؒ قاضی شوکانیؒ اور نواب صاحبؒ وغیرہ سب متفق ہیں) پہلے نقل کی جا چکی ہے اس کے پورے الفاظ یوں ہیں امرنا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ان نقرأ بفاتحۃ الکتاب وما تیسر آنحضرت صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے ہمیں یہ حکم دیا کہ ہم سورۃ فاتحہ اور اس کے علاوہ کچھ اور بھی جو آسانی سے پڑھا جا سکے پڑھا کریں۔ اس روایت سے معلوم ہوا کہ جس طرح آپ نے سورۂ فاتحہ پڑھنے کا حکم دیا ہے اسی طرح آپ نے ماتیسر کی قرأت کا بھی حکم دیا ہے اگر آپ کے حکم اور امر سے بھی وجوب ثابت نہیں ہوتا تو کس کے حکم سے ثابت ہو گا؟ وثالثاً مشہور مسیء الصلوٰۃ کی حدیث میں یہ الفاظ بھی موجود ہیں جو آنحضرت صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے ارشاد فرمائے ثم اقرأ بام القرآن ثم اقرأ بما شئت (مسند احمد وابن حبان، سبل السلام جلد ۱ ص۱۳۷) پھر تم سورۃ فاتحہ پڑھو اور پھر اس کے بعد تم قرآن کا جو حصہ چاہو پڑھو اور ابوداؤد (جلد ۱ ص۱۲۵) میں بسند صحیح یہ روایت ان الفاظ سے مروی ہے ثم اقرأ بام القرآن وبما شاء اللہ ان تقرأ پھر تم سورۃ فاتحہ اور اس کے ساتھ کچھ اور بھی جو اللہ کو منظور ہو پڑھو۔ ان روایتوں میں آپ نے ماذاد علی الفاتحۃ کی قرأت کا امر کے صیغہ (اقرأ) سے حکم دیا ہے اور اس کی پوری تحقیق پہلے ہو چکی ہے کہ امر وجوب کے لیے ہوتا اور حافظ ابن حجرؒ اسی حدیث کی شرح میں لکھتے ہیں کہ امر وجوب کے لیے ہے۔

(فتح الباری جلد ۲ ص۲۲۲) جناب رسول خدا صلی اللہ تعالیٰ علیہ وآلہ وسلم کے صحیح اور صریح امر اور حکم کو اپنی مرضی اور خواہش سے رد کر دینا کہاں کا انصاف ہے؟ ان دلائل سے معلوم ہوا کہ سورۂ فاتحہ کے علاوہ ماذاد علی الفاتحۃ کی قرأت یا بالفاظ دیگر ضم السورۃ مع الفاتحۃ

بھی واجب ہے رہا اس حدیث میں فصاعداً کی زیادت کو تقطع الید فی ربع الدینار فصاعداً
(کہ چور کا ہاتھ ربع دینار اور اس سے زیادہ میں قطع کرنا چاہیئے) پر قیاس کرنا تو قیاس مع الفارق اور باطل
ہے۔ اولاً اس لیے کہ محض عبادت کو محض عقوبت پر قیاس کرنا غلط ہے کیونکہ سورۃ فاتحہ اور اس کے
بعد کسی بھی سورۃ کا پڑھنا بالاتفاق عبادت اور کار ثواب ہے، اور ربع دینار یا اس سے زیادہ میں قطع ید
کی سزا نکال اور عقوبت ہے، اور دونوں میں زمین و آسمان کا فرق ہے، پھر ایک کو دوسرے پر قیاس
کرنا چہ معنی دارد؟ مؤلف خیر الکلام کہتے ہیں کہ یہ قیاس نہیں بلکہ ایک مثال دے کر فصاعداً والی
ترکیب کا مفہوم واضح کرنا ہے الخ (ص ۱۳۳) کیا اس مثال کے لیے کتب حدیث کے ذخیرہ میں قطع
سرقہ والی حدیث ہی مثال کے لیے دستیاب ہوئی ہے اور کوئی چیز موجود نہیں؟ اور جو لوگ
عبادت کو عقوبت پر قیاس بھی کرتے ہیں وہ کب تمام دنیا کو چیلنج کرتے ہیں؟ اور کب دوسرے
فریق کے عمل کو باطل بیکار اور کالعدم قرار دیتے ہیں؟ وثانیاً چوری کے سلسلہ میں تو صرف فصاعداً
کا لفظ مذکور ہے اور یہاں فصاعداً۔ ماتیسر اور ما زاد وغیرہ دیگر بے شمار الفاظ وارد ہیں
جیسا کہ آپ بعض کا مطالعہ کر چکے ہیں اس میں نرا فصاعداً ہی نہیں تاکہ آسانی کے ساتھ اس کو
اس پر قیاس کر لیا جائے۔ مؤلف خیر الکلام اس سے یوں گلو خلاصی کرتے ہیں کہ ہماری بحث عبادہؓ کی
حدیث میں ہے دوسری احادیث زیر بحث نہیں (ص ۱۳۳) الجواب:۔ آخر کیوں نہیں؟ کیا وہ اسی
باب کی حدیثیں نہیں ہیں؟ بات واضح ہے کہ چونکہ وہ صحیح بھی ہیں اور ان میں حرف واو کے ساتھ
(جو مغایرت کے لیے ہوتا ہے) وما تیسر وغیرہ آیا ہے جن کو مؤلف مذکور کا معدہ ہضم نہیں کر
سکتا اس لیے وہ زیر بحث نہیں وثالثاً اگر اس قیاس کو صحیح بھی تسلیم کر لیا جائے تب بھی یہ ہمیں
مضر نہیں ہے کیونکہ جیسے ربع دینار ادنیٰ نصاب ہے جس میں ہاتھ کاٹا جاتا ہے اور فصاعداً
میں بطریق اولیٰ کاٹا جائے گا، اسی طرح سورۃ فاتحہ اقل درجہ کا واجب ہے اور ما زاد علی الفاتحۃ
کامل اور مکمل واجب ہوگا۔ ورابعاً جب اصل مقیس علیہ ربع دینار ہی حنفیہ وغیرہ کے نزدیک مختلف
فیہ ہے تو اس پر قیاس کرنے کا کیا مطلب؟ وخامساً یہ طے شدہ قاعدہ ہے کہ نص کی موجودگی
میں قیاس باطل ہے۔ اور جمہور کی طرف سے مقتدی پر فاتحہ کے نہ ہونے کی صحیح اور صریح حدیثیں پیش
کی جا چکی ہیں جو اس مسئلہ میں نص ہیں۔ مؤلف خیر الکلام نے لفظ فصاعداً پر ضرورت سے زیادہ

لاطائل بحث کی ہے جس میں کام کی بات ایک بھی نہیں اس لیے ہم قارئین کرام کے ذہن کو پریشان نہیں کرتے

۳۔ حضرت عبداللہ بن عباسؓ کے طریق سے جو روایت پیش کی گئی ہے وہ نہایت ہی کمزور اور ضعیف ہے کیونکہ اس کی سند میں حنظلہ سدوسیؒ نامی راوی ہے۔ امام بخاریؒ فرماتے ہیں کہ امام یحییٰ القطانؒ نے فرمایا کہ میں نے عمداً اس کو ترک کر دیا تھا اور بعد کو وہ مختلط بھی ہو گیا تھا (ضعفاء صغیر ص۹) امام نسائیؒ لکھتے ہیں کہ وہ ضعیف تھے (ضعفاء صغیر امام نسائی ص۱۰) امام احمدؒ اس کو منکر الحدیث اور ابن معینؒ اس کو لیس بشئ کہتے ہیں (میزان الاعتدال جلد ۱ ص ۲۹۲ والجوہر النقی جلد ۲ ص ۶۱) محدث میمونیؒ، امام ابو عبداللہؒ سے اس کی تضعیف نقل کرتے ہیں۔ ابوحاتمؒ اس کو لیس بالقوی کہتے ہیں۔ ابن حبانؒ اس کو ضعفاء میں لکھتے ہیں اور کہتے ہیں کہ وہ ایسے مختلط ہو چکے تھے کہ ان کی اگلی اور پچھلی سب روایتیں خلط ملط ہو چکی تھیں کہ ان میں تمیز نہیں ہو سکتی (تہذیب التہذیب جلد ۳ ص ۶۲) یہ ہے وہ روایت جس سے مبارکپوری صاحب فصاعداً، ماتیسر اور مازاد وغیرہ کی صحیح زیادت کو رد کرتے ہیں تعجب اور حیرت ہے اس انصاف پر حضرت ابوہریرہؓ سے بھی ایک روایت مروی ہے وہ فرماتے ہیں کہ ایک شخص آیا اور اس نے آنحضرت صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم سے سوال کیا یا رسول اللہ ارأیت ان لم یکن معی الا ام القرآن قال ھی حسبک ھی السبع المثانی (کتاب القرأۃ ص۸) یا رسول اللہ یہ فرمایئے کہ اگر مجھے سورۃ فاتحہ کے علاوہ اور کوئی سورت یاد نہ ہو تو میں کیا کروں؟ آپ نے فرمایا یہی تجھے کافی ہے کیونکہ یہ سبع مثانی ہے لیکن اس کی سند میں ابراہیم بن فضل مدنیؒ ہے امام احمدؒ اور ترمذیؒ اس کو ضعیف الحدیث کہتے ہیں ابن معینؒ کہتے ہیں لیس حدیثہ بشئ امام بخاریؒ اس کو منکر الحدیث اور ابوحاتمؒ ضعیف الحدیث اور منکر الحدیث کہتے ہیں ابوزرعہؒ اس کو ضعیف کہتے ہیں نسائیؒ اس کو لیس بثقہ اور منکر الحدیث کہتے ہیں ابو احمد حاکمؒ کہتے ہیں کہ وہ محدثین کے نزدیک قوی نہیں ہے، دارقطنیؒ اور ازدیؒ اس کو متروک کہتے ہیں۔ (تہذیب التہذیب جلد ۱ ص ۱۵۰، ۱۵۱) الغرض ما زاد علی الفاتحۃ کی نفی پر صریح، صحیح اور مرفوع روایت موجود نہیں ہے بخلاف اس کے مازاد، ماتیسر اور فصاعداً کی روایتیں بالاتفاق صحیح صریح اور مرفوع ہیں پھر ان کا انکار محض تعصب ہے۔

۴۔ مبارکپوری صاحبؒ نے کفایتِ سورۂ فاتحہ پر حضرت ابوہریرہؓ کی جو روایت پیش کی ہے، وہ ان کے لیے ہرگز مفیدِ مطلب نہیں ہو سکتی۔ کیونکہ یہ حضرت ابوہریرہؓ پر موقوف ہے اور کسی مرفوع اور صحیح روایت میں اس قسم کے الفاظ منقول نہیں ہیں (دیکھئے فتح الملہم جلد ۲ صفحہ ۳۱ وغیرہ) اور موقوفاتِ صحابہؓ کے بارے میں فریقِ ثانی کا مسلک نقل کیا جا چکا ہے کہ موقوفات صحابہؓ حجت نیست اگرچہ بصحت رسد و ثانیاً یہ تو ان موقوفات کا حکم ہے جو بظاہر آنحضرت صلی اللہ تعالیٰ علیہ وآلہ وسلم کے ارشاد کے مخالف نہ ہوں اور یہاں تو یہ قول فصاعداً، ماتیسر اور ما زاد کے مخالف ہے پھر یہ کیسے حجت ہو گا؟ بجائے اس کے کہ خود اس موقوف اثر کا کوئی مناسب اور صحیح محمل بیان کیا جائے اس کو مرفوع حدیث کے مقابلہ میں پیش کرنا عجیب ترہات ہے۔

۵۔ حافظ ابن حجرؒ لکھتے ہیں کہ امام قرطبیؒ اور ابن حبانؒ وغیرہ نے یہ دعویٰ کیا ہے کہ ما زاد علی الفاتحۃ کی قرأت بالاجماع نہیں ہے لیکن حافظ موصوفؒ ان پر گرفت کرتے ہوئے لکھتے ہیں فیہ نظر لثبوتہ عن بعض الصحابۃؓ ومن بعدھم (فتح الباری جلد ۲ صفحہ ۲۰۲) اجماع کا دعویٰ محلِ غور ہے کیونکہ بعض حضرات صحابہ کرامؓ اور ان کے بعد کے سلفؒ سے ما زاد کا وجوب بھی ثابت ہے اور حافظ ابن القیمؒ بفاتحۃ الکتاب میں حرف باء کے تعدیہ سے استدلال کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ وھذا لا یعطی الاقتصار علیھا بل یشعر بقراءۃ غیرھا معھا (بدائع الفوائد جلد ۴ صفحہ ۲۶) اس سے صرف سورۂ فاتحہ پر اقتصار ہی ثابت نہیں بلکہ غیر فاتحہ کی قرأت پر بھی یہ دال ہے۔ اور قاضی شوکانیؒ اس مسئلہ پر بحث کرتے ہوئے تحریر فرماتے ہیں کہ:

وھذہ الاحادیث لا تقصر عن الدلالۃ علی وجوب قرآن مع الفاتحۃ الی ان قال وقد ذھب الی ایجاب قرآن مع الفاتحۃ عمرؓ وابنہ عبد اللہؓ وعثمان بن ابی العاصؓ والھادی و القاسم والمؤید باللہ الی ان قال والظاھر ماذھبوا الیہ من ایجاب شیء من القرآن

اور یہ حدیثیں (جن میں فصاعداً، ماتیسر اور ما زاد کی زیادت موجود ہے) اس حکم پر دلالت کرنے سے قاصر نہیں ہیں کہ سورۂ فاتحہ کے ساتھ قرآن کا کوئی اور حصہ بھی واجب ہے چنانچہ حضرت عمرؓ، حضرت ابن عمرؓ، حضرت عثمانؓ بن ابی العاص، ہادی، قاسم، اور مؤید باللہ کا بھی مسلک ہے اور ان احادیث کے پیشِ نظر بظاہر ان کا

(نیل الاوطار جلد ۲ ص ۲۳۱) یہ مسلک صحیح ہے کہ سورۂ فاتحہ کے علاوہ قرآن کریم کا کوئی اور حصہ بھی واجب ہونا چاہیئے۔

حضرت مولانا شیخ الاسلام شبیر احمد صاحب عثمانیؒ لکھتے ہیں کہ

ولهذا اوجب الحنفية قرأة الفاتحة وضم السورة اليها قال فى البحر و هما واجبتان للمواظبة۔ (فتح الملهم جلد ۲ ص ۳۰)

ان احادیث کو مدنظر رکھ کر فقہاء احنافؒ نے سورۂ فاتحہ اور اس کے ساتھ کسی اور سورت (خواہ چھوٹی سورت ہی ہو) کے وجوب پر استدلال کیا ہے۔ صاحب البحر الرائق کہتے ہیں کہ چونکہ آپؐ نے ان پر مواظبت کی ہے۔ لہذا سورۂ فاتحہ اور اس کے علاوہ کوئی اور سورۃ دونوں واجب ہیں۔

حضرت امام ابو حنیفہؒ کا بھی یہی مسلک ہے (فتح الملہم جلد ۲ ص ۲۹) اور ابن کنانہ مالکیؒ کا بھی یہی مسلک ہے (حاشیہ نسائی جلد ۱ ص ۱۰۵) اور امیر یمانیؒ حدیث مسئ الصلوٰۃ کی شرح میں لکھتے ہیں کہ فتجب الفاتحة فى كل ركعة وتجب قرأة ماشاء معها فى كل ركعة اھ (سبل السلام جلد ۱ ص ۲۴۸) کہ ہر رکعت میں اس کے ساتھ جتنی قرأت نمازی چاہے وہ بھی واجب ہے۔ اور حضرت مولانا سید محمد انور شاہ صاحبؒ تحریر فرماتے ہیں۔

ووجوب السورة قول عند المالكية والحنابلة (فصل الخطاب ص ۱۷) یعنی سورۂ فاتحہ کے ساتھ کسی اور سورت کا ملانا اور اس کو واجب قرار دینا مالکیوں اور حنبلیوں کا بھی ایک قول ہے۔ بلکہ حضرت امام شافعیؒ کی ایک عبارت سے بھی ما زاد على الفاتحة کا وجوب ہی مترشح ہوتا ہے چنانچہ وہ لکھتے ہیں کہ:۔

وهو قد يحتمل ان يكون الفرض على من احسن القرأة قرأة ام القران و آية واكثر۔ (کتاب الام جلد ۱ ص ۸۹)

اور اس میں یہ بھی احتمال ہے کہ جو شخص قرآن کریم کی اچھی طرح قرأت کر سکتا ہو اس پر سورۂ فاتحہ اور ایک آیت اور اس سے زیادہ کی قرأت بھی فرض ہو۔

اگر اتنی خدا کی دنیا کے منکر جانے کے بعد بھی اجماع باقی رہتا ہے تو وہ کوئی عجیب سخت جان اجماع ہو گا۔ امام نوویؒ لکھتے ہیں کہ وضوء اور غسل میں پانی استعمال کرنے کی کوئی حد اور

مقدار متعین نہیں ہے اور اس پر اجماع ہے (شرح مسلم جلد ۱ ص۱۷۸) مبارکپوری صاحبؒ ان پر گرفت کرتے ہوئے لکھتے ہیں فی دعوی الاجماع کلام کہ اجماع کے دعوی کرنے میں کلام ہے کیونکہ ابن شعبان مالکیؒ اور محمدؒ بن الحسنؒ اس سے اختلاف کرتے ہیں (تحفۃ الاحوذی جلد ۱ ص۲۱۶) امام ابن حزمؒ ایک مسئلہ پر بحث کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ اس میں اجماع کا دعوی صحیح نہیں ہے کیونکہ حضرت عطاءؒ، عمرؒ بن عبدالعزیزؒ، حسنؒ، زہریؒ، ابوسلمہؒ بن عبدالرحمنؒ اور سلیمانؒ بن یسارؒ اس سے اختلاف کرتے ہیں وَاَنّٰی لکل اجماع یخرج عنہ ھؤلاء (محلی جلد ۷ ص۳۲۷) اور حیف ہے اس اجماع پر جس سے یہ بزرگ خارج ہوں۔

قارئین کرام! آپ نے ملاحظہ کر لیا کہ فریق ثانی فصاعدا، ماتیسر اور ما زاد کی صحیح زیارت سے کیسے پہلو تہی کرتا ہے اور عدم وجوب ما زاد علی الفاتحۃ پر کیسی روایات سے استدلال کرتا ہے اور اجماع کے خوش کن الفاظ کے ہوائی قلعہ میں کیسے بچاؤ کا انتظام کرتا ہے مگر یہ سب کچھ کرتے ہوئے وہ اہلحدیث اور ان کے مخالف تمام صرف اہل الرائے ہیں۔ افسوس اور صد افسوس ہے ایسے تعصب پر۔ مؤلف خیر الکلام نے اس سے یہ مخلص تلاش کیا ہے کہ ان روایات میں مقدار کا ذکر نہیں اور واجب میں تعیین لازمی ہوتی ہے (مصلہ ص۱۹۲) الجواب:۔ ہر واجب میں تعیین غیر مسلم ہے اصول فقہ کی کتابوں (مثلاً التحریر ص۲۵۱ اور مسلم الثبوت ص۲۹ وغیرہ) میں اس کی تصریح موجود ہے کہ واجب میں کبھی تخییر بھی ہوتی ہے جس کو واجب مخیّر کہتے ہیں جیسے قسم کے کفارہ میں متعدد اشیاء میں سے جو چاہے کرے اور جنایات حج میں بعض صورتوں میں دم (یعنی قربانی) لازم ہے ادنیٰ بکری وغیرہ ہے اور اعلیٰ کی کوئی مقدار متعین نہیں اونٹ ہو یا گائے وغیرہ اور یہاں عند البعض ادنیٰ تین آیتیں اور عند البعض ایک آیت طویلہ ہے زیادہ کی کوئی حد نہیں علاوہ ازیں ابھی امیر یمانیؒ وغیرہ کے حوالہ سے عرض کیا گیا ہے کہ وہ سورۃ فاتحہ کی قراءۃ کے سوا اور قراءۃ کو بھی واجب کہتے ہیں جو نمازی کی مرضی پر ہے ماشاء معہا اھ۔

۶۔ ام القرآن عوض عن غیرھا الخ کی روایت سے ما زاد علی الفاتحہ کی نفی پر استدلال کرنا صحیح نہیں ہے۔ اوّلاً اسلئے کہ اس کی سند میں محمد بن خلاد ہے علامہ ذہبیؒ لکھتے ہیں۔ لا یدری من ھو (میزان جلد ۳ ص۵۳) معلوم نہیں کہ وہ کون اور کیسا تھا۔ ابوسعیدؒ بن یونسؒ ان کو صاحب مناکیر بتلاتے ہیں (ایضاً) امام دارقطنیؒ کا بیان ہے کہ ام القرآن عوض عن غیرھا الخ کے الفاظ بیان کرنے میں محمد بن خلاد متفرد ہے صحیح الفاظ

وہی ہیں جو امام زہریؒ وغیرہ نے بیان کیے ہیں لا تجزئ صلاۃ لا یقرأ فیھا بام القرآن۔
(میزان الاعتدال جلد ۱ صـــ۱۲۲) حافظ ابن حجرؒ لکھتے ہیں کہ اگرچہ محدث عجلیؒ اور ابن حبانؒ نے ان کی توثیق کی ہے لیکن معمر اور القرآن الخ میں محمد بن خلاد نے غلطی کی ہے اور نقل بالمعنی کا ارتکاب کیا ہے صحیح الفاظ وہی ہیں جو لا صلوٰۃ الا بفاتحۃ الکتاب سے مروی ہیں کیونکہ جمہور محدثین جن میں حضرت امام احمدؒ ابن ابی شیبہؒ اسحاقؒ بن راہویہؒ، ابن ابی عمرؒ، عمرو الناقدؒ معمرؒ، صالح بن کیسانؒ اوزاعیؒ اور یونسؒ بن یزیدؒ خاص طور پہ قابل ذکر ہیں اس حدیث کو لا صلوٰۃ لمن یقرأ بفاتحۃ الکتاب کے الفاظ ہی سے نقل کرتے ہیں (لسان المیزان جلد ۵ صـــ۱۵۶) وثانیاً اگر یہ روایت انہیں الفاظ کے ساتھ صحیح بھی ہو تب بھی ما زاد علی الفاتحۃ کی نفی پر اس سے استدلال صحیح نہیں ہے اس لیے کہ اس میں نہ خلف الامام کی قید ہے اور نہ مقتدی کی تصریح ہے لہٰذا یہ امام اور منفرد کے حق میں ہو گی اور اپنی بعض خصوصیات کی وجہ سے سورۃ فاتحہ کی جگہ کوئی اور سورت قائم نہیں ہو سکتی جیسا کہ محققین احنافؒ کا مسلک ہے اور اس کے وجوب پر تو تمام کا اتفاق ہے اور مطلب واضح ہے کہ سورۃ فاتحہ باقی تمام سورتوں کی عوض ہے مگر اس کی جگہ کوئی اور سورت قائم نہیں ہو سکتی اس کو نفی ما زاد سے کیا تعلق ہے؟ اسی طرح ایک روایت ان الفاظ سے مروی ہے لا تجزئ صلوٰۃ لا یقرأ الرجل فیھا فاتحۃ الکتاب (کتاب القرأۃ صـــ۹) لیکن حافظ ابن حجرؒ اور صاحب تعلیق المغنی (جلد ۲ صـــ۱۲۲ میں) اس کی تصریح کرتے ہیں رواہ جماعۃ بلفظ لا صلوٰۃ لمن لم یقرأ وھو الصحیح وکان زیاد رواہ بالمعنی۔ (فتح الباری) کہ محدثینؒ کی جماعت اس روایت کو لا صلوٰۃ لمن یقرأ کے الفاظ سے روایت کرتی ہے یہ زیادؒ بن ایوبؒ کی غلطی ہے کہ انہوں نے روایت بالمعنی کا ارتکاب کر کے اس کا مطلب بدل دیا ہے اور حافظ ابن حجرؒ لکھتے ہیں کہ اشہبؒ اور زیادؒ بن ایوبؒ کی روایت منقولۃ بالمعنی (لسان جلد ۵ صـــ۱۵۶) منقول بالمعنی ہے۔ پہلے تو مثال کے طور پہ ہم یہ سنا کرتے تھے کہ بعض لوگ لا تقربوا الصلوٰۃ کے قائل ہوتے ہیں اور آگے نہیں پڑھا کرتے مگر اب تو اپنے ماتھے پہ لگی ہوئی آنکھوں کے ساتھ ایسا فرقہ بھی دیکھ لیا ہے جو کبھی تو واذا قرأ فانصتوا کی صحیح زیادت کو کھا جاتا ہے۔ اور کبھی فصاعداً۔ ما تیسر اور ما زاد کی صحیح زیادت کو ہضم کر جاتا ہے اور کبھی الا وراء الامام

کی استثناء کو ہڑپ کر جاتا ہے اور اس زیادت کو اُڑا کر ساری دنیا کے مسلمانوں کو یہ چیلنج کرتا ہے کہ تمہاری نماز باطل ہے، بیکار ہے، اور کالعدم ہے۔ تعجب اور حیرت ہے اس دیانت پر سو فیصدی محدثین کا اتفاق پہلے نقل کیا جا چکا ہے کہ زیادت جو ثقہ راوی سے منقول ہو وہ واجب القبول ہوتی ہے اور حافظ ابن حجرؒ بھی الاخذ بالزائد فالزائد کا ضابطہ بیان کرتے ہیں (فتح الباری جلد ۲ صفحہ ۲۲) اور اس زیادت کو بیان کرنے والے بالاتفاق ثقہ، ثبت اور حجت بلکہ اثبت الناس فی فلاں کا مصداق ہیں مگر باوجود اس کے فریق ثانی تمام طے شدہ اصول وضوابط کو پامال کرتا ہوا صرف اپنی ضد پر قائم ہے اعاذنا اللہ تعالیٰ منہ۔

جواب سوم: جب یہ بات قطعی طور پر ثابت ہو چکی ہے کہ حرف من عموم میں نص قطعی نہیں ہے اور یہ بات بھی پایۂ ثبوت کو پہنچ چکی ہے کہ اسی روایت میں صحیح اسانید کے ساتھ جناب رسول خدا صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم سے فصاعداً، ماتیسر اور مازاد کی زیادت بھی مروی ہے جس کا مطلب یہ ہے کہ جس شخص نے سورۂ فاتحہ اور اس کے ساتھ قرآن کریم کے کسی اور حصہ کی قرأت نہ کی تو اس کی نماز نہ ہوگی اور گو مقتدی کے لیے سورۂ فاتحہ کی قرأت کا پڑھنا اور نہ پڑھنا محل نزاع ہے لیکن اس بات پر سب کا اتفاق ہے کہ مازاد علی الفاتحۃ کی قرأت مقتدی کے لیے جائز نہیں اس لیے اس حدیث کا صحیح اور حقیقی مصداق صرف امام یا منفرد ہے کیونکہ سورۂ فاتحہ کے ساتھ قرآن کریم کے کسی اور حصہ کا پڑھنا صرف امام اور منفرد کے لیے ہی ضروری ہے۔ مقتدی پر اس روایت کے مشتمل نہ ہونے کے لیے فصاعداً، ماتیسر اور مازاد کی زیادت نہ صرف کافی ہے بلکہ نص صریح ہے اور اس حدیث کا امام پر مشتمل ہونا اتفاقی امر ہے البتہ بعض حضرات صحابہ کرامؓ اور دیگر ائمہ حدیثؒ کے بیان سے یہ بات صاف آشکارا ہوتی ہے کہ اس حدیث کا اصلی مصداق صرف منفرد اور اکیلا ہے اور ضمنی طور پر امام بھی اس میں داخل ہے لوجود العلۃ۔ ہاں مگر مقتدی اس سے بہر حال خارج ہے۔ چنانچہ حضرت جابرؓ بن عبداللہؓ فرماتے ہیں کہ حدیث لا صلوٰۃ لمن یقرأ بفاتحۃ الکتاب فصاعداً منفرد کے حق میں وارد ہوئی ہے (موطا امام مالکؒ ص ۲۸ وترمذی جلد ۱ ص ۴۲ وقال ھذا حدیث حسن صحیح) اور حضرت عبداللہؓ بن عمرؓ فرماتے ہیں کہ یہ حکم منفرد کے لیے ہے (موطا امام مالکؒ ص ۲۹) امام احمدؒ بن حنبلؒ فرماتے ہیں

کہ یہ حکم منفرد کے لیے ہے۔ (ترمذی جلد ا صلا۴۲) امام سفیانؒ بن عیینہؒ فرماتے ہیں کہ یہ حکم منفرد کے لیے ہے (ابوداؤد جلد ا صلا۱۱۹) اور امام اسمٰعیلیؒ (المتوفی سنہ ۳۷۱ھ جو الامام الحافظ الثبت، شیخ الاسلام اور کبیر الشافعیۃ تھے (تذکرہ جلد ۳ صلا۱۴۹) امام حاکمؒ کہتے ہیں کہ وہ شیخ المحدثین والفقہاء تھے (ایضاً صلا۱۵۰) خطیب تبریزیؒ لکھتے ہیں کہ وہ الامام اور الحافظ تھے اکمال صلا۶۲۸) فرماتے ہیں کہ یہ حدیث منفرد کے بارے میں ہے (بذل المجہود جلد ۲ صلا۵۲) امام موفق الدینؒ ابن قدامہ الحنبلیؒ فرماتے ہیں کہ:۔

فاما حدیث عبادۃؓ الصحیح فھو محمول علیٰ غیر المأموم وکذٰلک حدیث ابی ھریرۃ الخ (مغنی جلد ا صلا۶۰۶ طبع لولاق) — حضرت عبادہؓ کی جو حدیث صحیح ہے تو وہ غیر مقتدی پر محمول ہے اور اسی طرح حضرت ابوہریرہؓ کی روایت بھی غیر مقتدی پر محمول ہے۔

حضرت ابوہریرہؓ کی حدیث آگے دوسری حدیث کے عنوان سے آرہی ہے اور امام شمس الدینؒ فرماتے ہیں کہ:۔

فالحدیث الاول الصحیح محمول علیٰ غیر الماموم وکذا حدیث ابی ھریرۃؓ اھ (شرح مقنع للکبیر جلد ۲ صلا۱۲) — وہ مقتدی کے علاوہ دوسروں پر محمول ہے اور اسی طرح حضرت ابوہریرہؓ کی روایت بھی غیر مقتدی کے حق میں ہے۔

فصاعدًا، ما تیسر اور ما زاد کی زیادت کے پیش نظر ان اکابر کا یہ ارشاد سو فیصدی صحیح ہے جس میں شک نہیں ہو سکتا۔ مؤلف خیر الکلام کہتے ہیں کہ حضرت جابرؓ اور حضرت ابن عمرؓ کی یہ بات نہایت کمزور ہے کیونکہ وہ اس حدیث کے راوی نہیں ہیں بخلاف حضرت عبادہؓ کے کہ وہ اس کے راوی ہیں، باقی امام احمدؒ اور سفیانؒ کے قول سے اس کو منفرد پر کوئی محمول کرے تو اس کی مرضی دوسروں کے لیے حجت نہیں (محصلہ صلا۱۳۵)

الجواب:۔ حضرت عبادہؓ کی روایت بقید خلف الامام ہے ہی ضعیف جیسا کہ انشاء اللہ تعالیٰ آئے گا جس کا کوئی اعتبار نہیں بخلاف حضرت جابرؓ وغیرہ کی حدیث کے جو بالکل صحیح ہے اور حرف مَن کی تخصیص کا (بشرطیکہ عام ہو) یہ واضح قرینہ ہے اور اسی لیے حضرت امام احمدؒ وغیرہ نے اس روایت کو غیر مقتدی کے لیے کہا ہے جو مبنی بر دلیل ہے، نری مرضی کا سوال نہیں

کیونکہ اسی حدیث میں فصاعداً اور مَا تَیَسَّرَ وغیرہ کی زیادت بھی تو موجود ہے جو غیر مقتدی کے بارے میں ایک گونہ نص ہے۔

اعتراض: مبارکپوری صاحبؒ لکھتے ہیں کہ جناب رسول خدا صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کے قول کی تخصیص کتاب اور سنت سے ہی ہو سکتی ہے امام احمدؒ اور سفیانؒ بن عیینہؒ کے قول سے نہیں ہو سکتی (ابکار المنن)

جواب:- مبارکپوری صاحب نے کیسی دُور اندیشی کا ثبوت دیا ہے کہ حضرت جابرؓ اور حضرت ابن عمرؓ کا نام تک نہیں لیا اور صرف امام احمدؒ اور ابن عیینہؒ کا نام لے کر دفع الوقتی کی ناکام کوشش کی ہے لیکن موصوفؒ کا یہ اعتراض بھی باطل ہے اوّلاً اس لیے کہ حرفِ مَن کی تخصیص کتاب اللہ اور سنت رسول اللہ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم ہی سے کی گئی ہے اور علماء عربیت کے حوالے اس پر مستزاد ہیں وثانیاً اگر اس حدیث میں منفرد وغیرہ کی تخصیص کی گئی ہے تو جناب رسول خدا صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کے صحیح ارشاد فصاعداً، مَا تَیَسَّرَ اور مازاد وغیرہ کی زیادت کی بناء پر نہ کہ صرف امام احمدؒ اور ابن عیینہؒ وغیرہ کے قول سے ان کا اگر کوئی قصور ہے تو صرف یہ کہ انھوں نے اس کو بیان کیوں کیا ہے؟ وثالثاً ضرورت تو نہیں مگر مبارکپوری صاحب کا مغالطہ بھی نکالنا ہے کہ عام کی تخصیص کتاب اور سنت کے علاوہ کسی اور چیز سے بھی ہو سکتی ہے۔ یا نہیں؟ قاضی شوکانیؒ جو علامہ زمن اور مجتہد مطلق تھے (تقصار ص۸۲) لکھتے ہیں فدل ذلک علی ان العموم یخص بالقیاس (نیل الاوطار جلد ۴ ص۸) اس سے معلوم ہوا کہ عموم کی تخصیص قیاس سے بھی صحیح ہے امام ابن دقیق العیدؒ (المتوفی سنہ ۷۰۲ھ) جو الامام الفقیہ المجتہد، المحدث، الحافظ، العلامۃ اور شیخ السلام تھے (تذکرہ جلد ۴ ص۲۶۲) فرماتے ہیں کہ جب تخصیص کی وجہ ظاہر ہو تو بلا اختلاف احدے قیاس اور رائے سے بھی عموم کی تخصیص جائز ہے (بحوالہ فیض الباری جلد ۲ ص۱۲۷) علامہ جزائریؒ لکھتے ہیں کہ تمام علماء اسلام کا اس بات پر اتفاق ہے کہ عموم کی تخصیص دلالت عقلی اور قیاس سے بھی جائز ہے (توجیہ النظر ص۷۹) اور حافظ ابن کثیرؒ لکھتے ہیں۔

لان القیاس مقدم علی العموم کما حضرات ائمہ اربعہؒ اور جمہور اہل اسلام کے نزدیک

هومذهب ائمة الاربعة والجمهور قیاس عموم سے مقدم ہے ۔

(تفسیر ابن کثیر جلد ۲ ص۹)

مولانا ظفر احمد صاحب تھانوی لکھتے ہیں کہ خبر واحد کی تخصیص جب عقل، عرف اور قیاس سے جائز ہے ۔ جیسا کہ فن اصول کی یہ طے شدہ اور مبرہن حقیقت ہے تو صحابی کے قول سے خبر واحد کی بطریق اولیٰ تخصیص جائز ہوگی (اعلاء السنن جلد ۸ ص۵۳) اور اصول فقہ کی کتابوں میں اس پر مستقل بحث موجود ہے کہ عموم کی تخصیص عقل، حس اور عادت وغیرہ سے جائز اور صحیح ہے (مثلاً دیکھئے توضیح وتلویح ص۱۱۸ وغیرہ)

مؤلف "خیر الکلام" لکھتے ہیں کہ مطلق کے بعض افراد کی تقیید موقع اور محل کے اعتبار سے جائز ہے (ص۳۸۳) نہ معلوم مبارکپوری صاحب کس سادگی سے عموم کی تخصیص کے لیے کتاب وسنت کی دلیل کا مطالبہ کرتے ہیں؟ حالانکہ اس روایت میں عموم کی تخصیص محض قیاس سے نہیں کی گئی بلکہ کتاب اللہ اور صحیح احادیث سے بلکہ خود اسی روایت میں جناب رسول اللہ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کے صحیح ارشاد سے تخصیص کی گئی ہے تاکہ مبارکپوری صاحب ناراض نہ ہوجائیں الحاصل اس روایت میں فصاعداً، ماتیسّر اور مازاد وغیرہ کی زیادت کے مدنظر رکھنے سے یہ بات واضح سے واضح تر ہوجاتی ہے کہ اس حدیث کا مصداق ہرگز ہرگز مقتدی نہیں ہے اور مقتدی کو امام کے پیچھے بغیر استماع اور انصات کے کوئی چارہ نہیں ہے ہاں جو جماعت نظریہ بدلنے میں ہتک شان سمجھے تو اس کا کوئی علاج نہیں ہے ۔

جواب چہارم :۔ جمہور اہل اسلام کا اس بات پر اتفاق ہے کہ اگر کوئی شخص رکوع کی حالت میں امام کے ساتھ نماز میں شریک ہوا تو اگرچہ اس نے خود سورۂ فاتحہ نہیں پڑھی اور نہ امام سے سنی ہے لیکن اس کی وہ رکعت اور نماز صحیح ہے چنانچہ امام شافعیؒ لکھتے ہیں کہ رکوع کی حالت میں جس نے امام کو پالیا اس کی وہ رکعت صحیح ہوجاتی ہے ۔ (کتاب الام جلد ۱ ص۸۷) شیخ الاسلام ابن تیمیہؒ لکھتے ہیں کہ جس نے امام کے ساتھ رکوع پالیا اس کی وہ رکعت ہوگئی (منہاج السنة جلد ص۵) امام نوویؒ لکھتے ہیں کہ جو شخص امام کو رکوع میں پالے اس کی وہ رکعت سورۂ فاتحہ پڑھے بغیر بھی جائز ہے (شرح مسلم جلد ص۱۳۵ ومثلہ فی شرح

المهذب جلد ۳ صـ۳۲۶) حافظ ابن عبدالبرؒ لکھتے ہیں کہ جمہور فقہاءؒ کا اس بات پر کلی اتفاق ہے کہ جس شخص نے امام کو رکوع کی حالت میں پالیا ہو اور سورۂ فاتحہ نہ پڑھی ہو تو اس کی وہ رکعت اور نماز صحیح ہے۔ امام مالکؒ اور امام شافعیؒ، امام ابو حنیفہؒ، امام ثوریؒ، امام اوزاعیؒ، امام ابو ثورؒ، امام احمد بن حنبلؒ اور امام اسحاقؒ بن راہویہؒ (وغیرہ) کا یہی مسلک ہے اور حضرات صحابہ کرامؓ میں حضرت علیؓ، حضرت ابن مسعودؓ، حضرت زیدؓ بن ثابت اور حضرت ابن عمرؓ کا یہی مسلک ہے اور ہم نے تمہید میں ان کی جملہ اسانید درج کر دی ہیں (بحوالہ امام الکلام صفحہ ۶ و اوجز المسالک جلد ۱ صـ۲۴۰ و اعلاء السنن جلد ۴ صـ۳۲۹) نواب صاحبؒ لکھتے ہیں کہ جمہور کا یہی مسلک ہے کہ جس نے رکوع میں امام کو پالیا ہو۔ تو اس کی وہ رکعت صحیح ہے۔ (بدور الاھلہ صـ۶۵ و دلیل الطالب صـ۳۳۳) مولانا شمس الحق صاحب عظیم آبادیؒ لکھتے ہیں کہ قاضی شوکانی صاحبؒ نے (نیل الاوطار جلد ۲ صـ۱۱۳ میں) پہلے یہ لکھا تھا کہ مُدرِک رکوع کی وہ رکعت شمار نہ ہوگی لیکن بعد کو جمہور کے مسلک کی طرف رجوع کر لیا چنانچہ انہوں نے اپنے فتح الربانی میں اس کی تصریح کی ہے کہ امام کے ساتھ رکوع میں مل جانے والے کی وہ رکعت بالکل صحیح ہے (عون المعبود جلد ۱ صـ۳۳۴) مبارک پوری صاحبؒ حدیث میں من صلی رکعۃ لم یقرأ فیھا (الحدیث) کی تحقیق میں لکھتے ہیں کہ اس سے مُراد وہ رکعت ہو سکتی ہے جس میں مقتدی نے امام کو بحالت رکوع پالیا ہو اور خود قرأت نہ کی ہو اس کی وہ رکعت جائز اور صحیح ہوگی۔ (تحفۃ الاحوذی جلد ۱ صـ۲۶۱) مؤلف "خیر الکلام" لکھتے ہیں کہ اسی طرح اگر رکوع والی حالت میں رکعت کا صحیح ہونا دلائل سے ثابت ہو جائے (جو ٹھوس حوالوں سے یقیناً ثابت ہے۔ صفدر) تو اس کی تخصیص کر لی جاتی ہے نہ یہ کہ اس کو رد کر کے اعتراض کیا جائے گا۔ بلفظہٖ صـ۱۳۶) ہم تو پہلے ہی سے اس حدیث کی تخصیص کے قائل ہیں لیجئے اب مؤلف مذکور بھی تخصیص کو مان گئے ہیں البتہ اعتراض کے لفظ سے ذرا گھبراتے ہیں۔ اور اسی صفحہ میں اس سے پہلے لکھتے ہیں کہ اور اس حدیث سے صرف ایک بار فاتحہ کا واجب ہونا ثابت ہوتا ہے، اگر کوئی شخص رکوع میں رکعت کے جواز کا قائل ہے تو اس سے اس حدیث کی مخالفت لازم نہیں آتی اھ

الجواب:۔ بس اسی طرح اگر کوئی شخص صرف منفرد کے لیے فاتحہ پڑھنے کا قائل ہو تو اس سے اس حدیث کی عین مطابقت پیدا ہوتی ہے کیونکہ یہ حدیث ہی لمن یصلی وحدہٗ

کے بارے میں ہے۔ اگر اس حدیث سے ہر رکعت میں صرف ایک بار فاتحہ کا ثبوت ہے تو حدیث مسیئ الصلوٰۃ سے ہر رکعت میں سورۂ فاتحہ کا ثبوت ہے۔ چنانچہ امیر یمانیؒ اس کے فوائد میں لکھتے ہیں کہ فتجب الفاتحۃ فی کل رکعۃ اھ (سبل السلام جلد ۱ ص ۲۴۵) حضرات! انصاف کے ساتھ آپ ایک طرف حضرات محدثین کرامؒ کی ان تصریحات کو ملاحظہ کیجیے اور دوسری طرف فریق ثانی کا یہ دعوٰی دیکھیے کہ غرض تمام محدثین بالاتفاق اس حدیث کو ہر نماز اور ہر نمازی پر شامل کرتے ہیں، اور یہ کہ جو شخص امام کے پیچھے ہر رکعت میں سورۃ فاتحہ نہ پڑھے اس کی نماز ناقص ہے کالعدم ہے بیکار ہے اور باطل ہے۔ کہ یہ کہاں تک مبنی بر انصاف ہے۔ افسوس اور حیرت ہے اس تحقیق پر مولانا میر صاحبؒ ہی فرمائیں کہ کیا حضرت جابرؓ، حضرت ابن عمرؓ، حضرت ابن مسعودؓ، حضرت زیدؓ بن ثابت، اور حضرت ابن عباسؓ وغیرہ حضرات صحابہ کرامؓ اور امام مالکؒ، امام احمدؒ، امام ابو حنیفہؒ، امام شافعیؒ، امام ابن عیینہؒ، حافظ اسمٰعیلیؒ، حافظ ابن عبد البرؒ، امام موفق الدینؒ ابن قدامہؒ، شیخ الاسلام ابن تیمیہؒ اور حافظ ابن القیمؒ، وغیرہ وغیرہ (جن کی پوری تشریح جلد اول میں عرض کی جا چکی ہے) آپ کے نزدیک محدث نہیں ہیں؟ اور کیا ان میں بعض جہری نمازوں کو اور بعض مقتدی کو اور اکثر مدرک رکوع کو اس حدیث سے کتاب وسنت کے دلائل سے مستثنیٰ نہیں کرتے؟ تعجب ہے میر صاحبؒ کی دیدہ دلیری پر کہ وہ کس بے احتیاطی سے یہ دعوٰی کرتے ہیں کہ غرض تمام محدثین بالاتفاق اس حدیث کو ہر نماز اور ہر نمازی پر شامل کرتے ہیں مولانا خود ہی ازراہِ بزرگی اور انصاف فرمائیں کہ ایک شخص مادر زاد گونگا ہے وہ نماز تو ادا کرتا ہے لیکن دوسری قرأۃ کی طرح وہ سورۂ فاتحہ کی قرأۃ سے بھی عاجز ہے کیا اس کی نماز ہو جائے گی؟ اگر نہ ہوگی تو کس دلیل سے؟ اور اگر ہو جائے گی تو آپ کے قاعدہ کے مطابق یہ روایت تو ہر نمازی کو شامل ہے وہ گونگا کیسے مستثنیٰ قرار پایا؟ اس گونگے کو بھی جانے دیجیے یہ بتلائیے کہ سو سالہ کا بوڑھا کافر مسلمان ہوتا ہے نہ حافظہ ساتھ دیتا ہے اور نہ زبان وہ نماز کے ظاہری ارکان تو ادا کرتا ہے مگر سورۂ فاتحہ یاد نہیں کر سکتا کیا اس کی نماز جائز ہے، اگر ہے تو یہ خود اور اس کی نماز ہر نماز اور ہر نمازی کی زنجیروں سے کیسے خارج تصور ہوں گے؟ حضرت عبد اللہؓ بن ابی اوفیٰؓ فرماتے ہیں کہ آنحضرت صلی اللہ تعالیٰ علیہ وآلہ وسلم کی خدمت میں ایک شخص آیا اور کہنے لگا حضرت میں قرآن کریم کا کوئی بھی حصہ یاد کرنے کی طاقت نہیں رکھتا مجھے کوئی ایسی چیز ارشاد فرمائیے جو اس کے قائم مقام ہو آپ نے

ارشاد فرمایا تم یہ پڑھا کرو سُبْحَانَ اللّٰہِ وَالْحَمْدُ لِلّٰہِ وَلَآ اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہُ وَاللّٰہُ اَکْبَرُ وَلَا حَوْلَ وَلَا قُوَّۃَ اِلَّا بِاللّٰہِ الْعَلِیِّ الْعَظِیْمِ (الحدیث) (رواہ ابوداؤد واحمد والنسائی وصححہ ابن حبانؒ والدار قطنی والحاکم سبل السلام جلد ا صـ۲۹۷) امیر یمانیؒ صاحب لکھتے ہیں کہ یہ حدیث اس امر کی دلیل ہے کہ یہ اذکار قرأت کے قائم مقام ہیں خواہ سورۂ فاتحہ کی قرأت ہو یا قرآن کریم کے کسی اور حصہ کی اور یہ حکم اس شخص کے لیے ہوگا جو قرأت پہ قادر نہ ہو اور بہ نظر ظاہر یہ روایت صاف بتاتی ہے کہ ایسے شخص پہ قرآن کریم کا سیکھنا واجب نہیں ہے تاکہ وہ اس کو نماز میں پڑھ سکے کیونکہ میں طاقت نہیں رکھتا کا مطلب یہی ہے کہ میں اب قرآن کریم کا کوئی حصہ یاد نہیں کر سکتا معہذا آنحضرت صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلّم نے اس کو قرآن کریم کا کوئی حصہ یاد کرنے کا حکم نہیں دیا اور ان کلمات کی تلقین فرمائی ہے حالانکہ جو شخص یہ الفاظ یاد کر سکتا ہے وہ سورۂ فاتحہ بھی یاد کر سکتا ہے اگر سورۂ فاتحہ وغیرہ کا سیکھنا واجب ہوتا تو آپ ضرور اس کا حکم دیتے۔ (سبل السلام جلد ا صـ۲۵۱) لیجئے ایک غیر مقلد عالم صاحب نے ساری نمازوں کے لیے ایسے شخص کو چھٹی دے دی ہے جو سورۂ فاتحہ پر قادر نہیں ہے ؎

این گناہیست کہ در شہر شما نیز کنند

مؤلف خیر الکلام کہتے ہیں کہ ایسا مقتدی معذور ہے اور عذر کا حکم الگ ہے جیسے منفرد گونگا جس پر احناف کے نزدیک بھی قرأت فرض ہے مگر عذر کی وجہ سے مستثنیٰ ہے (محصلہ صـ۱۴۷)

الجواب :۔ ہمارے نزدیک تو یہ حدیث عام نہیں لیکن مؤلف خیر الکلام اس کو عام تسلیم کرکے معذور کو اس سے مستثنیٰ کرتے ہیں تو یہ حدیث ہر نمازی کو شامل تو نہ ہوئی عموم کی رٹ تو ٹوٹی عام مخصوص البعض قطعی نہیں رہتا اور مقتدی بھی جمہور کے نزدیک شرعی طور پر معذور ہے کہ اس کو امام کے پیچھے قرأت کرنے کی ممانعت ہے۔

امام نوویؒ لکھتے ہیں کہ جو شخص سورۂ فاتحہ نہیں پڑھ سکتا اور اس کے لیے اس کا سیکھنا بھی ممکن نہ ہو تو اس کے علاوہ کوئی اور سورت ہی وہ پڑھ لیا کرے۔ (شرح مسلم جلد ا صـ۱۶۹) حافظ ابن حجرؒ لکھتے ہیں جس کو سورۂ فاتحہ یاد ہو اس کے لیے فاتحہ متعین ہے اگر وہ یاد نہیں تو قرآن کریم کا کوئی حصہ لازم

ملـ؎ اور سوا رد الطاق صـ۱۲۹)

ہے وہ بھی نہ ہو تو ذکر پڑھ لینا کافی ہے (فتح الباری جلد ۲ ص ۱۹۳) اب آپ خود میر صاحبؒ کی سُن لیجئے وہ خود لکھتے ہیں کہ جسے فاتحہ یاد نہ ہو وہ کسی اور مقام سے پڑھ لے اور اگر دیگر مقام سے بھی یاد نہیں تو تحمید، تکبیر، تہلیل پڑھے الخ بلفظہٖ پھر آگے لکھتے ہیں، سورۂ فاتحہ اس شخص پر لازم ہے جو اسے بخوبی پڑھ سکے لیکن جو بخوبی نہ پڑھ سکتا ہو وہ جہاں سے چاہے قرأت کر سکتا ہے (بلفظہٖ تفسیر واضح البیان ص ۴۴۶ و ص ۴۴۷) دیکھئے مولانا خود ہر نمازی اور ہر نماز کی تخصیص کر کے جمہور کے زمرہ میں شامل ہو گئے ہیں ع یہ بھی لگا کے خون شہیدوں میں مل گیا۔

تمام محدثین بالاتفاق الخ کا قصہ تو رہا اپنی جگہ کیا میر صاحبؒ خود بھی محدث ہیں یا نہیں ؟ دیکھئے کیا لب کشائی فرماتے ہیں؟ جمہور محدثین نے تو مدرکِ رکوع کو اس حدیث سے (حضرت ابو ہریرہؓ وغیرہ کی صحیح روایت ہے جس کا ذکر پہلے ہو چکا ہے) مخصوص کیا ہے حضرت امام بخاریؒ وغیرہ نے اس بات پر اصرار کیا ہے کہ مدرکِ رکوع کو مدرکِ رکعت تصور نہیں کیا جائیگا یہ بات بڑی ناانصافی پر مبنی ہوگی کہ ہم ان کی پیش کردہ دلیل اور اس کا پس منظر آپ سے عرض نہ کریں، حضرت امام بخاریؒ کوئی صحیح مرفوع اور صریح روایت اس دعویٰ پر پیش کرنے سے سو فیصدی قاصر رہے ہیں کہ جس نے رکوع کی حالت میں امام کو پالیا اس کی وہ رکعت شمار نہ ہوگی بخلاف اس کے ہم نے حضرت ابو ہریرہؓ کی صحیح، صریح اور مرفوع روایت سے جو حسن کے درجہ سے فروتر نہ ہوگی اور دیگر بعض آثار حضرات صحابہ کرامؓ سے اس مسئلہ کو پہلے مبرہن کر دیا ہے اعادہ کی ضرورت نہیں ہے، امام بخاریؒ کا استدلال ملاحظہ ہو، امام بخاریؒ فرماتے ہیں کہ ہم سے معقل بن مالکؒ نے بیان کیا وہ کہتے ہیں کہ ہم سے ابو عوانہؒ نے بیان کیا وہ محمد بن اسحاقؒ سے روایت کرتے ہیں وہ عبدالرحمٰنؒ بن اعرجؒ سے اور وہ حضرت ابو ہریرہؓ سے انہوں نے فرمایا قال اذا ادرکت القوم رکوعاً لم تعتد بتلک الرکعۃ (جزء القراءۃ ص ۵۹) کہ جب تم جماعت کے ساتھ اس حالت میں شریک ہو کہ وہ رکوع میں جا چکی ہو تو تمہاری اس رکعت کا اعتبار نہ ہوگا۔ لیکن اس روایت سے استدلال مخدوش ہے اولاً اس لیے کہ معقل بن مالک کو علامہ ابو الفتح ازدیؒ متروک کہتے ہیں۔ (میزان جلد ۳ ص ۱۸۵ و تہذیب التہذیب جلد ۱۰ ص ۲۳۴) وثانیاً اس کی سند میں محمد بن اسحاقؒ ہے جس پر پوری جرح (اور کلام) اپنے مقام پر بیان کی جائے گی وثالثاً ابن اسحاق مدلس ہے اور عنعنہ سے روایت کرتا ہے جو قابل التفات

نہیں ہے درابعاً یہ روایت حضرت ابوہریرہؓ پر موقوف ہے اور موقوف روایت کو حضرت ابوبکرہؓ وغیرہ کی مرفوع حدیث (جو آنحضرت صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم سے ثابت ہے) کے مقابلہ میں کون سنتا ہے؟ اور مرفوع اور صحیح روایت کے مقابلہ میں ایسی ضعیف کمزور اور موقوف روایت حجت کیسے ہو سکتی ہے؟ وخامساً حضرت ابوہریرہؓ کا خود اپنا فتویٰ یہ ہے کہ مدرک رکوع مدرک رکعت ہے (دیکھئے سنن الکبریٰ جلد ۲ صفحہ ۹۰ وغیرہ) اندریں حالات حضرت امام بخاریؒ کا اس سے استدلال کرنا بڑی عجیب بات ہے اگر ہمارے جیسا کوئی تہی مایہ ایسا استدلال کرتا تو اور بات تھی۔ کیونکہ ؎

دیوانے روزِ حشر کو پوچھے نہ جائیں گے — خالی ہے سرنوشت ہمارے حساب سے

اسی طرح ایک دوسری سند سے حضرت ابوہریرہؓ کا موقوف اثر امام بخاریؒ نے نقل کیا ہے (جزء القراۃ صفحہ ۲) لیکن اس کی سند میں بھی محمد بن اسحاقؒ ہے اسی مضمون کا ایک اثر انہوں نے حضرت ابوسعید الخدریؓ سے بھی نقل کیا ہے (ایضاً) اور اس کے الفاظ یہ ہیں، لا یرکع احدھم حتیٰ یقرأ بام القرآن یعنی سورۃ فاتحہ پڑھنے سے پہلے کسی کو رکوع نہیں کرنا چاہیئے۔ مگر یہ روایت بھی ان کو چنداں مفید نہیں ہے اولاً اس میں بعض متکلم فیہ راوی ہیں وثانیاً یہ بھی موقوف ہے اور ثالثاً اس میں مقتدی اور خلف الامام کا کوئی ذکر نہیں ہے جیسا کہ ظاہر ہے اور منفرد پر بہرحال یہ لازم ہے کہ پہلے سورۃ فاتحہ پڑھے اور پھر وہ رکوع کرے اس کا کون منکر ہے؟ امام بخاریؒ مجاہدؒ سے نقل کرتے ہیں کہ جب سورۃ فاتحہ بھول جائے تو اس رکعت کا کوئی اعتبار نہیں ہے۔ (جزء القراۃ صفحہ ۱۴) لیکن ایک تو اس میں لیثؒ ہے جو کمزور اور ضعیف ہے (دارقطنی جلد ۱ صفحہ ۱۲۶) پھر ہے بھی یہ مجاہدؒ کا قول۔ الغرض کتب حدیث میں کوئی صحیح صریح اور مرفوع روایت موجود نہیں ہے جس سے یہ ثابت ہو کہ رکوع میں امام کے ساتھ شامل ہونے والے کی وہ رکعت قابلِ اعتبار نہیں ہے بخلاف اس کے صحیح اور مرفوع حدیث اور جمہور اہل اسلام کی معیت سے ان حضرات کا دامنِ تحقیق وابستہ ہے جن کی نماز کو فریق ثانی بیکار، ناقص، کالعدم، اور باطل کہتا ہے حیف بر حیثیت ہے ایسے تعصب اور عناد پہ۔

جواب پنجم: جب قطعی دلائل سے یہ ثابت ہو چکا ہے کہ حرف مَن عموم میں نص قطعی نہیں ہے اور یہ کہ اسی حدیث کے بعض صحیح اور مرفوع طرق میں فصاعداً ما تیسّر اور ما زاد

کی زیادت بھی موجود ہے اور یہ زیادت اس کو متعین کر دیتی ہے کہ یہ روایت مقتدی سے متعلق نہیں ہے بلکہ منفرد وغیرہ کے حق میں ہے اور یہ کہ حضرت جابرؓ، حضرت ابن عمرؓ، امام احمدؒ بن حنبلؒ، امام سفیانؒ بن عیینہؒ، حافظ اسمٰعیلیؒ، امام موفق الدینؒ ابن قدامہؒ اور علامہ شمس الدین الحنبلیؒ وغیرہ اس روایت کا مصداق منفرد بیان کرتے ہیں اور یہ کہ جمہور اہل اسلام اور حضرات ائمہ اربعہؒ وغیرہا مدرک رکوع کو اس حدیث کے عموم سے مستثنیٰ کرتے ہیں اور یہ کہ گونگا یا وہ شخص جو مدت العمر سورۂ فاتحہ یاد نہیں کر سکتا یا کچھ عرصہ اس کو یاد نہیں ہو سکتی اور معہذا وہ نماز ادا کرتا ہے۔ تو ایسا شخص بھی باتفاق فریق ثانی اس حدیث کے عموم سے خارج ہے۔ ان تمام اندرونی اور بیرونی قرائن اور دلائل کی موجودگی میں ہر نمازی پر اور ہر نماز میں اس سے سورۂ فاتحہ کے ہر رکعت میں واجب اور رکن ہونے پر استدلال کرنا نہایت حیرت اور تعجب کی بات ہے۔ خیر یہ سب باتیں عرض کی جا چکی ہیں نمبر ہذا میں جو بات کہنے کی ہے وہ یہ ہے کہ حضرات محدثین کرامؒ کا ایک ضابطہ ہے اور جس کو فریق ثانی بڑی شدومد سے بیان کرتا ہے چنانچہ قاضی شوکانی صاحبؒ لکھتے ہیں وراوی الحدیث اعرف بالمراد من غیرہ (نیل الاوطار جلد ۱ ص۲۵۶) حدیث کا راوی اپنی مروی حدیث کا مطلب دوسروں سے زیادہ بہتر جانتا ہے اور نواب صاحبؒ لکھتے ہیں ان تفسیر الراوی ارجح من تفسیر غیرہ (عون الباری جلد ۱ ص۲۷ علی النیل) راوی کی تفسیر دوسروں کی تفسیر سے راجح تر ہے اور مبارکپوری صاحبؒ لکھتے ہیں۔ وقد تقرران راوی الحدیث ادری بمراد الحدیث من غیرہ (تحفۃ الاحوذی جلد ۱ ص۲۵۷) یہ بات طے شدہ ہے کہ حدیث کا راوی اپنی مروی حدیث کی مراد کو دوسروں سے زیادہ بہتر سمجھتا ہے اور دوسرے مقام پر لکھتے ہیں ومذہب الشافعی ومحققی الاصولیین ان تفسیر الراوی مقدم اذا لم یخالف الظاھر قالہ النوویؒ (تحفۃ الاحوذی جلد ۲ ص۲۳۵) کہ حضرت امام شافعیؒ اور محقق اصولیوں کا یہ مذہب ہے کہ راوی کی تفسیر جب کہ ظاہر کے خلاف نہ ہو دوسروں کی تفسیر سے مقدم ہو گی جیسا کہ امام نوویؒ نے کہا ہے، اس قاعدہ کو سامنے رکھ کر جب ہم حضرت عبادہؓ بن الصامت وغیرہ کی وہ صحیح حدیثیں جن میں حرف فصاعدا مذکور ہے، دیکھتے ہیں تو ان کے مختلف طرق اور اسانید میں ہمیں یہ مرکزی راوی نظر آتے ہیں۔ امام ابوبکرؒ بن ابی شیبہؒ، امام سفیانؒ بن عیینہؒ، امام زہریؒ

امام اسحاقؒ بن راہویہؒ، امام عبداللہؒ بن وہبؒ، امام مالکؒ بن انسؒ، امام احمدؒ بن حنبلؒ، امام عبدالرزاقؒ بن ہمامؒ، امام معمرؒ بن راشدؒ، امام اوزاعیؒ، اور حضرت امام شافعیؒ وغیرہ اور یہ تمام اکابر حرف من کے عموم کے قائل نہیں ہیں کوئی اس حدیث سے صرف منفرد مراد لیتا ہے اور کوئی منفرد اور امام دونوں اور کوئی امام کے پیچھے سری اور جہری سب نمازوں کو مستثنیٰ قرار دیتا ہے اور کوئی جہری نمازوں کو اس سے خارج کرتا ہے اور مدرک رکوع وغیرہ تو سب کے نزدیک مستثنیٰ ہے اور لطف کی بات یہ ہے کہ حضرت محمودؓ بن ربیع جو صغار صحابہؓ میں تھے اور اس حدیث کے راوی ہیں مگر وہ بھی قرأۃ خلف الامام کے قائل نہیں تھے جس کی پوری تفصیل اپنے مقام پر آئے گی انشاء اللہ تعالیٰ اور لطف بالائے لطف یہ ہے کہ حضرت عبادہؓ بن الصامت بھی وجوب قرأۃ خلف الامام کے قائل نہ تھے جیسا کہ ذکر ہوگا اور ایک اور بات بھی قابل غور ہے وہ یہ کہ مشہور محدث امام اعمشؒ فرماتے ہیں۔ انتم الاطباء ونحن الصیادلۃ (کتاب العلم جلد ۲ صـ ۱۳۱) اے فقہاء کے گروہ تم طبیب ہو اور ہم پنساری ہیں۔ امام سیوطیؒ اس کی تفسیر کرتے ہیں کہ اگرچہ پنساری کے پاس مختلف قسم کی جڑی بوٹیاں ہوتی ہیں مگر وہ یہ نہیں جانتا کہ کس کام آتی ہیں؟ طبیب اور حکیم ہی ان کی خاصیت اور مزاج سے واقف ہو سکتا ہے، اسی طرح حضرات محدثین کرام کے حافظہ میں اگرچہ بے شمار حدیثیں محفوظ ہوتی ہیں لیکن وہ ان سے استنباط مسائل کا طریقہ نہیں جانتے بلکہ یہ کام حضرات فقہاء کرامؒ کا ہے (رحمۃ مسالک الحنفاء صـ ۵۵) اور امام سفیانؒ بن عیینہؒ لکھتے ہیں کہ فقہاءؒ کی بات کو تسلیم کرنا ہی دین کی سلامتی ہے (الجواہر المضیۃ جلد ۱ صـ ۱۹۷) امام ترمذیؒ ایک مقام پر لکھتے ہیں وکذلک قال الفقہاء وھم اعلم بمعانی الحدیث (جلد ۱ صـ ۱۱۸) کہ فقہاء نے اس حدیث کا یہ معنیٰ بیان کیا ہے اور وہی حدیث کا مطلب زیادہ بہتر سمجھتے ہیں اور امام احمدؒ بن حنبلؒ فرماتے ہیں ما اقل الفقہ فی اھل الحدیث (طبقات ابو یعلی صـ ۲۲۰) فقہ اور سمجھ کی باتوں سے اہل حدیث کو کوئی سروکار نہیں ہے، امام حاکمؒ اور علامہ حازمیؒ لکھتے ہیں کہ اس حدیث کو جس کو فقہاءؒ روایت کرتے ہیں اس حدیث پر ترجیح ہوگی جس کو محدثینؒ نقل کرتے ہیں (معرفت علوم الحدیث صـ ۱۱ وکتاب الاعتبار صـ ۱۵) اور یہ اکابر جن کے اسماء نقل کئے گئے ہیں بلا اختلاف مسلّم فقیہ تھے، اس لیے راوی

حدیث ہونے کے علاوہ ان کی فقاہت کی وجہ سے بھی ان کا بیان کردہ مطلب اور معنیٰ قابل ترجیح ہوگا الغرض تمام اندرونی اور بیرونی شہادتیں اس امر کو بلا شک و شبہ متعین کر دیتی ہیں کہ حضرت عبادہؓ وغیرہ کی اس روایت کو جس میں حرف منؔ ہے مقتدی سے کوئی تعلق نہیں ہے اور نہ فریق ثانی کا اس سے استدلال و احتجاج صحیح ہو سکتا ہے۔

قارئین کرام! ابھی متعدد و صحیح جوابات اس روایت کے جو جمہور کی طرف سے پیش کیے گئے ہیں باقی ہیں مگر سلسلۂ کلام دراز سے دراز تر ہوتا جا رہا ہے اس لیے ہم ان کو قلم انداز کرتے ہیں تاکہ آپ اکتا نہ جائیں، ہاں البتہ ادب اور احترام کو ملحوظ رکھتے ہوئے صرف ایک جواب اور عرض کرتے ہیں اور فریق ثانی سے انصاف کی توقع رکھتے ہیں۔

جواب ششم:۔ اگر فریق ثانی خواہ مخواہ اس پر اصرار کرتا ہے کہ حضرت عبادہؓ بن الصامت کی یہ روایت مقتدی کے حق میں بھی عام ہے تو اس کو چاہیے کہ امام کے پیچھے بآواز بلند اور جہر سے قرأت کیا کرے کیونکہ حضرت عبادہؓ جہر سے قرأت کرتے تھے۔ چنانچہ امیر یمانی صاحبؒ حدیث فَلَا تَقْرَؤُا بِشَیْءٍ مِّنَ الْقُرْاٰنِ اِذَا جَهَرْتُ اِلَّا بِاُمِّ الْقُرْاٰنِ (کہ جب میں جہر سے قرأت کیا کروں تو تم قرآن کریم کا کوئی حصہ میرے پیچھے نہ پڑھا کرو، مگر سورۂ فاتحہ) کی شرح میں لکھتے ہیں۔

فهذا عبادةؓ راوی الحدیث قرأ بها جهراً خلف الامام لانه فهم من كلامه صلى الله عليه وسلم انه يقرأ بها خلف الامام جهراً وان نازعه (سبل السلام جلد اص ۲۴۶)

حضرت عبادہؓ بن الصامتؓ نے جو اس روایت کے راوی ہیں، امام کے پیچھے بلند آواز سے سورۂ فاتحہ پڑھی اس لیے کہ انہوں نے آنحضرت صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کے ارشاد سے یہی سمجھا تھا کہ امام کے پیچھے بلند آواز سے سورۂ فاتحہ پڑھی جا سکتی ہے، اگرچہ امام کے ساتھ منازعت اور الجھاؤ بھی کیوں نہ ہو۔

اور یہ روایت فریق ثانی کے نزدیک صحیح ہے۔ امام دارقطنیؒ لکھتے ہیں کہ هذا اسناد حسن ورجاله ثقات كلهم (جلد ا ص ۱۲۱) اور یہ معنیٰ بھی ایک غیر مقلد عالم صاحبؒ نے بیان کیا ہے اس لیے ان کو امام کے پیچھے خوب زور و شور کے ساتھ ام القرآن کی قرأت کرنی چاہیے

اگرچہ کھلے طور پر منازعت اور مخالجت بھی ہوتی ہے اگر حضرت عبادہ[1] بن الصامت کی اس روایت پر ان کا عمل نہیں ہے اور ترک جہر کرتے ہوئے بھی ان کی نماز جائز اور صحیح ہے اور ان کے اہل حدیث ہونے میں کوئی شک نہیں ہے تو دوسروں سے یہ انوکھا مطالبہ کیسے صحیح ہے؟ اور ان کی نماز کیوں ناقص، بیکار، کالعدم اور باطل ہے؟ آنچہ بر خود مپسندی بر دیگراں مپسند، ہم اس حدیث کے انہیں جوابات پر اکتفا کرتے ہوئے آگے چلتے ہیں گو ابھی بہت سی باتیں کہنے کی باقی ہیں وفیہ کفایۃ لمن لہ ھدایۃ۔ مؤلف خیر الکلام نے اس کا یہ جواب دیا ہے کہ، حضرت عبادہؓ نے فاتحہ آہستہ پڑھی تھی مگر بعض علماء نے جہر کا لفظ اس لیے بولا ہے کہ محمودؓ نے جو حضرت عبادہؓ کے ساتھ کھڑے تھے سن لیا تھا الخ (ص ۱۷۰) الجواب:۔ یہ نری دفع الوقتی ہے کیونکہ عبارت میں قرأ بہا جہرًا کے الفاظ ہیں پھر اس کا یہ مطلب کیونکہ صحیح ہو سکتا ہے کہ فاتحہ آہستہ پڑھی؟ اور یہ قرأت صرف پہلو میں حضرت محمودؓ ہی نے سُنی بلکہ یہ امام نے بھی سُنی اس لیے کہ امیر یمانیؒ وان نازعہ کا جملہ بول رہے ہیں کہ اگرچہ امام کے ساتھ منازعت اور رسہ کشی ہوتی ہے حضرت عبادہؓ کے نزدیک مقتدی جہرًا فاتحہ پڑھ سکتا ہے۔

دوسری روایت:۔ ابو السائبؒ[2] (جو ہشامؓ بن زہرہؓ کے غلام تھے) فرماتے ہیں کہ میں نے حضرت ابوہریرہؓ سے سنا کہ آنحضرت صلی اللہ تعالیٰ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا۔

مَنْ صلّٰی صلوٰۃ لم یقرأ فیہا بام القرآن	کہ جس نے نماز پڑھی اور اس میں سورۃ فاتحہ نہ پڑھی تو اس کی
فہی خداج ھی خداج غیر تمام	نماز ناقص ہے، ناقص ہے، ناقص ہے وہ تام نہ ہوگی۔

---

[1] حضرت ہشامؓ بن عامرؓ بھی امام کے پیچھے جہر سے قرأت کیا کرتے تھے (دیکھئے مجمع الزوائد جلد ۲ ص ۱۱۱) علامہ ہیثمیؒ فرماتے ہیں رجالہ موثقون کہ اس روایت کے سب راوی ثقہ ہیں۔ حضرت ہشامؓ کو علامہ ذہبیؒ صحابہؓ میں ذکر کرتے ہیں اور ان کے والد بھی صحابی تھے جو غزوہ احد میں شہید ہوئے (تجرید اسماء الصحابۃ ج ۲ ص ۱۲۹)

[2] حافظ ابن حجرؒ لکھتے ہیں کہ ان کا نام عبد اللہؓ تھا اور وہ الانصاری اور المدنی ہونے کے ساتھ قبیلہ جہینہ سے تعلق رکھتے تھے (تہذیب التہذیب جلد ۱۲ ص ۱۰۴) لیکن صاحب کشف المغطّٰی کہتے ہیں کہ شاید وہ دراصل شیراز (ایران) کے رہنے والے تھے (اوجز المسالک جلد ۱ ص ۲۴۲)

فقلت لابی ھریرۃ انی اکون وراء الامام قال فغمز ذراعی فقال اقرأ بہا فی نفسک[ع] یا فارسی۔ (مسلم جلد ۱ صفحہ ۱۶۹)

ابوالسائبؒ کہتے ہیں۔ میں نے حضرت ابوہریرہؓ سے دریافت کیا حضرت! میں جب امام کے پیچھے ہوں تو کیا کروں۔ تو انہوں نے میرا بازو دبا کر جواب دیا اے فارسی (اور عجمی) اپنے دل میں پڑھ لیا کرو۔

فریق ثانی امام کے پیچھے سورۃ فاتحہ کے وجوب اور اس کی رکنیت پر اس روایت کو نص سمجھتا ہے۔

جواب:۔ فریق ثانی کا اس روایت سے استدلال ان امور پر موقوف ہے (۱) حرف مَن عموم کے لیے ہے (۲) جس چیز پر لفظ خداج کا اطلاق ہو وہ کالعدم ہوتی ہے (۳) لفظ غیر تمام رکنیت پر دلالت کرتا ہے (۴) اقرأ بہا فی نفسک حتمی اور قطعی طور پر آہستہ پڑھنے پر دلالت کرتا ہے، یہ وہ چار اصولی نقطے ہیں جن پر ہمیں بحث کرنی ہے پوری توجہ اور دلجمعی کے ساتھ غور کریں، اس سے قبل کہ ہم ترتیب وار ان شقوں کا جواب دیں، اے عرض کرنا ضروری سمجھتے ہیں کہ ذرا فریق ثانی کی طرف سے پیش کردہ روایتوں کے راویوں کا جمہور کی طرف سے پیش کردہ روایتوں اور ان کے راویوں کا اجمالی طور پر تقابل کر دیکھیں، فریق ثانی نے قتادہؒ، سلیمان تیمیؒ، ابواسحاق السبیعیؒ، اسرائیل بن یونسؒ اور امام زہریؒ

ع علامہ ابوالولید الباجیؒ (المتوفی ۴۹۴ھ) کہتے ہیں کہ ابوالسائبؒ کے سوال کرنے کا سبب یہ تھا وھذا اعتراض من ابی السائب علی العموم بالعمل الشائع عندہ وما شاھدہ من الائمۃ فی ترک القراۃ وراء الامام (بحوالہ اوجز المسالک جلد ۱ صفحہ ۱۴۱) کہ انہوں نے جب بڑے بڑے اماموں کو اور دیگر اکثریت کو امام کے پیچھے ترک قرأۃ پر عامل پایا تو عموم الفاظ کے پیش نظر حضرت ابوہریرۃؓ پر یہ اعتراض کیا۔ ع وقال ابن القیمؒ فی تہذیب سنن ابی داؤد جلد ۱ صفحہ ۳۹۲) اقرأ بہا فی نفسک وھذا مطلق لیس فیہ بیان ان یقرأ بہا حال الجہر ولعلہ قال لہ یقرأ بہا فی السر والسکتات ولوکان عاما فھذا رائ لہ خالفہ فیہ غیرہ من الصحابۃؓ والاخذ بروایتہم اولی اھ۔ حافظ ابن القیمؒ فرماتے ہیں کہ اس میں اس کا ذکر نہیں کہ حالت جہر میں پڑھے اور ممکن ہے کہ انہوں نے سری نمازوں اور سکتات میں پڑھنے کا حکم دیا ہو اور اگر یہ عام ہے تو یہ ان کی اپنی روایت اور دیگر حضرات صحابہؓ کے مسلک کے خلاف ہے لہٰذا ان کی روایت ان کی رائے سے زیادہ بہتر ہے۔

ع یہ روایت ابوعوانہ جلد ۲ صفحہ ۱۲۹، ابوداؤد جلد ۱ صفحہ ۱۱۹ موطا امام مالکؒ صفحہ ۲۹، ترمذی جلد ۱ صفحہ ۳۴، ابن ماجہ صفحہ ۶۱، طیالسی صفحہ ۳۲۲، جزء القراۃ صفحہ ۱۶ اور کتاب الاعتبار صفحہ ۹۹ وغیرہ کتابوں میں موجود ہے۔

جیسے ثقہ ثبت اور حجت راویوں پر محض تخلیط، تفرد، تدلیس اور ارسال وغیرہ کے ایسے الزام عائد کئے ہیں جو اصول حدیث کے رُو سے مردود ہیں جیسا کہ آپ دیکھ چکے ہیں اور انہوں نے امام معمرؒ، سفیانؒ بن عیینہؒ، امام اوزاعیؒ، شعیبؒ بن ابی حمزہؒ، عبدالرحمٰنؒ بن اسحاق مدنیؒ اور صالحؒ بن کیسانؒ جیسے جلیل القدر ائمہ ثقات اور حفاظ کی صحیح اسانید سے مروی زیادت فصاعداً کو ٹھکرا دیا ہے اور وہ بھی محض اپنی مرضی سے بلا دلیل، اس روایت کے صحیح الفاظ یہ تھے۔ کل صلوٰۃ لا یقرأ فیہا بام الکتاب فھی خداج الا صلوٰۃ خلف امام کہ ہر وہ نماز جو سورۂ فاتحہ کے بغیر پڑھی جائے وہ ناقص ہے، ہاں مگر وہ نماز جو امام کے پیچھے پڑھی جائے اور یہ استثناء۔ الا صلوٰۃ خلف امام علاءؒ بن عبدالرحمٰنؒ کی غلطی سے چھوٹ گئی ہے جس کی پوری تفصیل پہلے عرض کی جا چکی ہے اور یہ بھی نقل کیا جا چکا ہے کہ امام ابن معینؒ کہتے ہیں کہ ان کی حدیث حجت نہیں ہے، ابن عدیؒ کہتے ہیں کہ وہ قوی نہ تھے ابو حاتمؒ کہتے ہیں کہ ان کی بعض حدیثیں منکر ہیں ابوزرعہؒ کہتے ہیں کہ وہ زیادہ قوی نہ تھے، ابوداؤدؒ فرماتے ہیں کہ محدثینؒ صیام شعبان کی روایت کو ان کی منکر روایتوں میں شمار کرتے ہیں اور حافظ ابوعمرؒ بن عبدالبرؒ لکھتے ہیں کہ :-

العلاء لیس بالمتین عندھم وقد انفرد بھذا الحدیث لیس یوجد الا لہ ولا تروی الفاظہ عن احد سواہ۔ واللہ اعلم (کتاب الانصاف ص۱۹)

علاءؒ بن عبدالرحمٰنؒ محدثینؒ کے نزدیک چنداں قابل اعتبار نہیں ہیں اور اس حدیث کو بیان کرنے میں متفرد ہیں ان کے بغیر کسی اور سے یہ الفاظ مروی نہیں ہیں۔ اور یہ صرف انہیں سے مروی ہیں۔

پس یہ روایت بلاشبہ شاذ ہے کہ ضعیف راوی تمام ثقات کی روایت کے خلاف کرتا ہے امت مسلمہ کا ایسی روایتوں کی صحت پر اجماع منعقد نہیں ہوا اور نہ آج تک جمہور نے ان کو قبول کیا ہے جیسا کہ مؤلف خیر الکلام کا غلط دعوے ہے۔ فریق ثانی کا انصاف ملاحظہ کیجئے کہ ثقہ ثبت اور حجت راویوں کی روایتیں تو ان کے نزدیک صحیح نہیں ہیں لیکن جس روایت کو کمزور

لہ مؤلف خیر الکلام نے ارسال و انقطاع وغیرہ کا رونا پھر رویا ہے (ملاحظہ ہو ص۱۸۳ و ص۱۸۴) مگر ہم ان کا با حوالہ مفصل جواب پہلے عرض کر چکے ہیں اعادہ کی ضرورت نہیں ہے۔

اور ضعیف راوی بیان کرتا ہو اور بقول حافظ ابن عبد البرؒ اس کے بغیر ان الفاظ کو خدا کی دنیا میں کوئی ایک راوی بھی بیان کرنے والا نہ ہو تو وہ ان کے نزدیک حجت ہے، اور اس کے خلاف کرنیوالوں کی نماز بیکار، ناقص، کالعدم اور باطل ہے۔ فوا اسفا ترجمان الحدیث ص۲۷ تا ۲۹ ماہ جولائی ۱۹۷۳ء میں اس کا خوب رونا رویا ہے کہ مؤلف احسن الکلام ایک طرف تو بخاری و مسلم کو صحیح مانتے ہیں اور دوسری طرف مسلم کے راوی پہ کلام کرتے ہیں اور یہ ان کا مذہبی تعصب ہے اور تضاد بیانی ہے (محصلہ)

الجواب:۔ یہ سبق ہم نے آپ حضرات ہی سے سیکھا ہے کہ حضرت قتادہؒ اور سلیمان تیمیؒ وغیرہ جو ثقہ اور ثبت اور بخاری اور مسلم کے مرکزی راوی ہیں مگر آپ حضرات نے باوجود ان کے ثقہ متابع ہونے کے ان کو معاف نہیں کیا حالانکہ صحیحین کی صحت آپ حضرات کے ہاں بھی براہ نام مُسَلَّم ہے سچ ہے ع این گناہ ہیست کہ در شہر شما نیز کنند۔ تو اگر ہم نے ٹھوس حوالوں کے ساتھ العلاءؒ بن عبد الرحمنؒ کی غلطی واضح کر دی ہے تو کیا جرم کیا ہے! اور جہاں حضرات محدثین کرامؒ نے العلاءؒ کی کسی روایت کو صحیح کہا ہو گا تو یقین جانئے کہ وہاں ان کے مقابلہ میں خالد الطحانؒ جیسا ثقہ اور ثبت راوی ہرگز کوئی نہ ہو گا اس بات کو بھی ضرور ذہن مبارک میں رکھئے۔ اور یہ بات بھی ملحوظ خاطر رہے کہ اس حدیث کا جو حصہ مرفوع ہے اس میں یہاں وراء الامام کے الفاظ موجود نہیں ہیں یہ الفاظ صرف اس حصہ میں ہیں جو حضرت ابو ہریرہؓ کا موقوف قول اور فتویٰ ہے۔ اور پہلے عرض کیا جا چکا ہے کہ فریق ثانی کا یہ نظریہ ہے کہ در موقوفات صحابہؓ حجت نیست اگرچہ بصحت رسد، اور آنحضرت صلی اللہ تعالیٰ علیہ وآلہ وسلم کے ارشاد کے مقابلہ میں تو کسی کا قول پیش ہی نہیں کیا جا سکتا۔ چنانچہ ایک مقام پہ امام بیہقیؒ لکھتے ہیں کہ بھلا حضرت علیؓ جناب رسول خدا صلے اللہ تعالیٰ علیہ وآلہ وسلّم کے خلاف کوئی بات کہہ سکتے ہیں؟ اور اگر آپ کے خلاف ان سے کوئی سند صحیح بھی ہو تب بھی حضورؐ کی بات ان پر اور دوسروں پہ حجت ہے اور آنحضرت صلی اللہ تعالےٰ علیہ وسلّم کے ارشاد کے ہوتے ہوئے کسی امتی کے قول کو کیسے حجت قرار دیا جا سکتا ہے۔؟ (سنن الکبریٰ جلد ۲ ص۱۷۳) آپ ترتیب وار جوابات سنیئے۔

۱۔ حرف مَنْ کے عموم میں نص قطعی نہ ہونے پہ سیر حاصل بحث پہلے کی جا چکی ہے اعادہ کی ضرورت نہیں ہے وہاں ہی ملاحظہ کر لیں، اور امام موفق الدینؒ ابن قدامہؒ اور علامہ شمس الدین الحنبلیؒ

کے حوالے سے عرض کیا گیا ہے کہ حضرت عبادہؓ کی سابق حدیث کی طرح حضرت ابوہریرہؓ کی یہ حدیث بھی منفرد سے متعلق ہے۔

۲۔ لفظ خداج سے وجوب اور رکنیت پر استدلال کرنا صحیح نہیں ہے، چنانچہ بعض مرفوع حدیثیں نقل کی جاتی ہیں۔

آنحضرت صلی اللہ تعالیٰ علیہ وآلہٖ وسلم نے ارشاد فرمایا۔[له]

الصلوٰة مثنیٰ مثنیٰ وتشهد فی کل رکعتین وتبأس وتمسکن واقنع یدیك وقل اللّٰھُمَّ فمن لم یفعل فھی خداج

نماز کی دو دو رکعتیں ہیں اور ہر دو رکعتوں میں تشہد ہے اور اپنی عاجزی فقر اور احتیاج کا اقرار کرنا ہے اور دونوں ہاتھ اٹھا کر یا اللہ یا اللہ کہو جس نے ایسا نہ کیا تو اس کی نماز ناقص اور خداج ہوگی۔

ظاہر ہے کہ نفس نماز تو عاجزی، تمسکن ہاتھ اٹھانے اور اللّٰھم اللّٰھم وغیرہ کہنے کے بغیر بھی بالاتفاق جائز ہے اور فریق ثانی کے نزدیک نماز وتر کی دو رکعتوں کے بعد تشہد بھی نہیں ہے حالانکہ اس حدیث میں ایسا نہ کرنے والے کی نماز پر خداج کا اطلاق ہوا ہے اگر خداج رکنیت کو چاہتا ہے تو ایسا کیوں فرمایا ہے اور فریق ثانی لفظ کل کے عموم سے بھی استدلال کرتا ہے جس کا ذکر عنقریب کیا جائے گا، انشاء اللہ العزیز۔

اعتراض:۔ مبارکپوری صاحبؒ لکھتے ہیں کہ اس روایت میں عبد اللہؒ بن نافعؒ بن عمیاءؒ راوی کمزور ہے، ابن حجرؒ لکھتے ہیں کہ وہ مجہول ہے (تقریب ص۲۱۸) علاوہ بریں امام لیثؒ بن سعدؒ لفظ خداج کے بجائے کذا وکذا کے الفاظ نقل کرتے ہیں، اور امام شعبہؒ لفظ خداج نقل کرتے ہیں اور امام بخاریؒ لیثؒ بن سعدؒ کی تصویب کرتے ہیں (بمعناہ تحقیق الکلام جلد ۲ ص۴۸)

جواب:۔ یہ ٹھیک ہے کہ بعض حضرات محدثین کرامؒ نے ان کو مجہول کہا ہے اور بعض

له یہ روایت ترمذی جلد ۱ ص۵۱، ابوداؤد جلد ۱ ص۱۸۳، ابن ماجہ ص۹۵، مسند احمد جلد ۱ ص۲۱۱ جلد ۴ ص۱۶۷، طیالسی ص۱۹۵، سنن الکبریٰ جلد ۲ ص۴۸۸، نیل الاوطار جلد ۲ ص۲۲۶ اور التاج الجامع للاصول جلد ۱ ص۲۰۰ وغیرہ کتابوں میں ہے۔

نے ان کی حدیث کی صحت کا بھی انکار کیا ہے مگر امام ابو حاتمؒ اس حدیث کی تحسین کرتے ہیں۔
(کتاب العلل جلد ۱ ص ۱۳۲) اور غایۃ المأمول جلد ۱ ص ۲۷ میں لکھا ہے بسند صحیح کہ اس کی سند
صحیح ہے۔ اور مبارکپوری صاحبؒ لکھتے ہیں کہ اگر کسی راوی پر جہالت کا الزام ہو اور ابن حبانؒ
اس کو ثقات میں بیان کر دیں تو اس کی جہالت رفع ہو جاتی ہے (ابکار المنن ص ۱۳۱) اور ان کو
ابن حبانؒ بھی ثقات میں بتلاتے ہیں (تہذیب التہذیب جلد ۶ ص ۱۵۱) تو ان کے مسلّم
قاعدہ کے مطابق یہ روایت صحیح ہے۔ رہا امام لیثؒ بن سعدؒ کا قصہ تو وہ بھی سن لیجئے امام لیثؒ
بن سعدؒ بھی اس روایت کو لفظ خداج سے روایت کرتے ہیں (دیکھئے سنن الکبریٰ جلد ۲
ص ۴۷۷ وغیرہ) اور لیثؒ بن سعدؒ کے ایک شاگرد عبد اللہؒ کے علاوہ باقی سب لفظ خداج ہی
سے اس روایت کو نقل کرتے ہیں، اس روایت سے یہ بھی ثابت ہو گیا کہ ہر دو رکعتوں کے
بعد تشہد ضروری ہے، لہٰذا وتروں کا بھی یہی حکم ہو گا اور فریق ثانی کا انکار باطل ہے خصوصاً جب
کہ لفظ کُل کے عموم کے بھی مدعی ہیں پھر وہ (تشہد فی کل رکعتین کا کیونکر انکار کرتے یا کر سکتے
ہیں؟ مگر اس کو کیا کہا جائے کہ وہ اپنی رائے کو نہیں چھوڑ سکتے۔ اس میں شبہ نہیں اور صریح صحیح و مرفوع
روایتوں میں اس کی بڑی تشدید آئی ہے کہ رکوع وغیرہ میں امام سے پہلے مقتدی کو سر اٹھانے کی گنجائش
اور اجازت نہیں ہے مگر ایسا کرنا رکن شکنی نہیں ہے جس سے کہ سے نماز ہی نہ ہو مسند آنحضرت
صلی اللہ تعالیٰ علیہ وآلہ وسلم نے ایک شخص کو جس نے آپ سے قبل ہی سر رکوع سے اٹھا لیا تھا۔
خطاب کرتے ہوئے یہ ارشاد فرمایا اتقوا خداج الصلوٰۃ۔ (مسند احمد جلد ۳ ص ۴۳)
کہ تم ناقص (اور خداج) نماز سے بچو اس حدیث میں بھی غیر رکن پر لفظ خداج کا اطلاق ہوا ہے
مؤلف خیر الکلام لکھتے ہیں کہ ان احادیث میں خداج کا معنیٰ نقصان وصفی کے لیے کیا گیا ہے اور
یہ مجازی معنیٰ ہے اور فاتحہ کو حنفی بھی واجب کہتے ہیں (محصلہ ص ۱۷۷) الجواب:۔ حضرت ابو ہریرۃؓ
کی حدیث میں بھی نقصان وصفی ہی مراد لے لیں کیونکہ وہاں بھی قوی قرائن موجود ہیں اور خود حضرت
ابو ہریرۃؓ کی روایت بھی ایک قرینہ ہے جو آثار صحابہؓ میں گذر چکی ہے کہ وہ جہری نمازوں
میں قرأت خلف الامام کے قائل نہ تھے اور حنفیوں کے نزدیک مقتدی پر فاتحہ واجب ہی نہیں
ہے اور بحث اسی میں ہے منفرد اور امام کی بات نہیں ہو رہی۔

۳- جیسے لفظ خداج کا اطلاق ایسے موقع اور محل پر ہوا ہے جو رکن نہیں اسی طرح لفظ غیر تمام بھی غیر رکن کے ترک پر بولا گیا ہے۔ آنحضرت صلی اللہ تعالیٰ علیہ وآلہٖ وسلّم نے ارشاد فرمایا اقامۃ الصف من تمام الصلوٰۃ (بخاری جلد ۱ ص۱۰۰) کہ صف کو سیدھا کرنا نماز کے اتمام میں داخل ہے۔ فان تسویۃ الصفوف من تمام الصلوٰۃ (مسلم جلد ۱ ص۱۸۲ و مسند احمد جلد ۳ ص۱۷۷) کہ بلاشک صفوں کا درست کرنا اتمام صلوٰۃ سے ہے اور اسی قسم کے الفاظ مسند طیالسی ص۲۶۶ وغیرہ میں مروی ہیں، یہ ٹھیک ہے کہ صفوں کی درستگی کا بڑا اہتمام کیا گیا ہے اور آنحضرت صلی اللہ تعالیٰ علیہ وآلہٖ وسلّم اس کا خاص لحاظ فرمایا کرتے تھے لیکن تسویہ صفوف آخر رکنِ صلوٰۃ بھی تو نہیں ہے کہ اس کے بغیر مطلقاً نماز ہی صحیح نہ ہو اسی طرح ایک روایت میں یوں ارشاد ہوا ہے۔ لا تتم صلوٰۃ احدکم حتیٰ یسبغ الوضوء (دار قطنی جلد ۱ ص۳۵) تم میں کسی کی نماز مکمل نہیں ہو سکتی تاوقتیکہ وہ وضوء کی تکمیل نہ کرے ظاہر ہے کہ اسباغ وضوء میں تین تین بار دھونا اور اطالہ وغیرہ کرنا پڑتا ہے۔ اور یہ نماز کے لیے ضروری نہیں ہے، ایک دفعہ وضوء کرنا کافی ہے اور دو مرتبہ کامل وضوء ہے اور تین مرتبہ کا اکمل جیسا کہ حضرات محدثین کرامؒ نے باب الوضوء مرۃ مرۃ۔ باب الوضوء مرتین مرتین اور باب الوضوء ثلاثا ثلاثا قائم کر کے اور ان کے تحت مرفوع قولی اور فعلی حدیثیں درج کر کے یہ بات واضح کر دی ہے اس حدیث میں بھی غیر رکن پر لا تتم کے الفاظ اطلاق کئے گئے ہیں، ایک حدیث میں آتا ہے کہ آنحضرت صلی اللہ تعالیٰ علیہ وآلہٖ وسلّم نے ارشاد فرمایا۔ من تمام الصلوٰۃ، الصلوٰۃ فی النعلین (مجمع الزوائد جلد ۱ ص۱۶۳) کہ نماز کا اتمام اور اس کی تکمیل یہ ہے کہ جوتوں میں نماز پڑھی جائے اگر من تمام الصلوٰۃ یا غیر تمام وغیرہ الفاظ رکنیت کو چاہتے ہیں تو جوتوں میں نماز پڑھنا بھی رکن ہونا چاہیئے، اور حافظ ابن تیمیہؒ لکھتے ہیں غیر تمام تفسیر لقولہ علیہ السلام وھذا اللفظ لا یقتضی الرکنیۃ (فتاویٰ ص۲۹ ج۴) کہ غیر تمام کا جملہ آنحضرت صلی اللہ تعالیٰ علیہ وآلہٖ وسلّم کے ارشاد (خداج) کی تفسیر ہے لیکن یہ لفظ رکنیت کو نہیں چاہتا، امام ابن دقیق العیدؒ ایک مقام پر اس کی تشریح کرتے ہوئے لکھتے ہیں۔ تمام الشئی امر زائد علی وجود حقیقتہ (احکام الاحکام جلد ۱ ص۱۹۵) کہ اصل شئے کی حقیقت سے تمام کا مفہوم زائد ہے اس کو یوں سمجھئے کہ لنگڑا اپاہج اور اندھا وغیرہ بھی تو

آخر انسان ہے ان نقائص کی وجہ سے اس کی انسانیت کا انکار تو ہرگز نہیں ہو سکتا، ہاں البتہ اگر یہ اعضاء بھی صحیح ہوتے تو وہ کامل اور مکمل انسان کہلاتا۔ آپ ملاحظہ کر چکے کہ لفظ خداج کی طرح غیر تمام کا جملہ بھی رکنیت کو نہیں چاہتا اور اس پر فریق ثانی کے استدلال کی عمارت قائم تھی۔

۴۔ قرأۃ فی النفس کے معنی عربی قواعد کے لحاظ سے زبان کے ساتھ آہستہ پڑھنے کے علاوہ اپنے دل ہی دل میں تدبر اور غور کرنے اور منفرد اور اکیلے ہو کر پڑھنے کے بھی آتے ہیں اور جب تک یہ دو معنی اور بھی موجود ہیں تو فریق ثانی کا قطعی اور حتمی طور پر یہ دعویٰ کیسے مسموع ہو سکتا ہے کہ قرأت فی النفس سے آہستہ زبان کے ساتھ پڑھنا ہی مراد ہے یہ کیوں نہیں ہو سکتا کہ حضرت ابو ہریرہؓ کے اس موقوف اثر اور فتوے کا مطلب یہ ہو کہ اے سائل جب تم امام کے پیچھے اقتدار کر چکے ہو تو اپنے دل ہی دل میں سورۂ فاتحہ کا تدبر اور غور کیا کرو اقرأ بہا فی نفسک اور زبان کو حرکت تک نہ دینا۔ اس روایت کا یہی مطلب حافظ المغرب امام ابن عبد البرؒ نے بیان کیا ہے اور اس کا بھی قوی احتمال ہے اور یا یہ معنیٰ ہو کہ اے سائل تم نے امام کے پیچھے سورۂ فاتحہ پڑھنے کا سوال کیا ہے لیکن اقرأ بہا فی نفسک جب تم اکیلے اور منفرد ہوا کرو تو اس وقت سورۂ فاتحہ پڑھا کرو گو اس اعتبار سے اسلوب حکیم کے پیش نظر حضرت ابو ہریرہؓ نے سائل کو یہ بتایا کہ جب تم منفرد اور اکیلے ہوتے ہو تو اس وقت سورۂ فاتحہ پڑھا کرو۔ امام کے پیچھے سورۂ فاتحہ پڑھنے کی گنجائش نہیں ہے اس کا بھی قوی احتمال ہے اور اگر اس کو آپ معنیٰ اور مطلب کہنے پر آمادہ نہیں تو صحیح احادیث کے ساتھ تطبیق دینے کی ایک جائز تاویل ہی کو لیجئے، امام نوویؒ حضرت ابو ہریرہؓ ہی کے ایک موقوف اثر کے بارے میں جو ایک مرفوع حدیث کے مخالف ہے، لکھتے ہیں۔ متاول او مردود (شرح مسلم جلد ۲ ص ۲۶۵) اس کی کوئی مناسب تاویل کر لی جائے گی یا اس کو رد کر دیا جائے گا پہلے تو اس اثر میں علاءؒ بن عبد الرحمٰنؒ موجود ہے جس کا حال آپ سن چکے ہیں پھر یہ ابو ہریرہؓ پر موقوف ہے اگر یہ اثر صحیح بھی ہو تب بھی مرفوع روایت کے مقابلہ میں قابل التفات نہیں ہے اور اس کا ایک صحیح محمل بیان کر کے صحیح روایات کے ساتھ منطبق کرنا یہ تو انتہائی خوش عقیدگی اور حسن ظنی ہے قرأۃ فی النفس تدبر کے معنیٰ میں آتا ہے آنحضرت صلی اللہ تعالیٰ علیہ وآلہ وسلم نے ارشاد فرمایا یؤم القوم اقرأھم لکتاب اللہ (مسلم جلد ۱ ص ۲۳۶ ابو داؤد جلد ۱ ص ۹۳ ترمذی جلد ۱ ص ۳۲)

قوم کا امام وہی ہو جو بڑا عالم کتاب اللہ ہو۔ امام نوویؒ اقرأ کا معنی افقہ بھی نقل کرتے ہیں اصل عبارت یوں ہے ولجابوا عن الحدیث بان الاقرأ من الصحابۃ کان ھو الافقہ اھ (نووی ص۲۳۶ ج۱) اور انہوں نے حدیث کا یہ جواب دیا ہے کہ حضرات صحابہ کرامؓ میں جو اقرأ ہوتا تھا وہی افقہ ہوتا تھا یعنی جو شخص قرآن کریم کا سب سے بڑا عالم اور اس کے معانی پر غور اور فکر و تدبّر کرنے والا ہو تو وہی شخص قوم کا امام ہونا چاہیے اور اگر علم قرأت اور تجوید پر بھی اس کی گہری نگاہ ہو تو نور علیٰ نور، اور صاحب تاج العروس اس کا معنی کرتے ہیں اقرأ اصحابہ واتقن للقرآن واحفظ کہ وہ شخص امام ہو جو دوسروں سے زیادہ معیاری عبور اور تدبّر کرنے والا اور الفاظ و معانی کا حافظ ہو۔ حضرت ابن عباسؓ فرماتے ہیں اذا قرأتہا فی نفسک لم یکتبا ما (نہایہ جلد ۴ ص۲۶) جب تم دل میں پڑھتے ہو تو وہ دونوں فرشتے اس کو نہیں لکھتے، دل میں پڑھنے کا مطلب جس کو کراماً کاتبین بھی نہ لکھیں غور کرنے اور تدبّر کرنے کے علاوہ اور کیا ہو سکتا ہے؟ حضرت ابو سعید الخدریؓ سے روایت ہے کہ آنحضرت صلی اللہ تعالیٰ علیہ وآلہ وسلّم نے ارشاد فرمایا جب تم میں سے کوئی شخص نماز پڑھ رہا ہو اور شیطان اس کے دل میں یہ وسوسہ ڈالے کہ تمہارا وضو ٹوٹ چکا ہے تو محض اس وسوسہ کی بنا پر نماز نہ چھوڑ دینا بلکہ یہ کہہ دیا کرو کہ کذبت اے شیطان تم جھوٹ بک رہے ہو مگر یہ کہنا فی نفسہ ہو امام ابن حبانؒ نے اپنی صحیح میں فی نفسہ کی زیادت روایت کی ہے (بلوغ المرام ص۵) سوچئے کہ بحالت نماز دل میں شیطان لعین کو یہ کہنا کہ تم جھوٹ بکتے ہو میرا وضو نہیں ٹوٹا بغیر تدبر اور غور کے اور کیا ہو سکتا ہے؟ مشہور تابعیؒ حضرت قتادہؒ فرماتے ہیں اذا طلّق فی نفسہ فلیس بشیٔ (بخاری جلد ۲ ص۷۹۴) جب کوئی شخص اپنے دل میں طلاق دے تو اس کا کوئی اعتبار نہیں ہے طلق فی النفس کا مطلب بغیر تدبر اور غور کے اور کیا ہو سکتا ہے زبان سے طلاق کا لفظ کہنے سے گو مسخرہ پن سے کیوں نہ ہو طلاق واقع ہو جاتی ہے حضرت عمرؓ نے ایک مشورہ کے موقع پر یہ ارشاد فرمایا تھا وکنت زوّرت مقالۃ (بخاری جلد ۲ ص۱۰۱۰) میں نے اپنے دل میں ایک مقالہ تیار کیا تھا۔ ظاہر ہے کہ قلبی مقالہ تدبر اور غور کے سوا اور کیا ہو سکتا ہے؟ حضرات ائمہ متکلمین نے کلام لفظی اور کلام نفسی پر روشنی ڈالی ہے اور اس پر متفق ہیں کہ کلام نفسی پر بھی کلام کا اطلاق صحیح ہے بلکہ حقیقت شناسی سے کام لیا جائے تو اصل کلام ہی دل کا کلام ہے۔

ے ان الکلام لفی الفؤاد وانما جعل اللسان علی الفؤاد دلیلاً
بے شک کلام تو درحقیقت دل ہی کا کلام ہے، زبان تو صرف اس کلام کو ظاہر کرنے کا ایک ذریعہ ہے۔

ان تمام اقتباسات سے یہ امر واضح ہو جاتا ہے کہ دل کے اندر غور اور تدبر و فکر کرنے پر بھی قرأت، قول، مقالہ اور کلام وغیرہ کا اطلاق جائز اور صحیح ہے اور اس کا انکار کرنا باطل ہے۔ مؤلف خیر الکلام نے امام بیہقیؒ کے حوالے سے جو یہ لکھا ہے کہ دل میں تدبر کرنے پر بالاجماع قرأت کا اطلاق نہیں ہوتا (محصلہ ص۱۸) تو یہ قابل قبول نہیں اس لیے کہ ہم حضرت ابن عباسؓ اور امام ابن عبد البرؒ وغیرہ کے حوالہ سے عرض کر چکے ہیں کہ دل کے تدبر پر بھی قرأت کا اطلاق ہوتا ہے محض بے دلیل خوش کن لفظ اجماع سے کچھ نہیں بنتا۔ فریق ثانی ہی ازراہ کرم یہ فرمائے کہ ایک شخص کسی کتاب یا اخبار وغیرہ کو دل ہی دل میں پڑھتا ہے اور زبان کو حرکت تک نہیں دیتا کیا یہ کہنا صحیح ہے کہ اس نے کتاب اور اخبار کی قرأۃ کی ہے؟ اگر جواب اثبات میں ہے اور یقیناً اثبات ہی میں ہونا چاہیئے تو اس غور اور تدبر پر قرأۃ فی النفس کا اطلاق کیسے صحیح ہوا؟ رہا حضرت امام بیہقیؒ، امام نوویؒ اور مبارکپوری صاحبؒ وغیرہ کا یہ اعتراض کہ اگر دل میں تدبر اور غور کرنے پر قرأت کا اطلاق صحیح ہے تو جنبی وغیرہ جب دل میں قرآن کریم پر تدبر کرتا ہے تو وہ گنہگار کیوں نہیں ہوتا حالانکہ زبان کے ساتھ پڑھنا اس کے لیے جائز نہیں ہے (کتاب القرأۃ ص۱۷، نووی جلد ۱ ص۱۷۰ تحقیق الکلام جلد ۲ ص۲۶) تو یہ ایک سطحی قسم کا سوال اور مغالطہ ہے، کیونکہ جنبی کے لیے تلفظ اور زبان سے پڑھنا جائز نہیں ہے۔ جیسا کہ دل میں طلاق دینے سے طلاق واقع نہیں ہوتی بلکہ اس کے لیے تکلم اور تلفظ شرط ہے یہ نہیں کہ دل میں طلاق کے تدبر پر طلاق فی النفس کا اطلاق ہی صحیح نہیں ہے؟ بہرحال یہ ایک ناقابلِ انکار حقیقت ہے، کہ دل کے اندر غور اور تدبر کرنے پر قرأت، مقالہ اور قول کا اطلاق صحیح ہے آخر حضرات مفسرین کرامؒ کے ایک معتد بہ گروہ نے حضرت یوسف علیہ السلام کے اس ارشاد کا کہ قَالَ بَلْ اَنْتُمْ شَرٌّ مَّکَانًا۔ اپنے جی میں حضرت یوسف علیہ السلام نے فرمایا بلکہ تم بدتر ہو درجہ میں یہی مطلب تو بیان کیا ہے کہ انہوں نے یہ بات اپنے دل میں کہی اور سیاق وسباق سے یہی تفسیر قرین قیاس معلوم ہوتی ہے گو دوسری تفسیر کا بھی احتمال ہے، جب یہ ثابت ہو گیا کہ

دل میں غور و فکر اور تدبر بھی قرأت فی النفس کا اطلاق صحیح ہے تو اس احتمال کی موجودگی میں فریق ثانی کا استدلال صحیح نہیں ہوسکتا، قاضی شوکانیؒ فرماتے ہیں ومع الاحتمال یسقط الاستدلال (نیل الاوطار جلد ا ص۱۹) احتمال کے ہوتے ہوئے استدلال ساقط الاعتبار ہے یعنی ایسا احتمال جو ناشئ عن دلیل ہو محض احتمال سے استدلال پر کوئی زد نہیں پڑتی (غیث الغمام ص۲۶) اور یہاں احتمال ناشئ عن دلیل ہی ہے کما لا یخفی۔ یہاں تک جو بحث ہوئی وہ اس امر کی تھی کہ اس حدیث کا مطلب حافظ ابن عبد البرؒ وغیرہ نے یہ بیان کیا ہے کہ اقرأ بھا فی نفسک کا معنی ہے دل میں اس پر غور فکر اور تدبر کرنا ہے، اور قواعد شرعیہ سے اس کا ثبوت موجود ہے جو عرض کر دیا گیا ہے اب آپ اقرأ بھا فی نفسك کا دوسرا معنی بھی سن لیں کہ فی نفس کے معنی اکیلے اور منفرد کے بھی آتے ہیں چند نظائر اور نقول عرض ہیں غور کریں اللہ تعالیٰ آنحضرت صلی اللہ تعالیٰ علیہ وآلہ وسلم کو ارشاد فرماتا ہے کہ آپ جب ان (خاص قسم کے) لوگوں کو وعظ کریں تو قُلْ لَّهُمْ فِيْ اَنْفُسِهِمْ قَوْلًا بَلِيْغًا (پ۵، نساء) آپ ان میں سے ہر ایک ایک اور اکیلے اکیلے کو تنہائی بلیغ بات کہدیجئے اس آیت میں فی نفس کا معنی امام عربیت علامہ زمخشریؒ نے تفسیر کشاف جلد ۲ ص۳۱۷ میں اور امام رازیؒ نے تفسیر کبیر جلد ۳ ص۳۷۰) میں اور اسی طرح دوسرے بعض مفسرینؒ نے جن میں قاضی بیضاویؒ اور صاحب روح المعانی وغیرہ شامل ہیں یہی معنی کئے ہیں اور اسی طرح کا معنی حضرت عبد اللہؓ بن عباسؓ سے بھی منقول ہے (دیکھئے فتح الملہم جلد ۲ ص۲۸ وغیرہ) ایک حدیث قدسی میں آنحضرت صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم اللہ تعالیٰ جل شانہٗ سے روایت کرتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا۔

فان ذکرنی فی نفسه ذکرته فی نفسی وان ذکرنی فی ملاء ذکرته فی ملاء خیر منهم الحدیث (بخاری جلد ۲ ص۱۱۰۱ مسلم جلد ۲ ص۳۴۳، مسند احمد جلد ۲ ص۱۳۸)	میرا کوئی بندہ جب مجھے تنہائی میں یاد کرتا ہے تو میں بھی اس کو تنہائی میں یاد کرتا ہوں اور جب وہ مجھے کسی جماعت میں یاد کرتا ہے تو میں اس جماعت سے بہتر جماعت میں اس کو یاد کرتا ہوں۔

اس حدیث میں فی نفسہٖ تنہا اور اکیلے کے معنی میں ہے کیونکہ اس کا تقابل فی ملاء، جماعت سے کیا گیا ہے اور کنز العمال جلد ا ص۱۰۰ میں فی نفسہٖ کے بجائے خالیا

(اکیلا اور منفرد) کا لفظ آیا ہے جو صراحت سے اس مفہوم کو ادا کرتا ہے اور قاموس میں فی نفس کے معنیٰ اکیلے کے بیان کئے گئے ہیں (فصل الخطاب صـ۲) اور فن نحو کی کتابوں میں اسم فعل اور حرف کی جو تعریف کی گئی ہے اس سے کون طالب علم ناواقف ہو سکتا ہے؟ اسم وہ کلمہ ہے جو فی نفسہٖ اپنے معنیٰ پر دلالت کرے، اور ضم ضمیمہ کا محتاج نہ ہو فعل وہ کلمہ ہے جو فی نفسہٖ اپنا معنیٰ دے اور ضم ضمیمہ کا مفتقر نہ ہو لیکن ماضی وحال اور استقبال میں سے کوئی زمانہ اس میں پایا جائے اور حرف وہ کلمہ ہے جو فی نفسہٖ اپنا معنیٰ ادا نہ کر سکے بلکہ اسم اور فعل سے مل کر اپنا مفہوم ادا کرے، ان مواقع میں فی نفسہٖ کا معنیٰ اکیلا اور منفرد ہی ہے کہ اسم و فعل اکیلے اور تنہا اپنا معنیٰ دیتے ہیں مگر حرف اکیلا معنیٰ نہیں ادا کرتا عرف عام میں بھی فی نفسہٖ کا معنیٰ اکیلے اور منفرد کے آتے ہیں کیا لوگ یہ نہیں کہا کرتے فلاں شخص فی نفسہٖ بڑا شریف (یا بُرا) ہے یعنی اگر اس کو اس کے رفقاء، جماعت، ہوائی اور گرد و پیش کے ماحول سے الگ کر کے اکیلا دیکھا جائے تو بڑا شریف (یا بُرا) ہے، جب قرآن کریم، صحیح حدیث ائمہ لغت و تفسیر اور علم نحو بلکہ عرف عام سے یہ ثابت ہے کہ فی نفس کے معنیٰ اکیلے اور منفرد کے بھی آتے ہیں تو حضرت ابُوہریرۃؓ کے اس موقوف اثر کا یہ معنیٰ کیوں نہ ہو جائے کہ اقرأ بہا فی نفسک جب تم اکیلے اور منفرد ہوا کرو تو اس وقت سورۃ فاتحہ پڑھا کرو، تاکہ نہ تو جناب رسول اللہ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کی صحیح اور صریح و مرفوع حدیثوں سے اس کا تعارض پیدا ہو اور نہ مخالفت لازم آئے، شاید ایسے ہی موقع کے لیے یہ کہا گیا ہے کہ نہ ہینگ لگے نہ پھٹکڑی، آخر حضرت ابوہریرۃؓ نے ابو السائبؒ کا بازو (فغمز ذراعی) بلاوجہ تھوڑا ہی دبایا تھا جواب کوئی مخصوص ہی ہو گا ؎

اور ہوں گے جو سہیں اُن کی جفائیں بے محل
ہم کسی کا غمزۂ بے جا اُٹھا سکتے نہیں

قارئین کرام! حضرت ابوہریرۃؓ کی اس روایت کا پس منظر آپ ملاحظہ کر چکے ہیں، زیادہ مناسب معلوم ہوتا ہے کہ ہم لفظ خداج کی مناسبت سے وہ جملہ روایتیں جو ہماری نظر سے گذری ہیں یہیں ہی نقل کر کے ان پر روایتی اور درایتی کلام کرتے جائیں اور پھر حدیث ثمر تین کا ذکر کریں۔

احادیث خداج اور مخدجہ کی بحث

حضرت عائشہؓ سے روایت ہے کہ آنحضرت صلی اللہ تعالیٰ علیہ وآلہ وسلم نے ارشاد فرمایا

کل صلوٰۃ لا یقرأ فیھا بفاتحۃ الکتاب وشیٔ فھی خداج (کتاب القرأۃ ص۳۱)

جس نماز میں سورۂ فاتحہ اور اس کے ساتھ کچھ اور نہ پڑھا جائے تو وہ نماز خداج اور ناقص ہوگی۔

جواب:۔ اس روایت سے استدلال صحیح نہیں ہے اولًا اس لئے کہ اس کی سند میں جبارۃ بن المغلسؒ راوی ہے۔ امام بخاریؒ فرماتے ہیں کہ وہ مضطرب الحدیث تھا امام ابن معینؒ اس کو کذاب کہتے ہیں۔ (میزان الاعتدال جلد۱ ص۱۷۹) امام احمدؒ فرماتے ہیں کہ اس کی حدیثیں بعض جعلی اور موضوع بھی ہیں، ابوزرعہؒ نے ان سے روایت ترک کر دی تھی، ابن سعدؒ اس کو ضعیف کہتے ہیں، ابوداؤدؒ نے اس سے ترک روایت کا یہ عذر پیش کیا ہے کہ وہ صاحب مناکیر تھا محدث بزارؒ اس کو کثیر الخطا کہتے ہیں ابن حبانؒ کا بیان ہے کہ وہ اسانید میں ہیر پھیر کر دیا کرتا تھا اور اس کی حدیث سے احتجاج صحیح نہیں ہے، دارقطنیؒ اس کو متروک کہتے ہیں (تہذیب التہذیب جلد۲ ص۵۸) دوسرا راوی اس سند کا شبیب بن شیبہؒ ہے امام یحییٰؒ اس کو لیس بثقہ اور امام نسائیؒ و دارقطنیؒ اس کو ضعیف کہتے ہیں، امام ابو حاتمؒ اور ابوزرعہؒ اس کو لیس بالقوی اور ابوداؤدؒ اس کو لیس بشیٔ کہتے ہیں (میزان جلد۱ ص۴۴۴) وثانیًا اس میں خلف الامام کا کوئی ذکر نہیں ہے اور لفظ کل کی بحث عنقریب آرہی ہے وثالثًا اس میں وشیٔ کی زیادت بھی موجود ہے مگر فریق ثانی اس کا قائل نہیں ہے ورابعًا بسند صحیح وحسن حضرت عائشہؓ سے ایک روایت پہلے عرض کی جاچکی ہے کہ وہ جہری نمازوں میں امام کے پیچھے قرأۃ سورۂ فاتحہ کی قائل نہ تھیں، اگر یہ روایت ان کے نزدیک صحیح ہوتی تو ہرگز اس کے خلاف نہ کرتیں، حضرت عائشہؓ سے ایک روایت مرفوعًا ان الفاظ سے مروی ہے کل صلوٰۃ لا یقرأ فیھا بام القرآن فھی خداج فھی خداج (مجمع الزوائد جلد۲ ص۱۱۱ وکتاب القرأۃ ص۳۱) ہر وہ نماز جس میں سورۂ فاتحہ نہ پڑھی جائے وہ ناقص ہے، ناقص ہے، ناقص ہے، لیکن اس کی سند میں عبداللہؒ بن لہیعہؒ ہے، امام مسلمؒ فرماتے ہیں کہ امام ابن مہدیؒ اور یحییٰؒ بن سعیدؒ اور وکیعؒ نے ان سے روایت بالکل ترک کر دی تھی ابو احمد حاکمؒ ان کو ذاہب الحدیث کہتے ہیں، ابن حبانؒ ان کی روایت کو

واجب الترک کہتے ہیں۔ اور ابن سعدؒ کہتے ہیں کہ وہ ضعیف ہے، ابو زرعہؒ کا بیان ہے کہ وہ صاحب ضبط نہ تھے، امام نسائیؒ ان کو لیس بثقہ کہتے ہیں، ابو حاتمؒ کہتے ہیں کہ ان کی روایت حجت نہیں ہو سکتی، ابن قتیبہؒ ان کی تضعیف کرتے ہیں علامہ خطیبؒ کہتے ہیں کہ وہ تساہل کی وجہ سے کثرت مناکیر کا شکار ہو گئے تھے، ابن معینؒ کہتے ہیں کہ ان کی حدیث سے احتجاج صحیح نہیں ہے۔

(تہذیب التہذیب جلد ۵ ص ۲۷۸-۲۷۹ محصلہ) امام ترمذیؒ کہتے ہیں کہ وہ ضعیف ہے جلد ا ص ۴) حضرت عائشہؓ کی ایک مرفوع روایت ان الفاظ سے مروی ہے کل صلوٰۃ لا یقرأ فیہا بام الکتاب فھی خداج (ابن ماجہ ص ۶۱ و کتاب القرأۃ ص ۳۱) ہر وہ نماز جس میں سورۂ فاتحہ نہ پڑھی گئی ہو وہ ناقص ہوگی۔

لیکن اس کی سند میں محمد بن اسحاقؒ ہے جس کا ذکر عنقریب کیا جائے گا نیز وہ عنعنہ بھی کرتا ہے اور جزء القرأۃ (ص ۴) میں بھی حضرت عائشہؓ سے مرفوعاً یوں مروی ہے کل صلوٰۃ لا یقرأ فیہا فھی خداج اور اس کی سند میں بھی محمد ابن اسحاقؒ ہے اور متن میں فاتحہ کی تعیین نہیں ہے۔

حضرت عبد اللہؓ بن عمرؓ سے مرفوعاً روایت ہے من صلّے صلوٰۃ لم یقرأ فیہا بام القرآن فھی خداج غیر تمام (کتاب القرأۃ ص ۳۳ و توجیہ النظر ص ۲۴۲) جس نے نماز پڑھی اور اس میں سورۂ فاتحہ نہ پڑھی تو اس کی نماز ناقص اور نامکمل ہوگی، لیکن اس روایت میں ایک راوی محمدؒ بن حمیر ہے اگرچہ جمہور محدثین کرامؒ اس کی توثیق کرتے ہیں لیکن امام ابو حاتمؒ فرماتے ہیں کہ ان کی حدیث لکھی جا سکتی ہے اس سے احتجاج صحیح نہیں ہے فسویؒ کہتے ہیں کہ وہ قوی نہ تھا علامہ ذہبیؒ انکو صاحبِ غرائب اور افراد کہتے ہیں (میزان ص ۴۲) حافظ ابن حجرؒ بھی امام یعقوبؒ بن سفیان الفسویؒ سے یہی قول نقل کرتے ہیں کہ وہ قوی نہیں ہے۔ (تہذیب التہذیب ص ۱۳۵ ج ۹) دوسرا راوی اس سند کا عبد اللہ بن عمر العمریؒ ہے، امام یحییٰؒ ان سے روایت نہیں لیتے تھے، امام نسائیؒ انکو لیس بالقوی کہتے ہیں۔

ابن مدینیؒ ان کو ضعیف کہتے ہیں، ابن حبانؒ کا بیان ہے کہ وہ کثرت خطاء کی وجہ سے قابلِ ترک تھے (میزان الاعتدال جلد ۲ ص ۵۸)، حافظ ابن حجرؒ لکھتے ہیں کہ وہ ضعیف ہے (تقریب ص ۲۰۹) تیسرا راوی اس کڑی کا اسمٰعیل بن عیاشؒ ہے، امام مسلمؒ لکھتے ہیں کہ ان کی کوئی روایت قابلِ حجت نہیں ہے معروف راویوں سے ہو یا مجہول سے (جلد ا ص ۱۸) لیکن محدث دحیمؒ وغیرہ نے یہ

فیصلہ درج کیا ہے کہ اسمٰعیلؒ مذکور کی ہر وہ روایت جو اہل مدینہ سے ہو ضعیف اور کمزور ہوتی ہے (میزان جلد ۱ صـ۱۱۲ وتہذیب التہذیب جلد ۱ صـ۳۲۴) اور یہ روایت بھی عبداللہ بن عمر مدنیؒ سے ہے۔ دوسری سند میں اگرچہ عبدالرحیمؒ بن سلیمانؒ، اسمٰعیلؒ مذکور کا متابع ہے، اور وہ خود ثقہ ہے مگر اس کی سند کمزور ہے لہذا اس کی متابعت کالعدم ہے۔

حضرت عبداللہؓ بن عمرو بن العاص سے مرفوعاً روایت ہے کل صلوٰۃ لا یقرأ فیھا بام القرآن فھی خدجۃ فھی خدجۃ (مجمع الزوائد جلد ۲ صـ۱۱۱) ہر وہ نماز جس میں سورۃ فاتحہ نہ پڑھی جائے وہ ناقص ہے، ناقص ہے، ناقص ہے لیکن اس کی سند میں سعید بن سلیمان النشیطی ہے، امام ابوزرعہؒ کہتے ہیں کہ ہم اللہ تعالیٰ سے سلامت کے خواہاں ہیں وہ قوی نہیں ہے۔ (مجمع الزوائد صـ۱۱۱/۲) ابوحاتمؒ کہتے ہیں کہ اس میں کلام اور نظر ہے، ابوداؤدؒ کہتے ہیں کہ میں اس سے روایت کرنے کے لیے تیار نہیں ہوں دارقطنیؒ کہتے ہیں کہ محدثینؒ اس میں کلام کرتے ہیں۔ (تہذیب التہذیب جلد ۴ صـ۴۴/۴۵) حضرت عبداللہؓ بن عمروؓ سے مرفوعاً ایک روایت یوں مروی ہے کل صلوٰۃ لا یقرأ فیھا بفاتحۃ الکتاب فھی خداج (ابن ماجہ صـ۶۱) ہر وہ نماز جس میں سورۃ فاتحہ نہ پڑھی جائے وہ ناقص، ناقص ہے لیکن اس کی سندیوں ہے عن عمروؒ بن شعیبؒ عن ابیہؒ عن جدہؓ اور جلد اوّل بحث مسلمات امام میں اس پر سیر حاصل بحث گذر چکی ہے، اعادہ کی ضرورت نہیں ہے وہاں ہی ملاحظہ کر لیں حضرت عبداللہؓ بن عمروؓ سے مرفوعاً ایک روایت اس طرح مروی ہے کل صلوٰۃ لا یقرأ فیھا بفاتحۃ الکتاب فھی خداج (کتاب القرأۃ صـ۳۲) جس نماز میں سورۃ فاتحہ نہ پڑھی جائے وہ ناقص ہے لیکن اس کی سند میں ایک راوی عبدالوہابؒ بن عطاءؒ ہے، امام ساجیؒ اور ابوحاتمؒ کہتے ہیں لیس بالقوی عندھم محدثینؒ کے نزدیک یہ قوی نہیں ہے، امام نسائیؒ ان کو لیس بالقوی کہتے ہیں امام احمدؒ ان کو ضعیف الحدیث کہتے ہیں، امام بزارؒ کہتے ہیں لیس بالقوی، امام ابن معینؒ ان کی ایک روایت کو موضوع اور جعلی بتاتے ہیں (تہذیب التہذیب جلد ۶ صـ۴۵۱/۴۵۲) دوسرا راوی اس سند کا محمد بن اسحاقؒ ہے جس کا ذکر عنقریب آئے گا (انشاء اللہ تعالیٰ) اور تیسرا راوی (بلکہ کڑی) عمروؒ بن شعیبؒ عن ابیہؒ عن جدہؓ ہے جس کا ذکر ہو چکا ہے ان کی ایک روایت مرفوعاً یوں ہے

كل صلوٰة لا يقرأ فيها بام القرآن فهى خداج (كتاب القراۃ ص۶۹) اس کی سند میں عمرو بن شعیبؒ الخ کے علاوہ ابو الصلت ھروی ہے، امام ساجیؒ، نسائیؒ، ابو زرعہؒ، ابو حاتمؒ اس کو ضعیف کہتے ہیں مسلمہؒ اور ابن طاہرؒ اس کو کذاب کہتے ہیں، دار قطنیؒ اور عقیلیؒ اس کو رافضی خبیث کہتے ہیں (تہذیب جلد۶ ص۳۲۱) حضرت عبد اللہؓ بن عمروؓ کی ایک مرفوع روایت یوں ہے كل صلوٰة لا يقرأ فيها بفاتحة الكتاب فهى مخدجة، مخدجة (کتاب القراۃ ص۳۲) جس نماز میں سورۂ فاتحہ نہ پڑھی گئی وہ ناقص ہے، ناقص ہے، ناقص ہے لیکن اس میں عمروؒ بن شعیبؒ عن ابیہؒ عن جدہؓ واقع ہے اور علاوہ بریں اس سند کا ایک راوی علی بن احولؒ ہے امام احمد ان کو لیس بالقوی اور ضعیف الحدیث کہتے ہیں امام نسائیؒ کا بیان ہے کہ وہ قوی نہ تھے، محدث حمیدؒ بن اسودؒ اس کو کمزور اور ضعیف کہتے ہیں (میزان جلد۲ ص۔ وتہذیب التہذیب جلد۵ ص۔) امام ابو حاتمؒ کہتے ہیں کہ یہ حدیث منکر ہے (توجیہ النظر ص۲۴۵) مبارکپوری صاحبؒ لکھتے ہیں کہ منکر وہ حدیث ہے جس میں ضعیف اور کمزور راوی متفرد ہو (تحفۃ الاحوذی ج۲ ص۶۴) پس یہ جرح مبہم نہیں بلکہ مفسر ہے مؤلف "خیر الکلام" کا اس کو مبہم کہہ کر ٹال دینا غیر مقبول ہے ان کی ایک روایت ان الفاظ سے بھی مروی ہے کہ سورۂ فاتحہ سکتات امام میں پڑھنی چاہیئے ورنہ نماز خداج غیر تمام ہوگی (کتاب القراۃ ص۵۴/۵۵) اس میں بھی عمروؒ بن شعیبؒ واقع ہے اور دوسرا راوی محمدؒ بن عبد اللہؒ بن عبیدؒ بن عمیرؒ ہے سکتات امام کی بحث دیکھیئے۔ اس پر باحوالہ جرح وہاں نقل کر دی گئی ہے۔

حضرت ابو ہریرہؓ سے مرفوعاً مروی ہے الركعتين اللتين لا يقرأ فيهما خداج فقال رجل يا رسول الله ارائيت ان لم يكن معى الا ام القران قال هى حسبك هى السبع المثانى (کتاب القراۃ ص۸) وہ دو رکعتیں جن میں قرأت نہ کی جائے وہ ناقص ہوں گی ایک شخص نے دریافت کیا یا رسول اللہ یہ فرمایئے کہ اگر مجھے صرف سورۂ فاتحہ ہی یاد ہو؟ آپ نے فرمایا تجھے یہی کافی ہے کیونکہ یہ سبع مثانی ہے اس کی سند میں ابراہیمؒ بن فضلؒ ہے امام نسائیؒ کہتے ہیں وہ متروک ہے (ضعفاء ص۳۶) علامہ ذہبیؒ امام ابن معینؒ امام احمدؒ ابو زرعہؒ اور دیگر محدثین اس کو ضعیف الحدیث کہتے ہیں، ترمذیؒ کہتے ہیں اور بجا کہتے ہیں کہ وہ ضعیف الحدیث

ہے ابو احمد الحاکمؒ کا بیان ہے کہ وہ قوی نہیں ابن حبانؒ ان کو کثیر الخطاء کہتے ہیں، ازدیؒ اور دارقطنیؒ اس کو متروک کہتے ہیں (تہذیب التہذیب جلد ۱ ص ۱۵۰) حافظ ابن حجر لکھتے ہیں متروکؒ، (تقریب ص ۲۰) علاوہ ازیں حسبک صرف کفایت پر دال ہے مگر فریق ثانی اس کی رکنیت اور وجوب کا مدعی ہے، حضرت ابو ہریرہؓ کی ایک موقوف روایت یوں ہے اقرأوا اذا اسکتوا و اسکتوا اذا قرأوا فان الصلوٰۃ الخدجۃ التی لا قراۃ فیہا (کتاب القراۃ ص ۹۶) تم قرأت کیا کرو جب امام خاموش ہوں اور جب وہ پڑھیں تو تم خاموش رہو کیونکہ جس نماز میں قرأت نہ ہو وہ ناقص ہے، اس روایت میں باوجود موقوف ہونے کے سورۃ فاتحہ کا ذکر نہیں ہے علاوہ بریں اس میں اسحاق بن عبداللہؒ بن ابی فروہؒ ہے امام علی بن المدینیؒ اس کو منکر الحدیث کہتے ہیں، ابن عمارؒ اس کو ضعیف اور ذاہب الحدیث کہتے ہیں ابو زرعہؒ، ابو حاتمؒ، نسائیؒ، دارقطنیؒ اور برقانیؒ اس کو متروک الحدیث کہتے ہیں۔ ابن خزیمہؒ کہتے ہیں اس کی حدیث سے احتجاج صحیح نہیں ہے خلیلیؒ کا بیان ہے کہ وہ محدثین کے نزدیک بہت زیادہ ضعف ہے، امام مالکؒ اور شافعیؒ نے اس کو متروک قرار دیا ہے بزارؒ، ابن جارودؒ، عقیلیؒ، دولابیؒ، ابو العربؒ، ساجیؒ ابو حاتمؒ، ابن حبانؒ اور ابن شاہینؒ سب اس کو ضعیف کہتے ہیں۔ (تہذیب التہذیب جلد ۱ ص ۲۴۱، ۲۴۲)

حضرت ابو امامہؓ مرفوعاً روایت کرتے ہیں من لم یقرأ خلف الامام فصلاتہ خداج۔ (کتاب ص ۵۳ القراۃ و تحقیق الکلام جلد ۱ ص ۹۵) جس نے امام کے پیچھے قرأت نہ کی تو اس کی نماز ناقص ہوگی اس کی سند میں سلیمانؒ بن سلمہ حمصیؒ ہے امام ابو حاتمؒ کہتے ہیں کہ وہ متروک ہے ابن جنیدؒ کا بیان ہے کہ وہ جھوٹا ہے نسائیؒ اس کو لیس بشیئ کہتے ہیں ابن عدیؒ کا بیان ہے کہ اس کی بے شمار حدیثیں منکر ہیں خطیبؒ کہتے ہیں کہ مشہور بالضعف یعنی ع بدنام اگر ہوں گے تو کیا نام نہ ہوگا (میزان جلد ۱ ص ۴۱۶ و لسان جلد ۳ ص ۹۳) علاوہ بریں اس میں سورۃ فاتحہ کا ذکر بھی نہیں ہے۔

ایک دیہاتی گنوار (رجل من اہل بادیۃ) اپنے والد سے مرفوعاً روایت کرتا ہے جو آنحضرت صلی اللہ تعالیٰ علیہ وآلہ وسلم کا قیدی تھا کل صلوٰۃ لا یقرأ فیہا فاتحۃ الکتاب

فھی خداج لم تقبل (کتاب القراۃ صـ۵۳ وتحقیق الکلام جلد ا صـ۹۵) ہر وہ نماز جس میں سورۃ فاتحہ نہ پڑھی گئی ہو تو وہ ناقص ہوگی اور قابلِ قبول نہ ہوگی۔ مجمع الزوائد جلد ۲ صـ۱۱۲ میں بھی یہ روایت ہے لیکن اس میں خداج کا لفظ نہیں ہے اس روایت میں یہ دیہاتی گنوار خود کون اور کیسا تھا؟ اور اس کا باپ کون تھا اور کیسا تھا؟ فن رجال اس سے خاموش ہے علامہ ہیثمیؒ لکھتے ہیں فیہ رجل لم یسم۔ اس میں مجہول راوی ہیں، آنحضرت صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کے قیدی اکثر کافر ہوتے تھے نہ معلوم یہ قیدی کس حالت میں تھا؟ اور کون تھا؟

حضرت مہرانؓ آنحضرت صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم سے روایت کرتے ہیں کہ آپؐ نے ارشاد فرمایا من لم یقرأ بام الکتاب خلف الامام فصلاتہ خداج (کتاب القراۃ و مجمع الزوائد جلد ۲ صـ۱۱۱) کہ جس شخص نے امام کے پیچھے سورۃ فاتحہ نہ پڑھی تو اس کی نماز ناقص ہوگی، اس روایت کی سند میں عبد الرحمٰنؒ بن سوارؒ وغیرہ مجہول راوی موجود ہیں جن کا کتب رجال سے کوئی پتہ نہیں چلتا علامہ ہیثمیؒ لکھتے ہیں فی اسنادہ جماعۃ لا اعرفھم (مجمع الزوائد جلد ۲ صـ۱۱۱) کہ اس کی سند میں مجہول راویوں کا ایک گروہ ہے جن کا مجھے علم نہیں ہے۔

حضرت جابرؓ بن عبد اللہؓ مرفوعاً روایت کرتے ہیں کل صلوۃ لا یقرأ فیھا بام القرآن فھی خداج الا ان یکون وراء الامام (دارقطنی جلد ا صـ۱۲۴) ہر وہ نماز جس میں سورۃ فاتحہ نہ پڑھی جائے وہ ناقص ہوگی ہاں مگر وہ نماز جو امام کے پیچھے ہو، امام دارقطنیؒ لکھتے ہیں کہ اس کی سند میں یحییٰؒ بن سلامؒ ہے جو ضعیف ہے، اور یہ حدیث موقوف ہے (جلد ا صـ۱۲۴) علاوہ بریں اس روایت میں الا ان یکون وراء الامام کی استثناء بھی ہے جو فریق ثانی کو سراسر مخالفت پڑتی ہے خداج کی بعض روایات پر جلد اول کی بحث سکتات امام میں کلام کیا جا چکا ہے وہاں ہی ملاحظہ کر لیں اعادہ کی ضرورت نہیں ہے۔

قارئین کرام! یہ ہیں خداج کی وہ ضعیف، کمزور معلل، منکر، متروک اور لیست بحجۃ حدیثیں جن کے بل بوتے پر فریق ثانی نے تمام دنیا کے علماء احناف کو کھلا انعامی چیلنج کیا ہے کہ جو شخص امام کے پیچھے ہر رکعت میں سورۃ فاتحہ نہ پڑھے اس کی نماز ناقص ہے، کالعدم ہے،

بیکار ہے اور باطل ہے (بلفظہ) اور از راہِ انصاف اور دیانت اس پر غور نہ کیا کہ جو جماعت اور فریق قرآن کریم، صحیح احادیث، صحیح آثارِ حضرات صحابہؓ اور اکثر سلف و خلف (اور جہری نمازوں میں تو بقول شیخ الاسلام ابن تیمیہؒ جو شخص امام کے پیچھے قرأت کرتا ہے وہ قرآن، حدیث اور اجماع کا مخالف اور منکر ہے) کے خلاف چلتا ہے کہیں انہیں کی نماز میں خرابی نہ ہوتی ہو۔ دنیا کو چیلنج دینے سے قبل ٹھنڈے دل سے سوچنے کا پہلو یہ تھا۔

اے چشم اشکبار ذرا دیکھنے تو دے ہوتا ہے جو خراب وہ میرا ہی گھر نہ ہو

تصویر کا دوسرا رُخ

آپ نے ملاحظہ کر لیا کہ خداج، خدجۃ اور فخدجۃ کی روایات کا روایتی پہلو کیا ہے؟ اور ان کی اسانید کیسی ہیں؟ اور ان کے راویوں کا کیا پایہ اور درجہ ہے؟

حضرات! اصل روایت یوں نہیں ہے جس طرح ان کمزور اور ضعیف راویوں نے نقل کی ہے اور استثناء ہضم کر گئے ہیں، اصل حدیث کے الفاظ یوں ہیں (اس مضمون کی بیسیوں سے زائد حدیثیں پیش کی جا سکتی ہیں مگر سردست ہم صرف چار روایتیں عرض کرتے ہیں)

پہلی روایت:۔ کل صلوٰۃ لا یقرأ فیھا بام القرآن فھی خداج الا صلوٰۃ خلف امام (کتاب القرأۃ ص۳۵) ہر وہ نماز جس میں سورۃ فاتحہ نہ پڑھی جائے وہ ناقص ہوگی مگر ہاں جو امام کے پیچھے پڑھی جائے، اس روایت کا ایک ایک راوی ثقہ ہے جیسا کہ جلد اول باب دوم میں عرض ہو چکا ہے اور الا صلوٰۃ خلف امام کی زیادت کو بیان کرنے والے خالد بن عبد اللہ الطحانؒ ہیں جو بالاتفاق ثقہ، ثبت، حافظ اور الامام تھے، دوسری روایت یوں ہے کل صلوٰۃ لا یقرأ فیھا بام القرآن فھی خداج الا وراء الامام (کتاب القرأۃ ص۱۱) ہر وہ نماز جس میں سورۃ فاتحہ نہ پڑھی جائے وہ ناقص ہوگی مگر ہاں وہ نماز جو امام کے پیچھے پڑھی جائے اس کی سند بھی صحیح ہے اور اس زیادت کو عبد اللہ بن محمود سعدیؒ نقل کرتے ہیں جو ثقہ اور حافظ تھے جس کی پوری تفصیل پہلی جلد میں نقل کی جا چکی ہے۔ تیسری روایت یوں ہے کل صلوٰۃ لا یقرأ فیھا بفاتحۃ الکتاب فلا صلوٰۃ لہ الا وراء الامام (کتاب القرأۃ ص۳۷) ہر وہ نماز جس میں سورۃ فاتحہ نہ پڑھی جائے وہ ناقص ہوگی مگر امام کے پیچھے اس روایت میں اس زیادت کو علیؒ بن کیسانؒ نے بیان کیا ہے اور

یہ باقی روایتوں کی تائید میں پیش کی جارہی ہے، چوتھی روایت حضرت جابرؓ کے حوالہ سے ابھی نقل کی جاچکی ہے جس میں اِلَّا وراء الامام کی استثنا موجود ہے، یہ روایت کتاب القراۃ ص۱۱۱ اور دار قطنی جلد ۱ ص ۱۲۴ میں ہے دارقطنیؒ کہتے ہیں کہ یحییٰ بن سلامؒ ضعیف ہے اور بیہقیؒ کہتے ہیں کہ اس میں یحییٰ بن سلام کا وہم ہے یہ ٹھیک ہے کہ وہم اور خطا سے کوئی راوی نہیں بچ سکتا اگر یحییٰؒ بن سلامؒ کو بھی کبھی وہم اور خطا سے دوچار ہونا پڑا ہے تو اس میں تعجب کی بات کون سی ہے؟ لیکن ذرا اس راوی کا خلاج والے راویوں سے تقابل تو کر دیکھیں؟ ابن عدیؒ کا بیان ہے کہ ان کی حدیث لکھی جاسکتی ہے، ابن حبانؒ ان کو ثقات میں لکھتے ہیں ابوزرعہؒ اُن کی لا باس بہٖ لکھتے ہوئے توثیق کرتے ہیں، ابوحاتمؒ ان کو شیخ اور صدوق کہتے ہیں ابوالعربؒ کہتے ہیں کہ وہ مفسرؒ اور کان من الحفاظ ومن خیار خلق اللّٰہ (لسان المیزان جلد ۲ ص ۲۶۱) حفاظِ حدیث میں اور اللہ تعالیٰ کے چنے ہوئے بندوں میں تھے اگر فریق ثانی کے نزدیک محض اس وجہ سے کہ یہ اِلَّا ان یکون وراء الامام کی استثنا نقل کرتے ہیں ضعیف ہیں تو یہ نہایت ہی تعجب اور حیرت وافسوس کی بات ہے، بلکہ ہم فریق ثانی کے معاملہ فہم اور اصحاب علم اور طبقات رواۃ اور رجال پر عمیق اور گہری نگاہ رکھنے والے حضرات کو دعوتِ فکر دیتے ہیں کہ وہ جن جن راویوں نے اِلَّا وراء الامام یا اِلَّا خلف الامام وغیرہ کی زیادت نقل کی ہے، اُن کا اُن راویوں سے موازنہ اور تقابل کر دیکھیں جو اس استثنا کو شیر مادر سمجھ کر ہضم کر بیٹھے ہیں مگر افسوس ہے کہ پھر بھی ان کی حدیثیں قابل اعتبار ہیں اور یہ زیادت نقل کرنے والے باوجود ثقہ، حافظ اور ثبت ہونے کے قابل ملامت ہیں فوا اسفا۔

لفظ کُل کی تحقیق

بعض روایات میں (کُلّ صلوٰۃ الخ) لفظ کُل آیا ہے اور بہت سی روایات میں مقتدی کا یا خلف الامام کا ذکر نہیں ہے اور فریق ثانی کی طرف سے لفظ کُل کے عموم کو لے کر ان سے استدلال کرنے کی ناکام کوشش کی گئی ہے، بایں طور کہ گو ان روایتوں میں صراحت کے ساتھ مقتدی پر سورۃ فاتحہ کی قرأت نہیں سمجھی جاتی لیکن لفظ کُل عام ہے جس سے ہر نماز مراد ہوگی، مقتدی کی نماز ہو یا منفرد کی اگرچہ اصولی طور پر ہمارے ذمہ اس کی تحقیق ضروری نہیں ہے کیونکہ

سند کے لحاظ سے ایسی کوئی روایت صحیح نہیں ہے جس میں مقتدی پر سورۂ فاتحہ کا پڑھنا ضروری ہو حرف منؔ کی بحث آپ پڑھ چکے ہیں اور لفظ خداج وغیرہ کے ساتھ جو روایتیں مروی ہیں وہ کمزور اور ضعیف ہیں جیسا کہ آپ پڑھ چکے ہیں اور سند کے لحاظ سے خداج وغیرہ کی جو جو روایتیں زیادہ صحیح ہیں ان میں ثقات حفاظ اور ائمہ سے اِلّا ان یکون وراء الامام اور الا وراء الامام کی زیادت بھی مروی ہے جب اس زیادت اور استثناء کے بغیر خداج اور کل کے الفاظ سے پیش کی گئی کوئی روایت صحیح نہیں ہے تو اصولی طور پر معنوی اور درایتی کلام کرنے کی ضرورت بھی نہیں ہے مگر ہم صرف تکمیل کتاب اور افادۂ طلبہ کے لیے چند اقتباسات درج کرتے ہیں جن سے یہ بتلانا مقصود ہے کہ گو لفظ کل اپنے لغوی مفہوم کے لحاظ سے عام ہے لیکن استعمال میں کُل اور بعض کے لیے اور عموم و خصوص کے لیے برابر آتا رہتا ہے اور اگر وہ عموم و استغراق حقیقی کے لیے آتا ہے تو موقع اور محل اور داخلی و خارجی قرینہ کا محتاج ہوتا ہے اور اگر کہیں اضافی استغراق اور بعضیت کے لیے مستعمل ہوتا ہے تب بھی قرینہ سے مستغنی نہیں ہو سکتا چند اقتباسات ہدیہ کیے جاتے ہیں بغور ملاحظہ کریں،

۱۔ اللہ تعالیٰ حضرت ابراہیم علیہ السلام کو ایک خاص موقع پر ارشاد فرماتا ہے۔ ثُمَّ اجْعَلْ عَلٰى كُلِّ جَبَلٍ مِّنْهُنَّ جُزْءًا (پ ۳ - ۳) کہ ان کوفتہ چڑیوں کی ایک ایک جزو ہر پہاڑ پر رکھ دیں۔ ظاہر امر ہے کہ علیٰ کل جبل سے روئے زمین کے چھوٹے بڑے اور قریب و بعید کے سب پہاڑ مراد نہیں ہیں اور نہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کو ہمالیہ اور نانگا پربت وغیرہ کی چوٹیوں پہ کوفتہ چڑیوں کی بوٹیاں بلکہ قیمہ رکھنے کا مکلف ٹھہرایا گیا تھا اس موقع پر بھی کل جبل سے بعض مراد ہیں جو بالکل قریب ہوں گے۔

۲۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے کہ ہم نے کفر و شرک اور دیگر معاصی کا ارتکاب کرنے والی قوموں پر بطور تنبیہ بعض آفاقی اور انفسی تکلیفیں مسلط کیں تاکہ وہ اپنی حرکات سے باز آجائیں جب انہوں نے اثر پذیری کا ثبوت نہ دیا فَتَحْنَا عَلَيْهِمْ أَبْوَابَ كُلِّ شَيْءٍ (پ ۷، انعام - ۵) تو ہم نے ان پر ہر قسم کے دروازے کھول دیے قطعی بات ہے کہ بعض نعمتوں کے دروازے اُن پہ کھولے گئے ہوں گے نہ یہ کہ نبوت اور رسالت اور مقبولیت و رضا وغیرہ کے دروازے بھی ان پر کھول دیے گئے تھے۔

۳۔ اللہ تعالیٰ مکہ مکرمہ اور وادیٔ غیر ذی ذرع کی مقبولیت کا ذکر یوں ارشاد فرماتا ہے یُجْبٰۤى اِلَیْهِ ثَمَرٰتُ كُلِّ شَیْءٍ (پ۲۰ رکوع۹) ہر قسم کے میوے وہاں پہنچائے جاتے ہیں، آج کل کے اس دور ترقی میں بھی جب کہ مختلف طرق سے میوے خشک کر لیے جاتے ہیں اور سیر و سیاحت و نقل و حرکت کے اسباب فراوانی سے موجود ہیں، سال کے بارہ۱۲ مہینے مکہ مکرمہ میں جا کر دیکھ لیجیے کیا ہر قسم کے میوے وہاں پہنچتے ہیں، بلکہ بعض میووں کے نام تک سے اہل مکہ واقف نہ ہوں گے یہی کہا جائے گا کہ اس بے آب و گیاہ زمین میں، ان کی روزی کا یہ سامان کیا گیا کہ بعض میوے بعض اکناف سے پہنچائے جاتے ہیں۔

۴۔ حضرت ہود علیہ السلام کی مجرم قوم پہ اللہ تعالیٰ نے بادِ صر صر اور تیز و تند ہوا کے جھونکے بھیجے تُدَمِّرُ كُلَّ شَیْءٍ (پ۲۶، احقاف ۳) جو ہر چیز کو ہلاک کر گئے، اور یہ بالکل عیاں ہے کہ زمین و آسمان وغیرہ کے علاوہ حضرت ہود علیہ السلام اور ان کے مومن ساتھی بھی تباہ نہ ہوئے تھے۔

۵۔ تورات کے بارے میں اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:۔ تَفْصِیْلًا لِّكُلِّ شَیْءٍ (پ۹، اعراف ۱۷) کہ اس میں ہر چیز کی تفصیل موجود ہے، یہ بات آشکارا ہے کہ نہ تو واقعۃً تورات میں ہر چیز کی تفصیل موجود تھی کہ زمین کا ایک ایک ذرہ اس میں درج ہوتا اور نہ تو علوم و معارف کے لحاظ سے وہ سب احکام اس میں درج تھے جو قرآن کریم میں موجود ہیں ورنہ قرآن کریم کی تورات پہ فوقیت اور مزیت کیا ہوگی۔

۶۔ اسی طرح اللہ تعالیٰ کا قرآن کریم کے بارے میں ارشاد ہوتا ہے۔ تَفْصِیْلًا لِّكُلِّ شَیْءٍ اور تِبْیَانًا لِّكُلِّ شَیْءٍ کہ قرآن کریم ہر چیز کی تفصیل اور ہر چیز کا واضح بیان ہے یہ بالکل ٹھیک ہے کہ قرآن کریم میں عقائد و اعمال اخلاق و معاملات وغیرہ کے اصول اور قوانین وضاحت اور صراحت کے ساتھ درج ہیں لیکن نماز کی جملہ رکعات، زکوٰۃ کا نصاب، حج، طواف اور سعی وغیرہ وغیرہ کی تفصیل اور بیان قرآن میں نہیں ہے بلکہ یہ قرآن کی شرح اور اس کی تفسیر حدیث شریف میں درج ہے اور صحیح حدیث بھی ویسے ہی منزل من اللہ ہے جیسے قرآن کریم۔

۷۔ حضرت سلیمان علیہ السلام اللہ تعالیٰ کے انعامات کو پیش نظر رکھ کر تحدیث بالنعمۃ کے طور پہ فرماتے ہیں وَاُوْتِیْنَا مِنْ كُلِّ شَیْءٍ (پ۱۹، نمل ۲) اور ہمیں ہر چیز دی گئی ہے۔ یہ

صحیح ہے کہ نبوّت و رسالت، خلافت و سلطنت اور دیگر جو ساز و سامان ان کی شان کے لائق تھا وہ ان کو عطا کیا گیا تھا لیکن بے شمار اشیاء کے علاوہ نہ تو ان کو قرآن کریم عطا ہوا تھا اور نہ جناب رسولِ خدا صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کی جلالت شان اور ختم نبوّت اور نہ آپ کے حضرات صحابہ کرامؓ ان کو عطا ہوئے تھے؟

۸۔ ذوالقرنین کے بارے میں اللہ تعالیٰ ارشاد فرماتا ہے۔ اٰتَیْنٰهُ مِنْ کُلِّ شَیْءٍ سَبَبًا (پ ۱۶، کہف) ہم نے اس کو ہر قسم کا سامان دیا تھا۔ یہ دلشگاف بات ہے کہ وہی سامان ان کو ملا ہوگا جو ان کے حال اور شان کے مناسب ہوگا۔ نہ یہ کہ آج کل زمانہ سائنس کے آلات و اسلحہ اور ہلاکت خیز اٹیم بم اور ہائیڈروجن بم وغیرہ بھی ان کو ملے تھے۔

۹۔ ملکہ سبا (بلقیس) کے بارے میں ارشاد ہوا ہے وَاُوْتِیَتْ مِنْ کُلِّ شَیْءٍ (پ ۱۹ سورۃ نمل، ۲) کہ ہر چیز اس کو عطا کر دی گئی تھی۔ اس کو بہت کچھ ملا ہوگا، مگر نبوّت و رسالت اور ملکِ سلیمان علیہ السلام تو ہرگز نہیں ملا تھا۔ بلکہ علامہ ذہبیؒ تو لکھتے ہیں کہ کیا بلقیس کو مخصوص مردانہ عضو اور ڈاڑھی بھی مل گئی تھی؟ (تذکرہ جلد ۲ صفحہ ۲۵۴) قرآن کریم کے ان اقتباسات سے یہ امر واضح ہو جاتا ہے کہ لفظ کُلّ ہمیشہ اور ہر مقام پر کُلّ ہی کے معنی میں نہیں آتا بلکہ عموم اضافی اور بعض کے لیے بھی آتا ہے ممکن ہے کسی کوتاہ فہم کو یہ وہم پیدا ہو جائے کہ آخر میں پیش کردہ مقامات میں لفظ کُلّ پہ حرفِ مِنْ داخل ہے جو بعض کے لیے آتا ہے لہذا البعضیت تو حرفِ مِنْ سے ثابت ہوتی نہ کہ لفظ کل سے، سو اس کا جواب یہ ہے کہ جو لوگ لفظ کل کو ہمیشہ اور ہر مقام میں عموم کے لیے نص قطعی سمجھتے ہیں ان کو حرف مِنْ کا بہانہ بھی مفید نہیں ہوگا کیونکہ اس صورت میں مِنْ کُلِّ شَیْءٍ کا معنی یہ ہوگا کہ ہر چیز سے کچھ اور بعض ان کو عطا ہوا ہو۔ کیا یہ صحیح ہوگا کہ دنیا میں جتنے بھی مرد گذرے ہیں یا موجود ہیں ہر ایک کی ڈاڑھی اور ہر ایک کی مونچھوں سے بلقیس کو کچھ حصہ عطا ہوا تھا؟ اور کیا یہ صحیح ہوگا کہ حضرت سلیمان علیہ السلام کو سورۃ فاتحہ میں سے اور سورۃ بقرہ میں سے وعلیٰ ہٰذا القیاس قرآن کریم کی جملہ سورتوں میں سے کچھ کچھ ملا تھا؟ کون اس جھمیلے میں پڑے، بہت سی چیزیں گننے کی بھی نہیں ہیں سمجھدار خود سمجھ سکتے ہیں کہ ہر چیز سے کچھ اور بعض ملنے کا مفہوم کہاں تک صحیح ہے اور اس سے کیا کچھ مراد نہیں لی جا سکتی؟ اب آپ دو تین حدیثیں بھی ملاحظہ کر لیں۔

۱- اس مضمون کی ایک روایت آتی ہے کہ ایک مرتبہ ایسی سخت اور زیادہ بارش ہوئی کہ حَصَّت كُلَّ شَيْءٍ (بخاری جلد ۱ ص۱۳۷ وغیرہ) اُس نے ہر چیز کو بیخ و بن سے اکھاڑ دیا کافی نقصان ہوا ہوگا لیکن آنحضرت صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلّم کی ذات گرامی اور حضرات صحابہ کرامؓ و دیگر انسان اور جاندار بلکہ مدینہ طیبہ کے مکانات اور مسجد نبوی وغیرہ اس تباہی اور بربادی سے یقیناً محفوظ رہے تھے۔

۲- حضرت ابو سعید الخدریؓ کا بیان ہے کہ ایک موقع پر ہم ایک قوم کے مہمان بنے مگر اُن لوگوں نے ہماری ضیافت وغیرہ کی مطلقاً پرواہ نہ کی، خدا تعالیٰ کی قدرت کہ ان میں سے ایک بڑے سردار کو کوئی زہریلی چیز ڈس گئی، انھوں نے اس پر جھاڑ پھونک کی ہر ممکن کوشش کی لیکن کوئی فائدہ نہ ہوا۔ فَسَعَوا لَهُ بِكُلِّ شَيْءٍ (بخاری ج۲ ص۳۰۴) وہ مجبور ہو کر ہمارے پاس آئے کہ تم میں کوئی جھاڑ پھونک (دم) کرنے والا ہے ہم نے کہا ہے چنانچہ اُن سے کچھ بکریاں لیکر (جو تیس ۳۰ تھیں بخاری ج۲ ص۷۴۹) بات طے ہوئی اس پر سورۃ فاتحہ پڑھ کر پھونکی گئی تو باذن اللہ تعالیٰ وہ بالکل تندرست ہو گیا (الخ ملخصاً) ان صحابہ کرامؓ کو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک سَریّہ (چھاپہ مار دستہ) کی صورت میں ایک فوجی مہم پر بھیجا تھا جس میں تیس ۳۰ سوار تھے (دارقطنی ج۲ ص۳۱۵) اُن لوگوں نے اپنے سردار کو بچانے کے لیے ہر امکانی کوشش کی ہوگی، لیکن سورۃ فاتحہ نہ اُن کے پاس تھی اور نہ انھوں نے پڑھی کیونکہ بظاہر وہ کافر و مشرک تھے اور کل شیءٍ کا ایک فرد سورۃ فاتحہ بھی ہے۔

۳- ایک حدیث اس مضمون کی آتی ہے کہ آنحضرت صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے کان یصومہ، کلہ (ترمذی جلد ۱ ص۹۲ وغیرہ) یعنی سارے ماہ شعبان کے روزے رکھتے تھے، امام ترمذیؒ نقل کرتے ہیں کہ دوسری احادیث کے پیش نظر حضرت امام عبد اللہؒ ابن مبارکؒ نے اس حدیث کا یہ مطلب بیان کیا ہے کہ لفظ کُل سے مراد یہاں اکثر ہے یعنی آپ نے سارے ماہ شعبان کے روزے نہیں رکھے بلکہ اکثر ماہ کے روزے رکھے ہیں۔ اس قسم کی حدیثیں اگر نقل کی جائیں تو یقیناً آپ اکتا جائیں گے ہم انہیں پر اکتفاء کرتے ہیں، امام سرخسیؒ لکھتے ہیں۔

وکلمة کل وھی تحتمل الخصوص نحو کلمة من اھ (اصول سرخسی جلد ۱ ص۱۵۷)

کہ کُل کا لفظ حرف مَنْ کی طرح خصوص کا احتمال رکھتا ہے علامہ محمد طاہرؒ اور علامہ زبیدیؒ لکھتے ہیں کہ۔

قد یستعمل کل الموضوع للاحاطة بمعنی البعض (مجمع البحار جلد ۳ ص۲۴۷ وتاج العروس جلد ۸ ص۱۰۰)

لفظ کل جو احاطہ اور شمول کے لیے موضوع ہے کبھی کبھی بعض کے لیے بھی استعمال کیا جاتا ہے

اور مشہور لغوی علامہ فیروز آبادیؒ لکھتے ہیں کہ :-

وقد جاء بمعنی بعض ضد ۔ (القاموس جلد۴ ص۲۵) — لفظ کل کبھی بعض کے معنیٰ میں آتا ہے جو اضداد میں سے ہے ۔

اور علامہ زبیدیؒ تحریر فرماتے ہیں کہ

وقد جاء استعماله بمعنی بعض ۔ (تاج العروس جلد ۸ ص۱۰۱) — کل کا استعمال کبھی بعض پر بھی ہوتا ہے اور یہ اضداد میں سے ہے ۔

اس سے صاف طور پر معلوم ہوا کہ لفظ کُل اگرچہ وضع تو احاطہ اور شمول کے لیے ہے مگر اس کا استعمال کُل اور بعض دونوں صورتوں پر ہوتا رہتا ہے اور مشہور مفسر علامہ خازنؒ لکھتے ہیں کہ لفظة کُل لا تقتضی الشمول والاحاطة — لفظ کُل شمول اور احاطہ کو نہیں چاہتا ۔

(تفسیر خازن جلد ۱ ص۲۸۶)

اور مُلّا جیونؒ لکھتے ہیں کہ

وکمة کل یحتمل الخصوص (نور الانوار ص۸) — کہ کلمہ کُل خصوص کا احتمال رکھتا ہے ۔

اور فریقِ ثانی کو بھی اس کا اقرار ہے کہ لفظ کُل اکثر کے معنیٰ میں مستعمل ہوتا ہے ومثلہ قول القائل :

ان الشواخلیرۃ طری ۔ کل ذالک یفعل الوصی

(پرچہ اہلحدیث یکم ذوقعدہ سن ۱۳۴۷ھ)

اور مبارکپوری صاحبؒ لکھتے ہیں ۔ والمراد بالکل اکثر وھو مجاز قلیل الاستعمال (تحفة الاحوذی جلد ۲ ص۵۱) کہ لفظ کُل سے مُراد (یہاں) اکثر ہے اور لفظ کل کا اکثر کے معنیٰ میں استعمال مجازی ہے اور کم استعمال ہوتا ہے اتنی بات تو مبارکپوری صاحب کو بھی مسلّم ہے کہ لفظ کل سے کسی موقع اور محل پہ مجازاً اکثر کا معنیٰ بھی مراد لی جاسکتی ہے اور عموم کے معنیٰ میں یہ نص قطعی نہیں ہے لیکن اس کا اقرار کرتے ہوئے بھی ساتھ قلیل الاستعمال کا پیوند جوڑتے ہیں ۔ ہم نے چند مواقع قرآن کریم اور حدیث شریف سے صرف بطور نمونہ عرض کئے ہیں ۔ اور اگر اس کے باوجود بھی یہ قلیل الاستعمال اور شاذ ہے تو شاید مبارکپوری صاحبؒ اور ان کے اتباع کا قلیل الاستعمال اور کثیر الاستعمال الفاظ کے لیے قاعدہ اور اصطلاح ہی جدا ہوگی ۔

ع رکھ دیا ہے نام اس کا آسماں تحریر میں

مؤلف خیر الکلام لکھتے ہیں کہ ان مثالوں میں یہ لفظ مجازی طور پر بعض کے لیے مستعمل ہے زیر کراس کے اصلی اور حقیقی معنی ہی بدوں قرینہ یہ ہیں (محصلہ ص۲۰۳)

الجواب :۔ ہم نے بھی تو یہی کہا ہے کہ لفظ کل اصل میں شمول اور احاطہ کے لیے ہے مگر استعمال کے لحاظ سے عموم و خصوص دونوں کا احتمال رکھتا ہے اور خصوص کی مثالیں یہ ہیں اس لیے کل کل یہاں خصوص کے لیے ہے جہاں یہ صفت ہو جیسے کلھم جو الملائکۃ کی صفت ہے تو وہاں عموم کے لیے ہے وہاں تخصیص کا احتمال بند ہے لہذا نور الانوار کا حوالہ مؤلف مذکور کو مفید نہیں ہے اور زیر بحث حدیث میں لفظ کل صفت نہیں ہے اس لیے خصوص کے لیے ہے۔

تیسری روایت :۔ جلد اوّل بحث سکتات امام میں فریق ثانی کی بعض روایات پر کلام ہو چکا ہے اور بحث خداج میں متعدد حدیثیں نقل کر کے ان پر مبسوط جرح عرض کی جا چکی ہے گو کہنے کو اس روایت کا درجہ تیسرا ہے مگر حقیقت میں اس کا نمبر پندرہ ، سولہ سے کم نہ ہو گا ہم نے محض سہولت کی بناء پر نمبر شماری کا یہ سلسلہ اختیار کیا ہے۔ محمدؒ بن اسحاقؒ مکحولؒ سے روایت کرتے ہیں اور وہ محمودؒ بن ربیع سے اور وہ حضرت عبادہؓ بن الصامتؓ سے وہ فرماتے ہیں۔

کنا خلف رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلّم فی صلوٰۃ الفجر فقرأ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم فثقلت علیہ القراۃ فلما فرغ قال لعلکم تقرؤن خلف امامکم قلنا نعم ھذًّا یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم قال لا تفعلوا الا بفاتحۃ الکتاب فانہ لا صلوٰۃ لمن لم یقرأ بھا۔

(ابو داؤد جلد ۱ ص۱۱۹)

کہ صبح کے وقت ہم آنحضرت صلی اللہ تعالیٰ علیہ و سلم کے پیچھے نماز پڑھ رہے تھے اور آپ قرأت کر رہے تھے آپ پر قرأت ثقیل ہو گئی، جب آپ فارغ ہوئے تو فرمایا شاید تم امام کے پیچھے قرأت کرتے ہو؟ ہم نے عرض کیا یا رسول اللہ ہم جلدی جلدی پڑھتے ہیں۔ آپ نے فرمایا کہ صرف سورۃ فاتحہ پڑھا کرو کیونکہ اس کے بغیر نماز نہیں ہوتی اور کچھ بھی نہ پڑھو۔

یہ روایت اسی پیش کردہ سند کے ساتھ ترمذی جلد ۱ ص۴۱ ، دار قطنی ص۱۲۰ ، مستدرک جلد ۱ ص۲۳۸ جزء القراۃ ص۱۴ کتاب القراۃ ص۳۶ معجم صغیر ص۱۳۳ للطبرانی اور سنن الکبریٰ

جلد ۲ صـ ۱۶۴ وغیرہ میں موجود ہے اور نسائی جلد ۱ صـ ۱۰۶ کی سند یوں ہے عن نافعؒ بن محمودؓ بن ربیعہ عن عبادۃؓ بن الصامت الخ اور ابوداؤد جلد ۱ صـ ۱۱۹ کی ایک سند یوں ہے عن مکحولؒ عن نافعؒ بن محمودؓ بن ربیع الخ اور دارقطنی جلد ۱ صـ ۱۲۱ وسنن الکبریٰ جلد ۲ صـ ۱۶۴ و صـ ۱۶۵/۲ میں بھی یوں ہی سند موجود ہے، اس حدیث کی سند کے مرکزی رواۃ یہی ہیں جن کا ذکر ہوا ہے کسی سند میں سب اکٹھے آجاتے ہیں اور کسی میں ان کی اکثریت اور کسی سند میں ان میں سے کوئی نہ کوئی آجاتا ہے۔

جواب:۔ فریق ثانی کا اس روایت سے استدلال کرنا صحیح نہیں ہے اور چونکہ یہ روایت ان کے دعوے کے لیے صریح دلیل ہے کیونکہ اس میں خلف الامام اور سورۂ فاتحہ کی خاص قید موجود ہے اور شاید اسی صریح روایت کے سہارے پر انہوں نے تمام دنیا کے احناف کو کھلا چیلنج کیا ہے اور غالباً ان کا یہ دعوے کہ جو شخص امام کے پیچھے ہر رکعت میں سورۃ فاتحہ نہ پڑھے اس کی نماز ناقص ہے کالعدم ہے، بیکار ہے اور باطل ہے (بلفظہ) اس حدیث اور اس مضمون کی دوسری حدیثوں پر مبنی ہے اس لیے ہمیں اس پر قدرے تفصیل سے کلام کرنے کی اجازت دے دیجئے تاکہ دودھ کا دودھ اور پانی کا پانی سامنے آجائے ہم نے جو باتیں اس حدیث کے سلسلہ میں عرض کرنی ہیں وہ یہ ہوں گی۔

۱۔ محمدؒ بن اسحاقؒ پر کلام۔ (۲) مکحولؒ کا معیاری ثقہ نہ ہونا اور نیز اس کا مدلس ہونا اور یہ کہ نہ تو ان سے کسی صحیح سند سے تحدیث ثابت ہے اور نہ کوئی ثقہ متابع موجود ہے جس کی سند بھی صحیح ہو (۳) نافعؒ بن محمودؒ مجہول ہے (۴) روایت میں اضطراب موجود ہے (۵) یہ روایت موقوف ہے مرفوع نہیں ہے (۶) اِلَّا بِاُمِّ الْقُرآن کی استثناء ضعیف ہے (۷) لفظ خلف الامام مدرج ہے (۸) بنا بر صحت خلف الامام کا معنی کیا ہے؟ آسانی اور سہولت کے لیے ہم ان آٹھ شقوں کو جواب تصور کرتے ہیں۔ لہٰذا آٹھ جواب آپ ملاحظہ فرمالیں۔

پہلا جواب:۔ محمدؒ بن اسحاقؒ کو گو تاریخ اور مغازی کا امام سمجھا جاتا ہے لیکن محدثینؒ اور ارباب جرح و تعدیل کا تقریباً پچانوے فیصدی گروہ اس بات پر متفق ہے کہ روایت حدیث میں اور خاص طور پر سنن اور احکام میں ان کی روایت کسی طرح بھی حجت نہیں ہوسکتی اور اس لحاظ سے ان کی روایت کا وجود اور عدم بالکل برابر ہے، تصریحات ملاحظہ کریں۔

امام نسائیؒ فرماتے ہیں کہ وہ قوی نہیں ہے (ضعفاء صغیر ص۵۲) ابو حاتمؒ کہتے ہیں کہ وہ ضعیف ہے (کتاب العلل جلد ا ص۴۳۳) ابن تیمیہؒ یہ کہتے کے بعد بھی کہ جب وہ معروف راویوں سے روایت کرے تو حسن الحدیث اور صدوق ہے یہ بھی تصریح فرماتے ہیں اور کہتے ہیں کہ وہ مجہول رواۃ سے باطل روایات نقل کرتا ہے (بغدادی جلد ا ص۲۲۷) دار قطنیؒ کہتے ہیں کہ اس سے احتجاج صحیح نہیں ہے۔ (ایضاً جلد ا ص۲۳۲) سلیمان تیمیؒ کہتے ہیں کہ وہ کذاب ہے، ہشامؒ بن عروہؒ کہتے ہیں کہ وہ کذاب ہے، امام جرح و تعدیل یحیٰی قطانؒ کہتے ہیں کہ میں اس بات کی گواہی دیتا ہوں کہ وہ کذاب ہے (میزان جلد ۳ ص۲۱) وہیبؒ بن خالدؒ اس کو کاذب اور جھوٹا کہتے ہیں (تہذیب التہذیب جلد ۹ ص۴۵) امام مالکؒ فرماتے ہیں کہ وہ دجالوں میں ایک دجال تھا (میزان جلد ۳ ص۲۱ و تہذیب التہذیب جلد ۹ ص۴۲) نیز امام امام مالکؒ نے اس کو کذاب کہا ہے (بغدادی جلد ا ص۲۳۲) جریرؒ بن عبد الحمیدؒ کا بیان ہے کہ میرا یہ خیال نہ تھا کہ میں اس زمانہ تک زندہ رہوں گا جس میں لوگ محمد بن اسحاقؒ سے احادیث کی سماعت کریں گے (تہذیب التہذیب جلد ۲ ص۳۰) ابو زرعہؒ کا بیان ہے کہ بھلا ابن اسحاقؒ کے بارے میں بھی کوئی صحیح نظریہ قائم کیا جا سکتا ہے؟ وہ تو محض ہیچ تھا (توجیہ النظر ص۲۸) امام بیہقیؒ فرماتے ہیں کہ محدثین اور

لہ تقریب النواوی میں ہے واذا قالوا متروک الحدیث او واھیہ او کذاب فھو ساقط لا یکتب حدیثہ (ص۲۳۳) کہ جب محدثین کسی راوی کے بارے میں متروک الحدیث یا واھی الحدیث یا کذاب کہتے ہیں تو وہ ساقط الاعتبار ہوتا ہے اس کی روایت لکھی بھی نہیں جا سکتی اور اس کی شرح تدریب الراوی میں لکھا ہے کہ ولا یعتبر بہ ولا یستشھد (ص۲۳۳) ایسے راوی کی حدیث کو اعتبار و متابعت اور شاہد کے لیے بھی پیش نہیں کیا جا سکتا لیکن افسوس ہے کہ فریق مخالف نہ صرف یہ کہ اس سے استدلال کرتا ہے بلکہ اس کے بل بوتے پہ مسلمانوں کی اکثریت کی نماز کو باطل، بیکار اور کالعدم قرار دینے کا ادھار کھائے بیٹھا ہے۔ ترجمان الحدیث ماہ ستمبر ۱۹۷۲ء از ص۲۶ تا ص۲۳ وغیرہ میں محمد بن اسحاقؒ کی توثیق پر ادھر ادھر کے چند حوالے نقل کر کے خاصا زور صرف کیا ہے لیکن ائمہ جرح و تعدیل کی اس کڑی جرح کا کہ محمد بن اسحاقؒ کذاب ہے کوئی جواب نہیں دے سکے اور نہ اس کا جواب دے سکتے ہیں گو احکام و سنن میں ان کی روایت حجت نہیں ہے باقی جن حضرات نے ان کو صدوق اور حسن الحدیث وغیرہ کہا ہے تو وہ تاریخ اور مغازی وغیرہ سے متعلق ہے نہ کہ بنیادی احکام اور سنن وغیرہا سے۔

حفاظ حدیث ابن اسحاقؒ کے تفردات سے گریز کرتے ہیں (سنن الکبریٰ بحوالہ الجوہر النقی جلد ۱ صفحہ ۱۵۵) علامہ ماردینیؒ لکھتے ہیں کہ ابن اسحاقؒ میں محدثینؒ کے نزدیک مشہور کلام ہے (الجوہر النقی صفحہ ۱۵۵ ج ۱) عبداللہؒ فرماتے ہیں کہ میرے والد امام احمدؒ بن حنبلؒ لم یکن یحتج بہ فی السنن (بغدادی جلد ۱ ص ۲۳۰ و تہذیب التہذیب جلد ۹ ص ۴۳) سنن اور احکام میں وہ ان سے احتجاج نہیں کرتے تھے حنبلؒ بن اسحاقؒ کا بیان ہے کہ امام احمدؒ بن حنبلؒ نے فرمایا ابن اسحاق لیس بحجۃ (بغدادی جلد ۱ ص ۲۳۰ و تہذیب التہذیب جلد ۹ ص ۴۳) ابن اسحاقؒ حجت نہیں ہے، ایوبؒ بن اسحاقؒ کا بیان ہے کہ میں نے امام احمدؒ سے دریافت کیا ابن اسحاقؒ جب کسی حدیث کے بیان کرنے میں متفرد ہو تو اس کی حدیث حجت ہوگی؟ قال لا واللہ (بغدادی جلد ۱ ص ۲۳۰) فرمایا بخدا ہرگز نہیں، ابن ابی خیثمہؒ کا بیان ہے کہ ابن معینؒ نے اس کو لیس بذاک، ضعیف اور لیس بالقوی کہا میمونیؒ کا بیان ہے کہ ابن معینؒ نے اس کو ضعیف کہا ہے (بغدادی جلد ۱ ص ۲۳۰ و تہذیب التہذیب جلد ۹ ص ۴۴) علیؒ بن المدینیؒ کا بیان ہے لم یضعفہ عندی الا روایتہ عن اھل الکتاب (تہذیب جلد ۹ ص ۴۵) میرے نزدیک ابن اسحاقؒ کو صرف اس بات نے ضعیف کر دیا ہے کہ وہ یہود اور نصاریٰ سے روایتیں لے کر بیان کرتا ہے۔ مشہور اور قدیم مؤرخ علامہ ابو الفرج محمدؒ بن اسحاقؒ بن ندیمؒ (المتوفی ۳۸۵ھ) اپنی کتاب الفہرست میں محمد بن اسحاقؒ کے بارے میں لکھتے ہیں کہ:۔

مطعون علیہ غیر مرضی الطریقۃ الی ان قال وکان یحمل عن الیھود والنصاریٰ ویسمیھم فی کتبہ اھل العلم الاول و اصحاب الحدیث یضعفونہ ویتھمونہ اھ (الفہرست لابن الندیم ص ۱۴۲ طبع مصر)

اس پر طعن کیا گیا ہے اور اس کا طریقہ ناپسندیدہ تھا (پھر آگے فرمایا۔ کیونکہ) وہ یہود اور نصاریٰ سے روایات لیتا تھا اور اپنی کتابوں میں ان کو پہلے علم والے کہا کرتا تھا اور اہل حدیث اس کو ضعیف کہتے ہیں اور اس کو متہم قرار دیتے ہیں۔

امام ترمذیؒ لکھتے ہیں کہ بعض محدثینؒ نے ان کے حافظہ کی خرابی کی وجہ سے اس میں کلام کیا ہے (کتاب العلل جلد ۲ ص ۲۳۷) امام نوویؒ لکھتے ہیں کہ جو راوی صحیح کی شرطوں کے مطابق نہیں ہیں۔ ان میں ایک محمدؒ بن اسحاقؒ بھی ہے (مقدمہ نووی ص ۱۶) علامہ ذہبیؒ لکھتے ہیں کہ ابن اسحاقؒ

کی روایت درجۂ صحت سے گری ہوئی ہے اور حلال وحرام میں اس سے احتجاج درست نہیں ہے (تذکرہ جلد۱ ص۱۷۳) حافظ ابن حجرؒ لکھتے ہیں ابن اسحاقؒ احکام کی روایات میں حجت نہیں ہے۔ خصوصاً جب کہ منفرد ہو اور جب کوئی ثقہ راوی اس کے خلاف روایت کرتا ہو تو ابن اسحاقؒ کی روایت قابل توجہ ہی نہیں ہوسکتی (درایہ ص۱۹۳) حافظ ابن القیمؒ لکھتے ہیں کہ امام احمدؒ نے ابن اسحاق کی روایت کو منکر کہا ہے اور اس کو ضعیف بتایا ہے (زاد المعاد جلد۱ ص۱۴۳) علامہ منذریؒ اور حافظ سخاویؒ لکھتے ہیں کہ امام احمدؒ نے فرمایا مغازی میں ابن اسحاقؒ کی روایات تو لکھی جاسکتی ہیں لیکن جب حلال وحرام کا مسئلہ ہو تو اس میں ایسے ایسے راوی (یعنی ثقہ اور ثبت) درکار ہیں (الترغیب والترہیب جلد۴ ص۲۹ وفتح المغیث ص۱۲۰) قاضی شوکانیؒ لکھتے ہیں کہ ابن اسحاقؒ لیس بحجۃ لاسیما اذا عنعن (نیل الاوطار جلد۱ ص۲۳۴) ابن اسحاقؒ کی روایت حجت نہیں ہے خصوصاً جب کہ وہ عنعنہ سے روایت کرتا ہو نواب صدیق حسن خان صاحبؒ ایک حدیث کی تحقیق میں لکھتے ہیں کہ در سندش نیز ہماں محمد اسحاقؒ است ومحمد بن اسحاق حجت نیست (دلیل الطالب ص۲۳۹) حضرت مولانا شیخ الہند محمودؒ الحسن صاحبؒ (المتوفی ۱۳۳۹ھ) نے (ایضاح الادلۃ ص۴۵) میں ابن اسحاقؒ پر سیر حاصل کلام کیا ہے اور ان تمام رکیک اور ضعیف تاویلوں کے دندان شکن جوابات دیے ہیں جو اس کو ثقہ قرار دینے کے لیے اختیار کی گئی ہیں طلبہ ضرور اس کا مطالعہ کریں۔ آپ ملاحظہ کرچکے ہیں کہ شاید ہی جرح کا کوئی ادنیٰ سے اعلیٰ تک ایسا لفظ ملے گا جو جمہور محدثینؒ اور ارباب جرح وتعدیل نے محمد بن اسحاقؒ کے بارے میں نہ کہا ہو معهذا محمدؒ بن اسحاقؒ فریق ثانی کے نزدیک ثقہ ہے اور حضرت امام ابوحنیفہؒ اور ان کے تلامذہ ضعیف ہیں (ربدہ الاہلۃ ص۲۳۵) فوا اسفا۔ حافظ ابن حجرؒ نے نہایت ضعیف اور رکیک تاویلیں کرنے کی بے جا سعی کی ہے تاکہ ابن اسحاقؒ کو قابل اعتبار بنانے کی کوشش کامیاب ہو سکے مثلاً یہ کہ سلیمان تیمیؒ ائمہ جرح وتعدیل میں نہ تھے اور امام مالکؒ نے اپنے الفاظ سے رجوع کر لیا تھا وغیرہ وغیرہ مگر یہ سب کوشش بیکار اور کالعدم ہے۔ اگر بالفرض سلیمان تیمیؒ ائمہ جرح وتعدیل میں نہ تھے تو کیا ہشامؒ بن عروہ، امام الجرح والتعدیل یحییٰ بن القطانؒ، وہیبؒ بن خالدؒ، امام احمدؒ بن حنبلؒ، یحییٰؒ بن معینؒ علیؒ بن المدینیؒ جریرؒ بن عبد الحمیدؒ، امام نسائیؒ، خطیبؒ، ابن نمیرؒ، دارقطنیؒ ابوزرعہؒ اور علامہ ذہبیؒ وغیرہ بھی ائمہ جرح وتعدیل میں نہیں ہیں؟ اور کیا ان سب نے ان

جرحی الزامات سے رجوع کر لیا ہے؟ باقی امام مالکؒ کا رجوع کرنا بھی محض دعویٰ ہی دعویٰ ہے خطیبؒ لکھتے ہیں اما کلام مالکؒ فی ابن اسحاقؒ فمشهور غیر خاف علی احد من اهل العلم بالحدیث (بغدادی جلد ۱ ص ۲۲۴) امام مالکؒ نے ابن اسحاق میں کلام کیا ہے وہ کسی بھی ایسے شخص سے مخفی نہیں ہے جس کو فن حدیث کا علم حاصل ہے۔ امام ابن الجوزی الحنبلیؒ (المتوفی ۵۹۷ھ) اپنی کتاب الموضوعات میں لکھتے ہیں کہ۔

اما محمد بن اسحاق فمجروح شهد بكذبه مالك وسليمان التيمي ووهيب بن خالد وهشام بن عروة ويحيى بن سعيد وقال ابن المديني يحدث عن المجهولين باحاديث باطلة (نصب الرایہ جلد ۲ ص ۱۵)

بہر حال محمدؒ بن اسحاقؒ مجروح ہے اس کے جھوٹا ہونے کی امام مالکؒ سلیمان تیمیؒ، وہیبؒ بن خالدؒ ہشامؒ بن عروہؒ اور یحییٰؒ بن سعید القطانؒ نے گواہی دی ہے، اور امام ابن المدینیؒ فرماتے ہیں کہ وہ مجہول راویوں سے باطل حدیثیں بیان کرتا ہے۔

اس سے ثابت ہوا کہ اس شدید قسم کی مفسر جرح سے رجوع کا ثبوت امام ابن جوزیؒ کے علم میں نہیں ہے اور امام بیہقیؒ لکھتے ہیں کہ:۔

وكان مالك بن انسؒ لا يرضاه ويحيى بن سعيد القطان لا يروي عنه ويحيى بن معين يقول ليس هو بحجة واحمد بن حنبل يقول يكتب عنه هذه الاحاديث اعني المغازي فاذا جاء الحلال والحرام اردنا قوما هكذا يريد اقوى منه فاذا كان لا يحتج به في الحلال والحرام فاولى ان لا يحتج به في صفات الله سبحانه وتعالى وانما نقموا عليه في روايته عن اهل الكتاب ثم عن ضعفاء الناس وتدليس اسامیهم فاذا روى عن ثقة وبين

امام مالکؒ اس کو (برائے روایت) پسند نہیں کرتے تھے اور یحییٰؒ بن سعید القطانؒ اس سے روایت نہیں لیتے تھے اور ابن معینؒ فرماتے ہیں کہ وہ حجت نہیں اور امام احمدؒ فرماتے ہیں کہ اس سے مغازی کی حدیثیں تو لکھی جا سکتی ہیں لیکن حلال وحرام کی روایتوں میں ہم قوی راویوں کو تلاش کریں گے پس جب حلال وحرام میں ابن اسحاقؒ کی روایت حجت نہیں تو صفات اللہ تعالیٰ میں بطریق اولیٰ اس کی روایت حجت نہیں ہو سکتی اور محدثینؒ نے اس پر جو عیب لگایا ہے وہ یہ ہے کہ وہ اہل کتاب سے روایت کرتا ہے اور ضعیف قسم کے لوگوں سے بھی روایت

سماعه منه فجماعة من الائمة لم يروا به بأسا اه

(کتاب الاسماء والصفات ص۲۹)

کرتا ہے اور ان کے ناموں میں تدلیس سے کام لیتا ہے پس جب وہ ثقہ سے روایت کرے اور سماع کی تصریح بھی کرے تو ائمہؒ کی ایک جماعت اس میں مضائقہ نہیں سمجھتی۔

اس سے معلوم ہوا کہ امام احمدؒ نے ابن اسحاقؒ کو جو حسن الحدیث کہا ہے تو مغازی وغیرہ کی حدیثوں سے متعلق کہا ہے نہ کہ احکام اور حلال وحرام کی حدیثوں کے بارے میں اور علامہ ذہبیؒ نے سفیانؒ بن حسینؒ کے ترجمہ میں نقل کیا ہے کہ لا یحتج به کمحمد بن اسحاقؒ یعنی محمد بن اسحاق کی طرح اس سے بھی احتجاج درست نہیں ہے اور کتاب العلو میں اس کو صاحب مناکیر وغرائب بتایا ہے ائمہ جرح وتعدیل نے ان میں جو کلام کیا ہے وہ فن روایت کے رُو سے ہے اور محض دیانۃً ہے اس کو حالت غصہ پر حمل کرنا جیسا کہ مؤلف خیر الکلام نے ص۱۹۵ میں کیا ہے صرف زعم کہانی ہے اور ص۱۹۹ و ص۲۰۰ میں بحوالہ تحفۃ الاحوذی جلد ا ص۲۵۳ وغیرہ رجوع کے لیے جو قصہ نقل کیا ہے اس سے ان کا صراحۃً رجوع ہرگز ثابت نہیں ہوتا محض کشید ہے ہاں بعد کے محدثینؒ نے اپنے ظن اور تخمینہ سے رجوع پر حمل کیا ہے۔ مگر یہ ان کی اپنی صوابدید ہے مؤلف خیر الکلام کا ص۲۱۱ میں امام مالکؒ اور یحییٰؒ بن سعیدؒ کی جرح کو مفسر قرار دینا اور باقی حضرات کی جرح کو مبہم کہہ کر گلو خلاصی کرنا محض تسکین قلب کا سامان ہے غرضیکہ ان تمام حضرات کی جرح مفسر کڑی اور شدید ہے اور کسی کا تاریخی طور پر صراحت کے ساتھ رجوع ثابت نہیں ہے مؤلف خیر الکلام کا ص۲۱۰ میں یہ لکھنا کہ محمدؒ بن اسحاقؒ پر ایک الزام اہل کتاب سے روایت لینا بھی ہے حالانکہ اہل کتاب سے روایات لینا کوئی جرم نہیں تو ان کی بے خبری اور غفلت کی واضح دلیل ہے کہ وہ مطلقاً اہل کتاب کی روایت کو جائز سمجھتے ہیں۔ حضرت شاہ ولی اللہ صاحبؒ تو یہ لکھتے ہیں کہ:

اقول الرواية عن اهل الكتاب تجوز فيما سبيله سبيل الاعتبار وحيث يكون الامن عن الاختلاط في شرائع الدين ولا تجوز فيما سوى ذالك۔

(حجة الله البالغة جلد ا ص۱۴۱)

میں کہتا ہوں کہ اہل کتاب سے روایت ایسے معاملات میں جہاں عبرت مقصود ہو اور جہاں دین کے احکام میں اختلاط واقع نہ ہوتا ہو درست ہے، اور اس کے علاوہ ان سے روایت جائز نہیں ہے۔

اور اسی لیے امام المدینیؒ نے اس کو ضعیف کہا ہے کہ وہ اہل کتاب سے روایت کرتا ہے جیسا کہ تہذیب التہذیب کے حوالہ سے پہلے عرض کیا جا چکا ہے۔ مؤلف خیر الکلام نے جن بعض ائمہؒ کی بسلسلہ ابن اسحاقؒ توثیق نقل کی ہے تو وہ مسلم ہے مگر وہ صرف تاریخ اور مغازی وغیرہ کے بارے میں نہ کہ صفات اللہ، حلال و حرام، احکام اور سنن کے بارے میں اور مغازی میں وہ ثقہ بھی ہیں اور امام بھی اس میں نزاع نہیں ہے اور بلاشک حافظ ابن ہمامؒ اور علامہ عینیؒ وغیرہ نے محمدؒ بن اسحاقؒ کی توثیق کی ہے مگر ائمہ جرح و تعدیل کی کڑی اور سنگین جرح کے مقابلہ میں ان کی توثیق مسلّم نہیں ہے۔ فریق ثانی کے شیخ الکل مولانا سید نذیر حسین صاحب دہلویؒ (المتوفی ۱۳۲۰ھ) لکھتے ہیں کہ:- اور ضعیف کہنا غزالیؒ کا اور رویانیؒ کا اور دبوسیؒ کا اور صاحب ہدایہؒ کا اور شیخ ابن الہمامؒ کا اور بعضے مالکیوں کا حدیث کو ضعیف نہیں کر دیتا کیونکہ یہ لوگ مقلدین ہیں ائمہ جرح و تعدیل میں سے نہیں ہیں الیٰ ان قال اب رہا ضعیف کہنا ابن عبد البرؒ کا اور ابو داؤدؒ کا اور علیؒ بن المدینیؒ کا، سو البتہ جرح ان کا پایہ اعتبار میں ہے لیکن اگر با بیان سبب اور با دلیل ہو تو معتبر ہے ورنہ بے بیان سبب ان کا جرح بھی مقبول نہیں ہونے کا الخ (معیار الحق ص ۲۴۲) اور مولانا محمد عبد اللہ صاحب روپڑیؒ (المتوفی ۱۳۸۴ھ) لکھتے ہیں کہ جرح تعدیل تاریخ کی قسم سے ہے اور تاریخ اس وقت کے لوگوں کی معتبر ہوتی ہے پچھلے لوگ نقال ہوتے ہیں اس لیے پہلے لوگوں کے خلاف کسی کی جرح تعدیل کا اعتبار نہیں اس کے لیے مقدمہ ابن الصلاحؒ کا مطالعہ مفید رہے گا۔ ان شاء اللہ (مودودیت اور احادیث نبویہ ص ۹) رہا محمدؒ بن اسحاقؒ کا مدلس ہونا تو یہ سب کے نزدیک مسلّم ہے چنانچہ علامہ ہیثمیؒ، حافظ ابن حجرؒ، قاضی شوکانیؒ، نواب صدیق حسن خانؒ، مولانا شمس الحق عظیم آبادیؒ اور مبارکپوری صاحبؒ وغیرہ کو اس کا صاف اقرار ہے۔ دیکھئے مجمع الزوائد جلد ۱ ص ۱۵ و تقریب ص ۳۱۳، نیل الاوطار جلد ۳ ص ۴۳، دلیل الطالب ص ۲۳۹، تعلیق المغنی جلد ۱ ص ۱۲۰، ابکار المنن ص ۴۵ و تحفۃ الاحوذی جلد ۱ ص ۲۹)

اعتراض:- مبارکپوری صاحبؒ لکھتے ہیں کہ محمد بن اسحاقؒ ثقہ ہے اور دلائل یہ ہیں۔

(۱) امام بخاریؒ اس کو ثقہ کہتے ہیں (۲) امام شعبہؒ اس کو امیر المحدثین کہتے ہیں (۳) ابن مدینیؒ اور احمدؒ بن حنبلؒ وغیرہ اس کو ثقہ کہتے ہیں (۴) اگر یہ ثقہ نہیں تو احناف اذانؑ، قطع سترہؑ اور تعجیل افطارؑ میں ابن اسحاقؒ کی روایتوں سے احتجاج کیوں کرتے ہیں (تحقیق الکلام جلد ۱ ص ۶۱ محصلہ)

جواب :- مبارکپوری صاحبؒ کے یہ جملہ اعذار بارد ہونے کے سبب مطلقاً قابل التفات نہیں ہیں ہر شق کا جواب سنئے (۱) ایسے کذاب اور دجال راوی کے بارے میں امام بخاریؒ وغیرہ کی رائے کیا وقعت رکھتی ہے ؟ خصوصاً جب کہ امام بخاریؒ نے ابن اسحاقؒ کا زمانہ نہیں پایا اور ہشامؒ بن عروہؒ امام مالکؒ اور یحییٰ القطانؒ وغیرہ اس کا زمانہ پانے والے انتہائی سنگین الزام اس پر عائد کرتے ہیں اور یہ بڑے محتاط اور عارف باسباب الجرح بھی ہیں۔ علاوہ بریں اگر واقعی محمدؒ بن اسحاقؒ ثقہ ہے تو حضرت امام بخاریؒ نے باوجود اشد ضرورت کے صحیح بخاری میں اس سے احتجاج کیوں نہیں کیا ؟ ع

کچھ تو ہے جس کی پردہ داری ہے۔

یہ حضرت امام بخاریؒ وغیرہ کی ذاتی رائے ہے حق وہی ہے جو جمہور نے کہا ہے چنانچہ نواب صاحب ایک مقام پر لکھتے ہیں جمہور اہل اسلام کے نزدیک ایسی حدیث سے جو حسن ہو احتجاج صحیح ہے لیکن امام بخاریؒ حدیث حسن سے احتجاج کے قائل نہیں ہیں آگے نواب صاحب لکھتے ہیں والحق ما قاله الجمهور (دلیل الطالب ص۸۸۲) حق بات صرف وہی ہے جو جمہور نے کہی ہے قاضی شوکانیؒ نے بھی امام بخاریؒ اور ابن العربیؒ کا یہ مسلک نقل کر کے آگے لکھا ہے والحق ما قاله الجمهور (نیل الاوطار جلد ا ص۲۲) کہ حق وہی ہے جو جمہور نے کہا ہے (۲) امام شعبہؒ کی بات اگر محمدؒ بن اسحاقؒ کے بارے میں حجت ہے تو جابر جعفی و جو قراۃ خلف الامام ہی کی ایک روایت کا راوی ہے مگر ہم نے اس سے احتجاج [illegible] کیوں حجت نہیں ہے ؟ امام شعبہؒ ان کو بھی ثقہ کہتے ہیں (کتاب القراۃ ص۱۰۸ ، میزان جلد ا ص۱۷۶ ، تہذیب جلد ۲ ص۴۷ و توجیہ النظر ص۲۹۱ وغیرہ) علاوہ بریں مبارکپوری صاحبؒ کے نزدیک امیر المحدثین ہونے سے توثیق کیسے لازم آتی ہے ؟ مبارکپوری صاحبؒ تو لکھتے ہیں کہ علامہ تاج الدین سبکیؒ نے ابو طاہر سلفیؒ کو گو شیخ ، ادیب ، عارف اور امام المحدثین والفقہاء لکھا ہے۔ قلت لا دلالة فی هذا علی کونه ثقة قابلاً للاحتجاج (تحفۃ الاحوذی جلد ۲ ص۵۹) لیکن میں کہتا ہوں کہ امام المحدثین والفقہاء ہونے سے یہ کیسے لازم آیا کہ وہ ثقہ اور قابل احتجاج بھی تھے ، محقق نیمویؒ نے ابو عبد اللہ فنجویہ دینوریؒ کو کبار محدثین میں لکھا ہے مبارکپوری صاحبؒ ان پر گرفت کرتے ہوئے لکھتے ہیں۔

فان مجرد کونه من کبار المحدثین لا یستلزم — ان کے صرف کبار محدثین میں ہونے سے یہ کیسے لازم

کونہ ثقۃ (انتہی بلفظہ تحفۃ الاحوذی جلد ۲ ص۷۵)   آیا کہ وہ ثقہ بھی تھے ؟

مبارک پوری صاحبؒ ہی ازراہِ بزرگی وانصاف فرمائیں کہ جن کے بارے میں جرح کا ایک لفظ بھی موجود نہ ہو اور علامہ تاج الدین سبکیؒ وغیرہ جیسے امام اور ثقہ عالم ان کو امام المحدثین اور کبار المحدثین لکھیں مگر محض ان کی ثقاہت ثابت نہ ہو سکے اور محمد بن اسحاقؒ کو ائمہ جرح وتعدیل کذاب اور دجال تک کہتے ہوں تو اس کے (بقول امام شعبہؒ) امیر المحدثین ہونے سے اس کی ثقاہت کیسے ثابت ہو سکتی ہے ! ؎

ٹھوکریں مت کھایئے چلئے سنبھل کر دیکھ کر   چال سب چلتے ہیں لیکن بندہ پرور دیکھ کر

(۳) امام ابن مدینیؒ اور امام احمدؒ بن حنبلؒ وغیرہ کو مطلقؒ ابن اسحاقؒ کے موثقین میں شامل کرنا انتہائی غفلت اور طبقات رواۃ سے بے خبری پر مبنی ہے باحوالہ ان کے اقوال نقل کئے جا چکے ہیں کہ یہ بھی ابن اسحاقؒ کو مجروح اور ضعیف قرار دیتے ہیں لہٰذا ان کا ذکر مطلقاً معدلین میں جہالت پر مبنی ہے امام نوویؒ فرماتے ہیں کہ اگر جرح وتعدیل کا تعارض ہو اور جارح امر خفی پر مطلع ہو چکا ہو جس کی اطلاع معدل کو نہیں تو جرح تعدیل پر مقدم ہے اور یہی محققین اور جمہور کا مختار ہے (شرح مسلم ج ۱ ص ۲۱) اور نیز وہ لکھتے ہیں کہ فانہم متفقون علی انہ لا یحتج بالضعیف فی الاحکام (ایضاً) یعنی محدثین کرامؒ اس بات پر متفق ہیں کہ ضعیف راوی سے احکام میں احتجاج واستدلال کرنا درست نہیں ہے اور ابن اسحاقؒ پر جرح مفسر اور ریا بیان ہو چکی ہے اور یہ روایت احکام شرعیہ میں سے ایک حکم سے متعلق ہے اور جبکہ فریق ثانی احناف کی نماز کو بیکار باطل اور کالعدم قرار دے کر اعاذ اللہ تعالیٰ ان کو فی السقر پہنچانے کا ادھار کھائے بیٹھا ہے اور چیلنج دیتا ہے ایں حالات ابن اسحاقؒ کی روایت کی کیا وقعت ہے ؟

(۴) علماء احناف نے اذان ، قطع سرقہ اور تعجیل افطار وغیرہ کے بارے میں اگر محمدؒ بن اسحاقؒ سے استدلال کیا ہے تو کیا صرف استدلال ہی کیا ہے یا فریق ثانی کو مباہلہ اور مفسدین عمل ہونے کا چیلنج بھی کیا ہے ؟ اور کیا محمدؒ بن اسحاقؒ کی روایات کو لے کر تمام روئے زمین کے غیر مقلدوں پر اشتہاری رعب بھی قائم کرنے کی کوشش کی ہے ؟ اور کیا یہ کہا ہے کہ فریق ثانی کا فلاں فلاں عمل ناقص اور بیکار باطل اور کالعدم ہے ؟ اگر محمد بن اسحاقؒ جیسے ضعیف اور کمزور راوی کی روایت کو احناف نے دلیل بنا کر ایسا کیا ہے تو خطا کی ہے اور کیا احناف نے محمدؒ بن اسحاقؒ کی روایت کو نصِ قرآنی اور

صحیح احادیث کے خلاف حجت سمجھا ہے اگر احناف نے اس کی روایت کو کسی موقع پر بطور حجت بھی پیش کیا ہو تو یقین جانئے کہ تمام روئے زمین کے غیر مقلدین کو للکارا اور کھلا چیلنج بھی ہرگز نہ کیا ہوگا اور نہ حلفیہ طور پر ان کو بے عمل کہا ہوگا؟ انصاف شرط ہے باقی جو حدیثیں مبارکپوری صاحب نے ہماری دلیلیں تصور کر لی ہیں ان کی کوتاہ فہمی ہے ہم سے پوچھیئے کہ ان مسائل میں ہمارے پاس کون سی حدیثیں موجود ہیں پھر آپ کو کچھ کہنے کا حق ہے۔ ؎

یہ کاوشیں بے سبب ہیں کیسی کدورتوں کی کچھ انتہا بھی زبان رکھتے ہیں ہم بھی آخر کبھی تو پوچھو سوال کیا ہے

مسئلۂ اذان :- علماء احناف کی یہ تحقیق ہے کہ اذان بھی دوہرے کلمات پر مشتمل ہے اور اقامت بھی بالفاظ دیگر اذان میں ترجیع نہیں اور اقامت و تکبیر میں ایتار نہیں ہے بطور نمونہ چند حدیثیں ملاحظہ ہوں۔

پہلی حدیث :- امام ابو عوانہؒ فرماتے ہیں کہ ہم سے عمرؒ بن شبہؒ نے بیان کیا وہ کہتے ہیں کہ ہم سے عبدالصمدؒ بن عبدالوارثؒ نے بیان کیا وہ کہتے ہیں کہ ہم سے شعبہؒ نے بیان کیا وہ مغیرہؒ سے اور وہ شعبیؒ سے اور وہ حضرت عبداللہؓ بن زید انصاری سے روایت کرتے ہیں وہ فرماتے ہیں۔

سمعت اذان رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم فکان اذانہ و اقامتہ مثنیٰ مثنیٰ (ابو عوانہ جلد ۱ ص ۳۳۱)

میں نے جناب رسول اللہ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وآلہٖ وسلّم کی اذان سنی آپ کی اذان اور آپ کی اقامت دوہرے دوہرے کلمات پر مشتمل تھی۔

آنحضرت صلی اللہ تعالیٰ علیہ وآلہٖ وسلّم کی اذان اور تکبیر سے آپ کے مؤذن اور مکبر کی اذان و اقامت مراد ہے کیونکہ آپ نے خود کبھی اذان نہیں کہی حضرت عبداللہؓ بن زید انصاری جلیل القدر صحابی ہیں امام شعبہؒ، مغیرہؒ بن مقسمؒ اور شعبیؒ کا ذکر جلد اوّل میں ہو چکا ہے کہ وہ سب ثقہ ثبت اور حجت تھے، عمرؒ بن شبہؒ کو امام دارقطنیؒ، خطیبؒ، مرزبانیؒ، اور مسلمہ ثقہ کہتے ہیں محمدؒ بن سہلؒ اور ابو حاتمؒ ان کو صدوق کہتے ہیں ابن حبانؒ ان کو ثقات میں لکھتے ہیں (تہذیب التہذیب جلد ۷ ص ۴۶۰) عبدالصمدؒ بن عبدالوارثؒ کو ابن نمیرؒ اور ابن قانعؒ ثقہ کہتے ہیں، ابن سعدؒ ان کو ثقہ اور حاکمؒ ان کو ثقہ اور مامون کہتے ہیں، ابن مدینیؒ کہتے ہیں کہ شعبہؒ کی روایت میں وہ ثبت تھے ابن حبانؒ ان کو ثقات میں لکھتے ہیں (ایضاً جلد ۶ ص ۳۲۷) حافظ ابن حجرؒ لکھتے ہیں ثبت فی شعبۃ۔

(تقریب صفحہ ۲۴) یہ روایت بھی امام شعبہ ہی سے ہے۔

دوسری حدیث :۔ عبدالرزاقؒ فرماتے ہیں کہ ہم سے معمرؒ نے بیان کیا وہ حمادؒ سے اور وہ ابراہیمؒ سے اور وہ اسودؒ بن یزیدؒ سے روایت کرتے ہیں وہ فرماتے ہیں کہ حضرت بلالؓ جو آنحضرت صلی اللہ تعالیٰ علیہ وآلہ وسلم کے مؤذن تھے، کان یثنی الاذان ویثنی الاقامۃ (طحاوی صفحہ ۸۰ و زیلعی جلد ۱ صفحہ ۲۶۹) وہ اذان اور اقامت دوہری دوہری کہا کرتے تھے اس روایت کے تمام راوی ثقہ ہیں اور پہلے مختلف مقامات میں ان کے تراجم نقل کئے جا چکے ہیں البتہ امام ابن جوزیؒ وغیرہ نے یہ اعتراض کیا ہے کہ اسودؒ بن یزیدؒ کی حضرت بلالؓ سے سماعت ثابت نہیں ہے لیکن ان کا یہ اعتراض غلط ہے علامہ ذہبیؒ لکھتے ہیں کہ اسودؒ بن یزیدؒ کی حضرت معاذؓ، حضرت ابن مسعودؓ، حضرت حذیفہؓ اور حضرت بلالؓ سے سماعت ثابت ہے (تذکرہ جلد ۱ صفحہ ۴۸)۔

تیسری حدیث :۔ حضرت عبداللہؓ بن زید کی روایت میں یہ آتا ہے کہ آنحضرت صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کے سامنے مؤذن نے فاذن مثنی واقام مثنی (مصنف ابن ابی شیبہ جلد ۱ صفحہ ۱۳۶ طحاوی جلد ۱ صفحہ ۸۰ سنن الکبریٰ جلد ۱ صفحہ ۴۲۰ محلی جلد ۳ صفحہ ۱۵۸) اذان بھی دوہری دوہری کہی اور اقامت بھی دوہری دوہری کہی علامہ ابن حزمؒ لکھتے ہیں ھذا اسناد فی غایۃ الصحۃ (جلد ۳ صفحہ ۱۵۸) کہ یہ سند اعلیٰ درجہ کی صحیح ہے۔

چوتھی حدیث :۔ عبدالرحمنؒ بن ابی لیلیٰ عبداللہؓ بن زید سے روایت کرتے ہیں کہ آنحضرت صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کے سامنے فاذن مثنی مثنی ثم قعد ثم اقام مثنی مثنی (سنن الکبریٰ جلد ۱ صفحہ ۴۲۱) مؤذن نے دوہری دوہری اذان کہی پھر بیٹھ گیا پھر اٹھ کر دوہرے دوہرے کلمات سے اقامت اور تکبیر کہی اس کے بھی تمام راوی ثقہ ہیں، امام بیہقیؒ نے اس پر یہ اعتراض کیا ہے کہ عبدالرحمنؒ بن ابی لیلیٰؒ کی ملاقات عبداللہؓ بن زید سے نہیں ہوئی مگر یہ اعتراض باطل ہے کیونکہ خطیب بغدادیؒ وغیرہ لکھتے ہیں کہ عبدالرحمنؒ بن ابی لیلیٰؒ ثقہ تابعی تھے اور ۱۷ھ میں ان کی ولادت ہوئی ہے۔ (بغدادی جلد ۱۰ صفحہ ۲۰۰) اور عبداللہؓ بن زید کی وفات جمہور کے نزدیک ۳۲ھ میں ہوئی ہے۔ (تہذیب جلد ۵ صفحہ ۲۲۴) پندرہ سال کے اس عرصہ میں امکان لقا یقینی ہے (الجوہر النقی فی الرد علی البیہقی جلد ۱ صفحہ ۴۲۱) اور جمہور کے نزدیک اتصال سند کے لیے امکان لقاء ہی شرط ہے، دیکھئے صحیح مسلم شریف

کا مقدمہ۔ مؤلف خیر الکلام لکھتے ہیں کہ کیونکہ صحت حدیث کے لیے صرف استاد اور شاگرد کی ملاقات کا ممکن ہونا کافی ہے عدم ثبوت سے نفی لازم نہیں آتی بلفظہ ص ۲۲۲)

پانچویں حدیث:۔ ایک حدیث کے الفاظ یہ ہیں کہ جس اذان (اور اقامت) کا آنحضرت صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے اجرا فرمایا الاذان مثنیٰ مثنیٰ والاقامة مثنیٰ مثنیٰ۔ اس اذان اور اقامت کے الفاظ دوہرے دوہرے تھے۔ حافظ ابن حجرؒ لکھتے ہیں اسنادہ صحیح (درایہ ص۶۱) کہ اس روایت کی سند صحیح ہے۔

چھٹی حدیث:۔ حضرت ابو جحیفہؓ فرماتے ہیں کہ آنحضرت صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کے سامنے اذن بلالؓ للنبی صلی اللہ علیہ وسلم مثنیٰ مثنیٰ واقام مثل ذلک (مجمع الزوائد جلد ۱ ص۳۲۳ ورواتہ ثقات) حضرت بلالؓ نے جو اذان کہی اس کے کلمات دوہرے دوہرے تھے اور اقامت بھی اسی طرح تھی۔

ساتویں حدیث:۔ حضرت بلالؓ مؤذن جناب رسول اللہ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کی اذان اور اقامت کے الفاظ مرتین مرتین دوہرے دوہرے ہوتے تھے (الجوہر النقی جلد ۱ ص۲۲۵) اس کے تمام راوی ثقہ اور ثبت ہیں اور جلد اول میں ان کے تراجم نقل ہو چکے ہیں، یہ تمام روایات صحیح ہیں اور ان میں کسی کی سند میں محمد بن اسحاقؒ موجود نہیں ہے مگر مبارکپوری صاحبؒ سوء فہم کی وجہ سے یہ سمجھے بیٹھے ہیں کہ احناف کا استدلال ابو داؤد وغیرہ کی اس روایت سے ہے جس کی سند میں محمد بن اسحاقؒ ہے، باقی اس باب کی مختلف روایات کی تطبیق اور ترجیح کا یہ مقام نہیں ہے۔

نصاب سرقہ کا مسئلہ:۔ تمام اہل اسلام کا اس امر پر اتفاق ہے کہ چور کا ہاتھ نص قرآنی کے تحت قطع کیا جائے گا لیکن کتنی مالیت کی چوری ہو تو ہاتھ کاٹا جائے گا؟ اس میں حافظ ابن حجرؒ نے فتح الباری میں بیس۲۰ مذاہب نقل کیے ہیں حضرت امام ابو حنیفہؒ کی تحقیق یہ ہے کہ قطع ید کا ادنیٰ نصاب دس درہم ہے (ہاتھ کی قیمت جب کہ وہ امین تھا بیت کافی تھی مگر جب اس نے خیانت کا ارتکاب کیا تو کوڑی کے مول نہ رہا لما کانت امینة کانت ثمینة فلما خانت ھانت)

آج اس دور تہذیب و تمدن میں جب کسی اعلیٰ حاکم کے خلاف ناکام ارادہ قتل کی سزا سزائے موت ہو سکتی ہے تو بالفعل خدا تعالیٰ کی نافرمانی کرنے والے اور قانون شکن کا ہاتھ کیوں نہیں کاٹا جا سکتا اگر

علماء احناف نے محمد بن اسحاقؒ کی روایت سے اس باب میں استدلال کیا ہے تو فریق ثانی کو کب مباہلہ کا چیلنج کیا ہے؟ یا کب ان کے عمل کو باطل اور کالعدم قرار دیا ہے؟ یا کب تمام دنیا کے باشندوں کو للکار کر ان پر اشتہاری رعب قائم کیا ہے؟ باوجود اس کے کہ بالاتفاق میدان جہاد اور قحط سالی وغیرہ کے موقع پر چور کا ہاتھ نہیں کاٹا جاتا۔ ہم پھر بھی یہ پیش کش کرتے ہیں کہ فریق ثانی ربع دینار کے نصاب کو ہی حکومت وقت سے اجرا کرا دے ہم ان کے ساتھ ہیں آخر باطل اور غیر معصوم قانون کے بجائے حضرت محمد صلی اللہ تعالیٰ علیہ وآلہٖ وسلم کی حدیث ہی پر تو عمل ہوگا۔ لیکن مبارکپوری صاحب نے اس مقام پر بھی ٹھوکر کھائی ہے۔ احناف کا استدلال اس روایت سے ہے ملاحظہ کیجئے۔

امام نسائی فرماتے ہیں کہ ہم سے محمدؒ بن بشارؒ نے بیان کیا وہ عبدالرحمٰنؒ سے روایت کرتے ہیں وہ فرماتے ہیں کہ ہم سے سفیانؒ نے بیان کیا وہ منصورؒ سے وہ مجاہدؒ سے اور وہ حضرت ایمنؓ سے روایت کرتے ہیں قال لم تكن تقطع اليد على عهد رسول الله صلى الله تعالىٰ عليه وسلم الا فى ثمن المجن وقيمته دينار (نسائی جلد ۲ ص ۲۲۵) وہ فرماتے ہیں کہ آنحضرت صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کے زمانہ میں ڈھال کی قیمت میں ہاتھ کاٹا جاتا تھا اور ڈھال کی قیمت ایک دینار ہوتی تھی۔ حضرت ایمنؓ صحابی ہیں اور بقیہ جملہ رواۃ محمدؒ بن بشارؒ، عبدالرحمٰنؒ بن مہدیؒ، امام سفیانؒ، منصورؒ اور مجاہدؒ کے تراجم جلد اول میں اپنے اپنے موقع پر عرض کئے گئے ہیں کہ تمام ثقہ ثبت اور حجت تھے، امام نسائیؒ فرماتے ہیں کہ ہم سے ہارونؒ بن عبداللہؒ نے بیان کیا وہ فرماتے ہیں کہ ہم سے اسودؒ بن عامرؒ نے بیان کیا وہ فرماتے ہیں کہ ہم سے حسنؒ بن حیؒ نے بیان کیا وہ منصورؒ سے اور وہ حکمؒ سے اور وہ عطاءؒ اور مجاہدؒ سے روایت کرتے ہیں اور وہ دونوں حضرت ایمنؓ سے وہ فرماتے ہیں۔

يقطع السارق فى ثمن المجن وكان ثمن المجن على عهد رسول الله صلى الله عليه وسلم دينارا او عشرة دراهم (نسائی جلد ۲ ص ۲۲۵)	کہ چور کا ہاتھ ڈھال کی قیمت اور مالیت کے سرقہ مال میں کاٹا جاتا ہے اور آنحضرت صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کے زمانہ مبارک میں ڈھال کی قیمت ایک دینار یا دس درہم ہوتی تھی

لہ دیکھئے ابوداؤد ج ۲ ص ۲۳۹ دارمی ص ۳۰۱ اعلام الموقعین ج ۳ ص ۷ اور المجۃ فی الاسوۃ الحسنۃ بالسنۃ ص ۶۳ وغیرہ

ہارونؒ بن عبداللہؒ (ثقہ تھے صفحہ ۳۷۵) امام نسائیؒ فرماتے ہیں وہ ثقہ تھے ابن حبانؒ ان کو ثقات میں لکھتے ہیں (تہذیب التہذیب صفحہ ۹/۱۱) اور حکمؒ بن عتیبہؒ بھی ثقہ اور ثبت تھے (تذکرہ صفحہ ۱۱۱/۱) اور باقی سب رواۃ ثقہ اور ثبت ہیں اور جلد اوّل میں حسنؒ بن صالحؒ بن حیؒ وغیرہ کے تراجم نقل کیے جا چکے ہیں۔

امام نسائیؒ فرماتے ہیں کہ ہم سے محمودؒ بن غیلانؒ نے بیان کیا وہ کہتے ہیں کہ ہم سے معاویہؒ (ابن ہشامؒ) نے بیان کیا وہ سفیانؒ (ثوری) سے اور وہ منصورؒ (بن معتمرؒ) سے اور وہ مجاہدؒ سے اور وہ عطاؒ سے اور وہ حضرت ایمنؓ سے روایت کرتے ہیں۔ قال لم یقطع النبی صلی اللہ تعالی علیہ وسلم السارق الا فی ثمن المجن وثمن المجن یومئذ دینار (نسائی صفحہ ۲۲۵/۲) وہ فرماتے ہیں کہ آنحضرت صلی اللہ تعالی علیہ وآلہ وسلم نے ڈھال کی قیمت سے کم چوری کے مال میں چور کا ہاتھ نہیں کاٹا اور ڈھال کی قیمت اس زمانہ میں ایک دینار تھی محمودؒ بن غیلانؒ کو امام نسائیؒ اور مسلمہؒ ثقہ کہتے ہیں ابن حبانؒ ان کو ثقات میں لکھتے ہیں (تہذیب جلد ۱۰ صفحہ ۶۵) حافظ ابن حجرؒ لکھتے ہیں کہ وہ ثقہ تھے (تقریب صفحہ ۳۳۰) معاویہؒ بن ہشامؒ کو ابو حاتمؒ اور ساجیؒ صدوق کہتے ہیں ابوداؤدؒ ان کو ثقہ کہتے ہیں ابن حبانؒ اور ابن شاہینؒ ان کو ثقات میں لکھتے ہیں ابن سعدؒ ان کو صدوق اور کثیر الحدیث کہتے ہیں (تہذیب صفحہ ۲۱۱/۱) کسی نے ان کے متعلق یہ کہا تھا کہ وہ متروک ہیں علامہ ذہبیؒ فرماتے ہیں۔ قلت ھذا خطاء منک ماترکہ احد (میزان جلد ۳ صفحہ ۱۸۱) میں کہتا ہوں اے قائل تیرا یہ قول سراسر خطا ہے ان کو کسی نے ترک نہیں کیا عطاؒ بن ابی رباحؒ ثقہ فقیہ اور فاضل تھے (تقریب صفحہ ۲۶۴) بقیہ رواۃ کا تذکرہ پہلے ہو چکا ہے یہ ہیں وہ صحیح احادیث جن سے علمائے احناف نے ادنیٰ نصاب سرقہ کے بارے میں (جس میں چور کا ہاتھ کاٹا جاتا ہے) استدلال کیا ہے اور ان میں سے کوئی سند ایسی نہیں جس میں محمد بن اسحاقؒ ہو۔ اور یہ روایت دارقطنی جلد ۲ صفحہ ۳۶۹ سنن الکبریٰ جلد ۸ صفحہ ۲۵۷ مستدرک جلد ۴ صفحہ ۳۷۹ اور طحاوی جلد ۲ صفحہ ۹۳ وغیرہ حدیث کی کتابوں میں موجود ہے۔ امام نسائیؒ اور امام بیہقیؒ وغیرہ نے یہ کہا ہے کہ ایمنؓ صحابی نہیں ہیں لہذا ان کی روایت مرسل ہو گی لیکن یہ اعتراض بے کار ہے اولاً اگر مرسل بھی ہو تب بھی جمہور محدثینؒ کے نزدیک حجت ہے اس پر جلد اول میں سیر حاصل بحث کی جا چکی ہے وثانیاً محمد بن اسحاقؒ (فریق ثانی کے امیر المحدثین) اور علامہ ابن سعدؒ، حافظ ابوالقاسم بغویؒ، محدث ابو نعیمؒ،

حافظ ابن مندہؒ حافظ ابن قانعؒ اور امام ابن عبد البرؒ وغیرہ سب ان کو صحابی کہتے ہیں (زیلعی جلد ۲ ص ۲۵۷) علامہ ذہبیؒ بھی ان کا شمار صحابہؓ میں کرتے ہیں اور لکھتے ہیں کہ یہ آنحضرت صلی اللہ تعالیٰ علیہ وآلہ وسلم کی خاضنہ (جس نے آپؐ کی بچپن میں پرورش کی تھی) حضرت اُم ایمنؓ کے صاحبزادے تھے (تجرید اسماء الصحابۃ جلد ۱ ص ۴۳) ابن اسحاقؒ کا یہ بیان ہے کہ غزوہ حنین میں ان کی شہادت ہو چکی تھی لیکن یہ صحیح نہیں ہے۔ امام طحاویؒ فرماتے ہیں کہ یہ آنحضرت صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کے بعد عرصہ تک زندہ رہے ہیں (الجوہر النقی جلد ۸ ص ۲۵۸ علی السنن) حافظ ابن کثیرؒ لکھتے ہیں کہ عطاءؒ کی ایمنؓ سے روایت اگر مدلس نہ ہو تو اس بات کی واضح دلیل ہے کہ ایمنؓ آنحضرت صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کے بعد عرصہ تک زندہ رہے ہیں (البدایۃ جلد ۵ ص ۳۱۳) الحاصل حضرات محدثین کرامؒ کے قواعد کے لحاظ سے اس روایت کے صحیح اور حجت ہونے میں کوئی شبہ نہیں ہے ہاں البتہ نہ ماننے والے کے منوانے کا ہمارے پاس کوئی ذریعہ نہیں ہے امام طبرانیؒ (اپنے معجم وسط میں) محمدؒ بن نوحؒ بن حربؒ سے اور وہ خالدؒ بن مہرانؒ سے اور وہ ابو مطیعؒ سے اور وہ قاسمؒ بن عبد الرحمٰنؒ سے اور وہ اپنے والد عبد الرحمٰنؒ سے اور وہ حضرت عبد اللہؓ بن مسعودؓ سے روایت کرتے ہیں، وہ فرماتے ہیں:-

عن النبی صلی اللّٰہ علیہ وسلم قال لا قطع الا فی عشرۃ دراھم (نصب الرایہ ص ۲۵۹)

کہ آنحضرت صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے فرمایا دس درہم سے کم میں چور کا ہاتھ نہیں کاٹا جا سکتا۔

امام طبرانیؒ وغیرہ نے اس پر یہ اعتراض کیا ہے کہ اس روایت کو بیان کرنے میں ابو مطیعؒ متفرد ہے اور وہ کمزور تھا لیکن مولانا شمس الحق صاحب عظیم آبادیؒ لکھتے ہیں کہ امام محمدؒ بن الحسنؒ (جو بقول امام دارقطنیؒ ثقات اور حفاظ میں تھے) اس روایت کے بیان کرنے میں ابو مطیعؒ کے متابع ہیں (تعلیق المغنی ص ۲۶۹/۲)

یہ روایت امام دارقطنیؒ (ص ۲۶۹/۲) وغیرہ نے بھی بیان کی ہے، بہر حال احناف کا مسلک اس میں بھی قوی ہے۔

تعجیل افطار کا مسئلہ:- تعجیل افطار جمہور اہل اسلام کا مسلک ہے احناف کا اس مسئلہ میں کسی سے کوئی اختلاف نہیں ہے اور جمہور حضرت سہلؓ بن سعدؓ کی مرفوع اور صحیح روایت پیش کرتے ہیں۔

قال لا یزال الناس بخیر ما عجلوا الفطر (بخاری جلد ۱ ص ۲۶۳ ومسلم جلد ۱ ص ۳۵۰)

کہ امت اس وقت تک بھلائی سے موصوف رہے گی جب تک روزہ افطار کرنے میں جلدی کرے گی، نہ اس روایت میں ابن اسحاقؒ ہے اور نہ اس کی صحت میں کلام ہو سکتا ہے کیونکہ یہ متفق علیہ

حدیث ہے مبارکپوری صاحبؒ نے بلاوجہ ابن اسحاقؒ کی روایت کی آڑ لی ہے۔

محمدؒ بن اسحاقؒ کی تحدیث اور متابعت

حضرات محدثین کرامؒ کا یہ قاعدہ اور اصول ہے اگر ثقہ راوی ہو اور اس پر صرف تدلیس کا الزام عائد کیا گیا ہو تو اس کی تحدیث سے یا کسی اور ثقہ راوی کی متابعت سے یہ الزام رفع ہو جائے گا۔ اسی طرح اگر کسی راوی میں معمولی ضعف اور کمزوری ہو اور کوئی ثقہ یا قریب بہ ثقہ راوی اس کی متابعت کرے تو اس کی روایت تعدد طرق کی وجہ سے حسن لغیرہ کے درجہ کو پہنچ سکتی ہے۔ فریق ثانی نے محمدؒ بن اسحاقؒ سے متعلق اس قاعدہ سے فائدہ اٹھانے کی کوشش کی ہے مگر بالکل بے سود ہے چنانچہ مولانا شمس الحق صاحبؒ اور مبارکپوری صاحبؒ وغیرہ نے یہ کہا ہے کہ محمدؒ بن اسحاقؒ نے تحدیث کی ہے۔ (دارقطنی جلد ۱ ص۱۲۱ وسنن الکبریٰ جلد ۲ ص۱۶۴ ومسند احمد جلد ۵ ص۳۲۲) لہذا اس کی روایت قابلِ قبول ہو سکتی ہے (تعلیق المغنی جلد ۱ ص۱۲۰ وتحقیق الکلام ج۱ ص۵۸) اگر محمدؒ بن اسحاقؒ ثقہ ہوتا اور اس پر صرف تدلیس کا الزام ہوتا تو پھر یہ بات صحیح تھی کہ اس کی تحدیث سے تدلیس کا شبہ جاتا رہتا مگر وہ تو پرلے درجہ کا ضعیف کمزور اور متروک ہے لہذا وہ تحدیث بھی کرتا ہے اس کی روایت کو کون سنتا ہے؟ وعلیٰ ھذا القیاس اگر اس میں معمولی کمزوری اور ضعف ہوتا اور اس کا کوئی ثقہ متابع موجود ہوتا اور اس کی سند بھی صحیح ہوتی تو الگ بات تھی مگر آپ سن چکے ہیں کہ ائمہ جرح وتعدیل نے جرح کے انتہائی اور سنگین الفاظ (کذاب ودجال وغیرہ) اس کے حق میں استعمال کئے ہیں اور ان ائمہؒ کی اکثریت اس بات پر متفق ہے کہ ابن اسحاقؒ کی روایات حلال و حرام احکام وسنن میں تو مطلقاً قابلِ قبول ہی نہیں ہیں اس لیے اس کی متابعت کا سرے سے سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ معہذا آپ ان روایات پر اور ان کے سند کے روات پر سرسری نگاہ ڈال لیجئے تاکہ آپ کو یہ بھی معلوم ہو جائے کہ محمدؒ بن اسحاقؒ کے متابع اور جن سندات سے متابعت ثابت کی جاتی ہے ان میں کیسے کیسے شیر خفتہ ہیں؟ ؎

ہر بیشہ گماں مبر کہ خالی است ۔۔۔ شاید کہ پلنگ خفتہ باشد

متابعت کی پہلی روایت

امام بیہقیؒ اپنی سند سے بطریق عبیداللہؒ بن سعیدؒ بن کثیرؒ بن عفیرؒ روایت کرتے ہیں اور وہ ابراہیمؒ

بن ابی یحییٰؒ سے اور وہ یزیدؒ بن یزیدؒ بن جابرؒ سے اور وہ مکحولؒ سے الخ روایت کرتے ہیں (کتاب القراۃ ص۳۲)
حدیث کا مضمون وہی ہے جو پہلے گذر چکا ہے اس سند میں یزیدؒ بن یزیدؒ محمدؒ بن اسحاقؒ کا متابع ہے اگرچہ
بعض محدثینؒ اس میں کلام کرتے ہیں لیکن زیادہ تر اس کی توثیق کے قائل ہیں۔ اس میں عبید اللہؒ
بن سعیدؒ بن کثیرؒ بھی ہیں جن میں امام ابن حبانؒ اور محدث ابن عدیؒ کلام کرتے ہیں۔ (لسان
ج ۲ ص ۱۶۷ و ج ۴ ص ۱۰۴) اور دوسرا راوی اس میں ابراہیم بن ابی یحییٰ ہے۔
علامہ ذہبیؒ ان کو احد الضعفاء کہتے ہیں یحییٰؒ ابن سعیدؒ کا بیان ہے کہ میں نے امام مالکؒ سے سوال
کیا کیا وہ حدیث میں ثقہ ہے؟ امام مالکؒ نے فرمایا کہ حدیث میں تو کیا ثقہ ہوتا دین میں بھی قابلِ اعتبار
نہ تھا، قطانؒ کہتے ہیں کہ وہ کذاب تھا امام احمدؒ فرماتے ہیں کہ محدثینؒ نے اس سے روایت ترک کر دی
ہے اور وہ ایسی بے بنیاد روایتیں کیا کرتا تھا جن کی کوئی اصل نہیں ہوتی۔ امام بخاریؒ فرماتے ہیں کہ امام
ابن مبارکؒ اور دیگر محدثینؒ نے اس سے روایت ترک کر دی تھی۔ ابن معینؒ کہتے ہیں کہ وہ کذاب
اور رافضی تھا۔ علیؒ بن مدینیؒ کہتے ہیں وہ کذاب تھا۔ امام نسائیؒ اور دار قطنیؒ اس کو متروک کہتے ہیں
(میزان الاعتدال جلد ا ص ۲۷) اس سند سے فریق ثانی محمدؒ بن اسحاقؒ کی متابعت ثابت کرتا ہے، افسوس
اور تعجب ہے۔

دوسری روایت: اسی مضمون کی ایک روایت امام دار قطنیؒ اور امام بیہقیؒ نے نقل کی ہے اور
اس میں زبیدیؒ کو محمد بن اسحاقؒ کا متابع بتلایا ہے (دار قطنی ج ا ص ۱۲۱ و کتاب القراۃ ص ۴۵) لیکن
سند کا مدار بقیۃؒ پر ہے، امام عبد اللہؒ بن مبارکؒ فرماتے ہیں کہ بقیۃؒ بن ولیدؒ صدوق تو تھا مگر ہر کہ و مہ
سے روایت کر لیا کرتا تھا، ابن عیینہؒ فرماتے ہیں کہ احکام میں اس کی کوئی روایت نہیں قبول کی جا
سکتی ہاں فضائل کا باب الگ ہے ابو حاتمؒ کہتے ہیں کہ اس سے احتجاج صحیح نہیں ہے ابو
مسہر غسانیؒ کہتے ہیں کہ بقیۃؒ کی حدیثیں صحیح نہیں ہوتیں ان سے بہر حال اجتناب کرنا چاہئے امام
بیہقیؒ کہتے ہیں کہ تمام محدثینؒ کا اتفاق ہے کہ بقیۃؒ حجت نہیں ہے عبد الحقؒ کہتے ہیں کہ اس سے
احتجاج صحیح نہیں ہے (میزان جلد ا ص ۱۵۴ و تہذیب التہذیب جلد ا ص ۴۷۴) نواب صاحبؒ
لکھتے ہیں کہ در وے جماعتے سخن کردہ (بدور الاہلہ ص ۲۶۹) امام دار قطنیؒ ایک مقام پر لکھتے ہیں کہ
متابعت کی اس روایت کی دارو مدار سالمؒ بن نوحؒ پر ہے جو کمزور ہے پھر اس کی متابعت کا کیا اعتبار

ہے؟ (جلد ا صـ ۱۲۵) اور مبارکپوری صاحبؒ لکھتے ہیں کہ بے شک حسنؒ بن عمارہؒ نے ابو حنیفہؒ کی متابعت کی ہے لیکن اس کی متابعت کالعدم ہے کیونکہ یہ متروک ہیں (بلفظہٖ تحقیق الکلام جلد ۲ صـ ۱۳۵) فریق ثانی کے نزدیک حضرت امام ابوحنیفہؒ کی متابعت میں تو حسنؒ بن عمارہؒ کی روایت کالعدم ہے مگر افسوس ہے کہ محمدؒ بن اسحاق ایسے کذاب و دجال کی متابعت ایسے راویوں کی سند سے جو محدثین کے نزدیک قابلِ احتجاج ہی نہیں ہیں بالکل صحیح ہے فوا اسفا علاوہ بریں امام دارقطنیؒ اور امام بیہقیؒ اس کو مرسل کہتے ہیں اور ہمارے نزدیک بلکہ جمہور محدثین کے نزدیک مرسل حجت ہے جس کی بحث جلد اوّل میں گذر چکی ہے لیکن فریق ثانی کے نزدیک مرسل حجت نہیں ہے امام بخاریؒ لکھتے ہیں کہ مرسل سے حجت درست نہیں ہے (جزأ القرأۃ صـ ۱۱) امام بیہقیؒ لکھتے ہیں وھو ضعیف من حیث انہ مرسل (کتاب القرأۃ صـ ۱۳۱) نواب صاحبؒ لکھتے ہیں و مرسل از قسم ضعیف است (دلیل الطالب صـ ۲۹۳) دوسری جگہ لکھتے ہیں و مرسل حجت نیست (بدور الاصلہ صـ ۷۹) اور مبارکپوریؒ صاحب لکھتے ہیں۔ والمرسل وان کان حجۃ عند الحنفیۃ لکن المحقق انہ لیس بحجۃ (تحفۃ الاحوذی جلد ا صـ ۳۶۵) احناف مرسل کو حجت کہتے ہیں لیکن حق یہ ہے کہ مرسل حجت نہیں ہے۔ پھر یہ روایت ان کے نزدیک کیسے صحیح اور قابل حجت ہو سکتی ہے؟ مؤلف خیر الکلام لکھتے ہیں کہ محقق مذہب محدثین کے ہاں یہی ہے کہ مرسل حجت نہیں ہوتی الخ (صـ ۴۷۸)

تیسری روایت :- مبارکپوری صاحبؒ کتاب القرأۃ صـ ۴۰ کے حوالہ سے نقل کرتے ہیں کہ ملک شام کے ثقہ راوی محمدؒ بن اسحاقؒ کے متابع ہیں (تحقیق الکلام جلد ا صـ ۹۵ وابکار المنن صـ ۱۲۸) لیکن اس سند میں ایک راوی محمدؒ بن ابی السریؒ ہے اعلاء السنن جلد ۴ صـ ۹۶ میں اس کا نام محمدؒ بن متوکلؒ نقل کیا گیا ہے اور علامہ ذہبیؒ فرماتے ہیں کہ اس کی چند حدیثیں ہیں جو منکر خیال کی جاتی ہیں۔ (میزان جلد ۳ صـ ۱۲۸) ابو حاتمؒ ان کو لین الحدیث کہتے ہیں ابن عدیؒ ان کو کثیر الغلط کہتے ہیں اور مسلمہؒ بن قاسمؒ ان کی توثیق کرتے ہوئے بھی ان کو کثیر الوھم کہتے ہیں ابن وضاحؒ ان کو کثیر الحفظ اور کثیر الغلط کہتے ہیں (تہذیب التہذیب جلد ۹ صـ ۴۲۵) دوسرا راوی اس سند کا علاءؒ بن الحارث ہے امام ابوداؤدؒ کہتے ہیں کہ اس کا حافظہ متغیر ہو چکا تھا امام بخاریؒ اس کو منکر الحدیث کہتے ہیں (میزان جلد ۲ صـ ۲۱۰) علامہ ذہبیؒ لکھتے ہیں کہ جس راوی کو امام بخاریؒ منکر الحدیث کہتے ہوں

اس سے احتجاج جائز نہیں ہے حوالہ پہلے نقل کیا جا چکا ہے تیسرا راوی اس سند کا احمدؒ بن عمیرؒ بن جوصاؒ ہے علامہ ذہبیؒ فرماتے ہیں کہ اس کی چند حدیثیں غریب ہیں دارقطنیؒ کہتے ہیں کہ یہ قوی نہیں حمزہ کنانیؒ نے اس سے بالکل روایت ترک کر دی تھی (میزان جلد اص ۵۹) محدث زبیرؒ بن عبدالواحدؒ اس کو ضعیف سمجھتے تھے (لسان جلد اص ۲۴۰) مؤلف خیر الکلام نے ص ۲۱۹ میں اس کا یہ ناکام جواب دیا ہے کہ یہ جرحیں مبہم ہیں پھر آگے ان رواۃ کے بارے بعض توصیفی کلمات نقل کئے ہیں الجواب اصول حدیث میں اس امر کی صراحت ہے کہ کثیر الغلط، کثیر الوہم ہونا جرح مفسر ہے۔ اور ایسے راوی کی حدیث مردود روایتوں میں شامل ہے اور امام بخاریؒ کا منکر الحدیث کہنا تو اپنی جگہ مستقل شدید جرح ہے۔

چوتھی روایت:۔ امام دارقطنیؒ، حاکمؒ اور بیہقیؒ ایک روایت نقل کرتے ہیں جس میں سعیدؒ بن عبدالعزیز تنوخیؒ کو محمدؒ بن اسحاقؒ کا متابع کیا گیا ہے۔ (دارقطنیؒ جلد اص ۱۲۱، مستدرک جلد اص ۲۳۸۔ سنن الکبریٰ ص ۱۶۵ جلد ۲) لیکن اس سند کی مدار ولیدؒ بن مسلمؒ پر ہے، امام احمدؒ اس کو کثیر الخطأ کہتے ہیں امام ابن معینؒ فرماتے ہیں کہ وہ ابوالسفرؒ سے روایتیں لیا کرتا تھا اور ابوالسفرؒ کذاب تھا ابومسہرؒ کہتے ہیں کہ وہ امام اوزاعیؒ کی روایتیں کذابین سے لیا کرتا تھا۔ دارقطنیؒ کا بیان ہے کہ وہ ضعیف اور کمزور راویوں کے نام ساقط کر دیتا تھا اور اوزاعیؒ وغیرہ کے نام ساتھ جوڑ دیتا تھا ابوداودؒ کہتے ہیں کہ دس حدیثیں اس نے ایسی بیان کی ہیں جن کی کوئی اصل نہیں ہے۔ امام احمدؒ فرماتے ہیں کہ اسکی مسموع وغیر مسموع تمام روایتیں خلط ملط ہو چکی تھیں اور بہت سی روایتیں اس کی منکر ہیں۔ (تہذیب التہذیب جلد ۱۱ ص ۱۵۴/۱۵۵) مؤلف خیر الکلام نے یہ کہا کہ امام زہریؒ اور ابن جریجؒ کی روایت میں اس پر جرح ہے اور یہاں سعیدؒ سے روایت کر رہا ہے اور بعض ائمہؒ نے اس کی توثیق اور توصیف کی ہے (محصلہ ص ۲۱۸، ۲۱۹) الجواب:۔ امام احمدؒ وغیرہ نے تصریح فرما دی ہے کہ اسکی روایتیں خلط ملط ہو چکی تھیں مسموع وغیر مسموع میں کوئی تمیز نہیں تو پھر حدثنا اور سعیدؒ وغیرہ کی آڑ لینا بالکل بے سود ہے۔

پانچویں روایت: دارقطنی ص ۱۲۱/ج۱، بیہقی ص ۱۶۴/ج۲ اور تلخیص الجبیر ص ۸۷ وغیرہ میں زیدؒ بن واقدؒ کو محمدؒ بن اسحٰقؒ کا متابع بتایا ہے لیکن اس کی ایک سند میں الہیثمؒ بن حمیدؒ وغیرہ بعض محدثینؒ کے نزدیک متکلم فیہ راوی ہیں علاوہ بریں اس میں عن مکحولؒ عن نافعؒ... الخ ہے اور ان دونوں پر

عنقریب کلام آرہا ہے اور دوسری سند میں محمدؒ بن مبارکؒ ہے علامہ ذہبیؒ لکھتے ہیں احادیثہ تستنکر (بحوالہ تہذیب جلد ۹ ص۴۲۴) کہ اس سے منکر روایتیں بھی مروی ہیں اور ایک تیسری سند میں یحییٰ بن عبداللہؒ بن الضحاکؒ ہے (یہ دونوں سندیں دارقطنی جلد ۱ ص۱۲۵ میں موجود ہیں) امام ابوحاتمؒ اس کو ساقط الاحتجاج کہتے ہیں، ابن عدیؒ کہتے ہیں اثر الضعف علی حدیثہ بیّنٌ. ضعف اور کمزوری کا نشان اس کی حدیث پر بالکل آشکارا ہے محدث خلیلیؒ بھی ان پر محدثین کا طعن نقل کرتے ہیں (تہذیب التہذیب جلد ۱۱ ص۲۲۰) مؤلف خیر الکلام نے لکھا ہے کہ اس کی جرح مسلّم ہے مگر متابعت میں کوئی حرج نہیں (ص۲۲۱) یہ ہے فریق ثانی کے وکیل اعظم اور محدثؒ جلیل کا استدلال؟ سبحان اللہ تعالیٰ ثقہ راویوں کی حدیث تو ان کے نزدیک مسلّم نہیں جیسا کہ جلد اوّل میں مفصل عرض کیا گیا ہے اور ضعیف حجت ہیں، رہا امام دارقطنیؒ کا اس سند کو حسن کہنا اور رواۃ کی توثیق کرنا تو لاحاصل ہے، امام دارقطنیؒ کا قاعدہ ہی جدا ہے جو آگے آرہا ہے ان شاء اللہ تعالیٰ۔

قارئین کرام! آپ نے ائمہ جرح و تعدیل کی زبانی محمدؒ بن اسحاقؒ کا رتبہ اور درجہ بھی ملاحظہ کر لیا کہ وہ اس کو کذاب اور دجال وغیرہ کہتے ہیں اور جو راوی اس کی متابعت میں پیش کئے گئے ہیں اور جو جو سندیں اس کی متابعات کی ہیں ان میں بھی کذاب، متروک، منکر الحدیث لا یجوز بہ الاحتجاج۔ ساقط الاعتبار، ضعیف، کمزور اور غیر معتبر راوی ہیں جن کی کوئی روایت فی نفسہ معتبر نہیں ہو سکتی چہ جائیکہ نص قرآنی اور صحیح اور مرفوع احادیث کے مقابلہ میں قبول کی جا سکے حاشا وکلا ثم حاشا وکلا۔

دوسرا جواب:۔ اس روایت میں ایک راوی مکحولؒ بھی ہیں یہ معیاری ثقہ بھی نہ تھے نیز مدلس بھی ہیں امام حاکمؒ لکھتے ہیں:۔ ان عامۃ حدیث مکحول عن الصحابۃ حوالۃ (معرفت علوم الحدیث ص۱۱۱) کہ مکحولؒ کی حضرات صحابہؓ کرام سے اکثر حدیثیں صرف تدلیس و ارسال کے حوالہ نظر ہیں، علامہ ذہبیؒ لکھتے ہیں کہ مکحولؒ حضرت ابیؓ بن کعب، حضرت عبادہؓ بن الصامت، حضرت عائشہؓ اور دیگر کبار سے بکثرت ارسال اور تدلیس کرتے تھے (تذکرہ جلد ۱ ص۱۰۱) علامہ ابن سعدؒ فرماتے ہیں کہ محدثین کی ایک جماعت نے مکحولؒ کی تضعیف کی ہیں اور وہ صاحب تدلیس بھی تھے (میزان جلد ۳ ص۱۹۸) حافظ ابن حجرؒ لکھتے ہیں کہ مکحولؒ نے دیگر حضرات صحابہ کرامؓ

سے عموماً اور حضرت عبادہؓ سے خصوصاً کوئی حدیث نہیں سُنی وہ محض تدلیس سے کام لیتے ہیں (تہذیب التہذیب جلد ۱۰ صفحہ ۲۹۱) امام ابو حاتمؒ کہتے ہیں کہ وہ یدلس بالمتین چنداں قابلِ اعتبار نہ تھے اور یہ باوجود اس کے مدلس بھی تھے (قانون الموضوعات صفحہ ۲۹۸) مبارکپوری صاحبؒ بھی ان کو مدلس لکھتے ہیں (ابکار المنن صفحہ ۱۷۷) اور نواب صاحبؒ لکھتے ہیں دس اقسام الضعیف المدلس (دلیل الطالب صفحہ ۸۸۲) کہ مدلس روایت ضعیف روایتوں میں شمار ہوتی ہے اور مبارکپوری صاحبؒ لکھتے ہیں وعنعنة المدلس غیر مقبولة (ابکار المنن صفحہ ۲۲۵) اور دوسرے مقام پر لکھتے ہیں اور عنعنہ مدلس کا مقبول نہیں (بلفظہٖ تحقیق الکلام جلد ۲ صفحہ ۲۲۵) یہ بھی مت بھولیے کہ کسی قابلِ اعتبار سند سے مکحولؒ کی محمودؓ بن ربیع سے سماعت اور تحدیث ثابت نہیں ہے۔
(بغیۃ الالمعی جلد ۲ صفحہ ۱۲)

مؤلف خیر الکلام لکھتے ہیں کہ مکحولؒ کبار صحابہؓ سے ارسال کرتے تھے اور یہاں محمودؓ بن ربیع صغار صحابہؓ میں ہیں اور تدلیس سے اصطلاحی مراد نہیں اور امکان لقاء کے بعد معاملہ رفع ہو جاتا ہے (محصلہ صفحہ ۲۲۳/۲۲۴) الجواب: بھلا ان لایعنی باتوں کو کون تسلیم کرتا ہے، امام حاکمؒ کبار کی کوئی قید نہیں لگاتے مطلق حضرات صحابہؓ کا ذکر کرتے ہیں اور مکحولؒ اصطلاحی مدلس ہیں اسی کتاب المدلسین میں اسکا ذکر ہے جس میں قتادہؓ کا ذکر ہے اور تیسرے درجہ کا مدلس لکھا ہے امکان لقاء کافی ہوتا ہے مگر مدلس کے لیے یہ قاعدہ ہرگز نہیں ہے اور مؤلف مذکور نے ان کی جو توثیق نقل کی ہے وہ بے سود ہے ہم نے معیاری ثقہ کا لفظ بولا ہے فریق ثانی کے لیے نہایت ہی شرم کی بات ہے کہ وہ قتادہؓ وغیرہ ثقہ حافظ اور ثبت راویوں کی تدلیس کو تو قبول نہیں کرتا مگر ضعیف کمزور اور یدلس بالمتین کی تدلیس سے قطع نظر کر جاتا ہے، فریق ثانی نے مکحولؒ کی تدلیس کا جواب دیتے ہوئے جو کچھ کہا ہے یا ان کی متابعت میں جو روایتیں اور راوی اور جو سندیں پیش کی ہیں اجمالاً ان کا ذکر بھی سن لیجیے۔ امام بیہقیؒ نے احمدؒ بن عمیرؒ بن جوصاؒ کے طریق سے موسیٰؒ بن سہل رملیؒ سے یہ نقل کیا ہے کہ مکحولؒ کی محمودؓ بن ربیع سے سماعت ثابت ہے۔ (کتاب القرأۃ صفحہ ۴۴) اور ایک مقام پر لکھتے ہیں کہ اس روایت سے ثابت ہو سکتا ہے کہ مکحولؒ کی محمودؓ بن ربیع سے سماعت ہوئی تھی (ایضاً صفحہ ۴۶) لیکن یہ تمام باتیں بے بنیاد ہیں کیونکہ پہلے نقل کیا جا چکا ہے کہ احمدؒ بن عمیرؒ بن جوصاؒ کمزور اور

ضعیف ہے، اس کی سند کیونکر قابل حجت ہو سکتی ہے؟ علاوہ ازیں امام بخاریؒ لکھتے ہیں کہ مکحولؒ، حرام بن حکیمؒ اور رجاءؒ بن حیوۃؒ میں سے کسی نے محمودؒ بن ربیع سے سماع کا ذکر نہیں کیا (جزء القراۃ ص ۳۴) مکحولؒ کی متابعت میں پہلی روایت:

مبارکپوری صاحبؒ لکھتے ہیں کہ عبداللہؓ بن عمروؓ بن الحارثؓ (جن کی روایت دارقطنی جلد ۱ ص ۱۲۱، مستدرک جلد ۱ ص ۲۳۹ اور کتاب القرأۃ ص ۴۱ وغیرہ میں موجود ہے) مکحولؒ کے متابع ہیں (ابکار المنن ص ۱۲۴) لیکن یہ متابعت بھی کالعدم ہے کیونکہ اس کی سند میں ایک راوی معاویہؒ بن یحییٰ ہے۔ امام بخاریؒ اس کی تضعیف کرتے ہیں (ضعفاء صغیر ص ۲۹) نسائیؒ فرماتے ہیں کہ وہ ضعیف الحدیث تھا (ضعفاء صغیر نسائی ص ۵۴) حافظ ابن حجرؒ کہتے ہیں کہ وہ ضعیف ہے (تقریب ص ۳۵۸) دارقطنیؒ اس کو ضعیف کہتے ہیں (ج ۱ ص ۱۲۱) ابن معینؒ اس کو لیس بشیؒ کہتے ہیں امام ابوزرعہؒ کہتے ہیں کہ اسکی حدیثیں معلول ہیں (میزان الاعتدال ج ۳ ص ۱۸۱) جوزجانیؒ اس کو ذاہب الحدیث اور ابو حاتمؒ، ابوداؤدؒ اور ابو علی نیشاپوریؒ اس کو ضعیف کہتے ہیں ابن عدیؒ کا بیان ہے کہ اس کی حدیثوں میں کلام ہے، ساجیؒ اس کو ضعیف الحدیث اور بزارؒ اس کو لین الحدیث کہتے ہیں امام احمدؒ کہتے ہیں کہ ہم نے اس کو ترک کر دیا تھا (تہذیب التہذیب جلد ۱۰ ص ۲۱۹) دوسرا راوی اس کا اسحاقؒ بن ابی فروہؒ ہے۔ امام بخاریؒ لکھتے ہیں کہ محدثینؒ نے اس کو ترک کر دیا ہے (ضعفاء ص ۴) نسائیؒ اس کو متروک الحدیث کہتے ہیں (ضعفاء ص ۲۸) علامہ ذہبیؒ اس کو ہالک اور تباہ شدہ لکھتے ہیں (تلخیص المستدرک جلد ۱ ص ۲۳۹) حافظ ابن حجرؒ اس کو متروک لکھتے ہیں (تقریب ص ۳۰) اور دوسرے مقام پر لکھتے ہیں کہ تمام محدثینؒ نے اس سے احتجاج ترک کر دیا تھا (تہذیب جلد ۱ ص ۹۰) دارقطنیؒ لکھتے ہیں کہ وہ ضعیف ہے (جلد ۱ ص ۱۲۱) بیہقیؒ لکھتے ہیں کہ وہ قابلِ احتجاج نہیں ہے (سنن الکبریٰ جلد ۹ ص ۲۲) علامہ ذہبیؒ لکھتے ہیں۔ ولم ار احدا احتج به (میزان جلد ۱ ص ۹۰) مجھے معلوم نہیں کہ کسی ایک محدثؒ نے بھی اس کی حدیث قبول کی ہو اور تیسرا راوی عبداللہؓ بن عمروؓ بن الحارثؓ (جو مکحولؒ کا متابع بیان کیا جاتا ہے) خود مجہول ہے (تقریب ص ۲۰۹) یہ ہے فریق ثانی کا معیار استدلال افسوس صد افسوس۔ مؤلف خیر الکلام نے ص ۲۲۵ میں عبداللہؓ بن عمروؓ بن الحارثؓ کو مجہول تسلیم کر کے یہ جواب دیا ہے کہ مستور کی روایت کو متابعت میں ذکر کرنے سے کوئی حرج نہیں مگر سند کے

باقی راویوں کو بالکل پی گئے ہیں۔

دوسری روایت:۔ مبارکپوری صاحبؒ کتاب القرآۃ صلا کے حوالہ سے ایک روایت نقل کرتے ہیں جس میں شعیبؒ بن ابی حمزہؒ کو مکحولؒ کا متابع بیان کیا ہے (ابکار المنن ص۱۲۵) بلاشک یہ متابع ثقہ اور ثبت ہیں لیکن سند میں ایک تو اسحاقؒ بن ابی فروہؒ ہے جس کا ذکر خیر ابھی ہو چکا ہے اور دوسرا راوی اس سند کا عمروؒ بن عثمانؒ ہے ابو حاتمؒ کہتے ہیں کہ محدثین اس میں کلام کرتے ہیں اور یہ منکر حدیثیں روایت کرتا ہے ابن حبانؒ کہتے ہیں کہ بسا اوقات وہ حدیث میں خطاء کرتا ہے۔ امام نسائیؒ اور ازدیؒ اس کو متروک الحدیث کہتے ہیں (تہذیب التہذیب جلد۸ ص۷۷) اور ایک اور سند ہے جس میں محمدؒ بن حمیرؒ ہے جس کا تذکرہ بحث خداج میں ہو چکا ہے کہ وہ قابلِ احتجاج نہیں ہے اور ایک سند میں ابو عبد الرحمٰن محمدؒ بن الحسین سلمیؒ ہے یہ صوفیوں کے لیے حدیثیں وضع کیا کرتا تھا۔ علامہ ذہبیؒ لکھتے ہیں کہ محدثین اس میں کلام کرتے ہیں اور یہ قابلِ اعتماد نہیں ہے (میزان جلد۳ ص۴۶)

تیسری روایت:۔ مبارکپوری صاحبؒ لکھتے ہیں کنز العمال جلد۴ ص۲۰۸ اور کتاب القراۃ ص۴۲ میں عن الزہریؒ عن محمودؓ بن الربیع الخ کی سند میں امام زہریؒ مکحولؒ کے متابع ہیں۔ (تحقیق الکلام جلد۱ ص۹۲) لیکن قطع نظر اس سے کہ اس کی سند کیسی ہے یہ بھی ان کو مفید نہیں ہے اولاً اس لئے کہ مبارکپوری صاحبؒ خود ایک مقام پہ لکھتے ہیں زہریؒ مدلس ہیں اور عنعنہ سے روایت کرتے ہیں تو ان کی حدیث کیسے صحیح ہو سکتی ہے۔؟ (ابکار المنن ص۲۵) متابعت سے تدلیس کا شبہ وہاں رفع ہوتا ہے جہاں اصل روایت کے راوی ثقہ ہوں اور شبہ صرف تدلیس کا ہو اور یہاں اصل روایت ہی صحیح نہیں ہے، اس نکتہ کو مؤلف خیر الکلام بالکل ہضم کر گئے ہیں۔ وثانیاً فریق ثانی کی طرف سے جن میں خاص طور سے امام بخاری علیہ الرحمۃ بھی قابلِ ذکر ہیں یہ کہا گیا ہے کہ امام زہریؒ اپنے کلام کو حدیث میں ملا دیا کرتے تھے (جزء القراۃ ص۲۳) تو ہم الزامی طور پر یہ کہہ سکتے ہیں کہ کیا بعید ہے کہ اس حدیث میں خلف الامام کا جملہ امام زہریؒ نے مرفوع حدیث میں ملا دیا ہو۔ مؤلف خیر الکلام لکھتے ہیں کہ زہریؒ کی یہ عادت نہ تھی بلکہ ایک خاص حدیث میں فعل تھا محصلہ ص۲۲۷) الجواب:۔ مگر اس میں کوئی جان نہیں کیونکہ خود مؤلف خیر الکلام اسی صفحہ میں امام بخاریؒ کی جزء القراۃ کے حوالہ سے لکھتے ہیں کہ قال ربیعۃ للزہری اذا حدثت

فتبین کلامك الخ اس میں اذا شرطیہ ہے اور خود مؤلف مذکور صہ ۸۲ میں بحوالہ قاضی شوکانیؒ اسماء الشرط کو عام لکھتے ہیں پھر محض بات بنانے کے لیے یہ کہنا کہ عادت نہیں فعل ہے کیا وقعت رکھتا ہے اور مدرج کے لیے یہ دعویٰ کرنا کہ کلام مستقل ہو بالکل بے دلیل ہے کیونکہ ادراج جیسے مستقل کلام سے ہوتا ہے غیر مستقل سے بھی ہو سکتا ہے اور فتح الباری کا جو حوالہ انہوں نے نقل کیا ہے وہ اس دعوے کے لیے غیر صریح بلکہ صرف کشید ہے اتولف مذکور کو جب خود اپنی اس کشید کی کمزوری کا احساس ہوا تو یہ لکھا ہے کہ غیر مستقل پر ادراج کا اطلاق مجازاً ہو سکتا ہے (محصلہ) وثالثاً اگر خلف الامام کا جملہ (جس کی وجہ سے ان کی متابعت کو مدنظر رکھا گیا ہے) امام زہریؒ کے نزدیک ثابت ہوتا تو وہ بھی امام کے پیچھے قرأت کے قائل ہوتے حالانکہ وہ جہری نمازوں میں سختی سے اس کا انکار کرتے ہیں اور سکتات کی کوئی روایت صحیح نہیں ہے کما مرّ ورابعاً اس روایت میں خلف الامام کا جملہ محمدؒ بن یحییٰ الصفارؒ کا مدرج ہے جیسا کہ یہ تحقیقی جواب اپنے مقام پر ذکر کیا جائے گا۔ انشاء اللہ تعالیٰ۔ الغرض دیگر حضرات محدثین کرامؒ کے طے شدہ قواعد کے لحاظ سے عموماً اور فریق ثانی کی طرف سے پیش کردہ اصول کے پیش نظر شد کے اعتبار سے کوئی بھی ایسی صحیح روایت موجود نہیں ہے جس کو محمدؒ بن اسحاقؒ اور مکحولؒ کی متابعت میں پیش کیا جا سکے۔

تیسرا جواب نافعؒ بن محمودؒ کی جہالت :-

علامہ ذہبیؒ لکھتے ہیں کہ نافعؒ بن محمودؒ سے خلف الامام کی روایت کے علاوہ اور کوئی روایت مروی نہیں ہے۔ ابن حبانؒ ان کو ثقات میں لکھتے ہیں اور یہ تصریح کرتے ہیں کہ حدیثہ معلل کہ اس کی حدیث معلول ہے (میزان جلد ۳ صہ ۲۲۷) امام طحاویؒ لکھتے ہیں کہ نافعؒ بن محمودؒ مجہول ہے (الجوہر النقی جلد ۲ صہ ۱۶۵) حافظ ابو عمرؒ بن عبد البرؒ فرماتے ہیں کہ وہ مجہول ہے (تہذیب التہذیب جلد ۱۰ صہ ۴۱۰) شیخ الاسلام موفق الدینؒ ابن قدامہؒ لکھتے ہیں لیس بمعروف (مغنی جلد ۱ صہ ۶۰۶) کہ وہ مجہول ہے، حافظ ابن حجرؒ لکھتے ہیں کہ وہ مستور ہے (تقریب صہ ۳۷۱) محقق نیمویؒ اس کا مجہول ہونا نقل کرتے ہیں (تعلیق الحسن جلد ۱ صہ ۷۶) نافعؒ کے مجہول ہونے کا اس سے بڑھ کر اور کیا ثبوت ہو سکتا ہے امام بیہقیؒ لکھتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے ہمیں اس امر کا ہرگز مکلف نہیں ٹھہرایا کہ ہم اپنا دین مجہول اور غیر معروف راویوں سے اخذ کریں (کتاب القرأۃ صہ ۱۲۷) امام خطابیؒ

فرماتے شرہا الموضوع ثم المقلوب ثم المجہول (تدریب الراوی ص۱۹۴) کہ بدترین حدیث جعلی ہے پھر مقلوب اور پھر مجہول اور غرق ثانی تو اس روایت کو لے کر تمام دنیا کو چیلنج دے کر ان کی نمازوں کو باطل ٹھہراتا ہے۔

اعتراض: مبارکپوری صاحبؒ لکھتے ہیں کہ نافعؒ بن محمودؒ ثقہ تھے اور اس کے دلائل یہ ہیں (۱) علامہ ذہبیؒ نے اپنی کتاب کاشف میں ان کو ثقہ لکھا ہے (۲) امام ابن حبانؒ اور دارقطنیؒ ان کو ثقہ سمجھتے ہیں۔ امام دارقطنیؒ کی توثیق کا حوالہ مؤلف خیر الکلام نے بھی ذکر کیا ہے (ملاحظہ ہو ص۲۱۳) (۳) نافعؒ سے مکحولؒ اور حرامؒ بن حکیمؒ روایت کرتے ہیں لہذا یہ مستور نہ ہوں گے (۴) اگر مستور بھی ہوں تب بھی امام ابوحنیفہؒ کے نزدیک مستور کی حدیث حجت ہے (شرح نخبۃ الفکر ص۱۷) (۵) ابن حبانؒ نے جو حدیثہ معلل کہا ہے وہ نسخہ ثابت نہیں ہے (۶) بلکہ یہ علامہ ذہبیؒ کا وہم ہے۔
(محصلہ تحقیق الکلام جلد ا ص۷۵ و ص۷۹ و ابکار ص۱۲۹)۔

الجواب: مبارکپوری صاحبؒ کی پیش کردہ یہ جملہ شقیں مردود ہیں علی الترتیب ہر ایک کا جواب سنئے (۱) کاشف ہمیں دستیاب نہیں ہو سکی اگر علامہ ذہبیؒ نے نافعؒ کو اس میں ثقہ لکھا ہے تب بھی یہ میزان کے حوالہ حدیثہ معلل کے خلاف نہیں ہے کیونکہ اصول حدیث کے رو سے ثقہ راویوں کی حدیث بھی معلل ہو سکتی ہے جس کا باحوالہ ذکر عنقریب آرہا ہے انشاء اللہ تعالیٰ (۲) امام ابن حبانؒ اور دارقطنیؒ کا توثیق رجال کے بارے میں مسلک ہی جمہور محدثینؒ سے الگ ہے جمہور تو یہ فرماتے ہیں کہ اگر کسی راوی سے دو راویوں نے روایت کی ہو اور اس کی توثیق کسی سے ثابت نہ ہو (حافظ ابن حجرؒ لکھتے ہیں کہ وہ متفرد خود یا غیر جب کہ توثیق کا اہل ہو اور اس کی توثیق کرے تو صحیح قول پر وہ ثقہ ثابت ہو جائے گا۔ شرح نخبۃ الفکر ص۷ اور اسی قاعدے سے مؤلف خیر الکلام نے ص۳۶ میں سہارا لیا ہے لیکن شرح شرح نخبۃ الفکر ص۷ میں اسی قول کے رد میں لکھا ہے کہ الصحیح الذی علیہ اکثر العلماء من اہل الحدیث وغیرہم انہ لا یقبل مطلقا اھ کہ اکثر محدثین وغیرہم کے نزدیک مطلقاً یہ توثیق غیر مقبول ہے تو وہ مجہول اور مستور ہی رہتا ہے چنانچہ حافظ ابن حجرؒ لکھتے ہیں کہ

ان روی عنہ اثنان فصاعدا ولم — اگر کسی شخص سے دو یا دو سے زیادہ راوی روایت

یوثق فھو مجھول الحال وھو المستور اھ (شرح نخبۃ الفکر ص۲۴) — بیان کریں اور اس کی توثیق نہ کی گئی ہو تو وہ مجہول الحال ہوتا ہے اور وہی مستور کہلاتا ہے

اور امام ابن الصلاح (المتوفی ۶۴۳ھ) نے نچلے دو راویوں کے عادل ہونے کی قید بھی لگائی ہے (شرح شرح نخبۃ الفکر ص۱۵۴ طبع مصر) لیکن امام ابن حبانؒ اور دارقطنیؒ فرماتے ہیں کہ اگر کسی شخص سے دو راویوں نے روایت کی ہو تو وہ مجہول نہیں رہتا اور اس کی عدالت ثابت ہو جاتی ہے چنانچہ امام دارقطنیؒ لکھتے ہیں کہ

وارتفاع اسم الجھالۃ لہ عنہ ان یروی عنہ رجلان فصاعداً فاذا کان ھذہ صفتہ ارتفع عنہ اسم الجھالۃ و صار حینئذ معروفا اھ (دارقطنی جلد ۲ ص۳۶۱) — راوی سے جہالت کا اسم اس وقت اٹھتا ہے جب کہ اس سے دو یا دو سے زیادہ راوی روایت کریں جب ایسا ہو تو اس سے جہالت کا اسم مرتفع ہو جاتا ہے اور وہ راوی معروف ہو جاتا ہے۔

اور علامہ سخاویؒ (المتوفی ۹۰۲ھ) نے ان کا مسلک یوں نقل کیا ہے کہ

من روی عنہ ثقتان فقد ارتفعت جھالتہ وثبتت عدالتہ (فتح المغیث ص۱۳۷) — جس شخص سے دو ثقہ راوی روایت کریں تو اس سے جہالت رفع ہو جاتی ہے اور اس کی عدالت ثابت ہو جاتی ہے۔

مطلب یہ ہوا کہ جمہور کے نزدیک اس صورت میں راوی اگرچہ مجہول العین نہیں رہا مگر مجہول الوصف اور مجہول الحال بدستور رہے گا۔ لیکن امام دارقطنیؒ وغیرہ کے نزدیک باوجود مجہول الحال اور مستور ہونے کے وہ عادل ہو جاتا ہے اور اس کی حدیث حسن، صحیح اور جید ہو جاتی ہے اور جمہور نہ تو اس کو ثقہ اور عادل تسلیم کرتے ہیں اور نہ اس کی روایت کو قبول کرتے ہیں چنانچہ علامہ خطیب الشافعیؒ ۴۶۳ھ لکھتے ہیں کہ:

قلت الا انہ لا یثبت لہ حکم العدالۃ بروایتھما عنہ وقد زعم قوم ان عدالتہ تثبت بذلک ونحن نذکر فساد قولھم بمشیئۃ اللہ وتوفیقہ (الکفایۃ فی علم الروایۃ ص۸۹) — میں کہتا ہوں کہ ایسے مجہول راوی سے دو راویوں کی روایت کر لینے سے اس کی عدالت ثابت نہیں ہو سکتی اور ایک قوم نے (مثلاً ابن حبانؒ اور دارقطنیؒ وغیرہ، صفدر) یہ خیال کیا ہے کہ اس طرح اس کی عدالت ثابت ہو جائے گی مگر ہم ان شاء اللہ تعالیٰ اللہ تعالیٰ کی توفیق سے اس قول کا فساد اور بطلان ذکر کریں گے۔

اور جو مسلک امام دارقطنیؒ کا ہے سو وہی نظریہ امام ابن حبانؒ کا ہے چنانچہ اسکی تصریح موجود ہے کہ۔

وتبعہ ابن حبانؒ اذ العدل عندہ من لا یعرف فیہ الجرح (شرح شرح نخبۃ الفکر ص۱۵)

ابن حبانؒ بھی اسی نظریہ کے حامی ہیں کیونکہ ان کے نزدیک بھی ثقہ وہ ہے جس پر کوئی جرح معلوم نہ ہو۔

علامہ ذہبیؒ عمارۃ بن حدید کے ترجمہ میں لکھتے ہیں کہ

انہ مجہول۔ ولا تفرح بذکر ابن حبانؒ لہ فی الثقات فان قاعدتہ معروفۃ من الاحتجاج لمن لا یعرف (میزان جلد ۲ ص۲۲۲)

وہ مجہول ہے اور اس پر خوش مت ہو کہ ابن حبانؒ نے اس کو ثقات میں ذکر کیا ہے اس لیے کہ ان کا قاعدہ ہی مشہور ہے کہ مجہول راویوں سے بھی احتجاج کر لیتے ہیں۔

اور حافظ ابن حجرؒ لکھتے ہیں کہ

ویحیی الکندی غیر معروف ذکرہ البخاریؒ وابن ابی حاتمؒ ولم یذکرا فیہ جرحاً وذکرہ ابن حبانؒ فی الثقات کعادتہ فیمن لم یجرح (فتح الباری پ۲۱ ص۵۲ باب ما یحل من النساء و ما یحرم)

یحیی الکندی مجہول ہے امام بخاریؒ اور ابن ابی حاتمؒ نے اسکا ذکر کیا ہے لیکن اس پر انہوں نے جرح ذکر نہیں کی اور ابن حبانؒ نے اس کو ثقات میں لکھا ہے جیسا کہ ان کی عادت ہے کہ جن راویوں پر جرح نہیں ہوتی وہ ان کو ثقہ کہتے ہیں۔

ان تمام ٹھوس حوالوں سے یہ امر ثابت ہو گیا کہ جس راوی کو امام دارقطنیؒ اور امام ابن حبانؒ ثقہ اور عادل کہتے ہیں وہ جمہور کے نزدیک بدستور مجہول الحال اور مستور رہتا ہے اس لیے ان کے نافعؒ کو ثقہ کہنے میں اور جمہور کے اس کو مستور اور مجہول کہنے میں کوئی تعارض نہیں کیونکہ سہ

قسمیں میری اور رقیب کی راہیں جدا جدا
آخر کو ہم دونوں دیر رجا ناں پہ جا ملے

یہی وجہ ہے کہ ابن حبانؒ کو متساہل گردانا گیا ہے چنانچہ علامہ سخاویؒ لکھتے ہیں کہ امام حاکمؒ کی طرح ابن حبانؒ بھی متساہل ہیں (فتح المغیث ص۲۴) علامہ ابن الصلاحؒ لکھتے ہیں کہ ابن حبانؒ تساہل میں حاکمؒ کی مانند ہیں (مقدمہ ابن الصلاح ص۹) امام سیوطیؒ لکھتے ہیں کہ امام ابن حبانؒ اور امام حاکمؒ تساہل میں ایک دوسرے کا نظیر ہیں (تدریب الراوی ص۳۲) اور خود مبارکپوری صاحبؒ لکھتے ہیں کہ اس میں کوئی شبہ نہیں کہ ابن حبانؒ متساہل ہیں (تحقیق الکلام جلد ا ص۷۷) اور مؤلف خیر الکلام لکھتے ہیں کہ ابن حبانؒ نے اس کو ثقات میں ذکر کیا ہے مگر ابن حبانؒ کا تساہل مشہور ہے (ص۲۳۶)

اور اس سے بھی بڑھ کر امام دارقطنیؒ بسا اوقات ضعیف راویوں کو ثقہ اور ان کی حدیث کو بھی حسن کہہ دیتے ہیں چنانچہ ایک سند میں عبد اللہؒ بن لہیعہؒ آیا ہے جو جمہور محدثینؒ کے نزدیک ضعیف ہے اور خود امام دارقطنیؒ کو بھی اس کا اقرار ہے مگر وہ بایں ہمہ اس کی حدیث کو حسن کہتے ہیں ھذا اسناد حسن و ابن لهيعة ليس بالقوي (دارقطنی ج ۱ ص ۱۳۲) محمد بن عبد الرحمٰنؒ بن ابی لیلیٰؒ کو ایک جگہ ثقة فی حفظه شئی لکھتے ہیں (جلد ۱ ص ۴۶) اور دوسری جگہ ضعیف سئ الحفظ لکھتے ہیں (جلد ۱ ص ۸۹) عبد الرحمٰن بن ابراہیم القاصؒ کو پہلے ثقہ لکھتے ہیں اور پھر اسی صفحہ پر چند سطروں کے بعد ضعیف الحدیث لکھتے ہیں (جلد ۱ ص ۲۴۳) عبد اللہؒ مثنیؒ کو ایک موقع پر ثقہ لکھتے ہیں اور دوسرے پر کہتے ہیں کہ وہ ضعیف (تہذیب التہذیب جلد ۹ ص ۳۸۸) اس جملہ بحث کو پیش نظر رکھنے سے یہ بات بخوبی سمجھ آسکتی ہے کہ امام دارقطنیؒ اپنی قائم کردہ اصطلاح پر بھی پورے مطمئن نہیں ہیں، اور رواۃ کی ثقاہت اور جرح کے بارے میں وہ متردد رہے ہیں۔ زیادہ سے زیادہ یہ توجیہ کی جاسکتی ہے اور ہم اس کے منکر نہیں ہیں کہ ثقہ کسی اور وجہ سے کہا اور ضعیف کسی اور وجہ سے مگر تردد تو رہا ہی اور ہم امام دارقطنیؒ کی فن حدیث میں امامت کے منکر نہیں ہیں مؤلف خیر الکلام نے بے سود عبارتیں ان کی امامت منوانے کے لیے نقل کی ہیں اختلاف صرف ان کی اصطلاح سے ہے اور صرف ہمیں ہی نہیں جمہور محدثین کو ہے۔ (۳) مبارکپوری صاحبؒ نے امام دارقطنیؒ وغیرہ کی اصطلاح لے کر جمہور کے گلے مڑھنے کی بے جا سعی کی ہے تفصیل سے عرض کیا جا چکا ہے کہ جمہور کے نزدیک ایسا راوی مستور ہی رہتا ہے اور اس کی حدیث مقبول نہیں ہوتی اور خود امام ابن حبانؒ باوجود متساہل ہونے کے نافعؒ کی حدیث کو معلول قرار دیتے ہیں مؤلف خیر الکلام کا یہ جواب کہ ابن حبانؒ نے معلل ہونے کی وجہ بیان نہیں کی اور وہ متشدد ہیں (ص ۲۳۱) بالکل غیر تسلی بخش ہے کیونکہ اس کی وجہ شیخ الاسلامؒ نے بحوالہ امام احمدؒ وغیرہ ائمہ حدیث بیان کردی ہے علاوہ ازیں اگر معلل کہنے میں متشدد ہیں تو ان کو ثقہ کہنے میں متساہل بھی تو ہیں کما مرّ اور بعد کے جن حضرات نے نافعؒ کی سند کو صحیح یا حسن کہا ہے اس میں انہوں نے اعتماد دارقطنیؒ وغیرہ پر کیا ہے اور ان کی مستور کے بارے میں اصطلاح با حوالہ گذر چکی ہے جس کے رو سے جمہور کے نزدیک مستور مستور ہی رہتا ہے اور جرح کرنے والے محتاط عارف باسباب الجرح اور غیر متعصب ہیں اس لیے قاعدہ کے

رو سے امام طحاویؒ، حافظ ابن عبد البرؒ، امام ابن قدامہؒ علامہ ماردینیؒ اور حافظ ابن حجرؒ وغیرہ کی جرح مقدم ہوگی اور نافعؒ بہر کیف مجہول ہی ہوں گے۔ مولانا میر صاحبؒ نے علامہ ابن حزمؒ کی کتاب محلی جلد ۳ صـ۲۴ سے نافعؒ کی ثقاہت نقل کی ہے (ملاحظہ ہو گلدستہ صـ۱۱) لیکن علامہ ابن حزمؒ کا معاملہ بھی رواۃ کی توثیق و تضعیف کے بارے میں بڑا ہی نرالا ہے۔ چنانچہ وہ امام ترمذیؒ کو بھی ایک جگہ مجہول کہتے ہیں (تہذیب التہذیب جلد ۹ صـ۳۸۸) یہی وجہ ہے کہ ناقد فن رجال حافظ ذہبیؒ سیر النبلاء میں لکھتے ہیں کہ میں ابن حزمؒ سے محبت بھی کرتا ہوں کہ وہ صحیح حدیث سے محبت کرتے ہیں اور اس کی معرفت بھی رکھتے ہیں لیکن وان کنت لا اوافقہ، فی کثیر من مایقولہ فی الرجال والعلل والمسائل البشعۃ فی الاصول والفروع واقطع بخطائہ فی غیر مسئلۃ ولکن لا اکفرہ ولا اضللہ، وارجولہ العفو والمسامحۃ اھ (بحوالہ مقدمہ تحفۃ الاحوذی صـ۱۶۹) میں ان کی موافقت نہیں کرتا ان بہت سے امور کے بارے میں جو وہ رواۃ اور علل کے بارے میں کہتے ہیں اور اسی طرح ان کے اصول و فروع میں بہت سے ناپسندیدہ نظریات میں اور میں بہت سے مسائل میں ان کو یقیناً خطا کار سمجھتا ہوں مگر پھر بھی ان کی تکفیر و تضلیل نہیں کرتا۔ اور اللہ تعالیٰ سے ان کی عفو و درگذر کا امیدوار ہوں (۴) یہ بالکل غلط ہے کہ امام ابو حنیفہؒ مستور کی روایت کو حجت سمجھتے ہیں۔ حافظ ابن ہمامؒ لکھتے ہیں کہ صحیح مسلک یہ ہے کہ مستور کی روایت فاسق کی طرح مردود ہوگی جب تک اس کی عدالت ثابت نہ ہو جائے اس کی حدیث حجت نہیں ہو سکتی۔ حضرت امام ابو حنیفہؒ سے ایک غیر ظاہر روایت یہ ہے کہ جس کو سلف نے رد نہ کیا ہو وہ مقبول ہے لیکن ظاہر روایت وہی ہے جو پہلے بیان ہوئی (التحریر الاصول صـ۳۱۶) امام سراج الدین ہندی حنفیؒ لکھتے ہیں کہ مستور حدیث کے سلسلہ میں باتفاق علماء احناف فاسق کی طرح مردود ہے۔ اس لیے کہ حدیث میں کافی سے زیادہ احتیاط کی ضرورت ہے البتہ پانی کے مسئلہ میں اختلاف ہے کہ مستور کی خبر پانی کی نجاست اور طہارت کے سلسلہ میں مقبول ہے یا مردود؟ (حاشیہ توضیح صـ۴۷۴) مستور کی حدیث کے بارے میں یہی مسلک صاحب حسامی صـ۷۱ (علامہ حسام الدینؒ المتوفی ۶۴۴ھ) اور شاہ عبد الحق محدث دہلوی (وغیرہ) بھی نقل کرتے ہیں (مقدمہ مشکوٰۃ صـ۵) اور علامہ زبیدیؒ لکھتے ہیں کہ امام صاحبؒ کے نزدیک مجہول کی روایت مردود ہے (عقود الجواہر المنیفۃ صـ۶) لہذا امام ابو حنیفہؒ

کا مستور کی حدیث کے بارے میں صحیح مسلک وہ ہے جو علماء احناف نے پیش کیا ہے نہ کہ وہ جو حافظ ابن حجرؒ نے نقل کیا ہے کیونکہ مشہور ہے صاحب البیت ادریٰ بما فیہ (۵) حدیثِ معلل کا نسخہ یقیناً ثابت ہے اولاً اس لیے کہ علماء احناف کی طرف سے جب یہ سوال ہوا کہ میزان الاعتدال کے بعض نسخوں میں وہ عبارت موجود نہیں ہے جس میں ابن عدیؒ نے حضرت امام ابوحنیفہؒ کی تضعیف کی ہے اور جس کو علامہ ذہبیؒ نے میزان میں نقل کیا ہے (علامہ ذہبیؒ نے حضرت امام ابوحنیفہؒ کے متعلق اپنا فیصلہ تذکرۃ الحفاظ میں درج کیا ہے جو مقدمہ میں نقل ہو چکا ہے اور اس مضمون پر ہماری مبسوط کتاب مقام ابی حنیفہؒ دیکھیں) تو مبارکپوریؒ صاحبؒ اس کا جواب یوں ارقام فرماتے ہیں۔ تو جواب اس کا یہ ہے کہ امام صاحب کا ترجمہ بعض نسخوں میں ہونا اور بعض میں نہ ہونا اس کے الحاقی وغیر معتبر ہونے کی دلیل نہیں کتبِ حدیث میں متعدد روایات اور عبارات ایسی موجود ہیں جو بعض نسخوں میں نہیں اور بعض میں ہیں مگر کوئی بھی ان عبارات کو الحاقی نہیں بتلاتا الیٰ ان قال الحاصل میزان کے بعض نسخوں میں امام صاحبؒ کے ترجمہ کا ہونا اور بعض میں نہ ہونا اس کے الحاقی ہونے کی دلیل نہیں (ملفظہ تحقیق الکلام جلد ۲ ص۱۴۲ ومثلہ فی ابکار المنن ص۱۹۱) مبارکپوریؒ صاحبؒ ہی از راہِ انصاف فرمائیں کہ کیا یہ قاعدہ صرف حضرت امام ابوحنیفہؒ کے لیے ہی محدود ہے یا حدیثِ معلل کا نسخہ بھی اس سے ثابت ہو سکتا ہے؟ فرمائیے بات کیا ہے؟ ؎

دعا کا اپنی ثبوت کیا دوں یہ میری الفت کی انتہا ہے ۔ کہ جس کو وہ چاہتے ہیں ہمدم میں خیر اس کی منا رہا ہوں

ثانیاً حدیثِ معلل کا نسخہ صرف علامہ ذہبیؒ اور ابن حبانؒ ہی سے منقول نہیں بلکہ دیگر جلیل القدر محدثینؒ بھی نقل کرتے ہیں چنانچہ شیخ الاسلام حافظ ابن تیمیہؒ لکھتے ہیں وھذا الحدیث معلل عن ائمۃ الحدیث کاحمد وغیرہ من الائمۃ (فتاویٰ جلد ۲ ص۱۵۰) کہ اس حدیث کو امام احمد بن حنبلؒ وغیرہ دیگر ائمہ حدیث نے معلول قرار دیا ہے۔

تو مبارکپوریؒ صاحبؒ کے نزدیک یہ نسخہ بھی ثابت ہے یا اس کے اثبات کا بھی کوئی اور رنگ ڈھنگ ہوگا؟ (۶) وہم خطا اور نسیان تو انسان کے خمیر میں داخل ہے ان سے وہی محفوظ رہے گا جس کو خدا تعالیٰ بچائے گا لیکن بلا دلیل علامہ ذہبیؒ جیسے ناقدین فنِ رجال پر وہم کا الزام سنتا کون ہے؟ حافظ ابن حجرؒ نے تو یہ کہا ہی تھا لیکن مبارکپوریؒ صاحب بھی اس کے کہنے پر مجبور رہیں۔

الذہبیؒ ھو من اھل استقراء التام فی نقد اسماء الرجال (تحقیق جلد ا ص۹۵، الکار ص۶۰ تحفۃ الاحوذی جلد ۲ ص۲) علامہ ذہبیؒ وہ ہیں جن کو نقدِ اسمائے الرجال میں کامل ملکہ حاصل ہے (جب علامہ ذہبیؒ کو رواۃ اور رجال کے پرکھنے کی مکمل مہارت حاصل ہے اور ان کے بعد آنے والے جملہ حضرات محدثینؒ کرامؒ ان پر اس فن میں کلی اعتماد کرتے ہیں تو ان پر بلاوجہ یہ الزام کیوں عائد کیا جاتا ہے کہ یہ ان کا وہم ہے؟ بہرحال اگر نافع بن محمودؒ کو بعض محدثینؒ نے ثقہ بھی کہا ہو تب بھی اس کی حدیث معلل ہوسکتی ہے چنانچہ امام حاکمؒ سیوطیؒ اور علامہ جزائریؒ اس کی تصریح کرتے ہیں کہ لیسا اوقات ثقہ راوی کی حدیث بھی معلل ہوسکتی ہے (معرفت علوم الحدیث ص۵۹، تدریب الراوی ص۴۸ توجیہ النظر ص۱۳۷) اور نواب صدیق حسن خان صاحبؒ لکھتے ہیں کہ صحت سند صحت متن کو مستلزم نہیں ہے اور یہ محدثینؒ کے نزدیک معروف و مشہور ہے۔ (دلیل الطالب ص۹۱۸) مبارکپوری صاحبؒ لکھتے ہیں صحت اسناد صحت متن کو مستلزم نہیں ہے (ابکار المنن ص۲۰۲ و تحفۃ الاحوذی جلد ا ص۲۲) اور حافظ عبداللہ صاحب روپڑیؒ لکھتے ہیں کیونکہ یہ بات ظاہر ہے کہ اسناد کے حسن ہونے سے حدیث اس وقت حسن ہوسکتی ہے جب حدیث میں کوئی اور عیب نہ ہو اور یہاں اور عیب موجود ہے چنانچہ صاحب ابن حجرؒ نے اس کو معلول کہا ہے۔ (ضمیمہ تنظیم اہل حدیث روپڑ ص۱۶) اور مؤلف خیر الکلام لکھتے ہیں کہ پس اگر ایک متن شاذ ہو یا اس میں کوئی علت ہو یا ارسال و انقطاع کی صورت ہو تو یہ احادیث اگرچہ اوّل درجہ کے ثقہ راویوں سے ہوں پھر بھی ضعیف ہونگی۔ (ص۱۹۴) جب مذکورہ بالا دلائل اور براہین سے یہ بات ثابت ہوگئی کہ نافع مذکور بدستور مستور ہیں تو نافعؒ کی حدیث کسی طرح بھی فریق ثانی کو نافع نہیں ہوسکتی بعض لوگ اس غلط فہمی کا شکار ہیں کہ تعدد طرق سے جبر نقصان ہوجائے گا اور حدیث حسن لغیرہ کو پہنچ جائیگی مگر یہ بھی باطل ہے (چنانچہ نواب صدیق حسن خان صاحبؒ لکھتے ہیں کہ وہ حدیثے کہ مدار ضعف اندروئے کذب یا ترک یا جہالت راوی آمدہ است ایں چنیں حدیث باوجود تعدد طرق درخور اعتداد و عمل نیست خواہ در احکام باشد خواہ در فضائل اعمال (انتہیٰ۔ بلفظہٖ دلیل الطالب ص۸۸۴) نواب صاحبؒ کے کلام سے جو درحقیقت کلام الملوک ملوک الکلام کا مصداق ہے یہ بات بالکل آشکارا کردی ہے کہ وہ روایات جن میں کذاب، دجال، متروک اور مجہول و مستور راوی ہوں خواہ وہ کتنی

ہی زیادہ کیوں نہ ہوں مگر باوجود تعددِ طرق کے نہ تو اثباتِ احکام کے لیے وہ قابلِ التفات ہو سکتی ہیں اور نہ فضائلِ اعمال کے لیے وہ اس قابل ہی نہیں کہ ان کی طرف نگاہ بھی اٹھائی جائے۔ زندہ باد نواب صاحبؒ :-

چوتھا جواب یہ حدیث مضطرب ہے

کیونکہ مکحولؒ جو قیس بالمتین ہیں سند میں گڑبڑ کرتے ہیں کبھیؒ وہ تو براہِ راست حضرت عبادہؓ بن صامت سے روایت کرتے ہیں (دارقطنی جلد ۱ ص ۱۲۱ وکتاب القراءۃ ص ۴۲) اور کبھی نافعؒ بن محمودؓ بن ربیع کے واسطے سے (ابوداؤد جلد ۱ ص ۱۱۹ وکتاب القراءۃ ص ۴۳) اور کبھی محمودؓ بن ربیع عن ابی نعیمؒ عن عبادہؓ کے واسطے سے (مستدرک جلد ۱ ص ۲۳۸) اور کبھی نافعؒ بن محمودؒ عن محمودؒ عن عبادہؓ کے طریق سے (اصابہ جلد ۶ ص ۶۶) اور کبھی رجاؒ بن حیوہؒ عن محمودؓ بن ربیع عن عبادہؓ کے طریق سے (ایضاً) مؤلف خیر الکلام نے کہا ہے کہ ممکن ہے کہ مکحولؒ اور نافعؒ کی روایت بالواسطہ اور بلاواسطہ دونوں طریق سے ہو (محصلہ ص ۲۳۸) الجواب :- ممکن تو ہے مگر کسی صحیح سند سے اس کا اثبات ضروری ہے جو ندارد۔ اور پھر ابو نعیمؒ میں بھی اختلاف ہے، امام حاکمؒ کہتے ہیں کہ یہ وہبؒ بن کیسانؒ تھے (مستدرک جلد ۱ ص ۲۳۸) اور ابوداؤدؒ اور دارقطنیؒ کہتے ہیں کہ یہ ابو نعیمؒ مؤذن تھے جلد ۱ ص ۲۲۱ مؤلف خیر الکلام لکھتے ہیں کہ ابو نعیمؒ کے ذکر میں راوی نے غلطی کی ہے (ص ۲۳۸)

الجواب :- بس اسی طرحؒ کی غلطی بعض شامی راویوں نے کر ڈالی ہے کہ موقوف کو مرفوع سے خلط ملط کر دیا ہے قول اور فہم حضرت عبادہؓ کا تھا اور بناء حدیث ڈالی ہے، راقم کہتا ہے کہ ابو نعیمؒ محمودؓ بن ربیع کی بھی کنیت تھی (تہذیب التہذیب جلد ۱۰ ص ۶۳) حافظ ابن حجرؒ نے اصابہ جلد ۳ ص ۳۸۶ میں بقول مؤلف خیر الکلام محمودؓ کی کنیت ابو محمد بتائی ہے اور اس کو صحیح کہا ہے مگر اختلاف کی نفی تو نہیں کی جس روایت کی سند میں ایسا بھلا اضطراب ہو وہ کیونکر قابلِ احتجاج ہو سکتی ہے ؟۔ (الجوہر النقی جلد ۲ ص ۱۶۴ و بذل المجہود جلد ۲ ص ۵۶ و فتح الملہم جلد ۲ ص ۲۶ وغیرہ) نواب صاحبؒ لکھتے ہیں کہ حدیث کا مضطرب ہونا اکثر اہلِ علم کے نزدیک حدیث کے مجروح اور کمزور ہونے کا سبب ہے (دلیل الطالب ص ۹۱۸) اور دوسری جگہ لکھتے ہیں کہ ضعیف حدیث کی قسموں میں سے ایک حدیث مضطرب بھی ہے (ایضاً ص ۸۸۲) اور مولانا مبارکپوری صاحبؒ بھی دیگر

حضرات محدثین کرامؒ کی طرح اس قاعدہ اور ضابطہ کو صحیح تسلیم کرتے ہیں کہ حدیث مضطرب قابلِ احتجاج نہیں ہو سکتی (دیکھئے تحقیق الکلام جلد ۲ ص وغیرہ)

اعتراض:۔ مبارکپوری صاحبؒ لکھتے ہیں کہ محض اختلاف کی وجہ سے اضطراب نہیں ہوتا اضطراب کے لیے دو شرطیں ہیں اور یہاں وہ دونوں مفقود ہیں (۱) اختلاف کے وجوہ برابر ہوں (۲) اختلاف کا جمع کرنا متعذر ہو اور یہاں جمع کرنا متعذر نہیں ہے کیونکہ جب حدیث کے مسند اور مرسل ہونے کا اختلاف ہو تو حدیث مسند ہی ہوگی؟ لہٰذا اضطراب کیسے؟ (ابکار ص۱۲۶ اور مؤلف خیر الکلام نے بھی یہی کچھ کہا ہے ص $\frac{۲۳۸}{۲۳۹}$)۔

جواب:۔ مبارکپوری صاحبؒ کا یہ ارشاد بھی صرف دفع الوقتی ہے اور یہ دونوں شقیں باطل ہیں پہلی تو اس لیے کہ طرفین کے نزدیک ان روایتوں کے وجوہ برابر ہیں، مبارکپوری صاحبؒ اور ان کی جماعت کے نزدیک تو ماشاء اللہ تعالیٰ محمدؒ بن اسحاق مکحولؒ نافعؒ اور دیگر جو راوی ان کی تائید میں پیش کئے گئے ہیں سب ثقہ اور قابلِ اعتماد ہیں ورنہ وہ ان کی روایتوں سے ہرگز استدلال نہ کرتے وہ ان رواۃ میں سے کس کو راجح اور کس کو مرجوح اور کس کو ثقہ اور ضعیف کہیں گے؟ اور ہمارے نزدیک بھی وہ ضعیف اور کمزور اور غیر معتبر ہونے میں برابر ہیں یہ الگ بات ہے کہ ان میں کوئی کذاب ہے اور کوئی دجال، کوئی مجہول ہے اور کوئی متروک کوئی لیس بالمتین ہے اور کوئی ضعیف اور ہمارے نزدیک بھی کسی کو کسی پر ترجیح نہیں ہے لہٰذا باتفاق فریقین وجوہ برابر ہیں اور حدیث یقیناً مضطرب ہے اسمیں شک نہیں مؤلف خیر الکلام لکھتے ہیں کہ ترجیح بعض دفعہ خارجی امور سے بھی ہوتی ہے الخ (ص۲۴۰) مگر اس وقت جب روایتیں صحت میں برابر ہوں ضعیف روایات میں تطبیق کی کیا ضرورت ہے؟ اور دوسری شق اس لیے مردود ہے کہ اگرچہ یہ صحیح ہے کہ جب حدیث کے مسند اور مرسل ہونے کا جھگڑا ہو تو حدیث مسند ہی ہوگی لیکن اس کے لیے اصولی اور بنیادی شرط یہ بھی تو ہے کہ رفع کرنے والا راوی ثقہ ہو اور اس کی سند صحیح ہو اور ان پیش کردہ روایات میں کوئی سند بھی صحیح نہیں ہے اور راوی کوئی کذاب و دجال ہے اور کوئی مجہول و متروک کوئی مدلس ہے اور کوئی غیر معتبر۔ اندریں حالات ان روایت کو صحیح قرار دینا نہ صرف یہ کہ تعصب پر مبنی ہے بلکہ انصاف کا بھی خون کرنا ہے۔

پانچواں جواب یہ روایت مرفوع نہیں بلکہ موقوف ہے۔

یہ روایت خلف الامام کی قید سے موقوف ہے چنانچہ شیخ الاسلام ابن تیمیہؒ لکھتے ہیں :۔

وضعفه ثابت بوجوہ وانما هو قول عبادةؓ بن الصامت (تنوع العبادات ص۸۶)

کہ یہ حدیث کئی وجوہ سے ضعیف اور معلول ہے اور یہ مرفوع بھی نہیں بلکہ حضرت عبادہؓ بن الصامت کا قول ہے۔

اور دوسرے مقام پر لکھتے ہیں کہ :۔

وهذا الحديث معلل عن ائمة الحديث كاحمد وغيره من الائمة وقد بسط الكلام على ضعفه في غير هذا الموضع وبيّن ان الحديث الصحيح قول رسول الله صلى الله عليه وسلم لا صلوٰة الا بام القرآن فهذا هو الذي اخرجاه في الصحيح ورواه الزهري عن محمود بن الربيع عن عبادةؓ اما الحديث فغلط فيه بعض الشاميين واصله ان عبادةؓ كان يوما في بيت المقدس فقال هذا فاشتبه عليهم المرفوع بالموقوف على عبادةؓ اھ

(فتاوی جلد ۲ ص۱۴۱)

اس حدیث کو امام احمدؒ بن حنبلؒ وغیرہ ائمہ حدیث نے معلول قرار دیا ہے اور کسی دوسرے مقام میں نہایت شرح وبسط کے ساتھ اسکا ضعف بیان کیا گیا ہے اور اس کی وضاحت کی گئی ہے کہ آنحضرت صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کی صحیح حدیث جو بخاری ومسلم میں موجود ہے اور جس کو امام زہریؒ محمودؒ بن ربیع کے طریق سے حضرت عبادہؓ سے روایت کرتے ہیں صرف یہ ہے کہ سورۃ فاتحہ کے بغیر نماز نہیں ہوتی ، رہی یہ حدیث جس میں خلف الامام کی زیادت ہے۔ تو اس میں بعض شامی راویوں کی غلطی شامل ہے وہ یہ کہ حضرت عبادہؓ بن الصامت نے ایک دن بیت المقدس میں یہ حدیث بیان کی اور اپنا قول خلف الامام کی قید والا بھی انہوں نے بیان کیا سو راویوں پر مرفوع حدیث اور موقوف قول مشتبہ اور غلط ملط ہو گیا۔

شیخ الاسلامؒ کی یہ عبارت نص صریح ہے کہ کمزور ضعیف اور لیس بالمتین قسم کے راویوں نے حضرت عبادہؓ بن الصامت کے موقوف قول کو جناب رسول خدا صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کی مرفوع حدیث میں ملا دیا ہے حالانکہ مرفوع حدیث میں خلف الامام کا ذکر تک نہیں ہے۔ القصہ خلف الامام کی قید سے روایت مرفوع نہیں بلکہ یہ غلط کار راویوں کی کرم فرمائی ہے۔ اور اسی کے بل بوتے پر فریق ثانی چیلنج کرتا ہے مؤلف خیر الکلام لکھتے ہیں کہ شیخ الاسلامؒ کے اس حدیث کو معلل کہنے کی وجہ ان کے خیال میں مکحولؒ کا تفرد ہے اور مرفوع وموقوف میں کوئی تعارض

نہیں مرفوع کو ترجیح ہوتی ہے خود بعض حنفیہ کو اس کا اقرار ہے (محصلہ صفحہ ۲۴۰) الجواب :۔ شیخ الاسلامؒ تفرد کی وجہ سے نہیں بلکہ اس راوی کی کھلی غلطی کی وجہ سے اس حدیث کو معلل کہتے ہیں اور مرفوع کو موقوف پر وہاں پر ترجیح ہوتی ہے جہاں مرفوع کی سند بھی صحیح ہو اور یہاں بخاریؒ وغیرہ کی روایت کو وہ صحیح اور خلف الامام والی کو معلول قرار دے رہے ہیں۔

چھٹا جواب اِلَّا بِاُمِّ الْقُرْآن کی استثنا ضعیف ہے

جن حدیثوں میں خلف الامام اور الا بام القرآن وغیرہ کی زیادت مروی ہے اور جو نقل کی جا چکی ہیں ان کی روایتی حقیقت تو آپ کو معلوم ہو چکی ہے ان کے اعادہ کی ضرورت نہیں ہے بقیہ کا حال سن لیجئے: ایک روایت حضرت ابو قتادہؓ سے مرفوعاً مروی ہے جس میں الا بام القرآن کی استثناء مذکور ہے لیکن علامہ ہیثمیؒ لکھتے ہیں فیه رجل لم یسم (مجمع الزوائد جلد ۲ ص ۱۱۱) کہ اس میں مجہول راوی ہے۔ ایک مرفوع روایت حضرت عبد اللہؓ بن عمروؓ سے مروی ہے اور اس میں بھی الا بام القرآن کی زیادت مروی ہے لیکن سند میں مسلمہؒ بن علیؒ ہے جو ضعیف ہے (مجمع الزوائد جلد ۲ ص ۱۱۱) امام ابن معینؒ اور دحیمؒ اس کو لیس بشیء کہتے ہیں امام بخاریؒ اور ابو زرعہؒ منکر الحدیث کہتے ہیں، ابن حبانؒ اس کو ضعیف الحدیث اور منکر الحدیث کہتے ہیں، جوزجانیؒ، یعقوبؒ بن سفیانؒ، نسائیؒ، دارقطنیؒ اور برقانیؒ سب اس کو متروک الحدیث کہتے ہیں ابو علی نیشاپوریؒ، ابن عدیؒ اور ابن یونسؒ سب اس کو ضعیف کہتے ہیں۔ ابو احمد حاکمؒ اس کو ذاہب الحدیث کہتے ہیں ازدیؒ ابن المنادیؒ، ساجیؒ، ابو داؤدؒ، اور حاکمؒ تمام اس کی تضعیف کرتے ہیں اور لکھا ہے کہ یہ منکر اور جعلی و من گھڑت روایتیں بیان کیا کرتا تھا۔ (تہذیب التہذیب جلد ۱۰ ص ۱۴۶/۱۴۷) ایک روایت اسی مضمون کی معجم صغیر طبرانی ص ۱۳۳ میں آتی ہے لیکن سند میں عبد اللہؓ بن لہیعہؒ ہے جس کا ذکر بحث خداج میں ہو چکا ہے اسی مضمون کی ایک روایت جزء القراءۃ ص ۱۴ کتاب القراءۃ ص ۴۶، ص ۵۱ اور تحقیق الکلام جلد ۱ ص ۹۳ میں ہے لیکن اس کی سند میں عمروؒ بن شعیبؒ الخ کے علاوہ عکرمہؒ بن عمارؒ ہے ابن حجرؒ ان کو غلط کار بتاتے ہیں (تقریب ص ۲۹۸) امام احمدؒ اس کو ضعیف الحدیث کہتے ہیں۔ (میزان جلد ۲ ص ۲۰۷) ایک روایت یہ پیش کی گئی ہے کہ حضرت جبرؓ نے فرمایا میں نے آنحضرت صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کے پیچھے قرأت کی آپ نے فرمایا اے جبرؓ اپنے پروردگار کو سناؤ مجھے نہ سناؤ

اوّلاً تو اس روایت میں اِلَّا بِاُمِّ الْقُرْاٰن کی استثنار مذکور نہیں ہے وثانیاً علامہ ہیثمیؒ لکھتے ہیں کہ اس کی سند میں عبد اللہؒ بن جبیرہؒ مجہول ہے لم اجد من ذکرہ (مجمع الزوائد جلد ۲ ص۱۱۱) اس کا ذکر مجھے کہیں نہیں مل سکا الغرض الا بام القرآن کی استثنار کسی صحیح سند سے ثابت نہیں ہے چنانچہ امام الجرح والتعدیل امام ابن معینؒ فرماتے ہیں ہیں کہ الا بام القرآن کی استثنار کسی بھی صحیح حدیث سے ثابت نہیں ہے (حاشیہ نسائی جلد ا ص۱۰۶ و اعلاء السنن جلد ۴ ص۱۰۷) الحاصل صحیح روایت صرف وہی ہے جو بخاری اور مسلم وغیرہ میں موجود ہے جس میں نہ تو خلف الامام کا ذکر ہے اور نہ خلف الامام کے بعد الا بام القرآن کا پیوند موجود ہے ، ہاں اس کے دیگر طرق میں فصاعداً ما تیسر اور ما زاد کی زیادت بسند صحیح موجود ہے اور یہ ضعیف ، مجروح اور لیس بالمتین قسم کے راویوں کی کارستانی ہے کہ وہ کبھی تو الا بام القرآن کا اضافہ کر دیتے ہیں اور کبھی خلف الامام کا پنکچر ساتھ لگا دیتے ہیں بخلاف ثقہ ، ثبت اور حجت قسم کے راویوں کے کہ وہ پوری دیانت اور صداقت کے ساتھ مرفوع روایت کو اس طرح نقل کرتے ہیں :۔

کل صلوٰۃ لا یقرأ فیھا بام الکتاب فھی خداج الا خلف امام (کما مرّ مفصلاً)	کہ ہر وہ نماز جس میں سورۃ فاتحہ نہ پڑھی جائے تو وہ ناقص ہوتی ہے ہاں البتہ وہ نماز جو امام کے پیچھے پڑھی جائے ۔

ساتواں جواب لفظ خلف امام مدرج ہے

شیخ الاسلام ابن تیمیہؒ کے حوالہ سے پہلے نقل کیا جا چکا ہے کہ خلف الامام کا جملہ جناب رسول اللہ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کا فرمان نہیں بلکہ یہ حضرت عبادہؓ بن الصامت کا قول ہے اور بعض غلط کار راویوں نے اس کو مرفوع حدیث میں درج کر دیا ہے حضرت مولانا خلیل احمد صاحبؒ سہارنپوری (المتوفی ۱۳۴۶ھ) فرماتے ہیں کہ خلف الامام کا لفظ شاذ ہے کیونکہ ثقات محدثینؒ اس کو نقل نہیں کرتے امام بیہقیؒ وغیرہ نے گو اس حدیث کے صحیح ہونے کا دعویٰ کیا ہے ۔ (اور اس کے اثبات کیلئے ہاتھ پاؤں بھی مارے ہیں صفدر) مگر یہ زیادت بہر حال ضعیف ہے (بذل المجہود جلد ۲ ص۵۵) حضرت مولانا سید محمد انور شاہ صاحبؒ لکھتے ہیں کہ لفظ خلف الامام یقیناً اور قطعاً مدرج ہے اگر کوئی شخص اس کے مدرج ہونے پر قسم کھائے تو وہ ہرگز حانث نہ ہوگا (فصل الخطاب ص۹۷) مؤلف خیر الکلام کا اس دعوائی ادراج کو صریح جھوٹ کہنا (ملاحظہ ہو ص۲۲۹) نرا تعصب ہے جو قطعاً مردود ہے شیخ الاسلامؒ کی عبارت پہلے گذر چکی ہے اور

اس پر ائمہ حدیث کے ٹھوس دلائل قائم کیے ہیں نرے احتمال سے ادراج کا دعویٰ نہیں ہے۔ اور حافظ ابن حجرؒ کے حوالے کہ محض احتمال سے ادراج ثابت نہیں ہو سکتا بالکل صحیح ہیں مگر یہ ادراج احتمال سے نہیں بلکہ دلائل سے ثابت ہے۔ فریق ثانی کے نزدیک زہریؒ بھی اپنا قول حدیث میں ملا دیا کرتے تھے شاید کہ خلف الامام کا لفظ انہوں نے ملا دیا ہو اور بقول شیخ الاسلامؒ شامی راویوں کی غلطی بھی کوئی مخفی بات نہیں اور کیا بعید ہے کہ یہ محمدؒ بن اسحاقؒ کے دجل اور کذب کا ہی کرشمہ ہو اور محمد بن یحییٰ الصفارؒ پر کس نے یہ پابندی عائد کی ہے کہ وہ اس زیادت کو بطور تفقہ کے استاد محترم کی طرح اس حدیث میں مدرج نہ کر سکیں؟ بہرحال کوئی بھی اس کا مرتکب ہوا ہو یہ یقینی بات ہے کہ خلف الامام کا لفظ مدرج ہے اور راقم کہتا ہے کہ قرین قیاس یہ ہے کہ یہ مکحولؒ کا مدرج ہے کیونکہ محدثین کی ایک جماعت ان میں کلام کرتی ہے اور وہ لیس بالمتین بھی تھے اور مکحولؒ کا شامی ہونا اظہر من الشمس ہے اور نظر بظاہر شیخ الاسلامؒ کی عبارت کا رخ بھی انہیں کی طرف ہے اور یہ قرین انصاف بھی ہے اس لیے کہ امام زہریؒ سے ثقات اور حفاظ کی ایک جماعت یہ روایت نقل کرتی ہے اور ان کی روایت میں خلف الامام کا لفظ نہیں لیکن جب مکحولؒ روایت کرتے ہیں تو اس میں خلف الامام کا پیوند بھی ساتھ ہی ملتا ہے۔ اب آپ نہایت اختصار کے ساتھ اجمالی طور پر ان راویوں کا ذکر سن لیں جو امام زہریؒ سے روایت کرتے ہیں مگر خلف الامام کا پیوند ساتھ نہیں ملاتے۔

(۱) امام سفیانؒ بن عیینہؒ (مسلم جلد ۱ صفحہ ۱۶۹ و ابو عوانہ جلد ۲ صفحہ ۱۲۴ و جزء القراۃ صفحہ ۲) (۲) امام یونسؒ (مسلم و ابو عوانہ جلد ۲ صفحہ ۱۲۵) (۳) امام صالحؒ (مسلم، ابو عوانہ صفحہ ۱۲۴) (۴) امام معمرؒ (مسلم جلد ۱ صفحہ ۱۶۹ و ابو عوانہ جلد ۲ صفحہ ۱۲۴) (۵) امام مالکؒ (موطا صفحہ ۲۹ و جزء القراۃ صفحہ ۲۳ و صفحہ ۵۵) (۶) امام ابن جریجؒ (کتاب القراۃ صفحہ ۹۶) (۷) امام لیثؒ بن سعدؒ (جزء القراۃ صفحہ ۲۳) (۸) امام قرۃؒ بن عبدالرحمٰنؒ (کتاب القراۃ صفحہ ۱۰) (۹) امام عقیلؒ (ایضاً) (۱۰) امام اسحاقؒ بن عبدالرحمٰن مدنیؒ (ایضاً) (۱۱) امام اوزاعیؒ (ایضاً) (۱۲) امام شعیبؒ بن ابی حمزہؒ (ایضاً) (۱۳) امام موسیٰؒ بن عقبہؒ (معجم صغیر طبرانی صفحہ ۴۲) (۱۴) امام عثمانؒ بن عمرؒ بواسطہ یونسؒ (مسند حمیدی صفحہ ۱۳۶ و کتاب القراۃ صفحہ ۱۰) وغیرہ وغیرہ

یہ تمام جو حدیث و فقہ کے مسلم امام ہیں امام زہریؒ سے یہ روایت نقل کرتے ہیں۔ لیکن ان میں کوئی بھی خلف الامام کا ذکر نہیں کرتا اور جب مکحولؒ اور ابن اسحاقؒ وغیرہ ضعیف کمزور اور لیس بالمتین راویوں کی

باری آتی ہے تو اُن کی روایت میں خلف الامام کا پیوند اور پیچز بھی ساتھ ہی ملتا ہے اگر ابن اسحاقؒ وغیرہ ثقہ اور ثبت ہوتے تو ان کی یہ زیادت قابل قبول ہوتی اور جمہور کا اس پر عمل ہوتا مگر ان حالات میں جن کا مفصل ذکر ہو چکا ہے کہ وہ ضعیف اور لیس بالمتین ہیں اس زیادت کی کیا وقعت باقی رہ جاتی ہے؟ اور اس کو سننے کے لیے کون آمادہ ہے؟ امام بیہقیؒ لکھتے ہیں کہ محدث ابن خزیمہؒ کا بیان ہے کہ اگر کوئی ثقہ اور حافظ راوی زیادت بیان کرے اور دیگر ثقات حفاظ اور متقنین نے وہ بیان نہ کی ہو تو ہم ایسی زیادت کا انکار نہیں کرتے لیکن اگر کوئی ایسا راوی زیادت نقل کرتا ہو جو حفظ و اتقان میں ان حفاظ اور ثقات کا ہم پلہ نہ ہو تو اس کی زیادت قبول نہیں کی جا سکتی (کتاب القراۃ ص ۹۵) خیر یہ تو عام ثقات کی زیادت کا ذکر ہوا امام زہریؒ کی روایت میں زیادت کا ضابطہ بھی سُن لیجیے جو حضرت امام مسلمؒ نے اپنی صحیح کے مقدمہ میں بیان کیا ہے چنانچہ وہ لکھتے ہیں۔ کہ حضرات محدثین کرامؒ کا زیادت کے بارے میں مسلک یہ ہے کہ اگر چند ثقات اور حفاظ کسی حدیث کو بیان کریں پھر ان ہی ثقات میں کوئی ثقہ زیادت نقل کرے جو دوسروں کے پاس نہیں ہے تو یہ زیادت قابل قبول ہوگی لیکن اگر کوئی راوی امام زہریؒ جیسے امام سے جن کے بکثرت تلامذہ موجود ہیں اور حفاظ اور متقنین بھی ہیں یا ہشامؒ بن عروہؒ جیسے امام سے ان کی مروی حدیث میں کوئی ایسی زیادت نقل کرے جو اُن کے تمام دیگر ثقات تلامذہ بیان نہیں کرتے اور اُن کی یہ حدیث بھی اہل علم کے ہاں مشہور و معروف ہو اور زیادت نقل کرنے والا ان ثقات کے ساتھ شریک بھی نہ ہو، فغیر جائز قبول هذا الضرب من الناس (مقدمہ مسلم جلد ۱ ص ۵) تو اس قسم کے راویوں کی زیادت ہرگز جائز نہیں ہے کہ قبول کی جائے اندریں حالات امام زہریؒ کی حدیث میں محمدؒ بن اسحاقؒ، مکحولؒ اور نافعؒ وغیرہ کذاب و دجال ضعیف و کمزور مجہول و مستور مدلس اور لیس بالمتین وغیرہ کی زیادت کون قبول کرتا ہے؟ اس پوری تشریح کے بعد مزید کسی بحث کی ضرورت تو نہیں لیکن ایک شبہ کا ازالہ ضروری ہے وہ یہ کہ مبارک پوریؒ صاحب حضرت عبادہؓ بن الصامت کی روایت (بزیادت لفظ خلف الامام) کی تصحیح اور تحسین کا یہ ثبوت پیش کرتے ہیں کہ امام ترمذیؒ نے اس حدیث کی تحسین کی ہے امام حاکمؒ اور دارقطنیؒ اس کی تصحیح کرتے ہیں امام خطابیؒ فرماتے ہیں کہ اس کی سند جید ہے اور اس میں کوئی طعن نہیں ہے لا مطعن فیہ مولانا محمد عبدالحیؒ صاحب لکھنویؒ لکھتے ہیں اس کی سند قوی ہے اس لیے یہ حدیث صحیح اور حسن ہے

(محصلہ ابکار المنن وغیرہ ص۱۲۳) اگر اس سند کے راوی ثقہ ہوتے یا ان میں معمولی کلام اور جرح ہوتی یا ائمہ جرح و تعدیل میں اکثریت نے ان کی توثیق کی ہوتی اور یہ اکابر اس سند کو صحیح، حسن جید اور قوی کہتے تو سر اور آنکھوں پر ان کی بات حجت تھی مگر اس کو کیا کیا جائے کہ کذاب و دجال قسم کے راوی اس میں موجود ہیں اور بتصریح حضرات محدثینؒ احکام و سنن میں ان کی روایت حجت ہی نہیں ہو سکتی اور اس سند کی کڑی میں مجہول و مستور اور لیس بالمتین قسم کے اور راوی بھی ساتھ شریک ہو جائیں تو اس سند میں کیا قوت باقی رہ جاتی ہے؟ خصوصاً جب کہ تصحیح اور تحسین کرنے والے متساہل بھی ہوں۔

امام ترمذیؒ کی تحسین :۔ علامہ ذہبیؒ ایک جگہ لکھتے ہیں کہ اس مقام میں امام ترمذیؒ نے اس حدیث کی تحسین کی ہے لیکن اچھا نہیں کیا (تہذیب التہذیب جلد۹ ص۱۲۱) اسی طرح ابو غالبؒ کی حدیث کی امام ترمذیؒ نے تصحیح کی ہے علامہ ذہبیؒ لکھتے ہیں کہ امام نسائیؒ اس کو ضعیف کہتے ہیں اور ابن حبانؒ کہتے ہیں کہ اس سے احتجاج ہی صحیح نہیں ہے (ایضاً جلد۱۲ ص۲۳۱) حافظ ابن القیمؒ لکھتے ہیں کہ کثیرؒ بن عبد اللہؒ کی حدیث پر امام احمدؒ نے قلم پھیر دیا تھا اور یہ فرماتے تھے کہ وہ محض ہیچ ہے لیکن امام ترمذیؒ کبھی اس کی حدیث کی تصحیح کرتے ہیں اور کبھی تحسین (زاد المعاد جلد۱ ص۱۷۳) مولانا شمس الحق صاحبؒ لکھتے ہیں کہ اس حدیث میں امام ترمذیؒ کی تصحیح و تحسین پر کسی نے ان سے اتفاق نہیں کیا (تعلیق المغنی جلد۱ ص۲۲۲) شیخ الاسلامؒ لکھتے ہیں کہ محدثین امام ترمذیؒ کی تصحیح پر اعتماد نہیں کرتے (فتح الملہم جلد۲ ص۴۳۰) آثار متبوعہ میں (جو ایک غیر مقلد عالم کی تالیف ہے) لکھا ہے رہی تصحیح و تحسین تو امام ترمذیؒ اس میں متساہل ہیں (بحوالہ ازہار مرفوعہ ص۴) مبارکپوری صاحبؒ لکھتے ہیں کہ امام ترمذیؒ کی تحسین پر کوئی اعتبار نہیں کیونکہ وہ متساہل تھے (تحفۃ الاحوذی جلد۱ ص۲۰۴ و ص۲۲۰ و ص۲۲۸ و ص۳۷۶ و ابکار المنن ص۱۸۱ و ص۲۳۶ اور یہ عبارت ابکار ص۲۰۲ کی ہے) اور دوسرے مقام پر لکھتے ہیں کہ اگرچہ امام ترمذیؒ نے اس حدیث کی تصحیح کی ہے لیکن ان کی تصحیح میں کلام ہے۔ (ابکار المنن ص۵۴) امام ترمذیؒ کی تصحیح قابل تنقید ہے کیونکہ وہ معصوم نہیں الخ ص۲۴۲)

امام حاکمؒ کی تصحیح :۔ علامہ ذہبیؒ لکھتے ہیں کہ امام حاکمؒ مستدرک میں موضوع اور جعلی حدیثوں تک کی تصحیح کر جاتے ہیں (تذکرہ جلد۳ ص۲۳۱) اور دوسرے مقام پر لکھتے ہیں کہ امام حاکمؒ ساقط الاعتبار حدیثوں کی بھی تصحیح کر جاتے ہیں (میزان جلد۳ ص۸۵) شیخ الاسلام ابن تیمیہؒ لکھتے ہیں کہ امام حاکمؒ موضوع اور جعلی حدیثوں کی بھی تصحیح کر جاتے ہیں (کتاب التوسل ص۱۰۱) علامہ ابن دحیہؒ لکھتے ہیں کہ امام حاکمؒ

کثیر الغلط تھے ان کے قول سے گریز کرنا چاہیئے (مقدمہ زیلعی ص۱۱) نواب صدیق حسن خاں صاحبؒ لکھتے ہیں کہ تصحیح حاکم پیش علماء حدیث بدون شہادت دیگر ائمہ فن لیس بشئی است (دلیل الطالب ص۱۹)۔ مبارکپوری صاحبؒ ایک مقام پر لکھتے ہیں کہ حاکم کی تصحیح میں کلام ہے (ابکار ص۳۴) اور دوسرے مقام پر لکھتے ہیں کہ امام حاکمؒ کا تساہل علماء فن کے نزدیک معروف و مشہور ہے (ایضاً ص۲۳۶) مؤلف خیر الکلام لکھتے ہیں کہ اسی طرح امام حاکمؒ کی تصحیح بھی قابل تنقید ہے الخ (ص۲۴۳)

امام دار قطنیؒ کی تصحیح کا بھی چنداں اعتبار نہیں ہے۔ وہ ایک ہی راوی کو کبھی ثقہ اور کبھی ضعیف کہہ دیتے ہیں جیسا کہ پہلے اوپر ذکر کیا جا چکا ہے اور محمد بن اسحاقؒ کے بارے میں تو امام دار قطنیؒ نے یہ فرمایا ہے کہ اس سے احتجاج صحیح نہیں ہے پھر ان کی ایسی تصحیح کا کیا اعتبار ہو سکتا ہے؟ خصوصاً جب کہ جمہور ائمہ جرح و تعدیل دوسری طرف ہوں۔

امام خطابیؒ کا یہ فرمانا کہ اس حدیث کی سند جید ہے محل تعجب ہے محمد بن اسحاقؒ پر اشد جرح موجود ہے مکحولؒ لیس بالمتین اور مدلس تھے، نافعؒ مجہول و مستور ہے، حدیث مضطرب ہے بقیہ خلف الامام یہ حدیث موقوف ہے اور یہ زیادت مدرج ہے اتنی خرابیاں ہوتے ہوئے بھی اگر یہ حدیث جید ہے تو انکی تصحیح و تضعیف کے بارے میں شاید اصطلاح ہی کوئی الگ اور جداگانہ ہوگی۔ ہاں البتہ امام خطابیؒ کا یہ ارشاد مبنی بر انصاف ہے کہ اس میں طعن نہیں ہے (لا مطعن فیہ) یہ بالکل صحیح ہے کیونکہ اس میں مطعن نہیں ہے کئی مطاعن ہیں بلکہ یہ گنجینۂ مطاعن ہے جیسا کہ آپ تفصیلاً ملاحظہ کر چکے ہیں۔

مولانا ابو الحسنات محمد عبد الحی صاحب لکھنویؒ اپنے وقت کے متبحر عالم اور وسیع النظر فقیہ اور محقق تھے لیکن نہ تو وہ ائمہ جرح و تعدیل میں سے تھے اور نہ بغیر کسی سند کے ان کا کوئی قول معتبر ہو سکتا ہے (دیکھئے مقدمہ زیلعی ص۴۲ وغیرہ) رواۃ کی جرح و تعدیل میں وہ تو صرف ہماری طرح کے ناقل ہیں۔ لہذا ان اکابر کا اس حدیث کو صحیح، حسن، جید اور قوی کہنا کوئی معنی اور پوزیشن نہیں رکھتا اور نہ ان کے کہنے سے کذاب و دجال مجہول و مستور راوی ثقہ ہو سکتے ہیں۔

امام بیہقیؒ نے بھی اس حدیث کی تصحیح کی ہے مگر ان کی یہ تصحیح بھی قابل اعتماد نہیں ہے کیونکہ سند کا حال آپ دیکھ ہی چکے ہیں شیخ الاسلام ابن تیمیہؒ قاعدہ جلیلہ میں لکھتے ہیں کہ امام بیہقیؒ تعصب سے کام لیتے ہیں اور بسا اوقات ایسی روایتوں سے احتجاج کرتے ہیں کہ اگر ان کا کوئی مخالف ان سے

استدلال کرے تو اس کی تمام کمزوریاں ظاہر کیے بغیر ان کو چین نہ آئے (دیکھئے بلغیۃ الالمعی جلد ۲ صہ ۸) امام بیہقیؒ ایک مقام پر صلوٰۃ وتر کے عدم وجوب پر عاصمؒ بن ضمرۃؒ کی روایت سے استدلال کرتے ہیں (سنن الکبریٰ جلد ۲ صہ ۸) اور دوسرے مقام پر لکھتے ہیں کہ عاصمؒ بن ضمرۃؒ لیس بالقوی (ایضاً جلد ۲ صہ ۱۷۳) اور ایک سند کے متعلق جس میں جواب تیمیؒ ہے لکھتے ہیں رواتہ کلھم ثقات کہ اس کے سب راوی ثقہ ہیں (سنن الکبریٰ جلد ۱ صہ ۴۶) اور دوسرے مقام پر لکھتے ہیں جواب التیمیؒ غیر قوی (جلد ۵ صہ ۲۳۵) جواب تیمیؒ قوی نہیں ہے وغیرہ وغیرہ مبارکپوری صاحب لکھتے ہیں۔ امام بیہقیؒ اگرچہ محدث مشہور ہیں مگر ان کا کوئی قول بلا دلیل معتبر نہیں ہو سکتا (بلفظہٖ تحقیق الکلام جلد ۲ صہ ۳۲) بلاشبہ ان اکابرین کا امت محمدیہ (علیٰ صاحبہا الف الف تحیۃ) پر بہت بڑا احسان ہے کہ انہوں نے قرآن کریم کے علاوہ اپنے پیارے نبی کی پیاری حدیثیں بھی امت تک پہنچائیں اور ساری عمریں اس خدمت میں صرف کر دیں لیکن تحقیق و تفحص کے میدان میں جب قدم آگے بڑھایا تو بسا اوقات کسی راوی اور حدیث کے متعلق ان کو نظریہ بدلنے کی ضرورت محسوس ہوئی اور اپنی سابق رائے کو ترک کرنا پڑا اور کسی موقع پر بمقتضائے بشریت فروعی مسائل میں تعصب سے بھی کام لیا گیا ہے لیکن حضرات انبیاء کرام علیہم السلام کے بغیر معصوم کون ہے؟ اور تحسینی طور پر بغیر اس تنازع کے احادیث کی چھان بین بھی کہاں ہو سکتی تھی؟ باوجود اس جزوی اور فروعی اختلاف کے ہمارے لیے وہ قابلِ صد احترام ہیں جہاں انہوں نے سونے کی بوریاں کمائیں مٹھی خاک کی بھی ان میں ڈال دی مگر ہمارے پاس نیکیوں کا کون سا ذخیرہ ہے؟ اس لیے ہمیں اپنے گناہوں میں اضافہ کرنے کی غرض سے چن چن کر ان کی خطائیں اور لغزشیں ملانے کی ہرگز ضرورت نہیں ہے۔

آٹھواں جواب:۔ آپ ملاحظہ کر چکے ہیں کہ خلف الامام کی قید کے ساتھ حضرت عبادہؓ بن الصامتؓ کی یہ روایت نہ صرف یہ کہ انتہائی درجہ کی ضعیف کمزور اور معلول ہے بلکہ یہ الفاظ ہی مدرج ہیں اور یہ اوراج بھی لبس بالمتین قسم کے راویوں کی غلطی کا شاخسانہ ہے جو بہر حال مردود ہے اندریں حالات اس روایت کے بارے میں مزید کچھ کہنے کی ضرورت نہیں پڑتی لیکن اگر بالفرض یہ روایت صحیح بھی ہو تو اس کا ایسا مطلب اور معنیٰ کیوں نہ کر لیا جائے جو قواعد عربی کے موافق ہو اور ایسا معنیٰ مراد لینے سے صحیح احادیث کے ساتھ تطبیق کی صورت بھی نکل آئے اور صحیح احادیث کی مخالفت لازم نہ آئے اور یہ بات زیادہ قرین انصاف ہے کہ واذا قرا فانصتوا وغیرہ کی صحیح روایات کو اپنے مقام پر رکھا جائے

اور کمزور قسم کی روایات میں مناسب تاویل کرلی جائے نہ یہ کہ کمزور اور معلول روایتوں کو اصل قرار دیا جائے اور صحیح احادیث میں بیجا تأویلات کا دروازہ کھول دیا جائے۔ خلف کا معنیٰ مکانی بھی ہوسکتا ہے اور زمانی بھی خلف الامام کا ثانی معنیٰ مدنظر رکھ کر مطلب یہ ہوگا کہ جس آدمی نے امام کے فارغ ہونے کے بعد اپنی بقیہ رکعات میں سورۂ فاتحہ نہ پڑھی تو اس کی نماز نہ ہوگی اس لحاظ سے یہ روایت مسبوق کے حق میں ہوگی۔ فن حدیث سے تعلق رکھنے والے اس امر سے بخوبی واقف ہیں کہ مختلف احادیث کی آپس میں تطبیق کے لیے بسا اوقات محض فرضی باتیں بھی اختیار کی جاتی ہیں اور یہ معنیٰ تو روزمرہ کے معمولات اور مشاہدات میں ہے کہ امام کے فارغ ہونے کے بعد وہ مقتدی جو مسبوق ہوتا ہے اپنی بقیہ رکعات میں باقاعدہ سورۂ فاتحہ پڑھتا ہے اور کون نمازی ایسا ہوگا جس کے ساتھ کبھی یہ صورت نہ پیش آئی ہو۔ رہا وہ مقتدی جو اوّل سے آخر تک حقیقۃً امام کے پیچھے کھڑا ہو یا حکماً امام کے پیچھے ہو جیسے لاحق وغیرہ تو اس کا مسئلہ ہی الگ ہے اس کو امام کے پیچھے قرأت کرنے کی مطلقاً گنجائش نہیں جس کی پوری تفصیل جلد اوّل میں گذر چکی ہے۔

مؤلف خیر الکلام لکھتے ہیں کہ یہ تاویل راوی حدیث حضرت عبادہؓ کے مسلک کے خلاف ہے اور خود حنفی مسلک میں فراغت امام کے بعد سورۂ فاتحہ کے ساتھ کچھ اور بھی پڑھنے کا حکم ہے یہ تاویل نہیں بلکہ تحریف ہے (محصلہ ص۲۴۶) الجواب:۔ یہ تاویل چونکہ دیگر صحیح روایات کے مطابق ہے اس لئے درست ہے روایت کے مقابلہ میں راوی کی رائے کا کوئی اعتبار نہیں ہوتا اور احناف سورۂ فاتحہ کے علاوہ مزید قرأت کے بھی فراغت کے بعد مسبوق کے لیے قائل ہیں مگر وہ مزید قرأت فصاعدًا۔ ماتیسر اور مازاد وغیرہ سے ثابت ہے اور ہم نے اس کا باقاعدہ (جلد ۱ ص۹۲ طبع اوّل میں) حوالہ دیا ہے جس کو مؤلف مذکور بالکل ہضم کر گئے ہیں لہٰذا یہ بالکل مناسب تأویل ہے جیں بجبیں ہونے کی ضرورت نہیں خلف الامام میں لفظ خلف مکان کے معنیٰ میں مستعمل ہونا تو فریق ثانی کے نزدیک بھی مسلم ہے البتہ خلف زمانی محل غور ہوسکتا ہے اس کی چند مثالیں سن لیں۔ (۱) وَقَدْ خَلَتِ النُّذُرُ مِنْ بَيْنِ يَدَيْهِ وَمِنْ خَلْفِهِ (پ۲۶۔ احقاف ۲۰) اور بے شک بہت سے ڈرانے والے حضرت ہود علیہ السلام کے آگے اور ان کے پیچھے گذر چکے ہیں۔ یہاں مِنْ خَلْفِهِ میں خلف زمانی مراد ہے کیونکہ ڈرانے والے پیغمبر حضرت ہود علیہ السلام کے پیچھے صف بندی کر کے کھڑے نہ تھے جیسا کہ ظاہر ہے بلکہ وہ ڈرانے والے، رسول اور نبی مراد ہیں جو ان کے زمانہ کے بعد دنیا میں آئے (۲) یتامیٰ کے اموال میں بے اعتدالی کرنے والوں کو

اللہ تعالیٰ اپنا شاہی حکم سناتا ہے لَوْ تَرَكُوا مِنْ خَلْفِهِمْ ذُرِّيَّةً ضِعَافًا الآية (پ، النساء ۱) یعنی اگر وہ لوگ اپنے پیچھے کمزور اور ضعیف اولاد چھوڑ جاتے اور خود راہی ملکِ بقا ہو جاتے تو ان کو اپنی اولاد کی ضرور فکر ہوتی اسی طرح دوسروں کے یتیموں کا خیال بھی کرنا چاہیے اس مقام میں بھی من خلفھم سے خلفت زمانی مراد ہے کیونکہ اولاد اپنے والدین کی وفات کے بعد دنیا میں اپنے بھلے برے دن پورے کر کے اپنی زندگی کا زمانہ گذارتی ہے نہ یہ کہ جس مقام پہ والدین ہوتے ہیں وہاں ان کے پیچھے لام بندی کر کے صف آراء ہوتی ہے اسی طرح حضرات شہداء کرامؓ کے بارے میں ارشاد ہوتا ہے۔

وَيَسْتَبْشِرُونَ بِالَّذِينَ لَمْ يَلْحَقُوا بِهِمْ مِنْ خَلْفِهِمْ (پ۴۔ ال عمران ۔ ۱۷)

اور وہ شہداء خوش وقت ہوتے ہیں ان کے بارے میں جو ان کے پیچھے ہیں اور ابھی ان سے نہیں ملے۔

(۳) آنحضرت صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم چھوٹے چھوٹے لشکروں میں جہاد کے لیے شریک نہ ہونے کی وجہ یہ بیان فرماتے ہیں لولا ان اشق علی امتی ما قعدت خلف سریة ولو ددت انی اقتل فی سبیل اللہ الحدیث (بخاری جلد ۱ ص۱ وغیرہ) اگر مجھے یہ خوف نہ ہو کہ میرے شریک ہونے کی وجہ سے امت بھی ضرور شریک ہوگی اور مشقت میں مبتلا ہوگی تو میں کسی چھوٹے لشکر کے پیچھے بھی نہ رہتا اور میں اس کو پسند کرتا ہوں کہ اللہ تعالیٰ کے راستہ میں شہادت پاؤں۔ واضح امر ہے کہ آنحضرت صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم مجاہدین کے لشکروں کو روانہ کر کے جتنا زمانہ وہ جہاد میں مشغول رہتے تھے۔ آپ مدینہ طیبہ میں وہ زمانہ گذارتے تھے نہ یہ کہ آگے مجاہد کھڑے ہوتے تھے اور پیچھے آپ کھڑے ہوتے تھے۔ یہاں بھی خلفت زمانی ہے نہ کہ مکانی۔

(۴) آنحضرت صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا۔

وتسبحون وتحمدون وتکبرون خلف کل صلوٰۃ الحدیث (بخاری جلد ۱ ص۱۱۶ وابوعوانہ جلد ۲ ص۲۴۹)

تم ہر (فرضی) نماز سے فارغ ہو کر (۳۳ مرتبہ) سبحان اللہ اور (۳۳ مرتبہ) الحمدللہ اور (۳۴ بار) اللہ اکبر کہا کرو۔

اس روایت میں بھی خلفت زمانی ہے کیونکہ سبحان اللہ وغیرہ کلمات نماز سے فارغ ہونے کے بعد پڑھنے کا حکم ہے یہ مطلب تو ہرگز نہیں ہے کہ بحالت نماز امام کے پیچھے یہ کلمات پڑھنے کی اجازت ہے۔ حافظ ابن حجرؒ اس کا معنی یوں کرتے ہیں یقال عند الفراغ من الصلوٰۃ (فتح الباری ص۲۶۱ ج۲)

یہ کلمات نماز سے فارغ ہونے کے بعد پڑھنے چاہییں اور نواب صاحبؒ لکھتے ہیں :۔ مراد بخلف دریں جا دُبر صلاۃ است عقب خروج از آن (دلیل الطالب ص۳۲۴) (۵) صراح ص۳۴۱ میں لکھا ہے خلف قرنے بعد قرنے یعنی ایک زمانہ کے بعد دوسرا زمانہ (۶) امام ابن جریر طبریؒ مَا بَيْنَهَا وَمَا خَلْفَهَا کا معنی کرتے ہیں لما قبلها وما بعدها من الامم (تفسیر ابن جریر جلد ۱ ص۲۶۵) یعنی جو قومیں زمانہ کے لحاظ سے پہلے گذر چکیں اور جو بعد کو آئیں گی وعلیٰ ہذا القیاس قاضی بیضاویؒ، امام سیوطیؒ اور شاہ عبد العزیز دہلویؒ (المتوفی ۱۲۳۹ھ) وغیرہ حضرات مفسرین کرامؒ اس آیت میں خلف سے خلف زمانی مراد لیتے ہیں یعنی بعد کو آنے والی قومیں (دیکھئے بیضاوی ص۸۱، جلالین ص۱۲۸ اور عزیزی جلد ۱ ص۱۶۸ وغیرہ) اور مشہور تابعی ابو العالیہ الریاحیؒ بھی خلف زمانی ہی مراد لیتے ہیں (بخاری ص۶۴۳ ج۲) اسی طرح مشہور حدیث کلما هلك نبي خلفه نبي الحديث (بخاری جلد ۱ ص۴۹۱) اور حدیث من كل خلف عدوله الحديث (مشکوٰۃ جلد ۱ ص۳۶) وغیرہ میں خلف زمانی کا معنی ہی متعین ہے علاوہ بریں سلف وخلف کا جملہ کس سے مخفی ہے؟ یعنی جو لوگ زمانہ کے لحاظ سے پہلے ہوئے وہ سلف اور جو بعد کو آئے وہ خَلَف۔ نواب صاحب قاضی شوکانیؒ کو فخر خلف وبقیہ سلف لکھتے ہیں۔ (اتقصار ص۸۲) اگر انصاف سے دیکھا جائے تو یہ اور اس قسم کی دیگر مثالیں دیکھ کر یہ قوی وہم پیدا ہو جاتا ہے کہ خلف کا زیادہ تر استعمال خلف زمانی کے معنیٰ میں ہوتا رہا اور ہوتا ہے اس لیے فریق ثانی کا اس حدیث میں لفظ خلف کے خلفِ مکانی کے معنی میں ہی متعین ہونے پر ضد اور اصرار کرنا اس ضد سے کس طرح بھی کم نہیں ہے جو وہ اس معلول حدیث کے صحیح اور قابل احتجاج ہونے پر کر رہا ہے۔

نواں جواب :۔ حضرت مولانا عبد الحی صاحب لکھنویؒ فرماتے ہیں کہ :۔

فان قيل حديث عبادةؓ لا تفعلوا الا بام القرآن فانه لا صلوٰة لمن لم يقرأ بها صريح في الزام الفاتحة على المؤتم قلنا نعم هو اصرح الروايات التي ذكرتم لكن دلالته على ما هو مطلوبكم غير مسلم لان الحديث دال على الالزام ان كان لقوله لا تفعلوا الا بام

اگر یہ کہا جائے کہ حضرت عبادہؓ کی حدیث کہ تم ام القرآن کے سوا کچھ اور نہ پڑھو اس لیے کہ جس نے سورۃ فاتحہ نہ پڑھی اس کی نماز نہیں ہوتی اس بات میں صریح ہے کہ مقتدی پر سورۂ فاتحہ لازم ہے تو ہم جواب میں کہیں گے کہ ہاں تمہاری پیش کردہ روایات میں سے یہ صریح ہے لیکن تمہارے مطلوب پر اس کی دلالت مسلم نہیں

القرآن فهو غير تام لما تقرر فی مقره ان الاستثناء عن النهی لا يدل الا علی خروج المستثنیٰ عن حيز المنهی لا علی اللزامه و رکنيته او وجوبه وان کان بقوله فانه لا صلوٰة الخ فهو لا يدل علی الرکنية کنظائره من الاحاديث السابقة

(امام الکلام ص۲۲۴)

کیونکہ اگر لازم ہونے پر استدلال لا تفعلوا الا بام القرآن سے ہے تو یہ تام نہیں کیونکہ اپنی جگہ یہ بات ثابت شدہ ہے کہ نہی سے استثناء صرف مستثنیٰ کے منہی کے حیّز سے نکلنے پر دلالت کرتی ہے لازم اور رکن ہونے یا وجوب پر دلالت نہیں کرتی اور اگر یہ استدلال لا صلوٰۃ الخ سے ہے تو بھی یہ رکنیّت پر دال نہیں جیسا کہ پہلے بیان کی ہوئی اس کی نظائر سے ثابت نہیں ہے۔

یعنی فریق ثانی مقتدی پر سورۃ فاتحہ کا پڑھنا لازم رکن اور ضروری قرار دیتا ہے جبھی تو مقتدی کے سورۃ فاتحہ کے نہ پڑھنے کی صورت میں اس کی نماز کو وہ باطل۔ بیکار اور کالعدم ٹھہراتا ہے لیکن عربی اور گرامر کے لحاظ سے ان کا مطلب اس حدیث سے ثابت نہیں ہوتا اور نہ ہو سکتا ہے اس لیے کہ نہی کے بعد اگر استثناء آئے تو اس سے صرف اباحت ثابت ہو سکتی ہے اور ظاہر امر ہے کہ ترک مباح کی وجہ سے کسی طرح بھی نماز کا بطلان اور فساد لازم نہیں آتا لہٰذا اس روایت سے نہ تو روایۃً فریق مخالف کا بے بنیاد دعویٰ ثابت ہوتا ہے اور نہ درایۃً اور بحمد اللہ تعالیٰ ہم نے بھی اس کے اس غلو کو توڑنے کے لیے یہ کتاب لکھی ہے ورنہ ایک اختلافی مسئلہ کے سلسلہ میں اتنی کاوش کی ضرورت نہ تھی۔

یہ ہے خلف الامام کی حدیث کا پس منظر جس کے بل بوتے پر فریق ثانی کی طرف سے تمام روئے زمین کے علماء احناف کو کھلا اور انعامی چیلنج کیا جا رہا ہے، اگر فریق ثانی گستاخی نہ سمجھے تو ایک جائز قسم کا ورد عرض کرتا ہوں وہ اس کو پڑھا کرے (اور وہ یا شیخ عبد القادر جیلانی شیئاً للہ تعالیٰ کے خالص مشرکانہ ورد سے کوئی تعلق نہیں رکھتا) وہ وِرد شریف یہ ہے ؎

اے میرے باغ آرزو کیسا ہے باغ ہائے تو
کلیاں تو گو ہیں چار سو کوئی کلی کھلی نہیں

چوتھی روایت:۔ امام بیہقی رحؒ نے اپنی سند سے یہ روایت نقل کی ہے کہ محمد بن ابی عائشہؒ آنحضرت صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کے ایک صحابی سے روایت کرتے ہیں وہ کہتے ہیں کہ آنحضرت صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا:۔

لعلکم تقرأون والامام یقرأ قالوا انا لنفعل قال فلا تفعلوا الا ان یقرأ احدکم بفاتحۃ الکتاب۔

(سنن الکبریٰ جلد ۲ ص ۱۶۶)

شاید تم اس وقت قرأت کیا کرتے ہو جس وقت امام قرأۃ کر رہا ہوتا ہے؟ حضرات صحابہؓ کرام نے فرمایا ہاں ہم قرأت کیا کرتے ہیں آپ نے فرمایا کہ تم قرأت نہ کیا کرو ہاں مگر یہ کہ سورۂ فاتحہ کی قرأت کر لیا کرو۔

امام بیہقی فرماتے ہیں هذا اسناد جید کہ اس کی سند جید کھری اور عمدہ ہے

الجواب:۔ نہ معلوم امام بیہقیؒ نے کس طرح اس سند کو جید کہہ دیا ہے کیونکہ اس کی سند میں ابراہیم بن ابی اللیث ہے صالح جزرہؒ کہتے ہیں کہ بیس ۲۰ سال تک وہ جھوٹ کہتا رہا ہے ابن معینؒ فرماتے ہیں کہ وہ ثقہ اور احمق تھا ساجیؒ اس کو متروک کہتے ہیں ابن معینؒ نے بعد کو اسے کذاب اور خبیث کہا ہے سب سے پہلے اس کے جھوٹ کی حقیقت دورقیؒ نے واضح کی تھی یعقوبؒ بن شیبہؒ کہتے ہیں کہ لوگوں نے پہلے اس سے روایتیں لکھی تھیں مگر بعد کو سب نے اسے ترک کر دیا تھا اس میں اتنی جرأت بڑھ گئی تھی کہ وہ جعلی اور موضوع حدیثیں بھی بیان کرنے سے گریز نہیں کرتا تھا۔ امام نسائیؒ کہتے ہیں کہ وہ ثقہ نہیں ہے، ابن سعدؒ کہتے ہیں کہ حدیث میں وہ ضعیف سمجھا جاتا ہے (لسان المیزان جلد ۱ ص ۹۳ و ۹۴) علامہ خطیبؒ لکھتے ہیں کہ ابن معینؒ نے پہلے اس کی توثیق کی تھی لیکن بعد کو جب تحقیق کر لی تو اس کی انتہائی مذمت کی حتیٰ کہ اسے کذاب اور خبیث کہا اور فرمایا خدا تعالیٰ اس کا ستیاناس کرے حدیث میں جھوٹ بولتا ہے۔ امام احمدؒ بن حنبلؒ اور علیؒ بن المدینیؒ پر ابتداً اس کا معاملہ مشکل رہا لیکن بعد کو اس کا جھوٹ واضح ہو گیا اور انہوں نے اس کی روایت کو ترک کر دیا۔ (البغدادی جلد ۶ ص ۱۹۱ تا ۱۹۶ ملتقطاً) یہ ہے امام بیہقیؒ کی اسناد جید مؤلف خیر الکلام یہ جواب دیتے ہیں کہ کثرت شواہد کی بنا پر سند کو جید کہا ہے (ص ۲۷۷) **الجواب:۔** اگر اصل روایت میں معمولی ضعف ہوتا تو کثرت شواہد کی بات درست تھی مگر یہاں تو کذاب، خبیث اور رافضی ہے اس کو سہارا دینے کا کیا معنیٰ ہے؟ یہ روایت جزء القرأۃ ص ۵۱ وکتاب القرأۃ ص ۵۰، دارقطنی جلد ۱ ص ۱۲۹، مسند احمد جلد ۴ ص ۲۳۶ و جلد ۵ ص ۶۰ و جلد ۵ ص ۴۱۰ وغیرہ میں مذکور ہے اور انکی اسانید میں ابراہیم بن ابی اللیثؒ نہیں لیکن ان تمام میں عنؒ ابی قلابۃ عن الا ہے۔ اور تمام کی اسانید

لہ مؤلف خیر الکلام لکھتے ہیں کہ اس روایت کا مدار سفیان ثوریؒ پر ہے ان سے بہت سے ثقات روایت کرتے ہیں اور شعبہؒ سفیانؒ کے متابع ہیں اور پھر امام بیہقیؒ تصریح کرتے ہیں کہ یہ حدیث صحیح ہے (محصلہ ص ۲۷۷) **الجواب:۔** مفصل گزر چکا ہے کہ امام سفیان ثوریؒ قرأۃ خلف الامام کے قائل نہ تھے اگر یہ روایت ان کے نزدیک صحیح ہوتی تو اس کے خلاف کبھی نہ کرتے

باقی حاشیہ ص ۱۲۳ پر

ہیں رجل من اصحاب النبی صلی اللہ علیہ وسلم ہے ، ابو قلابہؒ گو ثقہ تھے مگر غضب کے مدلس تھے علامہ ذہبیؒ لکھتے ہیں ۔ مدلس عن من لحقھم وعن من لم یلحقھم (میزان ص۳۹ ج۲) ابو قلابہؒ کی جن سے ملاقات ہوئی ہے ان سے بھی اور جن سے نہیں ہوئی ان سے بھی سب سے تدلیس کرتے ہیں اور مبارکپوریؒ صاحب کے حوالہ سے پہلے نقل کیا جا چکا ہے کہ نہ تو مدلس کا عنعنہ مقبول ہے اور نہ اس کی کوئی روایت اتصال پر محمول کی جا سکتی ہے ، مؤلف خیر الکلام لکھتے ہیں کہ ابو قلابہؒ پہلے طبقہ کے مدلس ہیں اور محدثین نے ان کی تدلیس کو برداشت کیا ہے (محصلہ ص۲۶۴) مگر مؤلف مذکور نے بالکل غور نہیں کیا ابو قلابہؒ جب عمن لم یلحقھم سے بھی تدلیس کرتے ہیں تو پھر کسی طبقہ میں بھی ہوں کیونکر وہ قابل برداشت ہوں گے ؟ اس صریح عبارت کو بھی دیکھیں نرا طبقہ ہی نہ دیکھیں امام نوویؒ حضرت امام شعبہؒ کے حوالہ سے لکھتے ہیں کہ زنا تدلیس سے ہلکا گناہ ہے (الزنا اھون من التدلیس شرح مسلم ص۱۶۳ ج۱) اور مبارکپوری صاحبؒ امام شعبہؒ کے حوالہ سے لکھتے ہیں کہ تدلیس حرام ہے اور مدلس ساقط العدالت ہے (تحفۃ الاحوذی ص۱۰) ہاں مگر صحیحین میں مدلس ہوں یا قتادہؒ اعمشؒ اور ابو الزبیرؒ محمد بن مسلمؒ وغیرہ کی تدلیس ہو تو وہ قطعاً مضر نہیں ہے کما مر مفصلاً ۔ علاوہ بریں رجل من اصحاب النبی صلی اللہ علیہ وسلم کے بارے میں خود امام بیہقیؒ وغیرہ کے نزدیک کلام ہے ، امام بیہقیؒ رجل من اصحاب النبی صلی اللہ علیہ وسلم کو مرسل کہتے ہیں (سنن الکبریٰ جلد ۱ ص۹۳) اور دوسرے مقام پر لکھتے ہیں : حمید بن عبد الرحمٰنؒ نے جو یہ کہا ہے لقیت رجلا صحب النبی صلی اللہ علیہ وسلم کہ میں جناب رسول اللہ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کے ایک صحابیؓ سے ملا ۔ اس نے صحابی کا نام نہیں بتایا اس لیے یہ روایت مرسل ہو گی ۔ (جلد ۱ ص۱۹۰) ایک حدیث اس مضمون کی آتی ہے کہ قبیلہ بنی عبد الاشہل کی ایک عورت کہتی ہے کہ میں نے جناب رسول خدا صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم سے مسئلہ دریافت کیا الخ امام خطابیؒ لکھتے ہیں کہ یہ عورت مجہول ہے (معالم السنن جلد ۱ ص۱۱۹) علامہ ابن حزمؒ رجل من اصحاب النبی صلی اللہ علیہ وسلم پر کلام کرتے ہیں اور کہتے ہیں کہ یہ مجہول ہے (محلی ص۲۱۶ ج۴ و ص۲۳۸ ج۵)

(ص۱۲۲ کا بقیہ حاشیہ) اور جن دیگر ثقات کا حوالہ دیا ہے ان کی اسانید درکار ہیں جو اول سے آخر تک صحیح ہوں امام شعبہؒ کے طریق سے جو روایت امام بیہقیؒ نے نقل کر کے اس کی تصحیح کی ہے اس میں وہی خرابی ہے کیونکہ حضرت انسؓ کے طریق کو وہ خود غیر محفوظ کہتے ہیں اور ابو قلابہؒ کی روایت مرسل ہے اور مرسل کو وہ صحیح نہیں مانتے پھر وہ کیونکر صحیح ہے ۔

اور اسی کے قریب مسلک الختام جلد ۱ ص ۲۴ میں ہے، خلاصۂ کلام یہ ہے کہ جب تک صحابی کا نام نہ بتایا جائے گا روایت صحیح نہ ہوگی چنانچہ امام حاکمؒ امام نوویؒ، حافظ ابن حجرؒ اور علامہ جزائریؒ صحیح حدیث کی تعریف یوں کرتے ہیں (واللفظ للحاکم)

وصفة الحديث الصحيح ان يروى عن النبي صلى الله عليه وسلم صحابي زائل عنه اسم الجهالة (معرفت علوم الحديث ص ۶۲ مقدمہ مسلم ص ۱۱ شرح نخبۃ الفکر ص ۳۱ توجیہ النظر ص ۶۸)

صحیح حدیث کی تعریف یہ ہے کہ جناب رسول خدا صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم سے ایسا صحابی روایت کرے جس سے جہالت کا اسم دور ہو (یعنی مجہول نہ ہو)

علامہ عراقیؒ اور محقق جزائریؒ اس کی وجہ یہ بیان کرتے ہیں کہ آنحضرت صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کے زمانہ میں منافق بھی ہوتے تھے اور مرتد بھی جب تک راوی صحابی کا نام نہ بیان کرے اور اس کا صحابی ہونا نہ معلوم ہو جائے تو اس کی روایت قابلِ قبول نہ ہوگی خواہ وہ راوی عن رجل من الصحابۃؓ کہے یا حدثنی من سمع النبي صلى الله عليه وسلم کہے (التنقید والایضاح ص ۱۲۵ و توجیہ النظر ص ۱۶۶/۲۴۶) امام سیوطیؒ ایک وجہ یہ بھی لکھتے ہیں کہ بسا اوقات صحابی کو تابعی اور تابعی کو صحابی سمجھ لینے کی غلطی بھی ہو جاتی ہے۔ جیسا کہ امام محمدؒ بن ربیعؒ نے عبد الرحمٰنؒ بن غنمؒ کو صحابی سمجھ لیا ہے لیکن علی الاصح (صحیح ترین قول یہ ہے کہ) یہ صحابی نہ تھے (تدریب الراوی ص ۲۳۳) اس لیے نام کی ضرورت سمجھی گئی کہ اگر واقعی وہ صحابی ہیں تو الصحابۃؓ کلھم عدول کے قاعدہ کے تحت داخل ہوں گے اور اگر وہ دوسری شق میں داخل ہیں تو اختلاط اور اشتباہ سے نجات مل جائے گی اور علامہ صیرفیؒ نے اس کی بھی تصریح کی ہے کہ جب تابعی ایسے ہی رجل من الصحابۃؓ سے عنعنہ کرے تو وہ روایت کسی صورت میں قابل قبول نہ ہوگی (تدریب الراوی ص ۱۳۶ و ایضاح ص ۵۸)

لہ اور جو حضرات اس صورت کو صحیح سمجھتے ہیں وہ شرط لگاتے ہیں چنانچہ مؤلف خیر الکلام نے بحوالہ تدریب الراوی ص ۶۶ لکھا ہے کہ اور جہاں صحابی کا نام مذکور نہ ہو تو وہاں صحیح مذہب یہی ہے کہ اگر سند کا پہلا حصہ صحیح ہو تو حدیث صحیح ہوتی ہے الخ ص ۲۷۵ مگر امام بیہقیؒ جس سند کو جید کہتے ہیں اس کا حال آپ دیکھ چکے ہیں اور دوسری اسانید بھی کلام سے خالی نہیں ہیں۔

بہر کیف امام بیہقیؒ وغیرہ کے قاعدہ کے رُو سے فی نفسہ یہ روایت قابل نہیں ہے چہ جائیکہ اس کو لے کر تمام دنیا کو کھلا اور انعامی چیلنج کیا جائے فریق ثانی کو اس مدعٰی کے لیے صحیح روایت تلاش کرنی چاہیئے امام بیہقیؒ لکھتے ہیں ھذا اسناد صحیح لیکن ابو قلابہؒ کی تدلیس کے علاوہ بھی عن رجل من اصحاب الخ کی سند کو خود امام بیہقیؒ مرسل کہتے ہیں اور پہلے امام بیہقیؒ ہی کے حوالہ سے نقل کیا جا چکا ہے کہ مرسل ضعیف ہوتی ہے پھر ان کے ہاں اس کی سند کیسے صحیح ہوئی؟ مرسل کو حجت ماننے والے یہ چاہتے ہیں کہ امام بیہقیؒ وغیرہ اپنے قائم کردہ اصول کی پابندی کریں یہ تھوڑا فائدہ ہے علاوہ بریں الا ان یقرأ احدکم الخ کے الفاظ صرف اجازت کا پہلو ظاہر کرتے ہیں اور فریق ثانی کا دعوٰی اس سے بہت اونچا ہے وہ تو ترک قرأت سورۃ فاتحہ کی بنا پر نماز کے ناقص، بیکار، باطل بلکہ کالعدم ہونے کا قائل ہے اور خاص طور پر یہ بات بھی قابل لحاظ ہے کہ آنحضرت صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے فرمایا فلا تفعلوا الا ان یقرأ احدکم بفاتحۃ الکتاب فی نفسہ (جزء القراءۃ ص۱۵) تم امام کے پیچھے قرأۃ نہ کیا کرو الا یہ کہ جب تم میں کوئی تنہا اور اکیلا ہو تو سورۃ فاتحہ پڑھا کرے فی نفسہ کا معنی اکیلا بھی ہو سکتا ہے جس کی تشریح پہلے کی جا چکی ہے اور اگر انصاف سے کام لیا جائے تو سورۃ فاتحہ کی قرأت کو منفرد سے مقید کرنا چاہیئے اس لیے کہ جملہ روایات میں اس کا ذکر آتا ہے کہ آنحضرت صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے نماز سے فارغ ہونے کے بعد یہ فرمایا تم نے میرے پیچھے قرأت کی ہے؟ جب جواب ملا کہ ہاں تو آپؐ نے فرمایا جبھی تو میں نے کہا کہ میرے ساتھ مخالجت، منازعت اور ہاتھا پائی ہو رہی ہے تم ایسا نہ کرو سوال یہ ہے کہ آپؐ نے مقتدیوں کو سورۃ فاتحہ پڑھنے کی نہ صرف اجازت دی بلکہ فریق ثانی کے خیال کے مطابق حکم بھی دیا تو یہ کیسے باور کر لیا جائے کہ جو چیز آپؐ کی تشویش اور منازعت کا سبب بنی اور آپؐ نے تحقیق حال کے لیے حضرات صحابہؓ سے دریافت بھی کیا اور ان کی اس حرکت کو ناپسند کرتے ہوئے ناراضگی کا اظہار بھی کیا اور پھر اسی چیز کا حکم بھی دے دیا؟ فریق ثانی ہی ازراہ انصاف فرمائے کہ بات کیا ہے؟ اور پہلی جلد میں اس کی پوری صراحت گزر چکی ہے کہ موجب منازعت اور مخالجت نفس قرأت تھی جو سورۃ فاتحہ وغیرہ سب کو شامل ہے اور یہ قرأت بھی آہستہ کی گئی تھی مگر باوجود اس کے آپؐ نے

---

[1] مولف خیر الکلام لکھتے ہیں کہ فاتحہ رکن ہے اور ہر نمازی کو یاد ہوتی ہے باقی قرآن اصح مذہب پر نہ رکن نہ واجب (محصلہ) (ص۲۸۱) الجواب: سب کے نزدیک فاتحہ رکن نہیں بلکہ بعض کے نزدیک نفس قرأت رکن ہے اور سب نماز یول
(بقیہ حاشیہ ص۱۳۶ پر)

اس کو پسند نہ کیا فریق ثانی کے نزدیک مطلب یہ ہوگا کہ جناب رسول خدا صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے اپنے پیچھے قرأت کو ناپسند بھی کیا اور پسند بھی کیا اس سے منع بھی کیا اور اس کا حکم بھی دیا قرأت سے مخالجت اور منازعت ہوتی بھی ہے اور نہیں بھی ہوتی اس سے نہی بھی ہے اور استثناء بھی ہے حاشا وکلا رسول اور نبی کی شان اس سے بہت اونچی ہے کہ بیک وقت وہ دو متضاد حکم دیں۔ قصہ یہ ہے کہ آپ نے نمازیوں کو مطلقاً قرأت قرآن کرنے سے منع کیا ہے اور تنہائی اور حالت انفراد میں سورۃ فاتحہ پڑھنے کا حکم دیا ہے الا ان یقرأ احدکم بفاتحۃ الکتاب فی نفسہ اور چونکہ دیگر صحیح روایات میں فصاعداً ما تیسر اور ما زاد کی زیادت بھی مروی ہے اس لیے منفرد کے لیے سورۃ فاتحہ کے علاوہ کچھ زیادہ بھی پڑھنے کا حکم ہے اور امام کو بین بین نہیں چھوڑا گیا جیسا کہ مؤلف خیر الکلام نے صفحہ ۲۸ میں کہا ہے بلکہ دیگر صحیح روایات میں امام کا فریضہ قرأت بتایا ہے اذا قرأ الحدیث اور قراءۃ الامام الحدیث۔ یہی وہ مطلب اور معنی ہے جس سے منشائے خداوندی اور مراد رسول سمجھ آسکتی ہے اور قرآن کریم صحیح احادیث، آثار حضرات صحابہ کرامؓ اور جمہور سلفؒ و خلفؒ کی مخالفت بھی لازم نہیں آتی اور یہی صحیح ہے ولیس وراء عبادان قریۃ ؎

ترے رندوں پہ سارے کھل گئے اسرار دیں ساقی
ہُوا علم الیقیں، عین الیقیں، حق الیقیں ساقی

پانچویں روایت: مبارکپوری صاحب لکھتے ہیں کہ حضرت انسؓ سے روایت ہے کہ آنحضرت صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے حضرات صحابہؓ کو ایک نماز پڑھائی جب نماز سے فارغ ہوئے اور مقتدیوں کی طرف اپنا رُخ مبارک پھیرا تو ارشاد فرمایا۔

اتقرؤن فی صلاتکم والامام یقرأ فسکتوا	کیا تم امام کے پیچھے قرأت کرتے ہو؟ حضرات صحابہؓ خاموش
فقالها ثلاث مرات فقال قائل او قائلون	ہو گئے آپ نے تین مرتبہ یہی سوال کیا ایک نے یا کئی آدمیوں نے

بقیہ حاشیہ ۱۲۵ کا

کو سورۃ اخلاص وغیرہ کوئی اور سورت بھی اکثر یاد ہوتی ہے اور ما زاد علی الفاتحہ کے وجوب کے دلائل بھی گذر چکے ہیں اس لیے فاتحہ کی تخصیص کی یہ وجہ قابل قبول نہیں ہے، منازعت اور قرأت کی فرضی تقسیم اور پھر فاتحہ کو ممانعت سے مستثنیٰ کرنا جیسا کہ مؤلف مذکور نے کیا ہے محض طفل تسلّی ہے۔

انا لنفعل قال فلا تفعلوا ولیقرأ احدکم بفاتحۃ الکتاب فی نفسہ (جزء القراءۃ ص۵۴ کتاب القراءۃ ص۴۸ سنن الکبریٰ جلد۲ ص۱۶۶ دارقطنی جلد۱ ص۱۲۹ وغیرہ)

کہا ہاں حضرت ہم قرأت کرتے ہیں آپؐ نے فرمایا ایسا نہ کرنا ہر ایک کو چاہیے کہ فی نفسہٖ سورۂ فاتحہ پڑھ لیا کرے

مبارکپوری صاحبؒ کہتے ہیں کہ علامہ ہیثمیؒ فرماتے ہیں کہ اس حدیث کے راوی ثقہ ہیں رواتہ ثقات (مجمع الزوائد جلد۲ ص۱۱۰) اس لیے یہ روایت بالکل صحیح ہے (تحقیق الکلام جلد۱ ص۹۰ وغیرہ)

جواب:- اگر محض بلا دلیل کہنے سے روایت صحیح ہو سکتی ہے تو یہ صحیح ہوگی ورنہ اس کی صحت پر کوئی دلیل موجود نہیں ہے اور یہ روایت بھی ضعیف ہے اولاً اس میں ابو قلابہؒ غضب کا مدلس ہے اور عنعنہ سے روایت کرتا ہے اور مدلس کا عنعنہ مقبول نہیں ہوتا۔ وثانیاً اس کی سند میں اضطراب ہے بعض طرق میں عن ابی قلابۃؒ عن انسؓ الخ ہے (جزء القراءۃ ص۵۴، کتاب القراءۃ ص۴۸ دارقطنی جلد۱ ص۱۲۹) اور بعض طرق میں عن ابی قلابۃؒ عن النبی صلی اللہ علیہ وسلم ہے (جزء القراءۃ ص۵۴، کتاب القراءۃ ص۴۹ و بیہقی جلد۲ صفحہ ۱۶۶) اور بعض طرق میں عن ابی قلابۃ عن محمدؒ بن ابی عائشۃؓ عن رجل من اصحاب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ہے (دارقطنی ص۱۲۹، بیہقی جلد۲ ص۱۶۶ تلخیص الحبیر ص۸۷) اور بعض طرق میں عن ابی ہریرہؓ ہے (دارقطنی جلد۱ ص۱۲۹) اور پہلے عرض کیا جا چکا ہے کہ حدیث مضطرب فریق ثانی کے نزدیک بھی ضعیف ہوتی ہے اور اس میں شدید اختلاف ہے پھر یہ کیسے قابل استدلال ہو سکتی ہے؟

وثالثاً اس کے متن میں بھی اضطراب ہے بعض طرق میں یہ روایت فلا تفعلوا پر ختم ہو جاتی ہے اور اس میں جملہ استثنائیہ موجود نہیں ہے۔ (کتاب القراءۃ ص۴۹ والجوہر النقی جلد۲ ص۱۶۷) اور بعض طرق میں یہ جملہ استثنائیہ بھی موجود ہے (کتاب القراءۃ ص۱۲۲ اور بیہقیؒ جلد۲ ص۱۶۶ و طحاوی جلد۱ ص۱۲۸ وغیرہ) اور ایک روایت میں صرف لیقرأ بفاتحۃ الکتاب کا ذکر ہے (جزء القراءۃ ص۵۴) امام بیہقیؒ نے یوسفؒ بن عدیؒ پر یہ الزام لگایا ہے کہ یہ جملہ نہ ذکر کرنے کی ذمہ داری ان پر عائد ہوتی ہے لیکن وہ تو ثقہ تھے، ابو زرعہؒ ان کو ثقہ کہتے ہیں مسلمہؒ ان کو ثقہ کہتے ہیں ابن حبانؒ ان کو ثقات میں لکھتے ہیں (تہذیب التہذیب جلد۱۱ ص۴۱۹) اس لیے یہ الزام کسی اور راوی پر ہونا چاہیے کیوں نہ ہو کہ یہ الزام

عبید اللہؒ بن عمرو الرقیؒ پر عائد کر دیا جائے علامہ ابن سعدؒ کہتے ہیں کہ وہ صاحب خطا تھے (تہذیب جلد ۷ صـ۴۲) حافظ ابن حجرؒ ان کو صاحب وہم کہتے ہیں (تقریب صـ۲۵۳) اور امام بیہقیؒ اسی روایت میں ان کا وہم بیان کرتے ہیں اور لکھتے ہیں کہ حضرت انسؓ کی طرف اس روایت کی نسبت محفوظ نہیں ہے۔ اور اس میں عبید اللہ کا وہم ہے (سنن الکبریٰ جلد ۲ صـ۱۲۹) مؤلف خیر الکلام کا یہ کہنا کہ مگر کتاب القرأۃ سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ اس سے رجوع کر چکے ہیں (ص ۲۴۵) محض بلا دلیل دعویٰ اور سینہ زوری ہے صاحب تعلیق المغنی جلد ۱ صـ۱۲۰ میں اس کو نقل کرتے ہیں اور امام ابو حاتمؒ کہتے ہیں کہ یہ طریق محفوظ نہیں ہے بلکہ یہ (وَهْمٌ) وہم ہے (کتاب العلل جلد ۱ صـ۱۷۵) مبارکپوری صاحبؒ بحوالہ حافظ ابن حجرؒ ابن حبانؒ سے یہ نقل کرتے ہیں کہ حضرت انسؓ اور محمدؒ بن ابی عائشہؓ دونوں کے طریق محفوظ ہیں لیکن یہ مبارکپوری صاحبؒ کی کھلی غلطی ہے۔ حافظ ابن حجرؒ نے تو یہ لکھا ہے وزعم ابن حبان ان الطریقین محفوظان الخ (تلخیص الحبیر صـ۸۷) ابن حبانؒ کا یہ زعم ہے کہ یہ دونوں طریق محفوظ ہیں۔ حافظ ابن حجرؒ نے درحقیقت لفظ زعم بول کر ابن حبانؒ کی تردید کر دی ہے اور امام بیہقیؒ نے بھی اس کی تردید کی ہے چنانچہ لکھتے ہیں کہ وقد قیل عن ابی قلابۃؒ عن انسؓ بن مالک ولیس بمحفوظ انتہیٰ (سنن الکبریٰ جلد ۲ صـ۱۶۶) اور خود مؤلف مذکور لکھتے ہیں کہ امام بیہقیؒ نے اگرچہ انسؓ کے طریق کو ایک جگہ غیر محفوظ قرار دیا ہے مگر کتاب القرأت سے معلوم ہوتا ہے کہ ان کے ہاں یہ طریق بھی محفوظ ہے الخ (ص ۲۴۳) مگر کتاب القرأۃ سے ان کا یہ بے بنیاد دعویٰ ہرگز ثابت نہیں ہوتا لفظ زعم اگرچہ حق و باطل دونوں کے لیے آتا ہے مگر یہاں اس کے باطل ہونے کا قرینہ موجود ہے لیس بمحفوظ وغیرہ والبعاقی نفسہ کا معنیٰ پہلے بیان ہو چکا ہے اس روایت کو صحیح تسلیم کر کے وہ مطلب بھی مراد ہو سکتی ہے وخامسًا جلد اوّل میں بسند صحیح حضرت انسؓ سے مرفوع روایت عرض کی جا چکی ہے کہ واذا قرأ فانصتوا جب امام قرأۃ کرے تو تم (تمام مقتدی) اس کے پیچھے) خاموش رہو۔ رہا علامہ ہیثمیؒ کا رواتہ ثقات کہنا تو اپنے موقع پر صحیح ہے عبید اللہؒ بن عمروؒ ثقہ ہے مگر صاحب خطا اور وہم ہے اور ابو قلابہؒ ثقہ ہے مگر غضب کا مدلس ہے اور حقیقت یہ ہے کہ اس کا خود مبارکپوری صاحبؒ جواب دے گئے ہیں چنانچہ انہیں کا خود نوشت جواب ملاحظہ ہو ایک مقام پر لکھتے ہیں واما قول الہیثمیؒ رجالہ ثقات الخ فلا یدل

علی صحۃ الحدیث (ابکار المنن ص۲۴۲) علامہ ہیثمیؒ کا یہ فرمانا کہ اس سند کے جملہ راوی ثقہ ہیں۔ اس سے حدیث کی صحت ثابت نہیں ہو سکتی یہ روایت بھی جمہور امت کی نمازوں کو ناقص، بیکار، باطل اور کالعدم قرار دینے کی اہلیت نہیں رکھتی۔

چھٹی روایت :- امام بیہقیؒ اپنی سند سے حضرت ابو قتادہؓ سے یہ روایت نقل کرتے ہیں۔

ان رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم قال اتقرؤن خلفی قالوا نعم قال فلا تفعلوا الا بفاتحۃ الکتاب (سنن الکبریٰ ص۱۶۶ ج۲)

کہ آنحضرت صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا تم میرے پیچھے قرأت کرتے ہو حضرات صحابہؓ نے کہا جی ہاں فرمایا سورۂ فاتحہ کے بغیر اور کچھ بھی نہ پڑھا کرو۔

جواب :- یہ روایت بھی احتجاج کے قابل نہیں ہے اولاً اس لیے کہ سند میں مالکؒ بن یحییٰؒ ہے ابن حبانؒ ان میں کلام کرتے ہیں امام بخاریؒ فرماتے ہیں کہ اس کی حدیث میں نظر اور کلام ہے عقیلیؒ اور ابن حبانؒ اس کو ضعفاء میں لکھتے ہیں اور اس کو منکر الحدیث کہتے ہیں نیز ثانی الذکر کہتے ہیں کہ اس سے احتجاج جائز نہیں ہے کیونکہ یہ ثقات سے ایسی روایتیں بیان کرتا ہے جن کی کوئی بھی اصلیت نہیں ہوتی ابن عدیؒ کہتے ہیں کہ اس کی حدیثیں محفوظ نہیں ہیں (لسان المیزان جلد ۵ ص۷) علامہ ابن خلدونؒ لکھتے ہیں کہ امام بخاریؒ کی اصطلاح ہے کہ جب وہ کسی راوی کے بارے میں فیہ نظر کہتے ہیں تو وہ انتہائی درجہ کا کمزور اور ضعیف ہوتا ہے (مقدمہ ص۳۱۸) وثانیاً سلیمان تیمیؒ حدثت کے لفظ سے روایت کرتے ہیں اور کتاب القرأۃ ص۵۳ میں بھی حُدِّثتُ سے یہ روایت ہے نہ معلوم یہ بیان کرنے والا کون اور کیسا تھا؟ عادل تھا یا فاسق؟ ثقہ تھا یا ضعیف؟ امام حاکمؒ مسند حدیث کی یہ شرط لکھتے ہیں۔ ان لا یکون فی اسنادہ اُخبرت عن فلان ولا حُدِّثت عن فلان (معرفت علوم الحدیث ص۱۹) کہ اس میں اُخبرت اور حُدِّثت عن فلان (کہ مجھ کو خبر دی گئی اور مجھ سے بیان کیا گیا) نہ ہو۔ وثالثاً خود امام بیہقیؒ اس کو مرسل کہتے ہیں (سنن الکبریٰ جلد ۲ ص۱۶۶) اور حدیث مرسل ان کے نزدیک ضعیف ہوتی ہے کما مر امام بیہقیؒ نے اس کی کڑی یوں جوڑنے کی کوشش کی ہے عن یحییٰ بن ابی کثیر عن عبد اللہ بن ابی قتادۃؓ الخ لیکن ایک تو حسب تصریح علامہ عقیلیؒ اور ابن حبانؒ وغیرہ یحییٰ مدلس تھے (دیکھیے تہذیب جلد ۱۱ ص۲۶۹) اور یہاں عنعنہ سے روایت کرتے ہیں اور دوسرے اس روایت کا دارومدار بھی مالکؒ بن یحییٰؒ پر ہے۔

ساتویں روایت :۔ امام بیہقیؒ نے کتاب القراۃ ص۵۵ میں ایک باب قائم کیا ہے اور یہ فرماتے ہیں کہ مقتدیوں کو ممانعت نفسِ قرأت سے نہیں بلکہ ان کو جہر سے ممانعت ہے اور اس کی دلیل یہ ہے کہ حضرت عبد اللہؓ بن حذافہ نے نماز پڑھی اور اس میں جہر سے قرأت کی۔ آنحضرت صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے فرمایا یا ابن حذافۃ فلا تسمعنی واسمع اللہ اے ابن حذافہؓ مجھے نہ سناؤ بلکہ خدا تعالیٰ کو سناؤ۔

جواب :۔ اس روایت سے بھی استدلال باطل ہے اوّلاً اس لیے کہ سند میں نعمانؒ بن راشدؒ ہے امام بخاریؒ فرماتے ہیں کہ ان کی حدیث میں بکثرت وہم ہوتا ہے امام احمدؒ ان کو مضطرب الحدیث کہتے ہیں اور نیز کہتے ہیں کہ یہ صاحب مناکیر بھی ہیں، امام ابن معینؒ، ابو داؤدؒ، نسائیؒ اور یحییٰؒ بن سعیدؒ تمام ان کی تضعیف کرتے ہیں (میزان جلد۳ ص۲۳۷) وثانیاً اس میں زہریؒ عنعنہ سے روایت کرتے ہیں اور مبارکپوری صاحبؒ کہتے ہیں کہ ان کی معنعن حدیث صحیح نہیں ہے وثالثاً روایت میں اس کا کوئی ذکر نہیں کہ ابن حذافہؓ آپ کے پیچھے بحالتِ اقتداء نماز پڑھتے ہوئے جہر کر رہے تھے ہو سکتا ہے کہ سنن و نوافل وغیرہ کی نماز میں انفرادی حالت میں انہوں نے ایسا کیا ہو اور آنحضرت صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے جو قریب ہوں گے ان کی یہ اصلاح فرمائی ہو بلکہ یہی قرینِ قیاس ہے۔ قارئین کرام نمبر شماری کے لحاظ سے گو فریق ثانی کی طرف سے سات روایتیں پیش کی گئی ہیں لیکن جو روایتیں ان کی طرف سے پیش کی گئی ہیں اور پھر ان کے جوابات دیے گئے ہیں۔ غالباً چالیس سے کم نہ ہوں گی اور آپ جلد اوّل میں پیش کردہ احادیث میں روات کا اور جلد ثانی میں پیش کردہ روایتوں میں راویوں کا توازن خوب ملاحظہ کر چکے ہیں اور یہ بھی دیکھ چکے ہیں کہ حضرت عبادہؓ بن الصامت کی بخاری و مسلم وغیرہ کی اس روایت کے علاوہ جو نمبر اوّل پر پیش کی گئی ہے اور جس میں فصاعدًا، ما تیسر اور ما زاد کی زیادت بھی موجود ہے اور کوئی روایت صحیح نہیں ہے خصوصاً لقیہ خلف الامام اور جملہ استثنائیہ کی روایت پر سیر حاصل بحث آپ ملاحظہ کر چکے ہیں عیاں را چہ بیاں اور شنیدہ کے بود مانند دیدہ اب ہم دوسرے باب کو ختم کر کے تیسرا باب شروع کرتے ہیں۔

تیسرا باب

آثار حضرات صحابہؓ و تابعینؒ وغیرہم

مرفوع روایات کا جن کو فریق ثانی نے مقتدی کے لیے ہر رکعت میں سورۃ فاتحہ کے وجوب کے لیے اور امام کے پیچھے سورۃ فاتحہ نہ پڑھنے والوں کی نماز کے ناقص، بیکار، کالعدم اور باطل ہونے کے لیے پیش کیا تھا، روایتی اور درایتی حال تو آپ اچھی طرح معلوم کر چکے ہیں کہ بغیر معدودے چند مرفوع روایات کے (جن میں خلف الامام کا لفظ موجود نہیں ہے اور اُن میں فصاعداً، ما تیسر اور ما زاد، کی زیادت یا اِذا وراء الامام کی قید مذکور ہے) اور کوئی روایت صحیح نہیں ہے خصوصاً وہ روایات جن میں خلف الامام کی زیادت اور الا بام القرآن کی استثنار موجود ہے وہ تو کسی طرح بھی صحیح نہیں ہیں۔ ان مرفوع روایات پر کلام کرنے کے بعد مزید حاجت تو باقی نہیں رہتی کہ ہم آثار حضرات صحابہؓ و تابعینؒ وغیرہم کو نقل کر کے ان کے جوابات عرض کریں خاص کر کے جب کہ فریق ثانی کے نزدیک قاعدہ یہ ہے کہ در موقوفات صحابہؓ حجت نیست اگرچہ بصحت رسد اور مؤلف خیر الکلام لکھتے ہیں کہ اور تابعینؒ کے اقوال بلکہ صحابہؓ کے اقوال اختلافی امور میں حجت نہیں ہوتے خصوصاً جب کہ ایک طرف صحیح حدیث موجود ہو الخ (ص۳۴) مگر صرف تکمیلِ کتاب اور افادۂ طلبہ کے لیے آثار حضرات صحابہؓ کرامؓ اور تابعینؒ وغیرہم پر کلام نقل کر دینا ضروری معلوم ہوتا ہے تاکہ اس مسئلہ کا کوئی پہلو اور گوشہ عامۃ المسلمین کی نگاہ سے بھی اوجھل نہ رہے۔

حضرت عمرؓ کا اثر: یزید شریکؒ فرماتے ہیں کہ میں نے حضرت عمرؓ بن الخطاب سے سوال کیا، اقرأ خلف الامام قال نعم قال وان قرأت یا امیر المومنین قال وان قرأت رجزأ لقراۃ ص۱۳،

طحاوی جلد ۱ ص ۱۲۹ کتاب القرأۃ ص ۵۶) کیا میں امام کے پیچھے قرأت کر سکتا ہوں؟ فرمایا ہاں سائل نے پوچھا اگرچہ آپ پڑھ رہے ہوں اے امیر المؤمنین؟ فرمایا ہاں اگرچہ میں پڑھتا رہوں اور مستدرک ص ۲۳۹ ج ۱ دار قطنی ص ۱۲۰ ج ۱ اور سنن الکبریٰ جلد ۲ ص ۱۶۷ وغیرہ) میں یہ بھی مذکور ہے تم سورۃ فاتحہ پڑھ لیا کرو سائل نے دریافت کیا اگرچہ آپ جہر سے قرأت کر رہے ہوں؟ فرمایا ہاں اگرچہ میں جہر سے قرأت کیا کروں۔

جواب:۔ فریق ثانی کا اس روایت سے وجوب فاتحہ پر استدلال صحیح نہیں ہے اس لیے کہ ہم نے جلد اوّل میں حضرت عمرؓ کا اثر ترک قرأت کا نقل کیا ہے اگر یہ اثر صحیح ہو جیسا کہ بعض ائمہؒ نے اس کو صحیح کہا ہے تو اس کا جواب وہی بہتر ہے جو مؤلف خیر الکلام نے ص ۲۹۳ میں حضرت شاہ ولی اللہ صاحبؒ کی کتاب ازالۃ الخفاء جلد ۲ ص ۹۳ سے نقل کیا ہے اور پھر مؤلف مذکور نے یہ لکھا ہے کہ یعنی قرأت فی نفسہٖ منع نہیں صرف منازعت منع ہے جو شخص فاتحہ بدون منازعت پڑھ سکتا ہو پڑھے جس میں اتنی طاقت نہیں وہ نہ پڑھے اس تطبیق کی اس وقت ضرورت ہوتی جب حضرت عمرؓ سے منع کی روایت صحیح ہوتی مگر وہ روایت صحیح نہیں الخ آگے لکھا ہے کہ وہ مرسل ہے اور محقق مذہب محدثین کا یہ ہے کہ مرسل حجت نہیں (محصلہ ص ۲۹۴) مگر ہم با حوالہ محدثینؒ کا مذہب نقل کر آئے ہیں کہ مرسل صحیح ہوتی ہے لہٰذا تطبیق کی ضرورت پیش آئے گی اور یہ بہتر تطبیق ہے لیکن اس اثر سے فریق ثانی کو چنداں فائدہ نہ ہوگا کیونکہ اس کا دعویٰ یہ ہے کہ جو شخص امام کے پیچھے ہر رکعت میں سورۃ فاتحہ نہ پڑھے اس کی نماز ناقص ہے کالعدم ہے بیکار ہے اور باطل ہے اور اس اثر سے صرف اجازت اور اختیار ثابت ہوتا ہے۔ حضرت عمرؓ سے اسی مضمون کا ایک اثر کتاب القرأۃ ص ۵۹ میں موجود ہے لیکن سند میں محمدؒ بن حسن ابو بکر بہاریؒ ہے امام دار قطنیؒ کہتے ہیں کہ ان کا ایک بیاض صحیح اور دوسرا بالکل ردی تھا، انہوں نے دونوں کو خلط ملط کر دیا تھا حتیٰ کہ صحیح اور ضعیف کی کوئی تمیز باقی نہ رہی تھی، علامہ ذہبیؒ لکھتے ہیں کہ وہ معروف واہٖ مشہور و معروف ضعیف ہے، علامہ برقانیؒ اور ابن سرخسیؒ کہتے ہیں کہ وہ کذاب تھا (بغدادی جلد ۲ ص ۲۱۰، کتاب الانساب ۱/۱۷۱، میزان جلد ۳ ص ۴۵ ولسان جلد ۵ ص ۱۳۱) کتاب القرأۃ ص ۶۱ اور سنن الکبریٰ جلد ۲ ص ۱۶۷ وغیرہ میں حضرت عمرؓ کا اس مضمون سے ایک اثر آتا ہے کہ انہوں نے فرمایا کوئی نماز صحیح نہیں ہے مگر یہ کہ اس میں سورۃ فاتحہ اور کچھ اور بھی پڑھا جائے اسائل نے کہا اگرچہ میں امام کے پیچھے کھڑا

ہوا کروں۔ فرمایا ہاں اقرأ فی نفسک مگر اس کی سند میں عبایہ ہے حافظ ابن حجرؒ لکھتے ہیں کہ وہ غالی شیعہ تھا۔ ابوبکر بن عیاشؒ کا بیان ہے کہ میں نے امام اعمشؒ سے پوچھا آپ عبایہؒ سے کیوں روایت کرتے ہیں؟ فرمایا خدا کی قسم میں تو اس کی روایت کو علی وجہ الاستہزا نقل کرتا ہوں میں نے اس کو کب حجت سمجھا ہے عقیلیؒ اس کو ضعفاء میں لکھتے ہیں اور کہتے ہیں کہ وہ غالی اور ملحد تھا (لسان المیزان جلد ۲ ص ۲۴۷) و رابعاً اگر حضرت عمرؓ کے یہ آثار صحیح بھی تسلیم کر لیے جائیں تو پھر بھی یہ فریق ثانی کے سراسر خلاف پڑتے ہیں۔ کیونکہ حضرت عمرؓ کے ان آثار میں سورۂ فاتحہ کے علاوہ قرآن کریم کے کسی اور حصہ کا بھی ذکر موجود ہے چنانچہ ایک روایت میں یوں ہے فاتحۃ الکتاب وشیئاً (کتاب القرأۃ ص ۶) ایک روایت میں ہے بفاتحۃ الکتاب ومعہا (کتاب القرأۃ ص ۹ و سنن الکبریٰ جلد ۲ ص ۱۶۷) اور ایک روایت میں ہے بفاتحۃ الکتاب وشیئ معہا (کتاب القرأۃ) اور ایک روایت میں ہے بفاتحۃ الکتاب ومعہا شیئ (جامع المسانید جلد ۱ ص ۳۴۶) اگر فریق ثانی حضرت عمرؓ کے اس اثر کو صحیح سمجھتا ہے تو معہا شیئ کی زیادت کو کیوں ہضم کر جاتا ہے؟ مؤلف خیر الکلام لکھتے ہیں کہ اس زیادت کو بیان کرنے والا عبایہؒ ہے پھر یہ کس طرح صحیح ہو سکتی ہے؟ (محصلہ ص ۲۹۳) الجواب: جامع المسانید کی سند میں عبایہ نہیں ہے اسی طرح مؤلف مذکور کا اس روایت کو سری نمازوں پر محمول کرنا بے دلیل ہے اور معہا سے اذکار مراد لینا بھی خلاف اصل ہے کیونکہ جب بات قرأت قرآن ہو رہی ہے تو بلا قوی قرینہ کے کیوں اصل کو چھوڑا جائے بلاشک فرض اور مستحب ایک امر میں جمع ہو سکتے ہیں مگر حضرت عمرؓ ما زاد کو واجب سمجھتے ہیں کما مرّ۔ بہرحال ان کی طرف سے جو معقول جواب ومعہا کی زیادت کا دیا جائے گا وہی جواب ہماری طرف سے قرأت فاتحہ کا سمجھ لیں اور فتح الباری کے حوالہ سے پہلے عرض کیا جا چکا ہے کہ حضرت عمرؓ ما زاد علی الفاتحہ کے وجوب کے قائل تھے۔ مؤلف خیر الکلام کا یہ کہنا کہ ما زاد کو حضرت عمر فرض نہیں سمجھتے ہوں گے اھ (ص ۲۹۲) مردود ہے کیونکہ باحوالہ عرض کیا گیا ہے کہ وہ ما زاد کو واجب سمجھتے ہیں، احناف کے نزدیک ثبوت اور دلالت کے لحاظ سے فرض اور واجب میں فرق ہے لیکن دیگر حضرات ان میں فرق ملحوظ نہیں رکھتے یا محض برائے نام فرق سمجھتے ہیں۔ چنانچہ خود مؤلف خیر الکلام لکھتے ہیں کہ کیونکہ شریعت میں واجب اور فرض میں

کوئی فرق نہیں الخ (ص۱۴۲) یا تو فریق ثانی حضرت عمرؓ کے اثر کے پیش نظر ما زاد علی الفاتحہ کے وجوب کا بھی قائل ہو جائے اور یا یہ تحقیق قبول کرے کہ حضرت عمرؓ کا یہ اثر منفرد کے حق میں ہے جس پر سورۂ فاتحہ کے علاوہ ما زاد بھی واجب ہے اور چونکہ حضرت عمرؓ امام کے پیچھے قرأت کے قائل نہ تھے حتیٰ کہ انہوں نے یہ بھی فرمایا کہ کاش جو شخص امام کے پیچھے قرأت کرتا ہے اس کے منہ میں پتھر ڈالا جائے جیسا کہ پہلی جلد میں گذر چکا ہے تو اس لیے قرین قیاس یہی ہے کہ یہ بعض راویوں کی غلطی ہے اور یہ اثر منفرد کے حق میں ہے نہ کہ مقتدیوں کے حق میں۔

حضرت علیؓ کا اثر:۔ سنن الکبریٰ جلد ۲ صـ۱۶۸۔ مستدرک جلد ۱ صـ۲۳۹، دار قطنی جلد ۱ صـ۱۲۲، طحاوی جلد ۱ صـ۱۲۳، کتاب القرأۃ صـ۶۳ اور جزء القرأۃ صـ۱۳ وغیرہ میں روایت ہے (واللفظ للاٰخر)

عن علیؓ بن ابی طالب انہ کان یأمر ویحب ان یقرأ خلف الامام فی الظہر والعصر بفاتحۃ الکتاب وسورۃ سورۃ وفی الاخریین بفاتحۃ الکتاب۔

حضرت علیؓ سے روایت ہے کہ وہ اس بات کو پسند کرتے اور اس کا حکم دیا کرتے تھے کہ امام کے پیچھے ظہر اور عصر کی پہلی دو رکعتوں میں سورۂ فاتحہ اور اس کے ساتھ کوئی اور سورت بھی اور پچھلی دونوں رکعتوں میں صرف سورۂ فاتحہ پڑھی جائے۔

مؤلف خیر الکلام لکھتے ہیں کہ امام دارقطنیؒ، امام بیہقیؒ اور علامہ ذہبیؒ اس اثر کو صحیح کہتے ہیں (محصلہ ص۲۹۸-۲۹۹)

جواب:۔ یہ روایت بھی قابل استدلال اور فریق ثانی کو مفید نہیں ہو سکتی اولاً اس لیے کہ سند میں سفیانؒ بن حسینؒ ہے امام احمدؒ فرماتے ہیں کہ زہریؒ کی روایت میں وہ نہایت ضعیف اور کمزور ہے، یحییٰؒ بن القطانؒ اور ابن معینؒ فرماتے ہیں کہ زہریؒ کی روایت میں یہ ثقہ نہ تھے ابن سعدؒ کہتے ہیں کہ اس کی حدیث میں بکثرت خطا ہوتی ہے یہی بات ان سے متعلق یعقوبؒ ابن شیبہؒ نے بھی کہی ہے۔ ابو حاتمؒ کہتے ہیں کہ اس سے احتجاج صحیح نہیں ہے۔ امام نسائیؒ کہتے ہیں کہ زہریؒ کی روایت میں ضعیف ہے، ابن حبانؒ کہتے ہیں کہ امام زہریؒ سے الٹ پلٹ روایتیں بیان کرتا ہے ابن عدیؒ کا بیان ہے کہ زہریؒ کی حدیث میں قابل احتجاج نہیں ہے (میزان جلد ۱ صـ۳۹۴) حافظ ابن حجرؒ لکھتے ہیں کہ زہریؒ کی روایت میں ضعیف ہے (تقریب صـ۱۲۸) قاضی شوکانیؒ لکھتے ہیں کہ زہریؒ کی روایت میں یہ ضعیف ہے (نیل الاوطار جـ۳ صـ۱۹) شیخ الاسلام ابن تیمیہؒ لکھتے ہیں کہ تمام محدثینؒ کا اتفاق ہے کہ زہریؒ کی روایت میں یہ ضعیف ہے

اس کی جو روایت زہریؒ کے طریق سے ہوگی وہ محض ہیچ ہے (فتاویٰ جلد ۱ ص ۴۱۵) اور یہ روایت بھی زہریؒ ہی کے طریق سے ہے اور مؤلف خیر الکلام لکھتے ہیں کہ زہریؒ میں اس کے ضعف کی یہ وجہ ہے کہ زہریؒ کا صحیفہ اس پر خلط ملط ہوگیا تھا الخ (ص ۲۹۹) کچھ بھی ہو اس کا ضعف ان کو مسلّم ہے مبارکپوری صاحبؒ نے یہ کہا ہے کہ اس روایت کو امام شعبہؒ نے روایت کیا ہے اور محدثینؒ نے ان کا یہ قول نقل کیا ہے کہ شعبہؒ ثقہ مشائخ سے ہی روایت کرتے ہیں لہٰذا یہ روایت بھی صحیح ہوگی لیکن یہ ان کا وہم ہے اور آخر میں خود مبارکپوری صاحبؒ کو اس کا احساس بھی ہوگیا تھا چنانچہ وہ لکھتے ہیں کہ امام بیہقیؒ امام شعبہؒ سے روایت کرتے ہیں کہ جب میں تم سے اعمشؒ ابو اسحاقؒ اور قتادہؒ کے طریق سے روایت بیان کروں تو اگرچہ وہ عنعنہ سے ہو تب بھی اس کو سماع پر محمول کرنا حافظ ابن حجرؒ لکھتے ہیں کہ یہ عمدہ قاعدہ ہے کہ جب امام شعبہؒ کی روایت ان تینوں سے مروی ہو تو تدلیس مضر نہ ہوگی اگرچہ وہ روایت معنعن ہی کیوں نہ ہو (تحفۃ الاحوذی جلد ۱ ص ۲۷) معلوم ہوا کہ امام شعبہؒ کا یہ ارشاد ان تینوں کی تدلیس سے متعلق ہے نہ کہ جملہ رواۃ کی توثیق سے متعلق امام دارقطنیؒ نے معمرؒ کی طریق سے بھی روایت نقل کی ہے اور اس کو صحیح کہا ہے اور مؤلف خیر الکلام نے اس کو متابع کہا ہے مگر اس میں بھی مدار زہریؒ پر ہے اور وہ عنعنہ سے روایت کرتے ہیں، فریق ثانی کے نزدیک یہ قاعدہ مسلّم ہے چنانچہ مبارکپوری صاحبؒ ان کی معنعن حدیث کو اس لیے رد کرتے ہیں کہ وہ مدلس تھے اور یہاں بھی وہ عنعنہ سے روایت کرتے ہیں۔ وثانیاً اگر یہ اثر صحیح ہے تو اس سے صرف ظہر اور عصر کی نمازوں میں امام کے پیچھے سورۂ فاتحہ کا ثبوت ہوگا اور یہ دونوں سری نمازیں ہیں حالانکہ فریق ثانی تمام نمازوں میں اس کا مدعی ہے وثالثاً اس اثر میں سورۂ فاتحہ کے علاوہ کسی اور سورت کا بھی حکم موجود ہے مگر فریق ثانی اس کا قائل نہیں ہے۔ مبارکپوری صاحبؒ نے سفیانؒ بن حسینؒ کا ایک متابع اسحاقؒ بن راشدؒ (جس کی روایت جزء القراءۃ ص ۲ وغیرہ میں ہے) بیان کیا ہے (ابکار المنن ص ۱۴۲) لیکن محدث ابن خزیمہؒ فرماتے ہیں کہ اسحاقؒ بن راشدؒ سے احتجاج درست نہیں ہے (میزان جلد ۱ ص ۸۹) امام نسائیؒ اس کو ضعیف کہتے ہیں (تہذیب جلد ۱ ص ۲۳۰) ابن معینؒ کہتے ہیں کہ زہریؒ کی روایت میں یہ ضعیف ہے (ایضاً) حافظ ابن حجرؒ لکھتے ہیں کہ زہریؒ سے جو یہ روایت کرتا ہے اس میں وہم ہوتا ہے (تقریب ص ۲۸) اور یہ روایت بھی زہریؒ ہی سے ہے مبارکپوری صاحبؒ نے امام معمرؒ کو بھی ان کا متابع بیان کیا ہے (ان کی روایت دارقطنی جلد ۱ ص ۱۲۲ میں

سے ہے اور دارقطنیؒ اس کی تصحیح کرتے ہیں) لیکن اس میں بھی زہری عنعنہ سے روایت کرتے ہیں اور مدار انہیں پر ہے اور مبارکپوری صاحبؒ کے حوالہ سے گذر چکا ہے کہ وہ ان کی معنعن حدیث کو صحیح اور حسن سمجھنے پہ آمادہ نہیں ہیں سنن الکبریٰ جلد ۲ صہ ۱۶۸ میں بھی یہ روایت ہے اور اس میں بھی یہ روایت معنعن ہے علاوہ ازیں اس روایت میں بھی ظہر اور عصر کی نماز کا ذکر ہے اور سورۂ فاتحہ کے علاوہ کسی اور سورت کا بھی ذکر ہے حالانکہ فریق ثانی فاتحہ کے علاوہ کسی اور سورت کا قائل نہیں ہے اس لیے اس اثر سے صرف سورۂ فاتحہ کی اجازت پر اور خصوصاً جملہ نمازوں میں اس کے ضروری ہونے پر استدلال ہرگز صحیح نہیں ہے۔ حضرت علیؓ کا ایک اثر کتاب القرآۃ صہ ۶۲ اور سنن الکبریٰ ج۲ صہ ۱۶۸ وغیرہ میں بھی (ان سے یہ اثر حکمؒ اور حمادؒ کے طریق سے) مروی ہے لیکن خود امام بیہقیؒ اس کو مرسل کہتے ہیں (ص ۱۶۸ ج ۲) امام طحاویؒ بھی اس کو منقطع کہتے ہیں (احکام القرآن جلد ۳ صہ ۴۳) اور فریق ثانی مرسل کو ضعیف سمجھتا ہے اور یہ تو لغوی مرسل (یعنی منقطع) ہے ان کا ایک اثر کتاب القرآۃ صہ ۵۸ اور صہ ۶۳ میں بھی مذکور ہے لیکن ایک سند میں محمدؒ بن مغیرہؒ بن عبدالرحمٰنؒ مجہول ہے۔ دوسرا راوی اس سند کا حسینؒ بن محمد مروزیؒ ہے حافظ ابن حجرؒ لکھتے ہیں کہ وہ مجہول ہے (تقریب صہ ۹۴) تیسرا راوی اس سند کا معقلؒ بن عبیداللہؒ ہے حافظ موصوف لکھتے ہیں کہ وہ صدوق یخطئ تھا (تقریب ۳۵۹) اور دوسری سند میں ابو علی بن ابراہیمؒ اور احمدؒ بن مہدیؒ وغیرہ راوی ہیں کتب رجال سے ان کا پتہ نہیں چل سکا کہ وہ کیسے تھے؟ مبارکپوری صاحبؒ نے کتاب القرآۃ صہ ۱۳۴ کے حوالہ سے حضرت علیؓ کا یہ فتویٰ بھی نقل کیا ہے کہ امام کے پیچھے سورۂ فاتحہ پڑھنی چاہیئے اور یہ بھی نقل کیا ہے کہ وھذا اسناد من اصح الاسانید فی الدنیا (تحقیق الکلام جلد ۲ صہ ۱۶۰) یہ دنیا کی تمام سندوں سے صحیح ہے۔

الجواب:۔ اگرچہ اس کے اور بھی سند اور معنی کے لحاظ سے کئی جوابات دیئے جاسکتے ہیں مگر ہم صرف وہی جواب عرض کرتے ہیں جو خود مبارکپوری صاحبؒ کے قلم سے نکلا ہے۔ اس روایت میں زہریؒ عنعنہ سے روایت کرتے ہیں اور مبارکپوری صاحبؒ ایک مقام پہ لکھتے ہیں۔ فی اسنادہ الزھری وھو مدلس ورواہ عن سالم بالعنعنۃ فکیف یکون اسنادہ صحیحا (ابکار المنن صہ ۵۶) اس کی سند میں زہریؒ ہیں جو مدلس تھے اور سالمؒ سے عنعنہ کے ساتھ روایت کرتے ہیں۔ تو اس کی اسناد کیسے صحیح ہو سکتی ہیں؟ اور دوسرے مقام پر لکھتے ہیں۔ فی سندہ الزھریؒ وھو

عن طلحۃ بن عبد اللہ بالعنعنۃ فکیف یکون اسنادہ صحیحا (ص ۲۵) اس کی سند میں زہریؒ ہیں جو مدلس تھے اور وہ طلحہؓ سے عنعنہ کے ساتھ روایت کرتے ہیں پھر کیونکر اس کی سند صحیح ہو سکتی ہے؟ مبارکپوری صاحبؒ ہی ازراہِ کرم و انصاف فرمائیں کہ جب زہریؒ کی معنعن روایت صحیح تک نہیں ہو سکتی تو وہ اصح الاسانید کیسے ہوگی؟ اور پھر تمام روئے زمین کی اسانید سے وہ اصح کیسے ہوگی؟ الغرض دیگر حضرات محدثین کرامؒ کے اصول کے تحت بھی اور خود فریق ثانی کے نزدیک بھی حضرت علیؓ کے پیش کردہ جملہ آثار ضعیف کمزور اور معلول ہیں اور مزید براں ان میں جہری نمازوں کا ذکر تک نہیں اور سری نمازوں میں بھی سورۃ فاتحہ کے علاوہ کسی اور سورت کا بھی ساتھ ذکر ہے۔ مگر فریق ثانی اس کی مطلقاً پرواہ نہیں کرتا۔

حضرت ابیؓ بن کعب کا اثر:۔

ان سے یہ روایت کی گئی ہے اِنَّہٗ کَانَ یَقْرَأُ خَلْفَ الْاِمَامِ (جزء القراۃ ص ۱۲ و کتاب القراۃ ص ۶۲) کہ وہ امام کے پیچھے قرأت کیا کرتے تھے۔

جواب:۔ اس کی سند میں زیاد بکائیؒ ہے امام نسائیؒ لکھتے ہیں کہ وہ قوی نہ تھا (ضعفاء ص ۴۳) ابو حاتمؒ کہتے ہیں کہ اس سے احتجاج صحیح نہیں ہے۔ ابن مدینیؒ اور ابن سعدؒ وغیرہ اس کی تضعیف کرتے ہیں (میزان جلد ۱ ص ۳۵۷) ابن معینؒ کہتے ہیں کہ حدیث میں یہ قابل اعتبار نہیں صالحؒ کا بیان ہے کہ وہ فی نفسہٖ ضعیف ہے، ابن حبانؒ اس کو فاحش الغلط اور کثیر الوہم کہتے ہیں اور کہتے ہیں جب یہ منفرد ہو تو اس سے احتجاج درست نہیں ہے (تہذیب التہذیب جلد ۳ ص ۳۷۵) حافظ ابن حجرؒ لکھتے ہیں کہ یہ کمزور ہے (التقریب ص ۱۳۲) کتاب القراۃ ص ۶۲، دارقطنی جلد ۱ ص ۱۲۰ اور سنن الکبریٰ جلد ۲ ص ۱۹۸ وغیرہ میں ایک دوسری سند سے یہ روایت منقول ہے لیکن اس کی سند میں ابو جعفر رازیؒ ہے جس کا نام عیسیٰؒ بن ابی عیسیٰ ماہانؒ ہے۔ امام احمدؒ اور نسائیؒ کہتے ہیں کہ وہ قوی نہ تھا ابن مدینیؒ اس کو صاحب غلط اور خطا کہتے ہیں۔ فلاسؒ اس کو سیئ الحفظ کہتے ہیں ابن حبانؒ کہتے ہیں کہ مشہور راویوں سے منکر روایتیں بیان کرتا ہے۔ ابو زرعہؒ کہتے ہیں کہ وہ بکثرت وہم کا شکار تھا (میزان جلد ۲ ص ۳۱۵) زکریا ساجیؒ کہتے ہیں کہ وہ صاحب اتقان نہ تھا۔ ابن خراشؒ اس کو سیئ الحفظ کہتے ہیں عجلیؒ کہتے ہیں کہ وہ قوی نہ تھا۔ حافظ ابن حجرؒ اس کو سیئ الحفظ کہتے ہیں (تہذیب التہذیب جلد ۱۲ ص ۵۴)

یہ اثر بھی انتہائی ضعیف اور مجروح ہے نیز یہ بھی نہ بھولئے کہ مطلق قرأت سے سورۃ فاتحہ کی قرأت کیسے ثابت ہو گی؟ کیونکہ اس اثر میں سورۃ فاتحہ کا کوئی ذکر نہیں ہے۔ اور فریق ثانی کی رٹ سورۃ فاتحہ کی ہے۔ مؤلف خیر الکلام نے بعض توثیقی کلمات نقل کر کے آگے لکھا ہے کہ توثیق کے بعد جرح مذکور کا کوئی اعتبار نہ ہو گا کیونکہ وہ مبہم ہے اور اس کی دو سندیں اور ہیں تعدد طرق سے حسن روایت صحیح ہو جاتی ہے (محصلہ ص۲۴۳) الجواب :- فاحش الغلط اور کثیر الوہم وغیرہ جرح مفسر ہے اس کو مبہم کہہ دینا اصول حدیث سے بے خبری کی دلیل ہے، چنانچہ حافظ ابن حجرؒ حدیث کی مردود قسموں پر بحث کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ

فمن فحش غلطه، او کثرت غفلته او ظهر فسقه فحدیثه منکر (شرح نخبة الفکر ص۵۹)

سو جس شخص کی غلطیاں زیادہ ہوں، یا اس کی غفلت زیادہ ہو یا اس کا فسق ظاہر ہو تو اس کی حدیث منکر ہوتی ہے۔

پھر آگے راوی کے وہم کی بحث کی ہے اور اس کی حدیث کو معلل کہا ہے۔ اور آخر میں راوی کے سوء حفظ پر کلام کیا ہے اور یہ لکھا ہے کہ اگر سوء حفظ تمام حالات میں راوی کو لازم رہے تو اس کی حدیث شاذ کہلاتی ہے اور اگر سوء حفظ طاری ہو تو اس کی مختلط کہتے ہیں اور تقریب النواوی میں ہے کہ:

واذا قالوا متروک الحدیث او واهیه او کذاب فهو ساقط لا یکتب حدیثه (مع التدریب ص۲۳۱)

جب محدثینؒ کسی راوی کو متروک الحدیث، یا واہی الحدیث یا کذاب کہیں تو وہ ساقط الاعتبار ہوتا ہے اور اس کی لکھی بھی نہیں جا سکتی۔

اور اس کی شرح میں لکھا ہے کہ:-

ولا یعتبر به ولا یستشهد (تدریب الراوی ص۲۳۳)

اور نہ تو اس کو اعتبار (و متابعت) میں پیش کیا جا سکتا ہے اور نہ شاہد میں۔

اور تقریب النواویؒ اور اس کی شرح میں اس کی تصریح موجود ہے کہ:-

واذا اجتمع فیه ای الراوی جرح مفسر وتعدیل فالجرح مقدم ولو زاد عدد المعدل هذا هو الاصح عند الفقهاء والاصولیین ونقله الخطیب عن جمهور العلماء اهـ (تدریب الراوی ص۲۰۴)

اگر راوی میں جرح اور تعدیل جمع ہو جائیں تو جرح مقدم ہو گی اگرچہ تعدیل کرنے والوں کی تعداد زیادہ بھی کیوں نہ ہو فقہاء اور ارباب اصول حدیث کے نزدیک یہی صحیح ہے اور خطیب بغدادیؒ نے جمہور علماء سے یہی نقل کیا ہے۔

مؤلف خیر الکلام نے ص۴۷ و ص۴۸ میں الرفع والتکمیل کے حوالہ سے جو عبارتیں نقل کی ہیں اولاً تو اس میں منکر الحدیث وغیرہ کو جو جرح مبہم کے تحت درج کیا ہے قابل تسلیم نہیں ہے کیونکہ ابھی ہم باحوالہ عرض کر چکے ہیں کہ منکر الحدیث ایسی مفسر جرح ہے کہ بطور اعتبار اور شاہد بھی ایسے راوی کی روایت نہیں پیش کی جاسکتی وثانیاً الرفع والتکمیل (ص۸) کی عبارت میں جس کو خود مؤلف خیر الکلام نے ص۴۷ میں لکھا ہے یہ شرط بھی ہے کہ من غلب ان یذکر سبب الطعن۔ یہ الفاظ بولے مگر اس کے طعن کا سبب بیان نہ کرے اور زیاد بکائیؒ وغیرہ کے بارے میں فاحش الغلط اور کثیر الوہم وغیرہ کی مفسر جرح موجود ہے اور ائمہؒ نے صراحت کے ساتھ سبب طعن ان میں ذکر کیا ہے پھر مؤلف خیر الکلام اس کو جرح مبہم کہہ کر کس طرح سستی گلو خلاصی کر سکتے ہیں؟ اور تعدد طرق کا بہانہ بھی بڑا عجیب ہے، تعدد طرق سے حدیث وہاں صحیح یا حسن لغیرہ ہو سکتی ہے جہاں ہر ایک سند کی روایت پر قابل برداشت جرح ہو نہ یہ کہ وہاں مفسر اور کڑی جرح بھی موجود ہو اور پھر بھی تعدد طرق سے حدیث صحیح یا حسن قرار پائے نواب صاحبؒ کا حوالہ اس سلسلہ میں پہلے عرض کیا جا چکا ہے، بہر حال یہ روایت ضعیف ہے اور معاملہ احکام کا ہے۔ اور امام نوویؒ تصریح کرتے ہیں کہ:۔

فانہم متفقون علی انہ لا یحتج بالضعیف فی الاحکام (شرح مسلم جلد ۱ ص۲۱)

تمام حضرات محدثین کرامؒ کا اس امر پر اتفاق ہے کہ ضعیف سے احکام میں احتجاج درست نہیں ہے۔

فائدہ:۔ اس اثر کی سند میں ابو سنانؒ کا ذکر آیا ہے محقق نیمویؒ فرماتے ہیں کہ مجھے اس کا نام معلوم نہیں ہو سکا (تعلیق جلد ۲ ص۸۳) راقم کہتا ہے کہ ان کا نام ضرارؒ بن مرۃؒ تھا (تہذیب جلد ۴ ص۴۶۲) اور یہ بالاتفاق ثقہ اور ثبت تھے (تہذیب جلد ۴ ص۴۵۷) حضرت ابی بن کعبؓ کی ایک روایت ان الفاظ سے مروی ہے۔ کان یقرأ خلف الامام فی الظہر والعصر (کتاب القرأۃ ص۶۲) کہ وہ ظہر اور عصر کی نماز میں امام کے پیچھے قرأت کیا کرتے تھے لیکن اس سے بھی فریق ثانی کا احتجاج باطل ہے۔

اولاً اس لیے کہ اس کی سند میں یحییٰؒ بن العلاءؒ ہے امام احمدؒ بن حنبلؒ فرماتے ہیں کہ یہ کذاب جعلی حدیثیں بنایا کرتا تھا۔ ابن معینؒ اس کو لیس بثقہ اور لیس بشیء کہتے ہیں عمروؒ بن علیؒ، نسائیؒ، دولابیؒ اور دارقطنیؒ اس کو متروک الحدیث کہتے ہیں امام وکیعؒ، ابو زرعہؒ، ابو حاتمؒ اور ابو داؤدؒ اس کو ضعیف کہتے ہیں، ابن حبانؒ کہتے ہیں کہ اس سے احتجاج صحیح نہیں ہے، ابن عدیؒ کہتے ہیں کہ اس کی

حدیثیں موضوع اور جعلی ہیں، ساجیؒ اس کو منکر الحدیث کہتے ہیں (تہذیب التہذیب جلد ۱ ص ۲۶۲) مؤلف خیر الکلام نے یہاں بھی یہ لکھ کر گلو خلاصی چاہی ہے کہ یہ سب جرحیں مبہم ہیں لا سبحان اللہ تعالیٰ (ص ۲۰۵) وثانیاً اس اثر میں ظہر اور عصر کی قید ہے اور فریق ثانی تمام نمازوں میں قرأت کا مدعی ہے وثالثاً اس میں مطلق قرأت کا ذکر ہے سورۂ فاتحہ کی تخصیص اس میں موجود نہیں ہے لہٰذا معنوی اعتبار سے بھی یہ اثر ان کو کسی طرح بھی مفید نہیں ہو سکتا۔

حضرت عبد اللہؓ بن مسعود:۔

ھذیلؒ بن شرحبیلؒ فرماتے ہیں کہ حضرت ابن مسعودؓ امام کے پیچھے عصر کی نماز میں پہلی دونوں رکعتوں میں سورۂ فاتحہ اور اس کے ساتھ کوئی اور سورت بھی پڑھا کرتے تھے (کتاب القرأۃ ص ۶۴ وابکار ص ۹۳)

جواب:۔ یہ اثر بھی ضعیف ہے کیونکہ اس کی سند میں ایک راوی لیثؒ بن ابی سلیمؒ ہے امام دار قطنیؒ (جلد ۱ ص ۱۲۶ میں) امام بیہقیؒ (کتاب القرأۃ ص ۱۰۱ میں) اور امام احمدؒ، امام یحییٰؒ اور امام نسائیؒ وغیرہ سب اس کو ضعیف اور کمزور کہتے ہیں (میزان جلد ۲ ص ۴۹، تہذیب التہذیب جلد ۸ ص ۴۶۸، قانون الموضوعات ص ۲۸۷) اور دوسرا راوی اس سند کا عبد الرحمٰنؒ بن ثروانؒ ہے امام احمدؒ فرماتے ہیں کہ اس سے احتجاج صحیح نہیں ہے (میزان جلد ۲ ص ۲۰) نیز اس اثر میں ظہر و عصر کی نماز کی تخصیص ہے اور وہ بھی صرف پہلی دو رکعتوں میں اور فاتحہ کے ساتھ کسی اور سورت کا بھی ذکر ہے۔ حضرت ابن مسعودؓ سے ایک روایت یوں ہے کہ وہ امام کے پیچھے ظہر اور عصر کی نماز میں قرأت کرتے تھے۔ سنن الکبریٰ ص ۱۶۹ ج ۲ کتاب القرأۃ ص ۶۳، تعلیق الحسن جلد ۱ ص ۹۳ ابکار المنن ص ۱۴۳ اور جزء القرأۃ ص ۱۳ (جزء القرأۃ میں ظہر اور عصر کا لفظ موجود نہیں ہے) لیکن اس روایت کا مرکزی راوی شریکؒ ہے، امام بیہقیؒ ایک مقام پر لکھتے ہیں کہ اکثر محدثین اس سے احتجاج نہیں کرتے (جلد ۱۰ ص ۲۷۱) اور دوسرے مقام پر لکھتے ہیں کہ یحییٰ قطانؒ اس کی اشد تضعیف کرتے تھے (جلد ۶ ص ۱۳۶) عبد اللہؒ بن مبارکؒ فرماتے ہیں کہ اس کی حدیث قابل قبول نہیں ہے جوزجانیؒ اس کو سیئ الحفظ اور مضطرب الحدیث کہتے ہیں ابراہیمؒ بن سعیدؒ کہتے ہیں کہ شریکؒ نے چار سو احادیث میں غلطی کی ہے (میزان جلد ۱ ص ۴۴۴ وتہذیب جلد ۴ ص ۳۳۴) علامہ جزائریؒ لکھتے ہیں کہ ان کی حدیث مردود اور غیر مقبول ہے (توجیہ النظر ص ۲۵۳) حافظ ابن حجرؒ اس کو کثیر الخطأ لکھتے ہیں (تقریب ص ۱۴۹) مبارکپوریؒ صاحبؒ ایک مقام پر لکھتے ہیں یہ حدیث حسن

کیسے ہو سکتی ہے اس کی سند میں شریک منفرد ہے اور وہ صاحب خطاء کثیر الغلط اور غرائب حافظہ کے مالک تھے (تحفۃ الاحوذی جلد ۱ صفحہ ۲۸۸) نیز اس روایت میں قرآت کا ذکر ہے سورۃ فاتحہ کی تخصیص نہیں ہے اور وہ بھی صرف ظہر اور عصر کی نمازمیں اور جلد اوّل میں صحیح اسانید کے ساتھ حضرت عبداللہؓ بن مسعود کا محقق مسلک نقل کیا جا چکا ہے کہ وہ کسی نماز میں امام کے پیچھے کسی قرآت کے قائل نہ تھے نہ سورۃ فاتحہ کے اور نہ کسی اور سورت کے اس لیے فریق ثانی کا حضرت ابن مسعودؓ کے اثر سے استدلال روایۃً و درایۃً ہر طرح سے مردود ہے۔ مؤلف خیر الکلام لکھتے ہیں کہ ان آثار میں اگرچہ کچھ ضعف ہے مگر مجموعی طور پر ان سے احتجاج درست ہے اور جن آثار میں ظہر و عصر کی قید ہے وہ اتفاقی ہے اور اس کے خلاف جو ان کا فتویٰ ہے وہ جہر پر محمول ہے (محصلہ صفحہ ۲۳۰، ۲۳۱)۔

الجواب: جن آثار میں کچھ ضعف ہے ان کی بجائے آپ وہ آثار کیوں نہیں لے لیتے جو بالکل صحیح ہیں جو جلد اوّل میں گذر چکے ہیں اور ظہر و عصر کی قید خالص احترازی ہے کیونکہ اس کے اتفاقی ہونے کی کوئی دلیل موجود نہیں ہے اور ان کے قول کو جہر پر محمول کرنا خالص سینہ زوری ہے وہ امام کے پیچھے نفس قرآت کے ہی منکر ہیں جو صحیح روایات سے ثابت ہے کما مرّ

حضرت عبداللہؓ بن مغفل کا اثر: امام بخاریؒ اپنی سند کے ساتھ یہ روایت نقل کرتے ہیں۔

عن عبد اللہؓ بن مغفل انہ کان یقرأ فی الظہر و العصر خلف الامام فی الاولیین بفاتحۃ الکتاب و سورتین و فی الاخریین بفاتحۃ الکتاب (جزء القرأۃ صفحہ ۱۳)

کہ حضرت عبداللہؓ بن مغفل ظہر اور عصر کی پہلی دونوں رکعتوں میں امام کے پیچھے سورۃ فاتحہ اور دو اور سورتیں بھی پڑھا کرتے تھے اور پچھلی دونوں رکعتوں میں صرف سورۃ فاتحہ پڑھا کرتے تھے۔

جواب: اس اثر سے بھی فریق ثانی کا احتجاج درست نہیں ہے۔ اوّلاً اس لیے کہ اس سند میں عمر بن ابی سحیمؒ ہے علامہ ذہبیؒ فرماتے ہیں کہ یہ راوی مجہول ہے چنانچہ حافظ ابن حجرؒ فرماتے ہیں وقال الذہبیؒ لا یعرف انتہی کہ علامہ ذہبیؒ فرماتے ہیں کہ وہ مجہول ہے (تہذیب صفحہ ۵۰۴) ابن حبانؒ اس کو ثقات میں لکھتے ہیں لیکن مبارکپوریؒ صاحب لکھتے ہیں کہ آپ کو کوئی خبر نہیں کہ ابن حبانؒ متساہل ہیں (تحقیق الکلام جلد ۲ صفحہ ۱۴۰) وثانیاً اس اثر سے صرف ظہر اور عصر کی سری نمازوں میں امام کے پیچھے قرآت کا ثبوت ہے حالانکہ فریق ثانی سب نمازوں اور سب نمازیوں کے لیے دعویٰ کرتا ہے وثالثاً اس اثر میں سورۃ فاتحہ کے علاوہ اور سورتوں کی قرآت کا بھی ذکر ہے اور فریق ثانی اس کا قائل نہیں ہے اس لیے یہ اثر بھی ان کو چنداں مفید نہیں ہو سکتا مؤلف خیر الکلام لکھتے ہیں کہ گو اس اثر میں ظہر اور عصر کا ذکر ہے مگر باقی کی نفی نہیں مفہوم مخالف کا اعتبار نہیں (محصلہ صفحہ ۲۲۶)

الجواب: ظہر و عصر کی قید احترازی ہے جو باقی کی نفی پر دال ہے اور مفہوم مخالف پر یہ واضح دلیل ہے پھر کیوں حجت نہیں؟ ہاں اگر احناف کی طرح وہ مفہوم مخالف کو حجت نہیں سمجھتے تو صاف بتائیں، تاکہ ہم ان کی پسند کا کوئی اور جواب عرض کر سکیں۔

حضرت ابو سعید الخدریؓ کا اثر:

حضرت ابو نضرؒ کہتے ہیں میں نے حضرت ابو سعید الخدریؓ سے پوچھا عن القرأة خلف الامام فقال بفاتحة الکتاب (جزء القراۃ ص۱۳) کہ امام کے پیچھے قرأت صحیح ہے فرمایا ہاں سورۃ فاتحہ۔

جواب: سند میں عوامؒ بن حمزہؒ ہے ابن جوزیؒ اس کو ضعفاء میں لکھتے ہیں (الجوہر النقی ج۱ ص۱۶۳) امام یحییٰؒ فرماتے ہیں کہ اس کی حدیث محض ہیچ ہے (میزان جلد۲ ص۳۰۱) امام احمدؒ فرماتے ہیں کہ یہ صاحب مناکیر تھے (تہذیب التہذیب جلد۸ ص۱۶۳) مبارکپوری صاحبؒ کہتے ہیں کہ عوام ثقہ ہے کیونکہ جرح مبہم ہے لہذا یہ اثر صحیح ہے (تحقیق الکلام جلد۲ ص۱۵۸) امام الجرح والتعدیل یحییٰؒ تو یہ فرماتے ہیں کہ اس کی حدیث لیس بشیء ہے اور امام احمدؒ اس کو صاحب مناکیر کہہ کر منکر الحدیث بتاتے ہیں لیکن عجیب بات ہے کہ مبارکپوری صاحب کے نزدیک یہ جرح مبہم ہے؟ کیا مولانا کو اپنا لکھا ہوا یہ ارشاد یاد نہیں کہ جس راوی سے متعلق منکر الحدیث ہونیکا الزام ہو اسکی حدیث قابل ترک ہے کیونکہ یہ جرح مفسر ہے (ابکار المنن ص۱۹۱) الغرض یہ روایت اور اثر بھی فریق ثانی کو مفید نہیں ہے۔

حضرت انسؓ بن مالک کا اثر: حضرت ثابتؒ سے روایت ہے وہ فرماتے ہیں:

عن انسؓ قال کان یأمرنا بالقرأة خلف الامام وکنت اقوم الی جنب انسؓ فیقرأ بفاتحة الکتاب وسورة من المفصل (کتاب القرأت ص۶۸ و ص۲۴۴)	کہ حضرت انسؓ ہمیں امام کے پیچھے قرأت کرنے کا حکم دیا کرتے اور میں حضرت انسؓ کے پہلو میں کھڑا ہوتا تھا اور وہ سورۃ فاتحہ اور مفصل میں سے کوئی سورت بھی ساتھ پڑھا کرتے تھے۔

جواب: یہ اثر بھی فریق ثانی کو مفید نہیں ہے اوّلاً اس لیے کہ اس کی سند میں وہی عوامؒ بن حمزہؒ ہے جس پر جرح گذر چکی ہے یہ روایت سنن الکبریٰ جلد۲ ص۱۷۱ میں بھی مذکور ہے اور اس کی سند میں عوامؒ بن حوشبؒ ہے اور گو وہ ثقہ ثبت اور فاضل تھے (تقریب ص۲۹۲) لیکن امام بیہقیؒ امام ابن خزیمہؒ وغیرہ کے حوالہ سے یہ نقل کرتے ہیں کہ عوامؒ بن حوشبؒ کا نام لینا صحیح نہیں ہے صحیح یہ ہے کہ یہ راوی عوامؒ بن حمزہؒ ہی ہے وھذا اصح صحیح ترین بات صرف یہی ہے وثانیاً اس اثر میں سورۃ فاتحہ کے علاوہ کسی اور مفصل سورت کا بھی ذکر ہے حالانکہ فریق ثانی اس کا قائل نہیں ہے جو جواب وہ ترک

سورۃ من المفصل کا عنایت فرمائے گا یہی ہماری طرف سے ترک سورۃ فاتحہ کا مچلکہ ہے۔

حضرت عبداللہؓ بن عمروؓ کا اثر: حضرت مجاہدؒ سے مروی ہے، وہ فرماتے ہیں۔

سمعت عبد اللہ بن عمرؓو یقرأ فی الظہر والعصر خلف الامام (سنن الکبریٰ جلد ۲ ص ۱۶۹ و کتاب القرأۃ ص ۹۵)	کہ میں نے حضرت عبداللہؓ بن عمروؓ کو ظہر اور عصر کی نماز میں امام کے پیچھے قرأت کرتے سنا۔

جواب: اگر مبارکپوری صاحبؒ کا قاعدہ پیش نظر رکھا جائے (جیسا کہ انہوں نے ابو اسحاقؒ اور حمادؒ بن سلمہؒ وغیرہ کے متعلق اختیار کیا ہے) تو یہ اثر سنداً صحیح نہیں ہے کیونکہ اس کی سند میں حصینؒ ہیں گو وہ ثقہ تھے لیکن حافظ ابن حجرؒ لکھتے ہیں کہ آخر عمر میں ان کا حافظہ خراب ہو گیا تھا (تقریب ص ۹۵) امام ابو حاتمؒ امام نسائیؒ اور یزیدؒ بن ہارونؒ بھی فرماتے ہیں کہ آخر میں ان کا حافظہ خراب ہو گیا تھا (تہذیب جلد ۲ ص ۳۸۲/۳۸۳) اور اگر اس اثر کو صحیح تسلیم کر لیا جائے جیسا کہ امام بیہقیؒ نے اس کی تصریح کی ہے تو فریق ثانی کو پھر بھی یہ اثر کلیتاً مفید نہیں ہو سکتا کیونکہ اس میں ظہر اور عصر کی قید ہے اور سورۃ فاتحہ کی قرأت کا ذکر نہیں ہے بلکہ دوسری روایت میں اس کی تصریح ہے کہ حضرت عبداللہؓ بن عمروؓ ظہر کی نماز میں امام کے پیچھے سورۃ مریم پڑھتے تھے (سنن الکبریٰ جلد ۲ ص ۱۶۹) امام بیہقیؒ کہتے ہیں کہ یہ صحیح ہے المحقق نیمویؒ لکھتے ہیں اسنادہ صحیح (تعلیق الحسن جلد ۱ ص ۱۴) کہ اس کی سند صحیح ہے لہذا اس اثر کو امام کے پیچھے جملہ نمازوں میں قرأت سورۃ فاتحہ کے اثبات کے لیے پیش کرنا دور از کار بات ہے امام بیہقیؒ نے ایک اور سند نقل کی ہے جس میں حضرت عبداللہؓ بن عمرؓ اور حضرت عبداللہؓ بن عتبہ سے روایت نقل کی ہے کہ وہ دونوں امام کے پیچھے قرأت کرتے تھے۔ (سنن الکبریٰ جلد ۲ ص ۱۶۹) لیکن اس کی سند میں عبدالملکؒ بن محمدؒ ہے امام دارقطنیؒ فرماتے ہیں کہ وہ صدوق تھے لیکن اسانید اور متون میں بکثرت خطاء کرتے تھے وہ زبانی روایت بیان کیا کرتے تھے جس کی وجہ سے ان کے اوہام بہت زیادہ ہو چکے تھے (تہذیب جلد ۲ ص ۴۲۰) امام حاکمؒ نقل کرتے ہیں کہ جن روایتوں میں یہ منفرد ہوں ان سے احتجاج صحیح نہیں ہے علامہ ابو القاسمؒ فرماتے ہیں کہ میرے پاس ان کی حدیثوں کی دس جلدیں موجود ہیں لیکن ان میں ایک حدیث بھی ایسی نہیں ہے جو ان کے وہم سے بچ سکی ہو، کسی کی سند میں خرابی ہے تو کسی کے متن میں وہ زبانی روایتیں بیان کیا کرتے تھے، اس لیے

ان کے اوہام بہت زیادہ ہوگئے ہیں (ایضاً ص ۴۲۱) اور ان کا وہم اس سے معلوم ہو سکتا ہے کہ اسی اثر میں یہ تین متضاد نام آتے ہیں عبداللہؓ بن عمرؓ۔ عبداللہؓ بن عقبہ اور عبداللہؓ بن عمروؓ چنانچہ امام بیہقیؒ (بلکہ حضرت امام بخاریؒ بھی یکھیے جزاءالقراۃ ص ۱۳) مؤخرالذکر کے نام کو صحیح سمجھتے ہیں۔ (سنن الکبریٰ جلد ۲ ص ۱۶۹ و کتاب القراۃ ص ۶۵) حضرت عبداللہؓ بن عمرؓ کا محقق مسلک باسند صحیح جلد اول میں نقل کیا جاچکا ہے اور ان کی اس کے خلاف پیش کردہ روایتوں پر کلام آرہا ہے۔ انشاء اللہ العزیز۔

حضرت جابرؓ بن عبداللہؓ کا اثر:۔ یزید فقیرؒ حضرت جابرؓ سے روایت کرتے ہیں:۔

قال کنا نقرأ فی الظھر والعصر خلف الامام فی الرکعتین الاولیین بفاتحۃ الکتاب وسورۃ وفی الآخریین بفاتحۃ الکتاب۔ (ابن ماجہ ص ۶۱ وسنن الکبریٰ ص ۱۷۰ ج ۲ کتاب القراۃ ص ۷۲)

وہ فرماتے ہیں کہ ہم ظہر اور عصر کی پہلی دو رکعتوں میں سورۃ فاتحہ اور اس کے ساتھ کوئی اور سورت بھی اور پچھلی دونوں رکعتوں میں صرف سورۃ فاتحہ پڑھا کرتے تھے۔

جواب:۔ اس اثر سے بھی فریق ثانی کا استدلال صحیح نہیں ہے اولاً اس لیے کہ اس کی سند میں سعیدؒ بن عامرؒ ہے گو وہ ثقہ تھے لیکن ابوحاتمؒ کہتے ہیں کہ ان کی حدیث میں بعض غلطیاں بھی ہوتی ہیں (تہذیب جلد ۴ ص ۵۰) حافظ ابن حجرؒ لکھتے ہیں کہ وہ کبھی وہم کا شکار ہوجاتے تھے (تقریب ص ۱۲۹) مؤلف خیرالکلام لکھتے ہیں کہ امام ابوحاتمؒ متعنت ہیں اس لیے ان کی جرح کا کوئی اعتبار نہیں (ص ۲۰۷)

الجواب:۔ ان کا تعنت وہاں ہوتا ہے جہاں وہ متفرد ہوں اور یہاں تو حافظ ابن حجرؒ بھی ان کو وہمی بتاتے ہیں اس کا معارضہ ان کے اُس اثر سے جو بسند صحیح مؤطا امام مالک اور ترمذی کے حوالے سے نقل کیا جاچکا ہے ہرگز نہیں ہو سکتا۔ مبارکپوری صاحب ایک مقام پر لکھتے ہیں، سو یہ معارضہ بھی صحیح نہیں کیونکہ اس اثر کی سند میں حمادؒ بن سلمہؒ کا واقع ہے (گو وہ ثقہ تھے تقریب ص ۱۰۱ مگر) آخر میں حافظہ متغیر ہوگیا تھا (تحقیق الکلام جلد ۱ ص ۱۲۳) مؤلف خیرالکلام کا یہ کہ یہ حدیث صحیح ہے (ص ۲۰۷) کوئی وزن نہیں رکھتا وثانیاً علامہ ماردینیؒ لکھتے ہیں کہ یہ اثر مضطرب المتن ہے کیونکہ ایک روایت میں خلف الامام کا جملہ نہیں ہے (جزءالقراۃ ص ۹ سنن الکبریٰ جلد ۲ ص ۶۳) اور دوسری روایت میں اس کا ذکر ہے (ایضاً جلد ۲ ص ۱۶۰ و ص ۱۷۰) (الجوہر النقی جلد ۲ ص ۱۶۱) زیادت ثقہ مقبول ہوتی مگر

جب کہ وہ خطا اور وہم کا شکار نہ ہو مؤلف خیر الکلام یہ نکتہ کھا گئے ہیں، نیز ایک مقام میں فاتحۃ الکتاب کے بعد فما فوق ذلك اوقال ما اکثر من ذلك کا ذکر ہے اور دوسرے مقام پر ما فوق کے بجائے سورۃ کا ذکر ہے اور ایک روایت میں فما فوقہا ہے (بیہقی جلد ۲ صفحہ ۹۳) مؤلف خیر الکلام لکھتے ہیں کہ مقتدی کے لیے سری نمازوں میں ما زاد پڑھنا منع نہیں لہٰذا اضطراب کیسا؟ (محصلہ صفحہ ۳۰۷) الجواب اوّلاً تو ما زاد کا مقتدی کے لیے سری نمازوں میں پڑھنے کا جواز محل نظر ہے وثانیاً وہمی راوی کے الفاظ میں اس نمایاں اضطراب کا یہ جواب غیر تسلی بخش ہے وثالثاً حضرت شاہ عبد الغنی مجددیؒ (المتوفی ۱۲۶۶ھ) لکھتے ہیں۔ حضرت جابرؓ کا یہ اثر اس وقت کا ہے جب کہ انہوں نے آنحضرت صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلّم سے قراۃ خلف الامام کی ممانعت نہیں سُنی تھی اور اپنے اجتہاد کے موافق امام کے پیچھے قرأت کرتے رہے جب آنحضرت صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلّم نے منع کر دیا تو باز آ گئے (انجاح الحاجۃ صفحہ ۶۱) اور یہ بالکل صحیح ہے کہ یہ حضرت جابرؓ کا پہلا قول اور عمل ہے بعد کو وہ قراۃ خلف الامام کے قائل نہ رہے تھے اور ان کا یہی مسلک حضرت امام مالکؒ، حضرت احمدؒ اور حضرت امام ترمذیؒ وغیرہ ائمہ فقہ و حدیث نے سمجھا اور اس کو روایت کیا ہے اور ہم نے ان کی صحیح اور متصل روایت بھی پہلے بیان کی ہے جو صراحت سے منع پر دال ہے۔ مؤلف خیر الکلام کا یہ کہنا کہ منع خیالی بات ہے (صفحہ ۳۰۸) خود ایک خیالی پلاؤ ہے۔ ورابعاً چونکہ اس اثر میں خلف الامام کا جملہ صرف سعیدؒ بن عامرؒ نقل کرتے ہیں۔ اور ان کی روایت میں غلطی اور وہم ہوتا ہے اس لیے یہ لفظ ان کی غلطی سے زیادہ ہوا ہے کیونکہ دوسرے راوی اس کو نقل نہیں کرتے چنانچہ یہ روایت یحییٰؒ بن سعیدؒ سے بھی مروی ہے (سنن الکبریٰ جلد ۲ صفحہ ۱۶۳ و کتاب القرأۃ صفحہ ۱۵۱) اور معاویہؒ بن ہشامؒ سے بھی (کتاب القرأۃ صفحہ ۱۵۱) مگر ان کی روایت میں خلف الامام کا جملہ مذکور نہیں ہے اور چونکہ صحیح روایات میں مقتدی کو امام کے پیچھے قرأت سے منع کا حکم آیا ہے اس لیے اصل روایت منفرد کے حق میں تھی لیکن ان کی غلطی اور وہم سے منفرد کے بجائے مقتدی سے جوڑ دی گئی ہے وخامساً اس اثر میں صرف ظہر اور عصر کی نماز کا ذکر ہے اور فریق ثانی کا دعویٰ عموم کا ہے وسادساً اس اثر میں سورۃ فاتحہ کے علاوہ کسی اور سورت کا بھی ذکر ہے حالانکہ فریق ثانی اس کا قائل نہیں ہے اگر یہ اثر ان کے نزدیک صحیح ہے تو جو جواب وہ اس میں سورت کی نفی کا ارشاد فرمائیں گے وہی ہماری طرف سے سورۃ فاتحہ کی نفی اور

ترک کا جواب سمجھ لیں حضرت جابرؓ سے ایک اثر یوں مروی ہے کہ ان کے ایک غلام نے کہا کہ مجھے میرے آقا نے یہ حکم دیا اقرأ فی الظهر والعصر خلف الامام (جزء القرأة ص۱۲ کتاب القرأة ص۶۷ والبکار ص۴۳۱) کہ میں ظہر اور عصر کی نماز میں امام کے پیچھے قرأت کروں لیکن اس سے بھی استدلال صحیح نہیں ہے اولاً اس لیے کہ اس کی سند یوں ہے سفیانؒ بن حسین عن الزہریؒ اور حضرت علیؓ کے اثر کے تحت اس کی پوری تحقیق گذر چکی ہے کہ یہ ضعیف ہے وثانیاً محقق نیمویؒ لکھتے ہیں کہ مولی جابرؓ اس سند میں مجہول ہے نہ معلوم وہ کون اور کیسا تھا؟ (تعلیق الحسن جلد اص ۸۴) وثالثاً اس میں ظہر اور عصر کی قید ہے اور فریق ثانی کا دعویٰ عام ہے حضرت جابرؓ کا مسلک صحیح سند کے ساتھ جلد اوّل میں نقل کیا جا چکا ہے کہ وہ امام کے پیچھے کسی نماز میں کسی قسم کی قرأت کے عموماً اور سورۃ فاتحہ کے خصوصاً ہرگز قائل نہ تھے ان کا ایک اور اثر سن لیجیے امام ابوبکرؒ بن ابی شیبہؒ فرماتے ہیں کہ ہم سے وکیعؒ نے بیان کیا وہ ضحاکؒ بن عثمانؒ سے روایت کرتے اور وہ عبید اللہؒ بن مقسمؒ سے اور وہ حضرت جابرؓ بن عبد اللہؓ سے وہ فرماتے ہیں لا یقرأ خلف الامام (الجوہر النقی جلد ۲ ص ۱۶۱ مع البیہقی) کہ امام کے پیچھے قرأت نہیں کی جا سکتی، اس سند کے سب راوی ثقہ اور ثبت ہیں بقیہ رواۃ کا ترجمہ پہلے اپنے اپنے موقع پر گذر چکا ہے۔ البتہ ضحاکؒ بن عثمان کا ترجمہ باقی ہے، امام احمدؒ ابن معینؒ مصعب زبیریؒ، ابوداؤدؒ، ابن بکیرؒ اور علیؒ بن المدینیؒ سب ان کو ثقہ کہتے ہیں ابوحاتم ان کو صدوق کہتے ہیں ابن حبانؒ ان کو ثقات میں لکھتے ہیں ابن سعدؒ ان کو ثقہ اور کثیر الحدیث کہتے ہیں ابن نمیرؒ ان کو لا بأس بہ اور جائز الحدیث کہتے ہیں (تہذیب جلد ۴ ص ۴۴۷) علامہ ابن ترکمانیؒ فرماتے ہیں یہ سند متصل اور علی شرط مسلم صحیح ہے (الجوہر جلد ۲ ص ۱۶۱)

حضرت عبد اللہؓ بن عباسؓ کا اثر:۔

امام بیہقیؒ اپنی سند کے ساتھ عبد الوہابؒ بن فلیح المکیؒ کے طریق سے روایت کرتے ہیں وہ فرماتے ہیں کہ ہم سے مروانؒ بن معاویہ الفزاریؒ نے اسماعیلؒ بن ابی خالدؒ سے روایت کی وہ فرماتے ہیں کہ ہم سے العیزارؒ بن حربؒ نے روایت کی ہے۔ وہ فرماتے ہیں کہ:۔

سمعت ابن عباسؓ یقول اقرأ خلف الامام بفاتحۃ الکتاب ھذا اسناد صحیح لاغبار علیہ

میں نے حضرت ابن عباسؓ سے سنا انہوں نے فرمایا کہ امام کے پیچھے سورۃ فاتحہ پڑھا کرو، یہ سند صحیح ہے اس

(کتاب القراۃ ص۱۳۷ طبع دہلی وکنز العمال ج۴ ص۲۵۲ و   پر کوئی غبار نہیں ہے۔

تحقیق الکلام ج۲ ص۱۵۹ وایکار ص۱۲۵)

الجواب :۔ اس اثر سے فریق ثانی کا استدلال صحیح نہیں ہے اولاً اس لیے کہ اس کی سند میں مروانؒ بن معاویہ الفزاریؒ ہیں اور وہ عن کے ساتھ روایت کرتے ہیں وہ اگرچہ ثقہ اور ثبت تھے لیکن وہ مجہول راویوں سے روایت کرنے تدلیس کرنے اور رواۃ اور شیوخ کے نام بدل دینے کے عیب میں مبتلا تھے امام ابن معینؒ فرماتے ہیں کہ وہ اگر معروف راویوں سے روایت کریں تو ثقہ ہیں (تذکرہ ج۱ ص۲۷۲) اور اگر مجہول راویوں سے روایت کریں تو ضعیف ہیں (تہذیب التہذیب ج۱۰ ص۹۸) امام ابن معینؒ ہی فرماتے ہیں کہ وہ گلیوں سے ہمارے لیے شیوخ اور رواۃ چن لیتے تھے (تذکرہ ج۱ ص۲۷۲) اور ایسا ہی محدث ابن نمیرؒ نے فرمایا (تہذیب التہذیب ج۱۰ ص۹۸) امام ابن معینؒ فرماتے کہ میں نے تدلیس کرنے میں ان سے بڑا حیلہ گر اور کوئی نہیں دیکھا (ایضاً) نیز انھوں نے فرمایا کہ وہ لوگوں سے مخفی رکھنے کے لیے راویوں کے نام بدل دیتے تھے چنانچہ انھوں نے ہم سے الحکمؒ بن ابی خالدؒ سے روایت بیان کی جو درحقیقت الحکمؒ بن ظہیرؒ ہیں (ایضاً) امام ابوداؤدؒ فرماتے ہیں کہ وہ راویوں کے نام بدل دیتے تھے۔ (اس کارروائی کو اصول حدیث والے تدلیس شیوخ کہتے ہیں۔ صفدر) امام ابوحاتمؒ فرماتے ہیں کہ وہ سچے تو ہیں مگر بکثرت مجہول راویوں سے روایت کرتے ہیں (ایضاً) علامہ ذہبیؒ فرماتے ہیں کہ وہ (بے تحاشا) زندوں اور مُردوں سے روایت کر لیتے تھے یروی عمن دب ودرج (ایضاً) اور حافظ ابن حجرؒ فرماتے ہیں کہ وہ مدلس ہونے کے ساتھ شیعہ بھی تھے (تقریب ص۲۷۳) اور مؤلف خیر الکلام لکھتے ہیں کہ وہ تدلیسِ شیوخ کرتے تھے اور اس کا امر ہلکا ہے (محصلہ ص۳۱۶) لیکن اسی پیش نظر کتاب میں باحوالہ اس کی تصریح موجود ہے کہ تدلیس زنا سے بھی بدتر ہے (مگر صحیحین میں رواۃ کی تدلیس اور بعض مخصوص رواۃ مثلاً قتادہؒ، اعمشؒ اور ابوالزبیر محمدؒ بن مسلمؒ بن تدرسؒ وغیرہ کی تدلیس اس کی زد اور حد میں نہیں ہے کما مر) اور امام نوویؒ تدلیسِ شیوخ کے بارے لکھتے ہیں وھو قبیح مذموم الخ (شرح مسلم ج۱ ص۱۹) کہ وہ قبیح اور مذموم ہے اور اس روایت کو الفزاریؒ عنعنہ سے بیان کرتے ہیں جس پر خاصا غبار ہے اور یہ صحیح نہیں ہے و ثانیاً اصل سند میں امام بیہقیؒ نے راوی کا نام الفراد بن حرب نقل کیا ہے جو مجہول ہے معلوم نہیں کہ وہ کون اور کیسا تھا؟ جب تک

کتب اسماء الرجال سے باحوالہ اس کی توثیق سامنے نہ آجائے اس کی صحت ثابت نہیں ہو سکتی۔ امام بیہقیؒ نے اگرچہ اس اسناد کو صحیح لاغبار علیہ فرمایا ہے مگر امام بیہقیؒ کا رواۃ کی توثیق اور تضعیف کے بارے نظریہ خود ان کے اپنے حوالوں کی روشنی میں پہلے بیان ہو چکا ہے اور حاشیہ پر تسخہ کا عنوان دے کر امام بیہقیؒ نے اس راوی کے بدلے العیزارؒ بن حریثؒ لکھا ہے اس کا مطلب یہ ہوا کہ خود امام بیہقیؒ اس راوی کی تعیین کے بارے میں متردد ہیں اور یہ بھی ممکن ہے کہ یہ الفزاریؒ کی تدلیس اور رواۃ کے نام بدلنے کا اثر اور نتیجہ ہو امام بیہقیؒ نے کتاب القرأۃ ص۶۴ اور سنن الکبریٰ جلد ۲ ص۱۶۹ میں بلا تردد العیزارؒ بن حریثؒ کا نام لیا ہے اور اس سند میں الفزاریؒ بھی نہیں لیکن اس کی سند میں ابو بحر بکاری ہے اور پہلے بیان ہو چکا ہے وہ کذاب تھا وثالثاً اس کی سند میں اسماعیلؒ بن ابی خالدؒ ہیں جو الکوفی تھے (تذکرہ ص۱۴۴ ج۱) اور مؤلف خیر الکلام لکھتے ہیں کہ جب اہل کوفہ کی نقل صحیح نہیں تو تطبیق کی بھی ضرورت نہیں بلفظہٖ (ص۲۹۴) لہٰذا کسی کو کیا مصیبت پڑی ہے کہ اس روایت کی حضرت ابن عباسؓ کی ان صحیح روایات سے تطبیق دینے کے لیے وجوہ تلاش کرے جو جلد اول میں بیان ہو چکی ہیں ورابعاً قطع نظر اس بحث سے اگر یہ روایت صحیح بھی ثابت ہو جائے تو اس سے تمام نمازوں میں قرأت سورۂ فاتحہ کا ثبوت نہیں ہو سکتا کیونکہ طحاوی ص۱۲۱ ج۱ میں اسماعیلؒ بن ابی خالدؒ سے عنعنہ کے ساتھ العیزارؒ بن حریثؒ کی حضرت ابن عباسؓ سے روایت ہے جس میں آتا ہے کہ انہوں نے فرمایا کہ تم امام کے پیچھے فاتحۃ الکتاب ظہر اور عصر کی نماز میں پڑھو اس سے معلوم ہوا کہ ان کی طرف سے اجازت صرف سری نمازوں میں تھی نہ کہ جہری نمازوں میں جیسا کہ مخفی نہیں وخامساً طحاوی جلد ا ص۱۲۱ کی روایت میں یونسؒ بن ابی اسحاقؒ کی العیزارؒ بن حریثؒ سے عنعنہ کے ساتھ روایت ہے وہ فرماتے ہیں کہ میں نے حضرت ابن عباسؓ سے سنا انہوں نے فرمایا کہ لا تصل صلوٰۃ اِلّا قرأت فیھا ولو بفاتحۃ الکتاب کوئی نماز تم قرأت کے بغیر نہ پڑھو اگرچہ فاتحۃ الکتاب ہی کیوں نہ ہو فریق ثانی چونکہ مقتدی کے لیے سورۂ فاتحہ کا پڑھنا فرض اور لازم قرار دیتا ہے اور ولو بفاتحۃ الکتاب کے الفاظ اس فرضیت کے اثبات سے بالکل قاصر ہیں جیسا کہ واضح ہے حضرت ابن عباسؓ سے کتاب القرأۃ ص۶۴ اور اعلاء السنن جلد ۴ ص۹۱ میں ایک روایت یوں آتی ہے کہ امام کے پیچھے قرأت کرو امام جہر کرے یا نہ کرے مگر اس کی سند میں عتبہ بن عبد اللہ الاصم ہے امام ابن معینؒ اس کو لیس بشئی اور امام نسائیؒ لیس بثقۃ

اور فلاسؒ واہی الحدیث اور ابوحاتمؒ لین الحدیث اور امام ابوداؤدؒ ضعیف کہتے ہیں (تہذیب التہذیب ج ۷، ص ۲۴۴) ابن حبانؒ ان کو ضعفاء میں لکھتے ہیں اور ساجیؒ فرماتے ہیں کہ اس کی حدیث سے احتجاج صحیح نہیں اور اس میں ضعف ہے (ایضاً ص ۲۴۵) علامہ ذہبیؒ فرماتے ہیں کہ وہ مشہور ضعیف ہے (میزان ج ۲ ص ۲۰۴)

حضرت ابن عباسؓ کی ایک روایت اس طرح مروی ہے کہ فاتحۃ الکتاب کسی رکعت میں نہ چھوڑو امام جہر کرے یا نہ کرے (کتاب القراۃ ص ۶۳ و سنن الکبریٰ جلد ۲ ص ۱۶۹) لیکن سند میں لیث بن ابی سلیم ہے۔ حضرت ابن مسعودؓ کے اثر کے تحت گذر چکا ہے کہ وہ ضعیف ہے۔

حضرت ابن عباسؓ سے ایک روایت کتاب القراۃ ص ۶۳ میں بھی ہے لیکن اس کی سند میں عبداللہؒ بن لہیعہؒ ہے بحثِ خداج میں نقل کیا جا چکا ہے کہ وہ ضعیف تھا ان کی ایک اور روایت کتاب القراۃ ص ۱۳ میں ہے لیکن سند میں زہیرؒ نا ابو اسحاقؒ الخ ہے امام بیہقیؒ، امام ابوزرعہؒ، علامہ ذہبیؒ، اور ابوحاتمؒ کہتے ہیں کہ زہیرؒ کی روایت ابو اسحاقؒ سے ضعیف اور کمزور ہے (دیکھئے سنن الکبریٰ جلد ۱ ص ۱۰۸، میزان جلد ۱ ص ۳۵۵ و تہذیب جلد ۳ ص ۳۵۲ وغیرہ) علاوہ بریں مبارکپوری صاحبؒ لکھتے ہیں کہ ابو اسحاقؒ مختلط تھے اور مدلس بھی تھے اور عنعنہ سے روایت کرتے ہیں تو ان کی سند کیسے صحیح ہو سکتی ہے؟ تو ان کے قاعدہ کے مطابق یہ روایت صحیح نہیں ہے۔ (ابکار ص ۱۹۶ جلد اول) میں اس کی پوری بحث عرض کی جا چکی ہے۔ الغرض حضرت ابن عباسؓ کی ایک سند صحیح نہیں ہے جس سے یہ ثابت ہو سکے کہ امام کے پیچھے سورۃ فاتحہ پڑھنی چاہیئے۔ بخلاف اس کے ہم جلد اول میں آیت کی تفسیر میں اور آثار حضرات صحابہؓ کرام میں ان کی صحیح سند سے کئی روایتیں اس کے خلاف عرض کر چکے ہیں۔

فائدہ: عقبہ بن الاصم کی سند میں ایک راوی ہے جس کا نام بشرؒ بن موسیٰؒ ہے صاحب اعلاء السنن (جلد ۳ ص ۸۸ میں) اس کو مجہول کہتے ہیں لیکن یہ صحیح نہیں ہے بشرؒ بن موسیٰؒ جلیل القدر محدث تھے علامہ ذہبیؒ ان کو المحدث الامام اور الثبت لکھتے ہیں، امام دارقطنیؒ ان کو ثقۃ نبیل کہتے ہیں (المتوفی ۲۸۸ھ، تذکرہ جلد ۲ ص ۱۹۸ و ص ۱۶۹)

حضرت ابوالدرداءؓ کا اثر: ان سے مروی ہے، انہوں نے فرمایا کہ لا یترک قراۃ فاتحۃ الکتاب خلف الامام جہر اولم یجہر (کتاب القراۃ ص ۶۷ و سنن الکبریٰ ج ۲ ص ۱۷۰)

امام کے پیچھے سورۃ فاتحہ کی قرأت نہ ترک کی جائے امام جہر کرے یا آہستہ پڑھے۔

جواب: سند میں ولیدؒ بن مسلم عن الاوزاعیؒ الخ ہے اور ولیدؒ مذکور مدلس ہے ابو مسہرؒ کہتے ہیں کہ وہ جھوٹے راویوں سے بھی تدلیس کر لیا کرتا ہے۔ علامہ ذہبیؒ اس کے بارے میں یوں فیصلہ صادر کرتے ہیں کہ جب یہ عن سے روایت کرے خصوصاً ابن جریجؒ یا اوزاعیؒ سے تو اس کی حدیث کا قطعاً کوئی اعتبار نہ ہوگا (میزان جلد ۳ ص ۲۷۵ و تہذیب جلد ۱۱ ص ۵۴) اور یہ روایت ان کی اوزاعیؒ سے ہے اور جلد اول میں حضرت ابو الدرداؓ کا بسند صحیح اثر اس کے خلاف عرض کیا جا چکا ہے حضرت ابو الدرداؓ کا اثر ہونے میں فریق ثانی کو بھی کوئی اختلاف نہیں ہے۔ حضرت امام بیہقیؒ نے الولید بن مسلم کا ایک متابع بھی ذکر کیا ہے جس کے سہارے پر مولانا مبارکپوری صاحبؒ نے اس کو اپنا مستدل قرار دیا ہے اور اس سے استدلال کرتے ہوئے اس کو احناف کے خلاف بتایا ہے (ملاحظہ ہو ابکار المنن ص ۔) وہ متابع محمد بن کثیر الثقفی ہے اور امام بیہقیؒ نے ان کی روایت کتاب القرأۃ (ص ۶۸ طبع دہلی) میں نقل کی ہے لیکن اس سے ان کو کوئی فائدہ نہیں اس لیے کہ محمد بن کثیر کی اگرچہ بعض حضرات محدثین کرامؒ نے توثیق کی ہے لیکن امام احمدؒ نے ان کی سخت تضعیف کی ہے اور اسے منکر الحدیث کہا ہے اور نیز انہوں نے فرمایا ہے کہ اس نے ایسی منکر احادیث بیان کی ہیں جن کی کوئی اصل نہیں ہے امام صالحؒ بن محمدؒ اس کو صدوق کثیر الخطأ کہتے ہیں، امام بخاریؒ نے بھی اس کو بہت ضعیف بتایا ہے امام نسائیؒ فرماتے ہیں کہ وہ قوی نہیں اور کثیر الخطأ ہے امام ساجیؒ فرماتے ہیں کہ صدوق اور کثیر الغلط ہے امام ابو احمد الحاکمؒ فرماتے ہیں کہ محدثین کے نزدیک وہ قوی نہیں امام ابن عدیؒ فرماتے ہیں کہ اس کی بیان کردہ روایات میں کوئی اس کی متابعت اور تائید نہیں کرتا (تہذیب التہذیب ج ۹ ص ۴۱۶ و ص ۴۱۷ محصلہ) اور حافظ ابن حجرؒ ان کو صدوق کثیر الغلط کہتے ہیں (تقریب ص ۔) جب یہ راوی نہایت ضعیف اور کثیر الغلط ہے تو اس کی روایت اور اس کی تائید سے کیا فائدہ؟ ترجمان الحدیث ماہ جنوری ۱۹۷۵ء ص ۲۵ و ۲۸ میں بلا وجہ ایسے راوی کا تذکرہ کر کے اس کی روایت سے سہارا تلاش کیا گیا ہے۔

حضرت عمرانؓ بن حصینؓ کا اثر۔ ان سے مروی ہے انہوں نے ارشاد فرمایا:

لا تزکو صلوٰۃ مسلم الا بطہور و رکوع	کسی مسلمان کی نماز مقبول نہیں ہو سکتی تاوقتیکہ وہ طہارت
و سجود و فاتحۃ الکتاب وراء الامام	رکوع، سجود اور سورۃ فاتحہ کا اس میں خاص اہتمام نہ کرے

وغیر الامام (کتاب القرأۃ ص۲۸ جز القرأۃ ص۱۳) امام کے پیچھے ہو یا اکیلا۔

جواب :۔ اس کی سند میں زیادؒ بن ابی زیاد جصاص ہے امام ابن معینؒ اور ابن مدینیؒ اس کو لیس بشئی کہتے ہیں نسائیؒ اور دار قطنیؒ اس کو متروک کہتے ہیں ابو زرعہؒ اس کو واہی کہتے ہیں علامہ ذہبیؒ فرماتے ہیں کہ اس کے ضعیف ہونے پر سب کا اجماع اور اتفاق ہے (میزان جلد ۱ ص۳۵۶ و تہذیب جلد ۳ ص۳۶۸) مؤلف خیر الکلام نے بھی علامہ ذہبیؒ کا حوالہ نقل کیا ہے (ص۳۲۷) یہ روایت بھی نہایت کمزور اور ضعیف ہے اور ان کی ایک روایت یوں ہے لا تجوز صلاۃ الا بفاتحۃ الکتاب وآیتین فصاعداً (کتاب القرأۃ ص۱۶) کہ نماز سورۂ فاتحہ اور دو آیتوں اور اس سے کچھ زیادہ کے بغیر صحیح نہیں ہوتی۔ لیکن اس میں ایک تو خلف الامام کا کوئی ذکر نہیں ہے اور دوسرے اس میں وآیتین فصاعداً کی زیادت موجود ہے۔

لطیفہ :۔ حضرت عمرانؓ بن حصینؓ سے مرفوعاً ایک روایت مروی ہے کہ ظہر کی نماز میں ایک شخص نے آنحضرت صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کے پیچھے قرأت کی نماز سے فارغ ہونے کے بعد آپؐ نے فرمایا کس نے میرے ساتھ منازعت اور ہاتھا پائی کی ہے؟ غرضیکہ آپ نے امام کے پیچھے قرأۃ کرنے سے منع کر دیا (دار قطنی جلد ۱ ص۱۲۴) اس روایت پر فریق ثانی کی طرف سے جن میں امام دار قطنیؒ بھی ہیں یہ اعتراض ہوا ہے کہ سند میں حجاجؒ بن ارطاۃؒ ہے اور وہ ضعیف ہے ہم نے حجاجؒ بن ارطاۃؒ سے کوئی روایت نہیں لی۔ لیکن فریق ثانی کی ستم ظریفی ملاحظہ کیجیے کہ حجاجؒ بن ارطاۃؒ، ابو داؤدؒ، ترمذیؒ، نسائیؒ اور مسلمؒ وغیرہ کے روات میں ہیں (ازالہ ستر ص۱۴۱) علامہ ذہبیؒ ان کو احد الاعلام اور علم کا ظرف لکھتے ہیں (تذکرہ جلد ۱ ص۱۷۵) ابو زرعہؒ اور ثوریؒ ان کی توثیق کرتے ہیں (تہذیب جلد ۲ ص۱۹۶)۔ امام نوویؒ لکھتے ہیں کان بارعاً فی الحفظ والعلم کہ حفظ اور علم میں وہ بلند پایہ رکھتے تھے۔ (تہذیب الاسماء جلد ۱ ص۱۵۳) امام ترمذیؒ ان کی ایک حدیث کو حسن کہتے ہوئے تحسین کرتے ہیں (جلد ۱ ص۱۱۴) بلکہ ایک حدیث کو حسن صحیح کہتے ہیں (جلد ۱ ص۱۱۳) افسوس ہے کہ ان کی روایت تو فریق ثانی کے نزدیک حجت نہیں ہے لیکن زیادؒ کی روایت حجت ہے جو لیس بشئی ہے اور اس کی تضعیف پر اجماع ہے ان کی ایک روایت یوں ہے کہ ظہر کی نماز میں ایک شخص نے سبح اسم ربک الاعلیٰ کی سورت آپؐ کے پیچھے پڑھی تھی (مسلم جلد ۱ ص۱۷۲، نسائی جلد ۱ ص۱۰۶، ابو داؤد جلد ۱ ص۱۲۷) چونکہ لغت

توفیقی ہے اس لیے قرأ کو جہر کے معنی میں نہیں لیا جا سکتا اور پڑھنے والا بھی صرف ایک شخص تھا اور لطف کی بات یہ ہے کہ اس نے قرأۃ ظہر کی نماز میں کی تھی جو سری ہے مگر آنحضرت صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے اس کو بھی گوارا نہیں کیا اور پوری تحقیق گذر چکی ہے کہ اعتبار عموم الفاظ کا ہوتا ہے خصوص سبب کا کوئی اعتبار نہیں ہوتا اور منازعت و مخالجت میں قرأت سورۃ فاتحہ اور دوسری تمام سورتیں یکساں ہیں کیونکہ علت ایک ہے اور ما زاد علی الفاتحۃ کو منازعت کے لیے متعین کر دینا اور سورۃ فاتحہ کو اس سے خارج تصور کرنا دعویٰ بلا دلیل ہے جو بہر حال مردود ہے۔

حضرت ہشامؓ بن عامرؓ کا اثر :۔ حمیدؒ بن ہلالؒ سے مروی ہے وہ کہتے ہیں۔

ان ھشامؓ بن عامرؓ قرأ فقیل لہ اتقرأ خلف الامام قال انا لنفعل (کتاب القرأۃ ص ۷۷ والسنن الکبریٰ جلد ۲ ص ۱۷۰)

کہ ہشامؓ بن عامرؓ نے قرأت کی ان سے پوچھا گیا کہ آپ امام کے پیچھے قرأت کرتے ہیں؟ فرمایا ہاں ہم یوں ہی کرتے ہیں۔

جواب :۔ یہ اثر بھی قابل التفات نہیں ہے اولاً اس لیے کہ اس کی سند میں ابوبکر بربہاریؒ ہے اور عرض کیا جا چکا ہے کہ وہ کذاب تھا وثانیاً اس بات میں اختلاف ہے کہ حمیدؒ بن ہلالؒ کی ہشامؓ بن عامرؓ سے ملاقات ثابت ہے یا نہیں؟ امام ابوحاتمؒ کہتے ہیں ملاقات ثابت نہیں ہے اور ان کی روایت مرسل ہے (دیکھئے تہذیب التہذیب جلد ۲ ص ۲۰ و جلد ۱۱ ص ۴۱) وثالثاً اس اثر میں سورۃ فاتحہ کا ذکر نہیں بلکہ مطلق قرأت کا ذکر ہے فریق ثانی کا دعویٰ صرف سورۃ فاتحہ کی قرأت کا ہے نہ کہ مطلق قرأت کا۔

حضرت معاذؓ بن جبلؓ کا اثر :۔ ایک سائل نے حضرت معاذؓ سے قرأۃ خلف الامام کے متعلق سوال کیا۔

قال اذا قرأ فاقرأ بفاتحۃ الکتاب وقل ھو اللہ احد واذا لم تسمع فاقرأ فی نفسک ولا تؤذ من عن یمینک ولا من عن شمالک (السنن الکبریٰ جلد ۲ ص ۱۶۹)

انہوں نے فرمایا کہ جب امام قرأت کرے تو تم بھی سورۃ فاتحہ اور قل ھو اللہ احد پڑھا کرو اور جب اس کی قرأۃ نہ سنو تو دل میں پڑھا کرو دائیں اور بائیں پہلو والوں کو اذیت نہ دیا کرو۔

جواب :۔ یہ اثر بھی قابل استدلال نہیں ہو سکتا اولاً اس لئے کہ اس کی سند میں احمدؒ بن محمودؒ

واقع ہے حافظ ابن حجرؒ ایک سند کے متعلق جس میں احمدؒ بن محمودؒ واقع ہے لکھتے ہیں کہ سند باطل ہے اور اس سند کے راوی ضعیف ہیں دارقطنیؒ کہتے ہیں کہ مجہول ہیں (لسان المیزان جلد ۶ ص ۲۱۴) وثانیاً اس کی سند میں ابوشیبہ مہریؒ ہے علامہ ذہبیؒ اور حافظ ابن حجرؒ بلج مہریؒ کے ترجمہ میں لکھتے ہیں لا یدری من ذا ولا من شیخہ بلج مہریؒ اور اس کا استاد ابوشیبہ مہریؒ پتہ نہیں یہ دونوں کون تھے؟ امام بخاریؒ فرماتے ہیں اس کی سند مجہول ہے (میزان جلد ۱ ص ۱۶۴ و لسان جلد ۲ ص ۱۲) وثالثاً اس سند میں علیؒ بن یونسؒ واقع ہے اگر یہ علی بن یونس بلخیؒ ہے تب بھی کمزور ہے (میزان جلد ۲ ص ۲۴۱ و لسان ص ۲۶۸) اور اگر علیؒ بن یونس مدینیؒ ہے تب بھی ضعیف ہے (ایضاً و ایضاً ص ۲۶۹) اگر کوئی اور ہے تو اس کی توثیق درکار ہے ورابعاً اس اثر سے بظاہر یہ معلوم ہوتا ہے کہ حضرت معاذؓ نے صرف سرّی نمازوں میں اجازت دی ہے وخامساً اس میں سورۃ فاتحہ کے علاوہ قل ھو اللہ احد کی قرأت کا بھی ذکر ہے اور فریق ثانی اس کا قائل نہیں ہے۔

حضرت عبداللہؓ بن عمرؓ کا اثر:۔ حضرت سالمؒ سے مروی ہے وہ فرماتے ہیں ان ابن عمرؓ کان ینصت للامام فیما جہر فیہ ولا یقرأ معہ (کتاب القرأۃ ص ۱۰۱ وتحقیق الکلام جلد ۲ ص ۱۶۱) کہ حضرت ابن عمرؓ جہری نمازوں میں امام کے پیچھے خاموش رہا کرتے تھے اور قرأت نہیں کرتے تھے، فریق ثانی کا کہنا ہے کہ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ سرّی نمازوں میں وہ امام کے پیچھے قرأۃ کیا کرتے تھے۔

جواب:۔ یہ اثر بھی فریق ثانی کو مفید نہیں اولاً اس لیے کہ اس کی سند میں ابن جریجؒ ہیں، امام دارقطنیؒ علامہ ذہبیؒ اور مبارکپوری صاحبؒ وغیرہ لکھتے ہیں کہ وہ مدلس تھے (تہذیب جلد ۶ ص ۴۰۵، میزان جلد ۲ ص ۱۵۱، ابکار ص ۲۳۷) اور یہاں وہ عنعنہ سے روایت کرتے ہیں اور عنعنہ مدلس کا مقبول نہیں وثانیاً اس میں زہریؒ ہیں اور مبارکپوری صاحبؒ ان کی مدلس روایت کو بھی صحیح تسلیم نہیں کرتے اور یہاں بھی وہ عنعنہ سے روایت کرتے ہیں وثالثاً یہ اثر عبارۃ النص کے طور پر ہماری دلیل ہے کہ حضرت ابن عمرؓ جہری نمازوں میں قرأت کے قائل نہ تھے رہا سرّی نمازوں میں اس سے قرأت کا اثبات کرنا تو مفہوم مخالف پر مبنی ہے اور ہمارے نزدیک مفہوم مخالف حجت نہیں ہے (تعلیق الممجد ص ۹۳ و اعلاء السنن جلد ۴ ص ۷۷) ورابعاً اگر مفہوم مخالف کو بعض فقہاءؒ

کے قول کے مطابق صحیح بھی تسلیم کر لیا جائے تب بھی اس سے اتنا ہی ثابت ہوگا کہ حضرت ابن عمرؓ سرّی نمازوں میں امام کے پیچھے قرأت کرتے تھے اور فریق ثانی کا دعویٰ اس سے خاص ہے کیونکہ ان کا دعویٰ صرف سورۃ فاتحہ پڑھنے کا ہے وخامساً موطا امام مالکؒ وغیرہ کے حوالہ سے بسند صحیح ان کا یہ اثر نقل کیا جا چکا ہے کہ وہ امام کے پیچھے کسی نماز میں کسی قسم کی قرأت کے قائل نہ تھے اور ان کا یہ مسلک ایک مسلّم حقیقت ہے اور ان سے ایک روایت یوں ہے انه كان ينهى عن القرأة خلف الامام (الجوهر النقی جلد ۲ صفحہ ۱۶۳) کہ حضرت ابن عمرؓ امام کے پیچھے قرأت کرنے سے منع کیا کرتے تھے۔ مولانا سید نذیر حسین صاحب دہلویؒ (المتوفی ۱۳۲۰ھ) جو فریق ثانی کے مقتدر اور پیشوا ہیں تحریر فرماتے ہیں کہ مقتدی کو سورۃ فاتحہ پڑھنے کی علماء احناف کے نزدیک اجازت نہیں ہے اور ان کا استدلال ان صحابہ کرامؓ کی روایات سے ہے اور یہ قرأت خلف الامام کے قائل نہ تھے۔ حضرت جابرؓ بن عبداللہؓ، حضرت ابن عباسؓ، حضرت عبداللہؓ بن عمرؓ، حضرت ابوہریرہؓ، حضرت ابوسعیدؓ الخدریؓ، حضرت انسؓ بن مالک، حضرت عمرؓ بن الخطاب، حضرت زیدؓ بن ثابت، حضرت ابن مسعودؓ اور حضرت علیؓ وغیرہم (منع قرأت خلف الامام۔ بحوالہ ایضاح الادلة صفحہ ۷۸) اور صحیح اسانید کے ساتھ جلد اوّل میں ان اکابر کے آثار نقل کیے جا چکے ہیں کہ یہ جملہ حضرات امام کے پیچھے قرأت کے قائل نہ تھے اور یہی بات مولانا نذیر حسین صاحبؒ فرماتے ہیں حضرت عبداللہؓ بن عمرؓ کا ایک اثر کتاب القرأۃ صفحہ ۱۲۹ و صفحہ ۱۴۷ میں ہے لیکن اس میں مکحولؒ مدلس ہیں اور عنعنہ سے روایت کرتے ہیں علاوہ ازیں امام بیہقیؒ فرماتے ہیں کہ یہ عبداللہؓ بن عمرؓ نہیں بلکہ عبداللہؓ بن عمروؓ بن العاص ہیں (صفحہ ۱۲۹) اور مستزاد براں اس میں خلف الامام کا جملہ بھی مذکور نہیں ہے لہٰذا یہ روایت منفرد کے حق میں ہے۔ حضرت عبداللہؓ بن عمرؓ سے ابوالعالیہؒ نے مکہ مکرمہ میں دریافت کیا کہ کیا میں نماز میں قرأت کیا کروں؟ فرمایا میں بیت اللہ کے رب سے حیا کرتا ہوں کہ نماز میں قرأت نہ کروں ولو بام الکتاب اگرچہ ام القرآن ہی ہو (جزء القرأۃ صفحہ ۱۲) لیکن اس میں بھی خلف الامام کا کوئی ذکر نہیں ہے۔ علاوہ بریں کتاب القرأۃ صفحہ ۱۵ میں اسی اثر کے آخر میں فاتحۃ الکتاب کے بعد ما تیسر کی زیادت بھی موجود ہے اور یہ زیادت اس بات کو متعین کر دیتی ہے کہ حضرت ابن عمرؓ کا یہ اثر مقتدی کے حق میں نہیں ہے کیونکہ فریق ثانی کے نزدیک

بھی اس کو ما زاد علی الفاتحہ پڑھنے کی گنجائش نہیں ہے اور کتاب القرأۃ صـ۹۴ میں ان کی اسی روایت میں بام الکتاب کے بعد فزائدا یا فصاعدا کی زیادت بھی مروی ہے حضرت ابن عمرؓ سے ایک اثر ان الفاظ سے مروی ہے۔

سئل ابن عمرؓ عن القرأۃ خلف الامام فقال ما کانوا یرون باسا ان یقرأ بفاتحۃ الکتاب فی نفسہ (جزء القرأۃ صـ۱۲)

ان سے سوال کیا گیا کہ کیا امام کے پیچھے قرأۃ کی جا سکتی ہے؟ فرمایا لوگ اس میں کوئی حرج نہیں سمجھتے تھے کہ اپنے دل میں سورۃ فاتحہ پڑھ لیں۔

لیکن اس کی سند میں ایک تو ابو جعفر رازیؒ ہے جس کا نام عیسیٰ بن ماہان ہے جس کا ترجمہ نقل کیا جا چکا ہے کہ وہ ضعیف ہے اور دوسرا راوی اس سند کا یحییٰ البکاءؒ ہے امام احمدؒ، ابو داؤدؒ، ابو زرعہؒ اور ابن عدیؒ اس کو ضعیف کہتے ہیں، دارقطنیؒ اس کو ضعیف اور علیؒ بن الجنیدؒ اس کو مختلط کہتے ہیں، ازدیؒ کہتے ہیں کہ یہ متروک ہے ابن حبانؒ کہتے ہیں کہ اس سے احتجاج صحیح نہیں ہے (تہذیب التہذیب جلد ۱۱ صـ۲۷۹) امام نسائیؒ اس کو متروک الحدیث کہتے ہیں (ضعفا صغیر صـ۵۵) حافظ ابن حجرؒ اس کو ضعیف الحدیث لکھتے ہیں (تقریب صـ۲۹۵) مؤلف خیر الکلام لکھتے ہیں کہ عیسیٰ بن ماہان متکلم فیہ ہے مگر حافظ ابن حجرؒ لکھتے ہیں کہ صدوق ہے اس کا حافظہ اچھا نہیں تقریب صـ۳۲۴ اور یحییٰ البکاءؒ کو ابن سعدؒ لکھتے ہیں کہ ثقہ ہے انشاء اللہ جب راوی مختلف فیہ ہو تو اس کی حدیث حسن ہوتی ہے (محصلہ صـ۳۲۳) الجواب:۔ بس ایسے ہی راویوں کی ایسی ہی حسن قسم کی حدیثوں پر آپ کے مذہب کی بنیاد ہے اور مسلمانوں کی اکثریت کی نمازوں کو باطل اور کالعدم ٹھہرانے والوں کی وکالت فرما رہے ہیں۔ سبحان اللہ تعالیٰ اور آگے لکھتے ہیں کہ تطبیق کی یہی صورت ہے کہ نفی سے مراد جہری نماز میں فاتحہ سے ما زاد کی نفی مراد لی جائے اور فاتحہ کو اس نفی سے مستثنیٰ قرار دیا جائے انتہیٰ صـ۳۲۵ الجواب:۔ نہ معلوم یہ حضرات کس روایت کی کس سے تطبیق دے رہے ہیں؟ صحیح اور ضعیف کی تطبیق کا کیا معنیٰ؟ الحاصل حضرت ابن عمرؓ ہوں یا کوئی اور صحابی ہو ان میں کسی سے بسند صحیح یہ ثابت نہیں کہ امام کے پیچھے مقتدیوں کو سورۃ فاتحہ پڑھنی ضروری اور واجب ہے۔

حضرت عبادۃؓ بن الصامت کا اثر:۔

حضرت محمودؓ بن ربیع فرماتے ہیں کہ:۔

سمعت عبادۃؓ بن الصامت یقرأ خلف الامام فقلت له تقرأ خلف الامام فقال عبادۃؓ لا صلوٰۃ الا بقراۃ (سنن الکبریٰ جلد ۲ ص ۱۶۸)

میں نے حضرت عبادۃؓ کو امام کے پیچھے قرأت کرتے سنا میں نے دریافت کیا کہ آپ امام کے پیچھے قرأت کرتے ہیں؟ حضرت عبادۃؓ نے فرمایا قرأت کے بغیر نماز نہیں ہو سکتی۔

امام بیہقیؒ نے اپنی سند کے ساتھ ان کی ایک اور روایت بھی نقل کی ہے جس میں امام کے پیچھے آہستہ قرأت کرنے کی اجازت ہے اور پھر لکھا ہے۔

ومذہب عبادۃؓ فی ذلک مشہور (ص ۱۶۸ ج ۲) حضرت عبادۃؓ کا مذہب اس میں مشہور و معروف ہے۔

جواب: سند کے لحاظ سے گو کلام کرنے کی کافی گنجائش ہے مگر ہم سند کے لحاظ سے اس پر کوئی کلام نہیں کرتے حضرت عبادۃؓ بن الصامت نے صحیح سمجھا یا غلط بہر حال یہ بالکل صحیح بات ہے کہ حضرت عبادۃؓ امام کے پیچھے سورۃ فاتحہ پڑھنے کے قائل تھے اور ان کی یہی تحقیق اور یہی مسلک و مذہب تھا مگر فہم صحابی اور موقوف صحابی حجت نہیں ہے خصوصاً قرآن کریم، صحیح احادیث اور جمہور حضرات صحابہ کرامؓ کے آثار کے مقابلہ میں لیکن یہ روایت خود اس بات کو واضح کر رہی ہے کہ حضرات صحابہ کرامؓ اور تابعینؒ میں امام کے پیچھے قرأت کرنے کو پسندیدگی کی نگاہ سے نہیں دیکھا جاتا اور یہ مسئلہ ان میں رائج بھی نہ تھا ورنہ محمودؓ بن ربیع جو خود صغار صحابہؓ میں تھے حضرت عبادۃؓ بن الصامت کی امام کے پیچھے قرأت سے کبھی تعجب نہ کرتے اور نہ یہ پوچھنے کی نوبت ہی آتی کہ حضرت آپ امام کے پیچھے کیوں قرأت کرتے ہیں؟ یقینی امر ہے کہ حضرت عبادۃؓ بن الصامت نے نماز میں تکبیر، قیام، رکوع، سجود، تشہد، اور سلام وغیرہ جملہ امور ادا کئے ہوں گے مگر ان میں سے کسی چیز کے بارے میں پوچھنے کی ضرورت محسوس نہ کی گئی کہ حضرت آپ نے رکوع کیوں کیا ہے؟ سجدہ کیوں کیا ہے؟ وغیرہ وغیرہ اگر سوال کیا ہے تو اس چیز کے بارے میں کہ آپ کے امام کے پیچھے قرأت کیوں کرتے ہیں؟ یہ بھی سن لیجئے کہ حضرت عبادۃؓ بن الصامت نے محمودؓ بن ربیع کو یہ نہیں فرمایا کہ برخوردار تمہاری تمام سابق نمازیں بے کار کالعدم اور باطل ہیں کیونکہ تم نے قرأت نہیں کی اور تمام نمازیں واجب الاعادہ ہیں اور نہ سہی تو یہی نماز جو تم نے ابھی ابھی میرے ساتھ بغیر قرأت کے ادا کی ہے وہی دوبارہ پڑھ لو اور لطف کی بات یہ ہے کہ حضرت محمودؓ بن ربیعؓ حضرت عبادۃؓ کے داماد تھے (تہذیب التہذیب جلد ۱۰ ص ۶۲) انہوں نے ان کو یہ بھی نہ فرمایا کہ تم امام کے پیچھے ترک قرأت کے مرتکب

ہوئے ہو اور تارکِ قرأت کی نماز باطل اور کالعدم ہے اور من ترک الصلوٰۃ متعمدا فقد کفر لہٰذا میری لختِ جگر کو میرے گھر پہنچا دو اور خود مرے اڑاتے پھرو۔ حضرت عبادہؓ وہی جلیل القدر صحابی ہیں جو فرماتے ہیں کہ ہم نے جناب رسولِ خدا صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کے ہاتھ مبارک پر اس شرط سے بیعت کی ہے کہ ان لاتخاف فی اللہ لومۃ لائم (مستدرک وقال صحیح جلد ۳ ص ۳۵۶) اللہ تعالیٰ کے معاملہ میں کسی ملامت کرنے والے کی ملامت سے ہرگز نہ گھبرائیں گے اور ایک معمولی قسم کے مسئلہ میں حضرت امیر معاویہؓ سے الجھ کر ملک شام ترک کر دیا تھا اور یہ فرمایا کہ ہمارا اجتماع ناممکن ہے لیکن حضرت عمرؓ کی زبردست مداخلت سے اپنے ارادہ سے باز آئے (دیکھئے مستدرک جلد ۳ ص ۳۵۵، مسند دارمی ص ۹۳ اور ابن ماجہ ص ۳ وغیرہ) مگر جب قرأت خلف الامام کے مسئلہ کی باری آتی ہے تو اپنے پڑھنے کی وجہ تو بتلاتے ہیں لیکن اس اہم مسئلہ کے اظہار پر کا حقہٗ وہ جوش و خروش ظاہر نہیں کرتے جو اس کے رکن اور ضروری ہونے پر کرنا چاہیئے تھا۔ اگر حضرت عبادہؓ کے نزدیک قرأت خلف الامام واجب فرض اور رکن ہوتی تو اس کے اظہار میں پوری قوت اور طاقت صرف کرتے اور اس میں کسی قسم کی کوئی کوتاہی نہ کرتے اس بحث کو پیشِ نظر رکھنے سے یہ بات بخوبی سمجھ آسکتی ہے کہ حضرت محمودؓ بن ربیع مطلقاً امام کے پیچھے قرأتِ فاتحہ کے قائل نہ تھے اور حضرت عبادہؓ گو قائل تو تھے لیکن محض استحباب کے طور پر اور اگر کسی کو حکم بھی کیا ہے تو صرف استحبابی امر سمجھ کر۔ اگر اس کو رکن اور فرض سمجھتے تو کتمان حق سے بچتے ہوئے حضرت ابن مسعودؓ کی طرح (جنہوں نے قرآن کریم کی دو سورتوں کے تقدم و تأخر فی النزول کے بارے میں اعلان کیا تھا) یہ اعلان فرماتے من شاء باھلتہ جس کا جی چاہے میں اس کے ساتھ مباہلہ کرنے کے لیے تیار ہوں جب حضرت عبادہؓ نے ایسا نہیں کیا تو قطعی بات ہے کہ وہ امام کے پیچھے بلاشک سورۃ فاتحہ پڑھتے تو تھے (اور جہری نمازوں میں پڑھتے تھے) صرف تنہا اور اکیلے تھے دوسرے حضرات صحابہؓ کا ان سے اتفاق نہ تھا) مگر صرف مستحب سمجھ کر ہم نے جو یہ کہا ہے کہ دوسرے صحابہؓ کرام حضرت عبادہؓ بن الصامت سے جہری نمازوں میں قرأۃ خلف الامام کے مسئلہ میں اتفاق نہیں رکھتے تھے، سینہ زوری نہیں بلکہ حقیقت ہے۔ چنانچہ امام بیہقیؒ لکھتے ہیں کہ۔

وانما تعجب من قرأۃ عبادۃؓ بن الصامت خلف الامام فیما یجھر فیہ بالقرأۃ لذھاب — جو لوگ امام کے پیچھے جہری نمازوں میں قرأت کے قائل نہ تھے انہوں نے حضرت عبادہؓ کی جہری نمازوں میں قرأت

من ذھب الی ترک القرأۃ خلف الامام فیما یجھر الامام فیہ بالقرأۃ حین قال النبی صلی اللہ علیہ وسلم مالی انازع القرآن ولم یسمع استثناء النبی صلی اللہ علیہ وسلم قرأۃ فاتحۃ الکتاب سراً وقولہ صلی اللہ علیہ وسلم فانہ لاصلوٰۃ لمن لم یقرأبہا وسمعہ عبادۃؓ بن الصامت واتقنہ واداہ واظہرہ فوجب الرجوع الیہ فی ذلک (انتہیٰ بلفظہٖ کتاب القرأۃ ص۴۲)

پر تعجب کا اظہار کیا اور اس کی وجہ یہ ہوئی کہ آنحضرت صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلمؐ نے جب یہ فرمایا کہ میرے ساتھ قرآن میں منازعت کیوں کی جا رہی ہے؟ اور اس کے بعد آپ نے آہستہ سورۃ فاتحہ پڑھنے کا حکم دیا اور اسی طرح آپ نے یہ فرمایا کہ جس آدمی نے نماز میں سورۃ فاتحہ نہ پڑھی تو اس کی نماز نہ ہوگی تو یہ استثناء صرف حضرت عبادہؓ بن الصامت نے سُنی اور دیگر حضرات صحابہؓ نہ سُن سکے اور اس کو حضرت عبادہؓ نے خوب محفوظ رکھا اس کو ادا کیا اور ظاہر کیا سو انکی بات کی طرف رجوع کرنا ضروری ٹھہرا۔

صحابی اور تارک نماز؟ یہ دو متضاد باتیں ہیں اور واقعہ صبح کی نماز کا ہے جس میں سینکڑوں حضرات صحابہؓ شریک ہوں گے اور آنحضرت صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلمؐ نے مالی انازع القرآن سے تنبیہ فرما کر سب حضرات صحابہ کرامؓ کی توجہ اپنی طرف مبذول کرائی تھی اور یہ حکم بھی پیش نظر تھا۔ یٰاَیُّھَا الرَّسُوْلُ بَلِّغْ مَآ اُنْزِلَ اِلَیْکَ مِنْ رَّبِّکَ اور فَاصْدَعْ بِمَا تُؤْمَرُ (یعنی اے رسول صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم اللہ تعالیٰ کے حکموں کو کھول کر بیان کردیں جن میں کوئی اشتباہ باقی نہ رہے) مگر بایں ہمہ جناب رسول خدا صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم یہ حکم آہستہ (سراً) بیان کرتے ہیں اور حضرت عبادہؓ کے بغیر اس حکم کو کوئی دوسرا سنتا ہی نہیں؟ پھر حضرت عبادہؓ پر لوگ متعجب کیوں نہ ہوں کہ حضرات صحابہ کرامؓ جو آنحضرت صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلمؐ کے ایک ایک حکم اور ارشاد کو عزیز از جان سمجھتے تھے اور ہمہ تن گوش ہو کر سنتے تھے کوئی بات نہیں سمجھ آتی تو پھر استدعا کرتے تھے اور کوئی ضروری امر ہوتا تو آپ تین تین مرتبہ ایک ایک جملہ کو دہراتے تھے لیکن جب امام کے پیچھے قرأت سورۂ فاتحہ کے حکم کے بیان کرنے کا نمبر آتا ہے تو آپ آہستہ بیان کرتے ہیں؟ تین مرتبہ بیان کرنے کی ضرورت ہی نہیں سمجھتے؟ اور یہ حکم صرف حضرت عبادہؓ سُنتے ہیں کسی دوسرے کے پلے کچھ نہیں پڑتا؟ اور دیگر حضرات صحابہ کرامؓ آپ سے دریافت کرنے کی ضرورت بھی نہیں سمجھتے کہ حضرت آپؐ نے کیا ارشاد فرمایا ہے؟ اگر امام کے پیچھے سورۂ فاتحہ کے پڑھنے کا مسئلہ ضروری فرض، واجب اور رکن ہوتا تو یقیناً آنحضرت صلی اللہ تعالیٰ علیہ و

سلم ایک بار نہ فرماتے بلکہ کئی بار فرماتے سراً نہ فرماتے بلکہ جہراً فرماتے صرف حضرت عبادہؓ کو نہ سناتے بلکہ تمام حضرات صحابہؓ کو سناتے اور اگر حضرت عبادہؓ بھی اس حکم کو ضروری سمجھتے تو یقیناً بغیر خوف لومۃ لائم کے اس کی خوب نشر و اشاعت کرتے اور حضرات صحابہ کرامؓ کو اس بات کا قائل کر لیتے کہ وہ بھی جہری نمازوں میں امام کے پیچھے قرأت کرتے۔ یہ حکم تو ضروری نہ تھا اس لیے اس کی پرزور اشاعت کی ضرورت ہی انہوں نے نہ سمجھی۔ بخلاف اس کے ترک قرأت کا حکم ضروری تھا اس لیے کہ جب آنحضرت صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کے پیچھے صرف ایک شخص نے قرأت کی تو آپ نے فرمایا میرے پیچھے کس نے قرأت کی ہے؟ کیوں میرے ساتھ منازعت اور مخالجت ہوتی رہی ہے؟ حتیٰ کہ آپ نے ببانگ دہل یہ ارشاد فرمایا مالی انازع القرآن نتیجہ یہ ہوا کہ یہ ارشاد سب نے سنا اور یہ ارشاد سن کر تمام حضرات صحابہؓ کرام نے جہری نمازوں میں امام کے پیچھے قرأت ترک کر دی۔ جیسا کہ مفصل پہلے گذر چکا ہے۔ باقی اگر حضرت عبادہؓ سے بسند صحیح یا کسی اور صحابی سے بلا قیل و قال خلف الامام کی قید سے کوئی روایت صحیح ہوتی تو یقیناً اس کی طرف رجوع کیا جاتا مگر روایات کا حال آپ ملاحظہ کر ہی چکے ہیں اور بقول شیخ الاسلام ابن تیمیہؒ حضرت عبادہؓ کے موقوف قول سے ہی غلطی در غلطی پیدا ہوئی ہے الغرض حضرات صحابہ کرامؓ کے یہ آثار پہلے تو سنداً ہی صحیح نہیں ہیں اور اگر کچھ صحیح بھی ہیں تو ان میں صرف سری نمازوں کا ذکر ہے، کسی میں مطلق قرأت کا ذکر ہے اور اکثر میں ماذاد، ماتیسر اور فصاعداً وغیرہ کی زیادت بھی موجود ہے لہٰذا یہ آثار فریق ثانی کو ہرگز مفید نہیں ہو سکتے۔

آثار حضرات تابعینؒ وغیرہم

فریق ثانی نے اپنے اس دعویٰ پر کہ امام کے پیچھے ہر رکعت میں سورۂ فاتحہ پڑھنا ضروری ہے ورنہ نماز ناقص، بیکار، کالعدم اور باطل ہو گی حضرات تابعینؒ و اتباع تابعینؒ وغیرہم کے آثار اور اقوال سے بھی استدلال کیا ہے حالانکہ ان کے نزدیک در موقوفات صحابہؓ حجت نیست اگرچہ بصحت رسد پھر آثار حضرات تابعینؒ وغیرہم سے استدلال کیونکر صحیح ہو سکتا ہے جب کہ وہ سنداً اور روایۃً بھی صحت کے معیار پر پورے نہیں اترتے اور معنوی اور درایتی پہلو کے پیش نظر بھی وہ ان کو چنداں مفید نہیں ہو سکتے مگر مشہور ہے ڈوبتے کو تنکے کا سہارا، حضرات تابعینؒ وغیرہم کے وہ آثار جو بحث سکتات

وغیرہ اور دیگر مواقع پر نقل کئے جا چکے ہیں اور جن پر کلام بھی کیا جا چکا ہے ان کے اعادہ کی ضرورت نہیں ہے اس موقع پر صرف وہ آثار پیش ہوں گے جو پہلے نقل نہیں ہوئے۔

حضرت مکحول رح کا اثر :۔ ان سے روایت ہے انہوں نے فرمایا کہ مغرب عشاء اور صبح کی نماز میں ہر رکعت میں آہستہ سورۂ فاتحہ پڑھی جاتے اور جہری نمازوں میں جب امام سورۂ فاتحہ پڑھنے کے بعد سکوت اختیار کرے تو اس وقت آہستہ سورۂ فاتحہ پڑھی جاتے اور اگر امام خاموش نہ ہو تو اس کے ساتھ یا اس کے بعد یا اس سے پہلے ہر حالت میں سورۂ فاتحہ پڑھو اور کسی حالت میں نہ چھوڑو (بیہقی رح جلد ۲ ص ۱۷۱)

جواب :۔ یہ اثر بھی قابل التفات نہیں ہے اولاً اس لیے کہ اگر بالفرض یہ اثر صحیح بھی ہو تب بھی نص قرآنی، صحیح احادیث اور جمہور حضرات صحابہ کرام رض کے صحیح آثار کے مقابلہ میں اس کو سنتا کون ہے؟ وثانیاً قرأتِ سورۂ فاتحہ کے لیے سکتہ کی کوئی گنجائش نہیں ہے جیسا کہ بحث سکتاتِ امام میں اس کی سیر حاصل تحقیق پیش ہو چکی ہے اور جہر امام کے ساتھ ساتھ پڑھتے جانا منازعت اور مخالجت کا موجب ہے جو کتاب وسنت اور اجماعِ امت سے مردود ہے۔

حضرت عروہ بن زبیر رح کا اثر :۔ ان سے مروی ہے انہوں نے ارشاد فرمایا کہ

لا تتم صلوٰۃ لاحد من الناس لا یقرأ فیہا بفاتحۃ الکتاب فصاعداً مکتوبۃ ولا سبحۃ (کتاب القراۃ ص ۷)

کسی شخص کی کوئی نماز خواہ وہ فرضی ہو یا نفلی اس وقت تک مکمل نہیں ہو سکتی جب تک اس میں سورۂ فاتحہ اور اس سے کچھ زیادہ کی قرأت نہ کی جائے۔

جواب :۔ یہ اثر بھی قابلِ استدلال نہیں ہے اولاً اس لیے کہ اس کی سند میں محمد بن العباس رح ہے کتب اسماء الرجال سے اس کی تعیین نہیں ہو سکی کہ یہ کون اور کیسا ہے؟ وثانیاً اس میں احمد رح بن سوید رح ہے جس کا کتب رجال میں کوئی نام ونشان ہی نہیں ملتا، مؤلف خیر الکلام لکھتے ہیں کہ مگر عدم علم سے یہ لازم نہیں آتا کہ وہ مجہول ہو اھ ص ۲۳۹ الجواب :۔ یہ ٹھیک ہے مگر مؤلف مذکور کا یہ علمی اور اخلاقی فریضہ تھا کہ وہ اس راوی کی نشاندھی کرتے اور کتب رجال سے اس کی توثیق نقل کرتے وثالثاً اس کی سند میں حماد رح بن سلمہ رح ہے ان کے اس اثر کا مقابلہ اُس اثر سے نہیں ہو سکتا جو جلد اول میں بسند صحیح نقل کیا جا چکا ہے مبارکپوری صاحب رح لکھتے ہیں۔ سو یہ معارضہ بھی صحیح نہیں

ہے کیونکہ اس اثر کی سند میں حماد بن سلمہؒ واقع ہے آخر میں حافظہ متغیر ہو گیا تھا (انتہی بلفظہ تحقیق الکلام جلد ۱ ص ۱۰۳) ورابعاً اس اثر میں خلف الامام کا کوئی لفظ نہیں ہے اور سبحہ نفلی نماز کا لفظ اس امر کا قوی قرینہ ہے کہ یہ اثر منفرد کے حق میں ہے کیونکہ عام نوافل میں جماعت کی کوئی پابندی نہیں ہے۔

وخامساً اگر یہ اثر صحیح اور قابل عمل ہے تو سارا ہی صحیح اور قابلِ عمل ہو گا اور اس میں فصاعداً کی زیادت بھی ہے اس کے علاوہ کتاب القرأۃ ص ۸۶، ۸۷ میں بھی فصاعداً کی زیادت مروی ہے حالانکہ فریق ثانی فصاعداً وغیرہ کی زیادت پر عمل پیرا نہیں ہے بلکہ ما زاد کو جائز ہی نہیں سمجھتا۔ سنن الکبریٰ جلد ۲ ص ۱۷۱ میں بھی یہ روایت ہے اور یہی راوی ہیں جن کا ذکر ہو چکا ہے البتہ اس میں فصاعداً کی زیادت نہیں ہے اور روایت کا مضمون بھی اس سے قدرے مختلف ہے کیونکہ اس میں امام اور سکتہ کا ذکر ہے لیکن ایک تو سکتہ کا حکم آپ کو معلوم ہے اور دوسرے ان کے دیگر آثار میں فصاعداً کی زیادت بھی نظر انداز نہیں ہو سکتی۔

حضرت حسن بصریؒ کا اثر:۔ ان سے مروی ہے انہوں نے فرمایا۔ اقرأ خلف الامام فی کل صلوۃ بفاتحۃ الکتاب فی نفسک (کتاب القرأۃ ص ۷ والسنن الکبریٰ جلد ۲ ص ۱۷۱) کہ امام کے پیچھے ہر نماز میں اپنے دل میں آہستہ سورۂ فاتحہ پڑھا کرو۔

جواب:۔ اس اثر میں بھی محمدؒ بن العباسؒ ہے معلوم نہیں وہ کون اور کیسا ہے؟ بخلاف اس کے جلد اوّل میں بسند صحیح واذا قرئ القرآن الآیۃ کی تفسیر میں ان کا اثر اس کے برعکس نقل کیا جا چکا ہے۔ چونکہ وہی اثر صحیح ہے اور قرآن کریم صحیح احادیث اور جمہور حضرات صحابہؓ و تابعینؒ کے مسلک کے عین مطابق ہے لہٰذا وہی قابل اخذ ہے، اس کی یہ تاویل جو مؤلف خیر الکلام نے (ص ۳۷۰) میں کی ہے کہ مقتدی کو امام کے پیچھے بلند آواز سے پڑھنے اور شور ڈالنے سے منع کیا گیا ہے (محصلہ) بالکل ان کے قول کی تحریف ہے۔ کیونکہ حسن بصریؒ امام کے پیچھے کسی قسم کی قرأت کے قائل نہ تھے وہ تو آیت واذا قرئ الآیۃ کو خلف الامام کے بارے میں مانتے ہیں جس میں استماع و انصات کا وجوبی حکم ہے جیسا کہ تفصیل کے ساتھ جلد اوّل میں گذر چکا ہے۔

حضرت امام شعبیؒ کا اثر:۔ مالک بن مغولؒ فرماتے ہیں کہ میں نے امام شعبیؒ کو سنا یحسن القرأۃ خلف الامام (سنن الکبریٰ جلد ۲ ص ۱۶۹ وکتاب القرأۃ ص ۱۷) کہ وہ امام کے پیچھے قرأت،

کو پسند کرتے تھے۔

جواب :۔ یہ اثر بھی قابلِ احتجاج نہیں اوّلاً اس کی سند میں ابوبکر بہاری ہے اور گذر چکا ہے کہ وہ کذاب تھا۔ ثانیاً اس اثر میں مطلق قرأت کا ذکر ہے اور فریقِ ثانی کا دعوےٰ خاص سورۂ فاتحہ سے متعلق ہے امام شعبیؒ کا ایک دوسرا اثر اس طرح مروی ہے انہوں نے فرمایا یعنی یقول اقرأ فی خمسهن یقول الصلوٰت کلها (بیہقی جلد ۲ صفحہ ۱۷۶) پانچوں نمازوں میں قرأت کرنی چاہیئے۔ لیکن اس کی سند میں بھی وہی ابوبکر بہاریؒ ہے علاوہ ازیں اس میں اسمٰعیلؒ بن ابی خالدؒ بھی ہے جن کی نقل ہی کوفی ہونے کے لحاظ سے مؤلف خیر الکلام کے نزدیک صحیح نہیں ہے کما مرّ اور حافظ ابن حجرؒ لکھتے ہیں کہ بسا اوقات یہ امام شعبیؒ سے ارسال بھی کرتے تھے اور یحییٰ بن سعیدؒ فرماتے ہیں کہ ان کی مرسل روایتیں محض ہیچ ہیں (تہذیب التہذیب جلد ا صفحہ ۲۹۲) ان کی ایک اور روایت ہے جس میں وہ فرماتے ہیں کہ ظہر اور عصر کی پہلی دونوں رکعتوں میں امام کے پیچھے سورۂ فاتحہ اور اس کے ساتھ کوئی اور سورت بھی اور پچھلی دونوں رکعتوں میں صرف سورۂ فاتحہ پڑھنی چاہیئے (بیہقی جلد ۲ صفحہ ۱۷۶) اگر یہ اثر صحیح بھی ہو تب بھی فریقِ ثانی کو مفید نہیں ہے کیونکہ اس میں صرف ظہر اور عصر کی قید ہے اور سورۂ فاتحہ کے علاوہ کسی اور سورت کا بھی صریح ذکر ہے حالانکہ ان کا دعوےٰ تمام نمازوں میں قرأت کا ہے اور ما زاد علی الفاتحۃ کی قرأت کو وہ جائز ہی نہیں سمجھتا مؤلف خیر الکلام کا اس اثر کو رواۃ کے مختلف فیہ ہونے کی وجہ سے حسن قرار دینا (دیکھئے صفحہ ۳۴۷) مضحکہ خیز ہے اور وہ اکثر اسی قاعدہ کے سہارے پر چلتے ہیں فواأسفا

حضرت امام اوزاعیؒ کا اثر :۔ امام بیہقیؒ اپنی سند کے ساتھ امام موصوفؒ سے نقل کرتے ہیں کہ انہوں نے فرمایا کہ امام کو سورت فاتحہ کی قرأت کے بعد سکوت کرنا چاہیئے تاکہ مقتدی سورۂ فاتحہ پڑھ لیں اور اگر وہ سکوت نہ کرے تو قرأ معه بفاتحة الکتاب اذا قرأ بها واسرع القرأة ثم استمع (کتاب القراۃ صفحہ ۷) اس کے ساتھ ساتھ سورۂ فاتحہ کی قرأت کر لی جائے اور جلدی سے قرأت کر چکنے کے بعد پھر استماع اور توجہ کیجائے۔

جواب :۔ اس بات سے قطع نظر کرتے ہوئے کہ اس کی سند کیسی ہے؟ اور یہ صحیح بھی ہو تب بھی قرآن کریم صحیح احادیث اور حضرات صحابہؓ کرام کے صحیح آثار کے مقابلہ میں یہ کیونکر حجت ہے؟

اور جلد اول کے مقدمہ میں حضرت امام احمدؒ بن حنبلؒ اور امام ابن قدامہؒ کے حوالہ سے نقل کیا جا چکا ہے کہ جو حضرات ائمہ کرامؒ امام کے پیچھے ترک قراۃ کی وجہ سے نماز کو باطل اور فاسد نہیں سمجھتے تھے ان میں حضرت امام اوزاعیؒ بھی ہیں اور شیخ الاسلام ابن تیمیہؒ کے حوالہ سے نقل کیا جا چکا ہے کہ وہ امام کے پیچھے قرأت کو صرف مستحب سمجھتے تھے وجوب کے قائل نہ تھے اور فریق ثانی کا دعوےٰ بڑا سنگین ہے جیسا کہ مخفی نہیں ہے۔

حضرت مجاہدؒ کا اثر :۔ امام بخاریؒ نقل کرتے ہیں :۔

قال مجاهد اذا لم يقرأ خلف الامام اعاد الصلوٰة (جزء القرأة ص۹) مجاہدؒ نے فرمایا جس نے امام کے پیچھے قرأت نہ کی تو اس کو نماز دھرانی چاہیئے۔

جواب :۔ حضرت امام بخاریؒ نے اس کی کوئی سند نقل نہیں کی اور بغیر سند کے ایسا سنگین حکم کون سنتا ہے خصوصاً قرآن کریم اور صحیح احادیث کے مقابلہ میں اور پھر یہ قرأت بھی مجمل ہے اس میں سورۃ فاتحہ کا کوئی ذکر نہیں ہے اور جلد اوّل میں بسند صحیح مجاہدؒ کا اثر اور آیت کا شان نزول اس کے خلاف عرض کیا جا چکا ہے۔

حضرت قاسمؒ بن محمدؒ کا اثر :۔ ان سے مروی ہے انہوں نے ارشاد فرمایا :۔

كان رجال ائمة يقرؤن خلف الامام (كتاب القرأة ص۵ جزء القرأة ص۵ و سنن الكبرىٰ ج۲ ص۱۶۱) کہ بڑے بڑے امام امام کے پیچھے قرأت کیا کرتے تھے۔

جواب :۔ یہ اثر بھی حجت نہیں ہے اولاً اس لیے کہ اس کی سند میں اسامہؒ ہے امام احمدؒ ان کو لیس بشئ کہتے ہیں نسائیؒ ان کو لیس بالقوی کہتے ہیں ابوحاتمؒ کہتے ہیں ان سے احتجاج صحیح نہیں ہے امام یحییٰؒ بن سعیدؒ نے ان کو ضعیف سمجھ کر بالآخر مطلقاً ترک کر دیا تھا امام ابن معینؒ کہتے ہیں کہ ان کی احادیث کا محدثینؒ نے انکار کیا ہے اور وہ ان کے مناکیر میں شمار کی ہیں امام دارقطنیؒ کہتے ہیں کہ جب انہوں نے عطاءؒ کے طریق سے جابرؓ کی یہ روایت مرفوعاً بیان کی منیٰ کلہا منحر (یعنی قربانی چار دن تک جائز ہے اور غیر مقلدین حضرات کا اس پر عمل ہے اس پہ راقم الحروف کا رسالہ مسئلہ قربانی دیکھئے) تو امام یحییٰؒ بن سعیدؒ نے فرمایا تم گواہ ہو جاؤ کہ میں نے اس کی حدیث بالکل ترک کر دی ہے امام دارقطنیؒ فرماتے ہیں کہ اسی حدیث کی وجہ سے امام بخاریؒ نے اس

کو ترک کر دیا تھا (تہذیب التہذیب جلد ۱ صفحہ ۲۰۹) و ثانیاً[۲] اس میں سورۂ فاتحہ کی کوئی تخصیص نہیں ہے اور بغیر اس کے فریق ثانی کا مدعیٰ حاصل نہیں ہو سکتا و ثالثاً[۳] بسند صحیح جلد اول میں حضرت قاسمؒ بن محمدؒ کا اثر نقل کیا جا چکا ہے کہ وہ جہری نمازوں میں امام کے پیچھے سورۂ فاتحہ کے قائل نہ تھے۔

قارئین کرام! آپ نے آثار حضرات تابعینؒ وغیرہم کی حقیقت بھی معلوم کر لی ہے کہ ان میں اکثر و بیشتر سند کے لحاظ سے ضعیف اور کمزور ہیں اور بعض میں ظہر اور عصر کی نماز کی تخصیص ہے اور بعض میں فصاعداً[۱] اور سورت وغیرہ کی زیادت بھی ساتھ ہی موجود ہے اور بعض میں مطلق قرأت کا ذکر ہے مخصوص طور پر سورۂ فاتحہ کا ذکر ان میں نہیں ہے اور ان واضح اور غیر مبہم قرائن کے ہوتے ہوئے فریق ثانی کا دعوے یقیناً باطل ہو جاتا ہے ان آثار کے علاوہ بعض اور بھی ہیں لیکن نہ ان کا سر ہے نہ پاؤں لہٰذا ایسے بے سر و پا اور بے اصل اور غیر مستند آثار کا کیا اعتبار ہو سکتا ہے؟ اس لیے ان کے نقل کرنے اور پھر ان کا جواب دینے کی کوئی حاجت معلوم نہیں ہوتی خلاصۂ امر یہ ہے کہ جمہور نے جو روایات و آثار اپنے استدلال میں پیش کیے ہیں ان میں پچانوے ۹۵ فیصدی راوی ثقہ ثبت اور حجت ہیں اور تقریباً پانچ فیصدی راوی متکلم فیہ ہیں لیکن جمہور ائمہ جرح و تعدیل ان کی بھی توثیق کرتے ہیں بخلاف اس کے جن روایات اور آثار سے فریق ثانی نے استدلال کیا ہے ان میں تقریباً پچانوے ۹۵ فیصدی راوی کذاب، دجال، مجہول، متروک، مستور، لیس بثقۃ، لیس بالقوی، لا یحتج بہ اور کثیر التدلیس والارسال وغیرہ اوصاف سے موصوف ہیں اور پانچ فیصدی ایسے ہیں جو ثقہ ہیں مگر جرح سے خالی نہیں ہیں اور یہ بھی آپ ملاحظہ کر چکے ہیں کہ جن روایات میں فصاعداً۔ ما تیسر۔ ما زاد اور الا وراء الامام کی زیادت موجود ہے ان کے علاوہ اور کوئی روایت صحیح نہیں ہے اور خاص طور پر وہ روایات جن میں خلف الامام اور الا بفاتحۃ الکتاب کی قید موجود ہے وہ تو کسی طرح بھی صحیح نہیں ہیں تو ان ضعیف احادیث سے شریعت کے رو سے صحیح نمازیں کیونکر باطل، بیکار، ناقص اور کالعدم ہو سکتی ہیں؟ اور ایسی ضعیف روایات و آثار پر بنیاد رکھ کر مقتدی کے لیے سورۂ فاتحہ کی فرضیت اور رکنیت کیسے ثابت ہو سکتی ہے؟ اور حنفیوں کو مفسدین صلوٰۃ کا خسروانہ خطاب کیسے حاصل ہو سکتا ہے؟ اور ان کی بیویوں سے بغیر ان کے خاوندوں کے طلاق دیئے اور عدت گذرے نکاح کیسے درست ہو سکتا ہے؟۔

چوتھا باب

قیاسی دلائل

فریق ثانی نے قرآن کریم کی جن آیات سے امام کے پیچھے قرأت سورۃ فاتحہ پر استدلال کیا ہے اس کی حقیقت آپ معلوم کر چکے ہیں کہ ان آیات سے ان کا استدلال تو نہیں ہو سکتا البتہ انہوں نے بعض آیات سے غلط استدلال اور بعض میں تفسیر بالرائے کا ارتکاب ضرور کیا ہے اسی طرح آپ یہ بھی معلوم کر آئے ہیں کہ بغیر ان روایات کے جن میں فصاعداً، ماتیسر اور مازاد وغیرہ کی زیادت اور اِلّا وراء الامام کی استثناء موجود ہے اور کوئی روایت صحیح نہیں ہے اور خاص طور پر وہ روایات جن میں خلف الامام کی قید اور اِلّا بفاتحۃ الکتاب وغیرہ کی استثناء ہے وہ تو انتہائی درجہ کی ضعیف، معلول اور کمزور ہیں اور ان کی اسانید پر جو جرح اور کلام کیا گیا ہے وہ کتب اسماء الرجال اور فریق ثانی کے مسلّم اور طے شدہ قواعد کے لحاظ سے واضح دلائل سے کیا گیا ہے جس سے ان کو کوئی مفر نہیں ہے نیز آثار حضرات صحابہ کرامؓ و تابعینؒ وغیرہم پر جو تنقید کی گئی ہے وہ بھی حضرات محدثین کرامؒ اور خاص طور پر فریق ثانی کے مسلّمات کے عین مطابق ہے اور کوئی بات حوالہ کے بغیر نہیں کہی گئی ہے اب اس باب میں ان کا قیاس اور اجتہاد بھی ملاحظہ کر لیجئے۔

پہلی قیاسی دلیل

امام دارقطنیؒ اور امام بیہقیؒ وغیرہ اپنی سند سے یہ مرفوع روایت نقل کرتے ہیں اَلْاِمَامُ ضَامِنٌ فَمَا صَنَعَ فَاصْنَعُوْا (دارقطنی جلد ۱ ص۱۲۲ و کتاب القرأۃ ص۵۸) امام ضامن ہے جو وہ کرے سو تم بھی کرو اور یہ روایت مجمع الزوائد جلد ۲ ص۶۶ وغیرہ میں بھی مذکور ہے امام بیہقیؒ وغیرہ فرماتے ہیں کہ جہری نمازوں میں ہمارا مشاہدہ ہے اور سرّی میں بھی ہمیں یقین ہے کہ امام سورۃ فاتحہ پڑھتا ہے

اور آنحضرت صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کا ارشاد ہے کہ جو تمہارا امام کرے سو وہ تم بھی کرو لہذا ہمیں بھی سورۃ فاتحہ پڑھنا ہوگی۔

جواب:۔ نہ تو یہ روایت صحیح ہے اور نہ یہ قیاس صحیح ہے اوّلاً اس لیے کہ اس کی سند میں موسیٰ بن شیبہ ہے امام احمدؒ اس کو ضعیف کہتے ہیں (مجمع الزوائد جلد ۲ ص ۱۱۲) نیز یہ فرمایا کہ احادیثہ مناکیر اس کی روایتیں منکر ہیں (میزان جلد ۳ ص ۲۱۱) حافظ ابن حجرؒ لکھتے ہیں لین الحدیث (تقریب ص ۳۶۷) کہ حدیث میں وہ ضعیف ہے اور ثانیاً اس لیے کہ معنی تو یہ ہیں کہ قابل اقتدار اُمور میں امام کی مخالفت نہ کی جائے بلکہ جو کچھ وہ کرے سو تم بھی کرو یہ مطلب تو ہر گز صحیح نہیں کہ جو امام کرے وہ تم بھی کرو ورنہ امام نے یہ کیا ہے کہ مقتدیوں کے آگے کھڑا ہوا ہے بلند آواز سے تکبیر کہتا ہے سمع اللّٰہ لمن حمدہ اور سلام کہتا ہے جہر سے قرأت کرتا ہے اور سورۃ فاتحہ کے بعد کی لمبی لمبی سورتیں پڑھتا ہے تو کیا یہ سب کچھ مقتدی بھی کر سکتے ہیں؟ اس قیاس کے رُو سے مقتدیوں کو چاہیے کہ جیسے امام مقتدیوں کے آگے کھڑا ہوا ہے وہ بھی آگے نکل جائیں حتیٰ کہ امام بیچارہ بھی منہ تکتا رہ جائے اور امام کی طرح مقتدی بھی جہر سے قرأت کریں حتیٰ کہ مسجد گونج اٹھے اور کان پڑی قرأت نہ سنائی دے اور لطف کی بات یہ ہے ما زاد علی الفاتحۃ میں بھی جیسا امام نے کیا ہے ویسا ہی کرنا ہوگا آخر حدیث کے الفاظ ہیں فاصنعوا کما صنع الامام (او کما قال) اس کی مخالفت کون کر سکتا ہے؟ علاوہ ازیں اگر یہ روایت صحیح بھی ہو تو اس میں قرأت کا کوئی لفظ نہیں بلکہ صنع (صنعت) کا ذکر ہے جو عملی کاروائی پہ اطلاق کیا جاتا ہے مطلب یہ ہے کہ امام قیام کرے تم بھی قیام کرو، امام رکوع کرے تم بھی رکوع کرو، امام سجدہ کرے تم بھی سجدہ کرو وغیرہ وغیرہ عملی طور پر اس کی مخالفت نہ کرو، رہی قولی بات تو اس کے متعلق ارشاد یہ ہے اذا قرأ فانصتوا جب امام پڑھے تو تم خاموش رہو غرضیکہ اس روایت سے مقتدیوں کے لیے سورۃ فاتحہ کی قرأت پہ استدلال کرنا روایۃً و درایۃً باطل ہے۔

دوسری قیاسی دلیل

امام بیہقیؒ فرماتے ہیں کہ آنحضرت صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا اَلْمُصَلِّیْ یُنَاجِیْ رَبَّہٗ نمازی اپنے رب سے مناجات کرتا ہے۔

اور مناجات نطق سے ہوتی ہے سکوت سے نہیں ہوتی معلوم ہوا کہ مقتدی کو امام کے پیچھے سورت فاتحہ پڑھنی چاہیئے (محصلہ کتاب القرآۃ ص۵٦)

جواب:- امام بیہقیؒ ہی ازراہ انصاف فرمائیں کہ کیا یہ مناجات صرف سورۃ فاتحہ کی مختصر سی سات آیتوں سے ہی ہو سکتی ہے قرآن کریم کی باقی ایک سو تیرہ ۱۱۳ سورتوں سے مناجات نہیں ہو سکتی؟ اور کیا خدا تعالے کی مناجات کا وقت صرف سورۃ فاتحہ کے وقفہ تک محدود ہے اس کے بعد سورۃ البقرہ جیسی طویل سورتوں کے وقفہ میں خدا تعالیٰ کی مناجات کی ضرورت باقی نہیں رہتی؟ اور یہ آداب مناجات کا کونسا پہلو اور طریقہ ہے کہ وفد کا امیر اور پارٹی کا لیڈر (امام) جب قوم کی نمائندگی کرتا ہے تو ہر طرف سے محفل اور مجلس کے ادب سے قطع نظر کرتے ہوئے وفد کا ایک ایک رکن درخواست کا ایک ایک لفظ دہراتا ہے؟ ہاں یہ ضروری ہے کہ سب اپنے نمائندہ کی آمین کہتے ہوئے تائید کریں لیکن جس سچی سرکار سے نماز میں مناجات ہوتی ہے وہ تو دلوں کے بھیدوں سے بخوبی واقف ہے اور وہ بے ریا اور مخفی دعا کو زیادہ پسند کرتی ہے اس لیے امام کی آہستہ آمین سے تائید زیادہ بہتر اور حسن ہوگی اور مناجات اور درخواست کے پیش کرنے کے لیے امام ہی کافی ہوگا۔

تیسری قیاسی دلیل

امام بیہقیؒ فرماتے ہیں کہ ایک روایت آتی ہے جس کا خلاصہ یہ ہے کہ ایک شخص نے نماز میں کلام کیا آنحضرت صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا نماز میں گفتگو اور کلام نہیں کرنا چاہیئے نماز تو تسبیح تکبیر اور تلاوت قرآن کا نام ہے۔ امام بیہقیؒ فرماتے ہیں کہ اس سے معلوم ہوا کہ مقتدی کو امام کے پیچھے (سورۃ فاتحہ کی) قرأت کرنی چاہیئے۔ (محصلہ کتاب القرآۃ ص۵٦)

جواب: امام بیہقیؒ کا یہ قیاس بھی مردود ہے اوّلاً اس لیے کہ نماز میں تلاوت قرآن باقاعدہ ہوتی ہے اور امام قرآن کریم پڑھتا ہے مقتدیوں کا فریضہ تلاوت نہیں بلکہ استماع اور انصات ہے جیسا کہ نص قرآنی اور صحیح احادیث سے معلوم ہو چکا ہے وثانیاً کیا تلاوت قرآن کا اطلاق صرف سورۃ فاتحہ پر ہی ہوتا ہے اور ما زاد علی الفاتحۃ میں قرآن کریم کی تلاوت نہیں ہے؟ پھر دوسرے حضرات عموماً اور حضرت امام بیہقیؒ خصوصاً کیوں یہ فرماتے ہیں کہ سورۃ فاتحہ کے علاوہ مقتدی کے لیے کسی اور قرأت کی اجازت نہیں ہے اور یہ حدیث فَلَا تَقْرَؤُا بِشَيْءٍ مِّنَ الْقُرْاٰنِ کے تحت ممنوع ہے

چوتھی قیاسی دلیل

امام بیہقیؒ فرماتے ہیں کہ اس مضمون کی ایک حدیث آتی ہے کہ آنحضرت صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے ایک شخص سے دریافت فرمایا تم کس طرح نماز پڑھتے ہو اُس نے جواب دیا میں فاتحۃ الکتاب پڑھتا ہوں جنت کا سوال کرتا ہوں، دوزخ سے پناہ مانگتا ہوں اور مجھے معلوم نہیں آپ کا طریقہ اس میں کیا ہے؟ امام بیہقیؒ فرماتے ہیں اس میں امام و مقتدی کی کوئی قید نہیں لہذا اس سے مقتدی کے لیے بھی قرأۃ ثابت ہوگئی۔ (کتاب القرأۃ ص۵۶)

جواب:۔ اگر یہ روایت صحیح ہے تو اتنی طویل مسافت طے کرنے اور چکر کاٹنے کی کیا ضرورت ہے؟ یہ کیوں نہ ہو جائے کہ یہ روایت صرف منفرد کے حق میں ہو اور وہ بھی محض نفلی نماز میں جیسا کہ ابوداؤد جلد ا ص۱۲۸ وغیرہ ہی کی ایک روایت اس کی طرف اشارہ کرتی ہے کہ آنحضرت صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم صلوٰۃ تطوع (نفلی نماز) میں اَعُوْذُ بِاللّٰہِ مِنَ النَّارِ وغیرہ پڑھا کرتے تھے، چونکہ اس روایت میں خلف الامام کی کوئی قید نہیں اس لیے یہی بات متعین ہے کہ یہ حکم منفرد کے لیے ہو کیونکہ آنحضرت صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے صاف اور صریح الفاظ میں یہ ارشاد فرمایا ہے اِذَا قَرَأَ فَاَنْصِتُوْا جب امام قرأۃ کرے تو تم خاموش رہو اور یہ محال ہے کہ جناب رسول خدا صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم دو متضاد حکم صادر فرمائیں کہنے والے نے کیا ہی سچ کہا ہے ؎

نمی باشد مخالف قول و فعل راستاں باہم
کہ گفتار قلم باشد ز رفتار قلم پیدا

یہ ہیں وہ قیاسات جو حضرت امام بیہقیؒ وغیرہ نے مقتدی کے لیے سورۂ فاتحہ پڑھنے پر پیش کئے ہیں حضرت امام بخاریؒ نے جو قیاسات کئے ہیں وہ ان سے بھی عجیب تر ہیں جن کی پوری تشریح جلد اوّل میں قرآن کریم کی آیت کے تحت نقل کر کے ان کے جوابات دیئے گئے ہیں اور قرآن کریم کی آیات سے جو قیاسات کئے گئے ہیں ان کے جوابات بھی باب اوّل میں عرض کر دیئے گئے ہیں اور باقی جو قیاسات پیش کئے گئے ہیں وہ ضعیف اکثر دور از کار ہیں اس لیے وہ قابل التفات ہی نہیں ہیں

الغرض حق اور منصور مسلک صرف یہی ہے کہ امام کے پیچھے سری نمازیں ہوں یا جہری کسی نماز میں کسی قسم کی قرأت عموماً اور سورۂ فاتحہ کی قرأت خصوصاً ممنوع ہے قرآن کریم صحیح احادیث آثار حضرات صحابہ کرامؓ

و تابعین و اتباع تابعین اور دیگر جمہور اہل اسلام کا یہی مسلک ہے اور جہری نمازوں میں ترک قرأۃ خلف الامام کا مسلک حضرات ائمہ اربعہؒ اور دیگر بالغ نظر حضرات فقہاء کرام و محدثینؒ کا متفق علیہ مسلک ہے اور فریق ثانی کا یہ دعوے کہ جو شخص امام کے پیچھے ہر رکعت میں سورۂ فاتحہ نہ پڑھے اس کی نماز ناقص ہے بیکار ہے اور باطل ہے (بلفظہٖ) قطعاً مردود اور باطل ہے اس دعویٰ پر ان کے پاس کالعدم ہے، ایک بھی صحیح صریح اور مرفوع حدیث موجود نہیں ہے اور اس کے خلاف جمہور علماء کا عموماً اور احناف کا دامن خصوصاً احادیث اور دلائل سے مالامال اور پُر ہے مگر فریق ثانی کا تعصب اور عناد دیکھئے کہ صحیح حدیثوں کو ٹھکراتے ہوئے بھی وہ اہلحدیث ہیں اور ہم لوگ صرف اہل الرائے ہیں اور صرف فقہ اور اماموں کے ماننے والے ہیں تعصب کی اس سے بدترین مثال شاید ہی دنیا میں کوئی اور موجود ہو گی باوجودیکہ فریق ثانی کا دامن مسئلہ زیر بحث میں دلائل سے یکسر خالی ہے مگر ہم پھر بھی ان کی قدر کرتے ہیں اور کوئی ایسا لفظ جو موہم تکفیر ہو کہنے کے لیے تیار نہیں ہے حضرت شیخ الہندؒ نے مولانا محمد حسین صاحب بٹالویؒ کے حق میں کیا ہی خوب ارشاد فرمایا ہے کہ گو آپ صاحب کیسی ہی بدزبانی سے پیش آویں مگر ہم انشاء اللہ تعالیٰ کلمات موہم تکفیر و تفسیق ہرگز آپ کی شان میں نہ کہیں گے بلکہ الٹا آپ کے اسلام ہی کا اظہار کریں گے ولنعم ما قیل ؎

اگر خواندی مرا کافر غمے نیست   چراغ کذب را نبود فروغے

مسلمانت بگویم در جوابش   دہم شیرت بجائے تلخ دوغے

اگر خود مومنی فبہا وگرنہ

دروغے را جزا باشد دروغے   (ایضاح الادلۃ ص۱۰)

راقم الحروف نے ایک مجلس کی تین طلاقوں پر عمدۃ الاثاث[1] فی حکم طلقات الثلاث اور مسئلہ تقلید پر الکلام المفید اور اسی طرح مسئلہ تراویح اور رفع یدین وغیرہ پر ٹھوس معلومات یکجا کئے ہیں اور ان کی ترتیب دی جا رہی ہے دعا کریں کہ اللہ تعالیٰ ان کی اشاعت کے اسباب بھی پیدا کر دے۔

آخر میں ہم پھر یہ گذارش کرتے ہیں کہ ہم نے حضرت امام بخاریؒ، حضرت امام بیہقیؒ اور امام دارقطنیؒ وغیرہ کے پیش کردہ دلائل پر جو گرفت کی ہے تو اس سے مقصد صرف ان کے دلائل کی خامی کا اظہار ہے ورنہ خدا تعالیٰ شاہد ہے کہ ہمارے دل میں ان کی بڑی قدر و منزلت ہے اور ہم یہ سمجھتے ہیں کہ انہوں نے

---

[1] بحمد اللہ تعالیٰ یہ کتاب طبع ہو کر تھوڑے ہی عرصہ میں ختم ہو گئی ہے اب طبع سوم کی تیاری ہو رہی ہے انشاء اللہ تعالیٰ۔

اپنی وسعت اور طاقت کے مطابق احادیث اور دین کی بڑی خدمت کی ہے۔ یہ الگ بات ہے کہ معصوم صرف حضرات انبیاء کرام علیہم السلام ہی ہوتے ہیں اور فریق ثانی کی خدمت میں نہایت ہی ادب سے مخلصانہ اپیل ہے کہ وہ اپنے اس غلو سے باز آجائے اور تمام مسلمانوں کی صحیح نمازوں کو ناقص، کالعدم اور باطل نہ ٹھہرائے۔ اللہ تعالیٰ ان کو حق کے قبول کرنے کی توفیق دے اور ہمیں بھی حق پر ثابت قدم رکھے یہی دلِ ناتواں کی دیرینہ آرزو ہے اور اسی پر دائم و قائم رہنے کی دلی خواہش ہے۔ ؎

یہ دیکھ کر میرا دیدۂ تر سمجھ لو خود حالِ قلبِ مضطر
کہ ہو گا کس جوش میں سمندر جو یہ تلاطم سحاب میں ہے

وصلی اللہ تعالیٰ علی خیر خلقہ محمد خاتم الانبیاء وامام الرسل وسید ولد آدم وعلی آلہ واصحابہ وجمیع امتہ الی یوم القیمۃ آمین ثم آمین

ابو الزاھد

محمد سرفراز خاں صفدر خطیب جامع گکھڑ

ضلع گوجرانوالہ (پاکستان)

۹ جمادی الاخری ۱۳۷۴ھ ۳ فروری ۱۹۵۵ء

وَاِذَا قُرِئَ الْقُرْاٰنُ فَاسْتَمِعُوْا لَهٗ وَاَنْصِتُوْا لَعَلَّكُمْ تُرْحَمُوْنَ ۔ (القرآن)

وذکر الامام احمد بن حنبل الاجماع علیٰ انہا نزلت فی الصلوٰۃ۔ (فتاویٰ ابن تیمیہ ج ۲ ص ۴۱۲)

وَاِذَا قَرَاَ فَاَنْصِتُوْا ۔

(مسلم ج ۱ ص ۱۷۴ ، والوعوانہ ج ۲ ص ۱۳۳)

مقدمہ

تدقیق الکلام

از: شیخ الحدیث حضرت مولانا ابوالزاہد محمد سرفراز خان صفدر دام مجدہم

شیخ الحدیث حضرت مولانا محمد سرفراز خان صفدر دام مجدہم کے استاد محترم جامع المعقول و المنقول حضرت مولانا عبدالقدیر صاحب رحمۃ اللہ علیہ سابق شیخ الحدیث مدرسہ تعلیم القرآن راجہ بازار راولپنڈی نے مسئلہ فاتحہ خلف الامام پر علمی و تحقیقی کتاب تدقیق الکلام تصنیف فرمائی جو دو جلدوں میں کتب خانہ رشیدیہ راجہ بازار راولپنڈی نے شائع کی۔ اس کتاب میں مؤلف خیر الکلام و مؤلف توضیح الکلام کے شکوک و شبہات کا علمی انداز میں جواب دیا گیا ہے۔ اس کتاب کا مقدمہ حضرت شیخ الحدیث صاحب دام مجدہم نے تحریر فرمایا تھا۔ اس مقدمہ میں بیان کردہ بحث کا احسن الکلام کی مباحث سے گہرا تعلق ہے جس کی وجہ سے بہت سے اہل علم حضرات نے فرمائش کی کہ اس مقدمہ کو احسن الکلام کے ساتھ بھی شائع کیا جائے تو ان حضرات کی فرمائش کا احترام کرتے ہوئے اس مقدمہ کو احسن الکلام کیساتھ شائع کیا جارہا ہے (بشکریہ ناشر تدقیق الکلام)

حافظ عبدالقدوس خان قارن

مقدمہ

بِسۡمِ اللّٰهِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِيۡمِ ط نَحۡمَدُهٗ وَنُصَلِّيۡ عَلٰى رَسُوۡلِهِ الۡكَرِيۡمِ ؕ

اَمَّا بَعۡدُ ! مذہب اسلام کے مسائل اصولاً دو حصوں میں منقسم ہیں۔ (۱) اصول، (۲) فروع۔ اصولِ دین میں اختلاف انتہائی مذموم اور قبیح ہے اور اس اختلاف کی وجہ آدمی یا تو سرے سے دین ہی سے خارج ہوجاتا ہے اور یا اہلِ حق سے کٹ اور ہٹ کر اہلِ بدعت کے فرقوں میں شامل ہوجاتا ہے اور فروعِ دین میں اختلاف اگر مجتہد سے رونما ہو تو وہ معذور بلکہ ماجور ہوگا اور اگر غیر مجتہد یہ کاروائی کرے اور اس میں تعصب مذہبی بھی شامل ہو تو وہ گنہگار ہوگا۔ حضرات ائمہ دینؒ کے فرعی اختلافات سے جو خالص دیانت اور خلوصِ نیت پر مبنی ہیں۔ کتبِ فقہ، شروحِ حدیث اور کتبِ تفسیر بھری پڑی ہیں۔ ان اختلافی اور فروعی مسائل میں سے ایک مسئلہ قرأت یا ترک القرأت خلف الامام کا بھی ہے جو عہدِ نبوت سے تاہنوز اختلافی چلا آرہا ہے۔ ہر فریق اپنی علمی تحقیق پر عمل کرتا رہا، کرتا ہے اور کرتا رہے گا۔ مگر غیر مقلدین حضرات نے اس میں بھی نہایت غلو اور تعصّب کا مظاہرہ کیا اور تمام دُنیا کے احناف کثرہ اللہ تعالیٰ جماعتہم کو چیلنج کیا اور ان کی نماز کو باطل بے کار اور کالعدم قرار دے کر ان کو فی النّار والسقر تک کا حکم خسروانہ سُنایا ان کے یہ باطل دعاوی اور ان کے الفاظ سبب تالیف احسن الکلام میں مذکور ہیں وہاں ہی ان کو دیکھ لیا جائے۔ الحمد للہ تعالیٰ احسن الکلام کے مضبوط اور واضح دلائل اور حوالوں کا یہ اثر ہُوا کہ مصنف خیر الکلام اور مؤلف توضیح الکلام یہ کہنے پر مجبور ہوئے کہ ہمارا تو یہ مسلک ہے کہ فاتحہ خلف الامام کا مسئلہ فروعی اختلافی ہونے کی بنا پر اجتہادی ہے پس جو شخص حتی الامکان تحقیق کرے اور یہ سمجھے کہ فاتحہ فرض نہیں خواہ نماز جہری ہو یا سری، اپنی تحقیق

پر عمل کرے تو اس کی نماز باطل نہیں ہوتی۔ (خیر الکلام ص۲۳ و توضیح الکلام ص۲۱۵) کاش کہ یہ حضرات پہلے ہی اس حق گوئی سے کام لیتے اور اپنے غالی دوستوں کو چیلنج بازی اور احناف کی صحیح نماز کے باطل بے کار اور کالعدم ہونے کے نارو فتوی سے باز رکھتے تو ہمیں احسن الکلام لکھنے کی سرے سے ضرورت ہی پیش نہ آتی۔ بفضلہ تعالیٰ یہ احسن الکلام کے ٹھوس اور محکم دلائل ہی کا نتیجہ ہے کہ ان حضرات نے ترک القرأت خلف الامام کرنے والوں کی نماز کے باطل نہ ہونے کا اقرار کیا۔ ورنہ غیر مقلدین حضرات کبھی کھلے لفظوں میں اپنی شکست فاش کو تسلیم نہ کرتے اور نہ یہ ان کا شیوہ اور عادت ہے۔ اس عبارت سے یہ معلوم ہوا کہ جن آیات اور احادیث کو وہ قرأت خلف الامام کے سلسلہ میں بطور دلیل پیش کرتے ہیں وہ نص اور قطعیت کے ساتھ ان کے نزدیک بھی اس دعوی پر دال نہیں ہیں ورنہ وہ اس مسئلہ کو اجتہادی مسئلہ کبھی نہ کہتے کیونکہ اجتہاد وہاں ہوتا ہے جہاں صراحت نہ ہو اور ان حضرات کا اس مسئلہ کو اجتہادی کہنا ہی اس بات کی واضح دلیل ہے کہ صریح، صحیح اور منطوق طور پر ان کے پاس کوئی دلیل موجود نہیں ہے جبھی تو یہ مسئلہ ان کے نزدیک اجتہادی ہے لہٰذا آیات واحادیث کو ترک کرنے کا احناف پر الزام اور طعن بالکل بے جا ہے اس لیے کہ بقول ان حضرات کے احناف نے ان دلائل اور احادیث کو ترک نہیں کیا۔ بلکہ ان کے اس مفہوم اور معنیٰ کو ترک کیا ہے۔ جس کو مجوزین حضرات اپنے اجتہادی رنگ میں اپناتے ہیں اور اس کے برعکس احناف نص قطعی اور صریح وصحیح احادیث سے مقتدی کا وظیفہ ترک القرأت خلف الامام بتاتے ہیں جیسا کہ پیش نظر کتاب تدقیق الکلام میں اس کی محققانہ وعالمانہ بحث کی گئی ہے۔ لہٰذا مصنف خیر الکلام اور مؤلف توضیح الکلام کا چند آیات واحادیث کو پیش کر کے احناف پر یہ طعن والزام قائم کرنا کہ ہمارے پاس تو یہ دلائل ہیں اور احناف ان کے قائل نہیں محض تضیع وقت اور سمع خراشی ہے اس لیے کہ وہ تو ان کے نزدیک بھی ان کے مدعا پر نص قطعی نہیں۔ ورنہ وہ اس مسئلہ کو اجتہادی کبھی نہ کہتے:

نکل جاتی ہو سچی بات جس کے منہ سے مستی میں
فقیہہ مصلحت بین سے وہ رند بادہ خوار اچھا

مؤلف توضیح الکلام کی لاعلمی اور بے خبری

موصوف لکھتے ہیں کہ امام بخاریؒ سے لے کر دورِ قریب کے محققین علمائے اہلِ حدیث تک کسی کی تصنیف میں یہ دعویٰ نہیں کیا گیا کہ فاتحہ نہ پڑھنے والے کی نماز باطل ہے۔ وہ بے نماز ہے وغیرہ (توضیح الکلام ص ۴۳) بجائے اس کے کہ ہم طویل راستہ اختیار کریں اختصاراً صرف دورِ حاضر کے بعض غیر مقلدین حضرات کی چند کتابوں کے حوالے ہی عرض کرتے ہیں۔ غور فرمائیں کہ انھوں نے کیا کہا؟

(۱) پہلے باب میں احادیث صحیحہ صریحہ سے یہ ثابت کیا گیا ہے کہ مقتدی کو امام کے پیچھے الحمد پڑھنا واجب ہے بغیر الحمد پڑھے اسکی نماز درست نہیں۔ (تحقیق الکلام ص ۱۲/۲) ظاہر بات ہے کہ جب نماز درست نہ ہوئی تو باطل ہی ٹھہرے گی اور جب نماز نہ ہوئی تو پڑھنے والا بے نماز ہی تصور ہوگا۔

(۲) سوال: فاتحہ خلف الامام فرض ہے یا واجب یا سنّت یا مستحب ہے؟

الجواب: فاتحہ خلف الامام پڑھنا فرض ہے بغیر فاتحہ پڑھے ہوئے نماز نہیں ہوتی تمام کتبِ احادیث میں مرقوم ہے۔ واللہ اعلم۔ حررہ السید محمد عبدالحفیظ غفرلہ۔ سید محمد نذیر حسین، سید محمد ابوالحسن، سید محمد عبدالسلام غفرلہ۔ (فتاویٰ نذیریہ ص ۳۹۸/۱ و فتاویٰ علمائے اہلِ حدیث ص ۱۲۰/۲)

(۳) سوال: جو شخص امام کے پیچھے کسی رکعت میں سورۂ فاتحہ نہ پڑھ سکا اس کی وہ رکعت ہوئی یا نہ؟

الجواب: بغیر سورۂ فاتحہ کے رکعت پوری نہیں ہوتی۔ ہر رکعت میں سورۂ فاتحہ پڑھنا فرض ہے پس صورتِ مسئولہ میں اس شخص کی وہ رکعت نہیں ہوئی اس کو دُہرانا چاہیئے۔۔۔ الخ حررہ محمد عبدالحق ملتانی، سید محمد نذیر حسین۔ (فتاویٰ نذیریہ ص ۳۹۸/۱، فتاویٰ علمائے اہلِ حدیث ص ۱۲۱/۲)

(۴) خلاصہ تمام مضمون کا یہ ہے کہ رسولِ خدا صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے بامر اللہ تعالےٰ صحابہ کرامؓ کو فرمایا میرے پیچھے سورۂ فاتحہ ضرور پڑھا کرو ورنہ تمہاری نماز باطل ہو جائے گی۔ (فتاویٰ ثنائیہ ص ۴۸۹/۱)

سوال: امام کے پیچھے فاتحہ پڑھنے کے متعلق آپ کی تحقیق از روئے قرآن و حدیث کیا ہے؟ کیا فاتحہ کے بغیر نماز ہو جاتی ہے؟

الجواب: میں سورۃ فاتحہ کو امام کے پیچھے پڑھنے کو ضروری جانتا ہوں۔ از روئے قرآن و حدیث میری تحقیق ہے کہ فاتحہ کے بغیر منفرد ہو یا مقتدی، کسی کی نماز نہیں ہوتی۔ (تفسیر ثنائی ۱۵ر جولائی ۱۹۳۸ء و فتاویٰ ثنائیہ ص۵۵۵/۱)

صاف عیاں ہو گیا کہ امام کے پیچھے سورۃ فاتحہ نہ پڑھنے والے کی نماز باطل ہے، اور جب نماز نہ ہوئی تو پڑھنے والا بے نماز ہی رہا۔

(۵) سوال: سورۃ فاتحہ کا امام کے پیچھے پڑھنا ان الفاظ میں ثابت کر دیا جائے کہ رسولِ مقبول صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے صحابہ کرامؓ کو یہ ارشاد فرمایا ہو کہ امام کے پیچھے ہر نماز میں سورۃ فاتحہ پڑھا کرو؟

جواب: کتاب القرأت بیہقیؒ ص۴۷ میں یہ حدیث ہے لا صلوٰۃ لمن لم یقرأ بفاتحۃ الکتاب خلف الامام۔ یعنی جو امام کے پیچھے فاتحہ نہ پڑھے اسکی نماز نہیں لیجیے جن الفاظ کا آپ نے سوال کیا ہے۔ ان سے بھی یہ سخت ہیں کیونکہ آپ نے امر کا سوال کیا ہے اور یہاں سرے سے نماز ہی کی نفی ہے۔ (فتاویٰ اہلِ حدیث عبداللہ روپڑی ص۱۳۲/۲ و تنظیم اہل حدیث جلد ۱۵ شمارہ ۲ بحوالہ فتاویٰ علمائے حدیث ص۱۱۱/۳)

جب سرے سے نماز ہی نہ ہوئی تو پڑھنے والا بے نماز ہی رہا۔

(نوٹ) اس روایت میں خلف الامام کا جملہ بعض رواۃ کی غلطی کا نتیجہ ہے۔ ملاحظہ ہو فصل الخطاب ص۷۹)

(۶) فرمایا رسول اللہ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے "نہیں ہوتی نماز اس شخص کی جس نے سورہ فاتحہ نہیں پڑھی" اس حدیث سے معلوم ہوا کہ ہر شخص کو نماز میں سورۃ فاتحہ پڑھنی ضروری ہے تنہا ہو یا امام یا مقتدی، بغیر سورۃ فاتحہ پڑھے کسی کی کوئی نماز نہیں ہوتی، خواہ فرض ہو یا نفل ہر ایک میں سورۃ فاتحہ پڑھنا ضروری ہے کیونکہ حکم عام ہے۔ (از مولانا عبدالسلام بستوی مدرس مدرسہ ریاض العلوم دہلی۔ اخبار اہل حدیث دہلی جلد ۹، شمارہ ۲۳

بحوالہ فتاویٰ علمائے حدیث صـ۱۲۲)۔

مؤلف توضیح الکلام ہی از روئے انصاف و دیانت داگران کے نزدیک انصاف و دیانت نامی کوئی چیز ہے اور اس کی ان کے ہاں قدر بھی ہے) یہ فرمائیں کہ کیا یہ تمام محققین علمائے اہلِ حدیث امام کے پیچھے سورۂ فاتحہ نہ پڑھنے والے کو بے نماز نہیں کہہ رہے اور کیا اسکی نماز کو باطل نہیں کہہ رہے ؟ یہ احسن الکلام کے محکم براہین و ادلہ ہی کا نتیجہ اور اثر ہے کہ مؤلف خیر الکلام و توضیح الکلام عدم البطلان کے فیصلہ پر مجبور ہوئے ہیں۔ ورنہ غیر مقلدین حضرات کا فیصلہ اور فتویٰ یہی ہے کہ امام کے پیچھے سورۂ فاتحہ نہ پڑھنے والوں کی نماز باطل ہے اور وہ بے نماز ہیں اور بے نماز کا ٹھکانہ ہی سقر ہے۔

استاذِ محترم شیخ الحدیث حضرت مولانا عبد القدیر صاحب دامت برکاتہم نے جو تقریباً ساٹھ سال تک علومِ نقلیہ اور عقلیہ کے کامیاب مدرس رہے ہیں۔ ڈابھیل میں بھی استاد حدیث رہ چکے ہیں اور اب بھی مدرسہ تعلیم القرآن راولپنڈی میں شیخ الحدیث ہیں) انوکھے اور علمی انداز میں ترک القرأت خلف الامام کے دلائل پیشِ نظر کتاب تدقیق الکلام میں بیان فرمائے ہیں۔ علمائے کرام کے لیے یہ انمول ہوتی ہیں اور ایسے انداز سے پیش کیے ہیں جو حقیقت کی خوب گرہ کشائی کرتے ہیں اور خیر الکلام میں نقل کردہ دلائل کا باحوالہ تانا بانا بھی روشن کیا گیا ہے اور بعض مقامات پر نام لے کر توضیح الکلام میں نقل کردہ دلائل کا بھی تعاقب کیا ہے مگر زیادہ تر تردید خیر الکلام کے شبہات کی کی گئی ہے۔ کیونکہ توضیح الکلام، خیر الکلام کا علمی سرقہ اور اسی کا چربہ ہے۔ جب اصل کا رد ہو گیا تو فرع کا خود بخود ہو جاتا ہے۔ قارئینِ کرام کو تدقیق الکلام میں بعض بعض مقامات میں تکرار بھی نظر آئے گا مگر کہیں بھی تکرار زائد سے خالی نہ ہوگا۔ پڑھنے والے اہلِ علم حضرات اس کا بخوبی اندازہ لگالیں گے۔ اس مسئلہ کے جن جن گوشوں کو حضرت شیخ الحدیث دامت برکاتہم نے اُجاگر کیا ہے اور جن دلائل کو علمی اور تحقیقی طور پر روشن کیا ہے بلا خوف لومۃ لائم یہ کہا سکتا ہے کہ وہ انہی کا حصّہ ہے اور اسی ہی کتاب میں آپ پر وہ عیاں ہوں گے۔ غیر مقلدین حضرات کو اس سے ناگواری تو ضرور ہو گی مگر ٹھنڈے دل سے اس کتاب کو اوّل سے آخر تک ایک بار پڑھ لیں جھوٹیں نہیں۔

وہ روٹھا ہے وہ مجھ سے مجھے منظور ہے لیکن
یارو اسے سمجھاؤ میرا شہر نہ چھوڑے

غیر مقلدین حضرات کے تعصب اور خیانیوں کو تدقیق الکلام میں جس طرح نمایاں کیا گیا ہے اور ان کی علمی غلطیوں کو واشگاف کیا گیا ہے وہ اسی کتاب کا خاصہ ہے۔ عیاں را چہ بیاں مصنف خیر الکلام اور ان کے شاگرد رشید مؤلف توضیح الکلام پر جو علمی تنقید کی گئی ہے اور ان کی سوقیانہ اور غیر عالمانہ زبان سے اغماض کیا گیا ہے وہ کتاب کی قدر و قیمت کو اور دوبالا کر دیتا ہے۔ دونوں مؤلفوں نے اپنے عوام کو اندھیرے میں رکھنے کی بے فائدہ کوشش کی ہے اور محقق اقوال کو محض تارِ عنکبوت قسم کے شبہات سے رد کرنے کی نامحمود کوشش کی ہے۔ مؤلف توضیح الکلام کا کتاب میں اکثر یہی طریقہ اور وتیرہ ہے مثال کے طور پر بعض باتیں ملاحظہ ہوں:

اوّل: حضرت امام مالکؒ مؤطا امام مالک ص۲۹ طبع مجتبائی دہلی میں الامر عندنا فرما کر یہ فرماتے ہیں کہ ہمارے ہاں طے شدہ بات اور ہمارا مذہب یہ ہے کہ امام کے پیچھے سری نمازوں میں قرأت کی جائے مگر جہری نمازوں میں نہ کی جائے۔ (محصلہ)

اس عبارت کو کاٹنے کے لیے مؤلف توضیح الکلام ص۶۵ میں تفسیر قرطبی ص۱۱۹ ج۱ کا یہ حوالہ پیش کرتے ہیں اور ایک قول امام مالکؒ کا یہ ہے کہ فاتحہ ہر رکعت میں ہر ایک کے لیے ضروری ہے ... الخ اور لکھتے ہیں کہ علامہ قرطبیؒ فقہ مالکی کے مسلمہ امام ہیں۔ ان کے کلام کو بلا دلیل رد کرنا بہت بڑی جسارت ہے۔

کیوں جناب؟ حضرت امام مالکؒ جو بلا اختلاف مجتہد مطلق اور مسلّم امام ہیں، اور وہ الامر عندنا فرما کر اپنا فیصلہ خود سناتے ہیں اور طبقہ اولیٰ کی کتاب مؤطا امام مالکؒ میں یہ موجود ہے ان کے اس فیصلہ کو ساتویں صدی کے محمدؒ بن احمدؒ بن ابی بکر الاندلسی القرطبیؒ المتوفی ۶۷۱ھ) بقول مؤلف توضیح الکلام مسلّمہ امام کے بلا سند منقول ایک قول سے رد کرنا کون سا انصاف و دیانت ہے؟ کیا یہ اس کا مصداق نہیں کہ: ؎

میں وہ جواں ہوں شیشے سے پتھر کو توڑ دوں

دوم : احسن الکلام میں ہم نے حضرت امام شافعیؒ کی یہ عبارت نقل کی تھی : و نحن نقول کل صلوٰۃ صلیت خلف الامام والامام یقرأ لا یسمع فیها قرأ فیها (کتاب الام ص ۱۵۳ ج ۷) یعنی ہم کہتے ہیں کہ تمام سری نمازوں میں مقتدی قرأت کرے۔ (جہری میں نہ کرے)

اس کے جواب میں مصنف خیر الکلام اور مؤلف توضیح الکلام نے جو جو شگوفے چھوڑے اور پاپڑ بیلے ہیں وہ قابل دید نی ہیں۔ (۱) یہ کہ کتاب الام کے مطبوعہ نسخوں میں یہ عبارت موجود نہیں ہے۔ معارف السنن ص ۱۸۶ ج ۳ میں ہے کہ یہ عبارت مطبوعہ نسخہ سے گر گئی ہے — (۲) فلاں اور فلاں اور فلاں بزرگ لکھتے ہیں کہ امام شافعیؒ تمام نمازوں میں قرأت خلف الامام کے قائل تھے۔ (۳) کتاب الام کے نام سے جو مجموعہ سات جلدوں میں مطبوع ہے۔ اس میں امام شافعیؒ کے مختلف رسائل بھی آ گئے ہیں۔ یہ عبارت امام شافعیؒ کے دوسرے رسالہ اختلافِ علیؓ و عبد اللہؓ کی ہے۔ جنہیں کتاب الام کو حصہ شمار کرنا علم و عقل کا ماتم کرنا ہے۔ (محصلہ توضیح الکلام ص ۶۵ تا ص ۷۵)

الجواب : غیر مقلدین حضرات کے ان وکیلوں نے جس بہانہ سازی اور حیلہ وری کا ثبوت دیا ہے وہ صرف انہی کا خاصہ لازمہ ہے۔ ترتیب وار جوابات ملاحظہ ہوں :

(۱) مشہور تو یہی ہے کہ النقد خیر من النسیئۃ کہ نقد ادھار سے بہتر ہے ہم نقد حوالہ بتلاتے ہیں اور آپ اس کو سینہ زوری سے ٹالنے کے لیے بہانہ سازی سے کام لیتے ہیں کہ عبارت کتاب الام سے ساقط ہو گئی ہے یہ وہ معہودہ عبارت نہیں ہے جناب ! یہی وہ معہودہ عبارت ہے جس کا حضرت امام شافعیؒ نے وعدہ فرمایا ہے : لا نرید فیہ۔ جو حضرات اس کو مسقوطہ اور گری ہوئی فرماتے ہیں وہ خود وہم کا شکار ہیں وہ یہ سمجھتے ہیں کہ یہ معہودہ عبارت صلوٰۃ کے باب میں ہوگی جو جلد اول میں ہے مگر چونکہ یہ عبارت ساتویں جلد میں ہے اس لیے ان کا ذہن اس طرف نہیں گیا۔

(۲) حضرت امام شافعیؒ کی اپنی صریح اور واضح عبارت کو چھوڑ کر دوسروں کا سہارا لینا جو قول قدیم کے چکر میں پڑ کر خود غلطی کا شکار ہیں۔ کہاں کا انصاف ہے ! حضرت امام شافعیؒ

کا مسلک سمجھنے کے لیے خود انکی اپنی عبارت ہی واضح اور کافی و وافی ہے۔

(۳) کتاب الام متداول کتاب ہے اور تمام اہلِ علم جانتے ہیں کہ اس کی سات جلدیں ہیں اس میں قطع و برید اور اختلاط کا دعوٰی کرنا بعینہٖ ایسا ہے جیسا کہ روافض قرآنِ کریم کے بارے یا منکرینِ حدیث کتبِ حدیث کے بارے کرتے ہیں لیکن ایسے لایعنی دعوٰی اور قول سے ان پر کیا زد پڑتی ؟ یا پڑسکتی ہے ؟ کتاب الام فقہ کی کتاب ہے اس میں کسی مقام پر کسی کے اختلاف کا ذکر ہے اور کسی دوسرے مقام میں کسی اور سے اختلاف کا تذکرہ کیا جاتا ہے۔

خود مؤلف توضیح الکلام نقل کرتے ہیں کہ ص ۲۸۳ تا ص ۲۹۳ میں سیر الاوزاعیؒ اختلاف علیؓ و عبداللہؓ، اختلاف العراقیینؒ اور اختلاف مالکؒ و شافعیؒ کے مباحث ہیں (محصلہ توضیح الکلام ص ۱/۱۶۷) علاوہ ازیں ذیل کے حوالے بھی ملاحظہ کریں:

(۱) کتاب الام ص ۶۳ ج ۴ میں ہے باب فی العُمریٰ من کتاب اختلاف مالک والشافعی رضی اللہ تعالٰی عنہما۔

(۲) ص ۶۹ ج ۴ میں ہے: وفی اختلاف مالکؒ والشافعیؒ اللقطۃ

(۳) ص ۱۶۲ ج ۴ میں ہے وترجم فی کتاب اختلاف علی وابنِ مسعود رضی اللہ تعالٰی عنہما۔

(۴) ص ۱۶۷ ج ۴ میں ہے وترجم فی اختلاف مالکؒ والشافعیؒ باب المنبوذ وغیر ذٰلک۔

کیا ہر مقام پر یہ ناروا دعوٰی کیا جائے گا کہ کتاب الام میں ان کے مختلف رسائل کا اختلاط ہو گیا ہے اس لیے کتاب الام قابلِ اعتبار نہیں ؟ حاشا و کلّا کہ کسی بھی ذی علم کے ذہن میں یہ شیطانی وسوسہ آتا ہو سبھی ہی جانتے ہیں کہ کتاب الام حضرت امام شافعیؒ کی اپنی تالیف ہے اور اس میں درج شدہ تمام مسائل کتاب الام ہی کے ہیں ایسی لایعنی باتوں سے نہ تو روافض قرآن کریم پر سے اعتماد اٹھا سکے ہیں اور نہ منکرینِ حدیث کتبِ حدیث سے اور نہ غیر مقلدین کتبِ فقہ اور کتاب الام پر سے اعتبار اٹھا سکتے

ہیں اور نہ کوئی ایسی بیہودہ گوئی کو تسلیم کرتا ہے۔ وَاللّٰہُ یَقُوْلُ الْحَقَّ وَھُوَ یَھْدِی السَّبِیْلَ۔ اللہ تعالیٰ سب کو سمجھ عطا فرمائے۔

دلِ بینا بھی کر خدا سے طلب
آنکھ کا نور، دل کا نور نہیں

سوم: مؤلف توضیح الکلام ص۵۴ میں خود امام محمدؒ کی اپنی کتاب مؤطا ص۹۴ اور کتاب الآثار ص۱۶۴ کے حوالے سے ان کا یہ مسلک نقل کرتے ہیں لا قراءۃ خلف الامام فیما یجھر فیہ ولا فیما لم یجھر وھو قول ابی حنیفۃؒ اور معنی یہ کرتے ہیں امام کے پیچھے قرأت نہیں کرنی چاہیئے خواہ امام بآواز بلند قرأت کرتا ہو یا آہستہ امام ابوحنیفہؒ کا یہی قول ہے۔

اس کے بعد مؤلف توضیح الکلام نے ص۵۴ تا ص۶۴ تک متعدد حضرات کے حوالے درج کیے ہیں اور آخر میں لکھا ہے ص۶۴ کہ امام محمدؒ بلکہ امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ تعالیٰ بھی سری نمازوں میں فاتحہ پڑھنا مستحسن اور جائز کہتے ہیں۔ (محصلہ) مگر یہ صرف دفع الوقتی اور مغالطہ آفرینی ہے کیونکہ جب حضرت امام محمدؒ جو حضرت امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ تعالیٰ کے براہِ راست شاگرد ہیں اور خود اپنی کتابوں میں ببانگِ دُہل وانشگاف الفاظ میں اپنا اور حضرت امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ تعالیٰ کا یہی مسلک بتاتے ہیں کہ امام کے پیچھے مقتدی کے لیے نہ تو جہری نمازوں میں قرأت ہے اور نہ سری نمازوں میں۔ تو ان کے اپنے قول اور ارشاد کے مقابلہ میں فلاں نے یہ کہا اور فلاں نے یہ کہا کیا حیثیت رکھتا ہے؟ تمام عقل مند اس کے قائل ہیں کہ توجیہ القول بما لا یرضیٰ بہ قائلہٗ ناپسندیدہ امر ہے اور مشہور ہے کہ صاحب البیت ادریٰ بما فیہ۔

غرضیکہ مؤلف توضیح الکلام اور ان کے استاذِ محترم شیخ الحدیث گرامی قدر نے آیات اور صحیح و صریح احادیث اور اقوال راجح کو تعصب کی بناء پر ترک کر کے محتمل معانی ضعیف اور غیر صریح احادیث اور اقوالِ مرجوحہ پر اپنے مسلک کی بنیاد رکھی ہے اور بلا وجہ غیر متعلق حوالے اور اقوال درج کر کر کے اپنے حواریوں کو یہ باور کرانے کے درپے ہیں کہ ہم بھی

دلائل سے لیس ہیں۔ لیکن بحمد اللہ تعالیٰ کتاب تدقیق الکلام کو پڑھنے والے قوی وضعیف دلائل اور راجح و مرجوح اقوال کا اچھی طرح سے موازنہ کر سکیں گے اور مسئلہ قرآت خلف الامام کی پوری حقیقت انشاء اللہ العزیز ان پر منکشف ہو جائے گی۔ اللہ تعالیٰ حضرت شیخ الحدیث دام مجدہم مؤلف تدقیق الکلام کو اُمّتِ مسلمہ کی طرف سے جزائے خیر عطا فرمائے کہ انھوں نے خالص علمی اور تحقیقی انداز میں مسئلہ کی حقیقت واضح کی ہے اور اس کتاب کو اللہ تعالیٰ علمائے کے لیے استفادہ کا ذریعہ اور موصوف کے لیے ذخیرۂ آخرت بنائے۔ آمین ثم آمین۔ وصلی اللہ تعالیٰ وسلّم علی خاتم الانبیاء والمرسلین وعلیھم وعلیٰ آلہٖ واصحابہٖ وازواجہٖ واتباعہٖ الیٰ یوم الدّین۔

احقر العباد

ابو الزاہد محمد سرفراز

صدر مدرس مدرسہ نصرۃ العلوم گوجرانوالہ وخطیب مرکزی جامع مسجد گکھڑ

۲ ربیع الثانی ۱۴۰۹ھ

۱۳ نومبر ۱۹۸۸ء